روس:
انقلاب سے ردِ انقلاب تک

ٹیڈ گرانٹ

دنیا بھر کے محنت کشو! ایک ہو جاؤ!

'جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں'

نام کتاب: روس انقلاب سے ردِ انقلاب تک

مصنف: ٹیڈ گرانٹ

مترجم: ابو فراز

پہلا ایڈیشن: دسمبر 1999ء

دوسرا ایڈیشن:

تعداد اشاعت:

ناشر: طبقاتی جدوجہد پبلیکیشنز 105 منگل مینشن رائل پارک لکشمی چوک لاہور

فون: 042-36316214 فیکس: 042-36365659

پرنٹرز: یاسر عمیر

صفحات:

قیمت:

سرورق تصویر:

email:editor@struggle.com.pk

www.struggle.com.pk

انتساب!

روسی انقلاب کے معمار لیون ٹراٹسکی کے نام
جس نے مر کر بھی بالشوازم کو زندہ رکھا

فہرست

مصنف کے بارے میں

کچھ اردو ایڈیشن کے بارے میں

عرضِ مصنف

انگریزی ایڈیشن کا پیش لفظ

مقدمہ کتاب

بے نظیر پیش رفت

عورت کی حیثیت

مافیا سرمایہ داری کا ظہور

موجودہ کاوش کے بارے میں

باب نمبر 1 :اکتوبر انقلاب کی میزان

منصوبہ بند معیشت کی پیش رفت

کیا اکتوبر انقلاب ایک کُو تھا؟

مسلسل حرکت

پارٹی اور طبقہ

تمام اقتدار سوویتوں کو دو

آئین ساز اسمبلی کا افسانہ

سوویت اور کسان

ننگی رجعت

لینن کی بین الاقوامیت

تنہائی کی قیمت

بے نظیر انہدام

نئی معاشی پالیسی

باب نمبر 2: اسٹالن ازم کا عروج

مارکسزم کا نظریہ ریاست

نیم ریاست

پرانی ریاستی مشینری

بیوروکریسی کی جڑیں

سٹالن کیخلاف لینن کی جدوجہد

نوکرشاہانہ رجعت

متحدہ حزب مخالف

ٹراٹسکی نے اقتدار پر قبضہ کیوں نہیں کیا؟

فرد کا کردار

باب نمبر 3: پانچ سالہ منصوبے سے تطہیرات تک

جبری اجتماعی کاشت کاری

معاشی نشیب وفراز
بڑھتی ہوئی سماجی تقسیم
سوویت خارجہ پالیسی
جرمن انقلاب 1923ء
''ایک ملک میں سوشلزم''
''تیسرا دور''
ہٹلر کی فتح
پاپولر فرنٹ ازم
انقلاب اسپین
تطہیری مقدمات
پرانے بالشویکوں کا قتل عام
خاندانوں کا صفایا
جنرل سٹاف کا قتل عام
''قابیل کی مہر''
کمیونسٹ انٹرنیشنل کا خاتمہ

باب نمبر 4: سٹالن ازم کی نوعیت

سوویت یونین کے طبقاتی کردار کے بارے میں تنازعہ
اکتوبر کے بعد کی عبوری ریاست
رجعت اور بوناپارٹ ازم
بوناپارٹ ازم کیا ہے؟

سٹالنزم، بوناپارٹ ازم کی ایک شکل

’نوکرشاہانہ اجتماعیت‘؟

ٹراٹسکی کی رائے ریاستی سرمایہ داری کے بارے میں

برسر اقتدار ٹریڈ یونین

آج کے دور میں ’’ریاستی سرمایہ داری‘‘ کا نظریہ

باب نمبر 5: جنگ سے ڈی سٹالنائزیشن تک

ایک بار پھر: منصوبہ بند معیشت کی فوقیت

تطہیرات کے نتائج

’’ریکارڈ روم میں رکھا جائے‘‘

پانسہ پلٹتا ہے

سٹالن کی چالیں

مشرقی یورپ جنگ کے بعد

چین میں فتح

سٹالن سے خروشیف تک

سٹالن کی آخری تطہیر

سوویت سامراجیت؟

انقلاب ہنگری

نووچرکاسک کی بغاوت

باب نمبر 6: دور جمود

خروشیف کا زوال

سوویت یونین ترقی کی دوڑ میں پیچھے

تکنیکی پیش رفت

زراعت، کمزور ترین کڑی

1970ء کی دہائی میں معیار زندی

معیار کا مسئلہ

برژنیف دور میں ریاست کی صورتحال

آرٹ اور سائنس

ادیبوں کے خلاف مقدمات

باب نمبر 7: پریسٹرائیکا کا مفہوم

ایک حتمی رکاوٹ

گوربارچوف اور سٹالن

نوکرشاہانہ بدانتظامی

طفیلی ٹولہ

بے چینی کا ابال

ایک دیوہیکل صفر

گورباچوف کے بارے میں خوش فہمیاں

یلسن کی جذبات انگیز خطابت

باب 8: خارجہ پالیسی سے قومی سوال تک

اسلحہ سازی پر اٹھنے والے اخراجات
پرامن بقائے باہمی
مشرقی یورپ کا بحران
مشرقی جرمنی میں ہیجان
چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور ہنگری
قومی سوال اور اکتوبر
قومی سوال اور سٹالن ازم
جسام دشمنی کی لعنت
''آزادی'' کوئی حل نہیں

باب 9: سٹالن ازم کا زوال

سرمایہ داری کی بحالی کے منصوبے
یلسن کا عروج
1991ء کی ناکام بغاوت
کیا بغاوت کامیاب ہوسکتی تھی؟
قیمتوں پر کنٹرول کا خاتمہ
تمام جہانوں کی خرابیاں
سامراجی دباؤ
وائٹ ہائس پر حملہ

مغرب کے بدلتے موڈ
ایک بار پھر قومی سوال کے بارے میں
یوکرائن کی خودمختاری
چیچنیا کی جدوجہد

باب 10: ایک بار پھر روسی ریاست کی ’’طبقاتی نوعیت‘‘

مارکسی طریقہ کار
مسلسل تخمینے
مسئلہ کی تفہیم
بیوروکریسی کا اقتدار اتنا عرصہ کیوں قائم رہا؟
کتنی نجکاری
ریڈ فیکٹری ڈائریکٹرز
کیا یہ عمل پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے؟
عالمی معیشت کا غلبہ
کیا روسی بورژوازی ترقی پسند کردار ادا کر سکتی ہے؟
طفیلی آڑھتی
معیشت کا فیصلہ کن کردار
طبقاتی تضادات اور ریاست
بیوروکریسی میں موجود تضاد، رجحانات
زائد پیداوار کون استعمال کرے گا؟

13

ضمیمہ: ریاست کا مارکسی نظریہ

(ریاستی سرمایہ داری کے نظریے پر ایک اور نظر)

عبوری دور کی معاشیات

مقدار کی معیار میں تبدیلی

زرِ تبادلہ اور ریاست

کیا سوویت میں بھی قانون قدر کارفرما ہے؟

عبوری دور کا مفہوم

مصنف کے بارے میں

کچھ اردو ایڈیشن کے بارے میں

اکتوبر 1917ء کے روسی انقلاب نے انسانی تاریخ کے دھارے کا رخ ایک دم موڑ دیا۔ پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ سماج کے اکثریتی حصے یعنی محنت کش طبقے نے مارکسی خطوط پر انقلاب برپا کر کے روس میں اپنی حکمرانی قائم کی تھی۔ تاریخ کے کسی ایک واقعہ یا تبدیلی نے اس سے بڑھ کر انسانیت پر اثرات مرتب نہیں کیئے تھے۔

لیون ٹراٹسکی کے الفاظ میں:

''اکتوبر انقلاب نے ایک بالکل نئی ثقافت کی بنیاد رکھی تھی۔ اسی وجہ سے اسے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ ہم تھوڑی دیر کیلئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ ناموافق صورتحال کے باعث اگر یہ انقلاب وقتی طور پر ناکام بھی ہو جاتا تو پھر بھی اس کے ناقابل فراموش نقوش باقی رہ جاتے اور ان کا اثر مستقبل پر ہمیشہ کیلئے قائم رہتا۔'' (انقلاب روس کی تاریخ)

دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح برصغیر پاک و ہند پر بھی بالشویک انقلاب نے بڑے گہرے اثرات مرتب کیئے۔ اقبال نے بھی مارکس کو ایک ایسا پیامبر قرار دے دیا جس کے پاس کتاب تو تھی مگر

نبوت نہیں تھی۔اس نے ''لینن خدا کے حضور میں'' جیسی بڑی نظم لکھی۔

حسرت موہانی کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے جنرل سیکرٹری رہے۔سوشلزم کا نظریہ بڑی تیزی سے برصغیر میں پھیلا اور اس نے یہاں کی ثقافت، شاعری اور سیاست کو بڑا متاثر کیا۔ برطانوی سامراج کیخلاف قومی آزادی کی تحریک میں اشتراکی نظریات دیکھتے ہی دیکھتے نمودار ہوئے۔روس میں ہونے والی تبدیلیاں کسی معجزے سے کم نہیں تھیں۔دنیا بھر کے محنت کشوں اور مظلوموں کی طرح برصغیر کے محنت کشوں کیلئے بھی اکتوبر انقلاب صدیوں کی محکومی اور ذلت سے نجات پانے کیلئے ایک مشعل راہ تھا۔

برطانوی سامراج کے جبر کے باعث برصغیر کے بہت سے سیاسی کارکن سوویت یونین گئے جہاں انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ یہ ان کیلئے سوشلسٹ تعلیم حاصل کرنے کا اہم موقع تھا۔اس سے برصغیر میں اشتراکی نظریات کی ترویج کا عمل تیز تر ہو گیا۔ جب 1919ء میں راؤلٹ ایکٹ کیخلاف ایک عوامی بغاوت ابھری تو بیس مارچ 1920ء کے ''دی ٹائمز'' لندن نے یہ سرخی لگائی ''ہندوستان میں انقلاب لانے کا بالشویک منصوبہ۔'' 1920ء کی نارتھ ویسٹ ریلوے کی ہڑتال پر برطانوی پریس چلا اٹھا۔''اس ہڑتال کا یقینی طور پر بالشویک کردار ہے'' اس طرح رجعتی تاریخ دان ایم آر مسافی کو اپنی کتاب میں لکھنا پڑا۔''1920ء کی دہائی کے آغاز میں ہندوستانی دانش اور جذبات کا موسم کیمونزم کیلئے نہایت ہی سازگار تھا۔''

برصغیر میں ابھرنے والی تحریک کا جو رشتہ بالشویک انقلاب سے براہ راست بنتا تھا اس کا ذکر لینن نے اپنی کئی تحریروں میں کیا تھا۔لینن ایک جگہ لکھتا ہے۔''مشرق کے عوام کی یہ انقلابی تحریک اسی صورت میں فعال ہوسکتی ہے اگر یہ سامراج کیخلاف ہماری بین الاقوامی جدوجہد سے براہ راست منسلک ہو جائے۔''

اس سے واضح ہے کہ لینن ہندوستان میں قومی آزادی کی تحریک کو طبقاتی جدوجہد کا حصہ سمجھتا تھا اور اس کو عالمی سوشلزم کی لہر میں اہم عنصر کا رتبہ دیتا تھا کیونکہ قومی آزادی کا حصول سوشلسٹ انقلاب کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

ہندوستان کے ابتدائی مارکسی رہنما لینن کی اس پوزیشن سے اتفاق کرتے تھے۔ سات مئی 1919ء کو لینن نے ماسکو میں محمد برکت اللہ کا استقبال کیا جو افغانستان میں ہندوستان کی عبوری جلاوطن حکومت کا وزیراعظم تھا۔اسی سال جولائی میں مہندر پرتاپ، عبدالرب برق، پراتی وادی، دلیپ سنگھ گل

اور پنجاب کے کسان رہنما محمد ابراہیم نے بھی لینن سے ملاقات کی تھی۔ اسی طرح 1920ء میں تیسری انٹرنیشنل کی مجلس عاملہ کی دوسری کانگریس میں محمد شفیق، ایم۔ این۔ رائے، عبدالحمید اور محمد علی نے شرکت کی تھی۔ ان میٹنگوں میں برصغیر کے انقلابیوں کی ملاقاتیں ایران، ترکی اور اس خطے کے دوسرے ممالک کے کمیونسٹوں سے ہوئیں۔ ان میں ایران کے سلطان زادہ اور ترکی کے مصطفیٰ صبوحی شامل تھے۔ اس دور میں جو نوجوان کمیونسٹ ایک تازہ قیادت اور کیڈر کی شکل میں ابھر رہے تھے ان میں پنجاب یونیورسٹی کے طالب علم عبدالقیوم، کشمیری نوجوان عبدالحمید اور پشاور کے نثار محمد شامل تھے۔

لیکن بعد میں روس میں انقلاب کی زوال پذیری اور افسر شاہی کے ابھار نے دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں پر بھی انتہائی منفی اثرات مرتب کئے۔ اس سے مارکسی نظریات پر پہلی کاری ضرب لگی۔ افسر شاہی روز بروز طاقت ور اور مضبوط ہونے لگی۔ بڑا ظلم یہ ہوا کہ دنیا کی بے شمار دوسری کمیونسٹ پارٹیوں کی طرح ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو بھی سوویت افسر شاہی کے ماتحت کر دیا گیا۔

برصغیر میں کمیونسٹ پارٹی 1928ء کے بعد نظریاتی زوال کا شکار ہونا شروع ہوئی۔ 1936ء تک اس کی نظریاتی صحت کسی حد تک قائم تھی۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے دوران یہ پارٹی آگے بڑھنے کے سارے امکانات گنوا بیٹھی۔ یہ بھی روسی افسر شاہی کی پیروی کرنے لگی تھی۔ 1943ء میں سٹالن، روزویلٹ اور چرچل کے مابین معاہدے کے بعد کمیونسٹ پارٹی اپنا انقلابی کردار بالکل کھو بیٹھی۔ اس نے سامراج کیخلاف جدوجہد ترک کر دی۔ اس نے برطانوی وائسرائے لارڈ ویول کو اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد جو سوشلسٹ انقلاب برپا کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی، ہندو مسلم کی تقسیم کے ہتھے چڑھ گئی اور ہندوستان کی نام نہاد آزادی جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ کا تسلسل بن گئی۔ یہ پارٹی برصغیر کی مذہبی بنیاد پر تقسیم کی نہ تو مخالفت کر سکی اور نہ ہی اس اقدام کو روک سکی۔

اس سارے عرصے میں برصغیر کے ''سوشلسٹوں'' اور ''کمیونسٹوں'' کی قیادت کی اکثریت ماسکو اور بیجنگ کی اندھی پیروی میں ان بیوروکریسیوں کے دم چھلے بن کر محنت کشوں کی تحریکوں اور انقلابات کو ''ترقی پسند''، ''لبرل''، ''قوم پرست'' اور ''سیکولر'' کے چرنوں پر بلی چڑھاتے رہے۔

وطن کی بات ہوتی رہی، بائیں بازو کی پارلیمانی (سرمایہ دارانہ) جمہوریت کی جدوجہد میں محکوم طبقات کے مفادات کا خون ہوتا رہا۔ ''سوویت یونین'' اور عوامی جمہوریہ چین'' کی حکومتوں اور نظاموں

کے بارے میں سوال کرنا بھی بائیں بازو کی تحریک میں جرم قرار دے دیا گیا۔ٹراٹسکی کا نام لینے والوں کو سی آئی اے (CIA) کا ایجنٹ گردانا گیا۔حالانکہ ٹراٹسکی کا ایک فقرہ پڑھے بغیر اس پر تنقید اور مذمت کی مسلسل بوچھاڑ جاری رہی۔

ایوب خان کیخلاف ابھرنے والی 1968ء کی انقلابی تحریک میں داخل ہونے سے اس لئے اجتناب کیا گیا کیونکہ اس فوجی آمر کی چین سے بہت دوستی اور قریبی تعلقات تھے اور پاک چین دوستی کا بہت شور تھا۔اس لئے ان ملکی اور قومی رشتوں کی خاطر طبقاتی یکجہتی اور جدوجہد کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔جس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ حکمران اور ان کا استحصالی نظام مضبوط ہوا لیکن اگر چوٹ کھائی تو وہ محنت کش طبقے اور اس کی تحریک نے۔دیوار برلن کے گرنے،چینی افسر شاہی کے کھلے عام سرمایہ دارانہ زوال اور سوویت یونین کے انہدام نے بائیں بازو کو بے نقاب کر دیا ہے۔وہ بدظن اور مایوس ہو چکے ہیں۔

نظریاتی خجالت کے اس عالم میں ان کا اصل روپ سامنے آیا ہے۔سٹالنزم کی ہلکی سی جھلی اتر کر ہمارے سامنے انکی جو تصویر پیش کرتی ہے وہ بہت ہیبت ناک ہے۔سوشلزم کا نام لینے والے لیڈر اب تصوف میں گم ہو کر رومانویت کا درس دے رہے ہیں۔جدلیاتی مادیت کے لیکچر دینے والے اب مذہبی رجحانات کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔لیکن ایک بڑی کھیپ سرمایہ دارانہ نظام میں ''اصلاحات'' اور اس نظام کو بہتر بنانے کے نظریے کے تحت این جی اوز کی کالی دولت اور سامراجی امداد کے نشے میں بدمست ہو کر اپنے سوشلزم اور کمیونزم کے گناہوں کا پراشچت کر رہی ہے۔بہت سے حکمرانوں کے دم چھلے بن کر جرائم کی دنیا میں نام پیدا کر رہے ہیں۔لیکن سٹالنزم کے بکھر جانے سے نہ تو سوشلزم کے نظریات غلط ثابت ہوئے ہیں اور نہ ہی طبقاتی جدوجہد کا ابھار رکے گا۔بلکہ اب کہیں بھی کوئی بھی انقلابی تحریک اگر ابھرتی ہے تو وہ اپنی قیادت خود تراش لائے گی۔وہ اپنی روایتوں میں سے گزرتی ہوئی ان کو یکسر بدل کر انقلابی رنگ دے گی۔اس تحریک کی نئی راہیں کھلیں گی اور کوئی سوویت یا بیجنگ افسر شاہی نہیں ہو گی جو اپنے ''نظریاتی'' دباؤ اور مالیاتی مفادات کے زور پر ان تحریکوں کو مصلحتوں کے راستوں پر زوال پذیر کر سکے۔آج سے ستر سال پیشتر ٹراٹسکی اور ٹیڈ گرانٹ نے جو تجزیہ اور تناظر پیش کیا تھا اس کو اتنے عشروں کے بعد سوویت یونین کے آخری حکمرانوں کو ماننا پڑا ہے۔نیوز ویک کے ایک حالیہ شمارے میں میخائیل گورباچوف نے اپنے ایک مضمون میں روسی انقلاب کی سٹالنسٹ زوال پذیری کو یوں تسلیم کیا ہے۔

''وہاں لڑنے کیلئے تھا ہی کیا! کمیونزم کے نظریے کو جس طرح اس کے خالقوں نے تصور کیا تھا وہ

کہیں بھی وجود نہیں رکھتا تھا۔ نہ ہی سوویت یونین میں اور نہ ہی مشرقی یورپ میں۔ یہاں جس نظام کا وجود تھا، وہ سٹالنسٹ سوشلزم تھا، جو کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس کا وقت ختم ہو گیا تھا اور اس کا انہدام ناگزیر ہو چکا تھا۔"

لیکن گورباچوف بذات خود کمیونزم کے نظریات میں اضافہ کرنے یا ان میں تخلیق نو کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ جب اسے سٹالنسٹ نظام میں اصلاحات کرنے میں ناکامی ہوئی تو وہ سرمایہ داری کی جانب مائل ہو گیا جس کا نتیجہ روس کی بربادی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ اکتوبر کا بالشویک انقلاب اور سوویت یونین کا انہدام یعنی ردانقلاب اس ملینیم (ہزار سال) کے دو بڑے واقعات ہیں۔ جس طرح سوشلسٹ انقلاب کا عمل ایک پیچیدہ سائنس ہے اسی طرح سوویت یونین کا جو انجام ہوا ہے وہ لینن، ٹراٹسکی، ٹیڈ گرانٹ اور ایلن ووڈز کی گزشتہ سات دہائیوں پر محیط تحریریں پڑھنے والوں کیلئے کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ لیکن سامراج اور اس کے پٹھو ذرائع ابلاغ نے جو مکروہ پروپیگنڈہ شروع کر رکھا ہے اس کا بنیادی مقصد سوویت یونین کے انہدام کو مارکسزم اور انقلابی نظریات کو غلط اور متروک ہونے سے تعبیر کرنا ہے۔ درحقیقت پروپیگنڈے کی اس یلغار کے پردے میں سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی اور اس کے بھیانک مستقبل کو چھپانا ہے۔ یہ نظام جس بند گلی میں جا چکا ہے وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اس صورتحال میں پاکستان کا مستقبل کبھی اسلامی بنیاد پرستی سے جوڑا جا رہا ہے اور کبھی بدعنوان اور بیہودہ قسم کی جمہوریت میں تحفظ تلاش کیا جا رہا ہے اور کبھی لبرل فوجی آمریت میں پناہ لینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ سابقہ بائیں بازو کے سیاست دانوں کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ وہ ایک چوراہے پر کھڑے ہیں اور جو راستہ انہیں منزل تک لے جا سکتا ہے اسے دانستہ طور پر دیکھنے کو تیار نہیں ہیں اور وہ راستہ ہے محنت کش طبقے کی انقلابی جدوجہد۔ آج بھی انسانیت کی خوشحالی اور نجات کا واحد راستہ سوشلزم ہی ہے۔ آج بھی اکتوبر انقلاب ہمارے لئے روشنی کا مینار ہے۔ لیکن انقلابی تحریک میں اہم کردار ادا کرنے والے طبقوں میں سامراجی پروپیگنڈہ کی یلغار کہ "سوشلزم ناکام ہو چکا ہے"، "اس کی افادیت ختم ہو چکی ہے"، کسی حد تک اپنا اثر دکھا رہا ہے لیکن اس کیفیت کی بڑی وجہ سابقہ "سوشلسٹوں" کا انقلاب سے اعتبار اٹھ جانا ہے۔ 1991ء کے بعد سامراجی پریس کی طرف سے مسلسل یہ رٹ لگائی جا رہی ہے کہ سوشلزم کا نظام قابل عمل نہیں ہے۔ اسے تاریخ کا خاتمہ سمجھ کر سرمایہ دارانہ نظام ہی میں گلتے سڑتے رہو۔ دوسرے الفاظ میں اس انسانیت دشمن نظام کو اپنی تقدیر سمجھ لو۔ یاس اور ناامیدی پیدا کی جا رہی ہے۔ یہ منفی پروپیگنڈہ،

انسانی سوچ اوراس کے ارتقا کی توہین ہے۔انسان نے آگے کی سمت اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔صدیوں کی انسانی محنت سے حاصل کیئے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی کے ثمرات نے ہماری مستقبل کی نسلوں کو ایک بامعنی اور خوشحال زندگی کی نوید دینی ہے۔یہ مسرت سے بھری زندگی فقط سوشلزم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ زیرِنظر کتاب ایک تاریخ ساز حیثیت کی حامل ہے۔اس میں سوویت یونین کے جنم اور انہدام کا مارکسی خطوط پر سائنسی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔سوویت یونین کے پیچیدہ کردار پر شاید ہی کسی دوسرے مصنف نے اتنی محنت اور جان سوزی سے کچھ لکھا ہو۔ٹیڈ گرانٹ کے وسیع تجربے اور مارکسزم پر اس کے گہرے تخلیقی مطالعے کے پس منظر میں یہ کتاب بہت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔یہ کتاب نہ صرف اس صدی کے اہم ترین سیاسی، سماجی اور اقتصادی تجربوں کا احاطہ کرتی ہے بلکہ روس کے مستقبل اور سوشلزم کے امکانات کو بھی ٹھوس دلائل سے پیش کرتی ہے۔ٹیڈ گرانٹ نے نہ صرف انقلاب برپا ہونے کے عمل کو باریک بینی سے پرکھا ہے بلکہ اس کے زوال کی معروضی اور موضوعی وجوہات کا بھی سائنسی انداز میں تجزیہ پیش کیا ہے۔کتاب میں ان تمام سوالوں کے جواب موجود ہیں جو سوویت یونین اور سوشلزم کے بارے میں محنت کشوں کی تحریکوں اور بائیں بازو کے دانشوروں کے حلقوں سے اٹھ رہے ہیں۔

روس اور سابقہ سوویت یونین کے ممالک میں جو بربادی ہوئی ہے اس کا موازنہ صرف سلطنت روم کے انہدام سے ہی کیا جا سکتا ہے جب یورپ ڈیڑھ ہزار سال تک جہالت، پسماندگی اور رجعت کے اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔روس میں سرمایہ داری نے پورے معاشرے اور تہذیب و تمدن کو جس بربادی کی دلدل میں ڈبو دیا ہے اس سے اب ایک نیا اکتوبر ہی اس کو نکال سکتا ہے۔سرمایہ داری کی استواری مکمل ہونے سے قبل ہی روس کے عوام سرمایہ داری نظام کو مکمل طور پر مسترد کر چکے ہیں۔

اکیسویں صدی کے دہانے پر سرمایہ دارانہ ممالک کے حکمرانوں اور جدید ٹیکنالوجی تیار کرنے والی کمپنیوں کے مالکان کا پیری مریدی، توہمات، جادوگری، تعویز دھاگہ، ٹونوں، ستاروں کے علوم اور جوتشیوں کے جانب رجوع کرنا انکی اپنے نظام کے مستقبل پر بے اعتمادی اور تاریخی استرداد کو تسلیم کرنے کی غمازی کرتا ہے۔

آج سرمایہ دارانہ سماج عالمی سطح پر شدید انتشار اور بدامنی کا شکار ہے۔اس کا بحران ہر روز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔اسے مکمل شکست و ریخت سے بچانے کیلئے اسکے نظریہ سازوں اور ماہرین کو کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا۔سرمایہ داری کی پیداواری قوتوں کے بانجھ پن نے محنت کشوں اور ان سے منسلک

پرتوں کو بے روزگاری اور دوسرے عذابوں میں مبتلا کر رکھا ہے جس سے نجات حاصل کرنے کیلئے وہ کوئی راستہ تلاش کر رہے ہیں۔

اس راستے کی تلاش میں یہ کتاب ان لوگوں کے لئے بہت مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اس میں وہ تمام وضاحتیں اور جواب موجود ہیں جس کی اس وقت انہیں اشد ضرورت ہے۔ یہ کتاب موجودہ نسل کے انقلابی سوچ رکھنے والوں کی نظریاتی تربیت میں اہم کردار ادا کرے گی اور آنے والے مشکل وقتوں میں انہیں اپنی مداخلت کے ہنر سے آشنا رکھے گی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ اس خطے میں انقلابی نظریات کے پھیلاؤ کو مزید وسعت دے گا۔

اس کتاب میں لینن اور ٹراٹسکی کی بہت سی ایسی کتابوں سے مواد اخذ کیا گیا ہے جس کا ابھی تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ یہ کتاب ان تحریروں تک رسائی کا بھی اہم ذریعہ ہے۔

تاریخ کے اس انتہائی نازک اور فیصلہ کن موڑ پر انسانیت کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔۔۔ سوشلزم یا بربریت۔ یہ کتاب سوشلزم کا راستہ انتخاب کرنے کی جرأت عطا کرتی ہے۔ پاکستان یا دنیا کے کسی بھی ملک میں جب بھی سوشلسٹ انقلاب برپا ہوا تو اس کے رونما ہونے میں اس کتاب کا بڑا عمل دخل ہوگا۔ اس کتاب کے مترجم کی کاوش بھی انقلاب کی تاریخ میں سنہری حروف میں درج ہوگی۔ یہ کاوش اردو پڑھنے والے انقلابیوں پر انقلاب کو ایک قرض بنا دیتی ہے اور یہ قرض سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کو تیز کر کے ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ قرض ان نسلوں کا بھی ہے جنہوں نے سال ہا سال کی محنت کے بعد آج کی دنیا کو اس قابل بنایا کہ جس میں سوشلزم کا ظہور ممکن ہو سکے۔ یہ آج کی اس نسل کا بھی قرض ہے جو آج سوشلزم کے امکانات کے باوجود اس عذاب و اذیت میں سسک رہی ہے۔ ہم پر یہ قرض آنے والی ان نسلوں کا بھی ہے کہ جن کا وجود اور جنم سوشلسٹ انقلاب کے بغیر شاید ممکن نہ ہو سکے گا۔

لال خان

لاہور۔ نومبر 1999ء

عرض مصنف

اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں ان سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے اس کتاب کے لکھنے اور شائع کرنے کے سلسلے میں کسی بھی طور پر میری معاونت کی ہے۔ میں ایلن ووڈز کا بالخصوص احسان مند ہوں جو بہت سالوں سے میرے قریبی سیاسی رفیق ہیں۔ ان کی انتھک محنت اور تعاون کے بغیر اس کتاب کو کبھی دن کی روشنی دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔ اگرچہ اس کتاب پر بطور مصنف میرا نام درج ہے لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے مندرجہ ذیل وضاحت ضرور کرنی چاہیے۔ ایلن اور میرے درمیان ایک انتہائی قریبی اور لاثانی عملی اور ادبی تعلق پیدا ہو چکا ہے۔ موجودہ کتاب کی اشاعت کی تیاری میں ان کا کام ترویج سے کہیں بڑھ کر ہے۔ انہوں نے اس کتاب کی اشاعت میں قابل قدر حصہ لیا ہے اور ان کی اس شرکت کے باعث میں اس کتاب کو مشترکہ کاوش خیال کرتا ہوں۔

میں راب سیول کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے ابتدائی مواد کو جمع کرنے، تحقیق اور ترویج کے سلسلے میں زبردست محنت کی ہے۔ میں سونورس، سٹیو جونز، مک بروکس، مائیکل رابرٹس اور ٹریسی ہاؤٹن کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے پروف ریڈنگ کے علاوہ اپنے قیمتی مشوروں اور تبصروں سے نوازا۔ میں السٹر ولسن کا بھی شکرگزار ہوں جنہوں نے اس کتاب (1997ء کے پہلے انگریزی ایڈیشن) کا سرورق ڈیزائن کیا ہے۔

اس موقع پر میں روس کی موجودہ صورتحال کے بارے میں رنفرے کلارک اور فریڈ ویر کی رپورٹوں پر مشتمل اس گرانقدر مواد کیلئے بھی اظہار تشکر کرنا چاہتا ہوں جس سے میں نے اس کتاب کے آخری حصے

میں جا بجا استفادہ کیا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے کہ میں وسیوولود والکوف کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ممنون ہوں جنہوں نے نہ صرف اپنے تبصروں سے نوازا بلکہ اس کتاب کا پیش لفظ بھی تحریر کیا۔ وسیوولود نے اپنے نانا لیون ٹراٹسکی کی سیاسی بحالی کیلئے انتہائی شدومد سے مہم چلائی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب حقیقی مارکسزم کو دوبارہ استوار کرنے میں اپنا حصہ ادا کرے گی۔ جس جدوجہد کیلئے ٹراٹسکی نے اپنی تمام عمر وقف کر دی تھی۔

انگریزی ایڈیشن کا پیش لفظ

ایک ایسے وقت میں ''روس: انقلاب سے ردّ انقلاب تک'' کی اشاعت انتہائی برمحل ہے جب مزدور طبقے کی وسیع پرتیں اور بالعموم بایاں بازو نشانِ راہ گم کر چکا ہے اور تذبذب کا شکار ہے۔ یہ کتاب انقلابی مارکسی فکر کی درستگی کی شاندار مثال ہے ان مایوسیوں، رخنوں اور غلطیوں کے باوجود، جو کچھ لوگ مارکسزم سے منسوب کرتے ہیں یہ ایک حقیقت ہے کہ اب تک کسی اصول یا نظریے میں وہ ضروری درستگی، تجزیاتی صراحت اور تشریح نہیں پائی جاتی جو ہمارے مشاہدے میں آنے والے تاریخی واقعات کی وضاحت کر سکے، سب سے بڑھ کر سوویت یونین اور دیگر ممالک جہاں ذرائع پیداوار کی ریاستی ملکیت کا نظام موجود تھا اور یقیناً سرمایہ دار ممالک میں پیش آنے والے واقعات بھی۔۔۔ سو سال سے بھی زیادہ عرصے سے سرمایہ دار اور ان کے معذرت خواہ مارکسزم کو نقصان پہنچانے اور دفن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن یہ مسلسل مہم مارکسزم کی غیر معمولی طاقت اور انقلابی قوت کو ثابت کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مزدور طبقے کے دشمنوں اور آزاد منڈی کے حامیوں کو بیسویں صدی کے اس سب سے بڑے جھوٹ کا

ساتھ دینے کا سنہری موقع ہاتھ آیا جب سٹالن نے اس سفلی اور مسخ شدہ مزدور ریاست کو ''سوشلسٹ'' اور ''کمیونسٹ'' بنا کر پیش کیا جس میں سٹالنسٹ خونی ردّ انقلاب کے نتیجے میں ذرائع پیداوار کی ریاستی ملکیت اور نوکر شاہانہ مطلق العنانی یکجا ہو گئے تھے۔

موجودہ کاوش ہمیں جدلیاتی مادیت کی غیر معمولی وسعت اور گہرائی کا احساس دلاتی ہے جو تاریخی اور سماجی و معاشی عوامل کا احاطہ ان کے بہاؤ میں کرتی ہے جس سے ہم اس کی جاندار قوت متحرکہ کے قریب تر ہونے کے قابل ہوتے ہیں اور حقیقت کی بے ضابطہ اور جامد شبیہوں سے دھوکہ نہیں کھاتے۔ موجودہ کتاب کے صفحات پر ہمیں مصنف کا مارکسی نظریے کا گہرا علم اور خاص طور پر ٹراٹسکی کے خیالات اور تحریریں لپکتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ علم ایک ایسی عمر طویل کا ثمر ہے جس کا ہر لمحہ مارکسزم کے نظری اور روزمرہ عمل کے باریک بینی سے کیئے گئے مطالعے سے عبارت ہے۔

ٹیڈ گرانٹ مارکسزم کیلئے روسی انقلابی لیون ٹراٹسکی کی عظیم خدمات کا تفصیلی ذکر کرتا ہے۔۔خاص طور پر سٹالنزم کے بوناپارٹسٹ نوکر شاہانہ نظام حکومت کا باریک بینی سے کیا گیا تجزیہ اور تعبیر و تفسیر۔۔۔اور یہ ثابت کرتا ہے کہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ قبل ٹراٹسکی کا ''انقلاب سے غداری'' میں پیش کیا گیا تھیسز کس طرح نام نہاد سوشلسٹ اور سابق سوشلسٹ ممالک میں ہونے والے حالیہ تاریخی واقعات سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ ٹراٹسکی نے نشان دہی کی تھی کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کی درمیانی حالت کی حیثیت سے سوویت یونین کی تقدیر کا فیصلہ مزدور طبقے اور نوکر شاہی ٹولے کے درمیان موجود طاقتوں کے رشتے سے متعین ہوگا۔ اگر آخرالذکر اقتدار میں رہتا ہے تو وہ یقیناً ان ممالک میں سرمایہ داری نظام کو بحال کرنے کی کوشش کرے گا جہاں قومی منصوبہ بند معیشت موجود ہے۔ دوسری طرف اگر مزدور طبقہ سیاسی انقلاب برپا کرتا ہے جو اقتدار کو اس کے ہاتھوں میں منتقل کر دے تو سرمایہ داری کی طرف واپسی کا راستہ رک جائے گا اور سوویت یونین اکتوبر انقلاب کے بنیادی راستے کی طرف واپس مڑ کر حقیقی سوشلزم کی راہ اختیار کرے گا جس میں منصوبہ بند سماج کا انتظام جمہوری انداز میں ہوگا اور اس میں طفیلی طبقات کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

ابھی تک روس کے مستقبل کا فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ سکہ ہوا میں گھوم رہا ہے۔ تاہم جدید دور میں تاریخی عمل کی مستقل شکستوں کی مثالوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے۔ سٹالنسٹ نوکر شاہی کا ردّ انقلاب کھلے سمندر میں قزاقوں کے حملے کی طرح تھا۔ انقلاب کے جہاز پر سوار ہو کر اسے اغواء کر لیا گیا اور تمام عملے کو

موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ خودساختہ عظیم ناخدا سٹالن اور اس کے غاصب ساتھیوں پر مشتمل عملے نے ایک بالکل نیا راستہ اپنایا۔ شکستوں، غداریوں اور مارکسزم سے انحراف کا راستہ، جس پر چل کر جہاز کا تباہ ہونا یقینی تھا۔

سابق سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ، انتشار اور بدعنوان، نااہل اور خوانخوار سٹالنسٹ نظام حکومت کے مکمل دیوالیہ پن کو مارکسزم اور سوشلزم سے منسلک کرنا ایک ایسا ننگا جھوٹ ہے جس کا براہ راست تعلق اس بے رحمانہ طبقاتی کشمکش سے ہے جو سامراجیوں نے اور سٹالنسٹ حکومتوں کے بعد قائم ہونے والی غیر مستحکم نوکرشاہیوں نے استحصال زدہ عوام کیخلاف شروع کر رکھی ہے۔ سٹالن ازم کے انہدام نے مارکسزم کو قطعاً کمزور نہیں کیا۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ روس کے مزدور طبقے کو اس سیاسی خلفشار اور دھند سے باہر نکالنے میں مدومعاون ثابت ہوگا جس میں سٹالن ازم کی نوکرشاہانہ آمریت کی ستر سال سے جاری تاریخی دروغ گوئی نے انہیں غرق کر رکھا تھا۔ عوام کو ضروری نتائج اخذ کرنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا۔ وہ ناگزیر طور پر سبق حاصل کرینگے۔ تحریک متوقع طور پر یوں ابھر سکتی ہے جیسے سوکھی ہوئی گھاس کے میدانوں میں آگ، جسے ہوا مزید تیز کرتی ہے۔ عوام کو جلد ہی آزاد منڈی اور مافیا سرمایہ داری کے ''معجزوں'' کی حقیقت معلوم ہو جائے گی جو سٹالنسٹوں کے بعد آنے والی نوکرشاہی کے تحت پنپ رہی ہے۔ سابق سوویت یونین کا مزدور طبقہ جلد ہی اس جرأت مندانہ جدوجہد کے معانی اور اہمیت سے واقف ہو جائے گا جو لیون ٹراٹسکی نے روسی انقلاب کی قبر کھودنے والوں اور غاصبوں کیخلاف کی تھی۔ وہ ایک پارٹی کی ریاست اور طفیلی نوکرشاہیوں کو مسترد کرتے ہوئے مزدور طبقے کے جمہوری انتظام کے تحت حقیقی سوشلزم کی راہ ایک بار پھر اختیار کرینگے۔ آج ہمیشہ سے بڑھ کر اس کرہ ارض کے باشندوں کی اکثریت کے سامنے صرف دو راستے ہیں۔۔۔ سوشلزم یا بربریت لیکن راستہ صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے سوشلزم۔۔۔!

وسیوولودوالکوف

میکسیکوسٹی مارچ 1997ء

مقدمہ کتاب

"بالشوازم کے بارے میں کسی کی چاہے جو بھی رائے ہو، یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ روسی انقلاب انسانی تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک تھا اور بالشویکوں کا اقتدار ایک عالمی اہمیت کا مظہر تھا"۔(1)

جان ریڈ، جنوری 1919ء

تاریخ عالم میں ایسے لمحات آتے ہیں جو فیصلہ کن موڑوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہم ایک ایسے ہی سنگم پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ چاہے آپ اکتوبر انقلاب کے حق میں ہیں یا خلاف، اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اس واحد واقعہ نے عالمی تاریخ کے رخ کو یوں موڑ دیا کہ پہلے کبھی نہیں موڑا گیا تھا۔ بیسویں صدی کی ساری تاریخ پر اس کے نتائج کا غلبہ رہا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف انتہائی قدامت پسند مبصر اور اکتوبر انقلاب کے مخالفین بھی کرتے ہیں۔ اب سٹالن ازم کا انہدام اور وقت کے پہیے کو 80 سال پیچھے لے جانے کی کوشش بھی اس سے کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ ان عظیم واقعات کی فرد میزان کیا ہے؟ انسانیت کے مستقبل کیلئے ان میں کیا مضمرات ہیں؟ اور ان سے کیا نتائج اخذ کئے جانے چاہئیں؟

تین نسلوں تک سرمایہ داری کے معذرت خواہوں نے سوویت یونین پر اپنا غصہ نکالا۔ اکتوبر

انقلاب کے نام کواوراس کے نتیجے میں پیدا ہونیوالی قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں رکھا گیا۔اس مہم میں سٹالن ازم کے جرائم بہت معاون ثابت ہوئے ہیں۔ چالاکی یہ دکھائی گئی کہ سوشلزم اور کمیونزم کوایک پس ماندہ ملک تک محدود رہ جانے والے انقلاب سے نمودار ہونے والی نوکر شاہانہ آمریت کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔لیکن یہ بہتان بے بنیاد ہیں۔اکتوبر انقلاب کے بعد وجود میں آنے والا نظام حکومت نہ تو آمرانہ تھا اور نہ ہی نوکر شاہانہ بلکہ اس سے زیادہ جمہوری نظام حکومت روئے زمین پر پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ایک ایسا نظام حکومت جس میں پہلی بار کروڑوں کی تعداد میں عام مرد وزن نے اپنا استحصال کرنے والوں کا تختہ الٹا، اپنا مقدر اپنے ہاتھ میں لیا اور کم ازکم سماج کو تبدیل کرنے کے فریضے کی ابتدا کر دی۔ یہ بات، کہ مخصوص حالات کے تحت اس فریضے کوایسی راہوں پر لگا دیا گیا جنہیں انقلاب کے قائدین قبل از وقت نہیں دیکھ پائے تھے،اکتوبر کے تصورات کو غلط ثابت نہیں کرتی اور نہ ہی اس سے سوویت یونین میں پچھلے ستر سالوں میں ہونے والی زبردست ترقی کی اہمیت کو کم کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام حضرات کی روس کیخلاف نفرت کو سمجھنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے جن کی ملازمتیں، تنخواہیں اور منافع اس رائج نظام کے طفیل ہیں جو کرائے،سود اور منافع کی بنیاد پر قائم ہے۔اس کا سٹالن کے آمرانہ نظام حکومت سے کوئی واسطہ نہیں۔ انہی ''جمہوریت کے دوستوں'' کو آمرانہ حکومتوں کی تعریف کرتے ہوئے کوئی شرم نہیں آتی تھی جب ان کے مفادات کیلئے وہ سودمند ہوتی تھیں۔ برطانیہ کا ''جمہوری'' برسر اقتدار طبقہ ہٹلر کو اقتدار میں آتے دیکھ کر اس وقت تک خوش تھا جب تک وہ جرمن مزدوروں کو دبا تا رہا اور انہوں نے اپنی توجہ مشرق کی طرف مبذول رکھی۔انہی لوگوں نے مسولینی اور فرانکو کے لئے 1939ء تک زبردست تعریف و توصیف کا اظہار کیا۔

1945ء کے بعد کے دور میں مغربی ''جمہوریتوں'' نے،جن میں امریکہ سرفہرست تھا سرگرمی سے سوموزا اور پنوشے سے لیکر ارجنٹائن کی جنتا اور سوہارتو سمیت ہر خوفناک آمریت کا ساتھ دیا جب ان کی بنیاد زمین کی ذاتی ملکیت،بینکوں اور بڑی اجارہ داریوں پر ہوتی تھی۔

لہٰذا ان کے سوویت یونین کیخلاف جارحانہ رویے کی بنیاد آزادی کیلئے محبت پر نہیں بلکہ ننگے طبقاتی مفاد پر تھی۔ان کی سوویت یونین کیخلاف نفرت اس کی خرابی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس چیز کیخلاف تھی جو اس میں مثبت اور ترقی پسندانہ تھی۔ وہ سٹالن کی آمریت پر اعتراض نہیں کرتے تھے (اس کے برخلاف

سٹالن ازم کے جرائم ان کے حق میں تھے جن کے ذریعے وہ آسانی سے مغرب میں سوشلزم کا نام بدنام کر سکتے تھے) بلکہ ان کا اعتراض قومیائی گئی ملکیت کی شکلوں پر تھا جو اکتوبر انقلاب کی حاصلات کی باقیات تھیں، یہ خطرناک تھی۔ انقلاب نے فوری طور پر ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت کو ختم کر دیا تھا۔ تاریخ میں پہلی بار قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی نمو پذیری نظری طور پر نہیں بلکہ عملاً ثابت کی گئی تھی۔ کرہ ارض کے چھٹے حصے پر ایک عظیم الشان اور پہلا تجربہ، جس نے ثابت کیا کہ سماج کو سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سود خوروں کے بغیر چلانا ممکن ہے۔

آج کل اس کے نتائج کو حقیر بنا کر پیش کرنا یا بالکل مسترد کر دینا فیشن میں داخل ہے۔ تاہم اگر حقائق پر ذرا سی نگاہ رکھی جائے تو ہم ایک بالکل مختلف نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ تمام تر مسائل، خامیوں اور جرائم کے باوجود (برسبیل تذکرہ سرمایہ داری نظام کی تاریخ ہمیں یہ سب چیزیں باافراط مہیا کرتی ہے) روس کے اندر قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت نے تاریخی اعتبار سے ایک نہایت قلیل عرصے میں شاندار پیش رفت کی۔ اسی چیز نے مغرب کے حکمران طبقات کے نفرت اور خوف سے بھرپور رویے کو مہمیز دی تھی۔ یہی چیز ہے جو آج بھی انہیں ماضی کے بارے میں انتہائی شرمناک اور بے مثل دروغ گوئیوں اور بہتان تراشیوں پر مجبور کرتی ہے۔

بورژوازی کیلئے اکتوبر انقلاب کو ہمیشہ کیلئے دفن کر دینا ضروری ہے۔ نتیجتاً دیوار برلن کے گرتے ہی روس اور مشرقی یورپ میں منصوبہ بند معیشت کی حاصلات کیخلاف پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کر دیا گیا۔ ''کمیونزم'' کیخلاف سرمایہ کی حکمت عملیاں طے کرنے والوں کا نظریاتی حملہ ایک سوچی سمجھی کوشش تھی جس کا مقصد انقلاب سے حاصل ہونے والی تاریخی فتوحات کو مسترد کرنا تھا۔ ان خواتین و حضرات کے نزدیک 1917ء کا اکتوبر انقلاب ایک تاریخی انحراف تھا۔ ان کے خیال میں سماج کی صرف ایک ہی ممکنہ شکل ہے۔

ان کی نظر میں سرمایہ داری ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ لہٰذا قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی حاصلات کے بارے میں تو کبھی بات ہی نہیں ہو سکتی۔ روسی اعداد و شمار کے بارے میں یہی کہا جاتا رہا کہ وہ یا تو غلط ہیں یا انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔

''اعداد و شمار جھوٹ نہیں بول سکتے مگر جھوٹے لوگ حساب کتاب لگا سکتے ہیں۔'' تعلیم، صحت اور سماجی بہبود کے سلسلے میں زبردست پیش رفت کو جھوٹ اور مسخ شدہ حقائق کے آبشار تلے چھپا دیا گیا جس کا مقصد ماضی کی حقیقی حاصلات کو مٹانا تھا۔ سوویت زندگی کی خامیوں کو۔۔ اور یہ اچھی خاصی تھیں۔۔۔

خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے تا کہ یہ ''ثابت'' کیا جاسکے کہ سرمایہ داری کا کوئی نعم البدل نہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ پیش رفت کی بجائے زوال پذیری ہوئی تھی۔ ترقی کی بجائے تنزلی ہوئی تھی، معاشی تاریخ دان ایلک نووی تحریر کرتا ہے کہ ''دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسّی کی دہائی میں سوویت یونین 1913ء کی روسی سلطنت کی نسبت امریکہ سے کہیں پیچھے تھا'' آخر میں وہ کہتا ہے ''اعداد و شمار کی ہیرا پھیری نے سوویت نظام کو جواز سے عاری بنانے میں سیاسی کردار ادا کیا ہے۔''(2)

تاریخ کے اس طرح مسخ کیئے جانے سے ہمیں بڑی شدت سے سٹالنسٹ نوکرشاہی کے پرانے ہتھکنڈوں کی یاد آتی ہے جس نے تاریخ کو سر کے بل کھڑا کر کے نمایاں شخصیات کو عفریتوں یا گمنام ہستیوں میں تبدیل کر دیا تھا جیسا کہ لیون ٹراٹسکی کے سلسلے میں ہوا اور ویسے بھی عام طور پر سیاہ کو سفید قرار دینا اس کا شیوہ تھا۔ سوشلزم کے دشمنوں کی حالیہ تحریریں بھی اس سے کچھ مختلف نہیں فرق صرف اتنا ہے کہ یہ لوگ لینن کے بارے میں ویسی ہی اندھی نفرت اور منتقم مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو سٹالنسٹ حضرات نے ٹراٹسکی کیلئے مخصوص کر رکھی تھی۔ اس کی بدترین مثالیں ہمیں روس میں ملتی ہیں۔ مختلف وجوہات کی بناء پر ہمیں اس پر حیرت زدہ نہیں ہونا چاہیے: اول تو یہ لوگ دروغ گوئی کے سٹالنسٹ مدرسے کے فارغ التحصیل ہیں جس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ سچائی محض حکمران ٹولے کی خدمات کا ایک اوزار ہے۔

چند قابلِ احترام استثنیات سے قطع نظر پروفیسر، معیشت دان اور تاریخ دان اپنی تحریروں کو مروجہ ''لائن'' سے ہم آہنگ کرنے کے عادی تھے۔ وہی دانشور جو اکتوبر انقلاب کے لیڈر اور سرخ فوج کے بانی کی حیثیت سے ٹراٹسکی کے قصیدے گاتے تھے چند برس بعد اس کی مذمت ہٹلر کے ایجنٹ کے طور پر کرتے ہوئے ضمیر کے ہاتھوں ذرا بھی پریشان نہیں ہوئے۔ وہی لکھاری جو جوزف سٹالن کو عظیم راہنما اور استاد قرار دیتے تھے فوراً ہی منہ پھیر گئے جب خروشیف نے شخصیت پرستی کے رجحان کو دریافت کیا۔ عادتیں بہت مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ دانشورانہ عصمت فروشی کے طریقے وہی ہیں صرف مالک تبدیل ہوا ہے۔ ایک اس سے بالکل مختلف وجہ بھی ہے۔

موجودہ نوزائیدہ سرمایہ داروں میں سے بہت سے بذات خود پرانی اشرافیہ کے رکن تھے، زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ان لوگوں کی جیبوں میں کمیونسٹ پارٹی کا کارڈ ہوتا تھا اور وہ ''سوشلزم'' کے نام پر گفتگو کرتے تھے۔ درحقیقت ان کا سوشلزم، کمیونزم یا مزدور طبقے سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ وہ ایک طفیلی حکمران ٹولے کا حصہ تھے جو سوویت مزدوروں کی پیٹھ پیچھے عیاشی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ اب اسی خودغرضانہ

جبلت کے تحت جو ایسے عناصر کا خاصہ ہوتی ہے یہ کھلم کھلا سرمایہ داری کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔لیکن یہ معجزہ نما تبدیلی اتنی آسانی سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ یہ لوگ اپنے انحراف کا جواز پیدا کرنے کیلئے ان عقائد کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانا ضروری خیال کرتے ہیں جن پر مکمل یقین کا وہ کل تک اعتراف کرتے تھے۔ان طریقوں سے وہ عوام کی آنکھوں میں دھول جھونکتے اور اپنے ضمیروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ ان کے پاس ضمیر جیسی کوئی شے موجود ہے حالانکہ اس کا امکان بہت کم ہے لیکن بدترین بدمعاش بھی اپنے اعمال کا جواز تلاش کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔

ضروری ہے کہ دروغ گوئی اور بہتان تراشی کی اس بے نظیر مہم کیخلاف ہم تصویر کا صحیح رخ پیش کریں۔ ہم قاری پر اعداد و شمار کا ضرورت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ تاہم منصوبہ بند معیشت کی زبردست پیش رفت پر سے شکوک وشبہات کے بادل ہٹانا ضروری ہیں۔نوکرشاہی کے خوفناک جرائم کے باوجود سوویت یونین کی بے مثال ترقی صرف تاریخی پیش رفت کو ہی ظاہر نہیں کرتی بلکہ سب سے بڑھ کر یہ ان زبردست امکانات کی جھلک پیش کرتی ہے جو قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت میں پوشیدہ ہیں خصوصاً اگر اسے جمہوری انداز میں چلایا جائے۔

یہ موجودہ دور میں روس اور مشرقی یورپ کی پیداواری قوتوں کے ہولناک انہدام کے مقابلے میں ایک مکمل تضاد کو پیش کرتی ہے۔ سرمایہ داری کی جانب پیش رفت ایک ڈراؤنا خواب ہے جس نے نہایت قلیل عرصے میں آبادی کی اکثریت کو غربت کی دلدل میں دھکیل دیا ہے۔

ہمیشہ کی طرح حکمران طبقے کیلئے محض کسی انقلاب کو شکست دینا ہی کافی نہیں ہے۔اسے مردہ کتوں کے ڈھیر تلے دبانا بھی لازم ہے تاکہ نئی نسلوں کو متاثر کرنے کیلئے اس کی یاد بھی باقی نہ رہے۔اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ 1660ء میں مطلق العنانی کی بحالی کے بعد برطانوی بورژوازی کے انقلاب کی یاد کو بھی اسی طرح اجتماعی یادداشت سے مٹانا پڑا تھا۔ سرکاری طور پر چارلس دوئم کی بادشاہت کا دور 30 جنوری 1649ء سے شمار کیا جاتا تھا جب چارل اول قتل ہوا تھا۔اس کے علاوہ ریپبلک اور اس کے انقلابی کاموں کے بارے میں حوالہ جات کو ختم کیا گیا۔کم ظرف چارلس دوئم انتقام کی رو میں اتنا بہہ گیا کہ اس نے اولیور کرامویل کی قبر کو کھدوا کر لاش نکلوائی اور اسے ٹیوبرن کے مقام پر سرعام پھانسی کے پھندے سے لٹکایا۔خوف سے پیدا شدہ اسی قسم کی نفرت اور کمینگی کا جذبہ ان حالیہ کوششوں کے پس منظر میں بھی کارفرما ہے جو روسی انقلاب کی انقلابی اہمیت اور حاصلات کو دفن کرنے کیلئے کی جارہی ہیں۔

بورژوازی کی طرف سے تاریخ کو مسخ کرنے کی حالیہ منظم کوشش اگرچہ برطانوی مطلق العنان بادشاہوں کے مردوں کو پھانسی پر لٹکانے کی نسبت قدرے زیادہ نفیس ہے مگر اخلاقی اعتبار سے ان سے کسی طرح اعلیٰ نہیں۔ آخر کار یہ بھی ان سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوگی۔ انسانی ترقی کا خودکار انجن ایک سچائی ہے، جھوٹ کا پلندہ نہیں اور سچائی ہمیشہ دفن نہیں رہ سکتی۔

بے نظیر پیش رفت

سوویت یونین میں جو کچھ ہوا اس کی وضاحت صرف تجزیے کا مارکسی طریقہ استعمال کرتے ہوئے ہی کی جاسکتی ہے۔ کارل مارکس اور اینگلز پہلے ہی کمیونسٹ مینی فیسٹو میں بیان کر چکے ہیں کہ انسانی تاریخ کی قوت متحرکہ پیداواری قوتوں کی ترقی ہے۔ اس نقطہ نظر سے روس کی قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت نے اپنی غیر معمولی قوت کا ثبوت کئی دہائیوں تک فراہم کیا۔ حقیقتاً کایا پلٹنے کی ایسی کوئی نظیر انسانی تاریخ کے اوراق میں کہیں نہیں ملتی۔

صرف مارکسسٹ ہی روس میں رونما ہونے والے عوامل کی وضاحت کرنے کے اہل تھے اور وہ بھی ان کے رونما ہونے کے بعد نہیں بلکہ کئی دہائیاں پہلے۔ اس کے برعکس سوویت یونین کے بورژوا ناقدین اور انکے سٹالنسٹ دوست ہر قسم کی سمجھ بوجھ سے قطعاً عاری تھے۔ وہ قطعی طور پر مخالفانہ نقطہ ہائے نظر کے باوجود ایک ہی غلط نتیجے پر پہنچے تھے کہ سوویت یونین میں سٹالنسٹ نظام حکومت کی تباہی تقریباً ناممکن ہے اور اس کے ایک طویل عرصے تک قائم و دائم رہنے کا امکان ہے۔

دوسری جنگ عظیم سے بھی پہلے جب اکثر سرمایہ دار نجومیوں اور سٹالن کے معذرت خواہوں کو روسی نظام حکومت کی زرہ بکتر میں کوئی سوراخ نظر نہیں آتا تھا لیون ٹراٹسکی (بالشویک لیڈر جسے سٹالن نے جلا وطن کر دیا تھا) یہ دلیل دیتا تھا کہ سٹالن ازم کا تختہ یا تو مزدور طبقے کے سیاسی انقلاب کے ذریعے الٹا جاسکتا ہے یا بعض صورتوں میں یہ سرمایہ داری کی طرف بھی پلٹ سکتا ہے۔ اگرچہ مارکسسٹوں نے سٹالن ازم کے بحران کو بہت پہلے دیکھا اور اس کی وضاحت بھی کی لیکن کسی ذہین ترین انسان کیلئے بھی یہ پیش گوئی کرنا ممکن نہیں تھا کہ یہ بحران کس طرح ظاہر ہوگا۔ ہمیں اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

جرمن شاعر گوئٹے نے ایک بار لکھا تھا ''میرے دوست، نظریہ سرمئی ہوتا ہے مگر شجر حیات سدا بہار ہے۔'' تاریخی عمل کا حقیقی اظہار انتہائی پیچیدہ ہوتا ہے اور جسے مارکسسٹ ''داخلی عامل'' کہتے ہیں، یعنی انسانوں کی شعوری مداخلت، انتہائی اہمیت کا حامل عنصر ہوتا ہے۔ تاریخی عمل کے ارتقا کی تفصیلات کے بارے پیش گوئی کرنے کیلئے صرف سائنسی پیش منظر ہی نہیں بلکہ جام جمشید کی بھی ضرورت ہوگی لیکن بدقسمتی سے تمام تر سائنسی ترقی کے باوجود یہ ہمیں ابھی تک دستیاب نہیں ہے۔

بدترین معاشی، سماجی اور ثقافتی پس ماندگی کے زیر اثر لینن اور ٹراٹسکی کی قائم کردہ مزدوروں کی جمہوریت کی جگہ سٹالن کی خوفناک حد تک مسخ شدہ مزدور ریاست نے لے لی۔ یہ ایک زبردست پسپائی تھی جو مزدور طبقے کی سیاسی قوت کے خاتمے کو ظاہر کرتی تھی مگر اس سے اکتوبر انقلاب کی بنیادی سماجی و معاشی حاصلات اور نئے ملکیتی رشتوں کا خاتمہ نہیں ہوا جس کا واضح ترین اظہار قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت تھی۔ نئے پیداواری نظام کے قابل عمل ہونے کا سخت ترین امتحان 45-1941ء میں ہوا جب نازی جرمنی نے سارے یورپ کے وسائل کی پشت پناہی سے سوویت یونین پر حملہ کیا تھا۔

27 ملین جانوں کے نقصان کے باوجود سوویت یونین ہٹلر کو شکست دینے میں کامیاب رہا اور 1945ء کے بعد ایک قلیل عرصے کے اندر اپنی شکستہ معیشت کی تعمیر نو کر کے دنیا کی دوسری عظیم طاقت بن گیا۔ 1917ء میں ایک پسماندہ، نیم جاگیردارانہ اور زیادہ تر ان پڑھ لوگوں پر مشتمل ملک سے ترقی کر کے سوویت یونین ایک جدید ترقی یافتہ ملک بن گیا جس میں دنیا کے سائنس دانوں کی ایک چوتھائی تعداد موجود تھی، صحت اور تعلیم کا ایسا نظام جو مغرب کے کسی ملک کے برابر یا اعلیٰ تر تھا، اس نے پہلا خلائی سیارہ چھوڑا اور پہلے انسان کو خلا میں بھیجا۔

موجودہ بھارت سے بھی زیادہ پس ماندہ ملک کی سطح سے شروع ہو کر کسی ملک کا ایسی حیران کن پیش رفت کرنا ہمیں دعوت فکر دیتا ہے۔ کسی کو بالشویک انقلاب کے آئیڈیل سے ہمدردی یا اختلاف ہوسکتا ہے مگر اتنے قلیل عرصے میں ایسی کایا پلٹ دنیا بھر کے باشعور لوگوں کی توجہ کی مستحق ہے۔ بلاشبہ، سٹالنزم کے انہدام کو اب ہر جگہ سوشلزم کے دشمن اس حتمی ''ثبوت'' کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ قومی ملکیت اور منصوبہ بندی ناکام ہو چکی ہے لہٰذا نسل انسانی کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ''منڈی'' کے قوانین کے غلبے سے سمجھوتہ کر لینا چاہیے، دراصل فرانسس فوکویاما کے مشہور زمانہ تھیسس ''تاریخ کے خاتمے'' کا حقیقی پیغام یہی ہے۔ تاہم مارکسی حوالے سے تاریخ کا خاتمہ نہیں ہوا اور سرمایہ داری کا مستقبل اس سے زیادہ محفوظ نہیں جتنا دیوار برلن

کے گرنے سے قبل تھا۔ درحقیقت یہ اس سے کہیں کم محفوظ ہے۔

پچاس سال کے عرصے میں سوویت یونین نے اپنی مجموعی داخلی پیداوار میں نو گنا اضافہ کیا۔ دوسری جنگ عظیم کی زبردست تباہی کے باوجود 1945ء سے 1979ء تک اس کی جی ڈی پی میں پانچ گنا اضافہ ہوا۔ 1950ء میں روس کی جی ڈی پی امریکہ کے مقابلے میں 33 فیصد تھی۔ 1979ء تک یہ 58 فیصد ہو چکی تھی۔ 1970ء کی دہائی کے آخر تک سوویت یونین ایک زبردست صنعتی قوت بن چکا تھا جسے مجموعی طور پر باقی دنیا کے مقابلے میں کئی کلیدی شعبوں میں نمایاں برتری حاصل تھی۔ سوویت یونین امریکہ کے بعد صنعتی پیداوار میں دوسرے نمبر پر تھا اور تیل، فولاد، سیمنٹ، ایسبٹاس، ٹریکٹر اور بہت سی مشینیں بنانے والا سب سے بڑا ملک تھا۔ ساری دنیا روس کے خلائی پروگرام پر رشک کرتی تھی۔

یہ اعداد و شمار پیش رفت کو مکمل طور سے بیان نہیں کرتے۔ یہ سب کچھ فی الحقیقت بے روزگاری یا افراطِ زر کے بغیر حاصل کیا گیا تھا۔ مغرب جیسی بیروزگاری کا سوویت یونین میں کہیں وجود نہ تھا۔ دراصل یہ ایک قانونی جرم تھا۔ (مزے کی بات ہے کہ یہ قانون اور آئین کی کتابوں میں اب بھی موجود ہے حالانکہ اب یہ بے معنی ہے)۔ ایسی مثالیں شاید مل جائیں جب افراد کو سستی، کاہلی یا حکمرانوں سے جھگڑے کے نتیجے میں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑے ہوں۔ مگر ایسی باتوں کا قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت سے براہ راست تعلق نہیں بنتا اور ان کا واقع ہونا غیر ضروری تھا۔ یہ سرمایہ داری کے بیروزگاری کے چکر کی طرح نہیں تھی اور نہ ہی اس نامیاتی ناسور کی طرح تھی جس سے تمام مغربی دنیا متاثر ہے اور جس نے صرف او ای سی ڈی کے ممالک میں 35 ملین انسانوں کو جبری بیکاری کی زندگی گزارنے پر مجبور کر رکھا ہے۔

علاوہ ازیں جنگ کے بعد کے عرصے میں افراطِ زر یا تو بالکل نہیں تھا یا نہایت کم تھا۔ نوکر شاہی کو ٹراٹسکی کی اس تنبیہ کی سچائی معلوم تھی کہ ''افراط زر منصوبہ بند معیشت کیلئے آتشک کی طرح ہے۔'' دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور میں انہوں نے افراط زر کو قابو رکھنے کو یقینی بنایا۔ بنیادی اشیائے صرف کی قیمتوں کے سلسلے میں خاص طور پر یہی صورت حال تھی۔ پریسترائیکا سے قبل گوشت اور ڈیری مصنوعات کی قیمتوں میں آخری بار 1962ء میں اضافہ ہوا تھا۔ روٹی، چینی اور دوسری اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں آخری دفعہ 1955ء میں اضافہ ہوا تھا۔ کرائے بہت کم تھے خاص طور پر جب ہم مغرب سے موازنہ کرتے ہیں جہاں اکثر مزدوروں کو رہائش کیلئے اپنی تنخواہ کا ایک تہائی یا اس سے زیادہ حصہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ صرف آخری دور میں جب پریسترائیکا کا انتشار شروع ہوا تو اس میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوگئی۔ اب منڈی کی

معیشت کی طرف دوڑ سے بیروزگاری اور افراط زر اتنی اونچی سطح کو پہنچ گئے ہیں جو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھے گئے۔

سوویت یونین کا بجٹ متوازن ہوتا تھا بلکہ ہر سال تھوڑا سا زائد بھی ہوتا تھا۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ایک بھی مغربی حکومت ایسا نتیجہ حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی (جیسا کہ ماسٹریخت معاہدے کی شرائط سے ثابت ہوتا ہے) اسی طرح وہ مکمل روزگار اور افراطِ زر کی صفر شرح کے حصول میں ناکام رہی ہیں جبکہ سوویت یونین نے اس کا حصول ممکن بنایا۔ مغربی نقادوں نے اس بارے میں چپ سادھے رکھی کیونکہ سوشلزم تو ایک طرف رہا یہ سب کچھ ایک ایسی معیشت کے امکانات کا مظہر تھا جس کی نوعیت محض عبوری تھی۔ اب جبکہ روسی عوام سرمایہ داری کے نمونے سے لطف اندوز ہو رہے ہیں تو انہیں پتہ چل رہا ہے کہ ایک بہت بڑا اور بے قابو بجٹ کا خسارہ کیا ہوتا ہے، دوسرے الفاظ میں یہ کہ کئی کئی مہینوں تک تنخواہیں ادا نہیں ہو پاتیں۔

بلاشبہ بنیادی سوال یہ ہے کہ سوویت یونین کیوں ٹوٹا۔ مصنف نے پورے عمل کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح 1965ء کے بعد کے عرصے میں سوویت معیشت کے فروغ کی شرح کم ہونا شروع ہوگئی تھی۔ 1965ء سے 1970ء کے درمیان یہ شرح 5.4 فیصد تھی۔ اگلے سات سال کے عرصے کے دوران یعنی 1971ء سے 1978ء کے درمیان اضافے کی اوسط شرح محض 3.7 فیصد رہ گئی تھی یہ او ای سی ڈی کے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی اوسط شرح 3.5 فیصد کے ہم پلہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں سوویت یونین کی شرح ترقی سرمایہ داری کے تحت ہونیوالی شرح ترقی سے بہت زیادہ بہتر نہیں رہی تھی جو ایک تباہ کن صورتحال تھی۔ اس کے نتیجے میں عالمی پیداوار میں روس کا حصہ حقیقتاً تھوڑا سا کم ہو گیا یعنی 1960ء میں 12.5 فیصد سے 1979ء میں 12.3 فیصد ہو گیا۔ اسی عرصے کے دوران جاپان کا حصہ 4.7 فیصد سے بڑھ کر 9.2 فیصد ہو گیا۔ خروشیف کی امریکہ کے برابر آنے اور اس سے آگے نکل جانے کی تمام باتیں ہوا ہو گئیں۔ اس کے بعد روس کی شرح ترقی لگاتار کم ہوتی گئی اور برژنیف کے دور آخر میں (جسے گورباچوف نے ''جمود کا عرصہ'' قرار دیا تھا) یہ کم ہو کر صفر ہو گئی۔

اس مرحلے کو پہنچنے کے بعد نوکر شاہی نے وہ نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کرنا بھی ختم کر دیا جو وہ ماضی میں ادا کرتی آئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سوویت نظام حکومت بحران میں داخل ہو گیا۔ آج یہ بات ہر کوئی جانتا ہے لیکن کسی واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کے بعد اسے سمجھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ تاریخی عوامل کے بارے

میں پیش گوئی کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا لیکن ٹیڈ گرانٹ کی روس کے بارے میں شاندار تحریروں کے بارے میں صورتحال یہی تھی جن میں سٹالنزم کے زوال کی ٹھیک ٹھیک نشان دہی کی گئی تھی اور دیوار برلن کے گرنے سے ربع صدی قبل اس نتیجے کی پیش گوئی کی گئی تھی۔ صرف یہیں ہمیں نوکرشاہانہ نظام حکومت کے بحران کی وجوہات کا جامع تجزیہ ملتا ہے جو کہ سابق سوویت یونین کے واقعات پر تبصرہ کرنے والے دوسرے مبصرین کے لئے آج بھی ایک ایسی بند کتاب ہے جس پر سات مہریں ثبت ہیں۔

سرمایہ داروں کے ''ماہرین'' کے رویے پر ہم پہلے ہی تبصرہ کر چکے ہیں۔ اس میں ہمارے لئے حیرت کا کوئی سامان نہیں۔ سوشلزم (یا کمیونزم) ناکام ہو گیا۔ کہانی ختم۔ لیکن بائیں یا دائیں بازو کے لیبر رہنماؤں کے تبصرے بھی کچھ بہتر نہیں ہیں۔ دائیں بازو کے اصلاح پسند ہمیشہ کی طرح صرف حکمران طبقے کے نظریات کو ہی دہراتے ہیں۔ بائیں بازوں کے اصلاح پسندوں کی طرف سے ہمیں ایک خجالت آمیز خاموشی ملتی ہے۔ مغرب کی کمیونسٹ پارٹیوں کے رہنما جو کل تک سٹالنزم کے تمام جرائم کی بلاتنقید حمایت کرتے تھے آج ایک مسترد شدہ نظام حکومت سے خود کو دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس کمیونسٹ مزدوروں اور نوجوانوں کے سوالات کا کوئی جواب نہیں جو سنجیدہ وضاحتوں کے طالب ہیں۔ اور یہ اشد ضروی ہے کیونکہ اگر ہم نے ماضی کو نہ سمجھا اور اس سے ضروری نتائج اخذ نہ کئے تو ہم کبھی بھی اس قابل نہیں ہونگے کہ ان عظیم مقاصد کا سامنا کر سکیں جو مستقبل ہمارے سامنے رکھے گا۔ موجودہ کاوش نہ صرف سوال پوچھتی ہے بلکہ جوابات بھی مہیا کرتی ہے۔

دیوار برلن کے خاتمے کا مغرب میں ایک نئی صبح کا آغاز سمجھ کر استقبال کیا گیا تھا۔ سرمایہ داروں کے مبصرین اور معذرت خواہوں نے اسے سرمایہ داری کی سوشلزم پر ''آخری فتح'' خیال کیا تھا۔ مورٹن میکاولی نے لکھا، ''سوویت یونین ختم ہو گیا۔ عظیم تجربہ ناکام ہو گیا۔۔۔ مارکسزم عمل میں ہر جگہ ناکام ہو چکا ہے۔'' (3) وال سٹریٹ جرنل نے اپنے اداریئے میں لکھا، ''ہم جیت گئے!'' (24 مئی 1989ء)

فرانسس فوکویاما کے مطابق ''بعد از تاریخ دور کا آغاز ہو چکا ہے۔۔۔ لبرل ڈیموکریسی جیت گئی ہے اور بنی نوع انسان عقل و دانش کی معراج پا چکا ہے۔ تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے۔''

اس وقت کے امریکی صدر جارج بش نے امریکی سامراج کے غلبے کے ماتحت ''نئے عالمی نظام'' کی تخلیق کا فاتحانہ انداز میں اعلان کیا۔ لیکن یہ ابتدائی جوش و خروش جلد ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ مختلف قوتوں کے درمیان سرد جنگ کے دوران پروان چڑھنے والے تعلقات جنہیں ٹھوس اور طے شدہ تصور کیا جاتا تھا،

تحلیل ہو گئے۔اس کی جگہ عدم اعتماد، عدم استحکام اور تصادم نے لے لی ہے۔فروری 1990ء میں وال سٹریٹ جرنل نے مضامین کے ایک سلسلہ میں جس کا نام ''1990ء کے مابعد'' تھا یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''یہ یقین کرنے کی بہت سی وجوہات موجود ہیں کہ 1990ء کی دہائی کی دنیا پچھلے کئی عشروں کے مقابلے میں کم قابل پیش گوئی اور کئی لحاظ سے غیر مستحکم ہو گی۔''

دی اکانومسٹ نے 8 فروری 1992ء کو لکھا ''سرد جنگ کے خاتمے کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا میں امن قائم ہو جائے گا بلکہ اس کے برعکس ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے دنیا پہلے سے بھی زیادہ تشدد آمیز ہو جائے۔'' مغربی لیڈر سابق سوویت یونین کی بالکنائزیشن کے تصور سے دہشت زدہ ہیں، ایک ایسی صورتحال جسے سابق امریکی وزیر خارجہ نے ''ایٹمی ہتھیاروں سے لیس یوگوسلاویہ'' سے تشبیہہ دی ہے۔ جیسا کہ ایک روسی مبصر ٹیٹیانا کوریاجینا نے واضح کیا ہے۔''سماجی اور معاشی نقطۂ نظر سے خوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔سوویت یونین کی سیاسی ٹوٹ پھوٹ، جو کہ اب بظاہر مکمل ہو چکی ہے بحران کی شدت اور سماجی کھچاؤ میں اضافہ کریگی۔'' آخر میں وہ کہتی ہے کہ ''۔۔۔ان کے سنگم پر ہمیں ایک سماجی انقلاب جنم لیتا ہوا ملے گا۔''(4)

اکیسویں صدی کے آغاز پر سرمایہ کی حکمت عملیاں طے کرنیوالے مستقبل کو گہری تشویش کے عالم میں دیکھ رہے ہیں۔ پرانے تضادات پر نئے معاشی، سماجی اور سیاسی تضادات کا انبار لگ رہا ہے۔اب ہم انتہائی اعتماد کے ساتھ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ سٹالنزم کا انہدام سرمایہ داری کے نئے بحران کی محض تمہید تھی جس کے مقابلے میں مشرق کا ابال اور سرمایہ داری کے ماضی کے تجربات ایک خوشگوار دعوت طعام معلوم ہونگے۔ 17 جون 1996ء کو امریکی رسالے نیوز ویک نے لکھا، ''سرمایہ داری جیت چکی تھی اور کمیونزم ہار چکا تھا، کم از کم ہم نے یہی خیال کیا تھا۔''

مغربی لیڈروں نے سٹالنزم کے خاتمے کے بعد شہد اور دودھ کی نہریں بہانے کے جو وعدے کئے ان کے باوجود سابق سوویت یونین میں سرمایہ داری آبادی کی اکثریت کیلئے ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوئی ہے۔اکتوبر انقلاب کی حاصلات کو منظم انداز میں ختم کیا جارہا ہے جس سے پیداواری قوتیں بے مثل انداز میں تباہ ہو رہی ہیں۔ہمیں اس سے کوئی حیرت نہیں ہوتی کہ وہی مغربی مبصرین جو سوویت معیشت کی ہر خرابی کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے تھے اور اس کی کامیابیوں کے تمام شواہد کو دیدہ ودانستہ چھپاتے تھے آزاد منڈی کی ان شاندار پیش رفتوں کے سلسلے میں نہایت ڈھٹائی سے چپ سادھے ہوئے ہیں۔

سلطنت روم کی تباہی کے بعد زمانہ امن میں دور جاہلیت سے لیکر آج تک یورپ نے ایسی معاشی تباہی نہیں دیکھی۔ خاص طور پر روس میں پیداوار کی تباہی کسی جنگ میں زبردست شکست سے مشابہہ ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ دو عالمی جنگوں پر مبنی جدید تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ پچھلے چھ سالوں میں پیداوار ساٹھ فیصد گر گئی ہے۔ اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ پیداواری ٹیکنیک اور صنعت کا تاریخی صفایا ہے اس کے مقابلے میں امریکہ کی 33-1929ء کی عظیم کساد بازاری جس میں بڑی تیزی سے پیداوار تیس فیصد گر گئی تھی نسبتاً معمولی تھی۔ روس میں زندگی کا ہر سال مغرب کو پیش آنے والی کسی بھی گہری سے گہری کساد بازاری کا ہم پلہ ہے۔ 1996ء میں مجموعی داخلی پیداوار میں مزید 6 فیصد کمی واقع ہوئی۔ صنعتی پیداوار میں 5 فیصد اور زرعی پیداوار میں 7 فیصد کمی ہوئی۔ ہلکی مصنوعات کی پیداوار 28 فیصد کم ہوئی اور تعمیراتی سامان کی صنعت میں 25 فیصد کمی ہوئی کیمیکل اور پٹرو کیمیکل کی پیدوار میں 11 فیصد اور نئے مکانات کی تعمیر میں 10 فیصد کمی ہوئی۔ روس کی 1996ء کی فصل تیس سالوں میں نیچے سے تیسرے نمبر پر تھی۔ اور روس کا زوال بدترین مثال نہیں ہے۔ 1994ء تک کے پانچ سالوں میں سوویت یونین کی سابق ریاستوں میں، اگر ہم جارجیا کی مثال لیں تو حیرت انگیز طور پر اس کی پیداوار میں 83 فیصد کی کمی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سے اس میں مزید گراوٹ آئی ہے۔

زوال کی حکمرانی

1936ء میں لیون ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی کہ ''اگر موجودہ نوکر شاہانہ آمریت کی جگہ نئے سوشلسٹ اقتدار نے نہ لی تو اس کے زوال کے معنی سرمایہ دارانہ رشتوں کی طرف واپسی اور صنعت و ثقافت کی زبردست تباہی ہونگے'' (5) پچھلے چھ سالوں نے اس کا کافی ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

موجودہ صورتحال کی نمایاں خصوصیات میں سے ایک سماجی طور پر تباہ کن پالیسیوں کی حقیقت پر پردہ ڈالنے کیلئے ایک بالکل نئی زبان کی ایجاد ہے۔ اس طرح مغرب میں ہمیں ''ڈاؤن سائزنگ'' اور ''آؤٹ سورسنگ'' کی اصطلاحات ملتی ہیں۔ اب روس میں ہمیں ''بگ بینگ'' کی تیاری کی خبر مل رہی ہے۔ ان بزعم خود درست مترادفات سے جارج آرویل کی کتاب ''1984ء'' کی ''نئی زبان'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس میں وزارتِ افراط، قلتوں کی نگرانی کرتی ہے، وزارت امن، مسلسل جنگ میں مصروف نظر آتی ہے اور

وزارتِ الفت خفیہ پولیس کی نمائندگی کرتی ہے۔اس ''بگ بینگ'' کے نتیجے میں ہوگا یہ کہ تمام ''غیر منافع بخش'' کارخانوں اور صنعتوں کو بند کیا جائے گا، ریاستی چھوٹ ختم کی جائے گی اور سرمایہ داری کی طرف سفر کو تیز تر کیا جائے گا۔اس کے نتیجے میں چالیس فیصد روسی صنعت بند ہو جائے گی اور پچیس ملین مزدور بے روزگار ہو جائیں گے۔اس صورتحال کے مقابلے میں موجودہ ذلت وافلاس معمولی دکھائی دے گا۔

کریڈٹ سوئیسی فرسٹ بوسٹن کا بین الاقوامی ماہر معیشت اس جوہر دانائی کا اضافہ کرتا ہے''ایک آسان سفر کا وعدہ کوئی نہیں کرتا۔روس کو جس سلطنت کی تباہی کا سامنا ہے اس کا سامنا موجودہ صدی میں کسی قوم کو نہیں کرنا پڑا۔مگر ان تمام باتوں کے باوجود معیشت کی تبدیلی ہوگی اور یہ عمل جاری وساری رہے گا۔''

صورتحال کی سنگینی کو گھٹا کر بیان کرتے ہوئے 11 نومبر 1994ء کے فنانشل ٹائمز میں انتھونی روبنسن لکھتا ہے''اذیت اس سے بڑھ کر ہے جتنی شروع میں تصور کی گئی تھی۔''اس سے محض ایک ماہ قبل مالیاتی سرمائے کے اسی آلے نے اپنے اداریئے میں اس سے کہیں زیادہ اذیت برداشت کرنے کا تقاضا کیا تھا۔ 7اکتوبر 1994ء کو اس نے لکھا کہ''درمیانی راستہ کوئی نہیں ہے۔۔۔صرف بگ بینگ استحکام اور سماجی ومعاشی تباہی کے درمیان انتخاب کرنا ہے۔۔۔جلد یا بدیر انہیں عوام سے قربانیوں کا تقاضا کرنا پڑے گا جو انہیں ابھی تک نہیں کرنا پڑی ہیں۔'' طویل المیعاد حل کے بارے میں سوال کا جواب دیتے ہوئے کینز نے کہا تھا:''مستقبل بعید کا جہاں تک ذکر ہے تو ہم سب نے فوت ہونا ہے۔''ایک نمایاں بورژوا نمائندے سر جی الیکسا شینکو نے جو ڈپٹی فنانس منسٹر تھا،اس پیش منظر کو سمیٹتے ہوئے کہا:''جب لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہوگا تو میں ہمیشہ کہتا ہوں کہ بیس سال میں سب ٹھیک ہو جائیگا۔''

موجودہ بورژوا حکومت کو اپنا ردانقلاب مکمل کرنے اور اپنی حیثیت مستحکم کرنے کے لئے بیس سال کا عرصہ نہیں ملے گا۔ ایک قلیل حکمران ٹولے کے امیر ہو جانے سے قطع نظر آبادی کی اکثریت کو ان ''اصلاحات'' سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔رائے عامہ کے جائزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بڑی اکثریت منڈی کی معیشت کیخلاف ہے۔ 1994ء میں لئے گئے جائزے میں اصلاحات کی حمایت پانچ سال پہلے کی چالیس فیصد کے مقابلے میں صرف پچیس فیصد رہ گئی۔اسی جائزے کے مطابق اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ نجکاری''ایسا قانونی ڈاکہ ہے جو مجرموں اور اشرافیہ کے مفاد کیلئے عمل میں لایا جارہا ہے۔نومبر 1995ء میں لئے گئے یوایس انٹرنیشنل فاؤنڈیشن آف الیکٹورل سسٹمز کے جائزے کے

مطابق تین چوتھائی لوگ موجودہ صورتحال سے انتہائی غیر مطمئن ہیں۔صرف بیس فیصد کا خیال تھا کہ آئندہ دو تین سال میں معیشت میں بہتری آئیگی اور نصف سے زیادہ لوگوں کی رائے تھی کہ معیشت پر ریاستی کنٹرول کو دوبارہ بحال کردینا چاہیے۔''(6)

اس سے تین ماہ پہلے لئے گئے یونیورسٹی آف سٹر یتھ کلائیڈ اور آل رشین سنٹر فار دی سٹڈی آف پبلک اوپینین کے جائزے میں پریسٹرائیکا کے دور کو 1995ء کے پچاسی فیصد کے مقابلے میں دو تہائی نے زیادہ مثبت قرار دیا۔اسی جائزے کو فنانشل ٹائمز نے 17 اگست 1995ء کو شائع کیا۔ایک تہائی سٹالنسٹ دور کی واپسی چاہتی تھی جبکہ دس فیصد کا خیال تھا کہ زار کا عہد بہتر ثابت ہوگا۔سیگوڈیا میں 24 جنوری 1997ء کو شائع ہونیوالے کل روسی جائزے کے مطابق اڑتالیس فیصد لوگ کلی یا جزوی طور پر اس بات سے متفق تھے کہ ''بطور نظام کے،سوشلزم نظام سرمایہ داری نظام کی نسبت روس کیلئے زیادہ قابل ترجیح ہے۔''اس سے کلی یا جزوی طور پر غیر متفق لوگوں کی تعداد ستائیس فیصد تھی جبکہ باقی لوگوں کا رجحان درمیانی پوزیشن کی طرف تھا۔43 فیصد کلی یا جزوی طور پر اس بات سے متفق تھے کہ روسی معیشت کو زیادہ تر ذاتی ملکیت کی بجائے ریاستی ملکیت کی بنیاد پر فروغ پانا چاہیے جبکہ انیس فیصد کی رائے اس کیخلاف تھی۔ لیتھوینیا، یوکرائن، پولینڈ، ہنگری، رومانیہ اور مشرقی جرمنی کی طرح روس میں ہونے والے دسمبر 1995ء کے ڈوما کے انتخابات میں بھی اصلاحات کی حامی پارٹیوں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔کمیونسٹ پارٹی اور اس کے اتحادیوں کیلئے یہ ایک بہت بڑی فتح تھی جس کے نتیجے میں قوم پرستوں کو دوسری جگہ نصیب ہوئی۔ان نتائج سے سرمایہ دار دنیا میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔

نیوز ویک رسالے نے 17 جون 1996ء کو اعتراف کیا:''عبوری دور کی سختیوں نے غم و غصے کو جنم دیا ہے۔اس سال کے شروع میں شمالی روس کی کوئلے کی کانوں کے مزدوروں کو کئی ماہ تک تنخواہیں نہیں ملیں۔بہت سی پنشنوں کی ادائیگی میں بھی تاخیر ہوئی ہے۔لیوڈملا سلیچاروو اتلخی سی پوچھتی ہے:''اگر سرمایہ داری ایک دن کے اچھے کام کے اچھے معاوضے کے حق کو تسلیم نہیں کرتی یا ریٹائرڈ ملازمین کے سلسلے میں اپنے فرائض ادا نہیں کرتی تو پھر یہ کونسے حقوق کا دفاع کرتی ہے؟''معاشی بحران کے ساتھ ساتھ معیار زندگی میں خوفناک گراوٹ آئی ہے۔آبادی کا ایک بڑا حصہ غربت کے ایسے حالات میں زندگی گزار رہا ہے جو جنگ کے بعد سے نہیں دیکھے گئے۔مرکزی منصوبے کی بربادی اور ریاستی ملکیت کے اداروں پر واجب الادا ضخیم قرضوں کے نتیجے میں مہینوں تک اجرتیں ادا نہیں کی جاتیں۔

صرف 1995ء میں حقیقی اجرتوں میں بیس فیصد کمی واقع ہوئی۔ 67 سالہ پنشنر فائنیا مولیچینا جسے ماہانہ 160,000 روبل ملتے ہیں، کہتی ہے ''میں پہلے ہی روٹی اور چائے پر گزارہ کر رہی ہوں۔ میں نے کئی سالوں سے گوشت کی شکل نہیں دیکھی۔ اگر قیمتیں مزید بڑھیں تو پھر مجھے فاقہ کشی کا سامنا کرنا ہوگا۔'' اس وقت ماسکو میں ایک ڈبل روٹی 2200 روبل کی ملتی ہے۔ تیس سالوں کی تیسری بدترین فصل کے بعد اب محکمہ زراعت کے ماہرین کا کہنا ہے کہ اس کی قیمت 4750 روبل تک پہنچ سکتی ہے۔ ابھی معیار زندگی کی گراوٹ مکمل نہیں ہوئی۔ افراطِ زر اجرتوں اور پنشنوں کو گھن کی طرح کھا رہا ہے۔ لیکن لاکھوں مزدوروں کو یہ کئی ماہ کی تاخیر سے ملتی ہے۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کے اور پنشنوں کے بقایا جات کی کل رقم اس قدر زیادہ ہے کہ یہ حقیقی معلوم نہیں ہوتی۔'' یہ وزیر معاشیات یاف جینی یاسن کا انکشاف ہے۔ (7)

تیز رفتاری سے آنے والی مفلسی کا مطلب سماج کی اکثریت کیلئے اذیت اور بدحالی ہے۔ اصلاحات کے دور میں روس کے اندر حقیقی اجرتوں میں نصف کمی ہوئی ہے۔ آج لاکھوں روسیوں کو اگر حقیقی فاقہ کشی نہیں تو غذائیت کی کمی کا ضرور سامنا ہے۔ ریاستی اعداد وشمار جمع کرنے والی کمیٹی کی سالانہ رپورٹ کے مطابق 1996ء کے آخر میں تقریباً 32 ملین افراد حکومت کی طے کردہ ''گزر اوقات کیلئے کم از کم'' 75 ڈالر ماہوار کی آمدنی سے کم پر گزارا کر رہے ہیں۔ بہت بڑی اکثریت اپنی بقا کیلئے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ گزر اوقات کیلئے تگ و دو میں گزارتی ہے۔ لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ منڈی کی معیشت کی طرف رجحان سے نوزائیدہ سرمایہ داروں کا ایک نہایت امیر ٹولہ پیدا ہوا ہے جن کا تعلق پرانے کمیونسٹوں سے ہے اور یہ لوگ بدعنوانی، دھوکہ، فریب اور ریاستی صنعتوں کی لوٹ مار میں ملوث ہیں۔

یہ روس کی نوزائیدہ بورژوازی کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نوسر بازوں، کالا دھندا کرنے والوں، سابق بیوروکریٹوں اور مافیا پر مشتمل نیا طبقہ جو اپنی قوت، مراعات اور آمدنیوں کو استحکام دینے کیلئے بے چین ہے۔ پرانی ''سنہری'' سرمایہ دارانہ مسابقت کی بجائے یہ اپنے کاروباری مخالفین کو ختم کرنے کیلئے موت اور قتل کی دھمکیوں پر انحصار کرتے ہیں۔ ان کا نصب العین یہ ہے کہ ''جلد امیر بن جاؤ۔'' 7 اور 8 اکتوبر 1995ء کا فنانشل ٹائمز اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''منڈی میں سب سے اوپر چمکیلی سپر مارکیٹیں ہیں جہاں زیادہ جھینگا مچھلی اور مہنگی شیمپئن ملک کے نئے امیر طبقے کیلئے برائے فروخت موجود ہے۔ روس کے نئے فیشن بوتیکوں میں دو ہزار ڈالر قیمت کی پوشاکوں کے گاہک موجود ہیں اور ماسکو کی گلیوں میں آپ کو نئی مرسڈیز کاریں اور لمبی لمبی لیموزین نظر آتی ہیں۔'' عوام کی بدحالی نوزائیدہ

بورژوازی اوراس کے حاشیہ نشینوں کی دولت کی نمائش سے بالکل متضاد ہے۔ مرسڈیز کاروں کے جمگھٹے اور چمکیلے فیشن گھر اپنی بقا کیلئے جدوجہد کرنیوالی اکثریت کے مقابلے میں ایک ذلیل تضاد پیش کرتے ہیں۔ بہتر ذہانت کے حامل مغربی مبصرین اس صورتحال کے نتائج سے بے بہرہ نہیں ہیں۔

10 اپریل 1995ء کا فنانشل ٹائمز لکھتا ہے کہ ''مغربی لوگوں کی نسبت روسی نگاہوں کے لئے امیر اورغریب کے درمیان بڑھتا ہوافرق اس لئے بھی زیادہ صدمے کا باعث ہے کہ یہ ایک ایسے کمیونسٹ نظام کی جگہ آیا ہے جس میں سماجی رتبے کا سکہ سیاسی قوت تھی نہ کہ روپیہ، پیسہ اور طبقۂ بالا اپنی مراعات کو چھپانے کیلئے مزدور طبقے کی راست بازی کے گن گاتا تھا۔

ان وجوہات کی بناء پر، جیتنے والوں اور ہارنے والوں کے درمیان گہری ہوتی ہوئی خلیج، جو روس کی تکلیف دہ معاشی اور سیاسی تبدیلی کے پچھلے تین سالوں کے درمیان پیدا ہوئی ہے، سب سے اہم عامل کے طور پر سامنے آرہی ہے جس سے ملک کی اس جدوجہد کا تعین ہوگا کہ مزید پیش رفت کس طرح ہوگی۔ روسی حکومت کا اندازہ ہے کہ جائیداداور بیرونی بینکوں میں جمع شدہ رقوم کے علاوہ 20 بلین ڈالر نوٹوں کی شکل میں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ نئے بورژوا کلچر کی عکاسی اس سے ہوتی ہے کہ ماسکو میں جوا خانوں کا جوارتکاز ہے وہ یورپ میں کسی اور جگہ نہیں۔

لیکن سکے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ غربت وبائی شکل اختیار کرگئی ہے۔ سینٹ پیٹرز برگ میں 50 ہزار لوگ سڑکوں پر رہ رہے ہیں۔ دارالحکومت ماسکو میں پچاس ہزار سے ایک لاکھ افراد ہر رات مشکل سے بسر کرتے ہیں۔ گداگری طاعون کی طرح پھیل چکی ہے۔ موجودہ حالات میں بے گھر لوگوں کو رہائش کیلئے اجازت نامے کا حق نہیں دیا جارہا جس کے بغیر کسی شخص کو کام کرنے، علاج یا ریاستی سہولتیں حاصل کرنے کا کوئی حق نہیں۔ ان کچلے ہوئے لوگوں کو اب بھی آوارگی، گداگری یا ''طفیلی زندگی گزارنے'' کے جرم میں دوسال تک کی قید ہوسکتی ہے۔ پرانے پنشنر جنہوں نے نازیوں کیخلاف شہر کا دفاع کیا تھا آج اس قدر بدحال ہیں کہ ان میں سے بہت سے گندگی کے ڈھیروں پر رہ رہے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کو مافیا نے دھوکے فریب سے ان کے گھر سے بے دخل کر دیا ہے۔ مفلسی نے ناقابل تصور کربناک صورتحال پیدا کر دی ہے۔ حال ہی میں ایک بے گھر بوڑھی عورت کو عینک چرانے کے جرم میں دوسال قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔

سرمایہ دار منڈی اپنے ساتھ بورژوا معاشرے کی بدترین خصوصیات لے کر آئی ہے: کنگالی، بے

گھری، بیروزگاری، پرتشدد جرائم اور روز افزوں کثرت شراب نوشی، جبکہ فلاحی خدمات کو اس نے تباہ کر دیا ہے۔ وحشیانہ کٹوتیوں کے باعث صحت کے شعبے میں ایک کے بعد دوسرا بحران آ رہا ہے۔ بدحالی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بیماریوں میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ کثرت شراب نوشی جو سٹالنزم کے تحت خطرناک حدود تک پہنچ گئی تھی اب وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ 1991ء میں شراب نوشی پر پابندیوں میں نرمی اور اس کے بعد تجارت کی آزادی سے واڈکا کے استعمال میں نہایت تیز رفتار اضافہ ہوا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ 150 ملین افراد پر مشتمل روسی آبادی ہر سال اس مقدار سے کئی زیادہ شراب استعمال کرتی ہے جتنی 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین کی 280 ملین افراد پر مشتمل آبادی کرتی تھی۔

سینٹ پیٹرز برگ کے بے گھر لوگوں کی پچیس فیصد تعداد بیلایا شاپکا یعنی صفائی کیلئے استعمال ہونیوالا محلول پینے کا اعتراف کرتی ہے۔ سردیوں میں ان دھتکارے ہوئے لوگوں میں سے سینکڑوں ڈھیر ساری سستی واڈکا پی کر کڑکڑاتی سردی میں سو جاتے ہیں اور ان میں بہت سے پھر کبھی بیدار نہیں ہوتے۔ اس وقت الماتا میں ایک کورین ہوٹل میں ایک میز کی بکنگ پر سو ڈالر خرچ ہوتے ہیں اور ماسکو میں فورسٹار ہوٹل کے کمرے کا ایک رات کا کرایا چھ سو ڈالر تک ہو سکتا ہے۔ منڈی کی معیشت یہ معجزے لے کر آئی ہے۔

ایک صحافی نیل میکے نے اپنے مضمون میں روسی زندگی کی دلخراش تصویر کشی یوں کی ہے کہ ''1993ء کے موسم سرما میں 1000 بے گھر لوگوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ جب ان کی ٹھٹھری ہوئی لاشوں کو اٹھا کر ذیلی راستوں کو صاف کر کے حکومت نے حقیقت میں ان کے وجود کا اعتراف کر لیا تھا۔۔ روسی سلطنت کی ٹوٹ پھوٹ نے اس کی بنیادیں تک ہلا دیں، سماجی بہبود کا خاتمہ ہو گیا اور اس سے پیدا ہونیوالے انتشار نے 'نئے غریبوں' کو جنم دیا۔۔۔ ہزاروں کی تعداد میں سابق قیدی جیلوں سے رہائی پا کر بے گھر اور بے در ادھر ادھر بھٹک رہے ہیں اور خود کو ذلت و خواری کی دھندلی دنیا میں پاتے ہیں۔ یہ سابق مجرم آپ کو گلیوں کے نکڑوں پر سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے ملیں گے جہاں وہ افغان جنگ کے مہاجروں، گھروں سے بھاگے ہوئے بچوں اور ذہنی و جسمانی معذوروں کے ساتھ مل کر واڈکا پیتے ہیں۔'' (8)

عالمی بینک کی حالیہ رپورٹ کے مطابق آبادی کا ایک تہائی حصہ خطِ مفلسی سے نیچے زندگی بسر کرتا ہے۔ علاوہ ازیں آمدنی کی تقسیم اب اتنی ہی ناہموار ہے جتنی فلپائن اور ارجنٹائن کی ہے۔ 1991ء سے

1993ء کے درمیان اجرتوں میں 43 فیصد حقیقی کمی کے ساتھ ساتھ قیمتوں سے پابندی اٹھنے سے یہ ہوا ہے کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے پاس وہ کم از کم رقم بھی موجود نہیں جو گزر بسر کیلئے ضروری ہے اور جس کا اندازہ نومبر 1994ء میں تیس ڈالر لگایا گیا تھا۔ نوچیلز کا نامی بے گھروں کیلئے قائم تنظیم کا اندازہ ہے کہ خطِ مفلسی سے نیچے گزر بسر کرنیوالے روسیوں کی حقیقی شرح 80 فیصد ہے جو کہ عالمی بینک کے اندازوں سے بہت زیادہ ہے اسی کے مطابق میسر رہائش گاہوں کا صرف تین فیصد انہیں ملتا ہے جو ویٹنگ لسٹ پر ہوتے ہیں اور اوسطاً پندرہ سال انتظار کرتے ہیں۔ باقی حصہ بیوروکریٹ لے جاتے ہیں۔

مافیا کا مکمل غلبہ ہے۔ کوئی بھی ان کے استحصال بالجبر اور غیر قانونی سرگرمیوں سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ جو افراد چند روبل کمانے کی جدوجہد میں چھوٹی موٹی چیزیں گلی میں فروخت کرتے ہیں انہیں بھی بیس فیصد غنڈہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔

بے ہودگی کی حد تک امیر لوگوں کے برعکس روز افزوں تعداد میں لوگ انتہائی بدحالی کا شکار ہو رہے ہیں۔ میکے لکھتا ہے کہ ''نوجوان لڑکیاں طوائف بننے کی آرزومند ہوتی ہیں اور مرد پستول لے کر پھرتے ہیں۔ ہر کوئی اذیت میں ہے۔'' بدحال نوجوانوں کو مافیا چوری چکاری کرنے والے گروہوں کی شکل دے دیتی ہے جہاں سے ان کا چھٹکارا بہت مشکل ہوتا ہے۔ کثرتِ شراب نوشی کی لعنت کے ساتھ ساتھ انہیں ٹی بی جیسی بیماری لگنے کا بھی اندیشہ ہوتا ہے جس سے بہت کم بچ پاتے ہیں۔ ''ہزاروں کو یہ موذی مرض لاحق ہے مگر علاج سے ان کے بچنے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ دوائی کیا کرسکتی ہے اگر آپ اس تھیلے میں سوتے ہوں جن میں کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے؟'' یہ نوچیلز کا تنظیم والے کہتے ہیں۔

سرمایہ داری آپ کی صحت کو سخت نقصان پہنچا سکتی ہے

معیارِ زندگی میں گراوٹ کے براہ راست منطقی نتیجے میں ہمیں عوام کی اکثریت کی صحت تیزی سے تنزل پذیر ہوتی نظر آتی ہے۔ نیوز ویک متوقع عمر کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''یہ کسی قوم کی مجموعی معاشی صحت کا حتمی پیمانہ ہے۔'' روس میں اس کی موجودہ صحت بھارت، پاکستان اور دوسرے ترقی پذیر ممالک سے بھی بدتر ہے اور اس میں مزید کمی آرہی ہے۔ اس کے مقابلے میں سٹالنزم کے تحت آنیوالے بحران کے عروج پر بھی سوویت یونین میں 1987ء میں اوسط عمر مردوں کیلئے 65.1 سال اور عورتوں کیلئے

73.8 سال تھی۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ میں مردوں کی موجودہ متوقع عمر 74 سال ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ 14 فروری 1994ء کے فنانشل ٹائمز نے پہلے صفحہ پر مضمون شائع کیا جس کی سرخی تھی ''روس کو آبادی کے بحران کا سامنا، اموات کی شرح میں زبردست اضافہ۔'' اس مضمون میں وضاحت کی گئی ہے کہ ''صرف پچھلے ایک سال میں شرح اموات میں بیس فیصد اضافہ ہوا ہے یا دوسرے لفظوں میں 1992ء کی نسبت 360,000 زیادہ اموات واقع ہوئی ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ روس میں مردوں کی اوسط عمر کم ہو کر صرف انسٹھ سال رہ گئی ہے۔ یہ صنعتی دنیا کی اوسط عمر سے بہت کم ہے اور 1960ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں کے بعد روس میں کم شرح ہے۔''

27 جون 1994ء کو امریکی رسالے ٹائم نے اپنے ایک مضمون میں تبصرہ کیا کہ ''مشرقی یورپ کے بہت سے باشندوں کیلئے آزادی کا دور دوسری جنگ عظیم کے بعد کے بدترین دور میں تبدیل ہو رہا ہے۔ مشرقی یورپ زبردست وسعت کے حامل صحت کے بحران سے گزر رہا ہے۔ اعداد و شمار جمع کرنیوالے اور محکمہ صحت کے افسران کی رپورٹوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ شرح اموات اور بچے پیدا نہ ہونے کی شرح اتنی بڑھ چکی ہے کہ عام طور پر صرف جنگوں کے دوران دکھائی دیتی ہے۔ جسمانی اور ذہنی بیماریاں کم و بیش وبائی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ روس سمیت بہت سے ممالک میں آبادی حقیقتاً کم ہو رہی ہے۔ رجائن ہلڈی برانٹ (جو کہ برانڈن برک کی ریاستی حکومت کا وزیر ہے) کہتا ہے ''یہ کمی تباہ کن ہے، یہ جنگ کی طرح ہے۔''

''روس، بلغاریہ، اسٹونیا اور مشرقی جرمنی میں پیدائش کے مقابلے میں اموات زیادہ ہو رہی ہیں، کچھ علاقوں میں ان کا تناسب ایک اور دو کا ہے۔ مشرق کے تقریباً ہر حصے میں متوقع عمر میں کمی آ رہی ہے خصوصاً مردوں کی عمر میں اور یہ ایک ایسے وقت ہو رہا ہے جب تیسری دنیا کے ممالک میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ہنگری میں مردوں کی اوسط عمر پینسٹھ اور عورتوں کی 74 ہے جبکہ 1975ء میں 67.3 سال اور 75 سال تھی اور آج کل فرانس میں مردوں کی اوسط عمر 73.3 سال اور عورتوں کی 81.8 سال ہے۔ 1989ء کے بعد سے روس میں شرح اموات میں تیس فیصد اضافہ ہوا ہے اور ان میں مردوں کی تعداد زیادہ ہے۔'' یہ جارج ٹاؤن یونیورسٹی کے میورے فیش باچ کا کہنا ہے۔ اس کے اندازے کے مطابق روسی مردوں کی اوسط متوقع عمر 59 سال تک گر چکی ہے جو تقریباً پاکستان کے برابر ہے۔'' واشنگٹن کے امریکن انٹرپرائز انسٹیٹیوٹ کے محقق نکولس ایبرزٹٹ کے مطابق ''ماضی میں صنعتی معاشروں میں اس قسم

کے دھچکے صرف دوران جنگ ہی مشاہدے میں آتے تھے۔''

یہ اعداد وشمار اور بھی زیادہ پریشان کن دکھائی دیتے ہیں اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ روس میں علاج معالجے کی سہولیات اور متوقع عمر کا معیار اکثر ترقی یافتہ ممالک کا ہم پلہ تھا۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ہمیں سوویت یونین کے اعداد وشمار پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ منصوبہ بند معیشت کے ساتھ تضاد دیکھنے کیلئے، حالانکہ اس کی معیشت نسبتاً پسماندہ ہے، ہم ٹائم رسالے کی بیان کردہ کیوبا کی صورت حال سامنے رکھتے ہیں۔ اس مجرمانہ ناکہ بندی کے باوجود جو واشنگٹن نے کیوبا کا گلا دبانے کیلئے کر رکھی ہے، پی اے ایچ او جو کہ عالمی ادارہ صحت کی شاخ ہے، کیوبا کی علاج معالجے کی سہولتوں کے بارے میں کہتی ہے ''یہ امریکی براعظموں میں مہیا کی جانیوالی سہولتوں میں سب سے بہتر ہے۔'' درحقیقت، کچھ بیماریوں کے علاج کیلئے سویڈن جیسے ترقی یافتہ ممالک سے لوگ یہاں آتے ہیں۔

حالانکہ ناکہ بندی کی وجہ سے یہاں دوائیوں اور میڈیکل کے شعبے میں استعمال ہونے والی اشیا کی شدید قلت ہے تاہم کیوبا اس بات پر فخر کرسکتا ہے کہ وہاں 51,000 ڈاکٹر موجود ہیں یعنی 231 افراد کیلئے ایک ڈاکٹر۔ ٹائم اعتراف کرتا ہے ''کیوبا میں نوزائیدہ اور پانچ سال سے کم عمر بچوں کی شرح اموات میں مسلسل بہتری ہو رہی ہے۔ پی اے ایچ او کے مطابق پچھلے سال کیوبا میں بچوں کی شرح اموات 9.4 فی ہزار تھی یعنی مغربی دنیا میں وہ صرف کنیڈا اور امریکہ سے پیچھے ہے جن میں یہ شرح بالترتیب 7 فی ہزار (1992ء) اور 9 فی ہزار تھی۔''

اس وقت روس میں صورتحال بہت مختلف ہے۔ بیماری، خودکشی، قتل، نامناسب خوراک اور مایوسی نے علاج معالجے کی سہولتوں کی بربادی کے ساتھ مل کر صحت کے معاملے میں روس کو تیسری دنیا کے برابر لا کھڑا کیا ہے۔ روبوچایا ٹربیونا کے مطابق ''روسیوں کی اکثریت مستقل طور پر غذائیت کی کمی کا شکار ہے۔ ان میں اعلیٰ معیار کے پروٹین کی کمی پچیس فیصد اور وٹامن کی کمی پچاس فیصد تک ہے۔ توانائی کی کمی بیس فیصد ہے۔'' روسی مردوں کی شرح اموات، خودکشی، قتل، خراب غذا اور برے حالات کے علاوہ پیش منظر کی عمومی کمی اور مستقبل کے بارے میں مایوسی سے منسلک ہے۔

جن بیماریوں کا خاتمہ کیا جا چکا تھا اب دوبارہ نمودار ہونا شروع ہوگئی ہیں جیسے ہیضہ، پیچش، خناق، ڈنبل اور سائبیریا کا مہلک پھوڑا۔ فنانشل ٹائمز 14 ستمبر 1994ء کے شمارے میں انکشاف کرتا ہے کہ ''یہ متعدی بیماریاں جو لینن گراڈ کے علاقے سے لیکر، جو کہ شمال مغربی روس میں ہے، بحرالکاہل کے ساحل

تک کے شہروں میں اتنی عام ہو چکی ہیں کہ ماسکو کے ایک اخبار نے ایک نیا 'وبائی' کالم تخلیق کیا ہے جو قارئین کو تازہ ترین بیماری کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتا ہے۔''

عالمی ادارہ صحت نے اعلان کیا ہے کہ سابق سوویت یونین میں خناق کی وبا خطرناک صورتحال اختیار کر چکی ہے۔ فنانشل ٹائمز 20 جون 1995ء کے شمارے میں لکھتا ہے ''1940ء کی دہائی میں بڑے پیمانے پر بچاؤ کے ٹیکے لگانے کے بعد خناق کا جو بچوں کی بیماری سمجھی جاتی ہے، بظاہر یورپ میں خاتمہ ہو گیا تھا۔ 1980ء میں اس کے صرف 623 مریضوں کی اطلاع ملی تھی۔ تازہ ترین وبائی حملے کا آغاز ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ سے 1991ء میں ہوا لیکن 1994ء تک یہ بیماری جس کے پانچ سے دس فیصد مریض موت کا شکار ہو جاتے ہیں روس کے تقریباً تمام علاقوں، یوکرائن، بیلا روس، مالدیویا، آذر بائیجان، آرمینیا، جارجیا، قازقستان، تاجکستان اور ازبکستان میں تقریباً 48,000 افراد کو اپنا شکار بنا چکی تھی۔'' ڈاکٹر جو اسوال نے جو کہ عالمی ادارہ صحت کا علاقائی ڈائریکٹر ہے خبردار کیا ہے کہ ''دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ یورپ کیلئے سب سے بڑا صحت عامہ کا مسئلہ ہے۔''

''دوائیوں کی قلت ہے اور جو دستیاب ہیں ان کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں۔ پرانے نظام کے تحت سوویت یونین میں تیار شدہ دوائیں بلا منافع فروخت ہوتی تھیں۔ 1992ء سے دواؤں کی قیمتوں نے باقی اشیائے صرف کی قیمتوں کو پیچھے چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ فروری 1992ء میں ہی سستی دوائیں دکانوں سے غائب ہو چکی تھیں۔ 1992ء کے اواخر میں ٹریڈ یونین اخبار ٹرڈ نے اطلاع دی کہ ''دواساز ادارے کاروباری اداروں کے ساتھ اپنے کاروبار کو زیادہ منافع بخش پا رہے ہیں۔ وہ باہر سے ڈالروں کے عوض دوائیں خریدتے ہیں اور ہارڈ کرنسی کی قیمتوں پر فروخت کرتے ہیں۔''(9)

ڈاکٹر بورس سٹروژلوف کے مطابق جو کہ ماسکو کے میونسپل ہسپتال نمبر 32 میں ہیڈ ڈاکٹر ہے اس کا کہنا ہے کہ ریاستی دواؤں کی چوری چھپے نج کاری جاری ہے۔ ''ہمارے گردو پیش خود رو سرمایہ داری کے فروغ کی وجہ سے نئے ماحول میں ڈاکٹروں کی گزر بسر اچھی نہیں ہو رہی جس کے باعث کچھ ڈاکٹر اپنے مریضوں سے ان خدمات کے عوض چوری چھپے پیسے وصول کر رہے ہیں جو انہیں بلا معاوضہ پیش کرنا چاہئیں۔''(10) جب کبھی انہیں اکثر تاخیر سے ملنے والی تنخواہیں وصول بھی ہوتی تھیں تو محض 85000 روبل ڈاکٹروں کیلئے اور 65000 روبل نرسوں کیلئے جو کہ نہایت معمولی رقوم ہیں۔ ڈاکٹر سٹوروژلوف کہتا ہے ''ہمارے لئے ان تنخواہوں پر نئے نوجوان ملازمین تلاش کرنا ناممکن ہے۔ ہر کوئی

تجارت میں قسمت آزمائی کرنے کے چکر میں ہے۔''

اعداد و شمار کی ریاستی کمیٹی کا رکن ای۔ ایم۔ اینڈریوف اپنے مضمون میں علاج معالجے کی سہولتوں کے بحران کو کم کر کے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ بھی یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہے کہ موجودہ رجحان کے پیش نظر اس صدی کے آخر تک مردوں کی اوسط عمر پچاس سال اور عورتوں کی محض تریسٹھ سال رہ جائے گی اور وہ یہ اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہے کہ اس کی اصل وجوہات معاشی ہیں ''1993ء سے عوام کی صحت کیلئے مخصوص رقوم کی مقدار میں کمی مسلسل جاری رہی ہے۔ ہسپتالوں میں علاج معالجے میں مزید کمی واقع ہوئی جس کی وجہ دواؤں کی قلت اور علاج میں استعمال ہونے والے آلات کا اپنی عمر پوری ہونے کے بعد خراب ہو جانا ہے۔ روس کے عوامی علاج معالجے کی خدمات کے شعبے میں تنخواہوں کی سطح 1992ء میں (1993ء کے اعداد و شمار ابھی دستیاب نہیں) دیگر معاشی شعبوں کی نسبت 1.7 گنا کم تھیں۔ منڈی کی اصلاحات کے حالات میں قلیل تنخواہ میں کام کرنے والے عملے سے بہتر خدمات کی توقع رکھنا عبث ہے۔'' غربت اور کٹوتیوں کے ساتھ ساتھ ہر طرف پھیلا ہوا عدم تحفظ کا احساس اور خوف ہر قسم کے نفسیاتی مسائل کو جنم دے رہا ہے۔ یہی مصنف اعتراف کرتا ہے کہ اصلاحات کی وجہ سے جو شورشیں اور تصادم ہو رہے ہیں ان کے باعث ''سماجی عدم استحکام اور اعصابی امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔''

منڈی کے اصولوں کو صحت کے شعبے میں متعارف کرانے کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ ماسکو کی صحافی خاتون ارینا گلوشینکو کے الفاظ میں ''تقریباً سال بھر پہلے ایماندار اور مخلص لوگ روسی ٹیلیویژن پر وضاحت کر رہے تھے کہ فارمیسیوں کا ریاستی نظام مزدوروں کے آگے بڑھنے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ کہا جا رہا تھا کہ حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت دواؤں کی قلت پیدا کر رہی ہے اور مریضوں کیلئے موثر طور پر کام کرنے کو ناممکن بنا رہی ہے۔ پھر جوں جوں معاشی اصلاحات آگے بڑھیں فارمیسیوں کو تجارتی مراکز میں تبدیل کر دیا گیا جن کا مقصد پیسہ کمانا تھا۔ اگر وہ زیادہ کماتی تھیں تو انہیں کامیاب تصور کیا جاتا تھا چاہے پہلے سے زیادہ لوگوں کی اموات واقع ہوئی ہوں۔۔۔۔

فارمیسیوں پر حملہ معیشت کے دوسرے شعبوں کو تجارتی بنیادوں پر استوار کرنے سے پہلے شروع ہوا جس کی بڑی وجہ وہ نفرت تھی جو نئے حکمران مفت علاج معالجے کے سوشلزم کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہونے کیخلاف محسوس کرتے تھے۔ فارمیسیوں کی بڑی تعداد کی نجکاری نہیں کی گئی اور وہ بدستور میونسپل ادارے ہیں۔ تاہم ان کے مقاصد کو تبدیل کر دیا گیا، فارمیسیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے لئے خود کمائیں

اور شہر کے خزانے کو بھی منافع کما کر دیں۔'' (12)

1993ء میں مفت علاج معالجے کی سہولتوں کے خاتمے کے بعد علاج کی پرائیویٹ سکیمیں متعارف کروائی گئیں لیکن وہ آبادی کے ایک بہت بڑے حصے کی پہنچ سے باہر ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف دس فیصد روسیوں کو پرائیویٹ انشورنس کا فائدہ پہنچتا ہے جنہیں کریملن کے ان بہترین ہسپتالوں میں علاج کا حق حاصل ہے جو پہلے پارٹی کے اعلیٰ بیوروکریٹ استعمال کرتے تھے۔

اونچی قیمتوں کی وجہ سے صرف 1992ء میں دواؤں کے استعمال میں تیس فیصد کمی واقع ہوئی۔ گلوشینکو کے مطابق ''جو کچھ فارمیسیوں کے ساتھ ہوا وہی کچھ اب علاج معالجے کے پورے نظام کے ساتھ ہو رہا ہے۔ 1991ء میں روس کی مجموعی قومی پیداوار کا 3.4 فیصد علاج معالجے کیلئے وقف ہوا۔ 1992ء میں اسے نصف کر دیا گیا۔ یہی نہیں کہ نئے آلات، ہسپتالوں کی مرمت اور تحقیق کیلئے پیسے نہیں بلکہ ڈاکٹروں کی تنخواہوں کیلئے بھی پیسے نہیں۔'' (13)

ایک ایسے ملک میں منڈی کی معیشت کی طرف تبدیلی، جہاں ریاست اور صنعت کا بہت گہرا تعلق تھا، ناقابل پیش گوئی نتائج کا باعث بنی ہے۔ وفاقی حکومت ریاستی ہسپتالوں کو چلانے کیلئے سرمایہ مہیا کرتی ہے جبکہ ماضی میں مقامی فیکٹریوں نے زیادہ تر آلات خرید کر دیئے تھے۔ فیکٹریوں کے دیوالیہ ہونے سے یہ ربط ختم ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر سٹوروزلوف کہتا ہے ''فیکٹریاں اب ہم سے بھی زیادہ غریب ہیں۔ وہ اپنی آدھی صلاحیت پر کام کر رہی ہیں اور مزدوروں کو برطرف کر رہی ہیں لہٰذا ہمارے میڈیکل آلات کو زنگ کھا رہا ہے۔'' اس نے ایک اور بات بھی محسوس کی ہے کہ مزدور برطرفی کے خوف سے اپنے بیمار ہونے کا اعتراف نہیں کرتے۔ ''وہ اس وقت تک کام کرتے رہتے ہیں جب تک وہ نڈھال ہو کر گر نہیں جاتے اور صرف تب ہی وہ ہسپتال آتے ہیں۔'' (14)

پرانے نظام کے تحت مزدوروں کیلئے کم از کم مفت علاج معالجے کی سہولت موجود تھی اور صورتحال نسبتاً مستحکم تھی۔ ہنگری کی پنشن یافتہ خاتون جولیکا لیوکاس کے الفاظ میں، ''کمیونسٹوں کے تحت معاشرہ منقسم نہیں تھا۔ جرائم یا غربت کا نشان تک نہیں تھا اور ہم ہنسی خوشی رہتے تھے۔'' یہ ایک مبالغہ آمیز یاد ہو سکتی ہے مگر بہت سے لوگوں کا یہی خیال ہے۔ ورکوٹاف کے ایک اورکان کن نے کہا کہ میں، ''زیوگانوف کو اس لئے ووٹ دے رہا ہوں کہ میں کمیونسٹوں کے تحت خود کو زیادہ محفوظ خیال کرتا تھا۔'' ایک اور روسی نے موجودہ دور میں لاکھوں کی نفسیات کی نمائندگی کرتے ہوئے جمہوریت کے بارے میں مندرجہ ذیل جواب

دیا۔'' آزادی؟ ہاں، ہمیں میسر ہے۔ مگر کس شے کی آزادی؟ درد قولنج سے مرنے کی آزادی؟ 200 جرمن مارک کے عوض مغرب کی تیار کردہ ٹوپ دار جیکٹ خریدنے کی آزادی؟ جبکہ اوسط اجرت پانچ مارک فی ہفتہ ہیں۔ استادوں کو ایک ہزار ڈالر فی سال رشوت دینے کی آزادی تاکہ وہ ہمارے بچوں کو پڑھائیں یا کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھانے کیلئے پچاس ڈالر دینے کی آزادی؟''

عورت کی حیثیت

عظیم فرانسیسی یوٹوپیائی سوشلسٹ فوریئے نے عورت کے مقام کو کسی سماجی نظام کی ترقی یا تنزلی کا سب سے واضح پیمانہ قرار دیا تھا۔ اس سلسلے میں روس کے اندر سرمایہ داری متعارف کروانے کے انتہائی تباہ کن نتائج سامنے آئے ہیں۔ روسی انقلاب نے عورت کی بہتری کیلئے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے بڑے منظّم انداز میں ختم کیا جا رہا ہے۔ بر سبیل تذکرہ یہ انقلاب خواتین کے بین الاقوامی دن کے موقع پر ٹیکسٹائل مزدوروں کی ہڑتال سے شروع ہوا تھا۔ عورتوں کی حیثیت کے سلسلے میں بورژوازی کی حامی حکومت کا رجعتی چہرہ مکمل طور پر بے نقاب ہوا ہے۔

بالشویک انقلاب نے عورت کی سماجی آزادی کی بنیاد رکھ دی تھی اگرچہ سٹالنسٹ ردانقلاب سے اسے جزوی دھچکا ضرور لگا مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سوویت یونین میں عورت نے برابری کے حصول کی جدوجہد میں زبردست پیش رفت کی۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے، ''اکتوبر انقلاب نے ایمانداری کے ساتھ عورت کے سلسلے میں اپنے فرائض کو ادا کیا۔ نئی حکومت نے اسے نہ صرف مردوں کے برابر سیاسی اور قانونی حقوق دیئے بلکہ جو بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے، اس نے اپنی بساط کے مطابق اور کسی بھی دوسری حکومت کے کسی بھی وقت کئے گئے اقدامات سے بڑھ کر حقیقتاً عورت کیلئے ہر قسم کے معاشی اور ثقافتی کاموں میں شرکت کی راہ ہموار کی۔'' عورت کی آزادی کی جدوجہد میں اکتوبر انقلاب ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے پہلے زار شاہی کے دور میں عورت پر تشدد کرنے کی اجازت تھی۔ بعض دیہی علاقوں میں عورتوں کو نقاب پہننے پر مجبور کیا جاتا تھا اور انہیں پڑھنے لکھنے کی آزادی نہیں تھی۔ 1917ء سے 1927ء کے درمیان بہت سے ایسے قوانین منظور کئے گئے جن کے تحت عورت کو رسمی طور پر مرد کے برابر

قرار دیا گیا۔ 1919ء میں کمیونسٹ پارٹی کے پروگرام میں نہایت جرأت سے اعلان کیا گیا کہ ”عورتوں کی رسمی برابری پر اکتفا نہ کرتے ہوئے پارٹی انہیں گھر گرہستی کے مادی بوجھ سے نجات دلانے کیلئے اجتماعی گھروں، کھانے کیلئے عوامی جگہوں، مرکزی دھوبی گھروں اور نرسریوں وغیرہ کو فروغ دے گی“۔

عورتیں خاوندوں کے ساتھ رہنے یا ملازمت میں تبدیلی کے باعث گھر تبدیل کرنے پر خاوند کے ساتھ جانے پر مجبور نہیں تھیں۔ خاندان کے سربراہ کے طور پر انہیں برابری کے حقوق حاصل تھے اور برابر تنخواہ ملتی تھی۔ بچوں کی پیدائش میں اس کے کردار پر خصوصی توجہ دی گئی تھی اور زچگی کے سلسلے میں خصوصی قوانین متعارف کروائے گئے جن کی رو سے زیادہ دیر تک اور رات کے وقت کام پر پابندی تھی اس کے علاوہ بچے کی پیدائش پر تنخواہ کے ساتھ چھٹی، خاندان کیلئے الاؤنس اور بچوں کی دیکھ بھال کے مراکز بھی متعارف کروائے گئے۔ 1920ء میں اسقاط حمل کو قانونی قرار دیا گیا، طلاق کو آسان بنایا گیا اور شادی کی سول رجسٹریشن کو متعارف کروایا گیا۔ ناجائز بچوں کے تصور کو بھی ختم کیا گیا۔ لینن کے الفاظ میں ”ہم نے لغوی معنوں میں ان قابل مذمت قوانین کی ایک اینٹ بھی کھڑی نہیں رہنے دی جو عورت کو مردوں کے مقابلے میں کمتر حیثیت دیتے تھے۔“

سیاسی، معاشی اور سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں عورت کی مکمل شرکت کو آسان بنانے کیلئے ٹھوس پیش رفت کی گئی۔ سکول میں بچوں کیلئے مفت کھانا اور دودھ، ضرورت مند بچوں کیلئے خصوصی غذا اور کپڑوں کیلئے الاؤنس، دورانِ زچگی مشورے کے مراکز، زچہ خانے، ڈے کیئر سنٹر اور دیگر سہولیات، یہ درست ہے کہ سٹالنزم کے ظہور پذیر ہونے کے بعد سماجی شعبے میں رد اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا جس سے عورت کی حیثیت شدید متاثر ہوئی۔ لیکن سٹالن کی موت کے بعد دوسری جنگ کے بعد شروع ہونے والی ترقی کی وجہ سے ایک عمومی بہتری کی صورت پیدا ہوئی جیسے 55 سال کی عمر میں ریٹائرمنٹ، ملازمت کی شرائط اور تنخواہ میں تمیز کا خاتمہ اور حاملہ عورت کیلئے ہلکے پھلکے کام کا حق، مکمل تنخواہ کے ساتھ زچگی سے 56 دن پہلے اور بچے کی پیدائش کے 56 دن بعد تک چھٹی۔ 1970ء میں عورتوں کیلئے رات کے وقت اور زیر زمین کام قانونی طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں خواتین کی کل تعداد کی شرح کے لحاظ سے 1927ء میں 28 فیصد تھی اور 1960ء میں 43 فیصد جو کہ 1970ء میں بڑھ کر 48 فیصد ہوگئی۔ پوری دنیا میں صرف تین ممالک ایسے تھے جن میں اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں کام کرنے والوں کی کل تعداد کا 40 فیصد سے زیادہ حصہ عورتوں پر مشتمل تھا اور یہ ممالک تھے فرانس، فن لینڈ اور امریکہ۔

سکول جانے کی عمر سے پہلے بچوں کی دیکھ بھال کے مراکز میں بہتری ہوئی، 1960ء میں ایسے پانچ لاکھ مراکز تھے لیکن 1971ء تک ان کی تعداد پچاس لاکھ ہو چکی تھی۔ منصوبہ بند معیشت کی زبردست پیش رفت کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ عورتوں کی اوسط عمر تیس سال سے 74 سال ہوگئی اور بچوں کی شرح اموات میں نوے فیصد کمی واقع ہوئی۔ 1975ء تک ایک تہائی عورتیں ان شعبوں میں کام کرتی تھیں جہاں کام کرنے والوں کی ستر فیصد تعداد خواتین پر مشتمل تھی لیکن 1970ء تک یہ شرح پچپن فیصد تک پہنچ گئی۔ اس وقت تک 98 فیصد نرسیں، 75 فیصد اساتذہ، 95 فیصد لائبریرین اور 75 فیصد ڈاکٹر عورتیں تھیں۔ 1950ء تک صرف 600 عورتوں کے پاس سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تھی لیکن 1984ء تک یہ تعداد 5600 تک پہنچ چکی تھی!

سرمایہ داری کی طرف رجحان سے ماضی کی پیش رفت تیز رفتار پسپائی میں تبدیل ہوگئی ہے اور ''خاندان'' کے منافقانہ نام پر عورت کو غلامانہ حیثیت کی طرف واپس دھکیلا جا رہا ہے۔ بحران کے بوجھ کا سب سے زیادہ حصہ عورت کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے۔ بچے کی پیدائش اور زچگی کے دوران دی جانیوالی سہولتوں سے چھٹکارا پانے کیلئے بیروزگاری کا سب سے پہلا شکار عورتیں ہوتی ہیں۔ اگر اس حقیقت کو مد نظر رکھا جائے کہ چند سال پہلے تک روسی مزدوروں کی 51 فیصد تعداد عورتوں پر مشتمل تھی اور 90 فیصد عورتیں برسر روزگار تھیں تو بے روزگاری میں اضافے کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ روس میں بے روزگاروں کی 70 فیصد تعداد عورتوں پر مشتمل ہے۔ بعض شعبوں میں یہ تعداد 90 فیصد ہے۔

سماجی خدمات کے شعبے کی تباہی اور روز افزوں بے روزگاری کی وجہ سے منصوبہ بند معیشت کے باعث عورتوں کو حاصل ہونے والی سہولتیں بتدریج ختم ہو رہی ہیں۔ بے روزگاری میں اضافہ مغرب کی نسبت روس میں زیادہ لوگوں کو غربت کے عذاب میں مبتلا کرے گا کیونکہ بہت سی سہولتیں براہ راست ان اداروں سے حاصل ہوتی ہیں جہاں یہ مزدور کام کرتے ہیں۔ 11 دسمبر 1993ء کا اکانومسٹ لکھتا ہے۔ ''بیروزگاری کو روس میں اب بھی کلنک کا ٹیکہ خیال کیا جاتا ہے۔ 1991ء سے پہلے اسے ایک جرم قرار دیا جاتا تھا۔ بے روزگاروں کو مکمل مفلسی کا سامنا ہے۔ بے روزگاروں کو دی جانیوالی سہولت کو کم از کم اجرت یعنی 14620 روبل ماہانہ سے منسلک کیا گیا ہے جو سرکاری طور پر متعین گزر بسر کی کم از کم سطح کے ایک تہائی اور اوسط اجرت کے 1/7 کے برابر ہے۔ بیروزگاروں کی حالت اکثر اس سے بھی بدتر ہوتی ہے جتنی یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کیونکہ صحت، سکول اور ٹرانسپورٹ جیسی بنیادی سماجی خدمات مقامی

حکومت کی بجائے کمپنیاں فراہم کرتی ہیں اس لئے صرف انہی لوگوں کو میسر ہوتی ہیں جو برسر روزگار ہیں۔''

سابق حکومت کے تحت عورتوں کو مردوں کی تنخواہ کا ستر فیصد ملتا تھا۔اب یہ شرح چالیس فیصد ہے، سابق سوویت یونین میں بھی ایک تنخواہ میں گزارہ کافی مشکل تھا۔غربت میں ڈرامائی اضافے کی وجہ سے اب یہ تقریباً ناممکن ہے۔لہٰذا اس رجعتی نظام حکومت کا سب سے بڑا شکار عورتیں ہیں۔جسم فروشی میں زبردست اضافہ ہوا ہے کیونکہ عورتیں زندہ رہنے کیلئے ایسے لوگوں کے ہاتھ اپنے جسم بیچتی ہیں جن کے پاس انہیں خریدنے کے لئے پیسہ ہے یہ لوگ زیادہ تر قابل نفرت نو دولتیوں اور غیر ملکیوں پر مشتمل ہیں یہاں بھی انہیں مافیا کا شکار بننا پڑتا ہے جو تمام کاروبار کا کم از کم بیس فیصد ہڑپ کر جاتے ہیں۔مغربی رسالوں میں تیسری دنیا کے ممالک کی عورتوں کے ساتھ ساتھ اب روسی عورتوں کے اشتہار بھی نظر آتے ہیں جو ایسے مردوں سے شادی پر تیار ہوتی ہیں جو اپنے ملک میں بعض ایسی وجوہات کی بنا پر شریک حیات حاصل کرنے کے اہل نہیں ہوتے جن کے بارے میں محض اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔عورتوں کی اس ذلت آمیز غلامی میں، جس کے مطابق ان کو اشیا کا درجہ دیا گیا ہے، اس خطے کی تذلیل کا راز پوشیدہ ہے جسے عریاں ترین اور انتہائی شرمناک استحصال کے آگے جھکنے پر مجبور کیا جارہا ہے۔

10 فروری 1993ء کو اس وقت کے وزیر محنت جے۔ میلکیان نے بیروزگاری کے حل کیلئے حکومت کی طرف سے اعلان کیا۔ایک ایسی زبان استعمال کرتے ہوئے جس پر مغرب کا کوئی بھی بورژوا سیاست دان فخر کر سکتا ہے۔انہوں نے فرمایا کہ وہ عورتوں کے کام پر واپسی کے خاص پروگراموں کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔''ہم عورتوں کیلئے کام تلاش کرنے کی کوشش کیوں کریں جبکہ مرد بیکار ہیں اور بیروزگاری کی سہولتوں پر گزارا کر رہے ہیں؟ مردوں کو کام کرنے دیں اور عورتیں گھر بار اور بچے سنبھالیں۔'' ماضی میں ایسی زبان کا استعمال ناقابل تصور تھا مگر اب یقیناً اسے جائز اور قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔یہاں ہمیں کسی بھی دوسری جگہ کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ رد انقلاب کا حقیقی چہرہ زیادہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔۔گھناؤنا، وحشی اور جاہل۔۔۔ یہ زار کے دور کی خوفناک غلامی کی طرف واپسی ہے جب ہر غلام کو اپنے ذلت آمیز حالات کے بدلے بیوی بچوں پر حکم چلانے کی آزادی تھی۔

حکومت کی ''گھر کو واپسی'' کی پالیسی پر عملدرآمد کی کوششوں کا عکس ہمیں اس نئے قانون کے متعدد مسودوں میں نظر آتا ہے جو منظوری کیلئے زیر غور ہیں۔ پہلا مسودہ بہت حد تک عورت کے اسقاطِ حمل کے حق

کوختم کر دیتا ہے اور چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کی ماؤں پر پینتیس گھنٹے فی ہفتہ سے زیادہ کام کرنے پر پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ احتجاج کے نتیجے میں اس کی اکثر متنازعہ شقیں ختم کر دی گئیں۔ قانون کی رو سے اب ریاست کام کرنے والی عورتوں کے بچوں کو ڈے کیئر کی سہولت مہیا کرنے کی پابند نہیں۔ اب صلے کے طور پر تین یا اس سے زیادہ بچوں کی ماؤں کو گھر میں رہ کر ان کی دیکھ بھال کرنے پر سہولتوں کی پیش کش کی گئی ہے۔ اس سے عورت کا مقام اسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں ستر سال پہلے تھا۔ خاندان کی تاریخ گہرائیوں میں دھکیل کر انہیں ایک خوفناک قیمت ادا کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ 1993ء میں 14000 عورتیں اپنے خاوندوں یا دوستوں کے ہاتھوں قتل ہوئیں۔ یہ تعداد امریکہ کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ ہے۔

مافیا سرمایہ داری کا ظہور

''ماسکو آج کل غنڈوں، منشیات فروشوں اور دلالوں کی گرفت میں ہے۔ وہ سماج جہاں کبھی ریاست خوف کے ذریعے حکومت کرتی تھی اور تجارت جرم تھی اب ایک ایسے جنگل میں تبدیل ہو چکا ہے جہاں تجارت پر خوف کی حکومت ہے اور جرم کی نشان دہی کرنے والے کو اس کے گھر کے دروازے پر کرائے کے قاتل گولی مار دیتے ہیں۔ روس کے نو دولتیوں کو گناہ کا خوب اچھا صلہ مل رہا ہے۔ ٹیٹر وگرل جیسی جگہوں پر آپ کو تیز طرار نوجوان مہنگے ترین لباسوں میں کنیڈا کی جھینگا مچھلی اور فرانسیسی شیمپین سے شغل کرتے، ہاتھوں میں موبائل فون اٹھائے ملیں گے۔۔۔ ان کی میزوں کے قریب آپ کو چمڑے کی جیکٹوں میں ملبوس ہٹے کٹے محافظ بھی ملیں گے اور ساتھ کوئی طوائف بھی موجود ہو گی۔۔۔ بدگمان لوگوں کا نقطہ نظر یہ ہے کہ روس کی اخلاقی اور سماجی حوالے سے پیچھے کی طرف واپسی نے مافیا کو نہ صرف ناگزیر بنا دیا ہے بلکہ درمیانی دور کیلئے شاید وہ ضروری بھی ہو۔ ہر قیمت پر ذاتی مفاد حاصل کرنے کا محرک اسے ان لوگوں کیخلاف ایک مسلح اور جان لیوا قوت بناتا ہے جو ریاستی اجتماعیت کو بحال کرنے کی کوشش کریں۔۔۔''(15)

مندرجہ بالا سطور بہت واضح طور پر اس سرمایہ داری کی تصویر کشی کرتی ہیں جو آج روس میں ظاہر ہو رہی ہے۔ پرانے نظام حکومت کیخلاف لگایا جانیوالا سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ اس کی خصوصی بیماری

بدعنوانی تھی۔ یہ درست ہے کہ بدعنوانی عوام کے عدم اطمینان کی بڑی وجوہات میں سے ایک تھی لیکن سرمایہ داری کی طرف سفر کے پہلے چھ سالوں سے ثابت ہوا ہے کہ نیا نظام پرانے کسی بھی دور کی نسبت انتہا درجے بدعنوان ہے۔ یہ تصور کہ روس میں مغربی یورپ یا امریکہ جیسی کلاسیکی شکل کی ''جمہوریت'' ترقی پا سکتی ہے مکمل طور پر غلط ثابت ہو چکا ہے۔ مافیا کے گروہ جو اس نئے سرمایہ داری نظام سے براہ راست منسلک ہیں اور اکثر نوزائیدہ بورژوازی میں اور ان میں تمیز نہیں کی جا سکتی، ہر جگہ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کی ریشہ دوانیوں سے ریاست کا کوئی شعبہ، کاروبار یا سیاست محفوظ نہیں۔ روسی مافیا کا تعلق اٹلی اور دیگر ممالک میں اپنے جیسی تنظیموں سے قائم ہے۔

اٹلی میں مافیا کے خلاف کام کرنیوالی گارڈیا ڈی فیننز کی ایک سرکردہ شخصیت میجر جنرل گیوانی ورڈ کچیو کا کہنا ہے کہ ''اس بات کی علامات ملی ہیں کہ سابق سوویت یونین میں روسی مافیا خود کو معاشی طور پر مضبوط کرنے کیلئے اٹلی کی مافیا کو اس طرح استعمال کر رہی ہے جس طرح اس صدی کے شروع میں امریکی مافیا نے کیا تھا۔'' نو دولتیے ان جرائم پیشہ عناصر کو نئے روس کی بقا کی ضمانت خیال کرتے ہیں۔ لیکن وہ اپنی خدمات کی قیمت وصول کرتے ہیں۔ سماجی اور معاشی پالیسیوں کا تجزیہ کرنے والے مرکز نے بورس یلسن کیلئے تیار کی جانیوالی رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ ذاتی کاروبار کرنیوالوں کی اپنی آمدنیوں کا دس فیصد تک جرائم پیشہ گروہوں کو دینا پڑتا ہے، ایسے 150 گروہ 40,000 کمپنیوں کو کنٹرول کرتے ہیں جن میں ملک کے 1800 کمرشل بینکوں کی اکثریت بھی شامل ہے۔ نیوز ویک رسالے کے مطابق ''روسی مافیا نے عملاً مادر وطن کو ٹھگوں کی حکومت میں تبدیل کر دیا ہے۔''

روس کا نیا بالائی طبقہ غنڈہ گردی کے سرمایہ دارنہ نظام کی نمائندگی کرتا ہے جو نیچے سے اوپر تک بدعنوانی میں ڈوبا ہوا ہے اور اگر اسے ایک خوشنما جملے میں بیان کیا جائے تو ''یہ فرینکنسٹائن کی عفریت کی طرح باوقار ہے۔'' روسی سرمایہ داری فلپائن میں مارکوس کے بدنام زمانہ ''رفیق سرمایہ داریت'' سے بھی زیادہ بدعنوان ہے۔ انیسویں صدی کے فرانسیسی سوشلسٹ پرودھون نے یہ مثل استعمال کی تھی کہ ''تمام ملکیت چوری کی ہے۔'' خالصتاً سائنسی نقطہ نظر سے یہ غلط ہے لیکن موجودہ روس میں یہ سچائی کے بہت قریب ہے۔ مالیاتی حکمت عملی کے ایک مغربی ماہر نے ماسکو سے واپسی پر اعتراف کیا کہ اسے، ''سرمایہ داری کی نقاب پہنے ہر طرف پھیلی ہوئی خود غرضانہ کمینگی، تنزلی اور بے لگام بدعنوانی دیکھ کر صدمہ ہوا ہے۔ میں اس واضح احساس کے ساتھ وہاں سے رخصت ہوا کہ یہاں مستقبل میں کوئی گڑ بڑ ہونے والی ہے۔''

اس نے مزید لکھا کہ ”شیطانی واقعات وقوع پذیر ہونے کے منتظر ہیں۔“ یہ نومبر 1993ء میں یلسن کی طرف سے وائٹ ہاؤس پر خونی حملے اور پارلیمنٹ کو برباد کرنے سے چند ماہ پہلے کی بات ہے۔

روس میں مافیا کی قوت کی مزاحمت کرنا انتہائی خطرناک ہے۔کلازوٹز کے الفاظ میں بیان کیا جائے تو یہاں قتل بھی دیگر ذرائع سے کاروبار کا ہی تسلسل ہے۔ 1993ء میں وزارت داخلہ نے ایسے 94 لوگوں کے قتل کی رپورٹ دی جنہیں ”کاروباری“ ظاہر کیا گیا تھا۔وزارت کے مطابق روزانہ کم ازکم دوحملوں میں دھماکہ خیز مواد استعمال ہوتا ہے جن میں سے ایک تہائی حملے کاروباری مخالفین کیخلاف ہوتے ہیں۔اگست 1995ء میں جس روز ماسکو کی زیرزمین ریلوے پر بم سے حملہ ہوا اسی دن ایسوسی ایشن آف بینکرز اور بزنس راؤنڈ ٹیبل کے ارکان نے مظاہرہ کیا۔ان کے گرد محافظوں کا گھیرا تھا اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے پچاسی ممبروں کیخلاف قتل کے ”کنٹریکٹ“ ہوئے۔۔۔۔اور 47 کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

روس کے بڑے ایک سولکھ پتیوں میں سے ایک الیا مئکوف کو اس وقت گولی ماردی گئی جب وہ دفتر سے نکل رہا تھا۔ 21 ستمبر 1997ء کے ڈیلی ایکسپریس کے مطابق،”جب اسے قتل کیا گیا تب اس کے پاس ایک ذاتی جیٹ طیارہ، مے فیئر میں دفتر اور پیرس میں ایک پینٹ ہاؤس اور فیراری کار موجود تھی۔اس نے دو بینکوں اور بہت سے دیگر کاروباری اداروں کی مدد سے وسیع کاروبار تشکیل دیا۔ تاہم ماسکو کے کاروباری جنگل میں کوئی بھی محفوظ دکھائی نہیں دیتا۔اخبارات کا کہنا ہے کہ اس کا کسی بینک سے جعلی کاغذات کے ذریعے ادائیگیوں کا جھگڑا چل رہا تھا۔“ مغرب کے برعکس مافیا سرمایہ دار اپنے مخالفین سے نمٹنے کیلئے گروہوں کو خود بھرتی کرتے ہیں جو قرضوں کی وصولی کے سلسلے میں بھی کارآمد ثابت ہوتے ہیں۔“(16)

روس کے اندر یہ استثنا نہیں بلکہ معمول ہے۔ 2اور3 ستمبر 1995ء کا فنانشل ٹائمز لکھتا ہے، ”سینکڑوں محافظوں پر مشتمل فوجیں بڑے بڑے منیجروں کو تحفظ دیتی ہیں،قرض کی وصولی کا کام کرتی ہیں، گاہکوں کی حفاظت کرتی ہیں اور خفیہ معلومات بھی جمع کرتی ہیں۔ یہ قرون وسطیٰ کے نوابوں یا انیسویں صدی میں جانوروں کے ریوڑ پالنے والے امریکی رئیسوں کے حاشیہ برداروں کا جدید نعم البدل ہیں۔“ تجزیاتی مرکز میں کام کرنے والے ایک معیشت دان پائیٹر فیلیپوف نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ”ایک پوری نسل جوان ہورہی ہے جس کے لئے یہ معمول کی صورت حال ہے اور جو ایسے حالات میں سرکاری

حکام کی طرف نہیں بلکہ غیرسرکاری لوگوں کی طرف رجوع کرے گی۔زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ یہ لوگ عدالت کا رخ کرنے یا سمجھوتے کی بجائے مجرم یا اپنے ناپسندیدہ ساتھی کوسزا دینے کیلئے کرائے کے قاتلوں سے معاملہ طے کریں۔''(17)

روس کے وزیرداخلہ اناطولی کولیکوف کا اندازہ ہے کہ کرائے کے قاتلوں کے ہاتھوں مرنے والوں کی تعداد، جن میں کچھ امریکی بھی شامل ہیں، 1995ء میں 530 سے کم ہوکر 1996ء میں 450 ہوگئی ہے۔اب وہ اعتراف کرتا ہے کہ''کاروباری حضرات نے پچھلے پانچ سال میں 150 سے 300 ارب ڈالر کے درمیان رقم باہر چھپائی ہے۔''اس کا اندازہ ہے کہ ملک کا چالیس فیصد حصہ جرائم پیشہ لوگوں کی ملکیت ہے۔اس قسم کی قانون سازی متوقع ہے کہ ٹیکس چوروں پر 862 ڈالر سے 2000 ڈالر تک جرمانہ کیا جائے۔اب جو کچھ وہ کہتا ہے وہ معتدل بیانی کا شاہکار ہے،''مجھے ان تمام لوگوں کے بارے میں کچھ خدشات وشبہات ہیں جو چار پانچ سال پہلے سماج کے دھتکارے ہوئے لوگ تھے مگر اب ارب پتی بن چکے ہیں۔''

کالا دھندا کرنے والے اور مافیا کے لوگ حکومت کی اعلیٰ ترین سطحوں تک رسائی رکھتے ہیں اور ریاست کوخوب لوٹ رہے ہیں۔اس کاروباری مافیا نے امیر ہونے کیلئے ہر جائز وناجائز طریقہ استعمال کیا ہے۔زیادہ تر بینکوں پر مافیا کا کنٹرول ہے جن کے پاس مغرب کی بنی ہوئی لگژری کاریں، خوبصورت عورتیں اور ہٹے کٹے محافظوں کے ٹولے موجود ہیں۔یہ جسم فروشی، منشیات فروشی اور کالے دھندے سے حاصل ہونے والی رقم کو''سفید'' کرنے کا ذریعہ ہیں۔ایف بی آئی کے جم موڈی کا کہنا ہے''ماسکو کی صورتحال 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں نیویارک شہر جیسی ہے۔ہر سال سینکڑوں لوگ کرائے کے قاتلوں کا شکار ہوتے ہیں۔قتل کیلئے ادا کی جانیوالی رقوم ایک ہزار سے پانچ ہزار ڈالر کے درمیان ہوتی ہیں۔

اکانومسٹ کے مطابق نجکاری پروگرام وہ شعبہ ہے جہاں اصلاحات اور جرم کا ملاپ سب سے زیادہ واضح ہے،''یہاں منظّم جرم کرنے والوں کی پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔'' یہی رسالہ لکھتا ہے، ''نجکاری کے سلسلہ میں نژانی نووگروڈ میں ہونے والے نیلام کیلئے آنے والے خریداروں کو مسلح غنڈوں سے محفوظ رکھنے کیلئے مسلح پولیس موجود تھی کیونکہ یہ عام خریداروں کو ڈرا دھمکا کر جائیدادیں سستی خرید لیتے ہیں۔'' سارنک میں (جو یورپی روس کے درمیان میں ہے) ہونے والے ایک نیلام میں غنڈوں سے

حفاظت کیلئے پولیس موجود نہیں تھی جو اپنے مخالفین کو بولی نہ دینے کا مشورہ دے رہے تھے اور کہتے ہیں کہ جنہوں نے بات نہیں مانی انہیں زدوکوب کیا گیا۔''

زیادہ منافع کی تلاش میں مافیا کے گروہ سماج کے کمزور ترین حصول کو اپنا شکار بناتے ہیں۔ ماسکو کے شعبہ جرائم کے اندازے کے مطابق ارادتاً کیا جانیوالا ہر پانچواں قتل مقتول کے گھر پر قبضے کیلئے ہوتا ہے۔ بوڑھے لوگ مجبوری کے عالم میں نقد رقم کے عوض معاہدہ کر لیتے ہیں کہ ان کی موت کے بعد مکان دوسرے فریق کا ہو جائے گا۔ نتیجتاً انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا نشانہ تنہا رہنے والے پنشن یافتہ افراد ہوتے ہیں۔ 3500 سے زیادہ ایسی لاشیں مردہ خانوں میں پڑی ہیں ''جن کے بارے میں خیال ہے کہ یہ گمشدہ اپارٹمنٹ مالکان کی ہیں۔'' 2 اور 3 ستمبر 1995ء کو فنانشل ٹائمز لکھتا ہے، ''تین سر بریدہ لاشیں (زیر زمین ریلوے ٹرین میں دھماکے سے چند ہفتے پہلے) میٹرو کے ساتھ والی سڑک کے کوڑے دانوں میں ملیں جنہیں گولی ماری گئی تھی۔ سننے میں آیا تھا کہ ان لوگوں نے کرایہ ادا نہیں کیا تھا۔'' مضمون میں مزید لکھا ہے کہ '' کاروباری حضرات اور کمپنیوں کے ایگزیکٹو پستول کو قرضے وصول کرنے والا کہتے ہیں اور وہ بھی آخری حربے کے طور پر نہیں۔'' آخر میں وہ لکھتا ہے کہ ''قرض کی وصولی کا کوئی موثر قانون موجود نہیں ہے۔''

موجودہ کاوش کے بارے میں

دیوار برلن کے گرنے اور سٹالنزم کے خاتمے کے بعد نہ صرف بذاتِ خود روس میں بلکہ ہر طرف بہت سے سوالات پوچھے جا رہے ہیں۔ موجودہ کتاب کا مقصد ان سوالات کی وضاحت کرنا اور حقائق، اعداد و شمار اور دلائل کے ذریعے سوشلزم کے دشمنوں کے پروپیگنڈے کا جواب دینا ہے۔ یہ فریضہ بہت پہلے ادا ہو جانا چاہیے تھا۔ یہ کوئی عملی مشق نہیں بلکہ مستقبل کی تیاری ہے۔ سوویت یونین کیا تھا؟ وہ کیوں ٹوٹا اور اب روس کس طرف جا رہا ہے؟ یہ سوالات آج سب کے ذہنوں میں منڈلاتے ہیں مگر ٹراٹسکی نے اپنی شاہکار کتاب ''انقلاب سے غداری'' میں، جو 1936ء میں لکھی گئی تھی اور آج بھی اسکی بنیادی تاثیر اور مطابقت برقرار ہے، ان خدشات اور امکانات کا ایک سائنسی تناظر تخلیق کیا تھا۔ کوئی بھی شخص جو سنجیدگی سے یہ جاننے کا خواہش مند ہے کہ روس میں کیا ہوا مارکسی تجزیئے کے اس شاہکار کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور یہ موجودہ کتاب کا نقطہ آغاز بھی ہے۔ موجودہ کتاب کا مقصد یہ بھی ہے کہ اکتوبر انقلاب سے ابھرنے

والے نظام حکومت کی نوعیت پر روشنی ڈالی جائے، اس کے متضاد رجحانات کا تجزیہ کیا جائے، اس کے عروج وزوال کا جائزہ لیا جائے اور آخر میں مستقبل کیلئے راستے کا تعین کیا جائے۔

پہلے موجودہ کتاب کے طریقہ کار کے بارے میں چند الفاظ کہنے ضروری ہیں۔ یہ کہنا ضروری نہیں کہ اس میں مارکسزم، جدلیات اور تاریخی مادیت کا طریقہ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ صرف یہی ہمیں ان سائنسی آلات سے مسلح کرتا ہے جو پیچیدہ اور متضاد عوامل کے تجزیئے کیلئے ضروری ہیں تا کہ حادثاتی کو لازمی سے الگ کیا جائے، جو کچھ مرد وزن اپنے بارے میں سوچتے اور کہتے ہیں اور بالآخر جن مادی مفادات کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اس کے درمیان تمیز کی جا سکے۔ صرف انہی ذرائع سے یہ سمجھنا ممکن ہے کہ سوویت یونین میں کیا ہوا اور اب کیا ہو رہا ہے اور کم از کم تجرباتی طور پر مستقبل کے واقعات کی پیش بینی کی جا سکے۔ موجودہ کتاب کے مصنف نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ روسی سوال کے مطالعے میں صرف کیا جو اس کے مارکسی تجزیئے کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹیڈ گرانٹ کو آج ٹراٹسکی ازم کے تصورات کا ایک نمایاں زندہ ترجمان خیال کیا جا سکتا ہے، جو انٹرنیشنل لیفٹ اپوزیشن کے دنوں سے ٹراٹسکی کا سرگرم پیروکار چلا آ رہا ہے۔ درحقیقت موجودہ کتاب کا ایک بڑا حصہ اس مواد پر مشتمل ہے جس کا تخلیقی دورانیہ پچاس سال پر محیط ہے۔ سب سے بڑھ کر اس کتاب میں مشرقی یورپ اور چین میں نئی سٹالنسٹ حکومتوں کی نوعیت اور نو آبادیاتی انقلاب کے حوالے سے ٹراٹسکی کی پرولتاری بوناپارٹ ازم کی تھیوری کی بنیاد پر تخلیقی ترویج کی گئی ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ روسی انقلاب کے بارے میں ہے اور اکتوبر انقلاب کی تاریخی توضیحات پیش کرتے ہوئے بہت سی تنقید، توڑ مروڑ اور ان غلط تصورات کا جواب دیتا ہے جنہوں نے کئی دہائیوں سے اسے گھیر رکھا ہے۔ اس حصے میں کئی ابواب ایسے ہیں جو اکتوبر انقلاب سے ابھرنے والی عبوری حکومت کے ریاست کی مارکسی تھیوری کے ساتھ تعلق کی تفصیلی وضاحت پیش کرتے ہیں۔ نوکر شاہی کے عروج اور سٹالنسٹ سیاسی رد انقلاب کا اس کے تمام مراحل کے دوران جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ حصہ اور بطور خاص ''ریاستی سرمایہ داری'' کی تھیوری پر تنقید (اس میں عبوری دور میں قدر کے قانون میں ایک بیش قیمت ضمیمہ بھی شامل ہے) کتاب کے دوسرے حصوں کی نسبت قاری کیلئے زیادہ مشکلات پیش کرتی ہے۔ لیکن سارے عمل کو ایک اکائی کے طور پر سمجھنے کیلئے ان نکات پر گرفت ضروری ہے۔ یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ یہ حصے پہلے 1940ء کی دہائی کے آخر میں ٹیڈ گرانٹ کی ایک اہم کتاب ''ریاست کا مارکسی نظریہ'' میں

شائع ہوئے تھے۔ اسے اور اس کے علاوہ دوسرے مواد کو کتاب کی شکل دینے کیلئے کافی ایڈیٹنگ کی ضرورت تھی۔ اس کا بہت سا کام راب سیول اور میں نے مل کر کیا۔ سٹائل میں اگر قاری کو کچھ تبدیلیاں نظر آئیں تو وہ مکمل طور پر اسی وجہ سے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹیڈ گرانٹ نے پچیس سال پہلے سٹالنزم کے بحران کی وجوہات کا درست تجزیہ کیا تھا اور اس کے انہدام کی پیش گوئی کی تھی۔ علاوہ ازیں ایسا کرنے والا وہ واحد فرد تھا۔ بورژوازی سے لیکر سٹالنسٹوں تک ہر رجحان کا خیال تھا کہ روس، چین اور مشرقی یورپ کی بظاہر دیوقامت حکومتیں غیر معینہ عرصے تک قائم و دائم رہیں گی۔ آج اگر ہم سٹالنزم کے بحران کی حقیقی وجوہات کی وضاحت کیلئے بورژوا، اصلاح پسندوں، سابق سٹالنسٹوں اور مزدور تحریک کے کونوں کھدروں میں موجود ان گنت فرقوں کی تحریروں کو چھانیں تو ہمیں ناکامی ہوگی۔ تاہم ٹیڈ گرانٹ نے بین الاقوامی پیش منظروں میں پیش از وقت ان کا تجزیہ کیا تھا جیسے اگست 1972ء میں۔ بدقسمتی سے اس وقت یہ مواد محض ایک معمولی سی تعداد نے ہی پڑھا تھا۔ موجودہ کتاب اس تفصیلی اور گہرے تجزیئے کو پہلی بار زیادہ بڑے پیمانے پر لوگوں تک پہنچائے گی۔

بعد کے تجربے کی روشنی میں یہ ضروری معلوم نہیں ہوتا کہ اس وقت سٹالنزم کے بحران کی وجوہات اور اس کے ناگزیر طور پر ٹوٹنے کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا تھا اسے تبدیل کیا جائے۔ یہ تجزیہ اسی طریقہ کار کے مطابق ہے جو ٹراٹسکی نے استعمال کیا تھا۔ جس واحد درستگی کو متعارف کروانا ضروری تھا وہ روس کی سرمایہ داری کی طرف واپسی کا پیش منظر ہے۔ ایک طویل عرصے تک مصنف کا خیال تھا کہ یہ خارج از امکان ہے یہ غلط ثابت ہو چکا ہے اگرچہ اس وقت سٹالنسٹ اور بورژوا مبصرین کی بھی یہی پختہ رائے تھی۔ یہ ٹراٹسکی کی عظیم ذہانت کا ثبوت ہے، اور لینن کے ہمراہ یہ دونوں وہ عظیم مارکسی مفکرین ہیں جو اس صدی نے پیدا کیے ہیں، کہ وہ اس سوال کے بارے میں صحیح ثابت ہوا۔ تاہم مصنف کا اس بارے میں یہ کہنا ہے کہ روس میں سرمایہ داری کی طرف تحریک ابھی نتیجہ خیز نہیں ہے اور اس کی ناکامی کا امکان موجود ہے۔ آخری حصے میں مختلف امکانات کی تفصیلی وضاحت کی گئی ہے جو روس اور باقی دنیا کے جدلیاتی رشتے کو واضح کرتا ہے۔

روس کی موجودہ بورژوازی کی حامی حکومت کے بحران کو مدنظر رکھا جائے تو کیا وقوع پذیر ہونے کا امکان ہے؟ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ اور سرمایہ داری کی بحالی کی طرف جھکاؤ نے ایک نیا متضاد

باب کھول دیا ہے۔ٹراٹسکی کی یہ پیش گوئی کہ اپنی مراعات کو برقرار رکھنے کی غرض سے سٹالنسٹ نوکرشاہی کے لئے ’’ضروری ہے کہ وہ ناگزیر طور پر مستقبل کے مراحل میں (سرمایہ دارانہ) ملکیتی رشتوں میں اپنے لئے حمایت تلاش کرے‘‘ درست ثابت ہوئی ہے۔کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں، منیجروں اور افسران کا پارٹی کارڈوں کو پھاڑ کر کھلم کھلا ’’کاروباری‘‘ حضرات میں تبدیل ہو جانے کا مکروہ منظر ثابت کرتا ہے کہ سٹالنسٹ نظام حکومت کا حقیقی سوشلزم سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔کتاب کے آخری حصے میں مصنف روس کے مستقبل کے بارے میں سوال کرتا ہے اور مختلف امکانات کو پیش کرتا ہے۔اس کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری کی طرف تحریک کا کردار ابھی نامکمل ہے۔مختلف نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

مارکسزم ایک سائنس ہے لیکن ریاضی یا علم فلکیات کی طرح بالکل قطعی سائنس نہیں ہے۔ایک ماہر علم فلکیات اکثر اوقات نہایت صحت کے ساتھ کروڑوں نوری سالوں پر واقع کہکشاں کی پوزیشن کے بارے میں بتا سکتا ہے۔لیکن مختلف سائنسوں میں فرق ہے۔ادویات کی بھی سائنس ہے لیکن یہ بالکل حتمی نہیں ہے۔ایک طرف میڈیکل سائنس کے بارے میں اپنے علم اور دوسری طرف دستیاب علامات کو بنیاد بنا کر ایک ڈاکٹر علاج تجویز کرتا ہے۔ ہمیشہ بہت سے امکانات ہوتے ہیں، مثال کے طور پر پیٹ کا درد السر، آنت یا معدے کے کینسر کی وجہ سے بھی ہو سکتا ہے۔لیکن آخر کار ڈاکٹر کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ سب سے زیادہ ممکنہ صورت کونسی ہے کیونکہ اسے تھیوری کے بعد عمل کا راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے تاکہ بیماری کا علاج کیا جا سکے۔

اگر پیش منظر کی تعریف کی جائے تو اس کا کردار مشروط ہوتا ہے۔پیش منظر حتمی طور پر نہیں بتاتا کہ کیا ہوگا بلکہ صرف ایک عملی مفروضہ ہوتا ہے جسے حقیقی واقعات کی مناسبت پر سے جانچنا، تبدیل کرنا اور اس کی خامیوں کو دور کرتے رہنا بہت ضروری ہے۔اس لئے موجودہ کتاب سے یہ توقع رکھنا کہ یہ صورتحال کے ہر پہلو کا مکمل طور سے احاطہ کرے غلط ہوگا۔اپنی نوعیت کی وجہ سے پیش منظر کیلئے ضروری ہے کہ وہ عمومی عوامل کے ساتھ نمٹے۔موجودہ صورتحال دو عہدوں کے درمیان کا عبوری دور ہے اور اس میں ایسے ادوار کے تمام تر عدم استحکام کا اظہار بھی ہے۔ پیش منظر تیار کرنے کا کام تیزی سے وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیوں کی وجہ سے مشکل ضرور ہو جاتا ہے لیکن ناممکن نہیں۔ جب پیچیدہ صورتحال کا سامنا ہو جس میں کئی تغیر پذیر عناصر موجود ہوں تو ان مختلف عناصر کی وضاحت ضروری ہو جاتی ہے اور ہر ایک کے نتائج کی نشاندہی کرنا پڑتی ہے۔لیکن یہ ضروری ہے کہ ان میں سے سب سے زیادہ ممکنہ تغیر پذیر عنصر کی نشاندہی کی

جائے۔

مجبوری ہے کہ پیش منظر کا کردار حساب جیسا نہیں بلکہ الجبرے جیسا ہوتا ہے جہاں نامعلوم مقداروں کی جگہ صرف حقیقی تجربے کی بنیاد پر ہی پُر کی جاسکتی ہے۔ پیش منظر میں اضافہ کیا جاسکتا ہے، تبدیلی کی جاسکتی ہے اور یہاں تک کہ اگر واقعات اسے جھٹلا دیں تو مسترد بھی کیا جاسکتا ہے۔ پیش منظر کی تیاری میں غلطی کا سرزد ہونا ممکن ہے۔ لیکن ایک مارکسسٹ کسی غلطی سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس شرط پر کہ اس کی نشاندہی، وضاحت اور تصحیح کی جائے۔ اسی طرح سائنس کی تاریخ میں اگر کوئی تجربہ مطلوبہ نتائج کا حامل نہ بھی ہو تو بھی اس کی بہت افادیت ہوسکتی ہے کیونکہ اس سے تحقیق کے زیادہ باثمر راستے کی نشاندہی ہوتی ہے اور ایک منفی حوالے سے ہی سہی مگر ہمارے مجموعی علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کے مقصد کو بیان کرنے کیلئے ہم ان الفاظ کو دہرانے سے بہتر کچھ نہیں کر سکتے جو ٹراٹسکی نے سٹالنزم کے بارے میں اپنی یادگار کتاب ''انقلاب سے غداری'' کے تعارف میں لکھے تھے۔ ''موجودہ تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس کا درستگی سے اندازہ لگایا جائے تاکہ جو کچھ ہونے والا ہے اسے بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔ ہم ماضی پر صرف اسی حد تک زور دیں گے جہاں تک وہ ہمیں مستقبل کو دیکھنے میں مدد دے سکتا ہے۔ ہماری کتاب ناقدانہ ہوگی۔ جو کوئی بھی طے شدہ حقائق کی پوجا کرتا ہے وہ مستقبل کی تیاری کا اہل نہیں ہوتا۔۔۔ ہمارا ارادہ چہرہ دکھانے کا ہے نہ کہ نقاب''۔(18)

اس سال اکتوبر انقلاب کی 80ویں سالگرہ ہے۔ سرمایہ داری کے معذرت خواہ اور مزدور تحریک میں ان کے وفادار خود کو اس خیال سے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ سوویت یونین کے خاتمے کا مطلب سوشلزم کی موت ہے۔ ایسا نہیں ہے! روس میں ناکام ہونے والی چیز سوشلزم نہیں بلکہ ایک غلط نمونہ تھا، سوشلزم کی مسخ شدہ شکل۔ کئی حوالوں سے سٹالنسٹ نظام حکومت 1917ء کے بعد بالشویکوں کے قائم کردہ جمہوری نظام حکومت کی ضد تھا۔ سٹالنزم کے زوال کی پیش گوئی اور وضاحت مارکسسٹوں نے پہلے ہی کر دی تھی۔ آج بھی اگر ہم عالمی سطح پر دیکھیں تو کسی بھی رجحان کی تحریروں میں ہمیں اس عمل کا کوئی جامع تجزیہ نہیں ملتا۔ اگر ہم پیچھے مڑ کر دیکھیں تو سٹالنزم کے زوال کو سوشلزم کے خاتمے کے طور پر دیکھا جائے گا۔ سوشلزم، مارکسزم، کمیونزم کیخلاف متعصّبانہ جملے بتدریج بے جان ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ وہ عالمی سرمایہ داری کے گہرے ہوتے ہوئے بحران کے پس منظر میں کئے جا رہے ہیں۔ شرح ترقی میں گراوٹ، بڑے پیمانے پر مستقل بے روزگاری، معیار زندگی پر حملے، وحشیانہ کٹوتیاں، فلاحی ریاست کا خاتمہ، یہ ہے بیسویں

صدی کی آخری دہائی میں ترقی یافتہ ممالک میں سرمایہ داری کی حقیقت۔اس پس منظر میں روس کے اندر سرمایہ داری کی بحالی کی کوشش کی جارہی ہے۔اس کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟اس کا حتمی جواب دینا ابھی قبل از وقت ہوگا۔لیکن ’’ایک ملک میں سوشلزم‘‘ کی ناکامی سے یہ بات آج پہلے سے کہیں زیادہ درست ثابت ہوئی ہے کہ عالمی پیمانے پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات روس کی تقدیر کا فیصلہ کرینگے۔

ایلن وڈز

لندن،8مارچ1997ء

مقدمہ کتاب

1۔ جان ریڈ۔دنیا کو جھنجوڑ دینے والے دس دن۔صفحہ 13

2۔ ایلک نوی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ۔صفحہ 438

3۔ ایم میکالے۔سوویت یونین 1991-1917۔صفحہ 15-378

4۔ مارننگ سٹار۔1992-1-2

5۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 251

6۔ فنانشل ٹائمز۔1995-11-29

7۔ دی گارڈین۔1996-5-27

8۔ بڑاایشو۔95-12-21 - 95-12-8

9۔ رشین لیبر ریویو سے اقتباس نمبر2۔1993

10۔ فنانشل ٹائمز1994-9-14

11۔ خیمیا ذی زن10اکتوبر1994

12۔ رشین لیبر ریویو نمبر2۔1993 صفحہ 42

13۔ ایضاً

14۔ فنانشل ٹائمز1994-9-14

15۔ دی سنڈے ٹائمز 1994-5-8

16۔ دی اکانومسٹ 194-12-19

17۔ دی اکانومسٹ 94-2-19

18۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 3-4

باب نمبر 1

اکتوبر انقلاب کی میزان

منصوبہ بند معیشت کی پیش رفت

’’جب میں مستقبل کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہوتا ہوں تو اس تحیر کی دھند میں لپٹی ہوئی دنیا کے تمام اسرار و رموز میری چشم حیراں میں منکشف ہو جاتے ہیں اور شعور کی آنکھ مستقبل میں اس گہرائی تک سفر کرتی ہے جہاں تک انسانی نظر کی فسوں کاری ان مناظر کو مقید کرتی ہے۔‘‘

الفریڈ ٹینی سن

1917ء کا روسی انقلاب تاریخ کے عظیم ترین واقعات میں سے ایک تھا۔ پیرس کمیون کے جرأت

مندانہ دور کے بعد پہلی بار کروڑوں کچلے ہوئے مزدوروں اور کسانوں نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے جابرانہ نظام کو ختم کر کے سیاسی قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی اور عالمی سوشلسٹ نظام کی تخلیق کا کام شروع کر دیا۔ ایک ہزار سال سے قائم زارشاہی کو تباہ کر کے انہوں نے کل خشکی کے چھٹے حصے کو تسخیر کر لیا۔ قدیم نظام کی جگہ ایک نئے ریاستی جمہوری نظام نے لے لی جو مزدوروں، سپاہیوں اور کسانوں کی نمائندہ سوویت تھی۔ اس نے عالمی انقلاب کے آغاز کی نوید سنائی اور پہلی جنگ عظیم کی ہولناکیوں سے گزرنے والے انسانوں کو نئے خواب اور نئی امیدیں عطا کیں۔ روس کی زبردست پس ماندگی سے قطع نظر نئی سوشلسٹ سوویت ریپبلک عالمی سرمایہ دارانہ نظام کیلئے ایک فیصلہ کن خطرے کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس نے بورژوا حلقوں میں خوف کی لہر دوڑا دی جو بجا طور پر اسے اپنی طاقت اور مراعات کیلئے خطرہ خیال کرتے تھے۔ لیکن وہ خود کو اس تصور سے تسلی دیتے تھے کہ بالشویک نظام حکومت محض چند ہفتوں تک قائم رہنے کا امکان ہے۔ انقلاب سے ظہور پانے والے قومی ملکیتی رشتے جو ایک نئے سماجی نظام کی بنیاد تھے سماج کی سرمایہ دارانہ شکل سے براہ راست متصادم ہو گئے۔ سٹالنزم کے ظہور کے باوجود یہ بنیادی مخاصمت سوویت یونین کے انہدام تک جاری رہی۔ آج بھی روس میں ہونے والے واقعات عالمی سیاست پر مسلسل خوف طاری کیے ہوئے ہیں جیسے کوئی بھوت سرمایہ دار طبقے کی رنگ رلیوں پر سایہ ڈال رہا ہو۔

ان حاصلات کی وسعت کو مکمل طور پر سمجھنے کیلئے نقطہ آغاز کو یاد رکھنا بہت ضروری ہے۔ حقیقی سوشلزم کے تصورات کو رسوا کرنے کے جوش میں ''آزاد منڈی'' کے معذرت خواہ نہایت آسانی سے چند تفصیلات فراموش کر جاتے ہیں۔ درحقیقت 1917ء کا زارشاہی روس آج کل کے بھارت کی نسبت کہیں زیادہ پسماندہ تھا۔ یہ مغرب سے بہت پیچھے تھا۔ یہ دور وحشت کا وہ خطہ تھا جہاں کسان غلامی کا خاتمہ محض دو نسل قبل ہوا تھا اور لکڑی کے ہل ابھی تک مستعمل تھے۔ روس صدیوں سے زارشاہی کی آمریت کا شکار تھا۔ صنعتی مزدور ایک نہایت معمولی اقلیت پر مشتمل تھے، یعنی 150 ملین میں سے چار ملین سے بھی کم۔ 70 فیصد آبادی ان پڑھ تھی۔ روسی سرمایہ داری کمزور تھی اور مغربی سرمائے کی بیساکھیوں کے سہارے کھڑی تھی۔ فرانس، برطانیہ، جرمنی، بلجیئم اور دوسری مغربی قوتیں روس کی 90 فیصد کانیں، 50 فیصد کیمیائی صنعت، 40 فیصد سے زیادہ انجینئرنگ کا شعبہ اور 42 فیصد بینکنگ سٹاک کنٹرول کرتی تھیں۔ اکتوبر انقلاب نے یہ سب کچھ تبدیل کرنے کی کوشش کی اور ہر جگہ مزدوروں کی رہنمائی کرتے ہوئے عالمی سوشلسٹ انقلاب کی راہ ہموار کی۔ بے شمار مسائل اور رکاوٹوں کے باوجود منصوبہ بند معیشت نے سوویت

یونین میں پیداواری قوتوں میں انقلاب بر پا کیا اور جدید معیشت کی بنیاد رکھی۔ جنگ سے پہلے کے عرصے میں کئی پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعے بھاری صنعت کو فروغ دے کر جنگ کے بعد کے سالوں میں ہونے والی پیش رفت کی بنیاد رکھی گئی۔

1936ء میں ٹراٹسکی نے لکھا کہ ''سوویت نظام حکومت کی بنیادی خدمت وہ شدید اور کامیاب جدوجہد ہے جو اس نے روس کی ہزار سال پرانی پسماندگی کیخلاف کی۔۔۔سوویت نظام مغرب کی ٹیکنیکی اور ثقافتی فتوحات کو درآمد کر کے، مستعار لے کر اور دوسرے ذرائع سے حاصل کر کے تیاری کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔''(1) اس کے بعد سوویت معیشت نے برق رفتاری سے ترقی کی۔ 1913ء سے (جو کہ قبل از جنگ پیداوار کا نقطۂ عروج تھا) 1963ء تک کے پچاس سالوں میں دو عالمی جنگوں، بیرونی مداخلت، خانہ جنگی اور قدرتی آفات کے باوجود صنعتی پیداوار میں 52 گنا اضافہ ہوا۔ اسی دوران امریکہ میں چھ گنا سے کم اور برطانیہ میں بمشکل دو گنا اضافہ ہوا۔ دوسرے الفاظ میں قومیائی ہوئی معیشت کی بنیاد پر چند دہائیوں کے اندر سوویت یونین ایک پسماندہ معیشت سے ترقی کر کے دنیا کی دوسری بڑی طاقت بن گیا جو ایک عظیم الشان صنعتی بنیاد اور ایک اعلیٰ ثقافتی سطح کا حامل ہونے کے علاوہ امریکہ اور جاپان کے سائنس دانوں کی مجموعی تعداد کے برابر سائنس دان رکھتا تھا۔ مارکسی نقطہ نظر سے ٹیکنیک کا مقصد انسانی محنت کے اصراف کو کم کرنا ہے۔ 1913ء سے 1963ء کے پچاس سالوں میں صنعت میں مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ، جو معاشی ترقی کی بنیادی علامت سمجھی جاتی ہے، برطانیہ میں 73 فیصد اور امریکہ میں 332 فیصد ہوا۔ سوویت یونین میں یہ اضافہ 1310 فیصد ہوا اگرچہ اس کا آغاز ایک نہایت کمتر سطح سے ہوا تھا۔ روس میں انتہائی تیز رفتار ترقی زیادہ تر ان ادوار میں ہوئی جو مغرب میں بحران یا جمود کے عرصے تھے۔ 1930ء کی دہائی میں سوویت صنعت میں ہونیوالی عظیم پیش رفت اس وقت ہوئی جب سرمایہ دارانہ دنیا کو زبردست کساد بازاری اور بحران کا سامنا تھا اور اسکے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے کی بیروزگاری اور شدید غربت کا بھی۔ 1929ء اور 1933ء کے درمیان امریکہ کی صنعتی پیداوار میں 48.7 فیصد کمی ہوئی۔ امریکہ کی قومی تحقیقاتی لیگ کے اندازے کے مطابق مارچ 1933ء میں بیروزگاروں کی تعداد 19,920,000 تھی۔ جرمنی میں ساٹھ لاکھ افراد بیروزگار تھے۔ صرف ان تقابلی جائزوں سے ہی سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی طوائف الملوکی پر منصوبہ بند معیشت کی برتری کا واضح اظہار ہو جاتا ہے۔

سابق سوویت یونین میں آبادی پندرہ فیصد بڑھی جبکہ ٹیکنیشنوں کی تعداد پچپن گنا بڑھی، کل وقتی تعلیم حاصل کرنیوالوں کی تعداد میں چھ گنا، کتابوں کی اشاعت میں تیرہ گنا، ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد میں دس گنا اور نرسریوں میں بچوں کی تعداد میں 1385 گنا اضافہ ہوا۔ ہر ایک لاکھ افراد کیلئے ڈاکٹروں کی تعداد 205 تھی جبکہ اس کے مقابلے میں اٹلی اور آسٹریا میں 170، امریکہ میں 150، مغربی جرمنی میں 144، برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ میں 110 اور سویڈن میں 101 تھی۔ متوقع اوسط عمر میں دوگنا اضافہ ہوا جبکہ بچوں کی شرح اموات میں نوگنا کمی واقع ہوئی۔ 1955ء سے 1959ء کے درمیان شہری رہائش گاہوں (ریاستی اور کوآپریٹو) میں دوگنا جبکہ پرائیویٹ میں تیس گنا اضافہ ہوا۔ 1970ء تک ڈاکٹروں کی تعداد 135000 سے بڑھ کر 484000 ہوگئی جبکہ ہسپتالوں میں بستروں کی تعداد 791000 سے 2224000 ہوگئی۔

سٹالن کی طرف سے جبراً مسلط کی گئی اجتماعی کاشت کاری کے باعث زراعت کو پہنچنے والے نقصان کے باوجود، جس کے بعد زراعت کبھی بھی مکمل طور پر سنبھل نہیں سکی، کافی پیش رفت ہوئی جس کے باعث روس اپنی آبادی کو مناسب خوراک مہیا کرنے کے قابل ہوا۔ اس قدر قلیل عرصے میں ایسی معاشی پیش رفت کی دنیا میں کہیں بھی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ صرف 1953ء سے 1956ء کے تین سالہ عرصے میں قابل کاشت رقبے میں 35.9 ملین ہیکٹر کا اضافہ ہوا جو کینیڈا کے مجموعی زیر کاشت رقبے کے مساوی ہے۔ یہ پیش رفت پاکستان، بھارت اور دنیا کے عوام کی المناک حالت کے مقابلے میں زبردست تضاد پیش کرتی ہے۔ سوویت معیشت کی یہ پیش رفت اور بھی ناقابل یقین لگتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا آغاز انتہائی پسماندگی کے حالات سے ہوا تھا۔ پرانی زارشاہی معیشت نیم جاگیردارانہ تھی جس میں شامل تھوڑی بہت جدید صنعت بھی زیادہ تر غیر ملکی سرمائے کی ملکیت تھی اور یہ معیشت پہلی جنگ عظیم میں تباہ ہوگئی تھی۔ اس کے بعد دو انقلابات آئے، خانہ جنگی ہوئی سامراجی ناکہ بندی اور بیرونی جارحیت کے علاوہ قحط میں ساٹھ لاکھ افراد کو جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اس میں ان بے شمار مزدوروں، کسانوں، ٹیکنیشنوں اور سائنس دانوں کو بھی شامل کرنا ضروری ہے جو پہلے جبری اجتماعی کاشت کاری اور پھر 1930ء کی دہائی کی عظیم تطہیرات میں مارے گئے۔ نوکرشاہی کی منصوبہ بندی نے معیشت کو آگے ضرور بڑھایا مگر مغرب کے صنعتی انقلابات کے مقابلے میں تین گنا زیادہ قیمت پر۔ بدانتظامی، ضیاع، بدعنوانی اور نوکرشاہی نے معیشت پر بہت بوجھ ڈالا اور آخر کار اسکو بالکل جامد کر دیا۔ یورپ میں ہونے والی دوسری جنگ عظیم نے

منصوبہ بند معیشت کی برتری کے حق میں مزید شہادت فراہم کی۔ درحقیقت یہ جنگ سوویت یونین اور نازی جرمنی کے درمیان ہونیوالی ایک انتہائی زبردست لڑائی تھی جس میں برطانیہ اور امریکہ کی حیثیت محض تماشائیوں کی سی تھی۔ اس میں دو کروڑ ستر لاکھ روسی موت کا شکار ہوئے۔ صرف لینن گراڈ کے محاصرے کے دوران دس لاکھ روسی مارے گئے۔ روس کے وسیع علاقے پر ہٹلر نے یا تو قبضہ کر لیا یا نازیوں کی "Scorched Earth" پالیسی کے تحت انہیں تباہ کر دیا گیا۔ مقبوضہ علاقوں میں پچاس فیصد شہری مکان یعنی تقریباً بارہ لاکھ گھر اور مضافاتی علاقوں میں پینتیس لاکھ گھر تباہ کر دیئے گئے۔ تاریخ دان ایلک نووی لکھتا ہے کہ ''بہت سے قصبات کھنڈر ہو گئے۔ ہزاروں دیہاتوں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ لوگ زمین میں گڑھے کھود رہے تھے۔ بہت سی فیکٹریاں، ڈیم اور پل جو پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دوران بے شمار قربانیاں دے کر بنائے گئے تھے از سر نو تعمیر کرنا پڑے۔'' (2)

جنگ کے بعد کے عرصے میں سوویت یونین نے کسی مارشل ایڈ پروگرام کے بغیر ہی ہر محاذ پر شاندار ترقی کی۔ قومیائی ہوئی معیشت اور منصوبہ بندی کے طفیل سوویت یونین نے تیزی سے اپنی تباہ شدہ صنعتوں کو از سر نو تعمیر کیا اور اس کی شرح ترقی دس فیصد سے زیادہ تھی۔ امریکی سامراج کے ساتھ ساتھ دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت یونین ایک عالمی سپر پاور کے طور پر ابھرا۔ نووی لکھتا ہے ''عالمی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔'' 1953ء تک سوویت یونین کے پاس ہر قسم کے پرزے بنانے والی تیرہ لاکھ مشینیں موجود تھیں یعنی جنگ سے پہلے کے مقابلے میں دگنی۔

1945ء سے 1960ء کے درمیان فولاد کی پیداوار 12.25 ملین ٹن سے بڑھ کر پینسٹھ ملین ٹن ہو گئی۔ اس عرصے میں تیل کی پیداوار 19.4 ملین ٹن سے بڑھ کر 148 ملین ٹن اور کوئلے کی پیداوار 149.3 ملین ٹن سے بڑھ کر 513 ملین ٹن ہو گئی۔ 1945ء سے 1964ء کے درمیان روس کی قومی آمدنی 570 فیصد بڑھی جبکہ امریکہ کی 55 فیصد بڑھی۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ جنگ میں امریکہ کی صنعت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا اور دنیا کے سونے کا دو تہائی حصہ اس کے تہہ خانوں میں موجود تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اسے جنگی سامان کی تیاری سے بہت فائدہ ہوا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ ساری سرمایہ دار دنیا پر اپنے غلبے کے نفاذ کے قابل ہو گیا تھا۔

جنگ سے پہلے سوویت یونین نہ صرف امریکہ بلکہ برطانیہ اور یورپ سے بھی بہت پیچھے تھا۔ حیرت انگیز طور پر 1980ء کی دہائی کے وسط تک سوویت یونین سوائے امریکہ کے برطانیہ سمیت بہت سے

سرمایہ دار ممالک کو پیچھے چھوڑ گیا تھا۔ کم از کم مجموعی طور پر پیداوار کے کئی کلیدی شعبوں میں سوویت یونین کو پہلی پوزیشن حاصل تھی، مثال کے طور پر فولاد، لوہا، کوئلہ، معدنی تیل، گیس، سیمنٹ، ٹریکٹر، کپاس اور بہت سی فولادی اوزار سازی کی مشینیں۔ 1980ء کی دہائی کے وسط میں میساچوسیٹس کیمبرج انجینئرنگ ریسرچ ایسوسی ایشن نے روس کی قدرتی گیس کی صنعت کی ترقی کو (جس نے دس سال سے بھی کم عرصے میں اپنی پیداوار دگنی کر لی تھی) ''قابل دید کامیابی'' (3) قرار دیا تھا۔ کمپیوٹروں کے شعبے میں بھی فرق اتنا کم رہ گیا تھا کہ مغربی ماہرین اعتراف کرتے تھے کہ یہ صرف دو یا تین سال رہ گیا ہے جبکہ 1970ء کی دہائی میں یہ فرق دس سال کے برابر خیال کیا جاتا تھا۔ منصوبہ بند معیشت کی برتری کا سب سے شاندار ثبوت روس کا خلائی پروگرام تھا۔ 1957ء کے بعد سے روس ''خلائی دوڑ'' میں آگے تھا۔ جب امریکیوں نے انسان کو چاند پر اتارا تو روسی ایک ایسا خلائی اسٹیشن تیار کر رہے تھے جو انہیں نظام شمسی کے دور دراز حصوں تک لے جاتا۔ ذیلی پیداوار کے طور پر سوویت یونین سستے اور قابل بھروسہ پروٹون راکٹ عالمی منڈی میں یورپی خلائی پراجیکٹ آرین کے مقابلے میں پندرہ ملین ڈالر کم قیمت پر بیچ رہا تھا۔

1940ء تک اس کی دو تہائی آبادی دیہی پسماندگی کے حالات میں رہتی تھی۔ اب یہ صورت حال مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ دو تہائی آبادی شہروں میں رہتی ہے اور صرف ایک تہائی دیہات میں۔ دوسرے لفظوں میں یہاں بھی وہی عوامل دکھائی دیتے ہیں جو ہم نے پچھلے پچاس سال میں مغرب میں دیکھے ہیں یعنی صنعتی ترقی کے باعث پرولتاریہ بہت مضبوط ہوا ہے جبکہ سماج کی درمیانی پرتیں اور کسان پیچھے رہ گئے ہیں۔ تاہم سوویت یونین میں یہ عمل ناقابل یقین حدود کو پہنچ گیا جب مزدوروں کو نہایت بڑے بڑے صنعتی اداروں میں یکجا کر دیا گیا جہاں ان کی تعداد ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد تھی۔ آج روسی پرولتاریہ پسماندہ یا کمزور ہونے کی بجائے روئے زمین کا طاقتور ترین مزدور طبقہ ہے۔ تعلیم کے سلسلے میں بھی صورتحال یکسر بدل چکی ہے۔ یہ اکتوبر انقلاب کی بنیادی حاصلات میں سے ایک تھی۔ سوویت یونین میں ہر تیسرا مزدور کوالیفائیڈ تھا اور مزدور طبقے کے نوجوانوں کی کثیر تعداد کو یونیورسٹی کی تعلیم تک رسائی حاصل تھی۔ 1940ء سے 1964ء کے درمیان اعلیٰ اور ثانوی ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کی تعداد چار گنا بڑھ گئی۔ 1970ء تک سوویت یونین میں طلبہ کی تعداد چھیالیس لاکھ ہو چکی تھی جن میں سے 2,57000 انجینئرنگ کے گریجویٹ تھے۔ (اس مقابلے میں امریکہ میں اسی شعبے کے گریجویٹس کی تعداد 50,000 تھی)۔ تعلیم پر خرچ فی کس کے لحاظ سے برطانیہ کے مقابلے میں چار گنا زیادہ تھا۔ اعداد

وشمار پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی مغرب کے اصلاح پسند لیڈروں کی گھٹیا نوعیت کی پریشانیوں کے مقابلے میں منصوبہ بند معیشت کی برتری ثابت ہو جاتی ہے جنہوں نے عمومی طور پر تعلیم، صحت اور سماجی بہبود کے شعبوں میں اخراجات میں شدید کٹوتیوں کی ضرورت کو تسلیم کر لیا ہے۔

معیشت کی ترقی کے باعث معیار زندگی میں بتدریج بہتری ہوئی۔ پچھلے دور میں اکثر روسیوں کے پاس ٹی وی، فریج اور واشنگ مشینوں جیسی چیزیں موجود تھیں اور یہ سب کچھ بے روزگاری یا افراط زر کے بغیر حاصل کیا گیا تھا۔ کرایہ تقریباً ماہانہ تنخواہ کے چھ فیصد کے برابر تھا اور اس میں آخری بار 1928ء میں اضافہ کیا گیا تھا۔ ابھی حال تک ماسکو میں ایک چھوٹا فلیٹ سترہ ڈالر ماہوار کرائے پر مل جاتا تھا جس میں گیس، بجلی، ٹیلی فون کے اخراجات اور وافر مقدار میں گرم پانی بھی شامل تھا۔ ڈبل روٹی 16 پنس کی ایک کلو تھی اور چینی وغیرہ جیسی بنیادی اشیائے خوردنی کی قیمتوں میں آخری بار 1955ء میں اضافہ ہوا تھا۔ گوشت اور ڈیری کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ 1962ء میں ہوا تھا۔ اس صورتحال میں تبدیلی صرف 1980ء کی دہائی میں شروع ہوئی۔ سرمایہ داری کی طرف رخ کرنے سے صورتحال یکدم بدل گئی ہے کیونکہ ریاستی چھوٹ ختم کر دی گئی اور قیمتوں پر کنٹرول ختم کر دیا گیا۔ 1993ء میں افراط زر 2,600 فیصد تک پہنچ گیا۔ اگرچہ اس کے بعد اس میں کمی ہوئی ہے مگر اس کی شرح اب بھی بہت زیادہ ہے۔

تاہم اس بے نظیر ترقی میں ہم کم از کم ان زبردست افادیتوں کا اظہار ضرور دیکھ سکتے ہیں جو سماج نے سرمایہ داری اور جاگیرداری کو ختم کر کے حاصل کی تھیں۔ پہلے ساٹھ سالوں میں ہونیوالی سوویت معیشت کی پیش رفت انتہائی غیر مساوی اور متضاد تھی۔ یہ ''سوویت یونین کے دوستوں'' کی پیش کردہ خوبصورت تصویر سے بہت مختلف تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سٹالنزم کی بدعنوانی اور بدانتظامی کے مقابلے میں مزدوروں کی جمہوریت پر مبنی نظام حکومت اس سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوتا۔ سوویت معیشت کی اس متضاد ترقی میں ہی 1980ء کی دہائی میں سٹالنزم کی ٹوٹ پھوٹ اور سرمایہ داری کی بحالی کی کوشش کو سمجھنے کی کلید موجود ہے۔

ایک سماجی ومعاشی نظام کی حیثیت سے سرمایہ داری کے ارتقا کے قوانین کا شاندار تجزیہ مارکس نے سرمایہ کی تین جلدوں میں کیا ہے۔ تاہم منصوبہ بند معیشت کا ارتقا، جو کہ سوشلزم کی طرف قدم بڑھانے کی بنیادی شرط ہے، ایک بالکل مختلف انداز میں ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے قوانین کا اظہار منڈی کی قوتوں

کے اندھے کھیل میں ہوتا ہے جس کے ذریعے پیداواری قوتیں ایک خودکار انداز میں ترقی کرتی ہیں۔قدر کا قانون خود کو طلب ورسد کے میکنزم کے ذریعے ظاہر کرتا ہے اور ایک شعبے سے دوسرے شعبے کیلئے وسائل مہیا کرتا ہے۔اس میں شعوری مداخلت یا منصوبہ شامل نہیں ہوتا۔ جہاں ریاست معیشت کو اپنے ہاتھوں میں مرکوز کر لے وہاں ایسا نہیں ہوتا۔اس صورت میں مزدوروں کی ریاست کو مجموعی معیشت کے حوالے سے وہی حیثیت حاصل ہوتی ہے جو ایک کارخانے کے حوالے سے انفرادی سرمایہ داری کی ہوتی ہے۔

اسی وجہ سے پچھلی سات دہائیوں میں سوویت حکومت کے اقدامات نے معاشی ترقی کے سلسلے میں، اچھا یا برا،لیکن فیصلہ کن کردار ادا کیا ہے۔ٹراٹسکی نے لکھا ہے کہ ''دنیا میں کوئی دوسری حکومت ایسی نہیں جس کے ہاتھوں میں پورے ملک کی تقدیر اس حد تک مرکوز ہو۔قومی معیشت کا مرکزی کردار ریاستی اقتدار کو ایک انتہائی اہم عامل بنا دیتا ہے۔'' ان حالات میں حکومت کی پالیسی فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی۔ یہ نوکر شاہی نظام کی بندگلی ہی تھی جس نے اس شاندار معاشی پیش رفت کو یکا یک جامد کر دیا۔سرمایہ داری کی ترقی کے برعکس، جو کہ وسائل کی دستیابی کیلئے منڈی پر انحصار کرتی ہے،قومیائی ہوئی معیشت کو سمت کے تعین اور منصوبہ بندی کیلئے شعوری کوشش درکار ہوتی ہے۔ یہ کام ماسکو میں بیٹھے ہوئے چند بیوروکریٹ کبھی کامیابی سے نہیں کر سکتے تھے چاہے وہ مارکس، اینگلز،لینن اور ٹراٹسکی ہی کیوں نہ ہوں۔اس صورتحال میں صنعت اور ریاست کو چلانے کیلئے آبادی کی اکثریت کی شرکت کی ضرورت ہوتی ہے۔صرف مزدوروں کی جمہوریت پر مبنی نظام حکومت ہی معاشرے کی تخلیقی صلاحیتوں اور قابلیت سے حقیقی معنوں میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔نوکر شاہانہ بدانتظامی پر مبنی نظام بالآخر اس وقت معیشت کو جام کر کے رکھ دے گا جب یہ ٹیکنیکی لحاظ سے ترقی یافتہ اور پیچیدہ ہو جائے گا۔ 1970ء کے عشرے تک سوویت معیشت مکمل جمود کا شکار ہو چکی تھی۔لیکن اس کی وجوہات کا ہم بعد کے کسی باب میں ذکر کریں گے۔

یہاں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ سٹالنزم کی جکڑ بندیوں کے باوجود منصوبہ بند معیشت کی کامیابیوں کا مظاہرہ ''سرمایہ'' کے صفحات پر جدلیات کی زبان میں نہیں بلکہ کرہ ارض کے چھٹے حصے پر محیط صنعتی میدان میں سٹیل، سیمنٹ اور بجلی کی زبان میں ہوا۔ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے:''اگر اندرونی مشکلات، بیرونی حملوں اور لیڈرشپ کی غلطیوں کی وجہ سے سوویت یونین ٹوٹ بھی گیا(ہم قوی امید رکھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوگا) تو پھر بھی مستقبل کیلئے یہ ناقابل تردید حقیقت بہرحال موجود رہے گی کہ ایک پسماندہ ملک نے محض مزدوروں کے انقلاب کے نتیجے میں دس برس سے کم عرصے میں وہ کچھ حاصل کیا جس کی مثال پوری تاریخ

میں نہیں ملتی۔‘‘(4)

کیا اکتوبر انقلاب ایک کُو تھا؟

بالشویکوں کو رسوا کرنے کیلئے تاریخی ریکارڈ کو مسخ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ایک عام حربہ یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کو کُو یعنی ایک معمولی اقلیت کی ایسی تحریک کے طور پر پیش کیا جائے جس نے اکثریت کی پیٹھ پیچھے سازشی ہتھکنڈوں کے ذریعے اقتدار حاصل کرلیا ہو۔اس دلیل کی رو سے بالشویکوں نے فروری انقلاب میں برسراقتدار آنیوالی عارضی حکومت سے زبردستی اقتدار چھین لیا تھا۔جس کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی جمہوری امنگوں کی نمائندہ تھی۔اس کہانی کے مطابق اگر لینن کی ’’سازش‘‘ کارگر ثابت نہ ہوتی تو روس مغربی پارلیمانی جمہوریت کے راستے پر گامزن ہو جاتا اور سب لوگ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگتے۔پریوں کے دیس کی یہ کہانی اتنی مرتبہ دہرائی جاچکی ہے کہ بہت سے لوگ اسے بلاتنقید قبول کر چکے ہیں۔پریوں کی دوسری کہانیوں کی طرح اس کا مقصد بھی تھپکیاں دے کر سلانا ہے اور اس قسم کی باقی کہانیوں کی طرح اس پر بھی صرف ننھے منے بچے ہی یقین کرتے ہیں۔

پہلا سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ اگر عارضی حکومت واقعی ایک بڑی اکثریت کی نمائندگی کرتی تھی تو بالشویک سازشیوں پر مشتمل ایک معمولی سا گروہ آخر کس طرح اول الذکر کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو گیا؟ کیونکہ کم ازکم کاغذی طور پر حکومت کے پاس ریاستی مشینری کی ساری طاقت،فوج،پولیس اور قزاق موجود تھے جبکہ بالشویک ایک چھوٹی سی پارٹی تھے جس کے ارکان کی کل تعداد سارے روس کے اندر فروری انقلاب کے آغاز میں صرف آٹھ ہزار کے قریب تھی۔ایسی معمولی سی اقلیت کیلئے ایک طاقتور ریاست کا تختہ الٹنا کس طرح ممکن تھا؟اگر ہم بغاوت والی دلیل کو تسلیم کرلیں تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ لینن اور ٹراٹسکی جادوئی طاقتوں کے مالک تھے۔یہ ہے پریوں کی کہانیوں والا مواد!مگر افسوس کا مقام ہے کہ حقیقی زندگی میں یا تاریخ میں اس کی کوئی جگہ نہیں۔

دراصل نظریۂ سازش تاریخ کی وضاحت سے قاصر ہے۔یہ اس شے کو فرض کر لیتا ہے جسے ثابت کرنا مقصود ہے۔بحث کا یہ سطحی طریقہ،جس میں فرض کیا جاتا ہے کہ ہر ہڑتال کے پیچھے کارخانے کے

مزدوروں کی مجتمع شدہ بے اطمینانی نہیں بلکہ تخریب کاروں کی کارروائیاں ہوتی ہیں، مخصوص پولیس والی ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن جب یہ دلیل بزعم خود عالموں کی طرف سے سنجیدگی سے پیش کی جاتی ہے تو بندہ حیرت سے صرف اپنا سر ہی کھجا سکتا ہے یا پھر یہ فرض کرتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ذاتی مفاد پوشیدہ ہے۔ اس پولیس والے کا محرک تو بالکل واضح ہے جو ہڑتال کے پیچھے نادیدہ تخریب کاروں کی کارفرمائی دیکھتا ہے لیکن حقیقت میں بحث کا یہ انداز بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ بنیادی تصور یہ ہے کہ مزدور طبقہ اپنے مفادات کو سمجھنے کی اہلیت سے عاری ہے (جو بظاہر ان کے آقاؤں کے مفادات سے مماثل ہیں) لہٰذا اگر وہ اپنے مقدر کو اپنے ہاتھوں میں لینے کیلئے حرکت میں آتے ہیں تو اس کی ایک ہی وضاحت ہو سکتی ہے کہ کچھ بے ضمیر طالع آزما ان کو غلط راستوں پر لگانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن یہ دلیل بھی، جسے عام طور پر جمہوریت کیخلاف بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، اپنے ہدف تک نہیں پہنچتی۔ لینن اور ٹراٹسکی نے کس طرح لوگوں کو ''گمراہ'' کر لیا کہ نو ماہ کے قلیل عرصے میں بالشویک پارٹی ایک معمولی اقلیت سے تبدیل ہو کر سوویتوں میں اکثریت حاصل کر گئی جو کہ سماج کی حقیقی نمائندہ تھیں اور پھر اقتدار پر بھی قبضہ کر لیا؟ محض اس لئے کہ بورژوا عارضی حکومت کا مکمل دیوالیہ آشکار ہو گیا تھا۔ محض اس لئے کہ وہ بورژوا جمہوری انقلاب کا ایک بھی فریضہ ادا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی اور اسے ثابت کرنے کیلئے یہ حقیقت ہی کافی ہے کہ اکتوبر میں بالشویک پارٹی نے ''امن، روٹی اور زمین'' کے پروگرام کی بنیاد پر اقتدار حاصل کیا تھا۔ یہ اس حقیقت کا واضح ترین اظہار ہے کہ عارضی حکومت روسی عوام کی انتہائی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئی تھی۔ صرف اور صرف اسی سے اکتوبر میں بالشویکوں کی کامیابی کی وضاحت ہوتی ہے۔

1917ء کے بارے میں جو بات سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ ہر مرحلے پر عوام کی اکثریت کی سرگرم شرکت ہے۔ دراصل یہی چیز کسی انقلاب کی اصل روح ہوتی ہے۔ عام حالات میں مرد وزن کی اکثریت ذہنی طور پر اس بات کو قبول کرنے کیلئے تیار ہوتی ہے کہ ان کی زندگیوں سے متعلق اہم فیصلے ''سمجھدار لوگ''، یعنی سیاستدان، نوکر شاہی، جج اور ''ماہرین'' کرینگے لیکن فیصلہ کن لمحات میں یہ ''عام'' لوگ ہر شے کو متنازعہ خیال کرنے لگتے ہیں اور اب وہ اس بات سے مطمئن نہیں ہوتے کہ دوسرے حضرات ان کے بارے میں فیصلے کرتے پھریں۔ وہ خود سوچنا اور عمل کرنا چاہتے ہیں۔ قصہ مختصر، وہ اپنی تقدیر کا فیصلہ اپنے ہاتھوں میں لے لیتے ہیں۔ بیوروکریٹوں اور پولیس والوں کو (اور کچھ تاریخ دانوں کو بھی جن کی

ذہنیت ان سے ملتی جلتی ہوتی ہے) یہ بات عجیب وغریب اور خطرناک دیوانگی دکھائی دیتی ہے۔ درحقیقت معاملہ اس کے بالکل الٹ ہے۔ ایسے حالات میں مزدور خودکار مشینوں کی طرح کام کرنے کی بجائے حقیقی انسانوں جیسا رویہ اپنا لیتے ہیں جن کا اپنا ذہن بھی ہوتا ہے اور ارادہ بھی۔ اپنی نظروں میں ان کی وقعت بڑھ جاتی ہے۔

وہ اپنے حالات اور اپنی امنگوں کے بارے میں تیزی سے شعور حاصل کرتے ہیں۔ ایسے حالات میں وہ شعوری طور پر اس پارٹی اور پروگرام کو کھوج نکالتے ہیں جو ان امنگوں کی ترجمان ہوتی ہے اور باقیوں کو وہ مسترد کر دیتے ہیں۔ کسی انقلاب کی نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ پارٹیاں، افراد اور پروگرام تیزی سے عروج وزوال کے مراحل سے گزرتے ہیں اور زیادہ ریڈیکل حصے کی پذیرائی زیادہ ہوتی ہے۔

لینن کی اس دور کی تحریروں میں ہمیں وہ زبردست اعتماد نظر آتا ہے جو اسے عوام کی معاشرے کو تبدیل کرنے کی صلاحیت پر تھا۔ ''سازشی'' ہتھکنڈے اپنانے کی بجائے اس نے مزدوروں، غریب کسانوں اور سپاہیوں کی انقلابی تحریک کو ابھارنے پر زور دیا۔

اپریل تھیسز میں اس نے وضاحت کی کہ ''ہم نہیں چاہتے کہ لوگ محض ہماری باتوں پر یقین کر لیں۔ ہم ڈھونگیئے نہیں ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عوام اپنے تجربات کے ذریعے اپنی غلطیوں کی اصلاح کریں۔''(5)

پھر وہ کہتا ہے کہ ''بغاوت کا انحصار سازش یا کسی ایک پارٹی پر نہیں بلکہ ہراول طبقے پر ہونا چاہیے۔ بغاوت کا انحصار لازمی طور پر عوام کے انقلابی ابھار پر ہونا چاہیے۔''(6)

یہ حقیقت محض حادثاتی نہیں ہے کہ لینن عوام کو پارٹی کے دوبدو لاکھڑا کرتا ہے۔ اگرچہ بالشویک پارٹی نے انقلاب میں کلیدی کردار ادا کیا لیکن یہ کوئی یکطرفہ عمل نہیں بلکہ ایک جدلیاتی عمل تھا۔ لینن نے کئی بار جتلایا کہ عوام بڑی سے بڑی انقلابی پارٹی سے بھی سوگنا زیادہ انقلابی ہوتے ہیں۔ یہ ایک قانون ہے کہ انقلاب کے دوران انقلابی پارٹی اور اس کی لیڈرشپ پر دیگر طبقات کا بھی دباؤ ہوتا ہے۔ ہم نے تاریخ میں بہت مرتبہ اس کا مشاہدہ کیا ہے۔ لیڈرشپ کا کچھ حصہ ایسے شکوک وشبہات اور ہچکچاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس تذبذب پر فتح پانے کیلئے داخلی جدوجہد ضروری ہوتی ہے۔ لینن کی روس واپسی پر بالشویک لیڈروں (زیادہ تر اسٹالن، کامینیف اور زینوویف) نے عارضی حکومت کی طرف صلح جو رویہ اپنایا اور یہاں تک کہ منشویکوں میں ضم ہونے پر بھی غور کیا۔ پارٹی کے نقطۂ نظر میں تبدیلی اس شدید جدوجہد

کے بعد آئی جس میں لینن اور ٹراٹسکی نے ملکر اس امر کیلئے لڑائی کی کہ دوسرا انقلاب برپا کیا جائے جس میں مزدور طبقہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔

اس جدوجہد میں لینن نے سنٹرل کمیٹی سے بالا ہوکر براہ راست ہراول مزدوروں سے اپیل کی۔ اس نے کہا کہ ''مزدوروں اور غریب کسانوں کا ''ملک'' چیرنوفوں اور تسرتیلیوں سے ہزاروں گنا زیادہ بائیں طرف رجحان رکھتا ہے اور ہماری نسبت کئی سو گنا زیادہ۔''(7)

انقلاب کے ہر مرحلے پر عوام کی تحریک ہی انقلاب کو آگے بڑھانے والی قوت تھی۔ بالشویکوں کا فریضہ یہ تھا کہ اس تحریک کو ایک واضح سیاسی و تنظیمی اظہار عطا کریں، اس امر کو یقینی بنائیں کہ اقتدار پر قبضے کیلئے یہ درست لمحے پر مجتمع ہوں اور قبل از وقت بغاوتوں سے بچیں جو پسپائی کا باعث بن سکتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ عوام کو کچھ وقت کیلئے روک کر رکھا جائے۔ پیٹروگراڈ کی وائی بورگ کمیٹی نے جون میں لکھا کہ ''ہمیں آگ بجھانے والے پانی کا کام کرنا ہے۔''(8)

اگست میں ہونے والی چھٹی پارٹی کانگریس میں بالشویک پوڈوسکی نے اعتراف کیا کہ ''ہم اپنا آدھا وقت عوام کو ٹھنڈا کرنے کیلئے صرف کرنے پر مجبور تھے۔''(9)

مسلسل حرکت

تمام پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار عینی شاہد عوام کی غیر معمولی شرکت کے گواہ ہیں۔ مارک فیرو کے الفاظ میں ''زار شاہی کا تختہ الٹنے کے بعد نئے روس کے شہری مسلسل حرکت کی حالت میں تھے۔''(10)

ایک نمایاں منشویک نکولائی سخانوف لکھتا ہے کہ ''ان دنوں تمام روس مظاہرے کر رہا تھا۔ تمام صوبوں میں گلیوں میں ہونے والے مظاہرے معمول کی بات تھے۔''

لینن کی بیوی کروپسکایا بتاتی ہے:

''ان دنوں گلیاں عجیب منظر پیش کرتی تھیں، ہر جگہ لوگ جتھوں کی شکل میں کھڑے ہوتے تھے اور تازہ ترین واقعات پر گرما گرم بحث کر رہے ہوتے تھے۔ ان مباحثوں کو کوئی چیز منقطع نہیں کر سکتی تھی۔ جس گھر میں ہم رہتے تھے اس کے سامنے صحن تھا اور یہاں بھی اگر آپ کھڑکی کھولیں تو آپ کو گرم گرم مباحثہ

سننے کو ملتا تھا۔ ایک سپاہی بیٹھا ہوتا تھا اور اس کے پاس ہمیشہ سامعین موجود ہوتے تھے۔ عام طور پر پڑوسیوں کے خانساماں، نوکرانیاں یا کچھ نوجوان لوگ۔ آدھی رات کے بعد آپ گفتگو کے ٹکڑے سن سکتے تھے۔ ''بالشویک منشویک''۔ صبح تین بجے، ملیوکوف بالشویک۔ پانچ بجے بھی اسی قسم کی سیاسی گفتگو جاری ہوتی تھی۔ میرے ذہن میں پیٹروگراڈ کی چاندنی راتوں کے ساتھ ساتھ شب بھر جاری رہنے والی یہ سیاسی بحثیں بھی موجود ہیں۔'' (12)

جان ریڈ بھی یہی تصویر پیش کرتا ہے، ''محاذ جنگ پر سپاہیوں نے افسروں سے اپنی جنگ لڑی اور اپنی کمیٹیوں کے ذریعے حکومت خود کرنا سیکھی۔ فیکٹریوں میں ان لاثانی روسی تنظیموں نے، (جنہیں فیکٹری شاپ کمیٹی کہا جاتا تھا) پرانے نظام کے ساتھ لڑائی کے دوران تجربہ اور قوت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے تاریخی فریضے کا ادراک بھی کیا۔ تمام روس سیاست، معاشیات، تاریخ پڑھنا سیکھ اور سمجھ رہا تھا کیونکہ لوگ جاننا چاہتے تھے۔ محاذ کے ساتھ ساتھ ہر شہر میں اور اکثر قصبوں میں ہر سیاسی دھڑے کا اپنا اخبار تھا۔ بعض اوقات کئی کئی اخبار ہوتے تھے۔ ہزاروں تنظیمیں لاکھوں پمفلٹ نکالتی تھیں اور انہیں فوجیوں میں، دیہاتوں میں، فیکٹریوں اور گلیوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ تعلیم کے حصول کی پیاس جو مدت سے دبی ہوئی تھی انقلاب کے ساتھ زبردست طریقے سے ظاہر ہوئی۔ صرف سمالنی انسٹیٹیوٹ سے پہلے چھ مہینوں میں ہر روز ٹنوں کے حساب سے لٹریچر ٹرکوں اور ریلوں کے ذریعے زمین کو سیراب کر رہا تھا۔ روس تحریری مواد کو یوں جذب کر رہا تھا جس طرح گرم ریت پانی کو جذب کرتی ہے۔ یہ ایک نہ بجھنے والی پیاس تھی اور یہ کہانیاں، مسخ شدہ تاریخ، رقیق شدہ مذہب یا اخلاق باختہ کرنے والے سستے قصے نہیں تھے بلکہ سماجی و معاشی نظریات، فلسفہ، ٹالسٹائی، گوگول اور گورکی کی کتابیں تھیں۔

تھیٹروں، سرکسوں، سکولوں، کلبوں، سوویتوں، یونین ہیڈکوارٹروں اور فوجیوں کی بیرکوں میں لیکچر، مباحثے اور تقریریں ہوتی تھیں۔ محاذ جنگ پر خندقوں میں گاؤں کے چوراہوں میں اور فیکٹریوں میں اجتماعات ہوتے تھے۔ کیسا شاندار نظارہ ہوتا تھا جب پوتیلوف فیکٹری کے چالیس ہزار مزدور باہر نکل کر سوشل ڈیموکریٹوں، سوشل انقلابیوں، انارکسٹوں کو اور ہر اس شخص کو سنتے تھے جس کے پاس کہنے کو کچھ ہوتا تھا۔ مہینوں تک پیٹروگراڈ اور تمام روس میں ہر گلی کے نکڑ پر جمہوری میلا لگا ہوتا تھا۔ ریل گاڑیوں اور بسوں میں ہر جگہ اور ہمیشہ برجستہ بحثیں پھوٹتی تھیں۔'' (13) چھپے ہوئے لفظ میں بے پناہ دلچسپی سے مختلف تصورات کیلئے پیاس منعکس ہوتی تھی۔ جان ریڈ محاذ کی اگلی صفوں میں فوجیوں کی صورتحال بیان کرتا ہے،

”ریگا کی پشت پر ہم بارہویں فوج کے محاذ پر پہنچے جہاں کیچڑ بھری خندقوں میں ننگے پاؤں، فاقہ زدہ اور بیمار فوجی موجود تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ چوکس ہو گئے حالانکہ ان کے چہرے دھنسے ہوئے تھے اور ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں کے نیچے گوشت نیلاہٹ آمیز رنگت لیے ہوئے تھا۔ وہ بے چینی سے تقاضا کر رہے تھے کیا تم ہمارے پڑھنے کیلئے کچھ لائے ہو؟“ (14)

بالشویک پارٹی کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس وہ واحد پروگرام تھا جو صحیح راستہ دکھاتا تھا۔ لینن کا مشہورِ زمانہ نعرہ تھا ”صبر و سکون کے ساتھ وضاحت کرو!“ عوام کا منشویکوں اور سوشل ڈیموکریٹوں کے پروگرام سے سابقہ پڑا اور انہوں نے یہ مسترد کر دیئے۔ رفتہ رفتہ بالشویک امیدواروں کے ووٹوں میں اضافہ ہوا اور ستمبر تک انہیں ماسکو، پیٹروگراڈ، کیف، اوڈیسا اور تمام بڑے شہروں کی سوویتوں میں اکثریت حاصل ہو گئی۔ اس مقام پر پہنچ کر مسترد شدہ عارضی حکومت سے اقتدار لیکر، جو کہ محض اپنی ہی نمائندگی کرتی تھی، سوویتوں کو یعنی مزدوروں اور سپاہیوں (زیادہ تر کسان) کی اکثریت کی جمہوری نمائندہ تنظیموں کو اقتدار سونپنا ایک لازمی ضرورت بن گئی تھی۔ اس عرصے میں بالشویک پارٹی کو جو عروج حاصل ہوا اس کی مثال سیاسی پارٹیوں کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ فروری میں تقریباً آٹھ ہزار ممبروں سے بڑھ کے جولائی میں چھٹی کانگریس تک یہ تعداد 177,000 ہو گئی۔ علاوہ ازیں ہمیں یہ ضرور یاد رکھنا چاہیے کہ یہ سب کچھ ایک انتہائی کمزور ڈھانچے اور انتہائی جبر و تشدد کے حالات کے باوجود ہوا۔ کرپسکایا لکھتی ہے، ”خاص طور پر سپاہیوں میں بالشویک اثرات کا نشوونما پانا یقینی تھا۔ چھٹی کانگریس نے بالشویکوں کی قوت کو مزید یکجا کر دیا۔ چھٹی پارٹی کانگریس کے نام سے جاری ہونے والی اپیل میں عارضی حکومت کی رد انقلابی پوزیشن کے علاوہ متوقع عالمی انقلاب اور طبقات کی جنگ کا ذکر تھا“۔ (15)

پارٹی کی عددی قوت میں اضافہ اس زبردست اور تیز رفتار ترقی کا محض جزوی اظہار تھا جو اسے عوام میں اور سب سے بڑھ کر مزدوروں اور سپاہیوں کی سوویتوں میں حاصل ہو رہی تھی۔ مارسل لیبمین پارٹی کی ترقی کو اس طرح بیان کرتا ہے، ”لینن کی پارٹی نے 1917ء کے سارے سال میں نمایاں اور تقریباً مستقل انتخابی کامیابیاں حاصل کیں۔ اگرچہ انقلاب کے شروع میں پیٹروگراڈ سوویت میں انکی معمولی نمائندگی تھی لیکن مئی تک اس ادارے کے مزدوروں کے شعبے میں بالشویکوں کو تقریباً مکمل اکثریت حاصل ہو چکی تھی۔ ایک ماہ بعد پیٹروگراڈ کی فیکٹری کی پہلی کانفرنس میں 568 نمائندوں میں سے تین چوتھائی نے بالشویکوں کے تھیسز (theses) کے حق میں رائے دی۔ تاہم عارضی حکومت کی مخالفت کی پالیسی کے

مکمل ثمرات موسم گرما کے آخر میں ہی حاصل ہوئے۔ جون میں پیٹروگراڈ کے میونسپل انتخابات میں بالشویکوں کو بیس سے اکیس فیصد ووٹ ملے مگر اگست میں جبکہ پارٹی پر جولائی کے واقعات کے نتائج کا اثر موجود تھا، اسے تینتیس فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ جون میں ماسکو میں بالشویکوں کو بارہ فیصد سے کچھ ہی زیادہ ووٹ ملے تھے۔ ستمبر میں انہوں نے اکیاون فیصد ووٹوں کے ساتھ قطعی اکثریت حاصل کر لی۔ مزدور طبقے پر ان کی زبردست گرفت اس ترقی سے واضح ہے جو فیکٹری کمیٹیوں کی کانفرنس میں ان کی نمائندگی کو حاصل ہوئی۔ ستمبر تک پیٹروگراڈ میں ان تنظیموں کی علاقائی سطح پر منشویک یا سوشل انقلابی اپنی نمائندگی کھو چکے تھے اور ان کی جگہ بالشویکوں نے لے لی تھی۔'' (16)

اس موضوع پر آخری بات کہنے کیلئے ہم بالشوزم کے ایک نمایاں مخالف، روسی انقلاب کے عینی شاہد اور تاریخ دان منشویک سخانوف کو دعوت دینگے۔ ستمبر کے آخری دنوں کے حالات بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے، ''بالشویک بغیر کوئی موقع دیئے نہایت ڈھٹائی سے کام کر رہے تھے۔ وہ عوام اور فیکٹریوں میں ہر روز بغیر کسی وقفے کے موجود ہوتے تھے۔ ہر روز چھوٹے بڑے سینکڑوں مقررین پیٹرزبرگ کی فیکٹریوں اور بیرکوں میں تقریریں کر رہے ہوتے تھے۔ عوام کیلئے وہ اپنے ہی لوگ بن چکے تھے کیونکہ وہ ہر وقت وہاں موجود ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے لیکر فیکٹریوں اور فوجی بیرکوں کے اہم ترین معاملات میں وہ راہنمائی کرتے تھے۔ وہ واحد امید بن چکے تھے۔ عوام بالشویکوں کے ساتھ جیتے اور سانس لیتے تھے۔'' (17)

پارٹی اور طبقہ

روسی انقلاب نو ماہ کے عرصے پر محیط تھا۔ اس دوران بالشویک پارٹی نے انتہائی جمہوری ذرائع استعمال کرتے ہوئے مزدوروں اور غریب کسانوں کی فیصلہ کن اکثریت کو جیت لیا۔ اسی سے اس امر کی وضاحت ہوسکتی ہے کہ انہوں نے کرنسکی کی مزاحمت پر اتنی آسانی سے کیسے قابو پالیا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم دیکھیں گے بالشویکوں کے پاس کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا کہ وہ سماج کی واضح اکثریت کی حمایت کے بغیر اقتدار پر قابض رہ سکتے۔ ہر مرحلے پر عوام کی سرگرم مداخلت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ اسکی مہر سارے عمل پر ثبت ہے۔ حکمران طبقہ اور اس کے سیاسی و فوجی نمائندے محض اپنے دانت ہی کچکچا سکتے تھے مگر اقتدار کو

اپنے ہاتھوں سے پھسلنے سے نہیں روک سکتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ انقلاب کیخلاف مستقل سازشوں میں ملوث تھے جن میں جنرل کورنیلوف کی وہ فوجی بغاوت بھی شامل ہے جو کرنسکی کا تختہ الٹ کر ایک فوجی آمریت قائم کرنے کیلئے کی گئی تھی۔ مگر عوام کی تحریک کے آگے یہ سب کچھ دھرا رہ گیا۔

بالشویکوں کیلئے عوامی حمایت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اعتراف اس وقت ہر کسی نے کیا جن میں انقلاب کے بدترین دشمن بھی شامل ہیں۔ فطری امر ہے کہ وہ اس کا ذمہ دار ہر طرح کے غلط عوامل ''جذباتی خطابت''، کسانوں اور مزدوروں کے ناپختہ پن، ان کی مبینہ جہالت کو قرار دیتے ہیں اور اس کے علاوہ تمام دوسرے دلائل جو بذات خود جمہوریت کے خلاف استعمال ہوتے ہیں۔ یہ بات یقیناً عظیم ترین اسراروں میں سے ایک ہے کہ عوام صرف اس وقت ناپختہ اور جاہل کیسے بن گئے جب انہوں نے عارضی حکومت کی حمایت ترک کی۔ لیکن اگر ہم کمینگی، کینہ پروری اور لاچارگی کے غصے سے صرف نظر کر لیں تو ہمیں دائیں بازو کے ایک اخبار میں یہ قابل قدر اعتراف دکھائی دے گا کہ بالشویکوں کو واقعی عوام کی حمایت حاصل تھی۔ 28 اکتوبر کو رسکایا وولیا نے مندرجہ ذیل سطریں تحریر کیں، ''بالشویکوں کی کامیابی کے امکانات کیا ہیں؟ اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے کیونکہ ان کی سب سے بڑی حامی عوام کی جہالت ہے۔ وہ اسی پر داؤ لگاتے ہیں اور اس پر اپنی جذباتی خطابت کا ایسا زور لگاتے ہیں کہ اس کا مقابلہ کوئی شے نہیں کر سکتی۔'' (18)

1917ء میں جو کچھ ہوا اسے عوام کے مرکزی کردار کو دیکھے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ 94-1789ء کے فرانسیسی انقلاب کے بارے میں بھی یہ بات درست ہے جسے تاریخ دان اکثر سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ (اس میں استثنیات موجود ہیں جن میں کروپوٹکن نامی انارکسٹ اور ہمارے اپنے عہد کا جارج روڈ قابل ذکر ہیں) لیکن یہاں ہم تاریخ میں پہلی بار مزدور طبقے کو واقعتاً اقتدار پر کامیابی سے قابض ہوتے اور کم از کم سماج کی سوشلسٹ تبدیلی کی شروعات کرتے دیکھتے ہیں، اگر ہم پیرس کمیون کے مختصر مگر شاندار دور کو شمار نہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم کے دشمن اکتوبر انقلاب کے بارے میں دروغ گوئی اور بہتان تراشی پر مجبور ہیں۔ وہ لینن اور بالشویکوں کو اس وجہ سے کبھی معاف نہیں کر سکتے کہ انہوں نے کامیابی سے پہلے کامیاب سوشلسٹ انقلاب کی راہنمائی کی اور یہ ثابت کیا کہ ایسی بات ممکن ہے اور اس طرح مستقبل کی نسلوں کو ایک راستہ سمجھایا۔ اس قسم کی مثال خطرناک ہے! لہٰذا یہ ''ثابت'' کرنا ضروری ہے (معمول کے مطابق ''غیر جانبدار'' عالموں کی اعانت سے) کہ یہ سب کچھ بہت غلط تھا جسے قطعاً دہرایا نہیں جانا

چاہیے۔

اکتوبر انقلاب کو بغاوت ثابت کرنے کیلیئے اکثر اوقات جواز کے طور پر اس معمولی تعداد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو بذات خود بغاوت میں براہ راست ملوث تھی۔ بظاہر گہری دکھائی دینے والی یہ دلیل معمولی سے جائزے کی مزاحمت بھی نہیں کر سکتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ مسلح بغاوت کو انقلاب کے ساتھ گڈ مڈ کرتی ہے یعنی یہ جز کو کل خیال کرنے کی غلطی کرتی ہے۔ حقیقت میں بغاوت انقلاب کا محض ایک جزو ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ بہت اہم جزو ہوتی ہے۔ ٹراٹسکی اسے لہر کے اوپری جھاگ دار حصے سے تشبیہہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیٹروگراڈ میں ہوانیوالی لڑائی بہت معمولی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انقلاب میں خونریزی نہیں ہوئی اسکی وجہ یہ تھی کہ مزدوروں اور سپاہیوں کی فیصلہ کن اکثریت کو جیت کر دس میں سے نو حصے کام پہلے ہی مکمل کیا جا چکا تھا۔ تب بھی پرانے نظام کی مزاحمت پر قابو پانے کیلیئے مسلح طاقت کا استعمال ضروری تھا۔ کسی بھی حکمران طبقے نے کبھی بھی لڑے بغیر ہتھیار نہیں ڈالے۔ مگر مزاحمت برائے نام تھی۔ حکومت ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گئی کیونکہ کوئی بھی اس کا دفاع کرنے کو تیار نہیں تھا۔

ماسکو میں زیادہ تر مقامی بالشویکوں کی غلطیوں کی وجہ سے، جنہوں نے زیادہ توانائی کا مظاہرہ نہیں کیا، ردانقلابی فوجی افسران نے ابتدائی طور پر جارحانہ رویہ اپنا کر قتل عام کیا۔ اس کے باوجود یہ امر نا قابل یقین ہے کہ انہیں اس یقین دہانی کے بعد چھوڑ دیا گیا کہ وہ وعدہ کریں کہ آئندہ سوویت اقتدار کیخلاف تشدد آمیز حرکات نہیں کریں گے۔ انقلاب کے ابتدائی دنوں میں اس قسم کی باتیں عام تھیں جن سے عوام کی اس سادہ لوحی کا اظہار ہوتا ہے کہ ابھی انہیں اندازہ نہیں تھا کہ پرانے نظام کا دفاع کرنے والے کس قدر خوفناک تشدد پر اتر سکتے تھے۔ خونخوار اور دہشت ناک ہونے کے برخلاف انقلاب غیر معمولی طور پر مہربان تھا، جب تک ردانقلاب نے اپنی حقیقی فطرت ظاہر نہیں کی۔ بالشویکوں کیخلاف پہلی بغاوت کرنے والا سفید جنرل پی کراسنوف تھا جو قزاقوں کی سربراہی کر رہا تھا، سرخ محافظوں نے اسے شکست دے دی اور قزاقوں نے اسے خود پکڑ کر انکے حوالے کر دیا مگر ایک بار پھر اسے مشروط طور پر رہا کر دیا گیا۔ اس بارے میں وکٹر سرجی بجا طور پر کہتا ہے، ''انقلاب نے قزاقوں کے حملے کے لیڈر کے سلسلے میں فراخ دلی کا مظاہرہ کر کے غلطی کی۔ اسے موقع پر ہی گولی مار دینا چاہیے تھی۔ اپنی غیرت کی قسم کھا کر یہ عہد کرنے کے بعد کہ وہ انقلاب کے خلاف آئندہ ہتھیار نہیں اٹھائے گا اسے چند روز بعد رہا کر دیا گیا۔ لیکن ملک اور نجی ملکیت کے دشمنوں کے سامنے کیئے گئے وعدوں کی کیا حیثیت ہے؟ بعدازاں وہ ڈان کے علاقے میں پہنچ گیا اور وہاں

آگ اور خون کی ہولی کھیلی۔'' (19)

کیا جنگ میں حصہ لینے والوں کی نسبتاً کم تعداد کا مطلب یہ ہے کہ اکتوبر انقلاب ایک کوُ (COUP) تھا؟ طبقاتی جنگ اور قوموں کے درمیان جنگ میں بہت سی مماثلات ہیں۔ موخرالذکر صورت میں بھی آبادی کا ایک چھوٹا سا حصہ مسلح افواج میں ہوتا ہے اور فوج کی ایک چھوٹی سی تعداد محاذ جنگ پر ہوتی ہے۔ ایک بڑی لڑائی کی صورت میں بھی ان کی ایک چھوٹی سی تعداد ہی عام طور پر کسی ایک وقت میں براہ راست لڑائی میں ملوث ہوتی ہے۔ تجربہ کار فوجی جانتے ہیں کہ دوران جنگ بہت سا وقت بیکار بیٹھ کر صرف کیا جاتا ہے۔ اکثر اوقات بیرکوں میں محفوظ فوجیوں کو سرگرم عمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ علاوہ ازیں گھروں میں موجود آبادی کی دلی حمایت کے بغیر کامیابی سے جنگ لڑنا ممکن ہی نہیں ہوگا اگرچہ وہ براہ راست جنگ میں حصہ نہیں لیتی۔ ویت نام کی جنگ کے آخری مراحل میں یہ سبق پینٹا گون کی ناک پر کھودا گیا تھا۔

اس دلیل کو کہ بالشویک عوام کی حمایت کے بغیر اقتدار پر قبضے کے قابل ہو گئے تھے عموماً اس تصور کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے کہ اقتدار پر قبضہ مزدور طبقے نے نہیں بلکہ ایک پارٹی نے کیا تھا۔ یہ دلیل بھی بالکل غلط ہے۔ تنظیم، ٹریڈ یونین اور پارٹی کے بغیر مزدور طبقہ محض استحصال کیلئے خام مال ہوتا ہے۔ مارکس اس بارے میں بہت عرصہ پہلے ہی کہہ چکا ہے۔ یہ درست ہے کہ پرولتاریہ بے پناہ قوت رکھتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی پہیہ نہیں چل سکتا اور نہ ہی کوئی بلب روشن ہوسکتا ہے۔ مگر تنظیم کے بغیر یہ قوت محض ایک امکان ہی رہتی ہے۔ اسی طرح بھاپ میں بہت قوت ہوتی ہے مگر انجن کے بغیر یہ بے ضرر انداز میں ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ مزدور طبقے کی قوت کو محض ایک امکان سے حقیقت میں تبدیل کرنے کیلئے اس کو منظّم کر کے ایک واحد نقطے پر مرکوز کرنا ضروری ہے۔ یہ صرف ایک ایسی سیاسی پارٹی کے ذریعے کیا جا سکتا ہے جس کی لیڈرشپ جرأت مند اور دوراندیش ہو اور اس کا پروگرام درست ہو۔ لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ کے تحت بالشویک پارٹی ایک ایسی ہی پارٹی تھی۔ عوام کی تحریک (ایک ایسی شاندار تحریک جو روسی سماج کے تمام تر زندہ اور متحرک حصوں کی نمائندگی کرتی تھی) پر انحصار کرتے ہوئے انہوں نے اسے ہیئت، مقصد اور آواز مہیا کی۔ حکمران طبقے اور مزدور تحریک میں اس کے ہم خیال لوگوں کے نقطہ نظر کے مطابق یہی اس کا سب سے بڑا گناہ ہے۔ بالشوازم سے نفرت و کراہت، تند و ترش تنقید اور کینہ پروری پر مبنی رویے کی تہہ میں یہی راز نہاں ہے جو تین نسلوں کے بعد آج بھی ان کے رویے پر مکمل طور پر حاوی

ہے۔

اپنی ہمت و جوانمردی کے باوجود مزدور 1917ء میں بالشویک پارٹی، لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ کے بغیر کبھی اقتدار حاصل نہ کر سکتے۔ انقلابی پارٹی عین وقت پر تیار نہیں کی جاسکتی بالکل اسی طرح جیسے جنرل سٹاف کی تشکیل جنگ چھڑنے پر نہیں کی جاسکتی۔ اسے سالوں اور عشروں پر محیط عرصے میں منظّم انداز میں ترتیب دینا پڑتا ہے۔ اس کا ثبوت تمام تاریخ، بالخصوص بیسویں صدی کی تاریخ میں ملتا ہے۔ عظیم انقلابی اور مزدور طبقے کی شہید روزا لکسمبرگ اس بات پر ہمیشہ زور دیتی تھی کہ عوام کی انقلابی پہل گامی انقلاب کی بنیادی قوت ہے۔ اس بارے میں وہ بالکل درست تھی۔ انقلاب کے دوران عوام بہت تیزی سے سیکھتے ہیں مگر انقلابی صورت حال کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتی۔ نہ تو سماج ہی مستقل ہیجان کی کیفیت میں رہ سکتا ہے اور نہ ہی مزدور طبقہ شدید سرگرمی کی کیفیت میں۔ اسی مدت میں یا تو کوئی راستہ کھلتا ہے یا پھر یہ لمحہ ضائع ہو جاتا ہے۔ نہ تو تجربات کیلئے کافی وقت ہوتا ہے اور نہ ہی مزدوروں کیلئے اپنی غلطیوں سے سیکھنے کیلئے زیادہ وقت ہوتا ہے۔ زندگی اور موت کی صورتحال میں غلطیوں کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ عوام کی ''برجستہ'' تحریک کو تنظیم، پروگرام، پیش منظر، حکمت عملی اور طریقہ کار سے منسلک کیا جائے یعنی ایک انقلابی پارٹی کے ساتھ، جس کی رہنمائی تجربہ کار کیڈرز کے ہاتھ میں ہو۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ ہر مرحلے پر بالشویکوں کے سامنے عالمی انقلاب کا پیش منظر موجود رہا ہے۔ انہیں اس بات پر قطعاً یقین نہیں تھا کہ وہ صرف روس کے اندر اقتدار پر قابض رہ سکتے ہیں۔ یہ اکتوبر انقلاب کی قوت کا زبردست ثبوت ہے کہ تمام تر نشیب و فراز، سٹالنزم کے تمام تر جرائم اور دوسری جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے باوجود بنیادی فتوحات اتنے طویل عرصے تک قائم رہیں۔ اس وقت بھی جب باقی دنیا کی مدد سے محروم ہونے کے بعد اسے محض اپنے وسائل پر تکیہ کرنا پڑا۔ یہاں تک کہ آخری دور میں بھی سٹالنزم کی ٹوٹ پھوٹ قومیائی گئی منصوبہ بند معیشت کی کسی جبلی خرابی کے باعث نہیں ہوئی بلکہ اس کا باعث نوکرشاہی کا دھوکہ اور غداری تھی جس کے بارے میں ٹراٹسکی نے نہایت شاندار انداز میں پیش گوئی کی تھی اور جو اپنی مراعات قائم رکھنے کی کوشش میں سرمایہ داری کے ہاتھوں بک گئی۔

تمام اقتدار سوویتوں کو دو

اکتوبر انقلاب کیخلاف بہتان تراشی کے ساتھ ساتھ ضمنی نتیجے کے طور پر فروری انقلاب کی تصویر کشی شاندار انداز میں کی جاتی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اگر بالشویک رنگ میں بھنگ نہ ڈالتے تو کرنسکی کی ''جمہوری'' حکومت روس کو روشن اور خوشحال مستقبل کی طرف لے جاتی۔ افسوس! فروری انقلاب کی بے عیبی کسی معمولی تنقیدی جائزے کی متحمل بھی نہیں ہوسکتی۔ زار شاہی کا تختہ الٹ کر آنیوالا فروری انقلاب قومی جمہوری انقلاب کے وظائف میں سے ایک بھی پورا نہ کرسکا جیسے زرعی اصلاحات، ایک جمہوری مملکت اور قومی سوال۔ یہ اس قابل نہیں تھا کہ عوام کے انتہائی بنیادی مطالبات ہی پورے کرسکتا یعنی سامراجی قتل عام کا خاتمہ اور نتیجہ خیز جمہوری امن۔ قصہ کوتاہ یہ کہ نو ماہ کے دوران کرنسکی حکومت نے روسی عوام کی انتہائی بنیادی ضروریات کے حل کے سلسلے میں مکمل نااہلی کا ثبوت دیا۔ یہی اور صرف یہی حقیقت ہے جس نے بالشویکوں کو سماج میں فیصلہ کن اکثریت کی حمایت سے اقتدار میں آنے کا اہل بنایا۔ پہلی جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا شکار ہونے والا زار شاہی روس خاص طور پر فرانس، جرمنی اور برطانیہ کی ایک نیم نوآبادی تھا۔ روس دنیا کی صنعتی پیداوار کا صرف تین فیصد پیدا کرتا تھا۔ اس میں عالمی سطح پر مقابلہ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ اس میں ہر چار سو مربع کلومیٹرز مین کیلئے صرف اعشاریہ چار کلومیٹر ریل کی پٹڑی موجود تھی۔ اسکی آبادی کا تقریباً اسی فیصد حصہ اپنے گزر اوقات کیلئے زمینوں پر کام کرتا تھا جو چھوٹے چھوٹے لاکھوں قطعہ ہائے اراضی پر مشتمل تھی۔ روسی بورژوازی تاریخ کے دھارے میں بہت دیر سے شامل ہوئی تھی۔ یہ بورژوا جمہوری انقلاب کے ان فرائض میں سے کوئی بھی فریضہ ادا کرنے میں ناکام رہی جو برطانیہ اور فرانس میں سترہویں اور اٹھارویں صدی میں پورے کئے جاچکے تھے۔ اس کے برعکس روسی سرمایہ دار ایک طرف سامراج اور دوسری طرف روسی اشرافیہ کی حمایت پر تکیہ کرتا تھا۔ وہ پرانے جاگیرداروں اور طبقۂ خواص کے ساتھ ہزار بندھنوں میں بندھا ہوا تھا۔ 1905ء کے انقلاب سے دہشت زدہ ہو کر بورژوازی مزدوروں کے سلسلے میں زیادہ مشکوک اور قدامت پسند ہوگئی تھی۔ اب یہ کوئی انقلابی کردار ادا نہیں کرسکتی تھی۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے، ''اپنی تاریخ کے آغاز پر یہ اتنی ناپختہ تھی کہ اصلاحات نافذ نہیں کرسکتی تھی اور اب جب انقلاب کی رہنمائی کا وقت آیا تو یہ ضرورت سے زیادہ پک چکی تھی۔''

روس کا واحد انقلابی طبقہ وہاں کا چھوٹا، نوخیز مگر انتہائی مرکوز پرولتاریہ تھا۔ ناہموار اور مشترک ترقی

کے قانون کے مطابق ایک پسماندہ ملک ترقی یافتہ ممالک کی مادی اور ذہنی فتوحات کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ یہ غلامانہ انداز میں ماضی کے تمام مراحل کو دہراتا نہیں بلکہ درمیانی مراحل کے پورے پورے سلسلے حذف کر دیتا ہے۔اس کی وجہ سے ترقی متضاد انداز میں ہوتی ہے جس میں انتہائی پسماندہ حالات پر انتہائی ترقی یافتہ خدوخال کی چھاپ ہوتی ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری کے باعث روس میں انتہائی جدید صنعتوں اور فیکٹریوں کا وجود عمل میں آیا تھا۔کسان اپنی زمین چھوڑ کر صنعت میں داخل ہوئے اور راتوں رات صنعتی مزدور بننے پر مجبور ہو گئے۔روسی سماج کو بند گلی سے نکالنے کی ذمہ داری اس نوخیز روسی پرولتاریہ پر آن پڑی جس میں اپنے مغربی ساتھیوں جیسی 'قدامت پسندانہ' روایات کا کوئی وجود نہیں تھا۔فروری حکومت کو اکتوبر حکومت کے مقابل لا کھڑا کرنے کی کوشش بے بنیاد ہے۔اگر بالشویک اقتدار پر قبضہ نہ کرتے تو روس کا مستقبل سرمایہ دارانہ جمہوریت پر مبنی خوشحال نہیں بلکہ کورنیلوف یا کسی دوسرے سفید جنرل کے بوٹوں تلے ہوتا اور فسطائی بربریت کا دور دورہ ہوتا۔ایسی صورتحال آگے کی جانب پیش قدمی نہیں بلکہ ارتقائے معکوس کی شکل میں ایک خوفناک پسپائی ہوتی۔

اکتوبر انقلاب میں فاتح پرولتاریہ کو پہلے قومی جمہوری انقلاب کی بنیاد پر مسائل حل کرنے پڑے جس کے بعد وہ بلا تعطل سوشلسٹ فرائض کی ادائیگی میں مصروف ہو گیا۔یہی نظریہ مسلسل انقلاب کی اصل روح تھی۔جیسا کہ لینن نے واضح کیا تھا سرمایہ داری اپنی کمزور ترین کڑی سے ٹوٹ گئی تھی۔اکتوبر انقلاب عالمی سوشلسٹ انقلاب کی نمائندگی کرتا تھا۔ **1905**ء کے انقلاب کی طرح **1917**ء کے فروری انقلاب میں بھی مزدوروں اور فوجیوں کی کمیٹیاں فوراً وجود میں آ گئی تھیں۔ یہ کمیٹیاں یا سوویتیں ہڑتالی کمیٹیوں سے تبدیل ہو کر اقتدار کے حصول کیلئے مزدور طبقے کی جدوجہد کے سیاسی آلات میں بدل گئیں اور بعد ازاں نئی مزدور ریاست کے انتظامی ڈھانچوں میں ۔ یہ جمہوریت میں علاقائی بنیادوں پر منتخب ہونیوالے اداروں کی نسبت کہیں زیادہ جمہوری اور لچکدار تھیں۔ مارکس کے بقول سرمایہ دارانہ جمہوریت مزدوروں کو اجازت دیتی ہے کہ وہ ہر پانچ سال بعد اپنے مفادات کی غلط نمائندگی کرنیوالی پارٹیوں کا انتخاب کریں۔روس میں کسانوں کی سوویتوں کے قیام کے بعد وہ آبادی کی اکثریت کا احاطہ کرتی تھیں۔

فروری سے اکتوبر کے درمیان نو ماہ میں سرمایہ دار ریاست کے مقابلے میں سوویتیں ایک مخالف قوت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ 'دوہرے اقتدار' کا دور تھا۔اس دور میں بالشویکوں کا ایک بنیادی مطالبہ یہ تھا کہ "تمام اقتدار سوویتوں کو منتقل کیا جائے!" کئی ماہ تک صبر سے وضاحت کرنے کی وجہ سے اور تلخ

تجربات سے گزرنے کے باعث مزدوروں اور غریب کسانوں کی اکثریت بالشوازم کی طرف مائل ہوگئی۔ اکتوبر انقلاب میں ایک نئی انقلابی حکومت برسراقتدار آئی جس کی باگ ڈور سوویتوں کی کانگریس کے ہاتھ میں تھی۔ عام عقیدے کے برعکس یہ ایک پارٹی کی حکومت نہیں تھی بلکہ بنیادی طور پر یہ بالشویکوں اور لیفٹ سوشل انقلابیوں کے اتحاد کی حکومت تھی۔ حکومت کے پیش نظر سب سے فوری کام سوویت اقتدار کی حکمرانی یعنی مزدور طبقے کو پورے روس میں پھیلانا تھا۔

5 جنوری 1918ء کو حکومت نے ایک فرمان جاری کیا جس کی رو سے آئندہ کیلئے سوویتوں کو وہی اختیارات دیئے گئے جو اس سے پہلے انتظامیہ کو حاصل تھے اور مزید کہا گیا کہ ''تمام ملک میں سوویتوں کا جال پھیلایا جائے۔''

اصلاح پسندوں کے دعوے سے قطع نظر سوویتوں کا نظام خالصتاً روسی مظہر نہیں تھا۔ نومبر 1918ء کے جرمن انقلاب نے بھی فوری طور پر اسی قسم کی تنظیموں کو جنم دیا تھا۔ یہ مزدوروں کی خود تنظیمی کی تجسیم تھیں۔ جرمنی کے ہر شہر، بندرگاہ اور فوجی بیرک میں مزدوروں، فوجیوں اور ملاحوں کی کونسلیں قائم ہوئیں جو موثر سیاسی قوت رکھتی تھیں۔ بوریا میں بھی سوویتیں قائم ہوئی تھیں اور ہنگری میں رونما ہونیوالے 1919ء کے انقلاب کے دوران بھی۔ برطانیہ میں بھی 1920ء میں رہنما کونسلیں قائم ہوئی تھیں جن کو لینن نے ''نام سے قطع نظر سوویتیں'' قرار دیا تھا۔ علاوہ ازیں 1926ء کی عام ہڑتال کے دوران بھی ایکشن کمیٹیاں اور ٹریڈ کونسلیں بنی تھیں۔ اگرچہ سٹالنسٹوں اور اصلاح پسندوں نے سوویتوں کو از سرنو ابھرنے سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ 1956ء میں رونما ہونیوالے ہنگری کے انقلاب میں بڈاپسٹ ورکرز کونسل کی شکل میں دوبارہ ظہور پذیر ہوئیں۔ اپنی شروعات کے حوالے سے سوویت آج تک وجود میں آنیوالی مقبول عام نمائندگی کی سب سے زیادہ جمہوری اور لچکدار شکل ہے جو محض ہڑتالی کمیٹی کی ہی اگلی کڑی تھی۔ عوامی جدوجہد میں جنم لینے کے بعد سوویتوں یا مزدوروں کی کونسلوں نے بہت وسعت اختیار کرلی اور بالآخر براہ راست انقلابی حکومت کے آلے میں تبدیل ہوگئیں۔ ہر شہر، قصبے اور گاؤں سے منتخب ہونیوالے مقامی سوویتوں کے علاوہ ہر بڑے شہر میں وارڈ سوویت (Raionny) اور ضلع یا صوبے کی سطح پر اوبلاسٹنی یا گبیرنسکی (Gubiernsky یا Oblastny) سوویتیں موجود تھیں۔ آخر میں پیٹروگراڈ میں کل روسی سوویتوں کی سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کیلئے نمائندے منتخب کئے جاتے تھے۔ ہر جگہ سے مزدوروں، فوجیوں اور کسانوں کے نائبین کی سوویتوں کیلئے نمائندے منتخب ہوتے تھے جن کو فوری طور پر واپس بلایا جا

سکتا تھا۔اعلیٰ نوکر شاہی ٹولے کا وجود ہی نہیں تھا۔کسی نائب یا افسر کو ہنر مند مزدور سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی تھی۔

انقلاب کے فوراً بعد سوویت حکومت نے معیشت، سیاست، انتظامیہ اور ثقافت کے بارے میں بہت فرمان جاری کئے۔ نچلی سطح پر سوویت تنظیموں میں بہت تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر جگہ مقننّہ اور انتظامیہ کو ختم کرنے کی کوشش ہو رہی تھی تا کہ افراد براہ راست ان فیصلوں کے عملی اطلاق میں حصہ لے سکیں جو انہوں نے خود کئے تھے۔اس کے نتیجے میں عوام نے اپنے مقدر کو خود اپنے ہاتھوں میں لینا شروع کر دیا۔نومبر 1917ء میں لینن نے پراودا اخبار میں ایک اپیل شائع کروائی،'' کامریڈو، مزدور لوگو! یاد رکھو کہ عنان حکومت اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔اگر آپ نے متحد ہو کر ریاست کے معاملات اپنے ہاتھ میں نہ لئے تو کوئی آپ کی مدد کو نہیں آئے گا۔خود کام کرنا شروع کر دو، بالکل نچلی سطح سے آغاز کرو اور کسی کا انتظار مت کرو۔''(21) وہ ریاست اور صنعت کے چلانے میں عوام کی براہ راست شرکت کیلئے بے چین تھا۔

دسمبر 1917ء کو لینن نے لکھا کہ ''اگر آج کا سب سے اہم نہیں تو اہم ترین کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ مزدوروں میں اور عام طور پر محنت کشوں اور استحصال زدہ لوگوں میں آزادانہ پہل گامی کو فروغ دیا جائے اور اسے تخلیقی تنظیمی کام میں جہاں تک ممکن ہو وسیع پیمانے پر فروغ دیا جائے۔ہمیں ہر قیمت پر اس پرانے، بیہودہ، وحشیانہ، گھٹیا اور قابل نفرت تعصب کو ختم کرنا ہے کہ صرف نام نہاد طبقۂ اعلیٰ، صرف امراء اور امیروں کے سکولوں کے فارغ التحصیل ہی ریاست کا انتظام چلا سکتے ہیں اور سوشلسٹ سماج کے تنظیمی فروغ کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔''(22)

آئین ساز اسمبلی کا افسانہ

اکتوبر انقلاب کی منفی انداز میں تصویر کشی کرنے کیلئے جو بے شمار قصے کہانیاں کئے گئے ان میں سب سے زیادہ اہم آئین ساز اسمبلی کا قصہ ہے۔اس کے مطابق انقلاب سے قبل بالشویک ایک جمہوری طور پر منتخب شدہ پارلیمنٹ (آئین ساز اسمبلی) کے قیام کی وکالت کرتے تھے مگر انقلاب کے بعد اس سے سبکدوش ہو گئے۔اس دلیل کے مطابق اقلیت میں ہونے کے باعث انہوں نے جمہوری طور پر منتخب شدہ

پارلیمنٹ کو ختم کر کے آمریت کی راہ اپنائی۔ یہ دلیل بہت سے بنیادی سوالات کو نظرانداز کر دیتی ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آئین ساز اسمبلی کے قیام کا مطالبہ، جس نے بلاشبہ عوام اور بالخصوص کسانوں کو زار شاہی کیخلاف متحرک کرنے میں ترقی پسندانہ کردار ادا کیا، بہت سے انقلابی جمہوری مطالبات میں سے ایک تھا اور سب سے زیادہ اہم بھی نہیں تھا۔

انقلاب نے کئی دیگر مطالبات کی بنیاد پر عوام کو جیتا تھا جن میں سے خاص طور پر ''امن، روٹی اور زمین'' زیادہ قابل ذکر ہے۔ اور پھر انہوں نے بھی محض اس لئے حقیقت کا روپ دھارا کہ انہیں ایک اور مطالبے سے منسلک کیا گیا تھا یعنی تمام اقتدار سوویتوں کو دو۔

فروری انقلاب کی ناکامی کی وجہ ہی یہی تھی کہ وہ عوام کی ان انتہائی شدید ضروریات کو پورا کرنے کا اہل نہیں تھا۔ کرنسکی حکومت کی مکمل نامردی کوئی حادثاتی امر نہیں تھا۔ یہ روسی بورژوازی کے رجعتی کردار کی عکاسی کرتی تھی۔ روسی سرمایہ دار طبقہ بہت کمزور تھا جس کے ہاتھ جاگیرداروں کے آگے بندھے ہوئے تھے اور وہ عالمی سامراج کا ماتحت تھا۔ سماج کے سب سے زیادہ پرعزم انقلابی حصے یعنی مزدور طبقے کے ہاتھوں میں اقتدار کی انقلابی منتقلی کے باعث ہی جنگ کا خاتمہ اور کسانوں میں زمینوں کی تقسیم ممکن ہو سکی۔ یہ فریضہ اکتوبر انقلاب نے سرانجام دیا۔

آئندہ برس آئین ساز اسمبلی کے انتخابات کے انعقاد کے اعلان کی نوعیت ایک طرح سے محض ضمنی تھی۔ بالشویک اسے کسانوں کو متحرک کرنے اور سیاسی زندگی میں سرگرمی سے حصہ لینے کیلئے تیار کرنے کی نیت سے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر سب سے بڑھ کر یہ کہ کسانوں کے نقطہ نظر کی رو سے اگر رسمی پارلیمانی جمہوریت ان پالیسیوں پر عمل پیرا نہیں ہوتی جو ان کی انتہائی بنیادی ضروریات کے حل کیلئے ضروری ہیں تو اس کا وجود اس کے نہ ہونے سے بھی بدتر ہے۔ بعض مخصوص حالات کے تحت آئین ساز اسمبلی ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کر سکتی تھی۔ مگر عمل سے یہ بات عیاں ہو گئی کہ یہ آئین ساز اسمبلی محض راستے کا پتھر ثابت ہو گی اور ردانقلابی قوتوں کیلئے نقطہ ارتکاز۔ پارلیمانی انتخابات کا سست رفتار میکنزم انقلاب کے تیز دھارے کے مقابلے میں بہت پیچھے رہ گیا۔ کسانوں کے حقیقی رویے کا اظہار خانہ جنگی کے دوران ہوا جب سوشل انقلابیوں اور منشویکوں کی اکثریت نے وائٹ گارڈز کا ساتھ دیا۔

اکتوبر انقلاب کے وقت مزدوروں اور سپاہیوں کے نائبین کی سوویتیں روسی سماج کی زندہ اور متحرک قوتوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ مزدور طبقے نے سوویتوں کے اندر بالشویکوں کو ووٹ دیئے جو کسی

بھی پارلیمنٹ سے زیادہ جمہوری تھیں۔اسی دوران فوجیوں نے بھی، جن کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی، بالشویکوں کو ووٹ دیئے۔

پارٹی	ووٹ		شرح فیصد	
	جون	ستمبر	جون	ستمبر
سوشل انقلابی	974,885	54,374	58	14
منشویک	76,407	15,887	12	4
کیڈٹ	168,781	101,106	17	26
بالشویک	75,409	198,203	12	51

یہ اعداد وشمار ایک طرف مختلف طبقات کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج کو ظاہر کرتے ہیں، دائیں جانب (بورژوا کیڈٹ پارٹی کے ووٹ دیکھیں) اور بائیں کی خلیج، جبکہ سنٹر کی پارٹیوں یعنی منشویکوں اور سوشل انقلابیوں کی ٹوٹ پھوٹ نظر آتی ہے۔مگر اس میں سب سے نمایاں چیز بالشویکوں کی زبردست فتح ہے جنھوں نے جون کے بارہ فیصد کے مقابلے میں ستمبر میں مکمل اکثریت حاصل کر لی۔اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بالشویکوں کو نہ صرف مزدوروں کی بہت بڑی حمایت حاصل تھی بلکہ کسانوں کے ایک قابل ذکر حصے کی بھی۔نومبر 1917ء میں منشویک لیڈر روائی اومارٹوف کو بذات خود یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ''تقریباً تمام پرولتاریہ لینن کی حمایت کرتا ہے۔''(23)

اسی وجہ سے بالشویک نااہل عارضی حکومت کا تختہ الٹنے کے قابل ہوئے اور انہیں بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔یہی حقائق اکتوبر انقلاب کو بغاوت (Coup) ثابت کرنے والی دیومالا کو جھٹلانے کیلئے کافی ہیں۔

اس طرح اکتوبر انقلاب کا جمہوری جواز واضح طور پر ثابت ہوگیا۔لیکن اس کا عکس آئین ساز اسمبلی کے الیکشنوں میں نظر نہیں آیا جب بالشویکوں کو ووٹوں کا محض 23.9 فیصد حاصل ہوا جس میں بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں کے ووٹ بھی شامل ہیں۔

آئینی اسمبلی (ووٹ)

کسان پارٹیاں

روسی سوشل انقلابی	15,848,004
یوکرائنی سوشل انقلابی	1,286,157
یوکرائنی سوشلسٹ اتحاد	3,556,581
سوشل انقلابیوں اور اتحادیوں کے کل ووٹ	20,690,72

ورکرز پارٹیاں

بالشویک	9,844,637
منشویک	1,364,826
دوسرے سوشلسٹ	601,707

بورژوا اور دائیں بازو کی پارٹیاں

کیڈٹ	986,601
کنزرویٹو روسی گروپ	1,262,418
قوم پرست گروپ	2,620,967

آئینی اسمبلی (نشستیں)

روسی سوشل انقلابی	299
یوکرائنی سوشل انقلابی	81
بائیں بازو کے سوشل انقلابی	39
بالشویک	168
منشویک	18
دوسری سوشلسٹ پارٹیاں	4
کیڈٹ	15
کنزرویٹو	2
قوم پرست گروپ	77

(بذریعہ: اوا ینو یلر، لاس سوویتیں صفحہ: 220)

اس کے باوجود بالشویک مضبوطی سے اقتدار پر قائم رہے۔ کیوں؟

نرودنکوں کے زمانے سے دائیں بازو کے سوشل انقلابی روایتی طور پر کسانوں کے رہنما رہے تھے۔ درمیانے طبقے کے یہ عناصر دیہات کی روایتی اشرافیہ، استادوں، وکیلوں اور ''اچھی گفتگو کرنیوالے شرفاء'' پر مشتمل تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ان میں سے بہت سے فوجی افسر بن گئے۔ فروری انقلاب کے وقت ان جمہوریت پسند انقلابیوں کا کسان فوجیوں میں کافی اثر ورسوخ تھا۔ ان کی دھندلی اور غیر واضح ''انقلاب پسندی'' کسانوں میں جاگنے والے ابتدائی شعور سے مطابقت رکھتی تھی۔ لیکن انقلاب کا ریلا برق رفتار ہوتا ہے۔ فروری انقلاب کے فوراً بعد دائیں بازو کے سوشل انقلابیوں نے امن کے پروگرام اور زمین کیلئے انقلابی جدوجہد ترک کر کے کسانوں سے غداری کی۔

باوردی کسان کہاں سے حمایت حاصل کر سکتے تھے؟ سیاسی زندگی کا شعور پانے کے بعد کسان لوگ اور بالخصوص فوج میں موجود وہ انتہائی سرگرم پرت، جس کی سمجھ بوجھ کی سطح گاؤں میں موجود اپنے بھائیوں کے مقابلے میں برتر تھی، جلد ہی امن، روٹی اور زمین کی تسخیر کیلئے انقلاب کی ضرورت کو سمجھ گئے۔ اس کا حصول صرف پرولتاریہ کے ساتھ انقلابی اتحاد کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ اس حقیقت کے ادراک کا اظہار سوویتوں کے انتخابات میں بائیں بازو کی طرف شدید جھکاؤ کی صورت میں ہوا۔ 1917ء کے موسم خزاں تک پرانے دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے سوشل انقلابی لیڈر فوجیوں میں اپنی جڑیں کھو بیٹھے تھے جوق در جوق بائیں سوشل انقلابیوں اور ان کے بالشویک اتحادیوں کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔

آئین ساز اسمبلی کے انتخابات انقلاب کے بعد جلد بازی میں اکتوبر سے پہلے مرتب ہونے والی لسٹوں کی بنیاد پر منظّم کئے گئے تھے۔ کسانوں کو ابھی وقوع پذیر ہونے والے عوامل کو سمجھنے کا وقت نہیں ملا تھا۔ دائیں اور بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں میں ابھی علیحدگی نہیں ہوئی تھی۔ بحیثیت مجموعی کسانوں کو اکتوبر انقلاب اور سوویت اقتدار کے معانی سے آگاہی نہیں ہوئی تھی بالخصوص زمینی اصلاحات اور امن کے انتہائی اہم شعبوں کے حوالے سے۔ انقلاب کی قوت متحرکہ کو پارلیمانیت کے بوجھل میکینزم میں آسانی سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات پر پسماندہ دیہاتی علاقوں کے جمود کا شکار عوام نے بھی اپنا اثر ڈالا۔ ہزار سالہ غلامی کے بوجھ تلے دبے ہوئے یہ دیہات شہروں سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

دائیں بازو کے یہ سوشل انقلابی کسانوں کے سیاسی نمائندے نہیں بلکہ سیاسی استحصال کنندہ تھے۔ اکتوبر انقلاب کے شدید مخالف ہونے کی وجہ سے یہ اقتدار جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو واپس لوٹا دیتے جس طرح نومبر 1918ء میں جرمنی کے مزدوروں کو جمہوری رد انقلاب کے ذریعے اقتدار سے محروم کیا گیا۔ اقتدار کے دو بالکل متضاد مراکز موجود تھے۔ رد انقلابی جس نعرے کے گرد جمع ہوئے وہ یہ تھا کہ ''تمام اقتدار آئین ساز اسمبلی کو دو۔'' اس صورتحال کے سامنے آتے ہی بالشویکوں نے اپنے بائیں سوشل انقلابی اتحادیوں کی حمایت سے انقلاب کے مفادات کو آئینی نفاستوں سے بالاتر رکھنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ سوویتوں پر انحصار کرتے ہوئے بالشویکوں نے آئین ساز اسمبلی کو تحلیل کر دیا۔ کوئی مزاحمت نہیں ہوئی، بعض حلقوں میں اس واقعہ کے سلسلے میں اب شدید برہمی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ تاہم ہمارے سامنے ایک ایسا تضاد موجود ہے جو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ اگر آئین ساز اسمبلی واقعی عوام کی امنگوں کی ترجمان تھی تو کسی نے اس کا دفاع کیوں نہیں کیا؟ اس کے دفاع میں اس لئے کوئی ہاتھ نہیں اٹھا کہ یہ غیر نمائندہ تھی اور ترتیب زمانی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ روسی تاریخ کے مشہور انگریز عالم ای ایچ کار نے اس کی وجہ کو بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔

''سوشل انقلابی ان انتخابات میں امیدواروں کی ایک ہی لسٹ کے ساتھ واحد پارٹی کے طور پر حصہ لے رہے تھے۔ اس کا انتخابی منشور اعلیٰ اصولوں اور مقاصد سے بھرپور تھا حالانکہ یہ اکتوبر انقلاب کے ایک دن بعد شائع ہوا تھا مگر اس واقعہ سے پہلے تصنیف ہوا تھا اور اس کے بارے میں پارٹی کے رویے کی وضاحت کرنے سے قاصر رہا تھا۔ انتخابات کے تین دن بعد پارٹی کے بڑے حصے نے بالشویکوں سے اتحاد قائم کر کے اس حصے سے رسمی علیحدگی اختیار کر لی جس نے بالشویکوں سے اپنا شدید جھگڑا جاری رکھا تھا۔ آئین ساز اسمبلی میں دائیں اور بائیں سوشل انقلابیوں کا تناسب 370:40 اتفاقی تھا۔ یہ کسانوں کی کانگریس کی ممبر شپ کے تناسب سے بالکل مختلف تھا اور انتخاب کرنے والوں کے نقطہ نظر کی حقیقی ترجمانی نہیں کرتا تھا جو اس وقت ان کے سامنے موجود نہیں تھا۔ لینن نے کہا، 'لوگوں نے ایک ایسی پارٹی کو ووٹ دیا جس کا کوئی وجود نہیں تھا'۔ دو سال بعد سارے معاملے کا از سر نو جائزہ لیتے وقت لینن نے ایک اور دلیل ڈھونڈ نکالی جواب اس سے کہیں زیادہ زوردار تھی جتنی پہلی نظر میں دکھائی دیتی تھی۔ اس نے توجہ دلائی کے بڑے صنعتی شہروں میں تقریباً ہر جگہ بالشویک دوسری پارٹیوں سے آگے تھے۔ دونوں دارالحکومتوں کو ملا کر دیکھا جائے تو انہوں نے ایک قطعی اکثریت حاصل کی جبکہ کیڈٹ دوسرے اور سوشل

انقلابی کہیں تیسرے نمبر پر تھے۔لیکن انقلاب کے معاملات میں یہ جانا پہچانا اصول لاگو ہوتا ہے،شہر ناگزیر طور پر دیہات کی رہنمائی کرتے ہیں اور دیہات ناگزیر طور پر شہروں کی پیروی کرتے ہیں۔''اگرچہ آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں بالشویکوں کو فتح حاصل نہیں ہوئی تاہم انہوں نے ایسے تمام لوگوں کو واضح طور پر راستہ سمجھایا جو دیکھ سکتے تھے۔''(24)

اس کا اعتراف کرنسکی نے بذات خود بھی کیا جس نے اپنی یاداشتوں میں مندرجہ ذیل سطریں تحریر کیں!''آئین ساز اسمبلی کا افتتاح ایک المیہ کھیل کی طرح ختم ہوا۔اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو اسے آزادی کے دفاع کی آخری جنگ کی خوبی عطا کرسکتا''۔(25)

سوویتیں اور کسان

اکتوبر انقلاب تقریباً پرامن تھا کیونکہ کوئی بھی طبقہ پرانے نظام کا دفاع کرنے کو تیار نہیں تھا چاہے وہ عارضی حکومت ہو یا آئین ساز اسمبلی جیسا کہ کرنسکی نے اعتراف کیا ہے۔کسان آئین ساز اسمبلی کے دفاع میں لڑنے کو تیار نہیں تھے۔

اس کے برعکس بعد میں ہونے والی خانہ جنگی میں کسانوں کی اکثریت نے بالشویکوں کا ساتھ دیا جب انہوں نے سفید محافظوں کی حکمرانی کا تجربہ کرلیا اور منشویکوں اور سوشل انقلابیوں کے کردار کو دیکھ لیا جو ناگزیر طور پر سفید رد انقلاب کی راہ ہموار کرتا تھا۔مختلف سفید جرنیلوں کی آمریت کے تحت پرانے جاگیردار واپس آگئے۔ہوسکتا ہے کسانوں کو سیاست کی زیادہ سوجھ بوجھ نہ ہو مگر انہیں یہ علم ضرور تھا کہ صرف بالشویک ہی انہیں زمین دینے کو تیار تھے،جیسا کہ انہوں نے انقلاب سے اگلے ہی روز فرمان کے ذریعے کیا جبکہ نام نہاد کسانوں کی پارٹیاں محض پرانے جاگیرداروں کی واپسی کی راہ ہموار کرتی تھیں اور مسئلے کا فیصلہ کرنے کو یہی کافی تھا۔

اپنی حال ہی میں شائع ہونیوالی کتاب 'ایک قوم کا المیہ،روسی انقلاب(1891-1924ء)، میں جو کسی نہ کسی وجہ سے روسی انقلاب کا سنجیدہ مطالبہ کہلائے جانے پر مصر ہے۔آرلینڈو فیجس بالشوازم کیخلاف زہر آلود مخاصمت کے مظاہرے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں گنواتا۔یہ نئے سٹائل کا خاصہ ہے۔آپ اسے''عالمانہ''تاریخوں کی نئی صنف بھی کہہ سکتے ہیں جس کا واحد مقصد لینن پر بہتان تراشی کرنا اور اکتوبر انقلاب کو سٹالنزم کے ساتھ ملانا ہے۔تاہم یہ مصنف بھی اس اعتراف پر مجبور ہے:

’’کسانوں میں اور بھی گہری لاتعلقی پائی جاتی تھی جو کہ سوشل انقلابی پارٹی کی روایتی بنیاد تھے۔ سوشل انقلابی دانشور ہمیشہ اس غلط فہمی کا شکار رہے کہ کسان بھی آئین ساز اسمبلی کی تعظیم میں ان کے ساتھ ہیں۔شاید ان کسانوں کے نزدیک جو پڑھے لکھے تھے یا عرصے سے سوشل انقلابیوں کے پروپیگنڈے کی زد میں تھے آئین ساز اسمبلی انقلاب کی سیاسی علامت تھی۔لیکن کسانوں کی اکثریت کے نزدیک، جن کی سیاسی بصیرت اپنے کھیتوں اور گاؤں تک محدود تھی، یہ شہر کی دور دراز چیز تھی جس پر مختلف پارٹیوں کے ’’سرداروں‘‘ کا غلبہ تھا، جسے وہ سمجھ نہیں سکتے تھے اور جو انکی اپنی سیاسی تنظیموں سے بالکل مختلف تھی۔ یہ ایک قومی پارلیمنٹ تھی جو دانشوروں کو مدتوں سے عزیز تھی لیکن کسان دانشوروں کے سیاسی قوم کے اس تصور میں انکے ساتھ نہ تھے۔ان کی ریاست، جمہوریت، شہری حقوق اور فرائض والی زبان کسانوں کیلئے اجنبی تھی اور جب وہ اس شہری لفاظی کو استعمال کرتے تو اس کے ساتھ اپنے مخصوص دہقانی معانی شامل کر دیتے تا کہ انہیں اپنی برادریوں کی ضروریات سے ہم آہنگ کیا جاسکے۔کسانوں کی اکثریت کے سیاسی تصورات سے یہ دیہی سوویتیں زیادہ قریب تھیں دراصل یہ ان کی دیہی تنظیموں جیسی ہی تھیں مگر زیادہ انقلابی شکل میں۔دیہی اور وولوسٹ سوویتوں کے ذریعے کسان پہلے ہی زمینوں کے سلسلے میں اپنا انقلاب لا رہے تھے اور انہیں اس کی تکمیل کیلئے آئین ساز اسمبلی (یا بذات خود سوویت حکومت) کے فرمان کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔دائیں بازو کے سوشل انقلابی اس بنیادی حقیقت کو نہیں سمجھ سکے، اپنی دیہی سوویتوں کے ذریعے حاصل ہونیوالی خودمختاری کی وجہ سے کسانوں کی نظر میں قومی پارلیمنٹ کی اہمیت کم ہوگئی تھی کیونکہ وہ پہلے ہی وولیا یعنی کسانوں کی اپنی حکمرانی کا قدیمی آئیڈیل حاصل کر چکے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ عادتاً یا گاؤں کے بزرگوں کی تعظیم کیلئے کسانوں کی اکثریت نے آئین ساز اسمبلی کے انتخابات میں سوشل انقلابیوں کو ووٹ دیئے ہونگے۔لیکن اس کی بحالی کیلئے بہت کم لوگ سوشل انقلابیوں کے ساتھ مل کر لڑنے کو تیار تھے جس کا ثبوت 1918ء کے موسم گرما میں کومچ کی افسوس ناک کامیابی ہے۔ دیہات سے اس سوال پر پیش ہونیوالی کم وبیش تمام قراردادوں سے یہ واضح تھا کہ وہ ایسی اسمبلی کی بحالی کے حق میں نہیں ہیں جو ان میں سے ایک کے بقول ’’روس کی سیاسی آقا ہو اور مقامی سوویتوں سے زیادہ بااختیار ہو۔‘‘(26)

اس حقیقت کے ثبوت میں فیجز دائیں بازو کے سوشل انقلابی بورس سوکولوف کے الفاظ کو نقل کرتا ہے جو فوج میں اپنے کام کی وجہ سے عام کسانوں کی رائے سے قریبی واقفیت رکھتا تھا:

’’محاذ جنگ پر موجود سپاہیوں کیلئے آئین ساز اسمبلی ایک بالکل غیر واضح اور نامعلوم شے اور ایک

ان دیکھا خطہ تھا۔ان کی ہمدردیاں واضح طور پر سوویتوں کے ساتھ تھیں۔ یہ ادارے انہیں زیادہ عزیز تھے اور انہیں اپنی دیہی پنچایتوں کی یاد دلاتے تھے۔ مجھے ایک سے زیادہ بار ان میں سے ذہین ترین سپاہیوں کو بھی آئین ساز اسمبلی پر اعتراض کرتے ہوئے سننے کا موقع ملا۔ان میں سے زیادہ تر کے خیال میں اس کا تعلق ریاستی پارلیمنٹ سے تھا اور یہ ادارہ ان سے کوئی قربت نہیں رکھتا تھا۔'ہمیں آئین ساز اسمبلی کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے پاس سوویت پہلے ہی موجود ہے جہاں ہمارے نائیبن مل بیٹھ کر ہر چیز کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں۔'' (27)

برسبیل تذکرہ اس موضوع پر بورژوا تاریخ دانوں کی چیخ و پکار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ یا تو تاریخ کے سلسلے میں بالکل جاہل ہیں یا صرف اپنے مطلب کی باتیں یاد رکھتے ہیں۔ برطانوی انقلاب کے لیڈر اولیور کرامویل نے بھی کم وبیش ایسی ہی وجوہات کی بنا پر اپنی ماڈل آرمی کے ذریعے پارلیمنٹ کو تتر بتر کر دیا تھا جن کی وجہ سے بالشویک آئین ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے پر مجبور ہوئے۔ پارلیمنٹ میں اکثریت رکھنے والے میانہ رو پریسبائی ٹیرین انقلاب کی پہلی غیر واضح اٹھان کے نمائندے تھے۔ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر وہ ایک قدامت پسند قوت کی شکل اختیار کر گئے اور مزید آگے بڑھنے کے متمنی پیٹی بورژوا کے راستے کی دیوار بن گئے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ راؤنڈ ہیڈز کی فتح کیلئے اس رکاوٹ کا دور کیا جانا ضروری تھا۔

اسی طرح کے عوامل فرانسیسی انقلاب میں بھی وقوع پذیر ہوئے جب جیکو بن انقلابیوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے سب سے زیادہ مستقل مزاج انقلابی رجحان نے بار بار نیشنل کنونشن کی تطہیر کی بلکہ اپنے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔مگر یہ بات واضح ہے کہ اس قسم کے فیصلہ کن عمل کے بغیر فرانس کے اندر اور باہر موجود طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں یہ انقلاب کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔انقلابیوں کے خلاف ہر طرح کے قانونی واخلاقی دلائل پیش کئے گئے ہیں۔مگر یہ بالکل بے جا ہیں۔انقلاب کی روح یہ ہے کہ وہ پرانے نظام سے فیصلہ کن طور پر ناطہ توڑتا ہے۔ پرانے صاحب جائیداد طبقے کی خونخوار مزاحمت کے باعث بعض اوقات اسے خود حفاظتی کی غرض سے شدید نوعیت کے اقدام کرنا پڑتے ہیں۔مگر آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ کرامویل اور روبس پیئر کس طرح کے اقدامات اٹھاتے کہ یہ سب کچھ کئے بغیر انقلابات کامیاب ہو جاتے۔ لانگ پارلیمنٹ کو تتر بتر کرنے کے بعد کرامویل نے یہ تبصرہ کیا، ''کسی کتے کے بھونکنے کی آواز بھی نہیں آئی اور نہ ہی اس پر کوئی عام طور پر اور واضح طور پر رنجیدہ خاطر ہوا۔'' (28) آئین ساز اسمبلی کے ٹوٹنے پر لوگوں کے ردعمل کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال سامراجی مداخلت

تک بالشویک انقلاب اپنے عظیم پیش رووَں کی نسبت کہیں زیادہ پرامن تھا۔

جنوری 1918ء میں ہونیوالی تیسری سوویتوں کی کل روسی کانگریس میں لینن نے کہا کہ ''اکثر اوقات مزدوروں کے نمائندے ہمارے پاس آکر پوچھتے ہیں کہ فلاں فلاں قطعۂ اراضی کے سلسلے میں کیا کیا جائے اور مجھے یہ دیکھ کر خجالت محسوس ہوتی ہے کہ وہ واضح اور حتمی نقطہ نظر نہیں رکھتے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ ہی اصل اقتدار ہیں، آپ جو کرنا چاہتے ہیں کریں جو لینا چاہتے ہیں لے لیں ہم آپ کی حمایت کریں گے۔''(29)

چند ماہ بعد ساتویں کانگریس میں اس نے زور دے کر کہا کہ ''سوشلزم ایک اقلیت اور ایک پارٹی نافذ نہیں کر سکتی۔ اس کو صرف کروڑوں لوگ ہی نافذ کر سکتے ہیں جب وہ بذات خود ایسا کرنا سیکھ جائیں۔''(30)

لینن کے بے شمار بیانات پیش کئے جاسکتے ہیں جو اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اسے مزدور طبقے کی اس صلاحیت پر پورا یقین تھا کہ وہ اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کر سکتے ہیں۔ یہ ان بورژوا تاریخ دانوں کی دروغ گوئیوں سے بالکل متضاد ہے جو لینن ازم کے جمہوری تصورات پر سٹالنزم کی کالک ملنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعد کی سٹالنسٹ آمریت کے برعکس یہ ''پرولتاریہ کی آمریت'' ہر لحاظ سے ایک حقیقی مزدور جمہوریت تھی۔ سیاسی قوت عوام کے ہاتھوں میں تھی جن کی نمائندگی سوویتیں کرتی تھیں۔ شروع میں سرمایہ داروں کی پارٹیوں (انتہائی رجعتی اور سام دشمن بلیک ہنڈرڈ کے علاوہ) کو بھی تنظیم سازی کی اجازت تھی۔ صرف بعد کی خانہ جنگی، رد انقلابیوں اور تخریب کاروں کی خطرناک کارروائیوں کی وجہ سے بالشویک دوسری پارٹیوں پر عارضی طور پر پابندیاں لگانے پر مجبور ہوئے۔ مثال کے طور پر بائیں بازو کے سوشل انقلابی مخالف ہو گئے اور روس کو جرمنی سے لڑوانے کیلئے جرمن سفیر کاؤنٹ میر باخ کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں نے 1918ء میں لینن پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ بھی کیا جس نے بالآخر چھ سال بعد اس کی جان لے لی۔

اقتدار ہاتھ میں لیتے ہی مزدوروں اور کسانوں کو مسلح سامراجی مداخلت کا سامنا کرنا پڑا جو سوویت اقتدار کو ختم کرنے کیلئے کی گئی تھی۔ 1918ء کے شروع میں برطانیہ اور فرانس کی بحری افواج نے شمالی روس میں مرمنسک اور آرک اینجل پر قبضہ کر لیا۔ چند روز بعد ہی ان کی افواج پیٹروگراڈ کی جانب پیش قدمی کر رہی تھیں۔ اپریل میں جاپانی ولاڈی واسٹک پر اترے اور اومسک آل رشین گورنمنٹ قائم کر دی۔ دو ماہ

کے اندر اندر ایک بغاوت کے ذریعے اس حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور ایڈمرل کولچک کی آمریت قائم ہو گئی۔ اسی دوران جرمن سامراج نے وائٹ گارڈ کے جرنیلوں کرسنوف اور رینگل کے تعاون سے پولینڈ، لیتھوینیا، لٹویا اور یوکرائن پر قبضہ کر لیا۔ بہانہ یہ بنایا گیا کہ ہم ''بالشویک جبر کیخلاف جدوجہد کرنیوالے عوام'' کی مدد کر رہے ہیں۔ 1919ء کے موسم خزاں میں دوطرفہ حملے کی زد میں آنے کے بعد خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پیٹروگراڈ بالشویکوں کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ٹراٹسکی نے لکھا کہ ''ہم ہتھوڑے اور نہائی کے درمیان تھے۔'' (31)

نام نہاد ''سرخ دہشت'' اور متشددانہ ذرائع کیخلاف بہت شور و غل مچایا گیا ہے جو انقلاب نے اپنے دفاع کیلئے استعمال کئے تھے۔ مگر اس بات کو نہایت آسانی سے فراموش کر دیا جاتا ہے کہ حقیقت میں اکتوبر انقلاب تقریباً بالکل پرامن تھا۔ حقیقی معنوں میں خونریزی اس خانہ جنگی کے دوران ہوئی جب سوویت ریپبلک پر اکیس غیر ملکی افواج نے چڑھائی کی۔ بالشویکوں کے حصے میں ایک تباہ معیشت اور ایک پارہ پارہ فوج آئی تھی۔ فوراً ہی انہیں کرنسکی اور سفید افسروں کی مسلح بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور بعد میں ملکی اقتدار محض دو صوبوں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا جن کا رقبہ مسکووی کی قدیم قلمرو کے برابر تھا۔ اس کے باوجود بالشویک ردانقلاب کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اگر ہم (غلط طور پر) یہ فرض کر بھی لیں کہ لینن اور ٹراٹسکی نے عوام کی حمایت کے بغیر کسی نہ کسی طرح سازشیوں کے ایک چھوٹے سے گروہ کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا تو یہ تصور بالکل بیہودہ لگتا ہے کہ وہ اس بنیاد پر سفید گارڈ اور غیر ملکی فوجوں کی مشترکہ قوت کو شکست بھی دے سکتے تھے۔

جنگ میں یقیناً تشدد ہوتا ہے اور خانہ جنگی میں سب سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ کمزور اور جنگ زدہ مزدور ریاست مجبور تھی کہ وہ یا تو ہتھیار اٹھا کر اپنا دفاع کرے یا سفید افواج کی رحمدلی پر تکیہ کر کے ہتھیار ڈال دے جو عالمی تاریخ کی تمام ردانقلابی فوجوں کی طرح مزدوروں اور کسانوں کو دہشت زدہ کرنے کیلئے انتہائی خون آشام اور بہیمانہ طریقے اختیار کرتی تھیں۔ اگر وہ فتح یاب ہو جاتیں تو خون کی ندیاں بہاتیں۔ اس مفروضے سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اگر بالشویکوں نے اقتدار پر قبضہ نہ کر لیا ہوتا تو روس ایک خوشحال سرمایہ دارانہ جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو گیا ہوتا۔ یہ تصور حقائق کا سامنا کس حد تک کر سکتا ہے؟ ابتدا میں ہی 1917ء کے موسم گرما میں جنرل کارنیلوف کی بغاوت ثابت کرتی ہے کہ فروری میں قائم ہونے والے دوہرے اقتدار کا غیر مستحکم نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ

آمریت قائم کرنے میں کون کامیاب ہوگا کرنسکی یا کارنیلوف۔ بالشویکوں کے خلاف ''سرخ دہشت'' کے سلسلے میں کیئے جانے والے منافقانہ حملوں کا سادہ سا جواب یہی ہے۔روئے زمین کی سب سے زیادہ جمہوری سرمایہ دارانہ حکومت بھی ایسے مسلح گروہوں کے وجود کو کبھی برداشت نہیں کرے گی جو تشدد آمیز ذرائع سے رائج الوقت نظام کا تختہ الٹنے کی کوشش کریں۔ایسے گروہوں کو فوراً غیر قانونی قرار دیکران کے رہنماؤں کو یا تو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے یا مار ڈالا جاتا ہے۔اسے مکمل طور پر قانونی اور قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔لیکن جنگ کی شکار بالشویک حکومت پر ایسے معیار کا اطلاق نہیں کیا جاتا جو اپنی بقا کیلئے چومکھی لڑائی لڑ رہی تھی۔ یہ منافقت اور بھی زیادہ گھناؤنی محسوس ہوتی ہے کہ اگر ہم اس حقیقت کو ذہن میں رکھیں کہ انہی ''جمہوری'' مغربی حکومتوں نے اس وقت بالشویکوں کیخلاف سب سے زیادہ فوجی جارحیتیں منظّم کی تھیں۔وارسائی امن کانفرنس کے موقع پر ہی فاتح اتحادی بالشویکوں کا تختہ الٹنے کی تیاری کر رہے تھے۔ بلٹ نے سینٹ کی خارجہ تعلقات کی کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے ہوئے اپریل 1919ء کی پیرس کانفرنس میں عام موڈ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''کولچک نے سومیل پیش قدمی کی اور پیرس کے تمام اخبارات اس موضوع پر ایک شور مچانے اور اعلان کرنے لگے کہ کولچک دو ہفتے کے اندر اندر ماسکو میں ہو گا۔اس لئے پیرس کانفرنس میں موجود سب لوگ اور مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں امریکی کمیشن کے اراکین بھی شامل تھے،روس میں امن کے سلسلے میں بہت سرد مہر ہونا شروع ہو گئے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کولچک ماسکو پہنچ کر سوویت حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔''(32)

روسی بورژوازی کی غیر جمہوری فطرت اکتوبر انقلاب سے پہلے بھی عیاں تھی جب وہ اس شدید خواہش کا اظہار کرتی تھی کہ کوئی نپولین آکر ''نظم وضبط'' بحال کر دے۔ایک بڑے سرمایہ دار اسٹیفن جارجوچ لیانوزوف کے مطابق:

''انقلاب ایک بیماری ہے۔جلد یا بدیر غیر ملکی طاقتوں کو یہاں مداخلت کرنا پڑے گی۔جس طرح کوئی بیمار بچے کے علاج کیلئے مداخلت کرتا ہے اور اسے چلنا سکھاتا ہے۔آمدورفت کے ذرائع مخدوش اور فیکٹریاں بند ہو رہی ہیں اور جرمن پیش قدمی کر رہے ہیں۔فاقہ کشی اور شکست سے شاید روسی عوام کے ہوش ٹھکانے آجائیں۔''(33)

برسبیل تذکرہ لینن کے بارے میں ''جرمن ایجنٹ'' ہونے کی مکروہ بہتان تراشی جو نا قابل یقین طور پر اب بھی جاری ہے حقائق سے بالکل متصادم ہے۔جرمن دوست لینن نہیں بلکہ روسی بورژوازی تھی

جو 1917ء میں روس کو دشمن کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتی تھی۔ جیسا کہ لیانوزوف کے تبصرے سے ثابت ہوتا ہے۔ اکتوبر انقلاب کے بعد یہ استثنا نہیں بلکہ اصول تھا۔ یہ ''محبّ وطن'' حقیقتاً جرمن فوج کی آمد کے شدید خواہش مند تھے۔ یہ غیر ملکی فوج کی حکمرانی کو روسی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے تھے۔ صاحب جائیداد طبقات میں یہ جرمن دوست موڈ عام تھا۔ لوس بریانٹ ایک کھاتے پیتے روسی گھرانے کے گھر میں ہونے والی ایک گفتگو کو یاد کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''گفتگو کا موضوع بتدریج سیاست کی طرف مڑ گیا۔ ہر کسی نے بالشویکوں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ کتنا اچھا ہو اگر جرمن آ کر قبضہ کر لیں۔ پھر جرمنوں کے بارے میں بحث چھڑ گئی اور حاضرین میں سے اکثر نے جرمن قبضے کی حمایت کی۔ محض آزمائش کیلئے میں نے انہیں ووٹ ڈالنے کیلئے کہا کہ آپ کس چیز کے حق میں ہیں فوجیوں اور مزدوروں کی حکومت یا قیصر۔ ایک کے علاوہ باقی سب نے قیصر کے حق میں ووٹ دیئے۔'' (34)

ننگی رجعت

اکتوبر کے بعد ہونے والی خانہ جنگی میں یکے بعد دیگرے کئی رجعتی جرنیل آئے لیکن یہ تصور بالکل کھلی بکواس ہے کہ سفید فوج کی سنگینوں کے سائے تلے روسی زمین پر جمہوریت کا بیج بویا جا سکتا تھا۔ وائٹ گارڈ کے پیچھے پیچھے پرانے جاگیردار اور سرمایہ دار بھی واپس لوٹ آئے اور انہوں نے مزدوروں اور کسانوں سے اپنا انتقام لیا۔ کسانوں کی اکثریت سوشلسٹ نہیں تھی حالانکہ وہ بالشویکوں کے انقلابی زرعی پروگرام کی وجہ سے ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ لیکن جب ایک بار انہیں یہ علم ہو گیا کہ سفید افواج جاگیرداروں کی طرفدار ہیں تو ان کی رہی سہی حمایت بھی ختم ہو گئی۔ سفید جرنیل زارشاہی رجعت کی سب سے ننگی شکل کے نمائندہ تھے۔ جو وسیع بنیاد سے تو عاری تھے لیکن فسطائی عزائم رکھتے تھے۔ مگر اس سے ان کی حکمرانی زیادہ خوشگوار نہ ہو جاتی بلکہ اپنے خوف کا بدلہ لینے اور عوام کو سبق سکھانے کیلئے وہ بڑے پیمانے پر دہشت گردی کرتے۔ روسی مزدوروں اور کسانوں کو اگر کئی عشروں تک نہیں تو کئی برسوں تک فرانکو یا پنوشے طرز کی بورژوا آمریت کی وحشتناکیوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ ایک خوفناک سماجی، ثقافتی اور معاشی زوال کا نظام ہوتا۔

اے آئی ڈینیکن، کولچک، رینگل اور کئی دوسرے جرنیلوں کے تحت سفید افواج کی خوفناک سفاکیاں ایک ڈوبتی ہوئی اشرافیہ کی بدحواسی کی عکاس تھیں۔ رینگل نے شیخی بگھاری کہ دس میں سے ایک سرخ قیدی کو گولی مار کر باقیوں کو لڑائی میں اپنے ''گناہ بخشوانے'' اور ''حب الوطنی'' کا ثبوت فراہم کرنے کا موقع دے گا۔ مقبوضہ علاقوں میں سرخ قیدیوں کو اذیتیں دے دے کر قتل کیا گیا، باغی کسانوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور یہودیوں کیخلاف منظم انداز میں ہنگامہ آرائی کی گئی۔ اور ہر جگہ جاگیرداروں کے اقتدار کو بحال کر دیا گیا۔ اپنے دفاع کی غرض سے بالشویکوں کو یرغمالی پکڑنا پڑے۔ وکٹر سرج لکھتا ہے:

''سفید فوج کے ہاتھوں سرخ قیدیوں کے اولین قتل عام اور وولوڈراسکی اور یورٹسکی کے قتل کے علاوہ لینن پر قاتلانہ حملے (1918ء کے موسم گرما میں) کے بعد یرغمالیوں کی گرفتاری اور بعض اوقات سزائے موت دینے کی روایت عام اور قانونی ہو گئی تھی۔ چیکا (Cheka) (بھگوڑوں، سٹہ بازوں اور انقلابیوں کیخلاف جبر کیلئے تشکیل کردہ غیر معمولی کمیشن) جو مشکوک لوگوں کو بڑے پیمانے پر گرفتار کرتا تھا اور رسمی طور پر پارٹی کے کنٹرول میں تھا، پہلے ہی آزادانہ طور پر ان کی قسمتوں کے فیصلے کرنے کے رجحان پر گامزن تھا لیکن حقیقت میں کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ یہ ریاست کے اندر ریاست بنتا جا رہا تھا اور اسے فوجی رازداری کے علاوہ ججوں اور نجی کمروں میں بھی مقدمہ چلانے کا تحفظ حاصل تھا۔ پارٹی حتی المقدور کوشش کرتی تھی کہ اس کی سربراہی سابق قیدی ڈزرزنسکی جیسے کٹر راست بازوں کے ہاتھ میں رہے جو ایک اعلیٰ اقدار کا حامل، مخلص، بے رحم، مگر شجاعت مند شخص تھا۔'' (35)

اگرچہ لینن اور ڈزرزنسکی نے بچاؤ کی ہر ممکن کوشش کی مگر ایسی صورتحال میں زیادتیوں کا ہونا ناگزیر تھا سفید افواج کی سفاکیاں تشدد آمیز ردعمل کو جنم دیتی تھیں، ''تاہم میونخ میں ہونے والے قتل عام نے دہشت پسندانہ ذہنیت کو تقویت دی اور اوفا میں کولچک کی فوجوں، سفاکانہ اقدامات کی وجہ سے جن میں سرخ قیدیوں کو زندہ جلا دیا گیا تھا، چیکسٹ ان پارٹی ممبران پر حاوی ہونے میں کامیاب ہو گئے جو نسبتاً زیادہ انسانیت کی توقع رکھتے تھے۔'' (36)

انقلاب کا بنیادی دفاع چیکا میں نہیں بلکہ بالشویکوں کی بین الاقوامی پالیسیوں میں پوشیدہ تھا۔ ان کا انقلابی پراپیگنڈہ سامراجی فوجوں کے جنگ سے تھکے ہوئے سپاہیوں کو متاثر کر رہا تھا۔ جارحانہ مداخلت کرنے والی فوجوں میں بے چینی اور کھلی بغاوت نے سامراجی طاقتوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ مزدور طبقے کے عالمی اتحاد نے روسی انقلاب کو بچا لیا۔ مندرجہ ذیل اقتباس صورتحال کا ایک عمومی خاکہ پیش کرتا

ہے:

''1919ء کے ابتدائی مہینوں میں اوڈیسا اور بحیرہ اسود کی دوسری بندرگاہوں میں اترنے والی فرانسیسی بحریہ میں اور فوجی یونٹوں میں شدید بغاوتوں کے باعث اپریل کے آغاز میں مجبوراً ان علاقوں کو خالی کرنا پڑا۔ آرک اینجل کے محاذ پر برطانوی کمانڈ کے تحت مختلف قوموں کے سپاہیوں کے بارے میں مارچ 1919ء میں ملٹری آپریشنز کے ڈائریکٹر نے یہ رپورٹ دی کہ ان کا مورال اتنا گر چکا ہے کہ وہ بالشویکوں کے اس خفیہ اور انتہائی سرگرم پروپیگنڈے کا آسانی سے شکار ہو رہے ہیں جنہیں دشمن روز افزوں توانائی اور مہارت سے پھیلا رہا ہے۔ اس کی تفصیلات بہت دیر بعد امریکہ کی سرکاری رپورٹوں کے ذریعے حاصل ہوئیں۔ یکم مارچ 1919ء کو ان فرانسیسی فوجیوں میں بغاوت پھیل گئی جنہیں محاذ جنگ پر جانے کا حکم ملا تھا۔ کچھ دن پہلے ایک برطانوی، انفنٹری کمپنی نے محاذ پر جانے سے انکار کر دیا تھا اور اس سے کچھ عرصے بعد ایک امریکی کمپنی نے کچھ دیر تک محاذ پر واپس جانے سے انکار کر دیا۔'' (37)

کولچک کی شکست کے بعد بالشویکوں نے صورتحال کو معمول پر لانے کی کوشش کی۔ جنوری 1920ء میں ڈزرزنسکی نے لینن اور ٹراٹسکی کی منظوری سے تمام ملک، ماسوائے ان اضلاع کے جہاں جنگ کی حالت تھی، سزائے موت کی منسوخی کی سفارش کی۔ 17 جنوری کو حکومت نے فرمان جاری کر دیا اور لینن نے اس پر عوامی کمیساروں کی کونسل کے صدر کی حیثیت سے دستخط کیے۔ لیکن تین ماہ کے اندر صورتحال پھر تبدیل ہو گئی۔ برطانیہ اور فرانس کی مدد سے پولینڈ کی رجعتی پلسوڈسکی حکومت نے سوویت روس پر حملہ کر دیا۔ پولینڈ نے کیف پر قبضہ کر لیا۔ انقلاب شدید خطرے میں تھا۔ سزائے موت از سرِ نو متعارف کروا دی گئی اور چیکا کو وسیع اختیارات دے دیئے گئے۔ یہاں ہم ایک بار پھر دیکھتے ہیں کہ کس طرح روس میں پرانے نظام کی بحالی کیلئے کی جانے والی بیرونی مداخلت نے انقلاب کو متشددانہ طریقوں سے اپنا دفاع کرنے پر مجبور کر دیا۔

اپنے خلاف ردِ انقلاب کے خطرے کے مقابلے کیلئے کسی قوم کے تمام تر دستیاب ذرائع کے ساتھ اپنی مدافعت کے حق کو کوئی منافق ہی جھٹلا سکتا ہے۔ بے شک اگر کسی کا خیال ہے کہ عوام کو اپنا دوسرا گال آگے کر کے چپ چاپ سارا جبر برداشت کر لینا چاہیے تو بالشویکوں کے طریقہ ہائے کار کی ضرور مذمت کی جانی چاہیے۔ ایسے فلسفے کا صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ آج تک جتنی بھی رجعتی حکومتیں رہی ہیں ان کو مستقل طور پر قبول کر لینا چاہیے تھا، درحقیقت اس سے عمومی سماجی ترقی کا عمل خارج از امکان ہو جائے گا۔

اخلاقیات یا انسانیت سے پیار نہیں بلکہ اسٹیٹس کو کا بزدلانہ دفاع ہی استحصالیوں کا اصول اور اکتوبر انقلاب کو بدنام کرنے والوں کا حقیقی محرک ہے۔

سفید جرنیلوں کی شکست کی وجہ ہتھیاروں کی برتر قوت نہیں بلکہ بڑے پیمانے پر سپاہیوں کا فرار، احکامات ماننے سے انکار اور مقبوضہ علاقوں میں ہونیوالی مستقل بغاوتیں تھیں۔ ٹراٹسکی کے تحت سرخ فوج کو پچاس لاکھ سپاہیوں پر مشتمل لڑاکا قوت بنا دیا گیا تھا۔ سفید جنرل کاؤنٹ کیڈوسٹف کے پاس عوام کو دینے کیلئے جو کچھ تھا وہ بہت کم تھا، ''ایک چیز واضح ہے کہ شروع میں آپ کیلئے فوجی آمریت ضروری ہے اور بعد ازاں شاید اس میں کاروباری عنصر کو بھی شریک کر لیا جائے۔۔۔''

صرف بالشویکوں نے ہی عوام کو جنگی بنیادوں پر منظّم کر کے اس آفت سے چھٹکارہ دلایا۔ لیون ٹراٹسکی کی ولولہ انگیز قیادت میں پرانی فوج کے بکھرے ہوئے حصے جلد ہی ایک نئی شکل میں یکجا ہو گئے۔ یہ تھی سرخ فوج۔ سرخ فوج کا اتنی تیز رفتاری سے وجود میں آنا اس بات کا کافی ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انقلاب کو وسیع عوامی حمایت حاصل تھی۔ عام طور پر بہت کم لوگوں کو نئی حکومت کے قائم رہنے کی امید رہی ہو گی لیکن تمام مشکلات کے باوجود سرخ فوج ہر محاذ پر دشمن کو شکست دینے میں کامیاب ہوئی۔

ٹراٹسکی کی شاندار کامیابیوں کا اعتراف انقلاب کے دشمنوں نے بھی کیا ہے جیسا کے جرمن افسروں اور سفارتکاروں کے مندرجہ ذیل بیانات سے ظاہر ہے۔ بعد ازاں میکس بار نے ٹراٹسکی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے پیدائشی فوجی منظّم اور لیڈر کہا اور مزید برآں یہ کہ ''اس نے شدید لڑائیوں کے دوران ایک نئی فوج کو جس طرح عدم سے وجود میں لا کر منظّم کیا اور تربیت دی اس سے نپولین جیسی صلاحیت کا اظہار ہوتا ہے۔''

اور ہوف مین نے بھی یہی فیصلہ سنایا ہے:

''خالصتاً فوجی نقطہ نظر سے یہ امر باعث حیرت ہے کہ نئے بھرتی شدہ سرخ فوجیوں کیلئے یہ کس طرح ممکن ہوا کہ وہ سفید جرنیلوں کی طاقتور فوجوں کو شکست فاش دے کر بالکل نیست و نابود کر دیں۔''(38)

کھلی جنگ میں جبر و تشدد کے شکار کمزور لوگوں کا اپنے سابقہ مالکان کیخلاف فتح یاب ہونا بلاشبہ انسانی تاریخ کے انتہائی ولولہ انگیز واقعات میں سے ایک ہے جبکہ تاریخ غلام بغاوتوں کی شکستوں اور اسی قسم کے المیائی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ایک بار پھر ہمیں اکتوبر انقلاب کے بدخواہوں سے یہ سوال

پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ یہ کیونکر ممکن ہوا کہ سازشیوں کے ایک چھوٹے سے غیر نمائندہ ٹولے نے طاقتور سفید افواج کو شکست فاش دینے میں کامیابی حاصل کی جبکہ اکیس غیر ملکی افواج ان کی پشت پناہی کر رہی تھیں؟ ایسا معجزہ صرف اسی وجہ سے ممکن ہوا کہ بالشویکوں کو نہ صرف مزدور طبقے کی سرگرم حمایت حاصل تھی بلکہ غریب اور درمیانے طبقے کے کسانوں کی وسیع پرتیں بھی ان کے ساتھ تھیں۔ یہاں پہنچ کر اقلیت کی سازش پر مبنی قصہ اپنے ہی وزن تلے ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

بالشویک انقلاب کوئی کُو (Coup) نہیں بلکہ تاریخ کا سب سے مقبول عام انقلاب تھا۔ صرف اسی سے یہ وضاحت ہوسکتی ہے کہ کس طرح وہ تمام مشکلات کے باوجود نہ صرف اقتدار پر قبضہ کرنے بلکہ اس پر سختی سے جمے رہنے میں کامیاب ہوئے اور یہ سب کچھ مزدوروں کی جمہوریت کی بنیاد پر کیا گیا۔ یہ ایسا نظام تھا جو مزدور طبقے کو انتہائی جمہوری بورژوا حکومت سے بھی کہیں زیادہ حقوق دیتا تھا۔

لینن کی بین الاقوامیت

سارا یورپ انقلابی لہر کی زد میں تھا۔ نومبر 1918ء میں جرمن انقلاب خاندان کی بادشاہت کو بہا لے گیا اور قیصر ولیم کو مجبوراً ہالینڈ میں پناہ لینا پڑی۔ انقلاب نے پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ کر دیا جب تمام جرمنی میں سوویتوں کا قیام عمل میں آیا۔ جرنیل گولوون نے مئی 1919ء میں ونسٹن چرچل کے ساتھ برطانوی فوجی مداخلت جاری رکھنے کے سلسلے میں ہونے والی گفتگو کی یہ رپورٹ دی، ''اس کیلئے مسلح حمایت کرنے کا سوال سب سے مشکل تھا جس کی وجہ سے مسلح مداخلت کی مزدور طبقے کی طرف سے مخالفت تھی۔'' اوڈیسا میں فرانسیسی بحریہ اور دوسری اتحادی فوجوں میں بغاوتوں نے آخر کار روس میں ان کی فوجی مہموں کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا۔ 1920ء میں لندن کی ایسٹ انڈیا گودیوں میں گودی مزدوروں نے جولی جارج نامی جہاز پر مال لادنے سے انکار کر دیا جس میں پولینڈ کیلئے خفیہ طور پر اسلحہ بھیجا جا رہا تھا تا کہ اسے سوویت روس کیخلاف استعمال کیا جا سکے۔

برطانوی وزیراعظم جارج لائڈ نے وارسائی امن کانفرنس کے موقع پر کلیمن چاؤ کو ایک خفیہ یادداشت میں لکھا کہ ''انقلابی جوش تمام یورپ میں سرایت کر گیا ہے۔ جن سے پہلے والے حالات کیخلاف محنت کشوں میں نہ صرف گہری بے چینی کا احساس پایا جاتا ہے بلکہ غصہ اور بغاوت بھی۔ موجودہ نظام کے

سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں پر آبادی کی اکثریت کی طرف سے یورپ کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔'' (39)

غیر ملکی مداخلت کے خاتمے کے ساتھ ہی سرخ فوج نے فوراً سفید افواج کی باقیات کا صفایا کر دیا۔ یورپ میں انقلاب کی خبر نے بالشویک کارل راڈک کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ ''عالمی انقلاب آ چکا تھا۔ عوام نے اس کے آہنی قدموں کی آہٹ سنی، ہماری تنہائی ختم ہو گئی تھی۔'' مگر یہ بات المناک طور پر قبل از وقت ثابت ہوئی۔ انقلاب کی پہلی لہر نے اقتدار سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کے ہاتھوں میں دے دیا جنہوں نے تحریک کو غلط راستے پر ڈال کر اس سے غداری کی۔ لینن نے یورپی انقلاب کی پہلی لہر کی پسپائی کو ایک زبردست صدمہ خیال کیا جس سے ایک عرصے کیلئے سوویت ریپبلک تنہا رہ گئی۔ یہ کوئی ضمنی بات نہیں تھی بلکہ انقلاب کیلئے زندگی موت کا معاملہ تھا۔ لینن اور دوسرے بالشویک لیڈروں نے یہ بات بہت واضح کر دی تھی کہ اگر انقلاب کو مغرب تک نہ پھیلایا گیا تو وہ تباہ ہو جائیں گے۔

7 مارچ 1918ء کو لینن نے صورت حال کا جائزہ لیا:

''اگر ہم تنہا رہ گئے اور دوسرے ممالک میں انقلابی تحریکیں نہ ابھریں تو عالمی تاریخی نقطۂ نظر کے حوالے سے ہمارے انقلاب کی حتمی فتح کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی۔ جب بالشویک پارٹی نے تنہا کام کرنے کا بیڑا اٹھایا تو اسے کامل یقین تھا کہ تمام ممالک میں انقلاب پختہ ہو رہا ہے اور شروع میں تو نہیں مگر آخر کار چاہے ہمیں کتنی بھی مشکلات پیش آئیں، چاہے ہمیں کتنی ہی شکستوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے، عالمی انقلاب آئے گا کیونکہ وہ آ رہا ہے، پختہ ہوگا کیونکہ وہ پختہ ہو رہا ہے اور بالآخر مکمل طور پر پختہ ہو جائے گا۔ میں پھر دہراتا ہوں کہ ان تمام مشکلات سے ہماری نجات کا ذریعہ ایک کل یورپ انقلاب ہے۔'' (40)

وہ آخر میں کہتا ہے کہ ''ہر حال میں اور تمام قابل تصور صورتوں میں ہمارا تباہ ہونا یقینی ہے اگر جرمن انقلاب وقوع پذیر نہ ہوا'' (41)

کئی ہفتوں بعد اس نے اسی پوزیشن کو دہرایا کہ ''ہماری پسماندگی نے ہمیں اگلی صف میں لا کھڑا کیا ہے اور اگر ہم اس وقت تک نہ ڈٹے رہے جب تک دوسرے ملکوں میں انقلاب لانے والے مزدوروں سے زبردست امداد نہیں ملتی تو ہم ختم ہو جائیں گے۔'' (42)

بنیادی فریضہ یہ تھا کہ جتنی دیر تک ممکن ہو اقتدار پر قبضہ برقرار رکھا جائے۔ لینن نے کبھی نہیں سوچا

تھا کہ سوویت ریاست کسی لمبے عرصے کیلئے تنہا رہ جائے گی۔ یا تو یہ تنہائی ختم ہو جائے گی یا سوویت حکومت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہر شے کا انحصار عالمی انقلاب پر تھا۔ اس تاخیر نے بہت سی مشکلات پیدا کیں جن کے گہرے نتائج برآمد ہوئے۔ ریاست کے رفتہ رفتہ مٹنے کی بجائے اس کے برعکس عمل واقع ہوا۔ بدحالی کی وجہ سے، جس میں خانہ جنگی کے باعث مزید اضافہ ہوا تھا، مارکس کے بقول ''انفرادی بقا کی جدوجہد'' غائب ہونے یا دھیمی پڑنے کی بجائے آنے والے برسوں میں انتہائی شدت اختیار کر گئی۔ انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ داری کی بنیاد پر تعمیر کی بجائے سوویت ریاست قبل از سوشلزم اور قبل از سرمایہ داری کے مسائل پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اب فریضہ یہ بن گیا کہ ''امریکہ اور یورپ کے مقابلے میں ترقی کی جائے۔'' یہ بات مارکس کی ''کمیونزم کے پہلے درجے'' والی سوچ سے بہت مختلف تھی۔ بالشویک ان معاشی اور ثقافتی مسائل کو حل کرنے پر مجبور تھے جن پر عرصہ ہوا مغرب میں قابو پا لیا گیا تھا۔ لینن نے ایک بار اعلان کیا تھا کہ سوشلزم کا مطلب ''سوویت اقتدار اور بجلی کی فراہمی'' ہے جس کا مقصد ایک بنیادی فریضے کی نشاندہی کرنا تھا۔

یہ ''سوشلزم کے روسی راستے'' کی ترکیب نہیں تھی بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اسے ہمیشہ عالمی انقلاب کے پیش منظر سے جوڑا گیا تھا۔ یہ مزدور ریاست کی تنہائی پر قابو پانے کی کوشش تھی جسے ہر طرف سے جارح سرمایہ دار ریاستوں نے گھیر رکھا تھا۔ روس کی انتہا درجے کی پسماندگی اور انقلاب کے محدود ہونے سے سوویت مزدور طبقے پر منفی اثرات مرتب ہونا شروع ہو گئے۔ خانہ جنگی، قحط اور جسمانی تھکن نے انہیں سیاسی سرد مہری کا شکار کر دیا اور پارٹی و ریاست کی بقا کو یقینی بنانے کیلئے بین الاقوامی مدد کی ضرورت تھی۔ بالشویک صرف اتنا ہی کر سکتے تھے کہ تمام تر مشکلات کے باوجود جب تک ممکن ہو اقتدار پر قبضہ برقرار رکھیں یہاں تک کہ مغرب سے کمک پہنچ جائے۔ ٹراٹسکی نے 1923ء میں لکھا، ''تاریخ بلا قیمت کچھ نہیں دیتی۔ ایک بار سیاست میں رعایت دینے کے بعد وہ ہم سے ثقافت میں زیادہ قیمت کا مطالبہ کرتی ہے۔ جتنی آسانی سے (بے شک نسبتاً) روسی پرولتاریہ انقلابی بحران سے گزرا تھا سوشلسٹ تعمیر کا کام اب اتنا ہی زیادہ دشوار ہو گیا ہے۔'' (43)

عالمی انقلاب کی ضرورت پر لینن کی پوزیشن کو شک و شبے سے بالا ثابت کرنا بہت مشکل نہیں ہو گا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کا خیال تھا کہ اگر سوویت ریاست اپنی تنہائی کو ختم کرنے میں کامیاب نہ ہوئی تو اکتوبر انقلاب زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکے گا۔ انقلاب کے بعد لینن کی تحریروں اور تقریروں میں

اس خیال کا بارہا اعادہ کیا گیا۔ ذیل میں ہم اس کی محض کچھ مثالیں دے رہے ہیں۔ ان میں بے شمار اضافہ کیا جا سکتا ہے:

24 جنوری 1918ء:

''ہم ابھی سرمایہ داری سے سوشلزم تک کے عبوری دور کو مکمل کرنے سے بہت دور ہیں۔ ہم اس بارے میں کبھی بھی بہت زیادہ پر امید نہیں رہے کہ ہم بین الاقوامی پرولتاریہ کی مدد کے بغیر ایسا کر سکتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں کبھی خوش فہمی کا شکار نہیں رہے۔ کسی ایک ملک میں سوشلزم کی حتمی فتح بلاشبہ ناممکن ہے۔ سوویت اقتدار کی بالا دستی کو قائم رکھنے والا ہمارا مزدوروں اور کسانوں پر مشتمل جتھہ عظیم عالمی فوج کے جتھوں میں سے ایک ہے جو (فی الحال) عالمی جنگ کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں لیکن متحد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اب ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ انقلاب کا ارتقا کس حد تک ہوگا۔ روسیوں نے اسے شروع کیا جرمن، فرانسیسی اور برطانوی اسے انجام تک پہنچائیں گے اور سوشلزم فتح یاب ہو گا۔'' (44)

8 مارچ 1918ء:

''کانگریس کا خیال ہے کہ روس میں فتح یاب ہونے والے سوشلسٹ انقلاب کو مستحکم بنانے کی واحد قابل اعتماد ضمانت یہ ہے کہ اسے عالمی مزدور طبقے کے انقلاب میں تبدیل کر دیا جائے۔'' (45)

23 اپریل 1918ء:

''ہمیں آخری فتح صرف اس وقت حاصل ہوگی جب ہم آخر کار فیصلہ کن طور پر عالمی سامراج کو پاش پاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو آلات اور تنظیم کی بے پناہ قوت پر انحصار کرتا ہے۔ مگر ہم تمام ملکوں اور تمام دنیا کے مزدوروں کے ساتھ مل کر ہی فتح حاصل کریں گے۔'' (46)

14 مئی 1918ء:

''اس وقت تک انتظار کا مطلب جب تک مزدور طبقات عالمی پیمانے پر انقلاب برپا نہیں کرتے، یہ ہے کہ ہر کوئی ہوا میں معلق رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی ایک ملک میں شاندار کامیابی کے ساتھ شروع ہو اور پھر اذیت ناک ادوار سے گزرے کیونکہ آخری فتح صرف عالمی پیمانے پر اور تمام ممالک کے مزدوروں کی مشترکہ کاوشوں سے ہی ممکن ہے۔'' (47)

29 جولائی 1918ء:

''ہمیں یہ خوش فہمی کبھی نہیں رہی کہ کسی ایک ملک کا پرولتاریہ اور انقلابی عوام کی طاقت، چاہے وہ کتنے بھی بہادر اور منظم کیوں نہ ہوں، بین الاقوامی سامراج کا تختہ الٹ سکتے ہیں۔ ایسا صرف عالمی مزدوروں کی مشترکہ کوششوں سے ہی کیا جاسکتا ہے۔ ہم نے خود کو کبھی یہ سوچ کر دھوکہ نہیں دیا کہ کسی واحد ملک کی کوششوں سے ایسا کیا جاسکتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری کاوشیں ناگزیر طور پر ایک عالمی انقلاب کی طرف جا رہی ہیں اور یہ کہ سامراجی حکومتوں کی شروع کردہ جنگ بذات خود ان حکومتوں کی کوششوں سے ختم نہیں ہوسکتی۔ یہ صرف تمام مزدوروں کی کوشش سے ختم ہوسکتی ہے اور جب ہم اقتدار میں آئے تو ہمارا فریضہ یہ تھا کہ اس اقتدار کو اور سوشلزم کی اس مشعل کو جلائے رکھیں تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ چنگاریاں بکھیر کر سوشلسٹ انقلاب کے بڑھتے ہوئے شعلوں کو مزید بھڑکائے۔''(48)

8 نومبر 1918ء:

''اکتوبر انقلاب کے آغاز ہی سے خارجہ پالیسی اور بین الاقوامی تعلقات ہمارے سامنے سب سے بڑا سوال رہے ہیں۔ محض اس لئے نہیں کہ اب دنیا کی تمام ریاستیں سامراج کے ذریعے مضبوطی سے ایک غلیظ اور خون آشام اکائی میں جوڑی جارہی ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ کسی واحد ملک میں سوشلسٹ انقلاب کی مکمل فتح ناقابل تصور ہے اور کم از کم کئی ترقی یافتہ ممالک کے انتہائی سرگرم تعاون کا تقاضا کرتی ہے جن میں روس شامل نہیں ہے۔ ہم عالمی پرولتاری انقلاب سے کبھی بھی اتنے قریب نہیں ہوئے جتنے اس وقت ہیں۔ ہم نے ثابت کردیا کہ عالمی مزدور انقلاب پر تکیہ کرنے میں ہم غلطی پر نہیں تھے۔ اگر وہ کسی ایک ملک کو دبا بھی لیتے ہیں تو بھی وہ عالمی پرولتاری انقلاب کو کبھی نہیں دبا سکیں گے۔ وہ صرف اس آگ پر تیل چھڑکیں گے جس سے وہ سب جل کر راکھ ہوجائیں گے۔''(49)

20 نومبر 1918ء:

''ہمارے روسی انقلاب کی ایک سوشلسٹ انقلاب میں تبدیلی کوئی مشکوک مہم نہیں بلکہ ایک ضرورت تھی کیونکہ کوئی دوسرا نعم البدل موجود نہیں تھا۔ اگر عالمی سوشلسٹ انقلاب یا عالمی بالشوازم کامیاب نہیں ہوا تو برطانوی، فرانسیسی اور امریکی سامراج ناگزیر طور پر روس کی آزادی و خودمختاری کو ختم کردے گا۔''(50)

15 مارچ 1919ء:

''عالمی پیمانے پر مکمل اور آخری فتح صرف روس میں ہی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ صرف اس وقت

حاصل ہوسکتی ہے جب کم از کم سارے ترقی یافتہ ممالک میں پرولتاریہ فتح یاب ہو یا بہرصورت بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک میں سے کچھ کے اندر۔ اسی وقت ہم مکمل اعتماد کے ساتھ یہ کہنے کے قابل ہونگے کہ پرولتاریہ نے اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرلی ہے اور ہم پہلا مقصد یعنی سرمایہ داری کا تختہ الٹنے کا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکے ہیں اور یہ ہمیں ایک دوسرا فرض سونپتا ہے۔ کیونکہ سوویت اقتدار قائم ہوچکا ہے، کیونکہ بورژوازی کا تختہ ایک ملک میں الٹا جاچکا ہے، دوسرا فریضہ ایک مختلف سطح پر، عالمی پیمانے پر جدوجہد کا ہے، ایک پرولتاریہ ریاست کی جدوجہد کا جو سرمایہ دار ریاستوں میں گھری ہوئی ہے۔'' (51)

5 دسمبر 1919ء:

''اکتوبر سے پہلے اور اکتوبر کے بعد بھی ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ ہم خود کو صرف اور صرف عالمی پرولتاری فوج کے جتھوں میں سے ایک جتھہ سمجھتے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ سوشلسٹ انقلاب کی فتح کو صرف اسی وقت سمجھا جاسکتا ہے جب یہ کم از کم کئی ترقی یافتہ ممالک کے پرولتاریہ کی فتح بن جائے۔'' (52)

20 نومبر 1920ء:

''منشویکوں کا دعویٰ تھا کہ ہم نے اپنے طور پر عالمی بورژوازی کو شکست دینے کا تہیہ کیا ہوا ہے۔ تاہم ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ ہم عالمی انقلاب کی زنجیر کی ایک کڑی ہیں اور ہم نے کبھی بھی اپنے ذرائع سے فتح کے حصول کو اپنا مقصد نہیں بنایا۔'' (53)

فروری 1922ء:

''لیکن ہم نے اپنی سوشلسٹ معیشت کی بنیاد رکھنے کا کام ابھی مکمل نہیں کیا اور قریب المرگ سرمایہ داری کی جارح قوتیں ہمیں اب بھی اس سے محروم کرسکتی ہیں۔ ہمیں واضح طور پر اسے سمجھنا اور تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ جھوٹے خوابوں سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں ہوتی۔۔۔ اور اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کرنا کوئی بہت خوفناک بات نہیں کیونکہ ہم نے ہمیشہ مارکسزم کی اس بنیادی سچائی کو دہرایا اور اس پر زور دیا ہے کہ سوشلزم کی فتح کیلئے کئی ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہوگی۔'' (54)

لینن کی ناقابل مصالحت بین الاقوامیت کوئی جذباتی یوٹوپیا نہیں بلکہ اس کے برعکس صورتحال کی حقیقت پسندانہ تشخیص کی پیداوار تھی۔ لینن اس بات سے پوری طرح آگاہ تھا کہ سوشلزم کیلئے ضروری مادی

حالات روس میں موجود نہیں ہیں مگر عالمی پیمانے پر موجود ہیں۔ عالمی سوشلسٹ انقلاب طبقاتی سماج کی وحشیانہ خصوصیات کے از سر نو زندہ نہ ہونے کی پیش بندی کرتا جنہیں مارکس ''تمام تر پرانی بکواس'' کہتا تھا۔ کیونکہ یہ اپنے آغاز ہی سے سرمایہ دار سماج سے زیادہ ترقی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ لینن عالمی انقلاب کے پیش منظر پر اس قدر زور دیتا تھا اور اس نے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی تعمیر کیلئے اتنا وقت اور توانائی خرچ کی۔

محنت کی نئی عالمی تقسیم اور پیداوار کی عالمی پیمانے پر منصوبہ بندی کی بنیاد پر پیداواری قوتوں کو بہت تیزی سے ترقی کرنے کی تحریک ملتی۔ فطرت پر غلبہ حاصل کرنے اور صحراؤں کو زرخیز میدانوں میں تبدیل کرنے کیلئے سائنس اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کیا جاتا۔ سرمایہ داری کے ہاتھوں ہونے والے زبردست ضیاع اور کرہ ارض کی تباہی کو روکا جا سکتا تھا۔ ایک آدھ نسل کے دوران سوشلزم کیلئے مادی بنیاد رکھی جا سکتی تھی۔ کچھ عرصے میں پیداوار میں زبردست اضافہ تمام مادی ناہمواریاں ختم کر کے اشیا کی ایسی افراط پیدا کرتا جس سے معیار زندگی عالمی پیمانے پر بے مثال سطح تک بلند ہو جاتا۔ ایسی عالمی معاشی منصوبہ بندی کے ذریعے تمام بنیادی انسانی ضروریات کی تسکین ممکن ہو جاتی۔ اس کے نتیجے میں طبقات سماج کے اندر ضم ہو جاتے اور ان کے ساتھ ساتھ طبقاتی سماج کی باقیات یعنی پیسہ اور ریاست بھی۔ اس سے حقیقی کمیونزم کو فروغ حاصل ہوتا اور انسان پر انسان کے غلبے کی جگہ اینگلز کے بقول ''چیزوں کا انتظام'' لے لیتا۔

لیکن سرمایہ داری کا تختہ اس ترتیب سے نہیں الٹا گیا۔ سرمایہ دار ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں مزدور طبقے کے برسر اقتدار آنے کی بجائے لینن کے الفاظ میں سرمایہ داری ''اپنی کمزور ترین کڑی'' سے ٹوٹ گئی۔ عالمی سرمایہ داری کے دیوالیہ پن کی قیمت کمزور روسی سرمایہ داری نے ادا کی۔ روسی بورژوازی بہت تاخیر سے تاریخی دھارے میں شامل ہوئی تھی اور قومی جمہوری انقلاب کے ان تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھی جو عرصہ ہوا مغرب میں پورے کئے جا چکے تھے۔ تاہم ناہموار اور مشترکہ ترقی کے اصول کے تحت بیرونی سرمائے نے روس کے شہروں میں انتہائی جدید اور بڑی بڑی صنعتیں قائم کر دی تھیں جن کی وجہ سے کسان کی جڑیں اکھڑ گئیں اور وہ راتوں رات صنعتی مزدور بن گیا۔ تجربے کی بنیاد پر اس نئے مزدور طبقے کا جھکاؤ مزدور تحریک کے انتہائی جدید تصورات کی طرف ہوا جو اس کی ضروریات کی عکاسی کرتے تھے یعنی مارکسزم۔۔۔اور وہ پہلا پرولتاریہ طبقہ تھا جس نے سوشلسٹ انقلاب کو انجام تک پہنچایا۔

اگر یہ انقلاب ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوتا تو اس حقیقت کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی کہ روس ایک پسماندہ ملک تھا۔ لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں بالشویک پارٹی کا یہی مقصد تھا۔ ''سوشلزم انسانی ضروریات کی تسکین کیلئے ایک منصوبہ بند اور ہم آہنگ سماجی پیداوار کی تنظیم ہے۔ ذرائع پیداوار کی اجتماعی ملکیت ابھی سوشلزم نہیں بلکہ محض اس کی قانونی بنیاد ہے۔ سوشلسٹ سماج کے مسئلے کو پیداواری قوتوں کے مسئلے سے الگ نہیں کیا جا سکتا جو انسانی ترقی کے موجودہ مرحلے پر اپنی نوعیت کے حوالے سے عالمی ہیں۔'' (55)

اکتوبر انقلاب کو نئے عالمی سوشلسٹ نظام کی شروعات خیال کیا جاتا تھا۔

تاریخ ایک سیدھی لکیر میں نہیں بلکہ ناہموار اور مشترکہ ترقی کے اصولوں کے تحت آگے بڑھتی ہے۔ ایک پسماندہ ملک ترقی یافتہ ملک کی مادی اور ذہنی حاصلات کو من و عن نہیں بلکہ ایک متضاد انداز میں نقل کرتا ہے۔ قبل از سرمایہ داری اشکال پر انتہائی جدید ٹیکنیک اور ثقافت کی کندہ کاری تاریخی عمل میں مختلف مراحل کے عجیب و غریب اشتراک کا باعث بنتی ہے۔ مجموعی اعتبار سے ان کا ارتقا ایک غیر منصوبہ بند اور ملا جلا کردار اختیار کر لیتا ہے۔

تنہائی کی قیمت

مذکورہ بالا سطور یہ ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ لینن اور بالشویک پارٹی نے روسی انقلاب کو ایک خود کفیل عمارت کے طور پر نہیں بلکہ عالمی سوشلسٹ انقلاب کی شروعات کے طور پر دیکھا تھا۔ روسی انقلاب نے دنیا کے مزدوروں کیلئے مشعل راہ کا کام کیا۔ بالخصوص جرمن انقلاب کیلئے اس نے ایک زبردست محرک کا کام کیا۔ لیکن جرمنی اور اٹلی کے علاوہ دیگر مغربی یورپی ممالک میں سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کی بزدلی وہاں انقلابات کی شکست اور ہولناک پسماندگی کے حالات میں روسی انقلاب کے محدود ہو جانے کا باعث بنی۔ ان حالات میں سٹالنسٹ سیاسی رد انقلاب ناگزیر ہو گیا تھا۔ روسی انقلاب کا نوکر شاہانہ انحطاط بالشوازم کی کسی نظری خامی کے باعث نہیں بلکہ تباہ کن پسماندگی کے باعث واقع ہوا۔

نوخیز سوویت ریپبلک کو بین الاقوامی مزدور طبقے کی یکجہتی نے بچا لیا تھا مگر تنہائی کی وجہ سے بہت نقصان اور تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں۔ معاملہ روسی مزدور طبقے کی برداشت سے باہر ہو چلا تھا۔ جسمانی

تھکن اور عددی کمزوری کے ساتھ ساتھ انہیں نا قابل عبور ثقافتی، معاشی اور سماجی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔ محض سامراجی گھیراؤ کا مقابلہ کرنے کیلئے ہرکولیس جیسی قوت درکار تھی۔ پسماندگی اور تنہائی کے نتیجے میں روسی پرولتاریہ کو جن خوفناک مسائل کا سامنا تھا ان کے بارے میں لینن ایک ایماندارانہ اور حقیقت پسندانہ رویہ رکھتا تھا۔ جنوری 1919ء میں روسی ٹریڈ یونینوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ''مزدوروں اور پرانے نظام کے درمیان کوئی دیوار چین حائل نہیں رہی اور ان میں سرمایہ دار سماج کی روایتی ذہنیت کی اچھی خاصی باقیات موجود ہیں۔ مزدور ایک نیا سماج تعمیر کر رہے ہیں حالانکہ نہ تو وہ خود نئے آدمی ہیں اور نہ ہی ان سے پرانی دنیا کی غلاظت اتری ہے۔ وہ اب بھی گھٹنوں تک اس غلاظت میں دھنسے ہوئے ہیں۔ ہم اس غلاظت کو صاف کرنے کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ یہ سوچنا کہ اس کو فوراً صاف کیا جا سکتا ہے انتہائی یوٹوپیائی حرکت ہوگی۔ یہ حرکت اس قدر یوٹوپیائی ہوگی کہ اس سے سوشلزم عملی طور پر ایک غیر معینہ عرصے تک ملتوی ہو جائے گا۔'' (56)

روسی سرمایہ داروں کی تخریب کاری اور خانہ جنگی کے نتیجے میں روسی حکومت اپنی پالیسی میں زبردست تبدیلی متعارف کروانے پر مجبور ہوگئی۔ ابتدا میں بالشویکوں کا ارادہ یہ تھا کہ زیادہ تر صنعت کو پرائیویٹ ہاتھوں میں اس وقت تک رہنے دیا جائے جب تک چھوٹا سا مزدور طبقہ صنعت کو اپنے طور پر چلانا نہیں سیکھ لیتا اس کیلئے وقت درکار تھا۔ روس کی ثقافتی پسماندگی کے پیش نظر سوچا یہ گیا کہ مزدوروں کے جمہوری کنٹرول کے ذریعے پرولتاریہ یہ ضروری علم حاصل کرے گا، انتظام کا فن سیکھے گا اور آخر کار صنعت اور ریاست کو چلانے کا سارا کام اپنے ہاتھوں میں لے لے گا۔ اس دوران مزدوروں کی ریاست وقت گزاری کرنے، مزدوروں کے کنٹرول کے تحت پرائیویٹ صنعت کو قائم رکھنے اور ریاستی مشینری کو چلانے کیلئے پرانی ریاستی نوکر شاہی پر بہت حد تک انحصار کرنے پر مجبور تھی۔ امید یہ کی جا رہی تھی کہ جب تک مغرب کے مزدور مدد کو نہ آ جائیں اس حالت کو برقرار رکھا جائے۔ روسی مزدور اقتدار پر قبضہ تو کر سکتے تھے مگر وہ غیر معینہ عرصہ کیلئے اس پر قابض نہیں رہ سکتے تھے، ہر شے کا انحصار عالمی انقلاب پر تھا۔ اس دور میں کسی صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک میں بھی ریاست اور صنعت کا انتظام اور کنٹرول فوری طور پر مزدوروں کے سپرد کر دینا بہت مشکل ہوتا۔ اس صورت میں پسماندہ سوویت روس میں یہ کس قدر مشکل تھا؟

انقلاب کا فوجی دفاع سب سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ سرخ فوج میں شامل ہونے والے لاکھوں افراد کو کھانا اور کپڑے مہیا کرنا بھی ضروری تھا۔ مزدوروں اور سپاہیوں کی بقا کیلئے جبری وصولی

ضروری تھی۔سارے روسی سماج کو جنگی بنیادوں پر کھڑا کیا گیا۔جنگی کمیونزم کی پالیسی تمام تر دشواریوں اور مخالفتوں کے خلاف انقلاب کا بے خوفی اور بہادری سے دفاع کرنے کی ایک کوشش تھی۔لیکن بڑے کاروبار کی تخریب کاری کے باعث، جو اپنی حیثیت کی بحالی کیلئے ردانقلاب کی طرف دیکھ رہا تھااور مزدوروں کے اپنے دباؤ اور خانہ جنگی کی ضروریات کی وجہ سے، بالشویک معیشت کے کلیدی شعبوں کو بڑے پیمانے پر قبل از وقت قومیانے پر مجبور ہو گئے۔ 1918ء میں جولائی اور دسمبر کے درمیان 1208اداارے ریاستی ملکیت میں لے لئے گئے۔یہ بھاری صنعتیں روسی معیشت کی فیصلہ کن بنیاد تھیں۔

شدید معاشی دشواریاں سوویت اقتدار کے ابتدائی برسوں کا خاصہ تھیں، کچھ جنگ اور خانہ جنگی کی وجہ سے، کچھ خام مال اور ہنر مند مزدوروں کی کمی کی وجہ سے، کچھ بالشویکوں کے سوشلسٹ اقدامات کی وجہ سے اور کچھ چھوٹے صاحب جائیداد کسانوں کی مخالفت کی وجہ سے۔خانہ جنگی کے دوران قحط، بیماری اور انتہائی سرد موسمی حالات سے نوے لاکھ جانیں ضائع ہوئیں۔معیشت کی حالت نازک تھی اور وہ تباہی کے دہانے پر کھڑی تھی۔اس تباہ کن تنزلی کو روکنے کیلئے سخت اقدامات کئے گئے تاکہ صنعت کو متحرک کیا جا سکے، بھوکے مزدورں کو خوراک مہیا کی جا سکےاور شہروں سے دیہات کی طرف نقل مکانی کو روکا جا سکے۔اس کا مطلب یہ تھا کہ عارضی طور پر مزدوروں کو مسلح کیا جائے۔اکتوبر انقلاب کے نقاداس پالیسی کیلئے بالشوازم کو موردالزام ٹھہراتے ہیں۔گویا جنگ اور قحط کی صورتحال میں کوئی دوسرا راستہ بھی موجود تھا۔اس صورتحال کی حقیقی ذمہ داری سامراجیوں پر عائد ہوتی ہے جنہوں نے انقلاب کیخلاف مسلح مداخلت کے دوران روسی عوام کو ناقابل بیان دہشت کا شکار بنایا۔اس سے زیادہ قابل نفرت جھوٹ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ لینن اور ٹراٹسکی کی یاد کو داغدار کرنے کیلئے دوران جنگ انقلاب کے دفاع کیلئے ضروری سخت اقدامات اور جنگی کمیونزم کی پالیسی کو سٹالن کی خوفناک آمرانہ حکومت کے ساتھ جوڑا جائے۔حقیقت تو یہ ہے کہ دوران جنگ انتہائی جمہوری بورژوا حکومتیں بھی جمہوری حقوق پر پابندی لگانا ضروری خیال کرتی ہیں۔دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی مزدوروں نے اپنے حقوق پر ہر طرح کی پابندیاں قبول کیں، اور اکثر رضاکارانہ طور پر، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ وہ ''نازی ازم'' کے خلاف جمہوریت کے دفاع کیلئے لڑ رہے ہیں۔اس سے کہیں بڑھ کر سفید افواج کو شکست دینے کیلئے روسی مزدوروں نے سخت ڈسپلن کی ضرورت کو محسوس کیا۔اقتدار مزدوروں کی سوویتوں کے ہاتھ میں تھا۔خوفناک خانہ جنگی کے حالات میں بھی وہاں اتنی جمہوریت تھی کہ تاریخ کے کسی عہد نے نہیں دیکھی۔آپ کو یہ جاننے کیلئے صرف کمیونسٹ پارٹی کی

کانگریس اور تیسری انٹرنیشنل کی روئیداد کو سرسری طور پر دیکھنا پڑے گا کہ ان حالات میں بھی بحث مباحثے اور تنقید کی مکمل آزادی موجود تھی۔ مزدوروں کی ریاست کے وجود میں آنے کے پانچ سال بعد تک کے دور میں آزادی کا جو ماحول تھا وہ آمرانہ حکومت سے بہت بعید تھا۔ تاہم آخری تجزیے میں سوویت جمہوریت کے قائم رہنے اور مزید گہرا ہونے کے امکان کا انحصار مادی حالات پر تھا۔

ایک کلیدی سوال صنعت اور زراعت کے رشتے کا تھا۔ یہ کسانوں سے مزدوروں کے تعلق کے اظہار کا محض ایک اور طریقہ تھا۔ حصول زمین کیلئے کسانوں کی بڑی اکثریت اقتدار پر قابض بالشویکوں کے قبضے کی حمایت کرتی تھی۔ لیکن انقلاب کے بعد سوویت حکومت کے بارے میں کسانوں کے رویے کا زیادہ انحصار اس کی اس صلاحیت پر تھا کہ وہ کس حد تک زرعی پیداوار کے بدلے سستی اشیائے صرف دیہاتوں کو مہیا کرتی ہے۔ عام حالات میں خوراک اور زرعی اجناس کے بدلے صنعتی اشیا کا تبادلہ ہوتا۔ مگر پیداوار میں انحطاط کے باعث کسانوں کی پیداوار سے تبادلے کیلئے اشیا موجود نہیں تھیں۔ شہروں کو قحط سے بچانے کیلئے مسلح فوجیوں کے ذریعے اناج جبراً وصول کیا گیا تاکہ جنگی صنعت کو چالو رکھا جا سکے۔ کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں تھا۔ جنگی کمیونزم سے یہی مراد تھی۔ ان اقدامات کے باوجود یہ معاشی انتشار اور پیداوار میں انحطاط کا دور تھا۔ کسانوں کے ساتھ تعلقات میں کھچاؤ اپنی انتہا کو پہنچ رہا تھا۔ سخت مرکزیت اور زندگی کے تمام شعبوں میں نیم فوجی اقدامات کے تعارف پر مبنی فوج آرائی کا یہ نظام خانہ جنگی اور بیرونی جارحیت کے حالات کے تحت جنگ سے شکستہ حال اور پسماندہ ملک میں انقلاب کے محدود ہو جانے سے پیدا ہونیوالی دشواریوں کا نتیجہ تھا۔

خانہ جنگی کی صورتحال اور اس دور کے شدید افراط زر کی وجہ سے شہر اور دیہات کے درمیان تجارت تقریباً بالکل رک گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قصبوں میں اور شہروں میں مزدور فاقہ کشی کا شکار تھے اور قحط عام تھا۔ قصبوں میں مزدوروں کی ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر خوراک کی تلاش میں دیہات کی طرف نقل مکانی شروع ہو گئی۔ 1919ء تک صنعتی مزدوروں کی تعداد 1917ء کے مقابلے میں 76 فیصد جبکہ تعمیراتی مزدوروں کی 66 فیصد اور ریلوے مزدوروں کی 63 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ صنعتی مزدوروں کی تعداد 1917ء کی تین لاکھ کی سطح سے گر کر 1920ء میں تقریباً آدھی سے بھی کم یعنی 12,40,000 تھی اور مزید کم ہو کر اگست 1920ء میں 570000 رہ گئی۔

بے نظیر انہدام

1920ء میں خام لوہے اور کاسٹ آئرن کی پیداوار 1913ء کی سطح کے مقابلے میں بالترتیب 1.6 فیصد اور 2.4 فیصد رہ گئی۔ تیل کا ریکارڈ سب سے بہتر تھا جو 1913ء کے مقابلے میں پیداوار کا 41 فیصد تھا۔ کوئلہ 17 فیصد پر تھا۔ مکمل طور پر تیار کی جانیوالی اشیا کی عام پیداوار 1913ء کے مقابلے میں 1920ء میں 12.9 فیصد تھی۔ زرعی پیداوار میں (1917-19ء) کے دوسالوں میں سولہ فیصد کمی ہوئی۔ سب سے زیادہ کمی ان اشیا میں ہوئی جو گاؤں سے شہروں کو برآمد ہوتی تھیں۔ سن میں 26 فیصد، السی کی پیدوار میں 32 فیصد اور چارے کی پیدوار میں 40 فیصد کمی ہوئی۔ لینن نے جنگی کمیونزم کے دور کو ''محصور قلعے میں بند کمیونزم'' سے تشبیہ دی ہے۔ ان سالوں میں صنعت اور زراعت میں بے نظیر انحطاط ہوا تھا۔ افراط زر قابو سے باہر ہو گیا۔ 1921ء میں مزید معاشی زوال ہوا۔ فصل کی مقدار محض 37.6 ملین ٹن تھی یعنی جنگ سے پہلے کی اوسط پیداوار کا 43 فیصد۔ اس کے نتیجے میں لاکھوں مزید افراد فاقہ کشی اور بیماری کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پیری سورلن کے مطابق ''وبائیں آسانی سے پھیلتی ہیں۔ جن متعددی بیماریوں پر بیسویں صدی کے آغاز میں پوری طرح قابو نہیں پایا گیا تھا تیزی سے دوبارہ پھیل گئیں۔ 1917ء سے 1922ء کے درمیان 22 ملین لوگ ٹائفس کا شکار ہوئے۔ 1918-19ء میں اس بیماری سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 15 لاکھ تھی۔ اور یہ اعداد وشمار غالباً مکمل بھی نہیں تھے۔ ہیضے اور سرخ بخار سے اموات تو کم ہوئیں لیکن 7 یا 8 ملین روسی ان سے متاثر ہوئے۔ شرح اموات میں بہت اضافہ ہوا اور بحیثیت مجموعی ملک میں یہ شرح دگنی ہوگئی۔ دوسری طرف اہم شہروں میں شرح پیدائش 13 فی ہزار تھی اور دیہات میں 22 فی ہزار۔ 1918ء کے آخر سے لیکر 1920ء کے آخر تک وباؤں، بھوک اور سردی سے 75 لاکھ روسی موت کا شکار ہوئے جبکہ عالمی جنگ میں 40 لاکھ روسی کام آئے تھے۔'' (57)

جولائی 1918ء میں لینن نے کہا کہ ''عوام کی حالت ایسی ہے جیسے کسی شخص کو مار مار کر موت کی دہلیز پر لا کھڑا کیا گیا ہو۔'' پھر جنوری 1919ء میں کہا'' بھوکے عوام نڈھال ہو چکے ہیں اور بعض اوقات انکی تھکن انسانی قوت برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔'' دسمبر 1919ء میں کہا'' ہم ایک شدید بحران کا شکار ہیں۔ ایک مزید لعنت ہم پر دھاوا بول رہی ہے، جوئیں اور ٹائفس ہمارے سپاہیوں کو ختم کر رہے

ہیں۔ یا تو جوئیں سوشلزم کو شکست دے دیں گی یا سوشلزم جوؤں کو ہرا دے گا!'' دسمبر 1920ء میں اس نے بھیانک صورتحال کے بارے میں بات کی۔ اپریل 1921ء میں صورتحال کو مایوس کن قرار دیا۔ جون 1921ء میں اس نے کہا'' کوئی ملک ہمارے ملک کی طرح تباہ نہیں ہوا۔'' (58)

جنگ، بھوک اور بیماری کے ہاتھوں لاکھوں افراد ہلاک ہوئے۔ 1920ء میں آدم خوری کے واقعات کی اطلاعات ملیں۔ مجموعی طور پر چھوٹا سا مزدور طبقہ اپنے پرانے حجم کا صرف 43 فیصد رہ گیا۔ یہ اعداد وشمار بھی تباہی کی مکمل عکاسی نہیں کرتے ان سے نیم فاقہ کشی کا شکار، چیتھڑوں میں ملبوس ان مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں کمی کا اظہار نہیں ہوتا جو فیکٹریوں میں باقی بچ گئے تھے۔ لینن نے لکھا،'' جنگ، غربت اور تباہی کے باعث صنعتی پرولتاریہ غیر طبقاتی ہو گیا ہے یعنی اپنی طبقاتی پٹڑی سے اتر گیا ہے اور پرولتاریہ کی حیثیت سے اپنا وجود کھو بیٹھا ہے۔ پرولتاریہ طبقہ وہ ہے جو بڑے پیمانے کی سرمایہ دارانہ صنعت میں مادی اقدار پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ بڑے پیمانے کی سرمایہ دار صنعت تباہ ہو چکی ہے اور فیکٹریاں بیکار کھڑی ہیں اس لئے پرولتاریہ غائب ہو گیا ہے۔ اس کے بارے میں بعض اوقات اعداد وشمار تو دیئے گئے ہیں مگر یہ معاشی حوالے سے اکٹھا نہیں رہا ہے۔'' (59)

یہ صورتحال، جس میں مزدور طبقہ بحیثیت ایک طبقے کے کم وبیش'' وجود سے عاری'' ہو گیا تھا، مزدوروں کی جمہوریت پر مبنی ایک قابل عمل نظام قائم کرنے کے امکانات کے سلسلے میں سنجیدہ مضمرات کی حامل ثابت ہوئی مزدوروں کی ریاست ایک ایسے مزدور طبقے پر تکیہ کر رہی تھی جو غبار بن چکا تھا۔ ہر اول مزدوروں کی پوری کی پوری پرتیں، جو انقلاب کی چٹانی بنیاد تھیں، خانہ جنگی کے دوران یا قحط کے حالات میں صفحہ ہستی سے مٹ چکی تھیں۔ فاقہ کشی کا شکار بہت سے مزدور خوراک کیلئے دیہی علاقوں کی خاک چھاننے پر مجبور تھے۔ اس سے ایک شدید سیاسی مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ سوویت ڈھانچوں نے کام کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ مزدور اقتدار کے اداروں کی حیثیت سے سوویتوں کا استعمال ختم ہو گیا۔ اس وقت کی معاشی اور سماجی صورتحال کو مدنظر رکھا جائے تو اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟

آل رشین کانگریس آف سوویٹس، جو ملک کی سب سے اعلیٰ اتھارٹی تھی، نومبر 1918ء اور دسمبر 1922ء کے درمیان سال میں صرف ایک بار اپنا اجلاس کر سکی۔ ایگزیکٹو کمیٹی آف دی سوویٹس کم باقاعدگی سے اجلاس کرتی تھی اور اس کی طاقت اس کی چھوٹی سی پریذیڈیم کو منتقل ہو گئی۔ فیکٹریوں نے کام کرنا بند کیا تو مزدوروں کا کنٹرول بھی غائب ہو گیا۔ رفتہ رفتہ طاقت حکومت اور پارٹی مشینری کے ہاتھوں

میں منتقل ہوتی چلی گئی جو بذات خود ریاستی مشینری میں پھنستی چلی گئیں۔ پرولتاریہ ایسی شکل میں وجود نہیں رکھتا تھا کہ اپنے کندھوں پر سیاسی طاقت کا بار اٹھا سکتا۔ اس حقیقت کو حکومت کا کوئی فرمان نہیں بدل سکتا تھا۔ لینن نے خطرات کو پہچانا اور کم از کم جزوی طور پر صورتحال کا ازالہ کرنے کیلئے اقدامات کئے۔ لیکن عالمی انقلاب کے علاوہ کوئی حل نہیں تھا۔

ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ ''ملک اور اس کے ساتھ حکومت بھی گہری کھائی کے بالکل کنارے کھڑے تھے۔'' ایک بار پھر انقلاب کی تقدیر ڈول رہی تھی۔ ٹمبوف اور دوسرے مقامات پر کسان بغاوتوں سے معاملات بحران کا شکار ہو گئے۔ اب صورتحال پہلے کی طرح جاری نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد پالیسی میں تیز رفتار تبدیلیوں کی ضرورت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ بالشویکوں کیلئے ضرورت اس امر کی تھی کہ مغرب سے امداد آنے تک جتنی دیر ممکن ہو اقتدار پر قائم رہیں۔

جب کرونسٹاٹ میں موجود بحری گیریژن نے بغاوت کر دی تو بہت سنجیدہ صورتحال پیدا ہو گئی۔ اس واقعہ کے بارے میں بہت اوٹ پٹانگ باتیں لکھی گئی ہیں جس سے یہ ایک داستان بن چکا ہے۔ حسب معمول اس کا مقصد یہی ہے کہ لینن اور ٹراٹسکی کو بدنام کیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ بالشوازم اور سٹالنزم ایک ہی چیز ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کرونسٹاٹ کے سلسلے میں چیخ و پکار کرنے میں بورژوا اور اکتوبر انقلاب کے مخالف سوشل ڈیموکریٹ انارکسٹوں اور الٹرا لیفٹ کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ مگر ان الزامات کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

پہلا جھوٹ تو یہ ہے کہ کرونسٹاٹ کے باغیوں کو 1917ء کے سرخ ملاحوں سے ملایا جاتا ہے۔ ان میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ 1917ء میں کرونسٹاٹ کے ملاح بالشویک اور مزدور تھے۔ پیٹروگراڈ کے مزدوروں کے ساتھ مل کر انہوں نے اکتوبر انقلاب میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن خانہ جنگی کے دوران کم و بیش ساری گیریژن نے رضا کارانہ طور پر سرخ فوج میں شامل ہو کر لڑنے کیلئے خود کو پیش کر دیا۔ انہیں مختلف محاذوں پر بھیجا گیا جہاں سے ان کی اکثریت کبھی واپس نہ آئی۔ 1921ء میں کرونسٹاٹ گیریژن زیادہ تر بحیرہ اسود کے بحری بیڑے کے کسان رنگروٹوں پر مشتمل تھی۔ باغیوں کے خاندانی ناموں پر سرسری نظر دوڑانے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ تقریباً سب کے سب یوکرائنی تھے۔

دوسرے جھوٹ کا تعلق کرونسٹاٹ کے واقعے میں ٹراٹسکی کے کردار کے بارے میں ہے۔ درحقیقت اس نے براہ راست کوئی کردار ادا نہیں کیا اگرچہ جنگ کا کیسار اور حکومت کا رکن ہونے کے

ناطے اس نے حکومتی اقدامات کی سیاسی ذمہ داری کو پوری طرح قبول کیا تھا۔ کرونسٹاٹ کے قلعے پر باغیوں کے قبضے نے سوویت ریاست کو زبردست خطرے سے دوچار کردیا تھا۔ انہوں نے ابھی ابھی خانہ جنگی سے نجات حاصل کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ لینن کی سربراہی میں گیریژن کے ساتھ گفت وشنید کرنے والے بالشویکوں نے مذاکرات میں اچھی کارکردگی نہیں دکھائی اور پہلے سے سنجیدہ صورتحال کو مزید بھڑکا دیا۔ لیکن باغیوں نے ایک بار روس کے سب سے اہم بحری اڈے پر قبضہ کرلیا تو سمجھوتے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

زیادہ خوف اس بات کا تھا کہ بغاوت کو بہانہ بنا کر برطانیہ اور فرانس کی بحری افواج کرونسٹاٹ پر قبضہ کرلیں گی۔ اس کے بعد پیٹروگراڈ ان کے رحم وکرم پر ہوتا کیونکہ جس کا قبضہ کرونسٹاٹ پر ہوتا وہی پیٹروگراڈ کو کنٹرول کرتا۔ اس کا واحد ممکنہ نتیجہ ردانقلاب کی شکل میں نکلتا۔ ملاحوں کے درمیان ردانقلابی عناصر کی موجودگی کا ثبوت اس نعرے سے ملتا ہے ''سوویتیں بغیر بالشویکوں کے!'' بالشویکوں کے پاس صرف ایک ہی چارہ کار رہ گیا تھا۔ قلعے کو طاقت کے زور پر واپس لینا۔ یہ واقعات دسویں پارٹی کانگریس کے دوران پیش آئے جسے ادھورہ چھوڑنا پڑا تا کہ اس میں شرکت کرنے والے مندوبین حملے میں حصہ لے سکیں۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک سیمی انارکوسنڈیکیلسٹ رجحان کے لوگ یعنی ورکرز اپوزیشن کے ممبران بھی کانگریس میں موجود تھے اور انہوں نے بھی حملہ کرنیوالی فوج میں شمولیت اختیار کی۔ اس سے ایک اور جھوٹ بھی پکڑا جاتا ہے جو ورکرز اپوزیشن، انارکسزم اور کرونسٹاٹ کا بدوضع ملغوبہ بنانے کی کوشش کرتا ہے، تین چیزیں جن میں قطعاً کوئی قدر مشترک موجود نہیں تھی۔

وکٹر سرجی جسے انارکسزم کے ساتھ کافی ہمدردی تھی۔ کرونسٹاٹ باغیوں کے قطعاً خلاف تھا جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''مقبول عام ردانقلاب نے سوویتوں کے آزادانہ انتخاب کے مطالبے کو کمیونسٹوں کے بغیر سوویت مطالبے میں تبدیل کردیا۔ اگر بالشویکوں کی آمریت کا خاتمہ ہوتا تو انتشار پیدا ہوجاتا اور انتشار سے کسانوں کی بغاوت شروع ہوتی، کمیونسٹوں کا قتل عام ہوتا، بھگوڑے سرمایہ داروں کی واپسی اور آخر میں واقعات کی قوت کے زیراثر ایک اور آمریت قائم ہوتی۔ لیکن اس بار یہ آمریت پرولتاریہ مخالف ہوتی۔ سٹاک ہوم اور ٹالن سے آنے والے مکتوبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بھگوڑے سرمایہ داروں کے ذہن میں یہی پیش منظر تھا۔ برسبیل تذکرہ مکتوبات سے بالشویک لیڈروں کے اس ادارے کو مزید تقویت ملی کہ ہر قیمت پر جلد از جلد کرونسٹاٹ کو قابو میں لایا جائے۔ ہم فرضی دلائل نہیں

دے رہے تھے۔ہم جانتے تھے کہ صرف یورپی روس کے اندر کسانوں کی بغاوتوں کے پچاس مراکز موجود تھے۔ ماسکو کے جنوب میں ٹمبوف کے علاقے میں اینٹوف نامی دائیں بازو کا سوشل انقلابی جو ایک سکول میں استاد تھا سوویت نظام کی تنسیخ اور آئین ساز اسمبلی کے قیام کا اعلان کر چکا تھا اور اس کے تحت کئی ہزار افراد پر مشتمل انتہائی منظم کسان فوج موجود تھی۔ اس نے وائٹ گارڈ سے مذاکرات بھی کئے تھے۔ تخا چیفسکی نے 1921ء کے وسط میں اسے کچل دیا تھا۔''(60)

نئی معاشی پالیسی

مزدور طبقے کے مفادات کی نمائندگی کے برعکس کرونسٹاٹ کے باغی کسانوں کے دباؤ کی عکاسی کرتے تھے جن کی بے چینی مستقل فوجی رسد اور اناج کی جبری وصولی کے باعث بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ اس کے بدلے انہیں تیار شدہ اشیا وصول نہیں ہوتی تھیں۔ اسے با آسانی ثابت کیا جا سکتا ہے۔ باغیوں کی مانگوں میں یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ اناج کیلئے آزاد منڈی بنائی جائے۔ بغاوت کو دبانے کے بعد لینن نے نتائج اخذ کرتے ہوئے پسپائی اختیار کر لی۔ نئی معاشی پالیسی (NEP) کے تعارف کا مطلب یہ تھا کہ کسانوں کو غلہ کھلی منڈی میں فروخت کرنے کی اجازت دے دی جائے اور اس کے بدلے میں ریاست ٹیکس وصول کرے۔ اس اقدام کے بعد کرونسٹاٹ یا ٹمبوف جیسی شورشیں ختم ہو گئیں۔ کسان جو کچھ چاہتے تھے انہیں مل گیا تھا۔

کیا نئی معاشی پالیسی (NEP) انقلاب اور مزدور طبقے کیلئے آگے کی جانب ایک قدم تھا؟ بالشویک اس ممکنہ خطرناک صورتحال کے باعث پسپائی پر مجبور ہوئے جو کسانوں کی مخالفت سے پیدا ہوئی تھی۔ کرونسٹاٹ اور ٹمبوف کے علاوہ دوسرے علاقوں میں شورشیں اس کا محض ایک حصہ تھیں۔ لیکن حقیقت میں نئی معاشی پالیسی کے باعث امیر کسانوں (کولاکوں) اور سٹہ باز سرمایہ داروں کو تقویت ملی اور پرولتاریہ کو دھچکا لگا۔ یہ پیچھے کی جانب ایک بہت بڑا قدم تھا اگرچہ یورپی انقلاب میں تاخیر کے باعث کوئی متبادل راستہ موجود نہیں تھا۔ 1923ء کے جرمن انقلاب کی پسپائی کے ساتھ ساتھ نئی معاشی پالیسی روسی انقلاب کی تنزلی کی بنیاد تھی۔ سٹالن، زینوویف اور کامینیف نے کولاکوں اور سٹہ باز سرمایہ داروں (نیپ مین) پر تکیہ کرتے ہوئے ٹراٹسکی اور لیفٹ اپوزیشن کیخلاف ضربیں لگائیں۔ لیکن NEP نے کسانوں کو

ٹھنڈا کر کے انقلاب کو سانس لینے کی مہلت ضرور عطا کی۔

کسانوں کی شدید مخالفت کے باعث، جو برسوں سے جاری خانہ جنگی اور اناج کی جبری وصولی پر تھک چکے تھے، لینن اور ٹراٹسکی نے جنگی کمیونزم کے سلسلے میں پسپائی اختیار کرنے اور منڈی کی بحالی کی ضرورت کی وضاحت کی تا کہ شہروں اور دیہات میں پڑنے والی پھوٹ کو دور کیا جاسکے۔ عملاً اس کا مقصد یہ تھا کہ جہاں تک ہو سکے کسانوں کے ساتھ ایک مستحکم تعلق استوار کیا جائے جو آبادی کا اسی فیصد تھے۔ ٹراٹسکی نے بارہویں پارٹی کانگریس کے سامنے رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ''1920-21ء کے دوران ہم پر یہ بات حتمی طور پر واضح ہوگئی ہے کہ یونین آف سوویت ریپبلکس کو غالباً ایک لمبے عرصے تک سرمایہ داروں کے گھیرے کے اندر اپنا وجود قائم رکھنا پڑے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمیں ریاست کی شکل میں منظّم پرولتاریہ سے کل ہی کوئی امداد وصول ہو جائے گی، ایک ایسی ریاست جو اعلیٰ قسم کی ہو اور اس کی معاشی قوت ہم سے زیادہ ہو۔ ہم نے 1920ء میں خود کو یہی بتایا تھا۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ یہ ایک، دو، تین یا دس سال کی بات ہو گی مگر ہم جانتے تھے کہ ایک طویل اور سنجیدہ تیاری کے دور کا آغاز ہمارے سامنے ہے۔

اس سے اخذ کردہ بنیادی نتیجہ یہ تھا کہ اگرچہ ہم مغرب میں طاقتوں کے رشتے میں تبدیلی کے منتظر رہیں گے لیکن ہمارے لئے اپنے ملک یعنی سوویت یونین میں طاقتوں کے رشتے کو زیادہ توجہ اور تن دہی سے دیکھنا بہت ضروری ہے۔''(61)

نئی معاشی پالیسی وجود میں آ گئی تھی۔ اس کی وجہ سے شہروں، دیہات اور ریاست کے درمیان منڈی کے تعلقات دوبارہ متعارف ہوئے۔ اناج کی جبری وصولی ختم کر دی گئی اور اس کی جگہ جنس کی شکل میں ٹیکس عائد کر دیا گیا۔ اس کے بعد کسانوں کو فاضل اناج بذات خود منڈی میں فروخت کرنے کی اجازت تھی۔ نئی معاشی پالیسی دیہی علاقوں کے خوشحال عناصر کی حمایت میں جاتی تھی اور مارکیٹ میں خرید وفروخت اور کچھ سرمائے کے ارتکاز کی اجازت دیتی تھی۔ منڈی کی بحالی کا اقدام نجی تجارت اور پیداوار کو رعایت دینے کیلئے کیا گیا تھا۔ تاہم معیشت کا فیصلہ کن کنٹرول ریاست کے ہاتھوں میں ہی رہا۔ تجارت کا مقصد کسانوں کی اکثریت اور قومیائی ہوئی صنعت کے درمیان ضروری تعلق کو قائم کرنا تھا۔ لینن نے اسے بڑھتی ہوئی مشکلات کے سامنے پسپائی کا نام دیا۔ تاہم سوویت نظام پر مسلط ہونے والی اس شکست کو لینن نے ہمیشہ ایک عارضی اقدام قرار دیا جس کا مقصد عالمی سوشلسٹ انقلاب کی ڈرامائی تبدیلیوں سے پہلے

''سانس لینے کی مہلت'' حاصل کرنا تھا۔ساتھ ہی وہ اس راہ میں حائل خطرات سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔خاص طور پر بورژوا اور پیٹی بورژوا عناصر از سرنو تقویت حاصل کرنے کی وجہ سے درپیش خطرات سے جو ایک رد انقلاب کی بنیاد بن سکتے تھے۔لینن ایک پسماندہ ملک میں محصور انقلاب کو درپیش دوسرے خطرات کو بھی سمجھتا تھا۔

دسمبر 1921ء میں ہونے والی سوویتوں کی نویں کانگریس میں اس نے کہا کہ ''معاف کیجئے گا مگر آپ کس چیز کو پرولتاریہ کے طور پر بیان کرتے ہیں؟ مزدوروں کا وہ طبقہ جو بڑے پیمانے کی صنعت میں ملازم ہے۔مگر بڑے پیمانے کی یہ صنعت ہے کہاں؟ آپ کی صنعت کہاں ہے؟ یہ بیکار کیوں پڑی ہے؟'' (62)

مارچ 1922ء کی گیارہویں پارٹی کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے لینن نے اس طرف توجہ دلائی کہ اس وقت فیکٹریوں میں کام کرنیوالے بہت سے لوگ طبقاتی حوالے سے غیر پرولتاریہ ہیں اور ان میں سے اکثر فوجی خدمات سے بھاگنے والے، کسان اور غیر طبقاتی عناصر ہیں:

''جنگ کے دوران ایسے لوگ فیکٹریوں میں پہنچ گئے جو کسی بھی طرح پرولتاریہ نہیں تھے اور جنگ سے بچنے کیلئے فیکٹریوں میں بھرتی ہو گئے تھے۔کیا آج ہمارے ملک میں سماجی اور معاشی حالات ایسے ہیں کہ وہ حقیقی پرولتاریہ کو فیکٹریوں میں جانے کیلئے راغب کر سکیں؟ نہیں۔مارکس کے مطابق یہ درست ہو گا مگر مارکس نے روس کے بارے میں نہیں لکھا اس نے سرمایہ داری کے بارے میں بحیثیت مجموعی لکھا اور اس کی شروعات پندرہویں صدی سے کی تھیں۔ چھ سو سال تک یہ درست تھا مگر آج روس کیلئے یہ درست نہیں ہے۔اکثر اوقات فیکٹریوں میں جانے والے لوگ پرولتاریہ نہیں ہوتے بلکہ ہر قسم کے اتفاقیہ عناصر ہوتے ہیں۔''(63)

جن پالیسیوں پر اس دور میں لینن اور ٹراٹسکی گامزن تھے انہیں سمجھنا ناممکن ہے اگر ہم اوپر بیان کردہ روس کی حقیقی پوزیشن کو ذہن میں نہ رکھیں۔معاشی تباہی، عوام کی انتہائی پسماندہ ثقافتی سطح، پرولتاریہ کا منتشر ہونا اور سوویتوں کا انحطاط پذیر ہونا۔۔۔ یہ سب کچھ عالمی انقلاب میں تاخیر کا نتیجہ تھا۔۔۔ان حالات میں مزدوروں کی ریاست کو کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا تھا؟ عالمی سرمایہ داری کے دباؤ جن کا اظہار پیٹی بورژوا عناصر کے ذریعے ہوتا تھا نئی معاشی پالیسی کے دوران بہت بڑھ گئے تھے۔اس بات سے لینن کے اس خوف کی وضاحت ہوتی ہے کہ خارجی طبقات کا دباؤ کمیونسٹ پارٹی میں پھوٹ پر منتج ہو سکتا ہے جو

ناگزیر طور پر سوویت ریاست کے زوال اور سرمایہ دارانہ ردانقلاب کی طرف لے جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ایک غیر معمولی اقدام کے طور پر پارٹی کے اندر مختلف دھڑوں پر عارضی پابندی کی وکالت کی تھی۔

کرونسٹاٹ کے موقع پر سوویت ریاست اور کسان عوام کے درمیان تعلقات بہت نچلی سطح پر پہنچ گئے تھے۔ مزدور ریاست کا وجود خلا میں نہیں تھا اور اس پر خارجی طبقات کے دباؤ اثر انداز ہوتے تھے جن کا اظہار پارٹی میں موجود مختلف گروہوں کے ذریعے ہوتا تھا۔ یہی خطرہ تھا جس میں بالشویک پارٹی میں سیاسی اجارہ داری کے امکان میں مزید اضافہ ہو گیا اور اس کے سد باب کیلئے بذات خود پارٹی کے اندر مختلف گروہوں پر عارضی پابندی عائد کر دی گئی۔ جیسا کہ لینن نے واضح کیا ہے کہ یہ ایک عارضی اقدام تھا جس کا مقصد غیر معمولی صورتحال کا مقابلہ کرنا تھا:

''پارٹی کے اندر مخالفت پر پابندی موجودہ لمحے کی سیاسی منطق کے نتیجے میں عائد کی جارہی ہے۔۔۔اس وقت ہم مخالفت کی اجازت نہیں دے سکتے۔ کامریڈز، یہ اس کا وقت نہیں ہے! یہ معروضی لمحے کا مطالبہ ہے اور شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔۔موجودہ وقت ایسا ہے کہ پارٹی سے باہر عوام ایک قسم کے پیٹی بورژوا تذبذب کا شکار ہیں جو روس کی موجودہ معاشی حالت کے پیش نظر ناگزیر ہے۔ ہمیں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ داخلی خطرہ بعض حوالوں سے ڈینیکن اور یودنیچ (خانہ جنگی کے دوران بالشویکوں کے دشمن سفید جرنیل) سے بڑھ کر ہے اور ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم صرف ظاہری نہیں بلکہ ایک گہرے اور دوراندیشی پر مبنی اتحاد کا مظاہرہ کریں۔ اس قسم کا اتحاد پیدا کرنے کیلئے موجودہ قرارداد کے بغیر گزارہ ممکن نہیں۔''(64)

علاوہ ازیں لینن نے اس کی لچکدار تشریح کی حمایت کی اور اس کے وسیع اطلاق کی کوششوں کو مسترد کر دیا۔ جب ریازانوف نے تجویز پیش کی کہ پارٹی کانگریس کیلئے الیکشن گروہوں کی بنیاد پر لڑنے پر پابندی عائد کی جائے تو لینن نے اس کی مخالفت کی، ''میں سمجھتا ہوں کہ چاہے یہ کتنی ہی بدقسمتی کی بات کیوں نہ ہو مگر ریازانوف کی تجویز کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔۔۔۔موجودہ کانگریس ایسے مستقل نوعیت کے فیصلے نہیں کر سکتی جو کسی بھی طرح اگلی کانگریس کے انتخاب کو متاثر کر سکتے ہوں۔ اگر صورتحال بنیادی نوعیت کے اختلافات کو ابھارنے کا موجب بن رہی ہو تو انہیں پارٹی کے اجتماعی فیصلوں کیلئے پیش کرنے پر پابندی کون لگا سکتا ہے؟ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔''(65)

حقیقت یہ ہے کہ سیاسی گروہوں پر رسمی پابندی کے باوجود دسویں کانگریس کے بعد بھی یہ پارٹی کے اندر کام کرتے رہے۔ جیسا کہ اے آئی میکویان اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے۔ لینن نے ان اصولوں کو بذات خود توڑا۔ وہ ایک واقعے کو یاد کرتے ہوئے لکھتا ہے جو دسویں کانگریس کے دوران پیش آیا۔ لینن نے اپنے گروہ کی ایک بالکل سازشی نوعیت کی میٹنگ طلب کی جس کے لئے دعوتی کارڈ نجی طور پر چھپوائے گئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سٹالن ہی تھا جس نے اس خوف کا اظہار کیا تھا کہ اگر اپوزیشن کو اس کی بھنک پڑ گئی تو وہ انہیں فرقہ پرستی کا الزام دینگے۔ اس کے جواب میں لینن نے اپنی روایتی حس مزاح کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''میں ایک توثیق شدہ پرانے فرقہ پرست کے منہ سے یہ کیا سن رہا ہوں۔'' لینن کو ڈر تھا کہ ایک ایسی صورتحال میں، جہاں ایک ہی پارٹی ہو، کہیں کمیونسٹ پارٹی خارجی طبقات کے دباؤ کی عکاسی کرنا شروع نہ کر دے جو اپنا اظہار پہلے فرقوں کی شکل میں اور آخر کار طبقاتی بنیادوں پر پارٹی میں پھوٹ کے ذریعے کرے گا۔ اس سے انقلاب کا تختہ الٹ جائے گا کیونکہ مزدور طبقے کے جزوی طور پر غائب ہو جانے کے بعد صرف کمیونسٹ پارٹی ہی مزدور ریاست کے وجود کی ضامن تھی۔ تاہم دی گئی صورتحال میں یہ ہنگامی اقدامات، جو پارٹی ممبران کے جمہوری حقوق پر قدغن لگاتے تھے، پارٹی میں غیر صحتمند نوکر شاہانہ رجحانات کے فروغ کا باعث بنے۔ اسے ایک ''لازمی برائی'' خیال کیا جاتا تھا جو شدید ضرورت نے پارٹی پر مسلط کر دی تھی۔ خیال تھا کہ جوں ہی حالات سنبھلیں گے مکمل جمہوری حقوق بحال کر دیئے جائیں گے۔ مگر درحقیقت لینن کی وفات کے بعد عارضی نوعیت کے یہ اقدامات سٹالن، کامینیف اور زینوییف کے اتحاد ثلاثہ نے مستقل بنا دیئے جو ٹراٹسکی کیخلاف جدوجہد کا حصہ تھے۔ یہ بالشوزم کی تاریخی روایت سے انحراف تھا جو جمہوریت میں رچی بسی ہوئی تھی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اقتدار پر قبضے کے فوراً بعد بالشویکوں نے جس واحد سیاسی پارٹی پر پابندی لگائی وہ بلیک ہنڈرڈز تھی جسے فاشزم کا پیشرو تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ بورژوا کیڈٹ پارٹی کو بھی غیر قانونی قرار نہیں دیا گیا تھا۔ سوویت حکومت بذات خود بالشویکوں اور بائیں بازو کے سوشل انقلابیوں کے اتحاد سے بنی تھی۔ لیکن خانہ جنگی کے دباؤ کے زیر اثر طبقاتی قوتوں کی شدید پولرائزیشن عمل میں آئی جس میں منشویک اور دائیں و بائیں بازو کے سوشل انقلابی رد انقلاب کی طرف چلے گئے۔ اپنے ارادوں کے برعکس بالشویک مخالف پارٹیوں پر پابندی لگانے اور سیاسی اقتدار کی اجارہ داری متعارف کروانے پر مجبور ہو گئے۔ ایک عارضی اور غیر معمولی معاملہ تصور کی جانیوالی اس اجارہ داری نے ایک ایسی صورتحال

میں زبردست خطرات پیدا کر دیئے جس میں ہراول پرولتاری طبقہ خارجی طبقات کے روزافزوں دباؤ کے نیچے پسا جا رہا تھا۔

تھوڑے ہی عرصے میں صنعت از سرنو بحال ہونا شروع ہو گئی۔ ایک کمتر بنیاد سے ہی سہی مگر 1922-23ء میں پیداوار دگنی ہو گئی اور 1926ء تک اپنی قبل از جنگ سطح کو پہنچ گئی۔ زرعی پیداوار میں اضافہ نسبتاً سست رفتار تھا۔ نئی معاشی پالیسی نے سانس لینے کی مہلت تو دی تھی مگر منڈی اپنے ساتھ روز افزوں سماجی تفریق لے کر آئی تھی۔ اس پسپائی کا پورا جواز موجود تھا جس کے نتیجے میں پیداوار میں اضافہ ہوا مگر شہروں اور دیہات میں سوشلزم کے مخالفین کی دولت میں اضافہ ہونے سے سرمایہ داری کی بحالی کے خطرات میں بھی اضافہ ہوا۔ نوزائیدہ بورژوا عناصر کا فروغ (یعنی کولاک اور سٹہ باز سرمایہ دار) اس نئی پالیسی کی ضمنی پیداوار تھا۔ طبقاتی تقسیم کے دوبارہ ظہور کے ساتھ ساتھ ریاست اور پارٹی کی بیوروکریسی نے بھی پر پرزے نکالنے شروع کر دیئے۔ اسے امید تھی کہ وہ اپنی حیثیت اور اثر و رسوخ کو استحکام اور فروغ دے سکے گی۔ اس صورتحال میں ان خارجی طبقات اور نوکر شاہانہ عناصر کا فروغ انقلاب کیلئے ایک جان لیوا خطرے کی نشاندہی کرتا تھا۔ مزدوروں کی ریاست کے لگاتار محصور رہنے سے داخلی نوکر شاہانہ انحطاط کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

باب نمبر 1: اکتوبر کی میزان

1۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری صفحہ نمبر 29

2۔ ایلک نووی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ صفحہ 292

3۔ فنانشل ٹائمز 95-11-14

4۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری صفحہ نمبر 8

5۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 36 صفحہ 439

6۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 26 صفحہ 22

7۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 24 صفحہ 364

8۔ ایم لیب مین۔لینن لینن ازم کی روشنی میں صفحہ 200

9۔ ایضاً صفحہ 201

11۔ ایضاً صفحہ 201

12۔ این کرپسکایا۔لینن کی یادیں صفحہ 352-351

13۔ جان ریڈ۔دنیا کو جھنجوڑ دینے والے دس دن صفحہ 5-14

14۔ ایضاً دنیا کو جھنجوڑ دینے والے دس دن صفحہ 16

15۔ این کرپسکایا۔لینن کی یادیں صفحہ 70-369

16۔ لیب مین۔لینن لینن ازم کی روشنی میں صفحہ 206

17۔ ایضاً لینن لینن ازم کی روشنی میں صفحہ 207

18۔ جان ریڈ۔دنیا کو جھنجوڑ دینے والے دس دن صفحہ 298

19۔ سر جی۔روسی انقلاب کا پہلا سال صفحہ 87

20۔ ٹراٹسکی۔تاریخ انقلاب روس جلد نمبر 1 صفحہ نمبر 28

21۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 26 صفحہ نمبر 297

22۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 26 صفحہ 409

23۔ لیب مین۔لینن لینن ازم کی روشنی میں۔جلد 1 صفحہ 218

24۔ ای ایچ کر۔بالشویک انقلاب 1923-1917 صفحہ 122-121

25۔ الیگزینڈر کرنسکی۔کرنسکی کی یادیں روس اور تاریخ کا فیصلہ کن موڑ صفحہ 470

26۔ او۔فکس۔لوگوں کا المیہ۔روسی انقلاب 1924-1891 صفحہ 519-518

27۔ ایضاً صفحہ 519

28۔ سر چارلس فرتھ۔اولیور کرومویل صفحہ 319

29۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 26 صفحہ 468

30۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 135

31۔ ٹراٹسکی۔میری زندگی صفحہ 411

32۔ ای۔ایچ کر۔بالشویک انقلاب 1923-1917ء جلد 3 صفحہ 121

33۔ جان ریڈ۔دنیا کو جھنجوڑ دینے والے دس دن صفحہ 34

34۔ لوئیس بریانٹ روس میں 6 سرخ ماہ صفحہ 131-126

35۔ وی سرگئی۔انقلابی کی یادداشتیں صفحہ 83

37۔ ای ایچ کر۔بالشویک انقلاب 1923-1917 جلد تین صفحہ 134

38۔ ایضاً بالشویک انقلاب 1923-1917 جلد تین صفحہ 326

39۔ ایضاً جلد تین صفحہ 136-135

40۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 95

41۔ ایضاً۔ایضاً صفحہ 98

42۔ ایضاً۔ایضاً صفحہ 232

43۔ ٹراٹسکی۔روزمرہ زندگی کے مسائل صفحہ 20

44۔ لینن۔مجموعہ تصانیف۔جلد 26 صفحہ 472-465

45۔ لینن۔مجموعہ تصانیف۔جنگ اور امن کی قرارداد سے اقتباس جلد 27 صفحہ 119

46۔ ایضاً جلد 27 صفحہ 231

47۔ ایضاً جلد 27 صفحہ 372-37

باب 2

سٹالنزم کا عروج

مارکسزم کا نظریہ ریاست

''تاریخی غلاظت کو ہٹا کر خالی کی گئی جگہ پر اب ہم ایک ہوادار اور اونچی سوشلسٹ سماج کی شاندار عمارت کی تعمیر کا کام شروع کرینگے۔''

لینن۔8 نومبر 1917ء

سوویت یونین کے ارتقا اور وہاں اب جو کچھ ہو رہا ہے اسے سمجھنے کیلئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم کارل مارکس کے سوشلسٹ نظریے کو سمجھیں اور دیکھیں کہ بالشویک حکومت نے کس طرح اس تصور پر عمل پیرا ہونے کی کوشش کی۔

رابرٹ اووین، سائمن، سینٹ اور فوریئے جیسے لوگوں کے یوٹوپیائی سوشلزم کے تصورات کے

برعکس مارکسزم کی بنیاد سوشلزم کی سائنسی بصیرت پر ہے۔ مارکسزم وضاحت کرتا ہے کہ ہر سماج کی ترقی کا راز پیداواری قوتوں کے ارتقاء پر ہے قوت محنت، صنعت، زراعت، ٹیکنیک اور سائنس ہر نیا سماجی نظام غلام داری، جاگیرداری اور سرمایہ داری، اپنی پیداواری قوتوں کے ارتقا کے ذریعے انسانی سماج کو آگے کی طرف لے گیا ہے۔

بنی نوعِ انسان کی ترقی کے سب سے ابتدائی یعنی قدیم اشترا کی دور کے طویل دورانیے کے بعد جس میں طبقات، ذاتی ملکیت اور ریاست کا کوئی وجود نہیں تھا، لوگ جیسے ہی اپنی روزمرہ کی ضروریات سے زیادہ یعنی قدر زائد پیدا کرنے کے قابل ہوئے ایک طبقاتی سماج وجود میں آ گیا۔ اس مقام پر سماج کی طبقات میں تقسیم ایک معقول معاشی جواز بن گئی۔ تاریخ کے وسیع تناظر میں طبقاتی سماج کا ظہور اس حوالے سے ایک انقلابی مظہر تھا کہ اس نے آبادی کے ایک مراعت یافتہ حصے یعنی حکمران طبقے کو مشقت کے براہ راست بوجھ سے چھٹکارا دلا دیا تا کہ اسے فنون لطیفہ، سائنس اور ثقافت کو فروغ دینے کیلئے درکار ضروری وقت مل سکے۔ اپنے بے رحمانہ استحصال اور عدم مساوات کے باوجود طبقاتی سماج ہی وہ راستہ تھا جس پر چل کر بنی نوع انسان مستقبل کے غیر طبقاتی سماج کیلئے ضروری بنیادی مادی شرائط کو پورا کرنے کا اہل ہو سکتا تھا۔

ایک مخصوص حوالے سے سوشلسٹ سماج قدیم اشترا کی نظام کی طرف واپسی ہے مگر ایک نہایت اعلیٰ پیداواری سطح پر۔ ایک غیر طبقاتی سماج کی خیالی تصویر بنانے سے پہلے آپ کو طبقاتی سماج کی تمام نشانیوں بالخصوص قلت اور عدم مساوات کا خاتمہ کرنا پڑے گا۔ جہاں عدم مساوات، قلت اور انفرادی وجود کی بقا کی جدوجہد کا وجود ہو وہاں طبقات کے خاتمے کی گفتگو بیہودگی ہوگی۔ یہ شرائط کے حوالے سے ایک تضاد ہوگا۔ سوشلزم انسانی سماج کے ارتقا کے ایک خاص مرحلے پر ہی ظاہر ہو سکتا ہے، پیداواری قوتوں کی ترقی کی ایک مخصوص سطح پر۔ ''کوئی بھی سماجی نظام اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک وہ تمام پیداواری قوتیں ترقی نہیں پا جاتیں جن کیلئے اس میں گنجائش موجود ہوتی ہے اور پیداوار کی اعلیٰ پیمانے پر از سر نو تقسیم کا نظام اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک اس کے وجود میں آنے کیلئے ضروری مادی حالات بذات خود پرانے نظام کے بطن میں پرورش پا کر تیار نہیں ہو جاتے۔'' (1)

انیسویں صدی کے ابتدائی عرصے کے یوٹوپیائی سوشلسٹوں کے برعکس، جن کے نزدیک سوشلزم ایک اخلاقی مسئلہ تھا اور جسے روشن خیال لوگ تاریخ کے کسی بھی دور میں متعارف کروا سکتے تھے، مارکس اور

اینگلز نے اس کی جڑیں سماج کے ارتقا میں تلاش کیں۔ ایسے غیر طبقاتی سماج کی ابتدائی شرط پیداواری قوتوں کی ترقی ہے جس کے ذریعے اشیا کی افراط ممکن ہو سکتی ہے۔ مارکس اور اینگلز کے نزدیک یہ سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت کا فریضہ ہے۔ مارکسی نظریئے کے مطابق طبقاتی سماج کے اعلیٰ ترین مرحلے یعنی سرمایہ داری نظام کا تاریخی فریضہ یہ تھا کہ وہ عالمی پیمانے پر سوشلزم اور طبقات کے خاتمے کیلئے مادی بنیاد فراہم کرے۔ سوشلزم محض ایک عمدہ خیال ہی نہیں بلکہ انسانی سماج کیلئے اگلہ مرحلہ بھی تھا۔

سرمایہ داری کا تاریخی فریضہ یہ تھا کہ وہ جاگیردارانہ نظام کی علاقائی تنگ نظری کا خاتمہ کر کے ایک جدید صنعتی معیشت قائم کرے اور ایک نئی عالمی تقسیم محنت کے ساتھ ایک عالمی منڈی کی تشکیل کرے۔ اس فرض کی ادائیگی کے دوران یہ اپنے گورکن یعنی جدید پرولتاریہ کو تخلیق کرتا۔ اس کی تصویر کشی مارکس اور اینگلز نے 150 برس قبل کمیونسٹ مینی فیسٹو کے صفحات میں کی تھی۔ سرمایہ داری کی ترقی آج اس پیش گوئی کو درست ثابت کر رہی ہے۔ سرمائے کا ارتکاز سرمایہ داروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھوں میں ہونے کے باعث کسان طبقہ تقریباً ختم ہو گیا جبکہ مزدور طبقہ بے حد وسعت اختیار کر کے نہ صرف صنعتی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں بلکہ کئی پرانے نو آبادیاتی ممالک میں بھی آبادی کا اکثریتی حصہ بن گیا۔ اسی طرح سرمایہ داری نے ایک عالمی منڈی تشکیل دی ہے جس سے تمام ممالک اٹوٹ طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ حقیقت میں سرمایہ داری کی تیار کردہ مادی بنیاد جو سوشلسٹ سماج کیلئے ضروری ہے پہلی عالمی جنگ کے آغاز کے زمانے سے ہی عالمی پیمانے پر موجود ہے۔ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کی شکل اختیار کر جانے والی بڑی بڑی صنعتیں اور فیکٹریاں اگر عوام کی ملکیت ہوں اور ملکی اور بین الاقوامی پیمانے پر جمہوری انداز میں ان کی منصوبہ بندی کی جائے تو ایک ایسی دنیا وجود میں آ سکتی ہے جس میں بنیادی اشیائے صرف کی بہت زیادہ افراط ہو گی۔

موجودہ وقت میں عالمی پیمانے پر سرمائے کے ارتکاز کی عکاسی اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ عالمی تجارت کے نوے فیصد حصے پر محض پانچ سو ملٹی نیشنل کمپنیوں کا غلبہ ہے۔ آج صرف ایک کمپنی یعنی آئی سی آئی کے پاس اتنی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ساری دنیا کی کیمیکلز کی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔ صنعت کے بہت سے دوسرے شعبوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ تاہم ایک ترقی پسند نظام کی حیثیت سے سرمایہ داری اپنی حدود تک پہنچ چکی ہے۔ ذاتی ملکیت اور قومی ریاست پیداواری قوتوں کی ترقی کو روکنے اور پیچھے دھکیلنے کا باعث بن رہی ہیں۔ انسانیت کو بربادی کی دہلیز پر لا کھڑا کرنے والی دو

عالمی جنگیں، بڑے پیمانے کی نامیاتی بیروزگاری اور زائد پیداوار کے باعث وقفے وقفے سے پیش آنے والی کساد بازاریاں اس تعطل کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ماضی میں سرمایہ دارانہ معاشی نظام نے پیداواری قوتوں میں انقلاب برپا کیا تھا مگر اب یہ مزید ترقی کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ کا کام کر رہا ہے۔ منافع کی ہوس میں سرمایہ داری دنیا کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار کر کے آخر کار اس کرہ ارض کی تباہی کا موجب بن سکتی ہے۔ اس بندگلی سے سماج کو محض پیداواری قوتوں کی عالمی منصوبہ بندی کے ذریعے ہی نکالا جاسکتا ہے۔ مارکس کو یقین تھا کہ سوشلسٹ انقلاب کے فرائض کی ادائیگی کا بوجھ مغربی یورپ کے معاشی اور ثقافتی لحاظ سے ترقی یافتہ مزدور طبقے کے کندھوں پر پڑے گا۔ ٹراٹسکی کے الفاظ میں ''مارکس کو توقع تھی کہ فرانسیسی پرولتاریہ سماجی انقلاب کا آغاز کرے گا، جرمن اسے جاری رکھے گا اور برطانوی پرولتاریہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے گا، جہاں تک روس کا سوال ہے تو مارکس نے اسے بہت زیادہ عقب میں رکھا تھا۔''(2)

سماج کیلئے یہ بات کسی بھی طرح قابل عمل نہیں کہ وہ سرمایہ داری سے چھلانگ لگا کر براہ راست غیر طبقاتی سماج میں تبدیل ہو جائے۔ اس کام کیلئے سرمایہ داری سماج کی مادی اور ثقافتی وراثت نہایت قلیل ہے۔ قلت اور عدم مساوات اتنی زیادہ ہے کہ اس پر فوری طور پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ سوشلسٹ انقلاب کے بعد ایک عبوری دور لازمی ہے جو بافراط پیداوار اور غیر طبقاتی سماج کیلئے بنیاد فراہم کرے گا۔ مارکس نے سماج کے اس نئے مرحلے کو ''کمیونزم کا سب سے نچلہ مرحلہ'' قرار دیا ہے جب کہ ''کمیونزم کے سب سے اعلیٰ مرحلے'' میں مادی عدم مساوات کی آخری باقیات کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ اس حوالے سے کمیونزم کو نئے سماج کے ''کمتر'' اور ''اعلیٰ'' درجات میں تقسیم کیا گیا ہے۔ کمیونزم کے نچلے مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے مارکس لکھتا ہے:

''یہاں ہمارا واسطہ ایک ایسے کمیونسٹ سماج سے ہے جو اپنی بنیادوں پر استوار نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے برعکس یہ ابھی ابھی سرمایہ داری سماج کے بطن سے پیدا ہوا ہے اور اس طرح ہر حوالے سے یعنی معاشی، اخلاقی اور ذہنی حوالے سے اس پر اس پرانے سماج کے پیدائشی نشانات موجود ہیں جس کی کوکھ سے اس نے جنم لیا ہے۔''(3)

تاہم مارکس کے نزدیک (اور یہ ایک فیصلہ کن نکتہ ہے) کمیونزم کا یہ کمتر مرحلہ اپنے آغاز سے ہی معاشی ترقی کے حوالے سے انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ داری کی نسبت بھی ایک اعلیٰ سطح پر ہوگا۔ اور یہ بات اتنی

اہم کیوں تھی؟ کیونکہ پیداواری قوتوں کی زبردست ترقی کے بغیر قلت موجود رہے گی اور اس کے ساتھ ساتھ وجود کی بقا کیلئے جدوجہد بھی۔ جیسا کہ مارکس نے وضاحت کی تھی ایسی صورتحال میں انحطاط کا خطرہ درپیش ہو جائے گا، ''پیداواری قوتوں کی یہ ترقی (کمیونزم کیلئے) ایک حتمی عملی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر مانگ عام ہوگی اور مانگ کی صورت میں ضروریات زندگی کے حصول کی جدوجہد دوبارہ شروع ہو جائے گی اور اس کا مطلب ہے کہ تمام تر پرانی بکواس از سرنو شروع ہو جائے گی۔''(4)

سوشلزم کا کردار بین الاقوامی ہونے کی واحد وجہ یہ ہے کہ بذات خود سرمایہ داری نظام کا کردار بھی بین الاقوامی ہے۔ کسی واحد ملک کے پاس ایک نئے غیر طبقاتی سماج کیلئے مادی بنیاد موجود نہیں اور نہ ہی وہ سرمایہ داری سے ورثے میں ملی ہوئی قلت کے مکمل خاتمے کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔ اپنی زبردست معاشی طاقت کے باوجود ایک سوویت امریکہ بھی سوشلسٹ سماج تک چھلانگ لگانے کا کام فوری طور پر سر انجام نہیں دے سکے گا۔ وہ ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق مہیا نہیں کر سکے گا۔ اس کیلئے ایک عبوری نظام کی ضرورت ہوگی جو ہے مزدور جمہوریت پر مبنی ریاست۔ جس کا کلیدی فریضہ پیداواری قوتوں کی ترقی کی رفتار کو تیز تر کرنا اور طبقاتی سماج کی باقیات کا خاتمہ ہوگا۔ مزدوروں کی اس ریاست کو مارکس نے ''پرولتاریہ کی آمریت'' قرار دیا تھا۔

مارکس اور اینگلز کی اس جابجا استعمال کی جانیوالی اصطلاع کا سادہ سا مفہوم اکثریت کی جمہوری حکمرانی تھا جو استحصالی اقلیت کی مزاحمت پر قابو پانے کیلئے اقدامات اٹھاتی۔ اس کی بنیاد قدیم روم کی آمریت کے ساتھ تاریخی مشابہت پر تھی جب ایک عارضی دور کیلئے (دوران جنگ) ریپبلک کی طرف سے حکومت کو غیر معمولی اختیارات دیئے جاتے تھے۔

ہٹلر اور سٹالن کے تجربہ کے بعد ''آمریت'' کا لفظ بدنام ہو چکا ہے۔ لوگوں کے تصور میں یہ ''مطلق العنان آمریت'' ٹوٹیلیٹیرین ازم کا ہم معنی ہے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو مارکس اور اینگلز کے ذہنوں سے بہت بعید تھی۔ مارکس کے دور میں یہ اس قسم کے مفہوم سے آزاد تھی اور مزدور طبقے کی حکمرانی کی ہم معنی تھی۔ درحقیقت مارکسی نقطہ نظر سے پرولتاریہ کی آمریت مزدوروں کی جمہوریت کے ہم معنی تھی۔

مارکس بیان کرتا ہے کہ ''سرمایہ دار اور کمیونسٹ سماج کے درمیان ایک سے دوسرے نظام میں انقلابی تبدیلی کا دور آتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک سیاسی تبدیلی کا دور بھی آتا ہے جو پرولتاریہ کی انقلابی آمریت کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔'' جیسا کہ تمام عظیم ترین مارکسی نظریہ دانوں نے وضاحت کی ہے

سوشلسٹ انقلاب کا فریضہ یہ ہے کہ وہ پرانی ریاستی مشینری کو پاش پاش کر کے مزدور طبقے کو برسر اقتدار لائے۔ موخرالذکر ایک ایسا آلہ جبر تھا جس کا مقصد مزدور طبقے کو محکوم بنا کر رکھنا تھا۔ مارکس نے وضاحت کی کہ سرمایہ دارانہ ریاست اوراس کی ریاستی نوکر شاہی نئے اقتدار کے مفادات کی نگرانی نہیں کرسکتی۔ اس کا ختم کیا جانا ضروری ہے۔ تاہم مزدور طبقے کی تخلیق کردہ نئی ریاست تاریخ کی تمام سابقہ ریاستوں سے مختلف ہوگی۔

نیم ریاست

طبقاتی حکمرانی کے ایک آلے کے طور پر ریاست کا ظہور طبقاتی سماج کے ظہور کے ساتھ وقوع پذیر ہوا۔ اس کو اینگلز نے اپنی کتاب ''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' میں بہت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ عام ادوار میں ریاست سماج کے غالب طبقے کے مفادات کی حفاظت کرتی ہے۔ حکمران طبقے کے مفادات اور اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے اسے طبقاتی حکمرانی کے ایک آلے کے طور پر تقویت دی گئی اور پختہ کیا گیا۔ ریاست اکثریت کو اقلیت کے تابع رکھنے کا فریضہ سرانجام دیتی ہے۔ تاہم مزدوروں کی نئی ریاست سابقہ ریاستوں کے برعکس آبادی کی اکثریت کو محکوم بنا کر رکھنے کا کام نہیں کرتی بلکہ مٹھی بھر سابقہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو قابو میں رکھنے کا کام کرتی ہے۔ اس مقصد کیلئے ایک بہت طاقتور ریاستی نوکر شاہی قطعاً غیر ضروری ہے۔ اس کے برعکس مزدوروں کی ریاست آبادی کی اکثریت کے مفادات کی حفاظت کرتی ہے اور حقیقت میں محض ایک نیم ریاست ہوتی ہے۔

جس حد تک عدم مساوات اور طبقات کا خاتمہ ہوتا ہے اسی حد تک یہ نیم ریاست بھی سماج میں تحلیل ہونا شروع کر دیتی ہے۔ ''ایک خاص آلہ، ایک خاص جبر کا آلہ یعنی ریاست اب بھی ضروری ہے مگر اب یہ ایک عبوری ریاست ہے۔ لفظ کے حقیقی معنوں میں اب یہ ریاست نہیں ہے۔۔۔ اور اس کا موازنہ جمہوریت کی اس وسعت سے کیا جاسکتا ہے جس میں آبادی کی اتنی بڑی اکثریت شریک ہوگی کہ اس کے بعد جبر کے خصوصی آلے کی ضرورت ختم ہونا شروع ہو جائیگی۔''(5)

ریاست طبقاتی سماج کی نشانی ہے اور غیر طبقاتی سماج کے وجود میں آتے ہی ''رفتہ رفتہ مٹ جائے گی۔'' لہٰذا پرولتاریہ کا مفاد اسی میں ہے کہ سرمایہ داری نظام کی یہ باقیات جلد از جلد ختم ہو جائیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب پیداواری قوتیں اس سطح کو پہنچ جائیں کہ مانگ کا خاتمہ ہو جائے اور ہر کسی کو اس

کی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت مل جائے۔

اینگلز نے اینٹی ڈیورنگ میں لکھا تھا کہ ''جب طبقاتی غلبہ اور اس کے ساتھ ساتھ پیداوار کی موجودہ طوائف الملوکی کی تخلیق کردہ انفرادی بقا کی جدوجہد اور اس جدوجہد کے نتیجے میں جنم لینے والی زیادتیاں اور تصادم ختم ہونگے تو اس کے بعد دبانے کیلئے کچھ نہیں ہوگا اور جبر کے خصوصی آلے یعنی ریاست کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔'' ریاست کے خاتمے کیلئے ''طبقاتی غلبے اور انفرادی بقا کی جدوجہد'' کا خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ اس وقت سماج ایک ایسے مرحلے پر پہنچ چکا ہوگا جہاں وہ ''ہر کسی سے اس کی صلاحیت کے مطابق اور ہر کسی کو اس کی ضروریات کے مطابق'' مہیا کرنے کی ضمانت دے سکے گا۔

مزدوروں کی ریاست اپنے آغاز سے ہی رفتہ رفتہ مٹنا شروع ہو جائے گی۔ نراجیت کے حامیوں کی خواہشات کے برعکس ریاست، پیسہ اور بورژوا خاندان راتوں رات ختم نہیں ہو سکتے۔ اینگلز کے بقول انہیں ''نوادرات کے عجائب گھر'' میں اسی وقت رکھا جا سکتا ہے جب مادی حالات مناسب سطح تک فروغ پا چکے ہوں۔ انہیں اپنا تاریخی فریضہ پورا کرنا ہے۔ انہیں انتظامی اقدامات کے ذریعے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے قبل ریاست کو یہ حالات پیدا کرنے ہوں گے۔ پہلے بات تو یہ ہے کہ مزدوروں کی ریاست ہر کسی کو ''اس کی صلاحیتوں کے مطابق'' یعنی جس قدر کوئی فرد یا عورت چاہے کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتی اور نہ ہی وہ ہر کسی کو ''اس کی ضروریات کے مطابق'' دے سکتی ہے اس بات سے قطع نظر کہ اس نے کتنا کام کیا ہے۔ آغاز میں مزدوروں کی ریاست پیداوار میں اضافے کیلئے ایک زبردست محرک کا کام کرتی ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری کے تشکیل کردہ اجرتی محنت کے طریقوں کا اطلاق کیا جائے۔ چونکہ تمام مانگ کی فوری تسکین ممکن نہ ہوگی اور کچھ عرصے کے لئے قلتیں باقی رہیں گی اس لئے لوگوں کو اپنی کمائی ہوئی اجرتوں کی مناسبت سے پیداوار میں حصہ دیا جائے گا۔ دوسرے لفظوں میں مزدوروں کی ریاست ابتدائی طور پر اجرتی محنت کی عدم مساوات کا دفاع کرنے پر مجبور ہوگی یعنی بورژوا نظام تقسیم کا سرمایہ کاری اور سماجی خدمات کے شعبے کیلئے ایک حصہ مختص کرنے کے بعد بقیہ حصہ اجرت کی صورت میں سماج میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس نکتے پر مارکس نے لاسال کی اس غلطی کو درست کیا ہے کہ نیا سماج فوراً ہی ''محنت کی مساوی پیداوار کے عوض سب کو برابر کا حق دے گا''۔ مارکس نے کہا کہ ''برابر کا حق'' درحقیقت مساوات کی خلاف ورزی ہے اور یہ ناانصافی طبقاتی سماج اور قلت کی صورتحال کی باقیات میں سے ہے، جہاں تک موخر الذکر (ذرائع صرف) کی انفرادی پیداوار میں تقسیم کا تعلق ہے تو مساوی

اجناس کے تبادلے میں بھی یہی اصول کارفرما ہے، ''ایک قسم کی مقدار محنت کا تبادلہ دوسری قسم کی مساوی مقدار محنت سے کیا جاتا ہے۔لہٰذا یہاں بھی ابھی تک ''مساوی حق'' درحقیقت ایک بورژوا حق ہے۔''(6)

نئے سماج کا یہ پہلا مرحلہ ابھی مکمل مساوات فراہم نہیں کرسکتا، آمدنی میں فرق جاری رہے گا اگرچہ زیادہ سے زیادہ اور کم ازکم اجرت میں فرق بہت حد تک کم ہو جائے گا۔ مارکس لکھتا ہے کہ ''ایک شخص دوسرے سے ذہنی اور جسمانی اعتبار سے برتر ہے اس لئے وہ یکساں وقت میں زیادہ محنت فراہم کرتا ہے یا زیادہ دیر تک محنت کرسکتا ہے اور اگر محنت کو پیمانہ تصور کیا جائے تو اس کی تعریف اس کے دورانیے یا شدت سے ہی کی جاسکتی ہے ورنہ یہ پیمائش کا معیار نہیں رہے گی۔ یہ مساوی حق دراصل غیر مساوی محنت کیلئے غیر مساوی حق ہے۔ یہ کسی طبقاتی فرق کو خاطر میں نہیں لاتا کیونکہ ہر کوئی باقی سب کی طرح محض ایک مزدور ہے لیکن یہ غیر مساوی اور فطری انفرادی صلاحیت کو چپ چاپ تسلیم کر لیتا ہے اور اس طرح پیداواری صلاحیت کو ایک فطری مراعت مان لیتا ہے۔لہٰذا ہر حق کی طرح مواد کے حوالے سے یہ ایک غیر مساویانہ حق ہے۔حق اپنی نوعیت کے اعتبار سے صرف ایک مساوی معیار کے اطلاق پر مشتمل ہوسکتا ہے۔''(7)

دوسرے لفظوں میں مزدوروں کی محنت کا صلہ انہیں اجرتوں کی صورت میں ملتا ہے۔اس میں ان کی مختلف ضروریات کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔آگے چل کر مارکس مختلف مزدوروں کے درمیان فرق کی وضاحت کرتا ہے:

''ایک مزدور شادی شدہ ہے دوسرا کنوارہ، ایک کے بچے زیادہ ہیں دوسرے کے کم اور علیٰ ہذالقیاس۔اس طرح مساوی محنت کے ساتھ اور سماجی تصور میں مساوی حصے کے بعد درحقیقت ایک کو دوسرے سے زیادہ ملے گا یعنی پہلا دوسرے کی نسبت زیادہ امیر ہوگا وغیرہ وغیرہ، ان تمام خرابیوں سے بچنے کیلئے حق مساوی کی بجائے غیر مساوی ہوگا۔

''لیکن کمیونسٹ سماج کے پہلے مرحلے میں یہ خرابیاں ناگزیر ہیں کیونکہ یہ وہ وقت ہے کہ اس سماج نے ایک تکلیف دہ عمل کے بعد ابھی ابھی سرمایہ دار سماج کے بطن سے جنم لیا ہے۔قانون کبھی بھی سماج کے معاشی ڈھانچے اور اس سے مشروط ثقافتی ترقی سے بالاتر نہیں ہوسکتا۔''(8) دوسرے الفاظ میں کمیونزم کا پہلا مرحلہ (سوشلزم) ابھی مکمل انصاف اور مساوات فراہم نہیں کرسکتا، دولت اور آمدنی میں فرق (غیر منصفانہ فرق) کچھ عرصے کیلئے پھر بھی موجود رہیں گے اگرچہ عام معیار زندگی میں بہت زیادہ بہتری آ جائے گی۔اس وقت سماج ہر کسی کو ''اپنی صلاحیتوں کے مطابق'' کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور نہ

ہی ہر ایک کو ''اس کی ضرورت کے مطابق'' اس کے کام سے قطع نظر صلہ دے سکتا ہے۔ مزدوروں کی ریاست ان دومخاصمانہ خصوصیات کے باہمی رشتے پرنظر رکھے گی اور اس امر کو یقینی بنائے گی کہ سوشلسٹ رجحانات کو حتمی غلبہ حاصل ہو اور رفتہ رفتہ ریاست کا خاتمہ ہوجائے۔

لٰہذا یہ نئی ریاست دوہرا کردار اختیار کر لیتی ہے، جہاں تک قومیائے گئے ملکیتی رشتوں کے دفاع کا تعلق ہے یہ سوشلسٹ ہوتی ہے اور جہاں تک اجرتی محنت کے سرمایہ دارانہ طریقے کے ذریعے اشیا اور خدمات کی تقسیم کا تعلق ہے یہ بورژوا ہوتی ہے۔ تاہم تقسیم کے بورژوا طریقے پر عمل پیرا ہونے سے پیداواری قوتوں کو فروغ حاصل ہوگا اور آخری تجزیے میں سوشلسٹ مقاصد کی خدمت ہوگی۔ مگر جیسا کہ لینن نے کہا تھا انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال ناممکن ہوجائے گا کیونکہ ذرائع پیداوار سماجی ملکیت میں رہیں گے۔ یہ حقیقت بذات خود تقسیم کی خامیوں اور بورژوا قانون کی عدم مساوات کو ختم نہیں کرسکتی۔ سرمایہ داری کا فوری خاتمہ ایک غیر طبقاتی سماج کو فوراً وجود میں لانے کی مادی بنیاد فراہم نہیں کرتا۔ یہ ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ریاست بذات خود (اگرچہ یہ ایک نیم ریاست ہے) سمجھتی ہے کہ اس کا کام اس بورژوا خاندان کی پاسداری ہے جو سماج میں ایک مخصوص عدم مساوات کو مقدس بناتا ہے۔ پیداواری قوتوں کی مزید ترقی اور کمیونزم کے حصول سے ریاست اور سرمایہ داری کی دوسری باقیات غائب ہوجاتی ہیں۔ لینن کہتا ہے کہ ''جب تک ریاست کا وجود ہے کوئی آزادی نہیں ہے، جب آزادی ہوگی تو ریاست نہیں رہے گی۔''(9)

آگے چل کر مارکس نے وضاحت کی ہے کہ کمیونزم کے اعلیٰ مرحلے میں بورژوا قانون کس طرح غائب ہوجاتا ہے، ''جب فرد کی تقسیم محنت کے تحت غلامانہ ماتحتی اور ساتھ ہی ساتھ ذہنی اور جسمانی محنت کے درمیان تضاد ختم ہوچکا ہو، جب محنت محض زندگی گزارنے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ زندگی کی بنیادی حاجت بن چکی ہو، جب فرد کی ہمہ جہت ترقی کے ساتھ ساتھ پیداواری قوتوں میں بھی اضافہ ہوچکا ہو اور باہمی تعاون کی دولت کے تمام چشمے بافراط بہہ رہے ہوں۔۔۔ صرف اسی وقت بورژوا حق کے تنگ افق کو مکمل طور پر عبور کیا جاسکتا ہے اور سماج اپنے جھنڈے پر یہ الفاظ لکھ سکتا ہے ''ہر ایک سے اس کی اہلیت کے مطابق، ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق۔''(10)

لینن اپنی کلاسیکل کتاب ''ریاست اور انقلاب'' میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے عبوری دور کے حوالے سے مزید اضافہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اشیائے صرف کی تقسیم کے بورژوا قانون کی ناگزیر شرط

اول یہ ہے کہ بورژوا ریاست کا وجود ہو کیونکہ اگر ایک ایسی مشینری موجود نہیں ہے جو قانون کے ضابطوں پر عمل درآمد کروانے اور انہیں لاگو کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو تو ایسا قانون کچھ بھی نہیں ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمیونزم کے تحت کچھ عرصے تک نہ صرف بورژوا قانون بلکہ بورژوا ریاست بھی قائم رہتی ہے مگر بورژوازی کے بغیر!'' (11)

بادی النظر میں یہ تبصرہ ناقابل یقین لگتا ہے۔ یہ یقیناً ان لوگوں کو دہشت زدہ کر دیتا ہے جو مزدوروں کی ریاست کو خیال پرستانہ انداز میں دیکھتے ہیں۔ پیرس کمیون کے محدود تجربے پر انحصار کے باعث مارکس مستقبل کی مزدور ریاست کی ہیئت کے سلسلے میں انتہائی عمومی خاکہ پیش کرسکتا تھا۔لینن نے اس موضوع پر مارکس کے خیالات کو ترویج دی مگر اس نے ان عوامل کا بہت گہرائی سے جائزہ نہیں لیا جو ایک ایسی صورت میں پیش آسکتے تھے جب روسی مزدوروں کی ریاست انتہائی پسماندگی کے حالات میں بالکل الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہوتی۔ بہت سے مواقع پر اس نے واضح کیا کہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مزدوروں کی مدد کے بغیر اس انقلاب کے بچنے کی کوئی توقع نہیں۔تاہم وہ بڑے بااعتماد انداز میں توقع کرتا تھا کہ عالمی سوشلسٹ انقلاب کی فتح اس ابتدائی مرحلے کا دورانیہ بہت کم کردے گی۔اس مظہر کا تجزیہ زیادہ تفصیل کے ساتھ کرنے کا کام ٹراٹسکی پر آن پڑا جس کی بنیاد روسی نظام میں نوکر شاہی کا فروغ اور سٹالنزم کا ظہور تھا۔

یہ بات واضح ہے کہ انقلاب کے بعد ظاہر ہونیوالا سماج جس قدر غریب ہوگا عبوری دور کی شکل بھی اتنی ہی زیادہ ناپختہ، زیادہ نوکر شاہانہ اور زیادہ ابتدائی نوعیت کی ہوگی اور مزدور طبقے کے ہاتھوں سے اقتدار کے نکل جانے کا خطرہ بھی اتنا ہی زیادہ شدید ہوگا۔روسی انقلاب سے ظاہر ہونے والی ریاست پر اس کا شدید اثر تھا جو کہ ایک پسماندہ ملک میں تھی اور اسے معاشی ٹوٹ پھوٹ کا سامنا تھا۔ٹراٹسکی کے الفاظ میں ''مزدوروں کی ریاست ''بورژوا قانون'' کے دفاع کی غرض سے ایک 'بورژوا' قسم کا آلہ تخلیق کرنے پر مجبور تھی یعنی وہی پرانا سپاہی اگرچہ اس کی وردی نئی تھی۔'' (12)

لینن ایسی صورت حال کے خطرات سے آگاہ تھا۔اس نے وضاحت کی تھی کہ ریاست طبقاتی سماج کی نشانی ہے جو بعض حالات میں انحطاط پذیر ہوسکتی ہے لہٰذا اسے مستقل طور پر مزدوروں کے ماتحت اور ان کے جمہوری کنٹرول میں رہنا چاہیے۔اسی وجہ سے لینن نے ایک ضروری قدم یہ اٹھایا کہ اوقات کار میں کمی کردی تاکہ عوام صنعت اور ریاست کو چلانے میں حصہ لے سکیں۔ایسا جذباتی وجوہات کی بنا پر نہیں

کیا گیا تھا بلکہ یہ نئی ریاست کے بالاتر ہو جانے اور مزدوروں سے کٹ جانے کیخلاف ایک دفاع تھا۔ دوسرے لفظوں میں اسے انحطاط پذیری سے بچانے کی غرض سے۔ایسے رجحان کا مقابلہ کرنے کیلئے لینن نے نوکر شاہی کیخلاف متعدد اقدامات کیئے۔ان میں مندرجہ ذیل شامل ہیں، تمام افسروں کا انتخاب اور انہیں واپس بلائے جانے کا اختیار، مستقل فوج پر پابندی، کسی افسر کو ہنر مند مزدور سے زیادہ تنخواہ کا نہ دینا اور ملازمتیں اور ذمہ داریاں سب کو باری باری دینا۔آخر میں لینن کہتا ہے کہ'' تاکہ سب کے سب کچھ عرصے کیلئے بیوروکریٹ بن سکیں اور کوئی بھی''بیوروکریٹ'' نہ بن سکے۔''(13) ان اقدامات کو فوری طور پر نافذ العمل ہونا تھا تاکہ نوکر شاہانہ خرابیوں سے نمٹا جا سکے جن کا ظاہر ہونا پرولتاریہ کی عددی اور ثقافتی کمزوری کی وجہ سے ناگزیر تھا۔تاہم روس کی ازلی پسماندگی اس کے مکمل طور پر نافظ العمل ہونے کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ تھی۔کام کے اوقات کار گھٹنے کی بجائے بڑھ گئے جب کہ قابل منتظمین کی انتہائی شدید قلت تھی۔

پرانی ریاستی مشینری

مارکس اور اینگلز کے نقش قدم پر چلتے ہوئے لینن انقلابی حکمت عملی اور چالوں کے علاوہ ایک پس ماندہ ملک میں سوشلزم کی تعمیر کے مسائل کے ساتھ مسلسل دست و گریباں رہا۔53 جلدوں پر مشتمل اس کا مجموعہ تصانیف (روسی ایڈیشن) مارکسزم کیلئے اس کی عمر بھر کی خدمات کی گہرائی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔اس نے معاملات کو ہمیشہ ایمان داری کے ساتھ پیش کیا اور روسی مزدوروں کو''سرکاری'' خوش فہمیوں اور خوش کن اعلانات سے دھوکے میں رکھنے سے انکار کر دیا۔سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے تمام تناظرات کی بنیاد عالمی انقلاب کی کامیابی کو بنایا۔لینن نے وضاحت کی کہ سرمایہ داری کا خاتمہ اور پرولتاری جمہوریت کو کسی ترقی یافتہ ملک میں مستحکم کرنا بھی جان جوکھوں کا کام ہوگا۔مگر پسماندہ روس میں مغرب کی فوری امداد کے بغیر یہ ایک ناممکن کام تھا۔لینن کی تمام تحریروں اور بالخصوص اس دور کی تحریروں میں سماج کو تبدیل کرنے کی مزدور عوام کی صلاحیت میں زبردست یقین اور مشکلات سے نمٹنے کے سلسلے میں ایک بے خوف ایمانداری نظر آتی ہے۔ وہ ہمیشہ ایسی سچائیوں سے پردہ اٹھاتا تھا جنہیں ہضم کرنا مشکل ہوتا تھا کیونکہ اسے مکمل اعتماد تھا کہ مزدور طبقہ اس بات کو سمجھے گا اور مزید قربانیوں کی ضرورت کو تسلیم کرے گا

بشرطیکہ ان کی وجوہات کی ایمانداری اور سچائی سے وضاحت کی جائے۔لینن کے دلائل کا مقصد سوویت مزدوروں کو''سوشلزم'' کی افیون دے کر سلانا نہیں بلکہ درپیش جدوجہد کیلئے تیار کرنا تھا۔روس کی پسماندگی اور بیوروکریسی کیخلاف جدوجہد، سرمایہ داری کیخلاف جدوجہد اور عالمی پیمانے پر سوشلسٹ انقلاب کیلئے جدوجہد۔

اسی ایمان دارانہ طریقہ کار پر عمل پیرا رہتے ہوئے لینن نے بار بار سوویت ریاست کی شدید خامیوں اور خوفناک مشکلات پر بحث کی جن کا روسی مزدوروں کو سامنا تھا۔روس کی معروضی پسماندگی (ناخواندگی کی اونچی شرح اور کمزور مزدور طبقہ) نے سوویت حکومت کو لاکھوں کی تعداد میں زار کے زمانے کے بیوروکریٹوں کی خدمات حاصل کرنے پر مجبور کر دیا جن کے پاس نئے نظام کی کوششوں کو تخریب کاری کے ذریعے ناکام بنانے کے ہزاروں طریقے موجود تھے۔یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ اس سے پورے انقلاب کے داخلی طور پر گل سڑ جانے کا خطرہ تھا۔مارکس پہلے ہی وضاحت کر چکا تھا کہ مادی پسماندگی کی وجہ سے نوکر شاہانہ انحطاط کا خطرہ درپیش ہوسکتا ہے تاہم اس نے اس نکتے کو مزید آگے نہیں بڑھایا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس قسم کے مسئلے کو ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں انقلاب کی بنیاد پر حل کر لیا جائے گا۔تنہا پسماندہ روس میں یہ ایک بالکل مختلف معاملہ تھا۔

مارکس اور اینگلز ایک مزدور ریاست میں بیوروکریسی کے خطرے سے اچھی طرح آگاہ تھے اور اس کا مقابلہ کرنے کیلئے انہوں نے کچھ اقدامات بھی تجویز کئے تھے۔پیرس کمیون کے تجربے کی بنیاد پر اینگلز نے لکھا تھا''اس مزدور طبقے کیلئے ضروری ہے کہ اپنی تازہ حاصل کی گئی فاتحانہ برتری کو دوبارہ خاتمے سے بچانے کیلئے اپنے نائبین اور افسران کیخلاف اپنا دفاع کرنے کیلئے اعلان کرے کہ ان سب کو بلا استثنا کسی بھی وقت واپس بلایا جاسکتا ہے۔''اس امر کو یقینی بنانے کیلئے کہ ریاست''سماج کے خادموں سے سماج کے آقاؤں میں تبدیل نہ ہونے پائے۔تمام سابقہ ریاستوں میں یہ تبدیلی ناگزیر طور پر ہوئی۔کمیون نے دو ناقابل شکست ذرائع اپنائے۔پہلے تو اس نے تمام انتظامی، عدالتی اور تعلیمی عہدے تمام متعلقہ افراد کی عام رائے کی بنیاد پر تفویض کئے اور اس میں انہی منتخب کرنیوالوں کو یہ حق بھی حاصل تھا کہ ان افسران کو کسی بھی وقت واپس بلالیں۔اور دوسری بات یہ کہ چھوٹے بڑے تمام افسران کو اتنی ہی تنخواہ دی گئی جتنی دیگر مزدوروں کو ملتی تھی۔کمیون نے سب سے زیادہ تنخواہ اگر کسی کو دی تو وہ 6000 فرانک تھی۔اس طرح سے ملازمتوں کیلئے تگ و دو اور کیریئرازم کیخلاف ایک موثر رکاوٹ کھڑی کر دی گئی اور یہ اس لازمی مینڈیٹ

کے علاوہ تھی جو نمائندہ اداروں کے مندوبین کیلئے ضروری تھی۔‘‘(14)

مارکس اور اینگلز کے پیرس کمیون کے اس تجزیئے کو بنیاد بناتے ہوئے مزدور ریاست میں بیوروکریسی کے خلاف لڑائی کیلئے لینن نے 1917ء میں چار کلیدی نکات پیش کئے:

(1) سوویت ریاست میں تمام عہدوں کیلئے آزادانہ اور جمہوری انتخاب

(2) تمام افسران کو واپس بلائے جانے کا حق

(3) کسی افسر کو ہنر مند مزدور سے زیادہ تنخواہ نہ دینا

(4) رفتہ رفتہ ریاست اور سماج کو چلانے کے فرائض ہر کوئی باری باری ادا کرے گا یا جیسے لینن کہتا تھا کہ ’’کوئی باورچی بھی وزیراعظم بن سکتا ہے۔‘‘

’’ہم ریاستی افسران کے کردار کو اتنا کم کر دیں گے کہ ان کا کام محض ہمارے احکامات کو ذمہ دار، اور معمولی تنخواہ پانے والے، فورمینوں اور اکاؤنٹینٹوں، کے طور پر پورا کرنا ہوگا۔ (جس میں ان کو مختلف اقسام کے درجات کے ہنر مندوں کی مدد حاصل ہوگی) یہ ہمارا پرولتاری فریضہ ہے، یہ وہ کام ہے جو ہم کر سکتے ہیں اور جس کے ذریعے ہمیں پرولتاری انقلاب کی تکمیل کا آغاز کرنا چاہیے۔‘‘(15)

لینن کے تحت اجرت کا زیادہ سے زیادہ فرق ایک اور چار کے تناسب سے تھا جسے وہ ایمانداری کے ساتھ ایک ’’سرمایہ دارانہ امتیاز‘‘ تسلیم کرتا تھا۔ تاہم یہ فرق اس لئے ضروری تھا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں عوام کی ثقافتی سطح بہت کمتر تھی ریاست اور صنعت کے امور چلانے کیلئے ہنر مند افراد کی کمی تھی۔ جیسا کہ منحرف سوویت تاریخ دان رائے میڈوی ڈیف لکھتا ہے:

’’پہلے سوویت اجرتی پیمانے کے مطابق کم از کم اور زیادہ سے زیادہ کمائی میں 1:2.1 کا تناسب تھا۔ 1919ء کے آغاز میں دونوں انتہاؤں میں فرق مزید کم ہو کر 1:1.75 رہ گیا۔ یہ 1921ء کے موسم خزاں میں نیو اکنامک پالیسی کے آغاز تک قائم رہا۔ سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی اور پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کی منظوری سے عوامی کمیساروں کی کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں لکھا تھا کہ مختلف قابلیت رکھنے والے مزدوروں (آفس سٹاف، درمیانے درجے کے ہنر مند اور اعلیٰ انتظامی عہدیدار) کی اجرتیں طے کرتے وقت مساوات کے خیال کو بالکل ترک کر دیا جائے، نئے اجرتی سکیل میں قابلیت کے مطابق بہت وسیع فرق رکھا گیا اور سٹاف کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا، نئے سیکھنے والے، مختلف ہنر مند مزدور، اکاؤنٹنٹ اور آفس ورکرز، انتظامیہ اور ٹیکنیکل سٹاف۔ کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ (سترہویں گریڈ) کے

درمیان فرق 1:8 کے تناسب سے رکھا گیا تھا۔

ریاستی انتظامی اداروں کے ملازمین کی تنخواہ کے سوال سے ایک مختلف انداز میں نمٹا گیا تھا۔ اکتوبر انقلاب کے بعد چند مہینوں میں گزر بسر کیلئے کم از کم اجرت، تبادلے کی شرح اور قیمتوں کی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے، آٹھ روبل روزانہ طے کی گئی اور سولہ جنوری 1918ء کو ایک فرمان کے ذریعے اس کی توثیق کردی گئی۔'' (16)

تقریباً اسی دوران لینن نے ''اعلیٰ افسران اور عہدیداران کی تنخواہوں کے سلسلے میں'' ایک بل کا ڈرافٹ تیار کیا جسے معمولی تبدیلیوں کے بعد عوامی کیساروں کی کونسل نے منظور کرلیا۔ اس کا مضمون ذیل میں دیا گیا ہے:

'' کیونکہ تمام ریاستی، پنچائتی، نجی شعبوں اور اداروں میں افسران کی تنخواہوں کو کم کرنے کیلئے بلا استثنا انتہائی شدید اقدامات کی ضرورت کو محسوس کیا جارہا ہے اس لئے عوامی کیساروں کی کونسل فرمان جاری کرتی ہے:

(1) عوامی کیسار (وزیر) کی تنخواہ کی زیادہ سے زیادہ حد 500 روبل ماہانہ ہوگی جب کہ ہر بچے کیلئے سو روبل الاؤنس ہوگا۔ جبکہ مکان کی حد گھر کے ہر فرد کیلئے ایک کمرہ مقرر کی جاتی ہے۔

(2) مزدوروں، فوجیوں اور کسانوں کے نائبین کی مقامی سوویتوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اعلیٰ عہدیداران پر خصوصی ٹیکس لگانے کے انقلابی اقدامات کی تیاری اور نفاذ کا بندوبست کریں۔

(3) وزارت خزانہ اور تمام انفرادی کیسار تمام وزارتوں کے اکاؤنٹس کا مطالعہ کریں اور بہت اونچی تنخواہوں اور پنشنوں میں کمی کریں۔''

سوویت حکمرانی کے ابتدائی مہینوں میں ایک عوامی کیسار (جن میں بذات خود لینن بھی شامل تھا) کی تنخواہ ایک عام شہری کی گزر بسر کیلئے دی جانیوالی اجرت سے صرف دگنی تھی۔ اگلے چند برسوں میں قیمتوں میں اور روبل کی قدر میں اکثر اوقات بہت تیزی سے تبدیلی آتی تھی اور اسکی مناسبت سے اجرتوں میں تبدیلی کی جاتی تھی۔ بعض اوقات یہ اعداد و شمار حیرت انگیز ہوتے تھے، یعنی ہزاروں اور لاکھوں روبل لیکن ایسے حالات میں بھی لینن نے اس امر کو یقینی بنایا کہ ریاست تنظیموں میں کم از کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہ کی شرح میں طے شدہ حد سے زیادہ اضافہ نہ ہونے پائے۔ اس کی زندگی میں بظاہر یہ شرح 1:5 کے تناسب سے زیادہ نہیں بڑھی۔ بے شک پسماندگی کے حالات میں بہت دفعہ اس سے انحراف بھی کرنا پڑا

جو پیرس کمیون کے اصولوں سے پسپائی تھی۔ ''بورژوا ماہرین'' کو سوویت ریاست کیلئے کام کرنے پر تیار کرنے کیلئے انہیں بڑی بڑی تنخواہیں ادا کرنا ضروری تھا۔ ایسے اقدامات اس وقت تک ضروری تھے جب تک مزدور طبقہ اپنے دانشور نہ پیدا کر لے۔ اس کے علاوہ فیکٹریوں اور دفاتر میں شاک ورکرز کو خصوصی شرح سے تنخواہ دی جاتی تھی۔

ماسکو کی صوبائی پارٹی کی ساتویں کانگریس میں 29 اکتوبر 1921ء کو لینن نے ایمانداری سے وضاحت کی:

''اس وقت بھی کئی نکات کے سلسلے میں ہمیں پسپائی اختیار کرنا پڑی تھی۔ مارچ اور اپریل 1918ء میں بھی ماہرین کو ایسی شرح سے تنخواہیں ادا کرنے کا سوال اٹھایا گیا تھا جو سوشلسٹ نہیں بلکہ بورژوا رشتوں سے مطابقت رکھتی تھیں یعنی ایسی شرحیں جن کا تعلق کام کی مشکل یا سختی سے نہیں بلکہ بورژوا روایت اور بورژوا سماج کے حالات سے تھا۔ ماہرین کیلئے ایسی غیر معمولی اجرتیں (بورژوا انداز کی) بنیادی طور پر سوویت منصوبے کا حصہ نہیں تھا اور 1917ء کے آخر میں جاری کئے گئے کئی فرمانوں کے برعکس تھیں۔ لیکن 1918ء کے آغاز میں پارٹی نے اس بارے میں براہ راست ہدایات دیں کہ ہمیں اس نکتے پر ضرور پیچھے ہٹنا چاہیے اور ایک ''سمجھوتے'' پر رضامند ہو جانا چاہیے۔ (میں اس وقت استعمال ہونے والی اصطلاح کو ہی استعمال کر رہا ہوں) (17)

تاہم ایسے سمجھوتوں کا اطلاق کمیونسٹوں پر نہیں ہوتا تھا۔ ان کے ہنر مند مزدوروں پر زیادہ اجرت لینے کی سخت پابندی تھی۔ اس سے زیادہ وصول ہونے والی آمدنی پارٹی کو دینا ضروری تھا۔ عوامی نائبین کی کونسل کے سربراہ کو پانچ سو روبل ادا کئے جاتے تھے جو ہنر مند مزدور کی تنخواہ کے برابر تھے۔ جب عوامی نائبین کی کونسل کے آفس منیجر وی ڈی بونچ بروویچ نے مئی 1918ء میں لینن کو بہت زیادہ ادائیگی کی تو لینن نے اسے ''سخت ڈانٹ'' پلائی اور اس اضافے کو ''غیر قانونی'' قرار دیا۔ انقلاب کے محدود ہو جانے اور بورژوا ماہرین اور ہنر مندوں کو ملازم رکھنے کی ضرورت کے باعث ان مزدوروں کے لئے اس تناسب میں اضافہ کر دیا گیا۔ یہ حکومت کے اراکین کے مقابلے میں پچاس فیصد زیادہ اجرت لے سکتے تھے۔ لینن نے اس کی مذمت ''بوژوا رعایت'' کہہ کر کی جس میں جتنی جلد ممکن ہو سکتا کمی کی جانی تھی۔

رائے میڈوی دیف کے الفاظ میں ''جہاں تک کمیونسٹوں کا تعلق تھا اعلیٰ ترین عہدیداروں سے بھی لینن اعتدال کا تقاضا کرتا تھا۔ وہ ان کی صحت، خوراک اور رہائش گاہوں کے سلسلے میں ہمدردی کا اظہار

ضرور کرتا تھا مگر اس کا اصرار تھا کہ ان سب کی تنخواہوں بشمول اس کی اپنی ذات کے، مخصوص حدود میں رہنی چاہئیں۔ عیاشیوں کی اجازت بالکل نہیں تھی۔'' اپریل 1918ء میں لینن نے مادی ترغیبات اور اجرتوں میں تفریق کو'' ہمارے سوشلسٹ، سوویت ریاستی اقتدار کیلئے، پیچھے کی جانب قدم اور شروع ہی سے زیادہ تنخواہوں کو کم کر کے اوسط مزدور کی اجرت کی سطح تک لانے کی پالیسی اور اعلانات کے منافی'' (18) قرار دیا۔ میڈوی دیف مزید لکھتا ہے کہ'' خاص طور پر پارٹی ممبران کیلئے لینن مساوی اجرتوں اور زیادہ اونچی تنخواہوں کیخلاف تھا۔ اس پالیسی کے نتیجے میں تمام کمیونسٹوں کیلئے زیادہ سے زیادہ اجرت کی حد مقرر کر دی گئی۔ حالات زندگی یا تنخواہ میں زیادہ عدم مساوات کو لینن پارٹی کے اندر بدعنوانی کا سرچشمہ اور کمیونسٹوں کی اتھارٹی کو کم کرنے والا عامل خیال کرتا تھا''۔ (19)

ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن سے مزدوروں کی ریاست کے رہنماؤں کے رہنےسہنے کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ خانہ جنگی کے دور کے بارے میں لکھتے ہوئے وکٹر سرجی نے چیکا کے ڈپٹی چیف کے رہن سہن کے بارے میں لکھا ہے:

'' ان دنوں بابا کوف پھٹے ہوئے جوتوں میں پھرتا تھا۔ سرکاری اہلکار ہونے کے ناطے مجھے خصوصی راشن ملتا تھا۔ لیکن بلیک مارکیٹ کی غلیظ ہیرا پھیریوں کے بغیر میں بھوک سے مرجاتا جہاں ہم فرانس سے لائی ہوئی معمولی اشیا کا تبادلہ کرتے تھے۔ زینوویف کے سالے اور میرے دوست یونوف (جو سوویت کا ایگزیکٹو ممبر اور ریاستی لائبریری کا بانی اور ڈائریکٹر تھا) کا بڑا بیٹا ہماری نظروں کے سامنے بھوک سے مر گیا اور اس تمام عرصے میں ہم بہت سے مال اور یہاں تک کہ دولت کی نگرانی بھی کرتے رہے تھے مگر ریاست کی طرف سے زبردست کنٹرول کے تحت ہماری تنخواہیں کمیونسٹوں کیلئے مخصوص زیادہ سے زیادہ تنخواہ تک محدود تھیں یعنی ایک ہنرمند مزدور کی تنخواہ کے برابر۔'' (20)

ایک برطانوی مصنف آرتھر رینسم جو روس سے خوب واقف تھا اور انہی دنوں اس نے روس کے کئی دورے بھی کئے تھے اپنا ایک غیر معمولی تجربہ بیان کرتا ہے۔ وہ اس وقت یعنی 1921ء میں ایک سرکاری وفد کے ساتھ جس میں راڈک اور لارن بھی شامل تھے ایک قصبے یاروسلاول کا دورہ کر رہے تھے۔ سٹالن کے دور میں ایک بدنام جیل تھی۔ مگر بالشویکوں نے جیل کیا اصلاح کے سلسلے میں سنجیدہ کوششیں کی تھیں اور قیدیوں کے حالات کو بہتر بنانے کی سعی کی تھی۔ خوفناک غذائی قلت کے حالات میں اس جیل کے اندر مہیا کی جانیوالی خوراک مقامی سوویت لیڈرشپ کو دستیاب خوراک سے بہتر تھی!

''روستوپچن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ جیل میں خوراک کا انتظام کرنے والا شخص بہت ہوشیار ہے اور پرانی فوج میں بھی اس کے ذمے یہی کام تھا اب صورتحال یہ ہے کہ جیل میں ملنے والی خوراک سوویت ہیڈکوارٹر میں ملنے والی خوراک سے اس قدر بہتر ہے کہ ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبران کا معمول بن گیا ہے کہ وہ کھانا کھانے کیلئے جیل چلے جاتے ہیں۔انہوں نے ہمیں بھی اس کی دعوت دی۔لارن میں چلنے کی ہمت نہیں تھی اسلئے وہ سوویت ہاؤس میں ہی ٹھہر گیا اور کمتر کھانا کھایا جبکہ ہم (راڈک، میں اور روستوپچن) مقامی کمیٹی کے تین دوسرے اراکین کے ہمراہ جیل چلے گئے۔''(21)

حکومتی وزرا یا کیساروں کیلئے بھی رہائش کی حد گھروں کے ہر فرد کیلئے ایک کمرہ مقرر تھی۔لینن کے دفتر کا فرنیچر چند ضروری اشیا پر مشتمل تھا۔فن لینڈ کی حکومت کے ایک ممبر کارل ایڈمن کے مطابق، جو کہ لینن سے دسمبر 1917ء میں ملا تھا، ''لینن بڑے تپاک کے ساتھ ملا اور ہمیں منتظر رکھنے پر معذرت طلب کی۔جس کمرے میں ہم کھڑے تھے اسے گتے کی دیوار سے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔یہ کمرہ سمولنی محل کے دوسرے کمروں سے کسی بھی طرح مختلف نہیں تھا یہ باقیوں کی طرح بالکل سادہ تھا۔دیواروں پر سفیدی کی ہوئی تھی کمرے میں ایک میز اور چند کرسیاں تھیں۔'' سٹالن اور اس کے بعد آنے والے کریملن کے آقاؤں کی زبردست مراعات اور عیاشانہ طرز زندگی سے یہ پالیسی بالکل متضاد تھی۔وکٹر سرجی اس کی تصدیق کرتا ہے:

''کریملن میں اس وقت بھی اس (لینن) کے پاس ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا جو محل کے نوکر کیلئے تعمیر کیا گیا تھا۔حالیہ موسم سرما میں باقی سب جگہوں کی طرح یہاں بھی گرمائش کیلئے کوئی بندوبست نہیں تھا۔جب وہ حجام کے ہاں جاتا تو اپنی باری کا انتظار کرتا کیونکہ اسے یہ بات اچھی نہیں لگتی تھی کہ کوئی اسے اپنی باری دے۔''(22)

ٹراٹسکی کے سلسلے میں بھی یہ بات درست ہے جو کہ درحقیقت لینن کا نائب تھا:

''بالشویک انقلاب کے ابتدائی دنوں میں تازہ ترین خبروں کے لئے میں ہر صبح سمولنی محل جایا کرتا تھا۔ٹراٹسکی اور اس کی چھوٹی سی خوش شکل بیوی، جو فرانسیسی زبان کے علاوہ کوئی دوسری زبان کم ہی بولتی تھی، سب سے اوپری منزل پر ایک کمرے میں رہتے تھے۔یہ کمرہ کسی غریب آرٹسٹ کے سٹوڈیو کی طرح دو حصوں میں تقسیم تھا۔ایک سرے پر دو چارپائیاں اور ایک سستی سی سنگھار میز تھی اور دوسرے سرے پر ایک ڈیسک اور دو یا تین سستی قسم کی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔وہاں تصویریں یا سہولت کی کوئی چیز نہیں تھی۔جب

تک ٹراٹسکی امور خارجہ کا وزیر رہا یہ دفتر اس کے تصرف میں رہا۔کمرے کے باہر دو سرخ گارڈز مستقل پہرہ دیتے تھے۔وہ نظر تو خطرناک آتے تھے مگران کا رویہ حقیقتاً دوستانہ تھا۔ٹراٹسکی کے ساتھ ملاقات ہر وقت ممکن تھی۔''(23)

یہ کوئی استثنا نہیں تھی۔ بالشویک لیڈروں تک رسائی ہمیشہ ممکن ہوسکتی تھی اور وہ عوام سے قریب رہتے تھے۔وہ بغیر حفاظتی دستوں کے گلیوں میں پھرتے تھے۔لینن اسی طرح پھر رہا تھا جب لیفٹ سوشل انقلابیوں کے ایک قاتل نے اسے گولی مار کر زخمی کر دیا تھا۔جب ہم سٹالن اوراس کے بعد آنے والوں کو سوویت عوام سے الگ اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے یا بڑی بڑی گاڑیوں میں مسلح محافظوں کے ہمراہ تیزی سے سفر کرتے دیکھتے ہیں،ان کی مراعات اور عیاشیوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں اس وسیع خلیج کا خیال آتا ہے جو لینن کے جمہوری نظام اور بعد ازاں آنیوالوں کے درمیان حائل تھی۔ یہاں اس نکتے پر زور دینا ضروری ہے کہ لینن اس معمولی فرق کو بھی نا قابل قبول سرمایہ دارانہ تفریق خیال کرتا تھا جو اس وقت موجود تھا اور جسے سوشلزم کی طرف ترقی کے دوران رفتہ رفتہ ختم کیا جانا تھا۔

بیوروکریسی کی جڑیں

فروری 1917ء میں پورے روس میں بالشویک پارٹی کے ارکان کی تعداد 8000 سے زیادہ نہیں تھی۔خانہ جنگی کے عروج پر جب کہ پارٹی ارکان کو جان کا خطرہ درپیش ہوتا تھا پارٹی کو مزدوروں کیلئے کھول دیا گیا جس سے یہ تعداد دو لاکھ ہوگئی۔لیکن خانہ جنگی کے خاتمے تک یہ تعداد تین گنا بڑھ گئی جن میں مخالف طبقات اور پارٹیوں کے عناصر کے علاوہ جاہ طلب بھی شامل تھے۔ان عناصر کی بیخ کنی ضروری تھی۔1921ء میں شروع کی گئی لینن کی ''تطہیر'' کا سٹالن کے دور کے جھوٹے مقدمات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ان میں پولیس،مقدمات یا جیل خانوں کا کوئی دخل نہیں تھا صرف پیٹی بورژوا اور منشویک جاہ طلبوں کی بیخ کنی کی جارہی تھی تا کہ اکتوبر انقلاب کے تصورات و روایات کو پیٹی بورژوا ردعمل کے زہریلے اثرات سے محفوظ رکھا جا سکے۔1922ء کے آغاز تک ایک تہائی یا دو لاکھ کے قریب ارکان کو نکالا جا چکا تھا۔

1919ء تک بالشویک حکومت نے مزدوروں اور کسانوں کی جانچ پڑتال کیلئے عوامی کیسا ریٹ

منظم کرلی تھی جسے رابکرن کے نام سے جانا جاتا تھا۔اس کا کام پارٹی مشینری اور ریاست سے جاہ طلبوں اور بیوروکریٹوں کو نکالنا تھا۔سٹالن کی شہرت بطور منتظم اچھی ہونے کے باعث اسے رابکرن کا انچارج بنا دیا گیا۔تاہم کچھ ہی عرصے میں سٹالن کی تنگ نظر منتظمانہ سوچ اور اقتدار کی ذاتی ہوس نے اسے پارٹی لیڈرشپ کے اندر بیوروکریسی کے سب سے بڑے نمائندے کی حیثیت میں لا کھڑا کیا۔سٹالن نے اپنی حیثیت کو، جس کے باعث وہ پارٹی اور ریاست کے نمایاں عہدوں کیلئے اشخاص منتخب کرسکتا تھا، اپنے گرد اتحادیوں، خوشامدیوں اور سیاسی طور پر نااہل لوگوں کو جمع کرنے کیلئے استعمال کیا جو اپنی ترقی کیلئے اس کے شکرگزار تھے۔سٹالن کے ہاتھوں میں رابکرن ایک ایسا ہتھیار تھا جسے وہ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اور سیاسی مخالفین کو ختم کرنے کیلئے استعمال کرتا تھا۔

1920ء کے آخر تک ریاستی اہلکاروں کی تعداد حیران کن طور پر 5880000 تک پہنچ گئی جو پہلے ایک لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یہ تعداد صنعتی مزدوروں کی تعداد سے پانچ گنا زیادہ تھی۔سرخ فوج میں فوجی اہلیت رکھنے والوں کی اتنی شدید قلت تھی کہ سفید افواج سے مقابلے کیلئے پرانے، زارشاہی دور کے افسران کو بھرتی کرنا پڑا۔اگست 1920ء تک 48408 زارشاہی دور کے فوجی افسران کو بطور ماہرین بلایا جاچکا تھا۔ان پرتوں کی سوویت ریاست کیلئے وفاداری زیادہ شدید نہیں تھی۔ان کی خدمات حاصل کرنے اور انہیں مخالفین سے جاملنے سے روکنے کیلئے بالشویک حکومت انہیں بہت سی مراعات دینے پر مجبور تھی۔اس کے علاوہ ان افسران کی وفاداری کو یقینی بنانے اور مزدوروں کے کنٹرول کے ایک ضروری آلے کے طور پر سیاسی کمیسار مقرر کیئے گئے تھے۔

لینن کا ارادہ یہ تھا کہ رفتہ رفتہ سارے مزدور طبقے کو ریاستی امور چلانے میں شریک کیا جائے،"ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمام غریبوں کو انتظام کے عملی کام میں شریک کیا جائے تاکہ ہر محنت کش پیداواری محنت میں آٹھ گھنٹے صرف کرنے کا "فریضہ" پورا کرنے کے بعد بلا معاوضہ ریاستی امور چلانے کا فرض ادا کرے۔"(24)

لیکن اس وقت موجود پس ماندگی کے حالات میں یہ ناممکن ثابت ہوا۔نوخیز سوویت ریاست پرانی ریاستی مشینری کی باقیات سے کام چلانے پر مجبور تھی۔مارچ 1918ء میں لینن نے پارٹی کانگریس کو بتایا کہ"جن اینٹوں سے سوشلزم کی تعمیر ہوگی وہ ابھی نہیں بنی ہیں۔"(25)

ثقافت کی کمتر سطح کے پیش نظر انقلاب کو آگے بڑھانے کیلئے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔جیسا کہ ہم دیکھ

چکے ہیں تعلیم کی کمی نے بالشویکوں کو پرانی زارشاہی بیوروکریسی (جسے چالو کرنے کیلئے تھوڑا سا سوویت تیل دیا گیا تھا) پر انحصار کرنے پر مجبور کر دیا جس میں منتظم، حکومتی اہلکار، فوجی کمانڈر اور فیکٹری مینیجر شامل تھے۔ یہ سب کچھ کم از کم اس وقت تک ناگزیر تھا جب تک مغرب سے (سوشلسٹ انقلاب کی) امداد نہ آ جاتی۔ بعدازاں اس کے دور رس نتائج سامنے آئے لیکن اس وقت کوئی اور چارہ کار تھا ہی نہیں۔ جب خانہ جنگی کے دوران لینن نے ٹراٹسکی سے پوچھا کہ کیا یہ بہتر نہیں ہوتا کہ سیاسی کیساروں کی زیر نگرانی کام کرنیوالے زارشاہی دور کے فوجی افسران کی جگہ دوسرے کمیونسٹوں کو دے دی جائے تو ٹراٹسکی نے جواب دیا:

''لیکن کیا آپ کو پتا ہے کہ ہماری فوج میں ان کی تعداد کتنی ہے؟''

''نہیں''

''اندازاً بھی نہیں؟''

''مجھے معلوم نہیں۔''

''تیس ہزار سے کم نہیں۔''

''کیا؟''

''تیس ہزار سے کم نہیں۔ ہر غدار کے مقابلے میں ایک سو قابل اعتماد افراد موجود ہیں۔ ایک بھگوڑا ہوتا ہے تو دو یا تین مارے بھی جاتے ہیں۔ ہم ان سب کی جگہ کیسے پر کر سکتے ہیں؟''

اس کے چند روز بعد لینن نے سوشلسٹ دولت مشترکہ کی تعمیر کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا:

''جب کامریڈ ٹراٹسکی نے مجھے بتایا کہ ہماری فوج میں افسران کی تعداد ہزاروں میں ہے تو مجھے اس بات کا ٹھوس ادراک ہوا کہ ہمارے دشمن کا صحیح معروضی امتیاز اس وقت کیا ہے، کہ ان اینٹوں سے کمیونزم کو کس طرح تعمیر کیا جائے جو سرمایہ داروں نے ہمارے خلاف استعمال کیلئے جمع کر رکھی ہیں۔''(26)

بذات خود ریاست کے حوالے سے لینن نے 1922ء میں کامنٹرن کی چوتھی کانگریس کو بتایا:

''ہم نے پرانی ریاستی مشینری پر قبضہ کر لیا ہے اور یہ ہماری بدقسمتی تھی۔ ہمارے پاس حکومتی ملازمین کی ایک بڑی فوج ہے مگر ہمارے پاس ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی ہے جو اس کو قابو میں رکھ سکیں۔ اوپری سطح پر ان کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ مگر نچلی سطح پر پرانے اہلکاروں کی تعداد لاکھوں میں ہے جو

ہمیں زارشاہی اور بورژوا سماج سے ملے ہیں۔'' (27)

ہمیشہ کی طرح لینن نے سوویت ریاستی مشینری کے متعلق کڑوی حقیقت کو بیان کر دیا۔ ماضی سے زیادہ تر ورثے میں ملنے والے اس ذلیل آلے کے بارے میں اسے کبھی خوش فہمی نہیں رہی۔ یہ ایک بیوروکریٹک مشین تھی جس پر سوشلزم کا تھوڑا سا رنگ لگا ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ معاملہ محض بیوروکریسی کے نوکرشاہانہ رویے، سرخ فیتے اور افسر شاہی کا نہیں تھا۔ ایسے طرز فکر کا مارکسی طریقہ کار سے کوئی تعلق نہیں۔ مارکسزم بیوروکریسی کو ایک سماجی مظہر کے طور پر لیتا ہے جو مخصوص مادی وجوہات سے جنم لیتا ہے۔ روس میں اس کے ظہور کی وجہ انقلاب کا ایک پسماندہ، ان پڑھ اور کسان ملک میں محدود ہو جانا تھا۔

لینن نے بیوروکریسی کو مزدور ریاست کے جسم پر ایک طفیلی، سرمایہ دارانہ جونک قرار دیا۔ اکتوبر انقلاب نے پرانے نظام کا تختہ الٹ کر زارشاہی ریاست کو بے رحمی سے دبایا اور اس کی تطہیر کی مگر شدید معاشی اور ثقافتی پسماندگی کے حالات میں عالمی انقلاب کی شکستوں کے بعد جوں جوں انقلابی لہر پیچھے ہٹتی گئی توں توں پرانے نظام کے عناصر نے ہر جگہ مراعات اور طاقت کی حامل پوزیشنوں پر واپس آنا شروع کر دیا۔ اس بات کا حقیقی خطرہ موجود تھا کہ انقلاب ایک نوکرشاہانہ انحطاط کا شکار ہو جائے گا۔ اسی لئے لینن نے نوکرشاہی کے بڑھتے ہوئے خطرے کے پیش نظر اس کیخلاف ایک شدید جدوجہد کا تقاضا کیا:

''ہم نے پرانے بیوروکریٹوں کو باہر نکال دیا تھا مگر وہ واپس آ گئے ہیں۔ وہ اپنے کاجوں میں سرخ ربن لگاتے ہیں اور بہتر عہدے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس بارے میں کیا کیا جائے؟ ہمیں اس گندگی کیخلاف بار بار لڑنا چاہیے، اسے بار بار صاف کرنا اور باہر نکالنا چاہیے اور اسے ان کمیونسٹ مزدوروں کی زیر نگرانی رکھنا چاہیے جنہیں ہم ایک مہینے یا ایک سال سے جانتے ہیں۔'' (28)

اینگلز نے واضح کیا تھا کہ ہر اس سماج میں جہاں فنون لطیفہ، سائنس اور حکومت ایک مراعات یافتہ اقلیت تک محدود ہو، یہ اقلیت اپنے مفادات کے حصول کیلئے ہمیشہ ان حیثیتوں کو ہر جائز اور ناجائز طریقے سے استعمال کرے گی اور جب تک عوام کی اکثریت زندگی کی بنیادی ضروریات کے حصول کیلئے صنعت اور زراعت میں زیادہ وقت تک کام کرنے پر مجبور رہے گی، اس صورتحال کا جاری رہنا ناگزیر ہے۔ انقلاب کے بعد صنعت کی تباہ حالی کے باعث اوقات کار کم ہونے کی بجائے بڑھ گئے۔ مزدور دس، بارہ اور اس سے بھی زیادہ گھنٹوں کیلئے محض گزر بسر کیلئے ضروری راشنوں کے عوض کام کرتے۔ بہت سے مزدور

چھٹی کے روز بھی رضا کارانہ طور پر کام کرتے۔ لیکن جیسا کہ ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا عوام ''کل'' کیلئے ''آج'' کی قربانی ایک مخصوص حد تک ہی دے سکتے ہیں۔

ناگزیر طور پر، جنگ، انقلاب اور چار سالوں کی خونریز خانہ جنگی کے علاوہ قحط کے بوجھ نے جس میں لاکھوں افراد لقمہ اجل بنے، مزدور طبقے کو مورال کے حوالے سے اور عددی اعتبار سے کمزور کر دیا۔ مزدور طبقے کا انتشار، دیہات سے پسماندہ عناصر کی شمولیت اور عوام کی تھکن اور مورال کا گرنا تصویر کا محض ایک ہی رخ ہے۔ دوسری طرف ردانقلابی قوتیں یعنی پیٹی بورژوا اور بورژوا عناصر جو عالمی طور پر اور روس کے اندر انقلاب کی کامیابی کے باعث چھپ گئے تھے اور عارضی طور پر ہمت ہار گئے تھے، ہر جگہ اپنی ہمت مجتمع کر کے خود کو آگے لانے لگے اور صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صنعت، ریاست اور یہاں تک کہ پارٹی میں بھی حکمران اداروں کے ہر گوشے میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔

ابتدائی سالوں میں بھی سوویت مشینری کے سلسلے میں اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے وکٹر سرجی لکھتا ہے:

''اس مشینری کے بارے میں جو، بظاہر ایک خلا میں کام کر رہی تھی اور اپنے وقت کا تین چوتھائی حصہ ناقابل حصول منصوبوں پر صرف کر رہی تھی، میں نے فوراً ایک بدترین تاثر قائم کر لیا۔ ایک ایسے دور میں جب بدحالی عام تھی یہ بیوروکریٹوں کی بہت بڑی تعداد کو پال پوس رہی تھی جو ایماندارانہ کام کم کرتی تھی اور مسائل زیادہ کھڑے کرتی تھی۔ وزارتوں کے دفاتر میں آپ کو بنے سنورے جنٹلمین پاؤڈر سرخی لگائے خوبصورت ٹائپسٹ اور میڈلوں کے بوجھ سے ڈھلکی ہوئی وردیوں میں ملبوس لوگ نظر آتے تھے جو گلیوں میں موجود بھوکے عوام کے مقابلے میں بالکل متضاد منظر پیش کرتے تھے اور یہ لوگ معمولی سے کام کیلئے آپ کو مختلف دفاتر کے چکر لگواتے تھے جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔'' (29)

سٹالن کیخلاف لینن کی جدوجہد

1920ء میں ٹراٹسکی نے رابکرن کی کارکردگی پر تنقید کی جو بیوروکریسی کیخلاف آلے کی بجائے اس کیلئے گرم بستر بنتا جا رہا تھا۔ ابتدا میں لینن نے ٹراٹسکی کی تنقیدوں کی مخالفت کی۔ بعد میں وہ ٹراٹسکی کے نقطہ نظر سے متفق ہو گیا، ''کامریڈ ٹراٹسکی نے یہ خیال کافی عرصہ پہلے پیش کیا تھا۔ اس وقت میں اس

کیخلاف تھا مگر اس معاملے کا قریبی جائزہ لینے کے بعد مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ ایک مناسب خیال ہے۔۔۔"

پہلے تو بیمار ہونے کی وجہ سے لینن کو پتہ نہ چلا کہ اس کی پیٹھ پیچھے پارٹی اور ریاست میں کیا ہو رہا ہے۔ 1922ء میں صورتحال اس پر واضح ہو گئی۔ اس نے شکایت کی کہ "بیوروکریسی ہمارا گلا دبا رہی ہے۔" اس نے دیکھا کہ مسئلے کی بنیاد ملک کی معاشی اور ثقافتی پسماندگی ہے۔

تو اس صورت حال کا مقابلہ کس طرح سے کرنا تھا؟ لینن نے نوکر شاہی کے خطرات پر قابو پانے کیلئے مزدور تنظیموں کی اہمیت پر زور دیا کہ "ہمارا پارٹی پروگرام ایک ایسی دستاویز ہے جس سے کمیونزم کی ابجد کا مصنف نکولائی بخارن بخوبی واقف ہے، بتاتا ہے کہ ہماری ریاست مزدوروں کی ریاست ہے جو نوکر شاہی کے باعث کچھ مسخ شدہ ہے۔ ہمارے پاس ایک ریاست ہے جس کے تحت اب یہ بڑے پیمانے پر منظّم مزدوروں کا کام ہے کہ وہ اپنی حفاظت کریں جبکہ ہمیں اپنے طور پر ان مزدور تنظیموں اور مزدوروں کو ریاست سے محفوظ رکھنے کیلئے استعمال کرنا چاہیے اور ان کے ذریعے اپنی ریاست کی حفاظت کرنا چاہیے۔"(30)

لینن نے جدلیاتی انداز میں بحث کرتے ہوئے کہا کہ مزدور ریاست میں ٹریڈ یونین آزاد ہونی چاہیے تاکہ مزدور طبقہ ریاست کے خلاف اپنا دفاع کر سکے اور اس طرح سے بذات خود مزدوروں کی ریاست کی حفاظت کر سکے۔ لینن نے اس نکتے پر اس لئے زور دیا کیونکہ وہ ریاست کے طبقے سے الگ ہو کر بالاتر ہو جانے کے خطرے کو دیکھ رہا تھا۔ مزدور اپنی تنظیموں کے ذریعے خود ریاستی مشینری اور بیوروکریسی پر نظر رکھ سکتے تھے۔ تاہم خانہ جنگی کے خاتمے تک مزدور طبقے کے تحلیل ہو جانے کے باعث ریاست میں نوکر شاہی کے فروغ کا موثر مقابلہ نہیں کیا جا سکا۔ اس سال کے دوران لینن کی توجہ بیوروکریسی کے بڑھتے ہوئے خطرے پر مرکوز رہی۔ مارچ، اپریل 1922ء میں ہونیوالی گیارہویں پارٹی کانگریس (یہ آخری کانگریس تھی جس میں لینن نے شرکت کی) میں اس کی توجہ بنیادی طور پر نوکر شاہی پر مرکوز رہی۔ اس کانگریس میں لینن نے "ریاستی سرمایہ داری" کی شکل میں مزدور ریاست کے معاشی رشتوں پر بات کی۔ یعنی وہ معاشی رشتے جن پر نئی معاشی پالیسی کی بنیاد تھی۔ اس میں منڈی کے رشتوں کی اجازت تھی جب کہ معیشت کے کلیدی شعبے ریاست کی تحویل میں رہے۔ لینن نے کہا کہ روایتی طور پر ریاستی سرمایہ داری کا اطلاق ایک سرمایہ دار ریاست میں چھوٹے سے قومیائے گئے شعبے پر ہوتا تھا۔ مگر اب اس نے نئی معاشی پالیسی کی وضاحت کیلئے اسے مختلف طرح بیان کیا:

''یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ریاستی سرمایہ داری کی اصطلاح سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔اس سے بچنے کیلئے ہمیں یہ بنیادی بات یاد رکھنی چاہیے کہ ریاستی سرمایہ داری کی جو شکل ہمارے ہاں ہے اس کیلئے کوئی تھیوری نہیں اور نہ ہی کتابوں میں اس کا ذکر ہے جس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ اس اصطلاح سے متعلق تمام تصورات سرمایہ دارانہ سماج میں بورژوا حکمرانی سے منسلک ہیں۔ ہمارے سماج نے سرمایہ داری کی پٹڑی تو چھوڑ دی مگر ابھی کسی نئی پٹڑی پر نہیں چڑھا۔اس سماج میں ریاست پر بورژوازی کی نہیں بلکہ پرولتاریہ کی حکمرانی ہے۔ہم یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ جب ہم ''ریاست'' کہتے ہیں تو اس سے مراد ہم خود یعنی مزدور طبقے کا ہراول دستہ ہوتا ہے۔ریاستی سرمایہ داری ایسی سرمایہ داری ہے جس پر ہم قابو رکھ سکیں گے اور اس کی حدود کا تعین کر سکیں گے۔اس ریاستی سرمایہ داری کا تعلق ریاست سے ہے اور ریاست مزدور ہیں، مزدوروں کا ترقی یافتہ حصہ یعنی ہراول دستہ یعنی ہم، ریاست ہیں۔'' پھر اس نے وضاحت کی کہ مزدوروں کی ریاست کے پہلو بہ پہلو وجود رکھنے والی ریاستی سرمایہ داری ''کسانوں کی ضروریات کی تسکین کیلئے لازمی ہے اور اس کے بغیر وجود کو قائم رکھنا ناممکن ہے۔''

اس کے بعد لینن مسئلے کے بنیادی نکتے کی طرف آتا ہے، ''ہم ایک سال مزید گزار چکے ہیں، ریاست ہمارے ہاتھ میں ہے مگر کیا نئی معاشی پالیسی نے پچھلے سال اسی طرح کام کیا ہے جس طرح سے ہم چاہتے تھے؟ نہیں۔مگر ہم یہ تسلیم نہیں کر رہے کہ اس نے ہماری منشا کے مطابق کام نہیں کیا۔اس نے کیسے کام کیا؟ مشین نے اپنی رہنمائی کرنے والے ہاتھ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔اس کی حالت ایک ایسی کار کی سی تھی جو ڈرائیور کی مرضی کی سمت میں جانے کی بجائے کسی اور طرف جا رہی ہو گویا اسے کوئی پراسرار، غیر قانونی ہاتھ چلا رہے ہوں، کون جانے کس کے ہاتھ، شاید کسی منافع خور کے یا نجی سرمایہ دار کے، یا دونوں کے، جو کچھ بھی ہو یہ کار بہر حال اس سمت میں نہیں جا رہی جو ڈرائیور کے تصور میں ہے اور اکثر اوقات یہ ایک بالکل مختلف سمت میں چلنے لگتی ہے۔'' (31)

لینن پوچھتا ہے کہ ''پھر خامی کیا ہے؟ اگر ہم ماسکو کو لیں تو اس میں 4700 کمیونسٹ ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں اور ہم وسیع نوکر شاہانہ مشینری، اس وسیع و عریض ڈھیر کو دیکھیں تو ہمیں یہ ضرور پوچھنا چاہیے کہ کون کسے چلا رہا ہے؟ مجھے اس بات پر شبہ ہے کہ یہ کمیونسٹ ہیں جو اس کو ہدایات دے رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ ہدایات نہیں دے رہے بلکہ لے رہے ہیں۔'' (32)

لینن نے جس ''نیم ریاست'' کا تصور اپنی کتاب ''ریاست اور انقلاب'' میں پیش کیا تھا اس کی

بجائے ریاستی مشینری بیوروکریسی کے حوالے سے مسخ ہونے کے علاوہ پرانے نظام کے طبقاتی طرز فکر سے بہت بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔ اسی کانگریس میں لینن نے انتہائی واضح اور غیر مبہم زبان میں خارجی طبقات کے دباؤ کے نتیجے میں انقلاب کے انحطاط پذیر ہو جانے کے امکان کو بیان کیا۔ لینن نے سوویت مزدوروں کے نوکرشاہی اور سرمایہ داری کے حامی عناصر سے تعلقات کا موازنہ فاتح اور مفتوح قوم کے تعلقات سے کیا۔ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ ایک قوم کا دوسری قوم کو اسلحہ کے زور پر شکست دینا بذات خود فتح کی ایک معقول ضمانت نہیں ہے۔ کمزور سوویت مزدور طبقے کی ثقافتی پسماندگی کے مدنظر چھوٹے صاحب جائیداد لوگوں کے سمندر میں گھرے ہونے کے باعث بالشویکوں پر بے تحاشہ دباؤ تھا۔ اس کا عکس محض ریاست کے اندر ہی نہیں بلکہ ناگزیر طور پر بذات خود پارٹی کے اندر بھی نظر آتا تھا جو متصادم طبقاتی مفادات کی جدوجہد کا مرکز بن گئی تھی۔

''بعض اوقات ایک قوم دوسری کو فتح کر لیتی ہے جیتنے والی قوم فاتح اور ہارنے والی مفتوح ہوتی ہے۔ یہ سادہ سی بات ہے اور ہر کسی کی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن ان قوموں کی ثقافت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ یہاں چیزیں اتنی سادہ نہیں رہتیں اگر فاتح قوم ایک بہتر کلچر کی حامل ہو تو وہ مفتوح قوم پر اسے مسلط کر دیتی ہے لیکن اگر معاملہ اس سے الٹ ہے تو مفتوح قوم اپنی ثقافت فاتح قوم پر مسلط کر دیتی ہے۔ کیا اس سے ملتی جلتی حرکت آر ایس ایف ایس آر (سوویت یونین کی تخلیق سے پہلے فیڈریشن کا نام رشین سوشلسٹ فیڈرل سوویت ریپبلک تھا) میں واقع نہیں ہوئی؟ کیا یہ 4700 کمیونسٹ (تقریباً فوج کا ایک پورا ڈویژن اور سب کے ساتھ نہایت اعلیٰ) ایک خارجی ثقافت کے دائرہ اثر میں آ چکے ہیں؟'' پھر لینن ذرا تیکھے انداز میں پوچھتا ہے کہ ''کیا آر ایس ایف ایس آر اور روسی کمیونسٹ پارٹی کے ذمہ دار کمیونسٹ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ وہ انتظام نہیں کر سکتے، وہ صرف تصور کرتے ہیں کہ وہ ہدایات دے رہے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ ہدایات لے رہے ہیں؟''

پہلے ہی مہاجر بورژوازی کے دوراندیش حصے استریالوف کے گروہ سمیناویخ سے تعلق رکھنے والے، کھلم کھلا اپنی امیدیں سوویت سماج میں ظاہر ہونیوالے بورژوا نوکرشاہانہ رجحانات کے ساتھ وابستہ کر رہے تھے اور اسے سرمایہ داری کی بحالی کی طرف ایک قدم خیال کرتے تھے۔ اسی گروہ نے بعد ازاں ٹراٹسکی ازم کیخلاف سٹالنسٹوں کی جدوجہد کی حوصلہ افزائی کی۔ لینن اس سمیناویخ گروہ کی طبقاتی دور اندیشی کا قائل تھا جس نے بجا طور پر سٹالن اور ٹراٹسکی کے مابین ہونیوالی جدوجہد کو ''شخصیات'' کے تناظر

میں نہیں بلکہ ایک طبقاتی سوال اور اکتوبر کی انقلابی روایات کے حوالے سے پیچھے کی جانب ایک قدم سمجھا۔
''مشین اب ڈرائیور کے تابع نہیں رہی تھی''۔ ریاست اب کمیونسٹوں، مزدوروں کے کنٹرول میں نہیں رہی تھی بلکہ روز بروز خود کو سماج سے بالاتر کر رہی تھی۔ سمیناوخ کے نقطہ نظر کا حوالہ دیتے ہوئے لینن نے کہا ''ہمیں کشادہ دلی سے یہ بات ضرور تسلیم کر لینی چاہیے کہ استریالوف جن باتوں کے بارے میں ذکر کرتا ہے وہ ممکنات میں سے ہیں، تاریخ ہر قسم کی تبدیلیوں سے آگاہ ہے۔ سیاست میں عقائد کی مضبوطی، وفاداری اور دیگر اعلیٰ اخلاقی اقدار پر انحصار کوئی سنجیدہ رویہ نہیں ہے۔ چند لوگ شاندار اخلاقی اقدار کے حامل ہو سکتے ہیں لیکن تاریخی مسائل کا فیصلہ عوام کی وسیع اکثریت کرتی ہے اور اگر یہ چند لوگ انہیں مناسب نہ لگیں تو بعض اوقات یہ ان کے سلسلے میں زیادہ نرمی کا مظاہرہ نہیں کرتے۔'' (33) دوسرے لفظوں میں کمیونسٹوں کے ہاتھوں سے ریاستی اقتدار کا پھسلنا، ان کی ذاتی کمزوریوں یا نفسیاتی خامیوں کی غمازی نہیں کرتا تھا بلکہ اسکی وجہ پس ماندگی، نوکر شاہی اور خارجی طبقاتی قوتوں کا زبردست دباؤ تھا جو مٹھی بھر ترقی یافتہ، سوشلسٹ مزدوروں پر پڑ رہا تھا اور انہیں کچل رہا تھا۔

لینن کی اس دور کی خط و کتابت اور تحریریں، جبکہ بیماری اسے اس جدوجہد میں دخل اندازی کرنے کی اجازت نہیں دے رہی تھی، واضح طور پر اس خطرے کی نشاندہی کرتی ہیں جو وہ سوویت بیوروکریسی کے پھیلاؤ اور ریاستی مشینری کے ہر کونے میں گستاخ نودولتیوں کی موجودگی سے محسوس کرتا تھا۔ لینن سرمایہ داری میں گھری ہوئی مزدور ریاست کی زوال پذیری کے خطرات سے بخوبی آگاہ تھا۔ 1922ء کی گیارہویں پارٹی کانگریس کے بعد لینن کی صحت اور بگڑ گئی اور اسی سال مئی کے مہینے میں اسے دل کا پہلا دورہ پڑا۔ وہ صحت مند ہو کر جولائی میں چلنے پھرنے لگ گیا اور سرکاری طور پر اکتوبر میں کام پر واپس آ گیا۔ واپسی پر اسے یہ دیکھ کر شدید صدمہ ہوا کہ نوکر شاہی کا پھوڑا پارٹی اور ریاست کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ لینن نے ٹراٹسکی کے سامنے تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''ہمارا نوکر شاہی نظام بہت خوفناک ہے۔ کام پر واپس آنے کے بعد میں تو ہیبت زدہ ہو گیا تھا۔'' یہی وقت تھا جب لینن نے ٹراٹسکی کو ساتھ مل کر نوکر شاہی کیخلاف بالعموم اور تنظیمی بیوروکریسی کیخلاف بالخصوص ایک بلاک قائم کرنے کی پیش کش کی۔ لینن نے پارٹی لیڈرشپ کے مجموعی مسئلے پر توجہ مرکوز کی۔ جارجیا کے مسئلے پر سٹالن کے ساتھ جھڑپوں اور دوسرے معاملات نے سٹالن کے کردار کو رفتہ رفتہ ننگا کر دیا۔ لینن نے اپنی وصیت پر کام شروع کر دیا۔

30 دسمبر 1922ء کو اس نے ایک نوٹ لکھوایا۔

لینن پوچھتا ہے کہ ''کہا جاتا ہے کہ ہمیں ایک متحدہ ریاستی مشینری کی ضرورت تھی۔ یہ یقین دہانی کہاں سے آئی؟ کیا یہ اسی روسی مشینری نے نہیں کروائی تھی جس کے بارے میں میری ڈائری کے گزشتہ ابواب میں نشاندہی کی گئی ہے اور جسے ہم نے زارشاہی سے مستعار لے کر اس میں تھوڑا سا سوویت تیل ڈال دیا تھا؟''

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس اقدام کو اس وقت تک کیلئے التوا میں رکھنا چاہیے تھا جب تک ہم یہ کہنے کے قابل نہ ہو جائیں کہ یہ مشینری ہماری اپنی ہے۔ لیکن اب ہمیں لازمی طور پر ایمانداری سے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ جس مشینری کو ہم اپنا کہتے ہیں وہ درحقیقت ہمارے لئے ابھی تک اجنبی ہے۔ یہ ایک بورژوا اور زارشاہی ملغوبہ ہے اور پچھلے پانچ سالوں میں دوسرے ممالک کی امداد کے بغیر اس سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں ہو سکا ہے اور اس لئے بھی کہ ہم زیادہ تر فوجی مہمات اور قحط کے خلاف جنگ میں مصروف رہے ہیں۔'' (34)

لینن کو پارٹی کے اندر نوکر شاہانہ رجعت سے مکمل آگاہی 1922ء کے آخر میں اس وقت ہوئی جب اسے جارجیا کے بالشویکوں کے ساتھ تعلقات میں سٹالن کے رویے کے سلسلے میں سچائی کا پتہ چلا۔ نوکرشاہی کے اس جالے میں سٹالن کا مرکزی کردار واضح ہو گیا۔ لینن یا پولٹ بیورو (پارٹی میں سب سے اعلیٰ ادارہ) کے علم میں لائے بغیر سٹالن نے اپنے حاشیہ برداروں ڈزرزنسکی اور آرڈژونکیڈزی کے ساتھ مل کر جارجیا کی پارٹی میں کامیاب بغاوت برپا کی تھی۔ جارجیا کے بالشویکوں کا اعلیٰ ترین کیڈر نکال دیا گیا، پارٹی لیڈروں کی رسائی لینن تک نہیں ہونے دی اور سٹالن نے لینن کو کئی جھوٹی کہانیاں سنائیں۔ جب لینن کو آخر کار صحیح صورتحال کا پتہ چلا تو اسے شدید غصہ آیا۔ 1922ء کے اواخر میں اس نے بیماری کی حالت میں اپنے سٹینوگرافر کو ''خود مختاری کے بدنام زمانہ سوال پر جسے بظاہر سرکاری طور پر یونین آف سوویت سوشلسٹ ریپبلکس کا سوال کہا جاتا ہے'' کئی نوٹ لکھوائے۔ لینن کے نوٹ سٹالن اور اس کے حاشیہ برداروں کے نوکرشاہانہ اور خود پرستانہ تکبر کیخلاف تباہ کن فردِ جرم کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن لینن نے اس واقعے کو ایک حادثاتی مظہر خیال نہیں کیا، ایک افسوس ناک غلطی کے طور پر بلکہ روسی بیوروکریسی کی گھٹیا رجعتی قوم پرستی کا مظہر سمجھا۔ لینن نے گرجتے ہوئے کہا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویت مزدوروں کی نہایت قلیل شرح اس عظیم روسی قوم پرستی کی لہر میں یوں ڈوب جائے گی جیسے دودھ میں مکھی۔'' (35)

جارجیا والے معاملے کے بعد لینن نے اپنی اتھارٹی کو بھی اس جدوجہد کا حصہ بنا دیا جو سٹالن کو

پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدے سے ہٹانے کیلئے کی جارہی تھی۔ سٹالن نے یہ عہدہ کچھ ہی عرصہ پہلے سورڈلوف کی موت کے بعد سنبھالا تھا۔ تاہم لینن کو پہلے سے کہیں زیادہ بنیادی خوف اس بات کا تھا کہ اگر ان حالات میں لیڈرشپ میں کھلی پھوٹ پڑتی ہے تو پارٹی کہیں طبقاتی بنیادوں پر تقسیم نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس نے جدوجہد کو لیڈرشپ تک محدود رکھنے کی کوشش کی اور اسکے لکھے گئے نوٹ عوام تک نہیں پہنچے۔ لینن نے خفیہ طور پر جارجیا کے بالشویکوں کو لکھا (اس نے ٹراٹسکی اور کامینیف کو اس کی نقول بھیجیں) کہ میں ''پورے صدق دل سے'' سٹالن کیخلاف آپ کے مقصد میں آپ کے ساتھ ہوں۔ کیونکہ وہ جسمانی طور پر اس قابل نہیں تھا اس لئے اس نے ٹراٹسکی کے ذمے یہ کام سونپا کہ وہ سنٹرل کمیٹی میں جارجیا والوں کا دفاع کرے۔ لینن بار بار بیوروکریسی اور اس کی تخلیق سٹالن، کیخلاف جدوجہد میں ٹراٹسکی کی مدد کا طلب گار ہوا۔ بیرونی تجارت کی اجارہ داری، جارجیا کے سوال اور آخر کار سٹالن کو لیڈرشپ سے ہٹانے کی جدوجہد میں لینن نے ٹراٹسکی کے ساتھ مل کر بلاک بنایا کیونکہ ساری لیڈرشپ میں یہی شخص تھا جس پر وہ اعتماد کر سکتا تھا۔ لینن کی سٹالن کیخلاف جدوجہد بالشویک پارٹی کے اندر بیوروکریسی کیخلاف اس کی پرعزم جدوجہد سے منسلک تھی۔ وصیت لکھنے سے پہلے ''Better Fewer But Better'' میں لینن تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اسے واوین میں کہا جانا چاہیے کہ بیوروکریٹ ہمارے پارٹی دفاتر میں بھی موجود ہیں اور سوویت دفاتر میں بھی۔'' اسی میں وہ رابکرن پر شدید حملہ کرتا ہے جس سے اس کی مراد سٹالن تھا۔

''ہمیں واضح طور پر کہنا چاہیے کہ مزدوروں اور کسانوں کے معائنے کی عوامی وزارت کی اس وقت معمولی سی اتھارٹی بھی نہیں ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ کوئی بھی دوسرا ادارہ اس وقت زیادہ بدانتظامی کا شکار نہیں ہے اور موجودہ صورتحال میں اس عوامی وزارت سے کوئی توقع رکھنا بھی فضول ہے۔''(36)

لینن نے اپنی وصیت 25 دسمبر 1922ء کو لکھنا شروع کی جس میں اس نے بالشویک لیڈرشپ کی خوبیوں کا ناقدانہ جائزہ لیا ہے۔ اس میں اس کی آخری سفارشات شامل ہیں۔ ''سیکرٹری جنرل بننے کے بعد کامریڈ سٹالن نے اپنے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت جمع کر لی ہے اور میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اسے ہمیشہ احتیاط کے ساتھ استعمال کرنا بھی جانتے ہونگے۔'' اس کے بعد وہ ٹراٹسکی کی خوبیوں کا ذکر کرتا ہے ''دوسری طرف ٹراٹسکی، جیسا کہ مواصلات کی عوامی وزارت کے سوال سے متعلق سنٹرل کمیٹی کیخلاف اس کی جدوجہد سے ثابت ہوا تھا، وہ محض اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے باعث ہی نمایاں نہیں بلکہ اپنی

بہت زیادہ خود اعتمادی اور معاملات کے خالصتاً انتظامی پہلو پر بہت زیادہ توجہ کے باعث بھی وہ اس وقت سنٹرل کمیٹی میں سب سے قابل شخص ہے۔" دوسرے کے بارے میں "میں آپ کو صرف اتنا یاد دلاؤں گا کہ زینوویف اور کامینیف سے متعلق اکتوبر انقلاب والا واقعہ حادثاتی نہیں تھا مگر یہ کہ اسے ان کی ذات کیخلاف اسی قدر کم استعمال کیا جانا چاہیے جتنا ٹراٹسکی کیخلاف اس کا غیر بالشویک ماضی۔"

تاہم سٹالن کا حد سے بڑھا ہوا طاقت کا غلط استعمال لینن کو دس دن بعد یعنی 4 جنوری 1923ء کو یہ بات تحریر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ مکمل طور پر سٹالن کیلئے وقف ہے اور اس بار یہ براہ راست اور بے رحم ہے۔ "سٹالن بہت گستاخ ہے اور اگرچہ ہم کمیونسٹوں کے باہمی معاملات میں یہ خامی بہت حد تک قابل برداشت ہے مگر ایک سیکرٹری جنرل میں یہ نا قابل برداشت بن جاتی ہے۔ اسی وجہ سے میرا مشورہ ہے کہ کامریڈز سٹالن کو اس عہدے سے ہٹانے کے طریقے کے بارے میں سوچیں اور اس کی جگہ کسی اور شخص کو منتخب کریں جو ہر حوالے سے سٹالن سے مختلف ہو اور اسے یہ برتری حاصل ہو کہ وہ زیادہ برداشت رکھتا ہو، زیادہ وفادار ہو، زیادہ نرم مزاج ہو اور کامریڈز کا زیادہ خیال رکھتا ہو، متلون مزاج کم ہو۔"

دو ماہ بعد جب سٹالن نے اپنی زبان سے اس کی بیوی کرپسکایا کو گالیاں دیں تو لینن نے سٹالن کے ساتھ سیاسی اور ذاتی تعلقات منقطع کر لئے۔ دل کے آخری دورے سے دو دن پہلے اس نے سٹالن کو خط لکھا جس کی نقول اس نے زینوویف اور کامینیف کو بھی بھجوائیں، "میرے خلاف جو کچھ کیا گیا ہے میرا ارادہ اسے اتنی آسانی سے بھلانے کا نہیں ہے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جو کچھ میری بیوی کیخلاف کیا گیا وہ میں سمجھتا ہوں کہ میرے خلاف بھی کیا گیا ہے۔" 6 مارچ کو کرپسکایا نے کامینیف کو بتایا کہ لینن نے سٹالن کو "سیاسی طور پر ختم" کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ لینن نے کرپسکایا سے کہا کہ وصیت کو اس کی موت کے بعد تک خفیہ رکھا جائے اور پھر اسے پارٹی کے عام ارکان تک پہنچا دیا جائے۔ 9 مارچ 1923ء کو پڑنے والے دورے سے لینن بہت حد تک معذور ہو گیا۔ اقتدار موثر طور پر زینوئیف اور سٹالن کے ہاتھوں میں آ گیا۔ نو ماہ بعد 21 جنوری 1924ء کو لینن کا انتقال ہو گیا۔ یہ سٹالن کیلئے بہت اچھی بات تھی۔ اتحاد ثلاثہ ٹراٹسکی کو لیڈر شپ سے دور رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے تھا اس لئے انہوں نے لینن کی وصیت کو تالا لگا کر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بیورو کریسی اور سٹالن کیخلاف لینن کی آخری لڑائی کا دستاویزی ثبوت کئی عشروں تک دبا کر رکھا گیا اور بین الاقوامی طور پر کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے اسے جعل سازی قرار دیکر اسکی مذمت کی۔ لینن کی آخری تحریریں کمیونسٹ پارٹی کے عام ممبروں سے چھپائی گئیں۔ لینن کی

بیوہ کے احتجاجات کے باجود لینن کی وصیت کو کانگریس میں نہیں پڑھا گیا جس میں سٹالن کو ہٹانے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور یہ 1956ء تک پوشیدہ رہی جب خروشیف اینڈ کمپنی چند دوسری چیزوں کے ہمراہ اسے منظر عام پر لائے۔ یہ ان کی اس مہم کا حصہ تھا کہ جو کچھ پچھلے تیس سالوں میں ہوا تھا اسے سٹالن کے کندھوں پر ڈال دیا جائے۔ لینن کی موت کے بعد بڑھتے ہوئے نوکر شاہی ردانقلاب کیخلاف جدوجہد کا کام ٹراٹسکی اور لیفٹ اپوزیشن کے ذمے آن پڑا۔

نوکرشاہانہ رجعت

مزدور طبقے کی ہر بین الاقوامی پسپائی اور اس کی وجہ سے روسی پرولتاریہ میں پھیلنے والی مایوسی کے ساتھ ساتھ سوویت یونین میں نوکر شاہی رجعت ایک خطرناک شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ سال ہا سال کی خانہ جنگی سے نڈھال اور تباہ، کمزوری، محرومی اور مایوسی کے شکار روسی پرولتاریہ کے لئے عوام کی خوفناک پسماندگی اور کمتر ثقافتی معیار ایک ناقابل عبور رکاوٹ ثابت ہوئے۔ بیوروکریسی نے اس تھکاوٹ اور خاص طور سے پرانی نسل میں بڑھتے ہوئے شک وشبے کے موڈ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ زیادہ تر زار شاہی کی باقیات پر مشتمل اہلکاروں کے اس گروہ میں نئی جان پڑ گئی اور اسے اپنی آزادی، اہمیت اور قوت کا زیادہ ادراک ہونے لگا۔

سیاسی زندگی میں عوام کی کم ہوتی ہوئی شرکت نے اس عمل کو مزید تقویت دی۔ جلد ہی بیوروکریسی نے اپنے خیالات، احساسات اور مفادات کو ظاہر کر دیا۔ اسے عالمی انقلاب سے دست برداری اور استحکام کی خواہش بے چین کر رہی تھی۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے:

''رفتہ رفتہ عوام کو ہر طرف سے ملک کی لیڈرشپ میں حقیقی شرکت سے دور دھکیلا جا رہا تھا۔ پرولتاریہ کے اندر رجعت کے باعث قصبوں اور دیہاتوں کے پیٹی بورژوا عناصر میں غیر معمولی امید اور اعتماد پیدا ہو گیا جو کہ نئی معاشی پالیسی کے طفیل نئی زندگی سے روشناس ہوئے تھے اور اب وہ زیادہ دلیر ہوتے جا رہے تھے۔ پہلے پہل پرولتاریہ کی ایجنٹ کے طور پر ابھرنے والی نوخیز بیوروکریسی خود کو مختلف طبقات کے درمیان مصالحت کروانے والا دربار سمجھنے لگی۔ ماہ بہ ماہ اس کی آزادی بڑھتی گئی۔ عالمی صورتحال بھی اسے زبردست قوت کے ساتھ اسی سمت میں دھکیل رہی تھی۔ عالمی مزدور طبقے پر لگنے والی

ضربوں کے ساتھ ساتھ اس سوویت بیوروکریسی کی خوداعتمادی میں اضافہ ہوتا گیا۔ان دونوں حقائق کے درمیان تعلق دوسمتوں میں عمل کرتا تھا۔ بیوروکریسی کے لیڈر پرولتاریہ کی شکستوں کوفروغ دیتے تھےاور یہ شکستیں بیوروکریسی کوفروغ دیتی تھیں۔''(40)

1923ء کے جرمن انقلاب کی شکست کے بعد بلغاریہ اوراسٹونیا کی شکستوں سے روسی پرولتاریہ کے مورال کوزبردست دھچکالگا۔اس کے نتیجے میں روسی ریاست مزید کچھ عرصہ کیلئے معاشی اورسیاسی تنہائی کا شکار ہوگئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے اندر عام ممبروں کی آزادی اور پہل کاری کا گلا بیوروکریسی کے ''کمانڈازم'' کے ذریعے ہرسطح پر دبایا جارہا تھا۔نامزداہلکارمنتخب نمائندوں کی جگہ لے رہے تھے۔ٹراٹسکی نے اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے لیفٹ اپوزیشن تشکیل دی جسے لینن نے بیوروکریسی کیخلاف جدوجہد کی ترغیب دی تھی۔ان کے مطالبات کا مرکزومحور پارٹی کے اندرمزدوروں کی جمہوریت کی بحالی اورایک قومی منصوبے کے تحت صنعت اورزراعت میں ہم آہنگی تھی۔ان تصورات کوفوراً ہی زینوویف،کامینیف اور سٹالن کے اکثریتی ٹولے کی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ٹراٹسکی نے بالشوازم کے دفاع کیلئے جوقدم اٹھایا تھاحکمران مشینری نے گالیوں اورطنز کے تیروں سے اس کا استقبال کیا۔

1924ء کے آغاز میں لینن کی وفات سے روسی مزدوروں کے مورال کوایک اور دھچکا لگا۔ کچھ تاریخ دانوں کا خیال ہے اگرلینن مزید کچھ عرصہ زندہ رہتا توروس میں صورتحال بالکل مختلف ہوتی۔لیکن لینن اگرمزید زندہ بھی رہتا تواس سے کوئی بنیادی فرق نہ پڑتا۔لینن کی زبردست عزت وشہرت سیاسی رد انقلاب کوروکنے کیلئے ناکافی ثابت ہوتی۔1926ء میں ہی لینن کی بیوہ کرپسکایا نے لیفٹ اپوزیشن کی ایک میٹنگ میں کہہ دیا تھا کہ''اگرایلیچ (لینن) آج زندہ ہوتا توغالباً جیل پہنچ چکا ہوتا۔''اس وقت ایسا کہنا غالباًقبل ازوقت تھا۔اگرلینن کچھ سال اورزندہ رہتا توزوال پذیری کے عمل میں تاخیر ہوجاتی اورواقعات ذرامختلف انداز میں رونما ہوتے۔لیکن جب تک انقلاب خوفناک پس ماندگی کے حالات میں الگ تھلگ رہتا بنیادی عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔اس میں کچھ شک نہیں کہ لینن بیوروکریسی کے خلاف شدومد سے لڑتا مگر یہ سب کچھ ردانقلاب کوشکست دینے کیلئے کافی نہ ہوتا۔صرف دوسری جگہوں میں انقلاب کی کامیابی جوتنہائی کوختم کرکے روسی عوام میں انقلابی جوش و جذبہ دوبارہ بحال کرتی بیوروکریسی کا راستہ روکنے میں کامیاب ہوسکتی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ لینن تیسرے دورے کے بعدبچ نہیں سکا جس نے اسے موت سے پہلے نوماہ کیلئے بالکل معذورکردیا تھا۔

کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ سٹالنزم کیخلاف جدوجہد کرنیوالوں کے مقدر میں ہی شکست تھی؟ سوال کو اس طرح سے پیش کرنا تجریدی، قیاسانہ اور تقدیر پرستانہ ہوگا۔ سٹالنزم کا ظہور زندہ قوتوں کی جدوجہد تھا جس کے نتیجے کا تعین قبل از وقت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ٹراٹسکی اور لیفٹ اپوزیشن کو یقیناً احساس تھا کہ طاقت ور معروضی قوتیں سٹالنسٹ بیورکریسی کے حق میں تھیں۔ تاہم ان کا رویہ تقدیر پرستی پر مبنی نہیں تھا۔ ہر شے کا انحصار عالمی صورتحال پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ ٹراٹسکی نے واضح کیا تھا کہ "جدوجہد کے ارتقا سے بلاشبہ اس امر کی تصدیق ہوئی کہ بالشویک عالمی انقلاب کی مدد کے بغیر سوویت یونین میں ایک مکمل فتح یعنی اقتدار کا حصول اور بیوروکریسی کے ناسور کا خاتمہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔" (41) یہی وجہ ہے کہ اپوزیشن نے برطانیہ، چین اور دوسرے ممالک میں درست مارکسی پالیسی کیلئے جدوجہد کی۔

لینن کی شدید بیماری اور بعدازاں اس کی موت سے اقتدار موثر طور پر سٹالن، زینوویف اور کامینیف کی ٹرائیکا کے ہاتھوں میں آ گیا۔ حقیقت میں اقتدار کی باگ ڈور پہلے ہی سٹالن کے پاس تھی کیونکہ پارٹی کے سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز ہونے کے باعث مشینری پر اسے مکمل تنظیمی غلبہ حاصل تھا۔ اس ٹرائیکا نے سازش کے ذریعے ٹراٹسکی کو لینن کی جگہ لینے سے محروم کردیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر وصیت کو دبایا جس میں براہ راست سٹالن کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس کا ایک اور عامل لینن کی وفات کے بعد ناپختہ کار اور ناتجربہ کار نئے ارکان کی پارٹی میں شمولیت تھی۔ یعنی نام نہاد لینن لیوی۔ اس سے پارٹی کا انقلابی مرکز سیاسی لحاظ سے پسماندہ عناصر کے سمندر میں ڈوب گیا یہ لوگ اہلکاروں کے ہاتھوں میں نرم مٹی کی طرح تھے اور جنہیں سٹالن کی مشینری نے چنا تھا۔ اس مشینری کی فتح کی اولین شرط یہ تھی کہ پارٹی کی پرانی قیادت کو تنہا اور کمزور کیا جائے۔ یہ بتا دینا کافی ہوگا کہ پارٹی کی ممبر شپ کا 75-80 فیصد حصہ 1923ء کے بعد بھرتی کیا گیا تھا۔ انقلاب سے پہلے خدمات سرانجام دینے والے پارٹی اراکین کی شرح ایک فیصد سے بھی کم تھی۔

اس کے ساتھ ساتھ ٹراٹسکی کیخلاف بہتان تراشی اور دروغ گوئی کی ایک مہم شروع کی گئی۔ اس کے مقابلے میں ٹراٹسکی نے اکتوبر کے اسباق نامی کتاب شائع کی جس میں جرمن انقلاب کی ناکامی کی وجوہات کا جائزہ لیا گیا تھا اور لیڈرشپ کی غلطیوں پر اس کی خاص ذمہ داری ڈالی گئی تھی۔ ایسا کرتے وقت ٹراٹسکی نے اس کا موازنہ جو کچھ روس میں اکتوبر 1917ء میں ہوا تھا اس سے کیا اور زینوویف اور دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے کامینیف کے تذبذب کا ذکر کیا جو دونوں کے دونوں بغاوت شروع کرنے

کیخلاف تھے (اگر چہ اس نے نام لے کران کا ذکر نہیں کیا)۔ یہ اہم اسباق ''ٹراٹسکی ازم'' کیخلاف مہم میں دب گئے۔ ٹراٹسکی کے غیر بالشویکی ماضی (جسے لینن نے اپنی وصیت میں معاف کر دیا تھا) ''مسلسل انقلاب'' برسٹ لٹووسک کا معاہدہ وغیرہ جیسی باتوں کو حکمران ٹولے نے کھوج نکالا اور اسے لیڈر شپ سے محروم رکھنے اور بدنام کرنے کیلئے استعمال کیا۔ ٹراٹسکی کیخلاف تحریری مواد کا دریا بہادیا گیا اور سٹالن، زینوویف اور کامینیف کو لینن کی پرانی رفاقت کی حیثیت سے تقویت دی گئی، ٹراٹسکی ازم یا لینن ازم (سٹالن) لینن ازم یا ٹراٹسکی ازم (کامینیف) اور بالشوازم یا ٹراٹسکی ازم (زینوویف)۔ بعد ازاں ٹراٹسکی کو جنوری 1925ء میں عوامی وزیر جنگ کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ ٹراٹسکی ازم کیخلاف مہم کو بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں تک پھیلایا گیا جہاں روسی پارٹی کی اکثریتی لیڈر شپ کی حمایت میں ووٹوں کا تقاضا کیا گیا۔

جدلیاتی مادیت کا اس قسم کی میکانکی سوچ سے کوئی تعلق نہیں جو تاریخ کو ایک سادہ اور سیدھی لکیر میں چلنے والا عمل سمجھتی ہے۔ یہ نقطہ نظر کالونزم جیسے مذہبی فلسفے سے زیادہ قریب ہے جو قضاوقدر کے نظریے کو تسلیم کرتا ہے۔ فطرت کی طرح تاریخ میں بھی حادثات ایک کردار ضرور ادا کرتے ہیں مگر جیسا کہ ہیگل نے نہایت شاندار انداز میں واضح کیا تھا کہ ضرورت اکثر و بیشتر اپنا اظہار حادثات کی شکل میں کرتی ہے۔ پارٹی کا راستہ بدلنے کیلئے اکیلے ٹراٹسکی کی کوششیں ناکافی تھیں۔ اس کے مقابلے پر زینوویف، کامینیف، بخارین اور سٹالن پر مشتمل رولٹ گارڈ تھی۔ مساوات میں اس نے بھی ایک مخصوص کردار ادا کیا۔ مارکسزم تاریخ میں فرد یا حادثات کے کردار سے انکار نہیں کرتا۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ افراد زبردست کردار ادا کر سکتے ہیں جو اچھا بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔ کامینیف اور بالخصوص زینوویف نے لینن کی موت کے بعد رجعت کی طرف رجحان میں اہم کردار ادا کیا۔ یہاں ذاتی محرکات نے اہم کردار ادا کیا۔ کئی سال تک لینن کے قریب رہ کر کام کرنے کی وجہ سے زینوویف کا خیال تھا کہ لینن کی جگہ اسے ملنی چاہیے۔ جاہ طلب ہونے کے علاوہ وہ ٹراٹسکی سے حسد بھی کرتا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس نے لینن کی وفات سے بھی پہلے ایک متوازی لیڈر شپ قائم کر لی تھی جس میں ٹراٹسکی کے علاوہ پولٹ بیورو کے تمام اراکین شامل تھے۔ ایسے طریقے استعمال کرتے ہوئے جو بالشوازم کے لئے قطعاً اجنبی تھے اس نے ٹراٹسکی کو بدنام کرنے کیلئے سازشوں اور ہیرا پھیریوں کا سہارا لیا اور لینن ازم اور اس کے درمیان دیوار کھڑی کر دی۔

لینن کی وفات کے بعد ٹراٹسکی ازم کا قصہ ایجاد کر کے زینوویف اور کامینیف نے ایک ایسا تباہ کن

کردار ادا کیا جس سے مزدوروں کے ذہنی انتشار اور مایوسی میں مزید اضافہ ہوا۔ دونوں میں سے کسی نے حقیقی عوامل کے بارے میں کسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ سٹالن کو اوزار کے طور پر استعمال کر رہے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ خود استعمال ہو رہے تھے۔ اس طرح غیر شعوری طور پر کامینیف اور زینوویف نے بالشویک پارٹی اور بذات خود اپنے اوپر سٹالن کے فتح پانے کی راہ ہموار کر دی۔ وہ خود کو سٹالن سے برتر سمجھتے تھے اور اگر ذہنی و اخلاقی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس میں حق بجانب بھی تھے۔ لیکن سٹالن کی طاقت کا دارومدار اس کی ذہنی صلاحیتوں پر نہیں بلکہ اس حقیقت پر تھا کہ وہ ان لاکھوں سرکاری اہلکاروں کے دباؤ اور مفادات کی عکاسی کرتا تھا جو طاقت کے حصول کیلئے پاگل ہو رہے تھے۔ اس جدوجہد میں کامینیف اور زینوویف کی وہی خوبیاں جو پہلے کبھی ان کی قوت ہوا کرتی تھیں اب ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن گئی تھیں یعنی انقلاب پر ان کا یقین اور مزدوروں کے آدرش سے وفاداری۔ ان سے علیحدگی کے وقت تک سٹالن ایسی باتوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ خالصتاً ذاتی خواہشات اس کو تحریک دے رہی تھیں لیکن کامینیف اور زینوویف کی طرح اس کے کندھوں پر اصولوں کا بوجھ نہیں تھا۔ اس نے بلا تردد پہلے پارٹی بیوروکریسی کو اپنی بنیاد بنایا جس پر اسکا غلبہ تھا اور بعد ازاں ان لاکھوں پرانے زار شاہی اہلکاروں کا چیمپئن بن گیا جو سوویت ریاست کے حفاظتی خول کے نیچے سرگرم عمل تھے۔

یہ عمل بالآخر پرانے بالشویکوں کے قتل عام پر منتج ہوا جو انقلاب اور لینن کی پارٹی کو تباہ ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس طرح سٹالن نے بالشویک پارٹی کیخلاف جلاد کا کردار ادا کیا۔ تاہم اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ اگر سٹالن موجود نہ ہوتا یا وہ بیوروکریسی کے مفادات کیلئے کام کرنے سے انکار کر دیتا تو یہ ہوتا کہ اسے ہٹا کر کسی دوسرے کو اس کی جگہ دے دی جاتی۔

اس مخصوص صورتحال میں بخارین کے گروہ کی فتح کم و بیش یقینی تھی۔ اس وقت بھی اس کا مطلب سرمایہ داری کی بحالی کی فتح ہوتا۔ بعد ازاں سٹالن کو بدحواسی کے عالم میں لیفٹ اپوزیشن کی بہت سی پالیسیوں کو مسخ شدہ شکل میں اپنانے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے بغیر شہروں میں نئی اقتصادی پالیسی کے نتیجے میں جنم لینے والے نو دولتیوں اور دیہات میں کولاکوں کے دباؤ کا نتیجہ نظام کا تختہ الٹے جانے کی صورت میں نکلتا۔ مزدور طبقے نے نئی پالیسی کا استقبال نہایت جوش و خروش سے کیا تاہم ان کی اکثریت غیر متحرک رہی۔ نوکر شاہی نے ڈی کلا کائزیشن یعنی کولاکوں کے خاتمے کیلئے غنڈہ گردی کا طریقہ استعمال کیا اور ساتھ ہی ساتھ خود کو محفوظ رکھنے کیلئے لیفٹ اپوزیشن کیخلاف بھی ضربیں لگائیں۔

سٹالن کے ساتھ اتحاد کے دور میں کامینیف اور زینوویف شعوری طور پر ان عوامل سے آگاہ نہیں تھے جو روسی ریاست میں وقوع پذیر ہو رہے تھے اور جنہیں وہ نادانی میں ہوا دے رہے تھے۔ اس وقت نہ تو انہیں خود احساس تھا کہ ٹراٹسکی اور ٹراٹسکی ازم پر ان کے حملے انہیں کس سمت لے جائیں گے اور نہ ہی سٹالن کو۔ لیکن ٹراٹسکی ازم اور لینن ازم کے درمیان دیوار کھڑی کرنے کی کوشش میں انہوں نے تاریخی دروغ گوئیوں اور بیوروکریسی کے ذریعے مخالفین کو دق کرنے کے جس عمل کا آغاز کیا وہ اکتوبر انقلاب کے تصورات وروایات سے دوری اور سٹالن کی خوفناک نوکرشاہانہ پولیس سٹیٹ کے قیام کی طرف ایک فیصلہ کن قدم ثابت ہوا۔ اس طرح انہوں نے غیر شعوری طور پر ان عوامل پر عمل درآمد کرنیوالوں کا کردار ادا کیا جو ان کے کنٹرول اور سمجھ بوجھ سے باہر تھے۔

سٹالن کے ذہن میں بھی اپنی منزل کے بارے میں کوئی شعوری منصوبہ موجود نہیں تھا۔ وہ ان عوامل کو دیکھنے سے بالکل عاری تھا جو وقوع پذیر ہو رہے تھے۔ ٹراٹسکی نے بھی تطہیری مقدمات کے موقع پر کہا تھا کہ ''اگر سٹالن کو اس امر کا ادراک ہوتا کہ ٹراٹسکی ازم کیخلاف جدوجہد اس کو کہاں لے جائیگی تو وہ بلاشبہ اس سے ہاتھ کھینچ لیتا باوجود اس بات کے کہ اسے اپنے مخالفین کی شکست کا امکان نظر آرہا تھا۔ لیکن وہ کسی بھی پیش بینی سے قاصر تھا۔'' (42) سٹالن ایک نہایت محدود منتظمانہ ''عملی'' ذہنیت کا مالک اور ابھرتی ہوئی سوویت بیوروکریسی کی ریاست، صنعت اور پارٹی میں موجود اس پرت کے دباؤ کی عکاسی کرتا تھا جسے انقلاب کے بعد خاطر خواہ فوائد حاصل ہوئے تھے اور اب وہ ہیجان کے اس دور کو ختم کر کے سماج کو منظم کرنا چاہتی تھی جس میں اسے ایک افضل اور آرام دہ حیثیت حاصل ہو۔

اس پرت کیلئے عالمی سوشلسٹ انقلاب کا تصور ایک غیر ضروری کوفت کی حیثیت رکھتا تھا۔ جرمن اور برطانوی تو ایک طرف انہیں روسی مزدور طبقے پر بھی کوئی یقین نہیں تھا۔ سٹالن نجی طور پر ان کا ہم خیال تھا اگرچہ لینن کی زندگی میں اسے کھلم کھلا اس کا اظہار کرنے کی کبھی جرات نہ ہوتی۔ 1924ء کے موسم خزاں میں سٹالن نے پہلی دفعہ جس مارکسزم مخالف تھیوری ''ایک ملک میں سوشلزم'' کو پیش کیا وہ ان تمام نظریات کی نفی تھی جو بالشویک اور کمیونسٹ انٹرنیشنل پیش کرتی رہی تھی۔ کسی ایک ملک میں قومی سوشلزم کی تعمیر کس طرح ممکن تھی اور پھر روس جیسے انتہائی پسماندہ ملک میں؟ اس قسم کا خیال بشمول سٹالن کے 1924ء تک کسی بالشویک کے ذہن میں نہیں آیا۔ اپریل 1924ء میں سورڈلوف یونیورسٹی کے طالب علموں کے سامنے ایک تقریر کرتے ہوئے، (جسے بعد ازاں لینن ازم کی بنیادیں کے نام سے شائع کیا گیا) سٹالن

نے کہا کہ ''کسی ایک ملک میں بورژوازی کا تختہ الٹنے اور پرولتاریہ کی حکومت کے قیام سے سوشلزم کی مکمل فتح کی ضمانت فراہم نہیں ہوتی۔ سوشلزم کے بنیادی فریضے یعنی سوشلسٹ پیداوار کی تنظیم کا پورا کرنا ابھی باقی ہے۔ کیا کئی ترقی یافتہ ممالک میں سوشلزم کی فتح کا حصول ممکن ہے؟ نہیں یہ ناممکن ہے۔۔۔ سوشلزم کی آخری فتح کے لئے سوشلسٹ پیداوار کی تنظیم کیلئے، ایک ملک کی کوششیں اور خاص طور پر روس جیسے کسانوں پر مشتمل ملک کی صورت میں یہ ناکافی ہیں۔'' (43)

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس میں بالشویک پارٹی کی عام پوزیشن کا درست اظہار کیا گیا ہے تاہم چند ماہ بعد شائع ہونیوالے دوسرے ایڈیشن میں ان سطروں کو ختم کر کے ان کی جگہ اس کے بالکل الٹ بات لکھ دی گئی، ''لیکن ایک ملک میں بورژوازی کے اقتدار کا تختہ الٹے جانے اور پرولتاریہ کے اقتدار کے قائم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ سوشلزم کی مکمل فتح یقینی ہوگئی ہے۔ اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے بعد کسانوں کو اپنی رہنمائی میں ساتھ لے کر چلتے ہوئے فاتح ملک کا پرولتاریہ ایک سوشلسٹ سماج تشکیل کر سکتا ہے اور اسے ضرور تشکیل کرنا چاہیے۔'' (44)

متحدہ حزب مخالف

زینوویف اور کامینیف کو، جو پہلے ہی سٹالن کی بڑھتی ہوئی طاقت، بدتمیزی اور بے وفائی سے پریشان تھے، اس نئے انکشاف سے سخت صدمہ پہنچا۔ ایک سال کے اندر اندر وہ سٹالن کو چھوڑ کر لیفٹ اپوزیشن میں شامل ہوگئے۔ پارٹی کی بالائی سطح پر نئے سرے سے ہونیوالی اس صف بندی کا باعث کولاکوں اور نئی معاشی پالیسی کے تحت کاروبار کرنیوالوں کو دولتمند بنانے کی پالیسی کیخلاف لینن گراڈ کے مزدوروں کا دباؤ تھا۔ زینوویف اور کامینیف نے بعد میں اعتراف کیا کہ ٹراٹسکی ازم کی داستان ٹراٹسکی کو بدنام کرنے کیلئے جان بوجھ کر اختراع کی گئی تھی۔ خالصتاً بوناپارٹسٹ انداز میں لیفٹ اپوزیشن پر حملے کیلئے سٹالن نے بخارین اور ٹامسکی کے دائیں بازو کا سہارا لیا۔ لیفٹ اپوزیشن نے انقلاب کے بنیادی تصورات کو قائم رکھنے کیلئے پارٹی کے اندر بڑھتے ہوئے نوکر شاہانہ ردانقلاب کے خلاف جرات مندانہ جدوجہد کی۔ انہوں نے نہ صرف پارٹی کے اندر جمہوریت کی بحالی کیلئے جنگ لڑی بلکہ سوویت معیشت کی پیداواری صلاحیت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کیلئے ایک معاشی منصوبے کے حق میں بھی بحث کی۔ اپوزیشن اس بات کو سمجھ

چکی تھی کہ صنعت ماضی سے ورثے میں ملی ہوئی مشینری پر انحصار جاری نہیں رکھ سکتی بلکہ اسے قومی منصوبہ بندی کے ذریعے سوشلسٹ ارتکاز پیداوار کی بنیاد پر ویسے کرنے کی ضرورت ہے۔ اس قسم کے منصوبے سے مغربی سرمایہ داری کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار شرح پیداوار کا حصول ممکن تھا۔ لیکن سٹالن کی لیڈر شپ نے نہایت احتیاط سے آگے بڑھنے کو ترجیح دی اور اپوزیشن لیڈروں پر سپر انڈسٹر یلائز رہونے کا الزام لگایا۔

سٹالن نے اپوزیشن کی تجاویز کا نوٹنکی جواب پانچ سالہ منصوبے کے ایک قنوطی مسودے کی شکل میں دیا جو 1927ء میں شائع کی گیا۔ صنعتی پیداوار میں اضافے کا تخمینہ نو فیصد شرح سے کم کر کے چار فیصد شرح تک لانے کا تھا اپوزیشن کی طرف سے شدید تنقید کے بعد منصوبے میں ترمیم کر کے اسے نو فیصد سالانہ پر لایا گیا مگر یہ اپوزیشن کے پندرہ اور اٹھارہ فیصد شرح اضافہ کے مقابلے میں اب بھی بہت کم تھا۔ سٹالن نے ٹراٹسکی اور اپوزیشن کو سپر انڈسٹر یلائزر کہہ کر ان پر حملے جاری رکھے۔ اپریل 1927ء تک وہ سنٹرل کمیٹی میں یہ دلائل دیتا رہا کہ ڈیسپر سٹرائے پن بجلی گھر کی تعمیر اسی طرح ہے جیسے کسی کسان سے کہا جائے کہ وہ گائے خریدنے کی بجائے گراموفون خرید لے! حکمران ٹولے کی کولاک کیلئے حمایت کی پالیسی اور مارکیٹ پر انحصار شہر اور دیہات کے درمیان بڑھتی ہوئی تفریق کی جانب لے جا رہا تھا۔ نپ مین اور کولاکوں کی بڑھتی ہوئی قوت اور اثر ورسوخ خطرناک حدود کو پہنچ رہا تھا۔ سرمایہ داری کا ابھار ہر جانب آ رہا تھا یہ خارجی طبقاتی دباؤ پہلے ہی کمیونسٹ پارٹی کی لیڈر شپ کے درمیان جدوجہد کے آغاز کا باعث بن چکے تھے۔ بخارین، رائیکوف اور ٹامسکی پر مشتمل دایاں بازو کولاکوں کو مزید مراعات دینا چاہتا تھا۔ سٹالن پولٹ بیورو میں مختلف دھڑوں کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے ان سوالوں پر سنٹرسٹ پوزیشن لیتا تھا اور حمایت کیلئے کبھی دائیں بازو کا سہارا لیتا تھا اور کبھی بائیں بازو کا۔ لیفٹ اپوزیشن کیخلاف جدوجہد میں اس نے بخارین اور دائیں بازو کا سہارا لیا۔ 1925ء میں سٹالن نے زمین کی نجکاری کی تیاری بھی شروع کر دی تھی۔ بخارین جس نے اپریل 1925ء میں کسانوں کو "امیر بننے" کا مشورہ دیا تھا ان امیر کولاکوں کو ارتقا پا کر سوشلزم میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک کسان ماڈل پر سوار ہو کر سوشلزم میں داخل ہونے کے بارے میں گفتگو کرتا تھا۔ ٹراٹسکی اور لیفٹ اپوزیشن نے اس پالیسی کی سخت مخالفت کی جو روس میں سرمایہ داری کی بحالی کا باعث بن سکتی تھی اور اس کی بجائے زراعت کے شعبے میں رضا کارانہ اجتماعی کاشتکاری اور صنعتی منصوبہ بندی کی پالیسی کی وکالت کی۔

لیڈر شپ کی امیدوں کے برخلاف کولاکوں نے سوشلزم کی بجائے سرمایہ دارانہ رد انقلاب کی راہ اپنالی۔ 1926ء کے موسم بہار کے اناج کی فروخت کا ساٹھ فیصد حصہ چھ فیصد کولاکوں کے قبضے میں تھا اور 1928ء کے آغاز تک کولاکوں کے اناج کی ترسیل روکنے کے باعث شہروں میں قحط کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ ایلک نووی کے مطابق،''اناج کے حصول میں کمی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ جنوری 1928ء تک ریاست صرف 300 ملین پوڈ خریدنے میں کامیاب ہوسکی جبکہ گزشتہ برس اس وقت تک 428 ملین پوڈ کی خریداری ہوئی تھی۔''(45)ایک ناگزیر بحران کو آتے دیکھ کر سارا نظام اپنی بنیادوں تک ہل گیا۔ ہر شہر اور قصبے کو غذائی محاصرے کا سامنا تھا۔ کولاک زبردست قوت حاصل کر چکے تھے اور اب اس قوت کو نظام کا تختہ الٹنے کیلئے استعمال کرنے کا تہیہ کئے ہوئے تھے۔

7نومبر 1927ء کو اکتوبر انقلاب کی دسویں سالگرہ کے موقع پر متحدہ اپوزیشن(متحدہ اپوزیشن 1926ء میں ٹراٹسکی کی لیفٹ اپوزیشن اور کامینیف اور زینوئیف کے حامیوں کے اتحاد سے تشکیل پائی) نے مارچوں اور مظاہروں میں مداخلت کی۔ ان کے بینروں پر یہ نعرے درج تھے، ''کولاک،نپ مین اور بیوروکریٹوں کیخلاف اقدامات کرو''،''لینن کی وصیت پرعملدرآمد کرو''اور''موقع پرستی مردہ باد''۔لینن گراڈ کے مزدوروں نے ٹراٹسکی اور دوسرے اپوزیشن لیڈروں کا زبردست استقبال کیا اور نوکر شاہانہ لیڈر شپ کیخلاف عدم اطمینان کا اظہار کیا۔ مزدور اور نوجوان اپوزیشن کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے مگر وہ تھکن اور مایوسی کا شکار تھے۔ جلد متاثر ہو جانے والے زینوویف کو ٹراٹسکی نے خبردار کیا جو اس علامت سے یہ سمجھتا تھا کہ صورت حال بدل گئی ہے کہ اس ہمدردی کا یہ مطلب نہیں کہ عوام میدان عمل میں کودنے کیلئے تیار ہیں۔ اس کے برعکس اس مظاہرے نے حکمران ٹولے کو یقین دلایا کہ اپوزیشن کیخلاف فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ ایک ہفتے بعد الزام تراشیوں کی شدید مہم کے بعد ٹراٹسکی، زینوویف، کامینیف، راکوفسکی، سملگا اور یفدوکینوف کو سنٹرل کمیٹی سے نکال دیا گیا۔ دسمبر میں تمام لیفٹ اپوزیشن کو کمیونسٹ پارٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ان لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے جو سیاسی پیش منظر اور عزت نفس سے محروم تھے۔ زینوویف کے پیروکار اپوزیشن چھوڑ گئے۔ نشان راہ کھو کر اور کم ہمتی کا شکار ہو کر زینوویف اور کامینیف نے سٹالن کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کے برعکس ٹراٹسکائیٹس نے جھکنے سے انکار کر دیا۔

لیفٹ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے لاکھوں افراد کو ملازمتوں سے نکالا گیا ان کے خاندانوں کو

ہراساں کیا گیا اور دیس نکالا دیا گیا۔ اب اپوزیشن کیخلاف جبر وتشدد کی مہم کا صحیح معنوں میں آغاز ہو گیا۔ کامینیف چونکہ سٹالن کو بہت اچھی طرح سے جانتا تھا اس لئے سٹالن سے علیحدگی کے بعد اس نے ٹراٹسکی کو خبردار کیا تھا کہ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ سٹالن اس وقت ہماری تنقیدوں کا بہترین انداز میں جواب دینے کے بارے میں سوچ رہا ہوگا؟ تم غلطی پر ہو۔ وہ سوچ رہا ہے کہ تمہیں تباہ کرنے کا بہترین طریقہ کونسا ہوگا۔ پہلے اخلاقی طور پر اور اگر ممکن ہو سکے تو جسمانی طور پر تم پر بہتان طرازی کر کے، کوئی جعلی جارحیت منظّم کر کے، فوجی سازش کا الزام لگا کر یا دہشت گردی کا ارتکاب کر کے۔ مجھ پر یقین کرو، میں اندازے سے کام نہیں لے رہا۔ اتحادِ ثلاثہ کے دوران ہمیں کئی بار ایک دوسرے سے بے تکلف ہونے کے مواقع میسر آئے تھے اگرچہ اس وقت بھی ہمارے ذاتی تعلقات ایک سے زیادہ مرتبہ ختم ہوتے ہوتے بچے تھے۔ سٹالن تمہارے مقابلے میں ایک بالکل مختلف سطح پر جدوجہد کرتا ہے۔'' (46)

پندرھویں کانگریس کے موقع پر سٹالن نے اپوزیشن کے ''خاتمے'' کا اعلان کر دیا۔ ٹراٹسکی اور اس کے خاندان کو الماتا میں دیس نکالا دیا گیا اور بعد ازاں ترکی میں ملک بدر کر دیا گیا۔ یہ سٹالنسٹ بیوروکریسی کی قوت کے استحکام میں ایک اہم سنگِ میل تھا۔

ٹراٹسکی نے اقتدار پر قبضہ کیوں نہیں کیا؟

بہت سے لکھنے والوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ ''ٹراٹسکی نے اپنی حیثیت کو، بالخصوص سرخ فوج میں اپنی اتھارٹی کو اس وقت اقتدار پر قبضہ کرنے کیلئے استعمال کیوں نہیں کیا؟'' ایک حالیہ کتاب ''لیون ٹراٹسکی کے تصورات'' جسے ایچ ٹکٹن اور ایم کوکس نے ایڈٹ کیا، میں ہمیں مندرجہ ذیل جائزہ نظر آتا ہے، ''ٹراٹسکی پر اس حوالے سے تنقید کی گئی ہے کہ وہ سیاست دان نہیں تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بحث کر چکے ہیں اس الزام میں سچائی کا عنصر موجود ہے۔۔۔ ٹراٹسکی کیخلاف دوسرا الزام یہ ہے کہ وہ سٹالن کے تحت نئے نظام حکومت کی نوعیت کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا۔ اس کو اگر پہلے الزام کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے کہ ٹراٹسکی سیاستدان نہیں تھا تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر اسے وقوع پذیر ہونیوالے ردِ انقلاب کی نوعیت کا علم ہوتا تو اس کا فرض بنتا تھا کہ وہ سٹالن سے اقتدار چھین لے۔۔۔ وہ ان فیصلہ کن سالوں میں اس جانور کی حقیقی نوعیت کو سمجھنے میں ناکام رہا جب وہ اس کے عروج کو روک سکتا تھا۔'' (47)

یہاں سارے واقعے کو افراد کے درمیان جدوجہد اور ان کی مخصوص خوبیوں تک محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ دلائل محض ان دلائل کی بازگشت ہیں جو ای ایچ کار، رچرڈ بی ڈے، موشے لے ون اور آئزک ڈیوشر جیسے تاریخ دانوں نے پیش کئے تھے اور یہ بھی اس جدوجہد کو زیادہ تر شخصیات کے حوالے سے دیکھتے تھے۔ کار کا دعویٰ ہے کہ ٹراٹسکی ''آخر تک یہ سمجھنے میں ناکام رہا کہ جدوجہد کا تعین دلائل کی دستیابی سے نہیں بلکہ اقتدار پر غلبے اور اس کے استعمال سے ہوگا۔'' بعدازاں وہ کہتا ہے ''وہ ایک ایسی لڑائی سے گھبراتا تھا جس کا کردار اس کی سمجھ سے باہر تھا اور اس کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔ حملے کے بعد اس نے میدان سے پسپائی اختیار کی کیونکہ اسے جبلی طور پر احساس تھا کہ پسپائی ہی اسے بقا کا بہترین موقع فراہم کر سکتی ہے۔''(48) موشے لے ون بھی اسی قسم کی تنقید کرتا ہے ''اس (ٹراٹسکی) میں کمزوری یہ تھی کہ وہ بہت خود پسند تھا اور ایک حوالے سے بہت خیال پرست بھی تھا جس کی وجہ سے وہ لیڈروں کے ایک چھوٹے سے گروہ کے اندر سیاسی جوڑ توڑ کو اپنی شان کیخلاف سمجھتا تھا۔ باہر کا آدمی ہونے کے باعث اور اپنے ماضی اور سٹائل کی وجہ سے وہ عین وقت پر (اس کے لئے یہ وقت صرف ایک مرتبہ آیا) عزم کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔''(40)

حقیقت میں یہ جدوجہد ٹراٹسکی اور سٹالن کے درمیان ذاتی اقتدار کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ جیتی جاگتی قوتوں کی جدوجہد تھی۔ وہ لوگ بذات خود اقتدار کی نوعیت کو ہی نہیں سمجھے جو یہ دلیل دیتے ہیں اقتدار پر قبضے کیلئے ٹراٹسکی کو صرف سرخ فوج کو استعمال کرنا چاہیئے تھا۔ اقتدار یا قوت ''عظیم لوگوں'' کے انفرادی ارادے کی پیداوار نہیں ہوتی جیسا کہ فاشزم کے نظریے کے پیش رو حضرات بشمول نطشے خیال کرتے تھے۔ یہ معاشرے میں موجود طبقات کے درمیان طاقتوں کے توازن کا عکس ہوتا ہے۔ فوج کو ایک سیاسی قوت کے طور پر استعمال کرنے کا براہ راست نتیجہ بوناپارٹ ازم کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ کسی مارکسسٹ کیلئے یہ بنیادی سی بات ہے۔ بوناپارٹ ازم بعض مخصوص صورتوں میں ہی قائم رہ سکتا ہے، عام طور پر اس وقت جب متصادم طبقات ہم پلہ ہوں۔ اس سے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ ریاستی مشینری خود کو سماج سے بالاتر کر لیتی ہے اور کسی حد تک خودمختار ہو جاتی ہے۔ لینن کی طرح ٹراٹسکی نے بھی ہمیشہ مزدور طبقے کو اپنی امیدوں کا محور بنایا۔ مزدور اپوزیشن سے ہمدردی رکھتے تھے مگر وہ اس قدر تھکے ہوئے اور مایوس تھے کہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ غیر متحرک رہے۔ یوگوسلاویہ کے آزمودہ کار کمیونسٹ اور اپوزیشن کے رکن اینٹی سیلیگا نے، جو 1920ء کے عشرے میں روس میں تھا اس وقت مزدوروں کے موڈ

کے بارے میں لکھا ہے:

''نجی گفتگو اور ان میٹنگوں نے مجموعی طور پر مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا مگر بہت سے مزدوروں کے مجہول رویے سے مجھے صدمہ ہوا۔ محسوس ہوتا تھا کہ ان میں کوئی دلچسپی یا جوش و خروش نہیں بلکہ اس کے برعکس ان میں ایک طرح کی سرد مہری اور حد سے بڑھی ہوئی کم سخنی پائی جاتی تھی۔ اس سے مایوسی طاری ہوتی تھی۔ مزدوروں کی خاموشی بظاہر یہ کہتی معلوم ہوتی تھی کہ 'یہ سب تو ٹھیک ہے مگر اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟' کسی کے منہ سے ایک لفظ نکلوانے کیلئے بھی جتن کرنا پڑتا تھا۔''(50)

اپنی آخری تحریروں میں سے ایک میں ٹراٹسکی نے وضاحت کی ہے کہ ''عام کارکنوں اور نوجوانوں کا بڑا حصہ اپوزیشن کے حق میں تھا لیکن سٹالن اور سنٹرل کمیٹی کے حق میں وہ منظّم اور خصوصی طور پر تربیت یافتہ سیاست دان تھے جو سیکرٹری جنرل کی سیاسی مشینری سے بہت قریبی رابطہ رکھتے تھے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری بیماری اور بعد ازاں جدوجہد میں عدم شراکت ایک اہم عامل تھا تاہم اس کی اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو اس کی اہمیت محض واقعاتی ہے۔ سب سے اہم حقیقت یہ ہے کہ مزدور تھک چکے تھے۔ اپوزیشن کے حامیوں کو بہت عظیم اور سنجیدہ نوعیت کی تبدیلیوں کی امید نہیں تھی۔ دوسری طرف بیوروکریسی نے نہایت غیر معمولی شدت کے ساتھ اس لڑائی میں حصہ لیا۔''

بیوروکریسی کی پیش رفت روکنے کیلئے مجہول حمایت اور ہمدردی کافی نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کسی ملک مثلاً چین میں انقلاب کامیاب ہو جاتا تو صورتحال یکسر تبدیل ہو جاتی، روسی مزدوروں کا حوصلہ بلند ہو جاتا اور بیوروکریسی کا رد انقلاب وہیں رک جاتا۔ لیکن سٹالن اور بخارین کی لیڈر شپ کی پالیسیوں کے (براہ راست نتیجے کے طور پر کامیابیوں کی بجائے صرف ناکامیوں کی خبریں آئیں۔'' ٹکٹن اور کوکس لکھتے ہیں کہ ''ہمیں یہ شبہ ضرور ہوتا ہے کہ پہلے پہل ٹراٹسکی رہنمائی کیلئے تیار نہیں تھا۔ اور بلاشبہ، بعد ازاں اس نے اقتدار پر قبضہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ سرخ فوج کا لیڈر تھا اور 1924ء میں سرخ فوج کے چیف پولیٹیکل کمیسار اینٹونوف افسینکو نے ٹراٹسکی کو اقتدار پر قبضہ کرنے کا مشورہ بھی دیا تھا۔''(51)

تاریخ کے بارے میں یہ ایک مخصوص سطحی نقطہ نظر ہے جس میں اسے انفرادی شخصیات کے درمیان جدوجہد تک محدود کر دیا جاتا ہے۔ عام طور پر اگر آپ درست سوال کریں تو اس بات کا اچھا خاصا امکان موجود ہوتا ہے کہ آپ کو درست جواب مل جائے۔ اگر آپ غلط سوال پوچھیں گے تو آپ کو ہمیشہ غلط جواب

ملے گا۔ٹکٹن اورکوکس جیسے حضرات کوتو یہ بھی پتہ نہیں کہ کیا سوال پوچھا جائے اس لئے نتیجہ ابتری کی صورت میں نکلتا ہے۔لیفٹ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے بونا پارٹسٹ نہیں بلکہ حقیقی مارکسسٹ تھے۔اس وجہ سے وہ مسئلے کے حل کیلئے فوج کی طرف نہیں دیکھ سکتے تھے۔انہوں نے مزدور طبقے کو ایک بنیاد بنایا۔من موجی پن سے یا جذباتی وجوہات کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے کہ صرف مزدور طبقہ ہی سماج میں سوشلسٹ تبدیلی لاسکتا ہے۔کسی اور طبقے یا سماجی گروہ کو بنیاد بنا کر بھی سماج میں تبدیلی لائی جاسکتی ہے لیکن اس کا رخ ایک صحت مند مزدور ریاست کی طرف نہیں ہوگا۔

ٹکٹن اورکوکس جیسے لوگ خودکوٹراٹسکی سے اعلیٰ خیال کرتے تھے جوان کے خیال میں یا تو بہت احمق تھا یا بہت زیادہ بزدل کیونکہ اس نے اقتدار پر قبضہ نہیں کیا جب کہ سٹالن کے بارے میں یہی خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ زیادہ ذہین اور زیادہ باہمت شخص تھا۔یہ ''عقل مند'' عالم'' طاقت کے سوال'' کے سلسلے میں بیک وقت چرب زبانی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں اور اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار بھی۔ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ ''اقتدار کوئی انعام نہیں ہے جسے زیادہ ہنر مند شخص جیت لیتا ہے۔اقتدار افراد کے درمیان اور آخری تجزیے میں طبقات کے درمیان ایک رشتے کا نام ہے۔'' (52)

مزدوروں کی فعال شرکت کی غیر موجودگی میں روس کے اندر بونا پارٹ ازم کے لئے واقعی حالات موجود تھے۔لیکن فوج کو سیاست میں استعمال کرنے کے بعد اس سے چھٹکارا پانا اتنا آسان نہیں جتنا تلوار کو میان میں واپس ڈالنا۔ان حالات میں اقتدار کے حصول میں فوج کے استعمال سے رد انقلاب کی راہ نہیں روکی جا سکتی تھی بلکہ اس کے برعکس اس کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ۔ واحد فرق یہ ہوتا کہ سول بیوروکریسی کی بجائے فوجی بیوروکریسی اقتدار میں آجاتی۔اس حقیقت سے قطعاً کوئی فرق نہ پڑتا کہ اس کی سربراہی ٹراٹسکی کر رہا ہوتا۔یا تو وہ افسر شاہی ٹولے کے مفادات کیلئے کام کرتا (جس کا کوئی امکان نہیں تھا) یا اسے ہٹا کر کسی دوسرے شخص کو لایا جاتا جو اس کام کو سرانجام دینے کیلئے تیار ہوتا۔اس مرحلے پر رجعتی تحریک نے ابھی کوئی مخصوص کردار نہیں اپنایا تھا۔بیوروکریسی ابھی کوئی راستہ تلاش کر رہی تھی۔سٹالن کی محتاط پالیسی سے اس حقیقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ایک فوجی بغاوت کا نتیجہ پرولتاری بونا پارٹ ازم کے تیز رفتار استحکام کی صورت میں برآمد ہوتا۔چہرے ضرور مختلف ہوتے مگر حقیقی صورتحال ایسی ہی رہتی۔زوال پذیری کا سارا عمل انتہائی تیز رفتار ہو جاتا،بس اتنی سی بات ہے۔

فرد کا کردار

اس میں کوئی شک نہیں کہ اپنی خوبیوں اور خامیوں سمیت افراد ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں مگر اس کردار کو صرف سماجی قوتوں کی جدوجہد کے سیاق وسباق میں ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ تاریخ میں فرد کا کردار اپنے گردوپیش کے معروضی حالات سے زیادہ فیصلہ کن نہیں ہوتا، اگرچہ تاریخی عوامل پر فرد کی صلاحیت، ذہانت اور شخصی کردار کا اثر یقیناً پڑتا ہے اور اہم مواقع پر اس کی حیثیت فیصلہ کن بھی ہو سکتی ہے۔ لینن اور ٹراٹسکی کے بغیر اکتوبر انقلاب کبھی رونما نہ ہو سکتا، یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زینوویف اور کامینیف اور سٹالن کی پالیسیاں 1917ء میں انقلاب کی شکست اور رجعت کی فتح کا موجب بنتیں جس کے بعد بہت سے عالمانہ تھیسز کے ذریعے اس بات کو ''ثابت'' کیا جاتا کہ روس میں ایک کامیاب سوشلسٹ انقلاب کا تصور یوٹوپیائی ہے۔

تاریخی مادیت تاریخ میں فرد کے کردار کو قطعاً نہیں جھٹلاتی۔ یہ محض اتنی وضاحت کرتی ہے کہ افراد بالکل آزاد عامل نہیں ہیں جیسا کہ خیال پرست سمجھتے ہیں بلکہ وہ ان سماجی و معاشی حالات کی بنیاد پر کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ان کے منتخب کردہ نہیں ہوتے بلکہ ایسے قوانین کے تحت وجود میں آتے ہیں جو مردوزن کے ارادے سے آزاد ہوتے ہیں۔ ان قوانین کو ایک بار سمجھ لینے کے بعد ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ تاریخی مرحلے میں کسی انفرادی شخصیت کے افعال کی اہمیت اور حقیقی وسعت کا سائنسی تجزیہ کر سکیں۔ 1917ء میں روسی مزدوروں کے انقلاب کی رہنمائی کرنیوالے لینن اور ٹراٹسکی اس سے قبل کئی دہائیوں تک بالکل الگ تھلگ اور بے قوت رہے۔ اپنی تمام تر شخصی قابلیتوں اور نظری علم کے باوجود وہ سماج کے عمومی حالات سے بالاتر نہیں تھے۔ جیسے اکتوبر انقلاب اور اس کے بعد ظاہر ہونیوالے نظام پر لینن اور ٹراٹسکی کی مہر ثبت ہے بالکل اسی طرح نوکر شاہانہ رد انقلاب سٹالن کے نام سے یوں جڑا ہوا ہے کہ دونوں ہم معنی بن چکے ہیں۔ لیکن اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ سوویت یونین میں سیاسی رد انقلاب کا انحصار ایک شخص پر نہیں تھا۔ یہ تاریخ کی میکانکی تشریح ہوگی۔ سٹالن ہوتا یا نہ ہوتا لیکن اگر انقلاب ایک پس ماندہ ملک تک محدود رہتا تو جلد یا بدیر، ایک یا دوسرے انداز میں رجعت ناگزیر تھی۔ تاہم اس سے سوال کا احاطہ مکمل طور پر نہیں ہو جاتا۔ جنگ کی طرح سیاست میں بھی ''جلد یا بدیر'' اور ''ایک یا دوسرے انداز میں'' کا سوال ضمنی حیثیت کا حامل نہیں بلکہ یہ فیصلہ کن بھی ہو سکتا ہے۔

پہلے عرصے کے دوران سٹالن کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ 1927ء میں مزدوروں یا 1923ء اور 1933ء میں جرمن مزدوروں کی شکست نہیں چاہتا تھا۔ تاہم ان تمام صورتوں میں اس کی پالیسیاں شکست کی مکمل ضمانت فراہم کرتی تھیں اور پھر اس کے نتیجے میں روسی انقلاب مزید محدود ہو کر رہ گیا جو نوکر شاہانہ رد انقلاب کی فتح کی حقیقی مادی بنیاد تھی اور اس بات کی سٹالن کو ابتدا میں نہ تو کوئی توقع تھی اور نہ ہی خواہش۔ علاوہ ازیں رد انقلاب نے جو عفریتی شکل اختیار کی اس پر سٹالن کے ذاتی کردار اور نفسیات کا یقیناً گہرا اثر تھا۔ ہیلویسیس نے بہت عرصہ پہلے کہا تھا، ''ہر عہد کے اپنے عظیم انسان ہوتے ہیں اور اگر ان کی کمی ہو تو یہ انہیں دریافت کر لیتا ہے۔'' ریاستی مشینری سمجھ رہی تھی کہ سٹالن اس کا اپنا ہی ہے۔ اکتوبر انقلاب میں وہ ایک ثانوی کردار تھا، تنگ نظر اور ریاستی مشینری کی پیداوار سٹالن اپنی ساری ذہنیت اور زاویہ نگاہ کے حوالے سے ریاستی دفاتر، ٹریڈ یونینوں اور یہاں تک کہ کمیونسٹ پارٹی میں موجود ابھرتے ہوئے اہل کاروں اور منتظمین کے نقطہ نظر اور خواہشات کی ترجمانی کرتا تھا۔

جن لوگوں نے انقلاب سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا تھا، انہیں بعض ایسی مراعات حاصل تھیں جو حکمران طبقے کے بعد میں اپنائے گئے طرز زندگی کے مقابلے میں تو بہت معمولی تھیں مگر اس وقت کے اندوہناک غربت کے حالات میں یہ اتنی اہم ضرور تھیں کہ انہیں عوام سے ممتاز کر سکیں۔ یہ اہلکار (جن کی اکثریت کو بالشوازم کے دشمنوں میں سے بھرتی کیا گیا تھا یعنی منشویک، پارٹی سے باہر کے عناصر اور بہت سے زار شاہی دور کے افسران) خود بخود حکمران پارٹی میں موجود ان عناصر سے قریب ہوتے چلے گئے جن کا نقطہ نظر ان سے ملتا جلتا تھا۔ بالشویکوں کی صفوں میں بہت سے ایسے لوگ موجود تھے جو سوشلزم کے آدرش کیلئے خود کو بڑے خلوص سے وقف کئے ہوئے تھے لیکن مارکسزم کے اصولوں اور تصورات پر ان کی گرفت زیادہ مضبوط نہیں تھی۔ یہ بدنام زمانہ کمیٹی مین، پارٹی میں موجود عمل پسند حضرات تھے جو تھیوری کیلئے حقارت اور عمومی ضابطہ بندی کے سلسلے میں بے صبری کا اظہار کرتے تھے اور ان کا رجحان مسائل کے انتظامی حل کی طرف تھا۔

انقلاب کے بعد ریاست کو چلانے کیلئے قابل منتظمین کی شدید ضرورت تھی۔ بہت سے لوگوں کو ضروری تیاری کے بغیر ہی ذمہ دار عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ بہترین عناصر میں سے بہت سے لوگ خانہ جنگی میں مارے گئے اور ان کی جگہ کم اہل لوگوں نے لے لی۔ ذمہ دارانہ عہدے سنبھالنے کے بعد ان کا قریبی رابطہ زار شاہی دور کے اہلکاروں سے ہوا جو منجھے ہوئے کھلاڑی تھے۔ جیسا کہ لینن بڑی تلخی سے

شکایت کرتا تھا اکثر اوقات یہ جاننا دشوار ہوتا تھا کہ کون کس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ خانہ جنگی کے بعد سرخ فوج میں لام بندی کے خاتمے نے اس مسئلے کو مزید تقویت دی۔ اگر چہ سرخ فوج کو مکمل طور سے جمہوری بنا دیا گیا تھا مگر کسان سپاہیوں کی اکثریت کی ثقافتی سطح کمتر ہونے کی وجہ سے بہت سے افسر اور نان کمیشنڈ افسر احکامات کے طریقہ کار کے عادی ہو گئے تھے۔ صنعتی زوال پذیری اور پرولتاریہ کے جزوی طور پر تحلیل ہو جانے کی وجہ سے ان حالات میں مزدور طبقہ پہلے جیسا کنٹرول قائم رکھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ریاستی مشینری رفتہ رفتہ بے قابو ہوتی جا رہی تھی۔

ٹراٹسکی کہتا ہے کہ ”یہ خیال کرنا نادانی ہوگی کہ سٹالن، جسے عوام پہلے سے جانتے بھی نہ تھے ایک مکمل منصوبے کے ساتھ یکا یک نمودار ہو گیا۔ قطعاً نہیں۔ اس سے قبل کہ وہ اپنا راستہ کھوجتا بیوروکریسی نے بذات خود سٹالن کو ڈھونڈا۔ وہ اسے تمام تر ضمانتیں مہیا کرتا تھا، پرانا بالشویک ہونے کے باعث عزت ووقار، ایک مضبوط کردار، محدود سوچ اور سیاسی مشینری سے قریبی رابطہ اس کے اثر ورسوخ کا واحد سرچشمہ تھا۔ پہلے پہل تو سٹالن بھی اپنی کامیابی سے حیران وششدر رہ گیا تھا۔ یہ نئے حکمران ٹولے کی طرف سے دوستانہ خوش آمدید کی طرح تھی جو پرانے اصولوں اور عوام کے کنٹرول سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کر رہا تھا اور اسے اپنے اندرونی معاملات طے کرنے کیلئے ایک قابل اعتماد ثالث کی ضرورت تھی۔ عوام کے سامنے اور اکتوبر انقلاب کے واقعات میں ایک ثانوی حیثیت رکھنے والے سٹالن نے خود کو رجعتی بیوروکریسی کے مسلمہ اور اولین لیڈر کے طور پر پیش کیا۔“(53)

یہاں فیصلہ کن چیز طبقاتی قوتوں کے توازن میں تبدیلی تھی۔ سالوں سے جاری جنگ، انقلاب اور خانہ جنگی کے باعث مزدور طبقہ تھک چکا تھا اور کمزور ہو چکا تھا۔ عالمی انقلاب میں تاخیر کے باعث روسی مزدوروں پر مایوسی طاری ہو گئی۔ دوسری طرف بیوروکریٹوں کی ابھرتی ہوئی پرت محسوس کرنے لگی کہ حالات پر ان کی گرفت مضبوط ہو رہی ہے۔ ایک ملک میں سوشلزم کا نظریہ اکتوبر انقلاب کے خلاف پیٹی بورژوا رجعت کا محض نظریاتی اظہار تھا جس کی وجہ سے ان عناصر کی یہ خواہش تھی کہ انقلاب کی ہنگامہ خیزی اور دباؤ کا خاتمہ ہو اور نظم وضبط بحال ہوتا کہ وہ اوپر سے سماج کا نظم ونسق چلانے کے فریضے سے عہدہ براہ ہو سکیں۔ جب کبھی کوئی مزدور اہلکاروں کے متکبرانہ رویے کیخلاف احتجاج کرتا تو اس سے طنزیہ انداز میں پوچھا جاتا تھا کہ ”تمہارا خیال ہے؟ تم سمجھتے ہو کہ یہ 1919ء ہے؟

اگر لینن زندہ بھی رہتا تو اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ پارٹی کے اندر طاقتوں کے توازن میں تبدیلی

کیلئے معروضی صورتحال میں ایک سازگار تبدیلی کی ضرورت تھی۔ یہ بات نہ صرف غلط اور سطحی بلکہ درحقیقت احمقانہ ہے کہ اس قسم کی گہری تاریخی تبدیلی کی وضاحت اوپری سطح پر سازشیں کرنیوالوں کی چالاکی یا بیوقوفی کے حوالے سے کی جاسکتی ہے۔ یہ محض تاریخ کے نظریہ سازش کی ہی ایک قسم ہے جس کا مارکسزم سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ مارکسزم تاریخ کی وضاحت طبقات کے درمیان جدوجہد کے حوالے سے کرتا ہے۔ جیسا کہ ٹراٹسکی بذات خود وضاحت کرتا ہے:

''بے شمار نقادوں، سیاسی تبصرہ نگاروں، نامہ نگاروں، تاریخ دانوں، سوانح حیات لکھنے والوں اور غیر پیشہ ور ماہرین عمرانیات نے وقتاً فوقتاً لیفٹ اپوزیشن کو اس کی غلطیوں پر لیکچر دیئے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اقتدار کے حصول کی جدوجہد کے حوالے سے لیفٹ اپوزیشن کی حکمت عملی قابل عمل نہیں تھی۔ تاہم اس سوال کے بارے میں ان کا طریقہ کار ہی غلط تھا۔ لیفٹ اپوزیشن اقتدار حاصل نہیں کر سکتی تھی اور کم از کم اس کے زیادہ غور و فکر کرنیوالے لیڈروں کو اس کی امید بھی نہیں تھی۔

لیفٹ اپوزیشن ایک انقلابی مارکسسٹ تنظیم ہونے کے ناطے صرف انہی حالات میں اقتدار کے حصول کی جدوجہد کر سکتی تھی جب ایک انقلابی ابھار موجود ہوتا۔ ایسے حالات میں حکمت عملی کی بنیاد جارحیت پر، عوام سے براہ راست اپیل پر اور حکومت کیخلاف براہ راست حملہ ہوتی ہے۔ لیفٹ اپوزیشن میں ایسے افراد کی کمی نہیں تھی جنہوں نے جدوجہد میں نمایاں حصہ لیا تھا اور ذاتی طور پر یہ تجربہ رکھتے تھے کہ جدوجہد کیسے کی جاتی ہے۔ لیکن بیس کی دہائی میں اور اس کے بعد بھی روس میں کوئی انقلابی ابھار نہیں تھا بلکہ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس قسم کی صورتحال میں اقتدار کے حصول کیلئے جدوجہد شروع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔'' (54)

باب نمبر 2: سٹالنزم کا ابھار

1۔ مارکس اور اینگلز۔ منتخب تصانیف جلد 1 صفحہ 504

2۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری۔ صفحہ 47

3۔ MESW گوتھا پروگرام پر تنقید مارکس۔ جلد نمبر 3 صفحہ 17

4۔ MESW جرمن آئیڈیالوجی جلد 1 صفحہ 37

5۔ لینن۔ مجموعۂ تصانیف۔ جلد 25 صفحہ 468

6۔ MESW۔ گوتھا پروگرام پر تنقید مارکس جلد 3 صفحہ 18

7۔ ایضاً۔ گوتھا پروگرام پر تنقید۔ مارکس۔ جلد تین صفحہ 18

8۔ ایضاً۔ ایضاً۔ جلد 3 صفحہ 9-18

9۔ لینن۔ مجموعہ تصانیف جلد 25 صفحہ 473

10۔ MESW گوتھا پروگرام پر تنقید۔ مارکس جلد تین صفحہ 19

11۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 25 صفحہ 476

12۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری۔ صفحہ 55

13۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 25 صفحہ 468

14۔ MESW مارکس۔ فرانس میں خانہ جنگی جلد 2 صفحہ 187-188

15۔ لینن۔ مجموعہ تصانیف جلد 25 صفحہ 431

16۔ میڈویڈیف۔ سوشلسٹ ڈیموکریسی پر صفحہ 221

17۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 33 صفحہ 88

18۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 249

19۔ میڈویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں۔صفحہ 841

20۔ وکٹرسرگی۔انقلاب کی یادداشتیں۔1941-1904 صفحہ 79

21۔ آرتھر رینسم ۔روس میں بحران صفحہ 56

22۔ وکٹرسرگی۔انقلابی کی یادداشتیں 1941-1901۔صفحہ 101

23۔ لوئیس بریانٹ روس میں سرخ چھ ماہ۔صفحہ 103

24۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 273

25۔ ایضاً جلد 27 صفحہ 148

26۔ ٹراٹسکی ۔میری زندگی۔صفحہ 464-465

27۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 33 صفحہ 430

28۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 29 صفحہ 32-33

29۔ وکٹرسرگی۔انقلابی کی یادداشتیں۔1941-1901۔صفحہ 74

30۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 32۔صفحہ 24-25

31۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 33۔صفحہ 179

32۔ ایضاً۔جلد 23۔صفحہ 288

33۔ ایضاً۔جلد 33۔صفحہ 287

34۔ ایضاً۔جلد 36 صفحہ 605-606

35۔ ایضاً۔جلد 36۔صفحہ 606

36۔ ایضاً۔جلد 33۔صفحہ 490

37۔ ایضاً۔جلد 36۔صفحہ 594-596

38۔ لیب مین۔لینن لینن ازم کی روشنی میں۔صفحہ 424

39۔ ایضاً۔صفحہ 424

40۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 90

41۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں 1935-36۔صفحہ 178

42۔ ایضاً۔ایضاً۔صفحہ 70

43۔ سٹالن۔لینن اور لینن ازم۔صفحہ 40

44۔ سٹالن مجموعہ تصانیف۔جلد 6۔صفحہ 110

45۔ ایللک نوی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ۔صفحہ 149

46۔ ٹراٹسکی۔تحریریں 37-1936۔صفحہ 43

47۔ ایچ ٹکٹن اور ایم کاکس۔ٹراٹسکی کے نظریات۔صفحہ 6-13

48۔ ای ایچ کر۔سوشلزم ایک ملک میں جلد 2 صفحہ 43

49۔ ایم لیون۔لینن کی آخری جدوجہد۔صفحہ 140

50۔ اے سیلیگا۔روسی پراسراریت۔صفحہ 21

51۔ ایچ ٹکسٹن اور ایم کاکس۔لیون ٹراٹسکی کے نظریات۔صفحہ 13

52۔ ٹراٹسکی۔تحریریں 36-1935 صفحہ 177

53۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 93

54۔ ٹراٹسکی۔سٹالن۔صفحہ 403

باب نمبر 3

پانچ سالہ منصوبے سے تطہیرات تک

جبری اجتماعی کاشت کاری

سال ہا سال تک کولاکوں کی دلالی کرنے کے بعد سٹالن اور بخارین کی لیڈرشپ 28-1927ء کے بحران سے بالکل حیرت زدہ رہ گئی۔ لیفٹ اپوزیشن کے سارے انتباہ بالکل سچ ثابت ہوئے۔ سٹالن نے بوکھلاہٹ کا شکار ہو کر ایک بالکل متضاد پالیسی کا حکم صادر فرما دیا۔ لیفٹ اپوزیشن کو ختم کرنے کے بعد سٹالن نے دائیں بازو کی حزب اختلاف کے خلاف پے در پے اقدامات کرنے کیلئے مزدوروں کا سہارا لیا۔ 1930ء تک سٹالن دائیں بازو کے لیڈروں بخارین، ٹامسکی اور رائیکوف کو پارٹی لیڈرشپ سے ہٹا چکا تھا۔ ان افراد (کمیونسٹ انٹرنیشنل کے سربراہ، سوویت حکومت کے سربراہ اور روسی ٹریڈ یونینوں کے رہنما) کی مذمت اب ردانقلاب کے ایجنٹوں کے طور پر کی گئی! لیفٹ اپوزیشن کے کچھ نکات کو مسخ شدہ اور نوکر شاہانہ انداز میں لے کر اب سٹالن نے ایک الٹرا لیفٹ پوزیشن اختیار کر لی۔ اگر لیفٹ اپوزیشن نے مہم نہ چلائی ہوتی تو سٹالن کولاکوں کی حمایت پر مبنی پالیسی جاری رکھتا اور اس کے باعث اکتوبر انقلاب کی تمام تر

حاصلات فنا ہو جاتیں۔

ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے کہ ''اپوزیشن کی جرات مندانہ تنقید اور بیوروکریسی کو اپوزیشن سے لاحق خوف کے بغیر سٹالن اور بخارین کی کولاکوں کے بارے میں پالیسی کا نتیجہ سرمایہ داری کی بحالی کی صورت میں نکلتا۔ اپوزیشن کی تنقید کے کوڑے نے بیوروکریسی کو ہمارے پلیٹ فارم سے اہم نکات مستعار لینے پر مجبور کر دیا۔ لینن اسٹ روسی نظام حکومت کو زوال پذیری کے عمل اور شخصی حکومت کی مشکلات سے تو نہ بچا سکے لیکن سرمایہ داری کی بحالی کا راستہ روک کر انہوں نے اسے مکمل طور پر تحلیل ہونے سے بچا لیا۔ بیوروکریسی کی ترقی پسندانہ اصلاحات اپوزیشن کی انقلابی جدوجہد کی ضمنی پیداوار تھیں۔ ہمارے نزدیک یہ بہت ہی ناکافی ہے لیکن کچھ نہ ہونے سے بہرحال بہتر ہے۔'' (1)

لینن نے ہمیشہ زراعت میں بتدریج اور رضاکارانہ اجتماعی کاشتکاری کی وکالت کی تھی۔ لیکن اس کے دماغ میں یہ پاگل پن کبھی نہیں سمایا کہ لاکھوں کسانوں کے جا بجا بکھرے ہوئے لاکھوں قطعہ ہائے اراضی کو راتوں رات بندوق کے زور پر اجتماعی کاشتکاری کے تحت لے آیا جائے۔ اجتماعی کاشتکاری کیلئے ترغیب نمونوں کے ذریعے دی جانی تھی۔ کسانوں کو صبر وسکون کے ساتھ دلائل دے کر اور مثالی اجتماعی فارم قائم کر کے قائل کرنا تھا جن میں جدید ترین ٹیکنالوجی، ٹریکٹر، کھاد، بجلی، سکول وغیرہ کو متعارف کروایا جانا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسا پیش منظر پانچ سالہ منصوبوں کے ذریعے سوویت صنعت کی ترقی کے ساتھ منسلک تھا۔ لکڑی سے بنے ہوئے ہلوں کی بنیاد پر اجتماعی کاشتکاری کا تصور ظاہر ہے کہ نہایت احمقانہ تھا۔ ٹراٹسکی نے اس مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا ''یہ مسئلہ عمومی تاریخی تاملات سے حل نہیں ہوتا۔ اجتماعیت یا اشتراکیت کے حقیقی امکانات کا تعین اس سے نہیں ہوتا کہ دیہات میں جمود کتنا گہرا ہے اور حکومت کی منتظمانہ توانائی کتنی ہے بلکہ اس کا انحصار موجود پیداواری وسائل پر یعنی صنعتوں کی اس صلاحیت پر ہے کہ وہ بڑے پیمانے کی زراعت کیلئے درکار مشینری مہیا کر سکے لیکن یہ مادی حالات موجود نہیں تھے۔ اجتماعی کاشتکاری کے فارم جن آلات کی بنیاد پر بنائے گئے وہ زیادہ تر چھوٹے پیمانے کی کاشتکاری کیلئے ہی مناسب تھے۔ ان حالات میں حد سے زیادہ تیز رفتار اجتماعی کاشتکاری نے ایک معاشی مہم جوئی کی شکل اختیار کر لی۔'' (2)

ایک مراعات یافتہ ٹولے کی حیثیت سے خود کو بچانے اور تقویت دینے کیلئے سٹالنسٹ بیوروکریسی اس بورژوا اردانقلاب کو ابتدائی مراحل میں تباہ کرنے کیلئے مزدوروں کا سہارا لینے پر مجبور تھی۔ اب دیہات

سے اناج کے ذخائر کو حاصل کرنے کیلئے مسلح دستے بھیجے گئے تاکہ شہروں کو خوراک مہیا کی جاسکے۔ سٹالنسٹوں نے موقع پرستی چھوڑ کر ایک الٹرالیفٹ پوزیشن اختیار کر لی۔ اس کی وجہ سے ''کولاکوں کے بحیثیت طبقے کے خاتمے'' اور ''جلد از جلد'' زراعت کی اشتراکیت کو مکمل کرنے کی جنونی پالیسی اپنالی گئی۔ اس کے نتیجے میں اجتماعی فارموں کی شرح 1929ء میں 1.7 فیصد سے 3.9 فیصد ہوگئی۔ 1930ء میں یہ شرح ڈرامائی طور پر 23.6 فیصد، 1931ء میں 52.7 فیصد، 1932ء میں 61.5 فیصد، 1933ء میں 64.4 فیصد، 1934ء میں 71.4 فیصد، 1935ء میں 83.2 فیصد اور 1936 میں 89.6 فیصد ہوگئی۔ اجتماعی کاشتکاری میں لئے گئے قابل کاشت رقبے کی شرح 1930ء میں 33.6 فیصد تھی جو 1935ء میں 94.1 فیصد ہوگئی۔

سٹالن نے کسانوں کو جن طریقوں سے اجتماعی کاشتکاری میں شامل کیا ان کا لینن کے تصورات سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ ''انہوں نے صرف گھوڑوں، گائیوں، بھیڑوں، سووروں کو ہی اجتماعی فارموں کا حصہ نہیں بنایا بلکہ نوزائیدہ چوزے بھی اس میں شامل تھے''۔ جیسا کہ ایک بیرونی مبصر نے لکھا ہے۔ ''انہوں نے چھوٹے چھوٹے بچوں کے پاؤں سے جوتے تک اتروا لئے۔ اس کے نتیجے میں پالتو جانوروں کو نہایت کم قیمت پر فروخت کرنے یا انہیں گوشت اور کھالوں کیلئے ہلاک کرنے کی وبا پھیل گئی۔'' (3) 1932ء تک اناج کی پیداوار وزنی اعتبار سے تقریباً 10 ارب یونٹ کے قریب گر گئی، چقندر کی پیداوار آدھی رہ گئی، گھوڑوں کی تعداد 55 فیصد کم ہوگئی اور بھیڑوں کی تعداد 66 فیصد کم ہوگئی۔ شلوخوف اپنی کتاب ''جب دھرتی جاگی'' میں لکھتا ہے کہ ''ہر رات گرمیاچی لاگ میں پالتو جانور ذبح کئے جاتے تھے۔ سورج بمشکل غروب ہی ہوا ہوتا تھا کہ جب مرتی ہوئی بھیڑوں، سووروں اور بچھڑوں کی گھٹی گھٹی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ انفرادی کاشتکار بھی اور وہ بھی جنہوں نے کولخوز میں شمولیت اختیار کر لی تھی دونوں پالتو جانوروں کو ہلاک کر رہے تھے۔ بیل، بھیڑیں، سوور اور یہاں تک کہ گائیں بھی ہلاک کر دی گئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ افزائش نسل کیلئے رکھے گئے جانور بھی۔ دو راتوں کے اندر اندر گرمیاچی میں سینگوں والے جانوروں کی تعداد نصف رہ گئی۔'' (4) تمام قوت جبری وصولی پر مرکوز کر دی گئی تھی۔

انسانی اور معاشی حوالے سے اس کے انتہائی ہولناک نتائج برآمد ہوئے۔ اس کے بعد پڑنے والے قحط میں لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ 33-1931ء کے دوران مرنے والوں کی تعداد کا اندازہ ستر لاکھ لگایا گیا ہے۔ 1921ء کے برعکس قحط زدہ لوگوں کیلئے کوئی راحت نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ

سرکاری طور پر قحط کا اعتراف ہی نہیں کیا گیا۔ جی پی یو میں بطور افسر کام کرنیوالا وکٹر کروچنکو اس وقت کی حالت کے بارے میں لکھتا ہے:

''وہ کہنے لگی، میں آپ کو مردوں کے بارے میں نہیں بتاؤں گی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ جانتے ہیں۔ نیم مردہ اور قریب المرگ لوگ ان سے بھی بدتر ہیں۔ پٹرووں میں سینکڑوں لوگ ہیں جو بھوک کی وجہ سے سوجن کا شکار ہیں۔ مجھے نہیں معلوم ان میں سے کتنے روزانہ مریں گے۔ بہت سے لوگ اتنے کمزور ہو چکے ہیں کہ وہ گھروں سے باہر نہیں نکلتے۔ وقفے وقفے سے ایک گھوڑا گاڑی لاشیں اٹھانے کیلئے جاتی ہے۔ ہم ہر وہ شے کھا چکے ہیں جو ہمارے ہاتھ لگی یعنی بلیاں، کتے، چوہے، پرندے وغیرہ۔ کل جب روشنی ہوگی تو دیکھنا کہ درختوں کی چھال اتری ہوئی ہے کیونکہ ہم اسے بھی کھا گئے ہیں اور گھوڑوں کی لید بھی کھالی گئی ہے، میرے چہرے کے تاثر سے اس نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مجھے یقین نہیں آیا۔ ہاں گھوڑے کی لید، ہم اس کیلئے بھی لڑتے جھگڑتے ہیں۔ بعض اوقات اس میں اناج کے ثابت دانے موجود ہوتے ہیں۔''(5)

اس مجنونانہ اشتراکیت کیلئے اٹھائے گئے اقدامات کا ایک جزو یہ تھا کہ ''کولاکوں کو بحیثیت طبقے کے'' ختم کر دیا جائے۔ این ایوٹسکی کے مطابق تین لاکھ کولاک خاندانوں کو جلاوطن کیا گیا تھا۔(6) تمام زراعت شدید ترین بحران کا شکار ہوگئی اور بیوروکریسی ایک غیر منظم پسپائی پر مجبور ہوگئی۔ نتیجتاً اسے اجتماعی فارموں کے ساتھ ساتھ کسانوں کو چھوٹے چھوٹے نجی قطعہ اراضی دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ تاہم روسی زراعت اس تباہی کے بعد کبھی بھی پوری طرح بحال نہ ہو سکی۔ یہ سب سٹالنسٹ نظام حکومت کی نوکرشاہانہ حکمرانی کا خوفناک نتیجہ تھا۔

معاشی نشیب و فراز

صنعتی محاذ پر بھی سٹالن نے ایک بالکل الٹ پالیسی کا حکم صادر فرمایا۔ سٹالن اور بخارین کی سست رفتار اور محتاط صنعتی ترقی کی پالیسی کو ترک کر دیا گیا۔ صنعتیں لگانے کو اب اولین ترجیح دی گئی۔ اب صنعتی ترقی کو انتہائی تیز رفتاری سے حاصل کیا جانا تھا۔ دسمبر 1929ء میں پانچ سالہ منصوبے کو چار سال میں پورا کرنے کا عہد کیا گیا۔ 4 فروری 1931ء کو سٹالن نے ''صنعت کے بنیادی اور فیصلہ کن شعبوں میں تین

سال کے اندر'' اس منصوبے کو پورا کرنے کی بات کی۔ اسی تقریر میں اس نے اعلان کیا کہ ''بعض اوقات یہ پوچھا جاتا ہے کہ آیا اس رفتار کو کم کرنا ممکن ہے۔ نہیں کامریڈز، یہ ناممکن ہے۔ رفتار کسی صورت بھی کم نہیں ہونی چاہیے! اس کے برعکس ہمیں اسے بڑھانا چاہیے۔'' جیسا کہ ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ ''تمام پرانے اصولوں کو سر کے بل کھڑا کر دیا گیا، منفی اور مثبت نے جگہیں تبدیل کر لیں۔''(7)

بائیں بازو کی طرف اس ڈرامائی موڑ نے لیفٹ اپوزیشن کی منتشر قوتوں کی ایک پرت میں پراگندگی پھیلا دی۔ 1928ء سے اپوزیشن کی رہنمائی کرنیوالے گروہ کو جلاوطن کر کے ان کے درمیان وسیع فاصلے پیدا کر دیئے گئے تھے۔ اپوزیشن کے سابقہ ارکان کی ایک پرت میں صلح جوئی اور شکست تسلیم کرنے کا موڈ پیدا ہو گیا۔ سب سے پہلے زینوویف اور کامینیف نے اپنی ''غلطیوں'' کا اعتراف کیا پھر راڈک اور پیریو برے زنسکی جیسے دوسرے لوگوں نے بھی یہی راہ اپنائی۔ ٹراٹسکی نے ان اقدامات کو غداری قرار دے کر ان کی مذمت کی کیونکہ اس سے پارٹی یا سوویت یونین کی اصلاح کا مقصد حل نہیں ہوتا تھا۔ ان شکستوں پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''انقلاب بہت سے لوگوں کو نگل جاتا ہے۔'' ایک دہائی سے زیادہ عرصے پر محیط طوفانی واقعات میں ایک پرت تھکن کا شکار ہو چکی تھی۔ ٹراٹسکی اس موڈ کیخلاف چٹان کی طرح ڈٹا ہوا تھا، ''اپوزیشن کے ہتھیار ڈالنے کا مطلب ہوگا (الف) ہم زینوویف جیسی نباتاتی زندگی کی سزا کو تسلیم کر لیں جس سے زیادہ شرمناک کیفیت فطرت میں کوئی دوسری نہیں ہے اور (ب) سٹالنسٹ فوراً ہی دائیں طرف مڑ جائیں گے۔''(8) بہرحال ان سابقہ اپوزیشن ارکان کا اعتراف شکست انہیں بچانے میں ناکام رہا۔ 1936ء اور 1938ء کے درمیان ان میں سے اکثر کو سٹالن نے ''سوویت یونین کے دشمن'' قرار دے کر جعلی مقدمات چلانے کے بعد گولی ماردی۔

جو کچھ ہوا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ ''بیوروکریسی نے لیفٹ اپوزیشن سے بھی بڑھ کر ایک اور شے کو تسخیر کیا۔ اس نے بالشویک پارٹی کو تسخیر کیا۔ اس نے لینن کے پروگرام کو شکست دی لیکن دلائل اور تصورات کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے سماجی وزن کے ذریعے۔ بیوروکریسی کی بھاری پٹھ کا وزن انقلاب کے سر سے زیادہ تھا۔ یہ سوویت رجعت (تھرمیڈور) کا راز ہے۔''(9) مزدور طبقے پر انتہائی اعتماد کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ آخر میں لکھتا ہے کہ ''نہ ہمیں کسی چیز کا افسوس ہے اور نہ ہی ہم کسی بات کی تردید کرتے ہیں۔ ہم آج بھی انہی تصورات اور رویوں کے ساتھ جی رہے ہیں جنہوں نے ہمیں اکتوبر 1917ء کے دنوں میں تحریک دی تھی۔ ہم ان عارضی مشکلات کے پار دیکھ سکتے ہیں۔ دریا چاہے

جتنے بھی موڑ کاٹے آخر کار سمندر میں ہی جا گرتا ہے۔‘‘(10)

5 ستمبر 1929ء کو فرد واحد کو منتظم بنانے کا اصول متعارف کروایا گیا۔فیکٹری کی پارٹی تنظیم سے کہا گیا کہ ڈائریکٹر کے اختیارات میں مداخلت نہ کی جائے۔جب کہ ٹریڈ یونینوں کا کام یہ تھا کہ ’’پیداواری سرگرمی اور محنت کش عوام کی پہل کاری کو جوش و خروش کے ساتھ منظّم کیا جائے۔‘‘ 33-1930ء کے دوران جاری ہونیوالے فرمانوں کے ذریعے غیر حاضری کی سزا نوکری اور فیکٹری کی طرف سے دی گئی رہائش گاہ سے نکال کر دی گئی۔ ہفتہ وار کام کے اوقات کار کو طویل کر دیا گیا اور اتوار کے دن کو ایک باقاعدہ چھٹی کے طور پر ختم کر دیا گیا۔وسائل کو اتلاف سے ہٹا کر بھاری صنعت میں لگایا گیا۔ پیداوار کے اس حد سے زیادہ غیر مناسب فروغ کی مخالفت کرنیوالوں کی مذمت منشویک تخریب کاروں کی حیثیت سے کی گئی۔ 1930ء کے اواخر اور 1931ء کے اوائل میں جھوٹے اعترافات کی اساس پر دو بڑے مقدمات قائم کئے گئے۔جن کا تعلق معاشی تخریب کاری اور توڑ پھوڑ کی سرگرمیوں سے تھا۔ان کی ایک بڑی تعداد کو گولی مار دی گئی۔

الٹرالیفٹ کی طرف سے نئے پینترے کا نتیجہ معاشی مہم جوئی اور 1930ء کی دہائی میں سوویت یونین کی حدود کے اندر ’’کمیونزم‘‘ کی تعمیر کی مہم کی صورت میں نکلا۔کم سے کم وقت میں مغرب کی ہم سری کے حصول کیلئے نہایت سفاکانہ طریقے استعمال کئے گئے۔سٹالن نے اعلان کیا کہ ’’ہم ترقی یافتہ ممالک سے سو یا پچاس سال پیچھے ہیں۔ہمیں اس فرق کو دس سال کے اندر اندر ختم کرنا ہے۔‘‘ اس مہم جویانہ مقصد نے معیشت میں تباہی مچا دی۔

جنوری 1931ء میں سٹالن نے اعلان کیا کہ پہلا پانچ سالہ منصوبہ چار سال اور تین ماہ میں مکمل ہو گیا ہے۔ساری معیشت میں جن حدود اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا ان کی وجہ سے یہ ترقی کی دوڑ 1933ء میں شدید بحران کا شکار ہوگئی۔زرعی پیداوار اپنی انتہائی کم سطح کو پہنچ چکی تھی۔اس کی وجہ سے معیار زندگی متاثر ہوا۔ 1934ء تک معاملات میں جزوی سدھار شروع ہو گیا۔اس ٹوٹ پھوٹ کے باوجود پہلے پانچ سالہ منصوبے میں تقریباً 1500 بڑے ادارے تعمیر ہوئے۔ان میں ڈیسپر وگس، میگیسو اور کزنیٹسک کے دھات سازی کے کارخانے، یورال مشین فیکٹری، روسٹوف میں زرعی مشینری کا کارخانہ، چیلیابنسک، اسٹالن گراڈ، خارکوف میں ٹریکٹر سازی کے کارخانے، ماسکو اور سورموو میں کار سازی کے کارخانے، یورال کیمیکل ورکس اور کرامیٹر کی بھاری مشینری تیار کرنیوالی فیکٹری کے علاوہ دیگر بہت سے

ادارے شامل تھے۔

ایلیک نوی لکھتا ہے کہ ''بعض سرکاری دعوؤں کی صحت سے قطع نظر اس بات کی سچائی میں کوئی کلام نہیں کہ دوسرے پانچ سالہ منصوبے کا دور اپنے مقصد کے حصول کے حوالے سے بہت متاثر کن تھا۔'' (11) 1932ء میں 338 ملین روبل کی مشینری درآمد کی گئی جو اس سال لگائی جانیوالی کل مشینری کا 78 فیصد تھی۔ تاہم 1937ء تک صنعت کاری اور اسلحہ سازی کیلئے درکار تمام بنیادی آلات سوویت یونین کے اندر ہی تیار ہو رہے تھے۔ 36-1935ء میں قابل قدر معاشی ترقی ہوئی۔ کل صنعتی پیداوار میں اضافہ 1934ء میں 19 فیصد، 1935ء میں 23 فیصد اور 1936ء میں 29 فیصد ہوا۔ زرعی پیداوار بھی بتدریج بحال ہونے لگی۔

صنعت میں ایسے نئے شعبے قائم ہوئے جو پہلے موجود نہیں تھے۔ مثلاً مشین سازی، کار اور ٹریکٹر سازی، کیمیائی صنعت، ہوائی جہاز بنانے کی صنعت، ٹربائن اور جنریٹر، اعلیٰ معیار کا فولاد، فیرس الائے، مصنوعی ربڑ، مصنوعی ریشے، نائٹروجن اور بہت سی دوسری اشیا۔ ہزاروں کلومیٹر طویل نہریں اور ریل کی پٹڑی تعمیر کی گئی۔ ملک کا مشرقی حصہ دھات سازی اور تیل کے حوالے سے سوویت یونین کا دوسرا مرکز بن گیا۔ سینکڑوں نئے شہروں اور قصبوں کی بنیاد رکھی گئی۔ آئندہ برسوں کے دوران جب سرمایہ دار دنیا تاریخ کی بدترین کساد بازاری کے ہاتھوں مفلوج ہو چکی تھی سوویت یونین نے نہایت تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔

سٹالنسٹ نظام حکومت نے مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں اضافے کیلئے پیس ورک اور اس کے ساتھ ہی ساتھ سٹاخانووائیٹ تحریک کے خصوصی مزدور دستے متعارف کروائے۔ کارکردگی میں اضافے کو عمومی طور پر متعارف کروایا گیا۔ 1936ء کے اوائل میں انجینئرنگ میں یہ اضافہ 30 سے 40 فیصد کر دیا گیا۔ کیمیائی صنعت میں 34 فیصد، بجلی کی پیداوار میں 51 فیصد، کوئلے کی کان کنی میں 26 فیصد اور تیل کی پیداوار میں 25 سے 29 فیصد کر دیا گیا۔ ساتھ ہی سٹالنسٹ حکومت نے ''سوشلزم کی حتمی فتح'' کا اعلان کر دیا۔ پیس ورک کا استقبال سوشلسٹ پیس ورک کے طور پر کیا گیا حالانکہ مارکس نے اسے ''سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کیلئے موزوں ترین'' قرار دیا تھا۔ اس کا اطلاق عریاں ترین شکل میں کیا گیا اور اس سے مزدور طبقے میں شدید ہتک کا احساس پیدا ہوا۔

ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ ''ذرائع پیداوار کی ریاستی ملکیت گوبر کو سونے میں تبدیل نہیں کر دیتی اور نہ ہی

مشقت گاہ کے گرد تقدس کا ہالہ قائم کرتی ہے جہاں عظیم ترین پیداواری قوت یعنی انسان کی شکست وریخت ہوتی ہے اور جہاں تک سوشلزم سے کمیونزم تک عبور کی تیاری کا سوال ہے تو اس کا آغاز بالکل متضاد سمت سے ہوگا یعنی پیس ورک کے متعارف کروانے سے نہیں بلکہ بربریت کی نشانی کی حیثیت سے اور اس کے خاتمے سے۔'' (12)

صرف دوسرے پانچ سالہ منصوبے کے دوران ہی حقیقی اجرتوں میں اضافہ شروع ہوا۔ یکم جنوری 1935ء سے روٹی کی راشن بندی ختم کردی گئی اور اکتوبر تک گوشت، گھی، مچھلی، چینی اور آلوؤں کی راشن بندی بھی ختم کردی گئی۔ جنوری 1936ء میں عام استعمال کی صنعتی اشیا کی راشن بندی بھی ختم ہوگئی۔ شدید افراط زر کے دور کے بعد زر تبادلہ پر مبنی تعلقات کی بحالی عمل میں آئی۔ 1935ء میں ہی منصوبہ بندی پر مبنی نظام تقسیم کی جگہ تجارت نے لے لی۔ روٹی اور آٹے کی قیمتوں میں کمی کردی گئی۔ 1937ء میں غذائی اشیا کے علاوہ باقی تمام چیزوں کی قیمتوں میں 3.8 فیصد کمی ہوئی۔ مالافیاف کے مطابق 1932-37ء کے دوران ریٹیل پرائس انڈیکس میں 80 فیصد کمی ہوئی جب کہ اوسط اجرت میں 113 فیصد اضافہ ہوا۔

الیک نوی کو یقین ہے کہ بہتر تجارتی انتظامات اور اشیا کی زیادہ دستیابی کے باعث یہ اضافہ اور بھی زیادہ تھا۔ تاہم زندگی میں بہتری کے باوجود یہ اب بھی بہت گھمبیر تھی کیونکہ حقیقی اجرت 1928ء کے مقابلے میں اب بھی کم تھی۔ سٹالن تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''زندگی آسان ہوگئی ہے، زندگی خوشگوار ہو گئی ہے اور جب زندگی میں خوشی ہو تو کام زیادہ تیز رفتاری سے ہوتا ہے۔'' ظاہر ہے سوویت زندگی کے بارے میں یہ نظریہ اسے بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرتا تھا۔ تاہم سرمایہ دار مغرب کے برعکس بے روزگاری کا خاتمہ کردیا گیا تھا۔ درحقیقت معاشی ترقی کی وجہ سے مزدوروں کی قلت پیدا ہوگئی جسے لاکھوں روسی کسانوں کو صنعت میں شامل کر کے پورا کیا گیا۔

سماجی تقسیم میں اضافہ

سٹالنزم کا مطلب مزدوروں کے بنیادی حقوق کا خاتمہ تھا۔ ہڑتال کا حق، تحریر و تقریر کی آزادی جیسے حقوق سرمایہ دار مغرب کی ''جمہوریتوں'' میں موجود تھے۔ سیاسی رد انقلاب کا آغاز پہلے ہی 1924ء میں

سٹالن کی سازشوں، پارٹی اور ریاستی مشینری پر اس کے غلبے سے ہو چکا تھا۔ تاہم یہ ایک نہایت طویل عمل تھا۔ انقلاب کے پرانے کیڈر کو بتدریج ختم کر کے اس کی جگہ طاقت ور بیوروکریسی نے لے لی تھی۔ 1930ء کے عشرے کے آغاز میں پہلے بائیں بازو اور پھر دائیں بازو کی اپوزیشن کی شکست سے سٹالنسٹ فرقے کے مکمل غلبے کی راہ ہموار ہوگئی۔ ٹراٹسکی نے لکھا کہ ''(تھرمیڈوریز) رجعتیوں اور بوناپارٹسٹوں نے انقلابیوں (جیکوبنز) کو باہر نکال دیا ہے۔ بالشویکوں کی جگہ سٹالنسٹوں نے لے لی ہے۔'' 1932ء سے 1947ء کے درمیان سوویت یونین میں کوئی ٹریڈ یونین کانگریس منعقد نہیں ہوئی۔ ٹریڈ یونینوں کو ریاست کے ضمیمے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ عرصہ ہوا سوویتیں نوکرشاہی کی حکمرانی کے آلے میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ سٹالن نے 1936ء میں ایک نیا آئین بنایا اور اسے دنیا میں ''سب سے زیادہ جمہوری'' قرار دیا۔ 1937ء کے انتخابات کے موقع پر سٹالن نے اعلان کیا کہ ''اتنے حقیقی طور پر آزاد اور صحیح معنوں میں جمہوری انتخابات دنیا نے کبھی نہیں دیکھے! تاریخ میں اس قسم کی کوئی مثال موجود نہیں ہے۔''(13) تاہم یہ ''جمہوری'' آئین انتخابات میں بدعنوانی کو روکنے کے سلسلے میں کچھ نہ کر سکا اور کمیونسٹ پارٹی کے امیدوار ووٹوں کا تقریباً 99.9 فیصد حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔ 21 دسمبر 1947ء کو مقامی سوویتوں کے ایک انتخاب میں سٹالن کو 2122 ووٹ ملے حالانکہ حقیقت میں اس حلقہ انتخاب میں ووٹروں کی کل تعداد 1617 تھی! اگلے دن پراودا، اخبار نے اس کی وضاحت کچھ یوں کی ''یہ اضافی بیلٹ پیپر قریبی حلقہ انتخاب سے تعلق رکھنے والے ان شہریوں نے ڈالے تھے جو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے رہنماؤں سے اظہار عقیدت کرنا چاہتے تھے۔''(14)

لیتھوینیا کے سوویت یونین کے ساتھ الحاق کے سلسلے میں 12 جولائی 1940ء کو ہونے والے ریفرنڈم میں کی جانیوالی دھاندلی بالکل واضح طور پر سامنے آگئی۔ بھونڈے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے ماسکو نے اس دو روزہ ریفرنڈم کے پہلے روز کے بعد ہی نتیجے کا اعلان کر دیا! ایک مبصر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''بدقسمتی سے ایک غلطی کے نتیجے میں لندن کے ایک اخبار نے روسی خبر رساں ایجنسی کے حوالے سے سرکاری نتائج کو ووٹوں کا وقت سرکاری طور پر ختم ہونے سے چوبیس گھنٹے پہلے ہی شائع کر دیا۔''(15)

سٹالن کی سرکردگی میں بیوروکریسی اقتدار پر اپنی گرفت کو مستحکم کر رہی تھی۔ 1930ء کی دہائی کے وسط تک بیوروکریسی نے اپنے لئے اتنی مراعات اور قوت حاصل کر لی تھی جو تاریخ میں کسی بیوروکریسی کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ نوکرشاہانہ احکامات کے کوڑے اور سٹاخانوائیٹ تحریک کے ذریعے ان سالوں میں

مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں مجموعی طور پر قابل ذکر اضافہ ہوا۔اس سے صنعت کوفروغ حاصل ہوا مگراس سے بیوروکریسی کو بھی کہیں زیادہ مراعات حاصل ہوئیں۔ٹراٹسکی لکھتا ہے''اشیائے تبادلہ کی گردش کی بنیاد پر پیداوار میں اضافے کے ساتھ ہی ساتھ عدم مساوات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔حکمران پرت کی خوشحالی میں عوام کے معیارزندگی میں بہتری کے مقابلے میں بہت زیادہ اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ ریاستی دولت میں اضافے کے پہلو بہ پہلو ایک نئی سماجی تفریق کا عمل بھی چلتا ہے۔''(16) اگرچہ راشن بندی کا خاتمہ ہوااوراکثریت کی حقیقی اجرتوں میں اضافہ بھی ہوامگر بیوروکریسی کی مراعات میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔ معاشی ترقی کے ساتھ مساوات میں نہیں بلکہ سماجی تقسیم میں اضافہ ہوا۔ اس طرح صرف مزدوروں اور بیوروکریسی کے درمیان ہی تقسیم واقع نہیں ہوئی بلکہ کم اجرت پانے والےاورزیادہ اجرت پانے والے مزدوروں میں بھی تقسیم بڑھی۔

معیشت میں تیز رفتار ترقی سے اعلیٰ افسران کی اجرتوں اورمراعات میں مزدوروں کی حقیقی اجرتوں کے مقابلے میں کہیں تیزی سے اضافہ ہوا۔بعض بیوروکریٹوں کے پاس ایک سے زیادہ عہدے تھے اس لئے وہ کئی کئی تنخواہیں لیتے تھے۔افسران کیلئے ریاستی چھوٹ کا نیا نظام بھی متعارف کروایا گیا جس کا آغاز شہری سوویت کے چیئر مین کی سطح سے ہوتا تھا۔جیسا کہ مارکس نے وضاحت کی تھی کہ''عمومی قلت'' کے باعث شروع ہونے والی بقا کی جدوجہد سے''تمام پرانی غلاظت'' کے ازسرنو ابھرنے کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے۔سٹالنسٹ نظام کے تحت اس نے ایک مسخ شدہ شکل اختیار کرلی۔ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ''ہمیشہ اور ہر نظام میں بیوروکریسی قدرزائد کا کافی حصہ ہڑپ کرجاتی ہے۔''

8فروری1930ءکووہ قانون رسمی طور پرختم کردیا گیا جس کی رو سے کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے اہلکار ایک ہنرمند مزدور کی اجرت سے زیادہ تنخواہ وصول نہیں کرسکتے تھے۔ بیوروکریسی روسی مزدور طبقے کی محنت سے پیدا ہونیوالی قدرزائد میں سے حصہ لینے کیلئے بے چین تھی جس میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا۔ وہ قومی آمدنی کا حصہ ہڑپ کرجاتی تھی، ضائع کردیتی یا ناجائز طریقوں سے قابو کرلیتی تھی۔ اعلیٰ افسران کا ایک چھوٹا سا گروہ پہلے پانچ سالہ منصوبے کے دور سے ہی مراعات حاصل کررہا تھا جن میں خصوصی دکانوں کا نظام، تقسیم کے مراکز اور طعام خانے شامل تھے جہاں چیزیں طے شدہ قیمتوں پر ملتی تھیں۔شدید افراط زر کے زمانے میں یہ ایک بہت بڑی مراعت تھی۔ بتدریج دیگر مراعات کا اضافہ بھی ہوتا گیا مثلاً خصوصی ہسپتال، چھٹیاں گزارنے کے مراکز وغیرہ۔کانفرنسوں اور کانگریسوں وغیرہ میں شرکت

کیلئے بھی پارٹی اہلکاروں کو اضافی سہولتیں ملتی تھیں۔ طفیلی بیوروکریسی قومی دولت میں سے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حصہ چاہتی تھی۔ بیوروکریٹ طبقے کے اجتماعی مفاد کیلئے یہ ضروری تھا کہ اس بدعنوانی کو محدود یا ختم کیا جائے تاکہ نظام کو زوال پذیر ہونے سے بچایا جاسکے۔ ثالث اعلیٰ کا یہ کردار سٹالن ادا کرتا تھا۔

ٹراٹسکی نے حساب لگایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل ریاستی مشینری، پارٹی، ٹریڈ یونینوں، امداد باہمی کے اداروں اور ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے اہلکاروں پر مشتمل بیوروکریسی اور ان کے خاندان اور لواحقین کی کل تعداد 25-20 ملین تھی یعنی کل آبادی کا 15-12 فیصد۔ تاہم بیوروکریسی کوئی عمومی یکساں خصوصیات کا حامل گروہ نہیں تھا جس طرح پرولتاریہ یا کسان ہوتے ہیں۔ صحیح معنوں میں حکمران ٹولہ تقریباً پانچ لاکھ افراد پر مشتمل تھا جو ایک بھاری اہرام نما انتظامی ڈھانچے کے اوپر ایستادہ تھا جبکہ ڈھانچے کی بنیادیں وسیع اور کثیر الاضلاع تھیں۔ یہ ایک مختلف الانواع کے کرداروں پر مشتمل گروہ تھا جس میں کریملن کی اعلیٰ شخصیات سے لے کر مقامی پارٹی اور ریاست کے اہلکار تک شامل تھے۔ ٹراٹسکی نے اس بارے میں بہت احتیاط برتی تھی اور اس طفیلی پرت کو ایک نیا سماجی طبقہ قرار نہیں دیا تھا۔

پہلے الماتا میں جلاوطن ہونے اور پھر سوویت یونین سے نکال دیئے جانے کے بعد ٹراٹسکی نے انٹرنیشنل لیفٹ اپوزیشن کی تنظیم کا بیڑا اٹھایا تاکہ بالشوازم کے تصورات وروایات کے دفاع کا کام جاری رکھا جاسکے۔ سٹالن ازم کو شکست دینے کیلئے سوویت یونین کے اندر نوکر شاہانہ رجعت کی نوعیت کو واضح کرنا اور سمجھنا ضروری تھا۔ کامنٹرن کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد ٹراٹسکی نے اپنی بقیہ زندگی مارکسی تحریک کے نوجوان کیڈروں کی نظریاتی تعلیم اور تنظیم کیلئے وقف کردی۔ جب ساری دنیا بنیادی پانچ سالہ منصوبوں کے تحت سوویت یونین میں ہونیوالی ترقی سے حیران وششدر تھی، ٹراٹسکی واحد شخص تھا جس نے سٹالن ازم کا سیر حاصل سائنسی تجزیہ مہیا کیا۔ محض اس ایک کارنامے کی وجہ سے مارکسی فکر کے عظیم استادوں میں سے ایک کی حیثیت سے تاریخ میں اس کا نام محفوظ ہوگیا۔ تاہم وہ فوراً ہی کسی کامل نتیجے پر نہیں پہنچ گیا تھا۔ اس کی وجہ بذات خود اس مظہر کی نوعیت تھی۔ یہ نوکر شاہانہ زوال پذیری راتوں رات واقع نہیں ہوئی۔ یہ ایک متضاد عمل تھا جو ایک دہائی سے زیادہ عرصے میں رونما ہوا۔ اس سے سٹالن ازم کے بارے میں ٹراٹسکی کے مسلسل جائزے کی وضاحت ہوتی ہے۔ جدلیاتی طریقہ کار پر پوری طرح عمل کرتے ہوئے اس نے نہایت احتیاط سے ہر اتار چڑھاؤ کا جائزہ لیا، ہر مرحلے پر متضاد رجحانات کو بے نقاب کیا اور دکھایا کہ یہ عمل کس طرح سے رونما ہونے کا امکان ہے۔

1924ء کے بعد سٹالنسٹوں نے ''ٹراٹسکی ازم'' کیخلاف بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں میں بالشوازم کے نام پر بے دخلیوں کی مہم شروع کر دی۔ یہ انتظامی طریقے تمام قومی شعبوں میں پھوٹ اور تقسیم کا باعث بنے۔ اس کے نتیجے میں کمیونسٹ پارٹیوں کے موجود ارکان اور سابقہ ارکان مختلف سیاسی دھڑوں میں بٹ گئے۔ کچھ منشوازم کی طرف چلے گئے اور اس بات کو تسلیم کر لیا کہ روس میں سرمایہ داری بحال ہو گئی ہے۔ بعض دوسرے لوگوں نے اس کی تعریف ''ریاستی سرمایہ داری'' یا ایک نئی قسم کے استحصالی سماج کے طور پر کی جس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ سوویت نظام کا مکمل خاتمہ ہو چکا ہے۔ کچھ لوگوں نے انقلابی تحریک کو بالکل ہی خیر باد کہہ دیا۔ ٹراٹسکی نے ان ''نئے'' نظریات کیخلاف آواز اٹھائی جنہوں نے سوویت یونین کو مزدور ریاست ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا۔ اس قسم کے خیالات خود لیفٹ اپوزیشن میں بھی سامنے آنے لگے جو سٹالنسٹ سیاسی رد انقلاب کی بظاہر نا قابل مزاحمت پیش رفت کی وجہ سے پیدا ہونیوالی قنوطیت اور مایوسی کے چہار سو پھیلے موڈ کی عکاسی کرتے تھے۔ ٹراٹسکی نے 1929ء میں، سوویت ریپبلک کا دفاع اور اپوزیشن، نامی مضمون کے ذریعے جرمن اپوزیشن کے ایک نمایاں رہنما ہیوگو اربنس پر شدید تنقید کی جس نے روسی ریاست کی طبقاتی نوعیت پر اس کے خیالات کی غلط تشریح کی تھی اور دعویٰ کیا تھا کہ سرمایہ دارانہ رد انقلاب مکمل ہو چکا ہے اور سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ ٹراٹسکی یہ دلیل دیتا تھا کہ اگرچہ ٹوٹ پھوٹ ضرور ہوئی ہے مگر انقلاب کی بنیادی حاصلات ابھی تک محفوظ ہیں۔

ٹراٹسکی نے لکھا کہ ''ہماری لڑائی سٹالنسٹ رجحان کیخلاف ہے مگر سوویت روس سٹالن سے بالکل مختلف چیز ہے۔ تمام تر بگاڑ کے باوجود، جس کیخلاف ہم لڑتے ہیں اور پورے عزم کے ساتھ لڑتے رہیں گے، جب تک طبقاتی شعور رکھنے والے مزدور مسلح ہیں ہمارے لئے سوویت روس ایک پرولتاری ریاست رہے گی جس کا دفاع ہم اپنے مفاد کی خاطر غیر مشروط طور پر جنگ اور امن دونوں حالتوں میں کرتے ہیں، سٹالن سے قطع نظر اور سٹالن کو شکست دینے کی خاطر جو اپنی پالیسی کے ذریعے اس کا دفاع کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جو کوئی بھی سوویت روس کے پرولتاری کردار کے سوال پر سختی سے قائم نہیں ہے وہ پرولتاریہ کو، انقلاب کو اور کمیونسٹ لیفٹ اپوزیشن کو نقصان پہنچا رہا ہے۔'' (17)

اس وقت ٹراٹسکی نے سوویت بیوروکریسی کو نوکر شاہانہ مرکزیت پسندی کی ایک قسم قرار دیا تھا کیونکہ سٹالن نے پہلے بائیں بازو سے دائیں بازو کی طرف اور پھر دوبارہ بائیں بازو کی طرف پوزیشن تبدیل کی تھی۔ اس سے بیوروکریسی کی ان کوششوں کی عکاسی ہوتی تھی جو وہ سوویت سماج کے اندر اور مزدور

ریاست اور عالمی سامراج کے درمیان تضادات پر قابو پانے کیلئے کر رہی تھی مگر اس کا انداز بتدریج بونا پارٹسٹ ہوتا جا رہا تھا۔ ٹراٹسکی کے نزدیک لیفٹ اپوزیشن کا فریضہ ایک نئی پارٹی کی تشکیل نہیں بلکہ ایک دھڑے کی حیثیت سے کمیونسٹ پارٹی کی اصلاح کی لڑائی لڑنا اور ایک نئے انقلاب کے لئے نہیں بلکہ سوویت یونین کی اصلاح کیلئے جدوجہد کرنا تھا۔ 1933ء تک انٹرنیشنل لیفٹ اپوزیشن نے اس پوزیشن کا دفاع شدومد سے کیا لیکن جرمنی میں رونما ہونیوالے واقعات نے ٹراٹسکی کو اپنی پوزیشن کا ازسرنو جائزہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس نے جرمنی میں ہٹلر کی فتح کی شکل میں رونما ہونیوالی تباہی کو تاریخی اعتبار سے اگست 1914ء میں سوشل ڈیموکریسی کی غداری کے برابر قرار دیا۔ اس بار جرمن کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کے لیڈروں کا کردار کہیں زیادہ تباہ کن تھا۔ ''سوشل فاشزم'' کی مجنونانہ اور نچلی سطح پر مشترکہ محاذ کی پالیسی پر مبنی جرمن کمیونسٹ لیڈروں اور سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کے کردار نے مزدور طبقے کی تحریک کو تقسیم کر کے بغیر کسی جدوجہد کے فاشزم کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''سوشل فاشزم'' کی تھیوری کا مطلب یہ تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کے علاوہ تمام پارٹیاں بلا استثنا فاشسٹ تھیں۔ اس خیال کو سٹالن کے اس بدنام زمانہ قول میں یوں بیان کیا گیا ہے:

''معروضی طور پر سوشل ڈیموکریسی اور فاشزم ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ جڑواں ہیں۔''

سوویت خارجہ پالیسی

''ہر جگہ ہم مزدوروں کے عالمی انقلاب کیلئے کال دیتے ہیں۔ روس طاقت ور اور خوشحال ہو جائے گا اگر وہ مایوسی اور فقرے بازی کو ترک کر دے، اگر وہ دانت بھینچ کر اپنی قوتوں کو مجتمع کر لے اور پورا زور لگائے، اگر وہ اس بات کا ادراک کرے کہ اس کی بھلائی عالمی سوشلسٹ انقلاب میں ہے اور اس کی طرف ہم گامزن ہیں۔'' (18) (لینن)

ہاورڈ: ''کیا آپ کے اس بیان کا یہ مطلب ہے کہ سوویت یونین نے عالمی انقلاب لانے کیلئے اپنے ارادوں اور منصوبوں کو کسی حد تک ترک کر دیا ہے؟

سٹالن: ہمارا کبھی بھی ایسا کوئی ارادہ یا منصوبہ نہیں تھا۔

ہاورڈ: مسٹر سٹالن آپ بلاشبہ سمجھتے ہوں گے کہ دنیا کا بڑا حصہ عرصے سے ایک مختلف تاثر لیتا

رہاہے؟

سٹالن: یہ غلط فہمی کی پیداوار ہے۔

ہاورڈ: ایک المناک غلط فہمی؟

سٹالن: نہیں مزاحیہ۔یا شاید المیائی مزاح (19)

(سٹالن سے رائے ہاورڈ کا انٹرویو)

''امریکہ کی دائیں بازو کی قوتیں اور پروپیگنڈا لاطینی امریکہ میں ہماری دلچسپی کو یوں بیان کرتا ہے گویا ہمارا ارادہ وہاں سوشلسٹ انقلابات کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا ہے۔ یہ لغوبات ہے گزشتہ کئی عشروں کا ہمارا رویہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہمارا اس قسم کا کوئی منصوبہ نہیں ہے۔'' (20) (میخائل گورباچوف)

خارجہ پالیسی داخلہ پالیسی کا ہی تسلسل ہوتی ہے۔ جب بالشویک اقتدار میں آئے تو ان کے پیش منظر کی بنیاد عالمی انقلاب تھا۔ بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ جب تک ممکن ہوا اقتدار پر قبضہ قائم رکھا جائے اور اس دوران بیرونی ممالک میں سوشلسٹ انقلاب کو فروغ دیا جائے۔ سوویت حکومت نے فوراً ہی ایک فرمان جاری کیا کہ دوسروں کے علاقوں پر قبضہ کئے بغیر امن بحال کیا جائے۔ لینن کے الفاظ میں یہ اپیل ''حکومتوں اور قوموں، دونوں سے کی جانی چاہیے۔ ہم حکومتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ اس سے امن قائم کرنے میں تاخیر ہو جائے گی اور عوام کی حکومت ایسا کرنے کی جرات نہیں کر سکتی۔'' (21) اس نے مزید کہا کہ ''ہماری جنگ بندی کی تجویز ایک الٹی میٹم کی شکل میں بھی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے دشمن ہماری عدم مصالحت کو بہانہ بنا کر اپنی عوام سے مکمل سچائی چھپانے کا موقع حاصل کر سکیں۔'' (22)

اس کے نتیجے میں روسی انقلاب نے ساری دنیا کے مزدوروں کی صفوں میں انقلابی جوش وجذبے کی لہر دوڑا دی۔ جنگ سے تھکے ہوئے مایوسی اور تلخی کا شکار عوام کے لئے یہ ہمت اور امید کا پیغام تھا، یہ اس خونی انتشار سے باہر نکلنے کی راہ دکھاتا تھا جس میں سرمایہ داری نے سماج کو ڈبو رکھا تھا۔

تاہم روس ہر طرف سے جارح قوتوں سے گھرا ہوا تھا اور اسے معاہدے میں جرمن سامراج کے ساتھ ایک ذلت آمیز امن پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کے فوراً بعد سوویت جمہوریہ کو خانہ جنگی اور بیرونی جارحیت کا سامنا کرنا پڑا۔ تاہم نومبر 1918ء تک جرمنی میں انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ سوویت حکومت کو یہ پیغام وصول ہوا، ''سب کو امن اور آزادی مبارک ہو۔ برلن اور اس کے اردگرد کے اضلاع مزدوروں اور

کسانوں کے نائبین کی کونسل کے ہاتھوں میں ہیں'' روس میں جرمن انقلاب کی خبر کے وصول ہوتے ہیں فوراً مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا جنہیں کارل راڈک نے یوں بیان کیا ہے،''شہر کے ہر کونے سے مظاہرین ماسکو سوویت کی طرف مارچ کر رہے تھے۔ لاکھوں مزدور خوشی سے تالیاں بجا رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے کبھی ایسا منظر نہیں دیکھا۔ شام کو دیر تک مزدور اور سرخ فوج کے سپاہی قطاروں میں گزر رہے تھے۔ عالمی انقلاب آ چکا تھا۔'' (23)

لینن نے ٹراٹسکی اور سورڈلوف کو لکھا کہ ''ایک ہفتے کے اندر اندر عالمی انقلاب اس قدر قریب آ چکا ہے کہ اگلے چند دنوں میں اس کا وقوع پذیر ہونا لازم ہے۔۔۔ جرمنی میں شروع ہونیوالے انقلاب کو آگے بڑھانے کیلئے ہم سب ان جرمن مزدوروں کی حمایت میں جان دینے کو تیار ہیں۔ اس لئے (الف) اناج کے حصول کیلئے دس گنا زیادہ کوشش (اپنے لئے اور جرمن مزدوروں کیلئے تمام سٹاک جمع کرنا) (ب) فوج کیلئے دس گنا زیادہ بھرتی۔ موسم بہار تک مزدوروں کے عالمی انقلاب کی امداد کیلئے ہمارے پاس تیس لاکھ فوج ہونا ضروری ہے۔'' (24) جرمنی، آسٹریا اور ہنگری میں انقلابات کے علاوہ اٹلی، فرانس اور یہاں تک کہ برطانیہ میں انقلابی صورتحال سامراج اور سرمایہ داری کے خاتمے کا اشارہ دے رہی تھی۔ بدقسمتی سے جرمنی میں سوشل ڈیموکریٹ رہنماؤں نے انقلاب سے غداری کرتے ہوئے سرمایہ داروں سے ساز باز کر کے طاقت مزدوروں سے لے کر سرمایہ داروں کو واپس کر دی۔ اس کا نتیجہ جرمن مزدوروں کی کئی خونریز شکستوں کی صورت میں نکلا اور ان کے دو نہایت شاندار نمائندے روزا لکسمبرگ اور کارل لائبخنت قتل کر دیئے گئے۔ بویریا اور ہنگری میں ایک سوویت جمہوریہ کا اعلان کیا گیا مگر رد انقلاب نے اسے شکست دے دی۔ سوشل ڈیموکریسی نے سرمایہ داری کو بچا لیا۔ طاقت ور ٹریڈ یونینوں اور سوشلسٹ نوکر شاہیوں نے عوامی ابھار کی سربراہی کرتے ہوئے اسے فضول راہوں پر لگا دیا۔

مارکسزم سے غداری کے سبب دوسری انٹرنیشنل کے اندر عالمی سوشلزم کے خاتمے کے بعد ماسکو میں مارچ 1919ء میں تیسری کمیونسٹ انٹرنیشنل کی بنیاد رکھی گئی جس میں بالشویک انقلاب کے حامی گروپ شامل تھے۔ اس کے اعلان کردہ اغراض و مقاصد میں عالمی سرمایہ داری کا خاتمہ اور سوویت یونین کے ساتھ اتحاد کیلئے سوویت سوشلسٹ جمہوریاؤں کی ایک لڑی کی تعمیر شامل تھی، سوویت یونین کی ایک علیحدہ حیثیت نہیں تھی بلکہ یہ عالمی انقلاب کیلئے محض ایک بنیاد تھی۔ اس کا مقدر عالمی انقلاب کے مقدر سے وابستہ تھا۔ یورپ کے اندر آسٹریا، اٹلی، فرانس اور برطانیہ میں اٹھنے والی انقلابی لہر نے ان توقعات کو تقویت بخشی

کہ دیگر ممالک میں بھی مزدور اقتدار میں آسکتے ہیں۔ سارے یورپ پر انقلاب کا بھوت منڈلا رہا تھا۔ اس دور میں سرمایہ دار سیاست دانوں کی لکھی ہوئی تحریریں اور یادداشتیں بورژوازی کے خوف اور عدم اعتماد کی شہادت دیتی ہیں کیونکہ انہیں انقلاب سامنے دکھائی دے رہا تھا۔ 1920ء تک اٹلی میں مزدور فیکٹریوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ اقتدار تک مزدوروں کی رہنمائی کرنے کی بجائے سوشلسٹ پارٹی نے انہیں ''غیر آئینی'' طریقہ کار ترک کرنے کو کہا۔ سارے یورپ میں یہی صورتحال تھی۔

روس سے باہر انقلاب کی ناکامی کی بنیادی وجہ پرانے لیڈروں کی غداریاں اور کمیونسٹ پارٹیوں اور گروپوں کی کمزوریاں تھیں۔ صرف 1920ء میں، تیسری انٹرنیشنل کی تشکیل کے بعد ہی، فرانس، جرمنی، اٹلی اور چیکوسلواکیہ میں روایتی عوامی پارٹیوں کی تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ کے بعد بڑی کمیونسٹ پارٹیوں کا وجود عمل میں آیا۔ تاہم روسیوں کے مقابلے میں یہ پارٹیاں نئی اور ناتجربہ کار تھیں۔ اس کا نتیجہ 1920-23ء میں المناک غلطیوں کی صورت میں برآمد ہوا۔ ان نوتشکیل شدہ پارٹیوں میں سے بہت سی الٹرالیفٹ ازم اور فرقہ پرستی کا شکار تھیں۔ 1920ء میں لینن کو ان بچگانہ ''بیماریوں'' کے خلاف کومنٹرن کی دوسری کانگریس میں تنقید کرنا پڑی، علاوہ ازیں اس نے اس سوال پر ''بائیں بازوں کا کمیونزم، ایک طفلانہ بیماری'' کے نام سے مضمون بھی تحریر کیا۔

1919ء سے 1922ء تک کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پہلی چار کانگریسوں کی قراردادیں کمیونسٹ تحریک کی رہنمائی کیلئے وضع کردہ حکمت عملیوں اور طریقہ ہائے کار پر مشتمل ہیں۔ واقعات جس طرح سے رونما ہو رہے تھے ان سے عالمی انقلاب کی کامیابی یقینی دکھائی دیتی تھی۔ آنے والی انقلابی لہر کیلئے ہر شے بالکل تیار تھی۔ تاہم لینن کی درست پوزیشن کو زینوویف اور سٹالن نے تباہ کر دیا۔ ان کی نوکر شاہانہ پالیسیوں نے جرمنی پر بالخصوص ایک تباہ کن اثر ڈالا جہاں کی کمیونسٹ پارٹی کی لیڈرشپ 1919ء میں روزا الکسمبرگ اور کارل لائبنجت کے قتل کے بعد اپنا راستہ کھو بیٹھی تھی۔ پہلے پال لیوی نے اس کی بھاگ ڈور سنبھالی، لیوی نے موقع پرستی کا مظاہرہ کیا جس کے خلاف پارٹی کے الٹرلیفٹ ماسلوا آرکیڈی اور روتھ فشر نے شدید تنقید کی۔ لینن اور ٹراٹسکی بھی لیوی کے ناقدین میں شامل تھے مگر وہ ''لیفٹ'' کیخلاف اس کا دفاع کرتے تھے۔ انہوں نے نوکر شاہانہ طریقے سے لیڈروں کو ہٹانے کی پالیسی پر کبھی بھی عمل نہیں کیا چاہے ان سے غلطیاں بھی سرزد ہو رہی ہوں۔ لینن نے ایک بار بخارن کو انتباہ کیا تھا کہ ''اگر تم اطاعت چاہتے ہو تو تمہیں بیوقوف مطیع ملیں گے۔'' وہ ارکان کو صبر آزما وضاحتوں، بحث مباحثوں اور دوستانہ تنقید

کے ذریعے تعلیم دینے کو ترجیح دیتے تھے۔ لینن کے مشورے کیخلاف جب ''لیفٹ'' نے آخر کار لیوی کو ہٹادیا اور وہ دائیں بازو کی طرف چلا گیا تو لینن نے یہ تبصرہ کیا تھا ''اس کا دماغ چل گیا ہے مگر اس کیلئے اس کے پاس دماغ موجود تو تھا۔'' لیفٹ کی نئی لیڈ شپ کے بارے میں اس کے شبہات جلد ہی درست ثابت ہو گئے۔ مارچ 1921ء میں فشر اور ماسلو کے تحت نا تجربہ کار کمیونسٹ پارٹی نے نامناسب تیاری کے ساتھ اور عوامی حمایت کے بغیر بغاوت کی جس کا نتیجہ کمیونسٹوں کی زبردست شکست کی صورت میں برآمد ہوا۔ مارچ ایکشن کے اس نام نہاد انقلابی حملے کی وجہ سے پارٹی کو دو لاکھ ارکان سے ہاتھ دھونا پڑے اور وہ محدود ہو کر رہ گئی۔ لینن اور ٹراٹسکی کو اس مہم جوئی کا دفاع کرنے والے ''الٹرا لیفٹ'' کیخلاف شدید جدوجہد شروع کرنا پڑی کیونکہ یہ سلسلہ جاری رہنے کی صورت میں کمیونسٹ تحریک تباہ ہو جاتی۔ بے صبری اور مہم جوئی کی بجائے ضرورت اس امر کی تھی کہ کمیونسٹ ''صبر و سکون سے وضاحت کریں'' اور مزدور طبقے کی اکثریت کو اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ اپنے معمول کے طریقہ کار پر عمل کرتے ہوئے زینوویف نے فشر اور ماسلو کو ہٹا کر ان کی جگہ دائیں بازو کے برانڈلر اور تھلہیمر کو دے دی۔ عمل اور بحث کے دوران پارٹی اور لیڈر شپ کی از سر نو تربیت کرنے کی بجائے مختلف پینتروں اور نوکر شاہی کے استعمال کے ذریعے پارٹی کے داخلی مسائل حل کرنے کیلئے زینوویف کے طریقہ کار کا اثر یہ ہوا کہ پارٹی کے مختلف حصوں میں کم ہمتی پیدا ہوئی اور اس کے لیڈر اپنی راہ کھو بیٹھے۔

جرمن انقلاب۔ 1923ء

جنگ عظیم نے عالمی سرمایہ داری کا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے انہیں مزید بگاڑ دیا تھا۔ سرمایہ داری اپنی کمزور ترین کڑی سے ٹوٹ گئی تھی۔ نئی سوویت جمہوریہ کو بیرونی جارحیت کے ذریعے تباہ کرنے کی کوششیں مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھیں۔ یورپ کے طاقتور ترین سامراج کو اس کے مال ومتاع، وسائل اور کچھ علاقوں سے محروم کرنے کے علاوہ تاوان جنگ کے بوجھ تلے دبا دیا گیا اور اس کی عمومی حیثیت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ جنگ میں ''فاتحین'' کی حیثیت سے ابھرنے والے برطانوی اور فرانسیسی سامراجیوں کی حالت بھی بنیادی طور پر کچھ زیادہ بہتر نہیں تھی۔ روسی انقلاب سے حوصلہ پا کر نو آبادیاتی اور نیم نو آبادیاتی عوام میں بھی ہلچل پیدا ہو گئی اور وہ بھی بغاوت کی تیاری کرنے لگے۔ جاپانی اور

امریکی سامراجوں کے مقابلے میں برطانوی اور فرانسیسی سامراجوں کی معاشی حالت بدتر ہو چکی تھی اور ان کے اپنے عوام میں بے چینی پھیل رہی تھی۔ اس عالمی پس منظر میں جرمنی کا 1923ء کا بحران پیدا ہوا۔ جرمنی کی پیداواری صلاحیت بہت زیادہ تھی مگر اسے معاہدہ ورسائی میں لگائی گئی پابندیوں کے ذریعے اپاہج بنا دیا گیا اور اب یہ عالمی سرمایہ داری کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی بن چکا تھا۔ جرمنی جب تاوان جنگ کی اقساط کی ادائیگی میں ناکام رہا تو فرانسیسی سرمایہ داروں نے ''Ruhr'' کے علاقے پر فوج کشی کر دی۔ اس نے جرمنی کے بحران کو مکمل کرنے میں مدد دی اور جرمن بورژوازی نے سارا بوجھ درمیانے اور مزدور طبقے کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے ایک شدید بحران پیدا ہو گیا اور سارے ملک میں انقلابی کیفیت ابھر آئی۔

انقلاب کی کامیابی کا دارومدار محض کسی ملک میں موجود مخصوص معروضی حالات پر ہی نہیں ہوتا۔ اس کا انحصار فیصلہ کن طور پر اس عنصر پر بھی ہوتا ہے جسے مارکسسٹ داخلی عامل کہتے ہیں یعنی ایک انقلابی پارٹی جس کی لیڈرشپ دور اندیش ہو اور واضح نظریات رکھتی ہو۔ عرصہ پہلے اینگلز نے وضاحت کی تھی کہ بعض اوقات ایک دن بیس برس کے برابر دکھائی دیتا ہے جب کہ دوسری جانب کبھی کبھی بیس برس کی تاریخ کا احاطہ چوبیس گھنٹے میں کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ انقلابی صورتحال کے پیدا ہونے میں کئی دہائیاں لگ سکتی ہیں لیکن اگر لیڈرشپ اس لمحے کا فائدہ اٹھانے کیلئے تیار نہ ہو تو یہ موقع چند روز میں ضائع ہو سکتا ہے۔ ناکامی کی صورت میں ہو سکتا ہے کہ انقلاب کا موقع اگلی کئی دہائیوں تک نہ آئے۔ اس کی کئی وجوہات تھوڑا سا غوروفکر کرنے والے پر بھی بالکل عیاں ہو جاتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ مٹھی بھر استحصالی کروڑوں مردوزن پر اپنی حکمرانی مسلط کئے رکھتے ہیں؟ سرمایہ داری نظام کو اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے عام طور پر تشدد کا سہارا نہیں لینا پڑتا (اگرچہ بوقت ضرورت یہ انتہائی سفاکانہ ہتھکنڈے استعمال کرنے سے بھی نہیں چونکتا) اس کا راز اس روٹین اور عادات کی زبردست قوت میں پوشیدہ ہے جو عام ادوار میں لوگوں پر حاوی رہتی ہے۔ شعور کے پہلے لمحے ہی سے عوام اپنے سے ''بہتر'' لوگوں کی اطاعت اور غلامی کی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس عمومی حالت کو مذہب، اخلاقیات، قانون اور روایات تقدس عطا کرتے ہیں اور عوام کی اکثریت اس سلسلے میں کوئی اعتراض نہیں اٹھاتی کیونکہ ان کے نزدیک یہ فطری اور ابدی امر ہے۔ صرف مخصوص اور فیصلہ کن لمحات میں ہی عوام اس خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں جب عظیم واقعات انہیں جھنجوڑتے ہیں اور وہ روایات کے مردہ ہاتھ سے رہائی پا کر نئے اور ان دیکھے راستوں پر

اپنے مسائل کے حل کیلئے نکل پڑتے ہیں۔ اپنی اسی فطرت کی وجہ سے ان ادوار کو انتہائی غیر معمولی سمجھا جاتا ہے۔

اس وجہ سے انقلابی پارٹی کی قبل از وقت تیاری ضروری ہے اسے عین ضرورت کے وقت تیار کر لینا ممکن نہیں ہے۔ 1924ء میں ٹراٹسکی نے ''اکتوبر کے اسباق'' نامی جو کتاب لکھی تھی اس میں دیئے گئے پیغام کا نچوڑ یہی ہے۔ یہ کتاب نئی کمیونسٹ پارٹیوں، بالخصوص جرمن پارٹی کے کیڈروں کو 1917ء میں بالشوازم کے حقیقی تجربات سے آگاہ کرنے کیلئے لکھی گئی تھی۔ روسی انقلاب کوئی استثنا نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ اس کی بعض ٹھوس غیر معمولی خصوصیات تھیں جیسی ہر انقلاب کی ہوتی ہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ برطانیہ یا جرمنی جیسے صنعتی ممالک کے برعکس یہ انقلاب ایک پسماندہ ملک میں وقوع پذیر ہوا۔ لیکن بہت سی نمایاں خصوصیات تمام انقلابات میں مشترک ہوتی ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ مماثلات تلاش کی جا سکتی ہیں اور سبق سیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر روسی انقلاب بالشوازم کی درستگی کو مثبت انداز میں ثابت کرتا ہے تو 1923ء میں جرمنی میں رونما ہونیوالے واقعات اسی بات کو منفی انداز میں ثابت کرتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں لیڈرشپ نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ لیکن جہاں لینن اور ٹراٹسکی کی لیڈرشپ نے روسی مزدوروں کو فتح دلائی وہاں جرمن کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں نے سٹالن اور زینوویف کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے انقلاب کو ناکامی سے دوچار کر دیا۔

1923ء میں جرمن سکے 'مارک' کے گرنے اور فرانسیسی سامراجی فوجوں کے رائی لینڈ پر قبضے نے جرمنی میں انقلابی صورتحال کو جنم دیا۔ اگر روزا لکسمبرگ اور کارل لائبنخت کو 1919ء میں قتل نہ کر دیا گیا ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مزدور طبقے کی فتح کو یقینی بنانے کیلئے ضروری لیڈرشپ مہیا کرتے۔ شاید اس حقیقت کے باعث یہ دعویٰ متضاد دکھائی دے کہ روزا ہمیشہ انقلاب میں پرولتاریہ کی برجستہ تحریک کے مرکزی کردار پر اصرار کرتی تھی۔ لیکن درحقیقت اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ انتہائی طوفانی عوامی تحریک کو بھی بورژوازی کی قوت پر قابو پانے اور سماج کو تبدیل کرنے کیلئے تنظیم اور لیڈرشپ کی ضرورت ہوتی ہے۔ 1923ء کے واقعات اس کا واضح ترین ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ روزا لکسمبرگ اور کارل لائبنخت کی غیر موجودگی میں جرمن پارٹی میں قیادت کا بحران پیدا ہو گیا تھا۔ بعدازاں کی جانیوالی تبدیلیوں نے جن میں زینوویف کے تحت کمیونسٹ انٹرنیشنل نے ایک نہایت منفی کردار ادا کیا، حقیقتاً پارٹی قیادت کا خاتمہ کر دیا۔ ماسکو کی ناپسندیدہ رہنماؤں کو قیادت سے محروم کرنے کی پالیسی نے ایک بڑی مثال قائم کر

دی جسے بعدازاں کمیونسٹ انٹرنیشنل کو سٹالنزم کے تابع اور آخر کار تباہ کرنے کیلئے استعمال کیا گیا۔اس کا بالشوازم کے طریقہ کار سے کوئی تعلق نہ تھا۔مزدوروں کیلئے مختلف مسائل پر بحث کرنے اور اپنے تجربے سے سیکھنے کے علاوہ درست یا غلط قیادت کے بارے میں فیصلے کرنے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔یہ عمل یقیناً سست رفتار ہے۔کیڈروں کی تیاری اور ایک حقیقی انقلابی قیادت کے ابھرنے میں سالوں اور دہائیوں کا عرصہ لگتا ہے۔لیکن اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔بالشویک پارٹی 1917ء سے پہلے اسی طرح کے ایک لمبے تیاری کے دور سے گزری تھی۔انہوں نے ہر طرح کی غلطیاں بھی کیں۔لیکن ہم غلطیوں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بشرطیکہ ان کا ایمانداری سے اعتراف کیا جائے اور تجزیہ کیا جائے۔لیکن نوکر شاہانہ پینتروں کے ذریعے اور قیادت کو غلطیوں سے پاک ثابت کرنے کی کوششوں سے ایک حقیقی انقلابی پارٹی کو ہزار سال میں بھی تعمیر کرنا ممکن نہ ہوگا۔

ان ذریعوں سے زینوویف اور اس کے حامیوں نے جرمن قیادت کو مکمل طور پر کھوکھلا کر دیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب 1923ء میں انقلابی لہر اٹھی تو وہ اپنا راستہ کھو چکی تھی۔برانڈلر یہ پوچھنے کیلئے ماسکو گیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔لینن اور ٹراٹسکی دونوں بیمار تھے اور اس سے ملاقات نہیں کر سکتے تھے۔ان کی بجائے وہ سٹالن اور زینوویف سے ملا جنہوں نے اسے بالکل غلط مشورہ دیا۔زینوویف اور کامینیف نے اکتوبر 1917ء میں انقلابی بغاوت کی مخالفت کی تھی اور اب اسی غلطی کا اعادہ کرتے ہوئے انہوں نے جرمنی میں انقلابی امکانات کے بارے میں کھلم کھلا تشکیک کا اظہار کیا۔نوکر شاہانہ رجحانات رکھنے والے لوگوں کی زبانی کلامی انقلاب پسندی ہمیشہ ان کی عوام پر بے اعتمادی اور فطری قدامت پسندی کا دوسرا رخ ہوتی ہے۔زینوویف نے احتیاط کا مشورہ دیا اور درحقیقت جرمنوں کو کچھ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔سٹالن نے اس سے بھی زیادہ موقع پرستی کا ثبوت دیا۔وہ زینوویف سے اس حوالے سے مختلف تھا کہ اسے جرمن انقلاب کے مسائل سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ ریاستی مشینری کو قابو کرنے کیلئے جو چالیں چل رہا تھا انہیں متاثر نہیں کرنا چاہتا تھا۔تنگ نظر اور محدود سوچ کا مالک ہونے کے ناطے وہ مغربی یورپ کے مزدوروں کیلئے گہری حقارت کے جذبات رکھتا تھا جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ کبھی انقلاب برپا نہیں کرینگے۔انتہائی موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سٹالن نے جرمن پارٹی کو مشورہ دیا کہ وہ کوئی قدم نہ اٹھائے۔جرمن قیادت کیلئے اس کا مشورہ انتہائی حیرت انگیز تھا،"پہلے فاشسٹوں کو کوشش کر لینے دو۔!"

انٹرنیشنل اور جرمن پارٹی کی قیادت اس امتحان میں پورا اترنے اور موقع کا فائدہ اٹھانے میں ناکام رہی۔ جرمنی میں کامیابی کا نتیجہ لازمی طور پر پورے یورپ میں کامیابی کی صورت میں نکلتا۔ جس طرح 1917ء میں روس میں ہوا تھا اسی طرح 1923ء میں جرمنی کے اندر بھی قیادت کے کچھ حصے تذبذب کا شکار ہو گئے۔ برانڈلر اور دوسری جرمن قیادت کو درحقیقت سٹالن، زینوویف اور راڈک نے روکے رکھا۔ انہوں نے بغاوت کے شیڈول کیلئے ٹراٹسکی کا مشورہ مسترد کر دیا اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایک کمزور اور نیم دلانہ کوشش کی جس کا نتیجہ ایک ذلت آمیز شکست کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس وجہ سے موقع ضائع ہو گیا اور جرمن انقلاب ناکام ہو گیا۔ خطرے کو بھانپ کر ٹراٹسکی نے ''اکتوبر کے اسباق'' لکھی تاکہ کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت جرمنی میں ہونیوالے واقعات سے ضروری نتائج اخذ کر سکے۔ لیکن سٹالن، کامینیف اور زینوویف پر مشتمل ٹولا جو طاقت کے حصول کی کوششوں میں مصروف تھا جرمن واقعات پر ایک کھری بحث کو قبول نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس سے ان کا وقار مجروح ہوتا۔ ٹراٹسکی کی اس تحریر کے بعد ٹراٹسکی ازم کیخلاف شدید حملوں کا آغاز کر دیا گیا اور اس کا مرکزی پیغام بہتان طرازی اور گالم گلوچ کے تودے تلے دبا دیا گیا۔ لینن کے طریقوں کی جگہ اب ایک ایسی حکمران بیوروکریسی کے اجنبی طریقوں نے لینی شروع کر دی تھی جو اپنی ''روشن ضمیر'' قیادت کے ہر فیصلے کو بلا تنقید قبول کرنے کا تقاضا کرتی تھی۔

''ایک ملک میں سوشلزم''

اس شکست نے روس میں نوکر شاہانہ رجعت کو مزید تقویت دی۔ لینن قریب المرگ تھا جب کہ سٹالن، زینوویف اور کامینیف ٹراٹسکی کے خلاف سازش میں مصروف تھے۔ ان حرکات سے صرف سٹالن کی حیثیت مستحکم ہوئی اور بیوروکریسی کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ سٹالن کو وسیع تر عالمی تناظر سے کوئی خاص دلچسپی تو کبھی بھی نہیں تھی مگر اب وہ عالمی انقلاب کے امکانات کے سلسلے میں مزید شکوک وشبہات کا شکار ہو گیا۔ سوویت یونین میں اس کا اظہار ''ایک ملک میں سوشلزم'' کے نظریے، معاشی پالیسی میں دائیں طرف موڑ اور کولاکوں اور کاروباری حضرات کیلئے دلالی کی صورت میں ہوا۔ یہ ''نظریہ'' جرمنی میں انقلاب کی ناکامی کا براہ راست نتیجہ تھا۔ یہ عالمی انقلاب کے ان اصولوں سے انحراف تھا جن پر روسی انقلاب کی بنیاد

رکھی گئی تھی اور جن پر تیسری انٹرنیشنل کی تشکیل کی گئی تھی۔

اس وقت سٹالن کو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ ایک ملک میں سوشلزم کا نظریہ سوویت یونین اور کامنٹرن کو کہاں لے جائے گا۔ عالمی انقلاب سے ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی کی تبدیلی کامنٹرن کے اندر ایک دائیں طرف موڑ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ انٹرنیشنل کے جوان اور ناتجربہ کار لیڈروں کو فوراً ہی کریملن میں موجود سٹالن کے ٹولے کے تحت لے آیا گیا جس نے انہیں اپنی خارجہ پالیسی کے ایجنٹوں کے طور پر استعمال کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھی۔ مزاحمت کرنیوالوں کو باہر نکال دیا گیا۔

لیون ٹراٹسکی نے 1928ء میں پیش گوئی کی تھی کی کمیونسٹ انٹرنیشنل کے ایک ملک میں سوشلزم کے نظریے کو قبول کرنے سے ایک ایسے عمل کا آغاز ہو سکتا ہے جو ناگزیر طور پر دنیا کی ہر کمیونسٹ پارٹی کے قومی اصلاح پسندی کی صورت میں انحطاط پذیر ہونے کا موجب بنے گا چاہے وہ پارٹی اقتدار میں ہو یا اقتدار سے باہر۔ ایک شاندار پیش گوئی کرتے ہوئے ٹراٹسکی نے کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت کو انتباہ کیا کہ ''اگر کسی بھی صورت ایک ملک میں سوشلزم کو حقیقت کا روپ دینا ممکن ہو تو اس نظریے پر یقین نہ صرف اقتدار پر قبضے کے بعد بلکہ اقتدار پر قبضے سے پہلے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر پس ماندہ روس کی قومی حدود کے اندر سوشلزم لایا جا سکتا ہے تو اس بات پر یقین کرنے کی بھی معقول وجہ موجود ہے کہ ترقی یافتہ جرمنی میں بھی ایسا ہونا ممکن ہے۔ کل کلاں جرمن کمیونسٹ پارٹی کی قیادت بھی اس نظریے پر غور و خوض کر سکتی ہے۔ ڈرافٹ پروگرام کے تحت وہ ایسا کرنے کی مجاز ہے۔ اس کے بعد کسی دن فرانسیسی پارٹی کی بھی باری آئے گی۔ یہ سوشل حب الوطنی کے خطوط پر کامنٹرن کے انحطاط کا آغاز ہوگا۔'' (25)

خارجہ پالیسی پر سٹالن کا غلبہ تھا جو بین الاقوامی مزدور طبقے پر اعتماد مکمل طور پر کھو بیٹھا تھا اور سراسیمگی کے عالم میں ''سوویت یونین کے خلاف حملے کے دفاع کیلئے'' اتحادی تلاش کر رہا تھا۔ کامنٹرن کا کردار پہلے ہی ایک سرحدی محافظ اور ماسکو کی خارجہ پالیسی کے آلے کا رہ گیا تھا۔ 1925-27ء کے چینی انقلاب کے دوران جب کروڑوں ایشیائی میدان عمل میں تھے کامنٹرن نے انقلاب لانے کیلئے مزدوروں اور کسانوں پر انحصار کرنے کی بجائے، جیسا کہ روس میں لینن اسٹ پالیسی رہی تھی، خود کو قوم پرست کو منتانگ میں چیانگ کائی شیک کے گرد موجود جرنیلوں اور چینی سرمایہ داروں کے تابع رکھنے کو ترجیح دی۔ سٹالن نے کومنتانگ کو ''چار طبقات پر مشتمل'' ایک انقلابی بلاک قرار دیا۔ 1926ء کے اوائل میں اسے کمیونسٹ انٹرنیشنل میں ایک رکن کی حیثیت سے داخل کر لیا گیا۔ چیانگ کو کامنٹرن کی ایگزیکٹو کمیٹی کا

اعزازی رکن منتخب کر لیا گیا جب کہ واحد اختلافی ووٹ ٹراٹسکی نے ڈالا تھا۔لیفٹ اپوزیشن نے اس منشویک پالیسی کے نتائج کیخلاف خبردار کیا۔چینی کمیونسٹ پارٹی واحد مزدور پارٹی تھی اور مزدور طبقے پر اس کا گہرا اثر ورسوخ تھا جب کہ کسان جاگیرداروں کے ہاتھوں صدیوں کے مظالم سے نجات حاصل کرنے کیلئے روسی مثال کی طرف دیکھ رہے تھے جو زمین پر قبضے کے ذریعے ہی ممکن تھی۔

سٹالن کے احکامات کے تحت اور کومنتانگ کے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے الگ تھلگ ہو جانے کے خوف سے چینی کمیونسٹوں نے خود کو زرعی انقلاب کی راہنمائی کیلئے پیش نہیں کیا۔کامنٹرن نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ مزدور طبقے کی آزادی کی راہ اپنانے سے انکار کر دیا جس کے بارے میں لینن کا اصرار تھا کہ مشرق میں انقلاب جمہوری اور سامراج دشمن انقلابات کے حوالے سے کمیونسٹ پالیسی کی اولین شرط ہے۔ 20 مارچ 1926ء کو کومنتانگ کی فوجی قیادت نے چیانگ کائی شیک کے احکامات پر نمایاں کمیونسٹوں اور ٹریڈ یونین لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔سٹالن کی اتھارٹی کو بچانے کی خاطر دائیں بازو کی اس بغاوت کی تمام خبروں کو دبا دیا گیا۔انپر ی کور نے بغاوت کی خبروں کو ''سامراجیوں کا شوشہ'' قرار دے کر مسترد کر دیا۔ چیانگ نے انقلابیوں کے گڑھ شنگھائی میں ایک مزید بغاوت برپا کی اور کمیونسٹ مزدوروں کا قتل عام کیا۔جب انقلاب کو مکمل شکست ہو چکی تو سٹالن نے کینٹن میں ایک خونریز بغاوت کا حکم صادر فرمایا جو خالصتاً مہم جوئی تھی۔اس میں پرولتاریہ کا ہراول دستہ ختم ہو گیا۔سٹالن نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''چیانگ کائی شیک کی بغاوت چینی انقلاب کے راستے میں آنیوالے موڑوں میں سے ایک تھا جس کی ضرورت اس لئے تھی کہ کوڑا کرکٹ کو صاف کر کے انقلاب کو آگے بڑھایا جا سکے۔''(26)

ایسی ہی موقع پرستانہ پالیسی برطانیہ کے سلسلے میں بھی اپنائی گئی جہاں عوام شدید ریڈیکلائزیشن کے عمل سے گزر رہے تھے۔سوویت یونین کیخلاف مداخلت کا مقابلہ کرنے کی غرض سے روسی ٹریڈ یونینوں نے برطانیہ کی ٹریڈ یونین کانگریس (ٹی یوسی) کی جنرل کونسل سے سمجھوتہ کر لیا جن کا باہمی تعاون اینگلو رشین کمیٹی کے ذریعے ہونا تھا۔ برطانیہ میں انقلابی رجحان کا اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ دس لاکھ اراکین یعنی ٹریڈ یونین ممبرشپ کا ایک چوتھائی حصہ اقلیتی تحریک کی شکل میں منظم تھا۔برطانیہ کی صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے ٹراٹسکی نے ایک عام ہڑتال کی پیش گوئی کی تھی۔کمیونسٹ پارٹی اور کمیونسٹ انٹرنیشنل کا فریضہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ مزدوروں کو ٹریڈ یونین قیادت کی ناگزیر غداری کے بارے میں خبردار کریں۔اس کی بجائے انہوں نے مزدوروں کے ذہنوں میں خوش فہمی کے بیج بوئے خصوصاً اس لیے کہ

برطانوی ٹریڈ یونین بیوروکریسی نے اینگلو رشین کمیٹی کے وقار کو ڈھال بنا رکھا تھا۔ ٹریڈ یونین بیوروکریسی کی 1926ء کی عام ہڑتال کے موقع پر غداری کے بعد ٹراٹسکی نے تقاضا کیا کہ روسی ٹریڈ یونین برطانوی ٹی یو سی سے اپنے تعلقات منقطع کر لیں۔ سٹالن اور کامنٹرن نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ جب تک برطانوی ٹریڈ یونین قیادت کو اینگلو رشین کمیٹی کی ضرورت محسوس ہوئی انہوں نے اسے استعمال کیا اور پھر عام ہڑتال کے ایک سال بعد خود ہی تعلقات منقطع کر لئے۔ کامنٹرن نے شور و غوغا مچایا کہ ہمارے ساتھ غداری ہوئی ہے۔ ان عظیم واقعات کے نتیجے میں کم عمر برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے اثر و رسوخ اور تعداد میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ بدقسمتی سے انٹرنیشنل کی لائن پر عمل کرتے ہوئے وہ ٹی یو سی کی جنرل کونسل میں ''بائیں بازو والوں'' کی پیروی کرتی رہی جب کہ وہ خود سٹرن اور تھامس جیسے دائیں بازو کے لوگوں کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ وہ انٹرنیشنل کی موقع پرستانہ پالیسی کے باعث بھٹک گئی اور اپنے راستے میں آنے والے مواقع سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے میں ناکام رہی۔ ان کے زاویہ نگاہ کو سنٹرل کمیٹی کے ایک ممبر جے ٹی مرفی نے ہڑتال کے موقع پر یوں بیان کیا کہ ''ہماری پارٹی کے پاس ٹریڈ یونینوں میں نمایاں عہدے نہیں ہیں۔ وہ مالکوں اور حکومت سے مذاکرات نہیں کر رہی ہے۔ یہ صرف مشورے دے سکتی ہے اور اپنی خدمات ان مزدوروں کو مہیا کر سکتی ہے جن کی قیادت دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔۔۔ اس بحران سے انقلابی امکانات کی بہت زیادہ توقع کرنا اور جدوجہد سے فوری قیادت کا ابھرنا وغیرہ جیسے خیالات احمقانہ ہیں۔'' (27)

متضاد امر یہ ہے کہ چین اور برطانیہ میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کی ان شکستوں کے باعث، جو سٹالن اور بیوروکریسی کی غلط پالیسی کا براہ راست نتیجہ تھیں، سوویت یونین کے اندر بیوروکریسی کی قوت میں اضافہ ہوا۔ لیفٹ اپوزیشن نے ٹراٹسکی کی سرکردگی میں ان واقعات کا درست تجزیہ کیا تھا اور درست پیش گوئی کی تھی مگر انہیں پہلے کمیونسٹ پارٹی اور پھر انٹرنیشنل سے نکال دیا گیا۔

''تیسرا دور''

سٹالن چین میں سرمایہ دار عناصر کی حمایت حاصل کرنے اور برطانیہ میں ٹریڈ یونین بیوروکریسی کو ہم خیال بنانے کی کوشش میں اپنے ہاتھ بری طرح جلا چکا تھا۔ اب اس نے کامنٹرن کو بالکل مخالف سمت

میں موڑ دیا۔ انٹرنیشنل کی کانفرنس چار سال سے نہیں ہوئی تھی جو اس کے آئین کی خلاف ورزی تھی۔ 1928ء میں ایک نئی کانگریس بلائی گئی اور ایک ملک میں سوشلزم کے پروگرام کو سرکاری طور پر انٹرنیشنل کے پروگرام میں شامل کر دیا گیا۔ اس میں سرمایہ داری کے استحکام کے خاتمے اور ''تیسرے دور'' کے آغاز کا اعلان بھی کیا گیا۔ 1917ء کے بعد والے انقلابی دور (پہلا دور) اور 1923ء کے بعد سرمایہ داری کے نسبتاً زیادہ مستحکم دور کے بعد (دوسرا دور) اس نام نہاد تیسرے دور میں عالمی سرمایہ داری کا آخرکار خاتمہ ہو جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سٹالن کی ایک مشہور زمانہ (اب دفن شدہ) تھیوری کے مطابق سوشل ڈیموکریسی نے خود کو ''سوشل فاشزم'' کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اب کمیونسٹوں اور ''سوشل فاشسٹوں'' کے درمیان سمجھوتا ناممکن تھا جو مزدور طبقے کو درپیش سب سے بڑا خطرہ تھے۔

یہی دور تھا جب 33-1929ء کی بے نظیر کساد بازاری نے سرمایہ دار دنیا کو بری طرح متاثر کیا۔ خاص طور پر جرمنی کو سخت دھچکا پہنچا۔ معیارِ زندگی بہت گر گیا۔ جرمن مزدور طبقے کو ذلت و افلاس کا سامنا تھا جب کہ درمیانہ طبقہ بھی تباہ ہو چکا تھا۔ جرمنی میں بیروزگاری میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ بیروزگاری کے عروج پر بے روزگاروں کی تعداد ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ درمیانے طبقے کو 1918ء کے انقلاب سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوا تھا اور 1923ء میں بھی اسے مایوسی ہوئی جب کمیونسٹ اقتدار پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے تھے۔ اب مایوسی اور پریشانی کے عالم میں انہوں نے اپنے مسائل کے حل کیلئے ایک مختلف سمت میں دیکھنا شروع کر دیا۔ سرمایہ داروں کی حمایت اور مالی معاونت سے نازیوں نے جرمنی میں عوام کے اندر جڑیں پکڑنا شروع کر دیں۔ ستمبر 1930ء کے انتخابات میں انہیں تقریباً پینسٹھ لاکھ ووٹ ملے۔ سٹالن کی پالیسیوں نے کمیونسٹ انٹرنیشنل پر تباہ کن اثرات مرتب کئے تھے۔ سوویت یونین میں بائیں بازو کی طرف جھکاؤ کا اظہار جبری اشتراکیت اور پانچ سالہ منصوبوں کی چار سال میں تکمیل کے پاگل پن کے ذریعے ہوا اور اس کی بین الاقوامی سطح پر عکاسی ''تیسرے دور'' اور ''سوشل فاشزم'' کے الٹرالیفٹ نظریات کی صورت میں ہوئی۔ اس کے بدترین اثرات جرمنی میں مرتب ہوئے جہاں مزدور طبقے کی تقسیم کیلئے یہ براہ راست ذمہ دار تھے اور اس سے ہٹلر کو بلا روک ٹوک اقتدار میں آنے کی اجازت مل گئی۔

جرمن مزدور طبقہ دنیا کے طاقتور ترین مزدور طبقات میں سے ایک تھا جس کے پاس طاقتور مزدور تنظیمیں تھیں اور لاکھوں مزدور سوشلسٹ اور کمیونسٹ ملیشیاؤں میں منظّم تھے۔ جرمن کمیونسٹ پارٹی اور سوشل ڈیموکریسی مشترکہ طور پر جرمنی کی سب سے بڑی قوت تھیں۔ 1930ء میں ہٹلر کی پہلی انتخابی پیش

رفت کے وقت جب نازیوں کو پینسٹھ لاکھ ووٹ ملے تھے، کمیونسٹوں کو پینتالیس لاکھ اور سوشل ڈیموکریسی کو پچاسی لاکھ ووٹ ملے تھے یعنی مشترکہ طور پر نازیوں کے مقابلے میں دگنے سے بھی زیادہ۔ کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ قوتوں کی مجموعی طاقت فاشسٹوں کو ہرانے کیلئے کافی تھی اگر وہ جدوجہد کے کسی سنجیدہ پروگرام کے حوالے سے اکٹھے ہو جاتے۔ اس کے باوجود 1933ء میں ہٹلر یہ شیخی بگھارنے کے قابل ہو گیا کہ ہم نے ''کسی کھڑکی کا شیشہ توڑے بغیر'' اقتدار پر قبضہ کر لیا ہے۔

اس خوفناک صورتحال کی وجہ سوشل ڈیموکریسی اور سٹالنسٹ بیوروکریسی کی قیادت کی پالیسیاں تھیں جنہوں نے جرمن پرولتاریہ کو مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ 1931ء میں سٹالنسٹ اس حد تک چلے گئے کہ انہوں نے پروشیا کی سوشل ڈیموکریٹ حکومت کو گرانے کیلئے غیر سرکاری طور پر نازیوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ قائم کر لیا (نام نہاد سرخ ریفرنڈم)۔ ایک موقع پر انہوں نے یہ نعرہ لگایا ''چھوٹے شیدمانوں کو سکول کے احاطے میں مارو''۔ یہ کمیونسٹوں کے بچوں کو دعوت تھی کہ سوشل ڈیموکریٹوں کے بچوں کی پٹائی کریں۔ جین والٹن اس وقت جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کا سرگرم رکن تھا۔ وہ اس پالیسی کے حوالے سے اپنے تجربات یوں بیان کرتا ہے:

''یہ ایک عجیب وغریب اتحاد تھا جسے سرخ یا براؤن بیوروکریسی نے کبھی تسلیم کیا نہ اس کا اعلان ہوا مگر بہر حال یہ ایک تلخ حقیقت تھی۔ بہت سے عام پارٹی ارکان نے شدت سے اس کی مزاحمت کی، ڈسپلن کی وجہ سے وہ کھلم کھلا سنٹرل کمیٹی کی مذمت نہیں کر سکتے تھے مگر انہوں نے مجہول مزاحمت کی مہم ضرور چلائی۔ تاہم زیادہ سرگرم اور وفادار کمیونسٹ عناصر زور وشور سے ان تازہ ترین پارٹی احکامات کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے اور میں بھی ان میں شامل تھا۔ ایک سمجھوتے کے تحت سٹالن اور ہٹلر کے پیروکار ایسے مواقع پر ایک عارضی صلح کر کے اپنی قوتوں کو یکجا کر لیتے تھے جب انہیں جمہوری محاذ کے مظاہروں اور اجتماعات پر حملہ کرنے اور انہیں منتشر کرنے کا موقع ملتا تھا۔ صرف 1931ء کے دوران ہی ایسے بیسیوں مواقع آئے جب میں نے نازیوں کے انتہائی غنڈہ گرد عناصر کے ساتھ مل کر ایسے دہشت گردی کے کام سرانجام دیئے۔ میں اور میرے ساتھی محض پارٹی کے احکامات پر عمل کر رہے تھے۔ میں اس قسم کے چند واقعات بیان کر رہا ہوں جن سے آپ کو ڈیمٹروف ہٹلر اتحاد کی نمایاں خصوصیات کا اندازہ ہو سکے اور یہ بھی پتہ چلے کہ اس وقت تمام جرمنی میں کیا ہو رہا تھا:

''1931ء کے موسم بہار میں سوشلسٹ ورکرز یونین نے مغربی جرمنی کی تمام بڑی بندرگاہوں

کے جہازوں اور گودیوں کے نمائندوں کی کانفرنس بلائی تھی۔اس کانفرنس کا انعقاد بریمن کی بندرگاہ کے ہاؤس آف لیبر میں ہوا۔ یہ پبلک تقریب تھی اور مزدوروں کو بھی سامعین کے طور پر مدعو کیا گیا تھا۔کمیونسٹ پارٹی نے نازی پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں ایک قاصد کو اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ ٹریڈ یونین کانفرنس کو درہم برہم کرنے میں تعاون کیا جائے۔جیسا کہ ایسے مواقع پر اکثر ہوتا تھا،ہٹلر کے پیروکار اس پر رضامند ہو گئے۔ کانفرنس کا آغاز ہوا تو گیلریوں میں دو تین سو کمیونسٹ اور نازی کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے میں اور نازی پارٹی کی طرف سے والٹر ٹیڈو نامی سٹارم ٹروپ لیڈر کارروائی کا انچارج تھا۔ دومنٹ کے اندر اندر ہم ایک منصوبے پر عمل درآمد کیلئے متفق ہو چکے تھے۔ سوشل ڈیموکریٹوں کی کانفرنس کا آغاز ہو چکنے کے بعد میں اپنی جگہ سے اٹھا اور باآواز بلند اوٹ پٹانگ تقریر شروع کر دی جب کہ ہال میں دوسرے حصے سے ٹیڈو نے بھی یہی حرکت کی۔ٹریڈ یونین کے نمائندے پہلے تو گم سم رہ گئے پھر چیئرمین نے حکم دیا کہ ان دونوں گڑ بڑ پھیلانے والوں کو بلڈنگ سے نکال دیا جائے۔ہم خاموشی سے بیٹھے تمسخرانہ انداز میں ان ہٹے کٹے ٹریڈ یونین والوں کو دیکھتے رہے جو ہمیں باہر نکالنے کی نیت سے آرہے تھے ہم نے اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا۔جیسے ہی انہوں نے ہمیں ہاتھ لگایا ہمارے ساتھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔فرنیچر ٹوٹ گیا،مندوبین کی پٹائی ہوئی اور ہال کباڑ خانے میں تبدیل ہو گیا۔ پولیس اور ایمبولینس کی آمد سے پہلے ہم گلی میں پہنچ گئے اور ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔اگلے دن نازی اور ہماری اپنی پارٹی کے اخبارات نے پہلے صفحے پر شہ سرخیاں جمائیں کہ کس طرح، سوشلسٹ مزدوروں نے اپنے بدعنوان لیڈروں کی، غداری، سے چراغ پا ہو کر ان کی اچھی ٹھکائی کی۔‘‘(28)

ان طریقوں سے انتہائی طاقتور جرمن مزدور طبقے کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے نازیوں کے حوالے کر دیا گیا۔کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ دونوں ہی ہٹلر کے جبری مشقت کیمپوں میں پہنچ گئے اور سوویت یونین ایک زبردست خطرے سے دوچار ہو گیا۔ یہ ’’سوشل فاشزم‘‘ کی پالیسی کی فرد میزان ہے۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل سے اپنے اخراج کے باوجود ٹراٹسکی اور اس کے پیروکار اپنے آپ کو اس کا حصہ سمجھتے تھے بار بار اصرار کرتے تھے کہ انہیں دوبارہ شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔ساتھ ہی ساتھ وہ خودکشی کے اس نظریے پر بھی شدید تنقید کرتے تھے جسے کامنٹرن نے اپنا رکھا تھا۔اس کی بجائے وہ عوام کو عمل کے دوران اور اپنے تجربات کے ذریعے کمیونزم کی طرف راغب کرنے کیلئے متحدہ محاذ کی حقیقت

پسندانہ لینن اسٹ پالیسی کی طرف واپسی کا تقاضا بھی کرتے تھے۔ انتخابات میں ہٹلر کی فتح کے ساتھ ہی ٹراٹسکی نے خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ اپنے ایک پمفلٹ ''کمیونسٹ انٹرنیشنل اور جرمنی کی صورتحال میں تبدیلی'' میں اس نے ایک مہم شروع کرنے کا اشارہ دیا جسے کامنٹرن کی انٹرنیشنل لیفٹ اپوزیشن نے تین سال تک جاری رکھا۔ جرمنی، فرانس، امریکہ، برطانیہ اور جنوبی افریقہ کے علاوہ جن ممالک میں بھی ٹراٹسکائیٹ گروپ موجود تھے وہاں انہوں نے یہ مہم چلائی کہ جرمن کمیونسٹ پارٹی سوشل ڈیموکریٹوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ قائم کرنے کی مہم چلائے تا کہ ہٹلر کو اقتدار میں آنے سے روکا جا سکے۔

ہٹلر کی فتح

سٹالن اور کامنٹرن کی براہ راست ہدایات کے تحت جرمن کمیونسٹ پارٹی نے اس پالیسی کو ردانقلابی ''سوشل فاشزم'' قرار دے کر اس کی مذمت کی۔ انہوں نے بڑے اصرار کے ساتھ سوشل ڈیموکریسی کو مزدور طبقے کا بڑا دشمن قرار دے کر اس کیخلاف لڑائی جاری رکھی اور دلیل یہ دی کہ جمہوریت اور فاشزم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ستمبر 1930ء میں جرمن کمیونسٹ پارٹی کے اخبار روڈ فھانی نے اعلان کیا کہ ''کل کا دن ہٹلر کیلئے عظیم ترین تھا مگر نازیوں کی انتخابات میں نام نہاد کامیابی ان کے خاتمے کا آغاز ہے۔'' ان تمام سالوں کے دوران کامنٹرن تباہی کے اسی راستے پر گامزن رہی۔ مئی 1932ء میں برطانیہ کے ڈیلی ورکر اخبار نے بڑے فخر سے ٹراٹسکائیٹس کی جرمنی میں پالیسی پر فرد جرم عائد کرتے ہوئے لکھا کہ ''یہ بات قابل غور ہے کہ ٹراٹسکی فاشزم کے خلاف کمیونسٹ اور سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے متحدہ محاذ کے دفاع میں بول رہا ہے۔ موجودہ دور میں اس سے زیادہ خلل انگیز، ردانقلابی اور طبقے کو غلط راہ پر لگانے والی کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی۔'' اس دوران ٹراٹسکی نے چار پمفلٹ اور درجنوں کے حساب سے مضمون اور مینی فیسٹو لکھے۔ عالمی ٹراٹسکائیٹ نے کامنٹرن کی پالیسی تبدیل کروانے کیلئے ہر ممکن کوشش کی لیکن لا حاصل۔ جنوری 1933ء میں ہٹلر اس قابل ہو گیا کہ بغیر کسی مزاحمت کے ایک ایسے ملک میں اقتدار پر قبضہ کر سکے جہاں ایک انتہائی منظّم مزدور طبقہ اور روس کے باہر سب سے طاقتور کمیونسٹ پارٹی موجود تھی۔ تاریخ میں پہلی بار مزدور طبقے کی مزاحمت کے بغیر رجعت پسندوں کو اقتدار پر قبضے کی اجازت دے دی گئی۔

اس غداری کے باعث جرمن کمیونسٹ پارٹی ہمیشہ کیلئے ختم ہو چکی تھی۔ مگر کامنٹرن اس تباہی کی

نوعیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ بلکہ اس نے جرمن کمیونسٹ پارٹی اور انٹرنیشنل کی پالیسی کو بالکل درست قرار دیا۔اس واقعہ کو جرمن مزدور طبقے کی زبردست شکست کے طور پر تسلیم کرنے کی بجائے کامنٹرن نے اسے ایک فتح قرار دیا اور اس کا نعرہ تھا ''ہٹلر کے بعد ہماری باری!'' کمیونسٹ پارٹیوں کے اندر عالمی سطح پر کوئی مخالفت ہوئی اور نہ ہی کوئی صدائے احتجاج بلند ہوئی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سیاسی طور پر کس قدر زوال پذیر ہو چکی تھیں۔اس سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ 1914ء کی دوسری انٹرنیشنل کی طرح تیسری (کمیونسٹ) انٹرنیشنل بھی سیاسی طور پر مردہ ہو چکی تھی اور سوشلسٹ انقلاب کا ذریعہ تصور نہیں کی جا سکتی تھی۔ مارچ 1933ء میں ٹراٹسکی نے سوویت یونین اور کمیونسٹ پارٹی کی اصلاح کی لڑائی لڑنے کی بجائے ایک نئی پارٹی بنانے کو کہا جو اس کی جگہ لے سکے۔ جولائی میں ٹراٹسکی نے لکھا:

''کامنٹرن کے مزید کمزور ہونے سے، عالمی پرولتاریہ کے ہراول دستے کے مفلوج ہونے سے اور ان حالات میں عالمی فاشزم کے فروغ کے باعث سوویت یونین میں رد انقلاب کی فتح ناگزیر ہو گی۔فطری امر ہے کہ حالات سے قطع نظر بالشویک لیننسٹ سوویت یونین کے اندر اپنا کام جاری رکھیں گے۔لیکن مزدور ریاست کو صرف عالمی انقلابی تحریک کی مداخلت ہی بچا سکتی ہے۔ساری انسانی تاریخ میں اس حیات نو کیلئے معروضی حالات کبھی بھی اتنے سازگار نہیں رہے جتنے اب ہیں۔اگر کمی ہے تو ایک انقلابی پارٹی کی۔ سٹالنسٹ ٹولہ روس کے اندر اور باقی دنیا میں پارٹی کو تباہ کر کے ہی حکمرانی کر سکتا ہے۔اس شیطانی چکر سے فرار صرف سٹالنسٹ بیوروکریسی سے چھٹکارا پانے کے بعد ہی ممکن ہے۔ایک صاف جھنڈے کے نیچے ایک تازہ جگہ کی تعمیر ضروری ہو گئی ہے۔''(29)

جو تنظیم تاریخ کے اسباق سے کچھ نہیں سیکھتی اس کی تباہی یقینی ہو جاتی ہے۔عالمی سوشلزم کی قوت کے طور پر کمیونسٹ انٹرنیشنل مردہ ہو چکی تھی۔ انٹرنیشنل لیفٹ اپوزیشن اس سے الگ ہو گئی اور ایک ہی انٹرنیشنل کی ضرورت کا اعلان کر دیا۔مگر جو کچھ کامنٹرن کی اصلاح سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے ہراول دستے کی نگاہوں کے سامنے بالکل واضح تھا عوام کی اکثریت کیلئے واضح نہیں ہو سکا۔وہ صرف عظیم واقعات سے ہی سیکھ سکتے تھے۔ان واقعات کی بنیاد پر ٹراٹسکی اس نتیجے پر پہنچا کہ نئی انقلابی پارٹیوں اور چوتھی انٹرنیشنل کی تعمیر ضروری ہو گئی ہے۔اس نے اپنی زندگی اس فریضے کیلئے وقف کر دی یہاں تک کہ اگست 1940ء میں ایک سٹالنسٹ ایجنٹ نے اسے قتل کر دیا۔

سوویت یونین کے اندر یہ بات واضح ہو گئی کہ سٹالنسٹ بیوروکریسی بتدریج مزدور طبقے سے آزاد ہو

چکی ہے۔ مزدوروں کے کنٹرول کی آخری باقیات کو بھی ختم کر دیا گیا۔ سٹالن نے شیخی بگھاری تھی کہ ''کیڈروں کو صرف خانہ جنگی کے ذریعے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔'' مقدار معیار میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس سے ٹراٹسکی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سٹالنسٹ ردانقلاب ایک نئے موڑ تک پہنچ چکا ہے اور بیوروکریسی کو ہٹا کر مزدوروں کی حقیقی جمہوریت پر مبنی نظام دوبارہ رائج کرنے کیلئے ایک نیا انقلاب، ایک سیاسی انقلاب ضروری ہے۔

ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ ''پچھلے چند برسوں کے تجربے کے بعد یہ فرض کرنا ایک طفلانہ حرکت ہو گی کہ سٹالنسٹ بیوروکریسی کو کسی پارٹی یا سوویت کانگریس کے ذریعے ہٹایا جا سکتا ہے۔ درحقیقت بالشویک پارٹی کی آخری کانگریس وہ بارہویں کانگریس تھی جو 1923ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اس کے بعد والی ساری کانگریسیں نوکرشاہانہ پریڈیں تھیں۔ آج ایسی کانگریسیں بھی ترک کر دی گئی ہیں۔ حکمران ٹولے کو ہٹانے کا کوئی نارمل ''آئینی'' طریقہ باقی نہیں رہا۔ بیوروکریسی کو صرف طاقت کے ذریعے ہی اقتدار پرولتاریہ کے ہراول کے سپرد کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔'' (30) آخر میں وہ لکھتا ہے کہ ''مسئلہ پرولتاریہ کی ڈکٹیٹر شپ کیخلاف ایک مسلح بغاوت کرنا نہیں بلکہ اس کے جسم پر بنی ہوئی رسولی کو کاٹ پھینکنے کا ہے۔'' پارٹی اور سوویت ریاست کی اصلاح پر مبنی سابقہ پوزیشن اب متروک ہو چکی تھی۔ جلد ہی تطہیر کے خوفناک تجربے نے اس تجزیے کی توثیق کر دی۔

کمیونسٹ انٹرنیشنل نے اپنی یہ غلط پالیسی 1934ء تک جاری رکھی۔ آسٹریا اور جرمنی میں فاشزم کی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر جب فرانس میں فاشسٹوں نے پارلیمنٹ اور لبرل حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے مسلح مظاہرے شروع کئے تو کمیونسٹ پارٹی نے ان کے ساتھ مل کر مظاہرے کرنے کے احکامات جاری کر دیئے۔ لیکن اب ہر کوئی اس خطرے کو دیکھ رہا تھا جو ہٹلر کی شکل میں سوویت یونین کو درپیش تھا۔ سٹالن اور بیوروکریسی پر حواس باختگی طاری ہو گئی۔ سٹالن عالمی انقلاب کے ایک آلے کی حیثیت سے کامنٹرن کی صلاحیت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اب اس نے زیادہ کھل کر اسے روس کی خارجہ پالیسی کے ایک آلے میں تبدیل کر دیا۔ طبقاتی سماج کے اندر جو تنظیم مزدور طبقے کی نمائندہ نہیں رہتی وہ ناگزیر طور پر بورژوازی کے دباؤ اور اثر کے تحت آجاتی ہے۔ اب سٹالن نے اتحادیوں کی تلاش میں برطانیہ اور فرانس کی بورژوازی کی طرف رخ کر لیا۔ پاپولر فرنٹ پالیسی کو شروع کیا گیا اور 1935ء میں انٹرنیشنل کی آخری کانگریس میں اس کی توثیق کر دی گئی۔ لبرل سرمایہ داروں کے ساتھ مفاہمت کی پالیسی ایسی پالیسی ہے

جس کیخلاف لینن ساری زندگی جدوجہد کرتا رہا۔ یہ کامنٹرن اور پہلی مزدور ریاست کی زوال پذیری کے ایک نئے مرحلے کی نمائندگی کرتی تھی۔

پاپولر فرنٹ ازم

اگرچہ 1930ء کی دہائی میں سٹالن کی ذاتی طاقت کو استحکام حاصل ہوا مگر نوکر شاہانہ نظام کوئی مستحکم مظہر نہیں تھا۔ بونا پارٹ ازم اپنی فطرت کے حوالے سے ہی ایک سماجی بحران کا نظام ہوتا ہے۔ سٹالن پر داخلی سلامتی کا خبط سوار ہو گیا لہٰذا اس نے سرمایہ دار طاقتوں کے ساتھ ''معمول'' کے سفارتی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔ 1933ء کے بعد سٹالن کو امید تھی کہ ہٹلر کے جرمنی سے اس کے قریبی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔ سٹالن نے کہا کہ ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم جرمنی کے فاشسٹ نظام کے بارے میں بالکل پرجوش نہیں ہیں لیکن یہاں مسئلہ فاشزم کا نہیں ہے مثال کے طور پر اٹلی میں فاشزم سوویت یونین کے بہترین تعلقات کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنا'' لیکن ہٹلر کے دھتکارنے اور جرمنی کی تیز رفتاری کے ساتھ دوبارہ مسلح ہونے کیوجہ سے سٹالن نے خطرہ محسوس کرتے ہوئے دوسرے اتحادیوں کی تلاش شروع کر دی۔ اس نے جلدی سے لیگ آف نیشنز میں شمولیت اختیار کر لی جس کی مذمت لینن نے ''چوروں کا باورچی خانہ'' کہہ کر کی تھی۔ فوجی خطرے کا مقابلہ کرنے کیلئے کامنٹرن کو کہا گیا کہ وہ ''مشترکہ سلامتی'' کے فروغ کیلئے کام کرے۔ یہ 1935ء میں کامنٹرن کی ساتویں کانگریس میں پیش کی جانے والی اس تبدیل شدہ پالیسی کا لازمی جزو تھا جسے پاپولر فرنٹ ازم کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ 1943ء میں اپنے سامراجی اتحادیوں کیلئے خیرسگالی کے اظہار کے طور پر سٹالن نے کامنٹرن کو بالکل ہی ختم کر دیا۔

پاپولر فرنٹ ازم کی پالیسی کی بنیاد مزدور پارٹیوں اور بورژوا پارٹیوں کے درمیان اتحاد پر تھی۔ یہ لینن اور مارکس کے طریقہ کار سے متضاد تھی جو کہ طبقاتی خودمختاری کی پالیسی پر اصرار کرتے تھے۔ اس تصور کی بنیاد ہی غلط ہے کہ مزدور طبقے اور بورژوازی کے نام نہاد جمہوری دھڑے کے درمیان سمجھوتہ ممکن ہے۔ اس قسم کا ''اتحاد'' گھوڑے اور سوار کے درمیان اتحاد کے مترادف ہے! اس میں اجرتی مزدور اور سرمائے کے درمیان طبقاتی تصادم کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ سرمایہ دار چاہے لبرل ہو یا قدامت پسند اس کی پالیسی

ہمیشہ اس کے معاشی مفادات کے تابع ہوتی ہے۔ بحران کے زمانے میں بورژوازی مزدور قیادت کا سہارا لینے کی کوشش ضرور کرسکتی ہے تاکہ مزدوروں کو قابو میں رکھا جا سکے مگر اپنا مقصد پورا ہو جانے کے بعد وہ انہیں پھر دھتکار دیتی ہے۔

پاپولر فرنٹ محض طبقاتی مفاہمت پر مبنی پرانی ''لب۔لیب'' پالیسی کا ہی نیا روپ تھا جس پر مارکس نے کڑی تنقید کی تھی اور لینن نے اس سے زیادہ سخت تنقید کی تھی اور ساری عمر لبرل بورژوازی کے بارے میں خوش فہمیوں کیخلاف لڑتا رہا تھا۔ اگرچہ مخصوص حالات میں عملی مقاصد کے تحت لبرل دھڑے کیساتھ وقتی اتحاد کی اجازت تو دی جاسکتی ہے مگر تمام تاریخ گواہ ہے کہ ان کے ساتھ پروگرام کی بنیاد پر کیے گئے اتحاد کا نتیجہ تباہی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ مارکس اور اینگلز کی تحریروں اور بالخصوص لینن کی تحریروں میں ثابت کیا گیا ہے کہ لبرل بورژوازی جمہوری انقلاب کے فرائض کی ادائیگی کی اہلیت سے عاری ہے۔

بورژوازی کی ردانقلابی فطرت کے بارے میں مارکس اور اینگلز پہلے ہی وضاحت کر چکے ہیں جس کی ایک مثال 49-1848ء میں لکھی جانیوالی تحریر، جرمنی میں انقلاب اور ردانقلاب ہے۔ 1904ء میں لکھی جانیوالی اپنی کتاب ''نتائج اور امکانات'' میں ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ زارشاہی روس جیسے پسماندہ اور نیم جاگیردارانہ ملک میں بورژوازی اتنی تاخیر سے تاریخ کے دھارے میں شامل ہوئی ہے کہ اپنے تاریخی فرائض کی ادائیگی سے قاصر ہے۔ ایک طرف بینکوں اور دوسری طرف جاگیردار طبقے اور سامراج کے ساتھ ہزاروں بندھنوں سے بندھے ہونے کے باعث بورژوازی نامیاتی اعتبار سے مطلق العنانی اور جاگیرداری نظام کے خلاف لڑنے کی اہل نہیں ہے۔ سرمایہ دار زراعت میں اور جاگیردار صنعت میں سرمایہ کاری کرتے تھے۔ وہ ترقی کے خلاف ایک مشترکہ رجعتی بلاک کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے باہمی اختلافات سے قطع نظر (06-1905ء تک روسی لبرل دھڑا اشرافیہ سے اکثر و بیشتر متصادم رہا تھا) جب انہیں مزدوروں اور کسانوں کی انقلابی تحریک سے خطرہ درپیش ہوتا تو وہ فوراً آپس میں اتحاد کر لیتے۔ لینن کے دلائل کا پورا زور اس بات پر تھا کہ روس میں جمہوریت لبرل بورژوازی نہیں لاسکے گی بلکہ اسے صرف لبرل اور جاگیردار اشرافیہ کیخلاف پرولتاریہ اور غریب کسانوں کے انقلابی اتحاد کے ذریعے ہی لایا جاسکتا ہے۔ 06-1905ء میں یہ بات سچ ثابت ہوئی جب لبرل دھڑے نے انقلاب سے غداری کرتے ہوئے مزدوروں اور کسانوں کیخلاف مطلق العنانیت سے سازباز کرلی۔

اس دور میں بھی لینن بورژوازی کے ساتھ سمجھوتے یا اتحاد کے زبردست خلاف رہا ہے ماسوائے

ضمنی مسائل کے حوالے سے وقتی بلاک تشکیل دینے کے جب وہ مغربی یورپ سے پہلے روس میں ایک سوشلسٹ انقلاب کو خارج از امکان سمجھتا تھا۔لبرل بورژوازی کے ساتھ پروگرام کی بنیاد پر کسی بھی قسم کے بلاک کے تصور کو وہ ایک لعنت سمجھتا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نہ صرف روسی انقلاب کے تجربے سے بلکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کے تمام عرصے میں برپا ہونے والے نوآبادیاتی انقلابات میں قومی بورژوازی کے کردار سے بھی پوری طرح آشکار ہو چکی ہے۔لبرل بورژوازی کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کا تصور لینن کی نہیں بلکہ منشوک پالیسی کا حصہ تھا۔ 1904ء کے بعد سے اس پالیسی کی مخالفت بالشوازم اور منشوازم کے درمیان اختلاف کا مرکزی نکتہ تھی۔اس کا واضح ترین اظہار 1917ء کی عارضی حکومت کی صورت میں ہوا۔

یہ عارضی حکومت پاپولر فرنٹ کی ایک کلاسیکی مثال تھی جس میں حکمران طبقے نے اپنے ''بائیں'' بازو کے نمائندوں (کرنسکی) کے ذریعے مشترکہ حکومت بنا کر مزدور تنظیموں کی قیادت کا سہارا لیا تاکہ انقلاب کی روک تھام کی جاسکے۔ پاپولر فرنٹ کے پردے میں ردانقلاب اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے جوابی حملے کی تیاری کرتا ہے اور جب ایک بار عوام پاپولر فرنٹ ازم کے تجربے کے بعد کم ہمتی کا شکار ہو جاتے ہیں جس کی وجہ بنیادی استحصالی نظام کا تسلسل ہوتا ہے تو اصلاحات کی جگہ رد اصلاحات لے لیتی ہیں۔لینن نے منشویک اور سوشل انقلابی قیادت کو عارضی حکومت میں شمولیت پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور دس سرمایہ دار وزیروں سے علیحدگی کا تقاضا کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ مزدوروں کی علیحدہ حکومت تشکیل دی جائے جس کی بنیاد سوویتوں پر ہو۔یہی وہ بنیاد تھی جس پر اکتوبر انقلاب کی تیاری کی گئی تھی۔

ٹراٹسکی کے بقول کامنٹرن کی 1935ء میں اپنائی جانیوالی پالیسی ''منشوازم کی بدنیتی پر مبنی نقالی'' تھی۔سپین اور فرانس میں مبینہ طور پر فاشزم کے خطرے کی روک تھام کے لئے بنائی گئیں پاپولر فرنٹ حکومتوں کا بالکل متضاد اثر ہوا۔شدید معاشی اور سماجی بحران کی صورت میں صرف جاگیرداری اور سرمایہ داری کا تختہ الٹ کر اور ایک انقلابی تبدیلی کے ذریعے ہی سماج کو صحیح راستے پر لایا جاسکتا ہے۔بورژوازی (یہاں یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ بورژوازی کا سایہ) کے ساتھ اتحاد تباہی کا نسخہ تھا۔ان تمام صورتوں میں بڑے کاروباری حضرات اور لبرل اتحادیوں کے دباؤ کے تحت مزدوروں، کسانوں اور درمیانے طبقے کے معیار زندگی پر حملے کئے گئے۔ اصلاحات کے وعدے اپنی ضد میں تبدیل ہو گئے اور رجعت کی راہ ہموار ہوگئی۔سپین میں جو کچھ ہوا وہ اس کی سب سے خوفناک مثال ہے۔

انقلاب سپین

جولائی 1936ء میں سپین کا بہادر پرولتاریہ جنرل فرانکو کی فسطائی بغاوت کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ کیٹالونیا اور دیگر مقامات پر مزدوروں نے طاقت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ فوجی افسران کی بڑی تعداد فرانکو کے ساتھ مل گئی اور ریاست منہدم ہوگئی۔ ہسپانوی مزدوروں نے اقتدار پر قبضے کیلئے یکے بعد دیگرے کئی کوششیں کیں۔ بارسلونا میں انارکسٹ ٹریڈ یونین سی این ٹی اور بائیں بازو کی پوم نے باورچی خانے میں استعمال ہونے والی چھریوں، ڈنڈوں اور شکاری رائفلوں کے ساتھ فوجی بیرکوں پر حملہ بول دیا۔ انہوں نے فاشسٹوں کی قوت توڑ کر اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ سارے سپین میں یہ ممکن تھا اگر مزدور تنظیموں کی پالیسیاں درست ہوتیں جو ابھی تک بورژوا ریپبلکن کے ساتھ اتحاد میں منسلک تھیں جو کہ بورژوازی کا محض ایک سایہ تھا۔

کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کو بھی اعتراف کرنا پڑا کہ انقلابی تحریک پہلے ہی بورژوا جمہوریہ کی حدود کو پھلانگ چکی تھی۔ جاس ڈیاس کے مشاہدے کے مطابق پرانے نظام حکمرانی کی تباہی کا ہدف پہلے ہی پورا ہو چکا تھا اور انقلاب نے خود کو 14 اپریل کو قائم ہونے والی جمہوریہ، جو 17 فروری کو دوبارہ بحال ہوئی تھی، کے دفاع تک محدود نہیں رکھا تھا جیسا کہ کمیونسٹ پارٹی جنگ کے آغاز پر کہتی تھی۔ میڈرڈ کے محاذ پر موجود میگوایل نونیز جیسے تعلیم کے شعبے سے تعلق رکھنے والے ملیشیا کے رکن اس مقبول عام دھماکے کی گہرائی سے بخوبی واقف تھے۔

''یہ ایک انقلاب تھا۔ لوگ ان چیزوں کیلئے لڑ رہے تھے جو اس ملک کی رجعتی قوتوں نے ان کیلئے حرام قرار دے رکھی تھیں۔ زمین اور آزادی، استحصال اور سرمایہ داری کا خاتمہ، ہمیں اس سلسلے میں بالکل واضح ہونا چاہیے کہ عوام ایک بورژوا جمہوریت کیلئے نہیں لڑ رہے تھے۔'' (31)

اقتدار کا حتمی اظہار مسلح لوگوں کے جتھے ہوتے ہیں۔ جو کوئی انہیں کنٹرول کرتا ہے اقتدار اسی کا ہوتا ہے۔ لیکن جولائی 1936ء میں فرانکو کی فوجی بغاوت کے جواب میں سپین کے مزدور اٹھ کھڑے ہوئے۔ پرانی فوج کو تباہ کرنے کے بعد اس کی جگہ مزدوروں کی ملیشیاؤں کی قیادت ہی تھی جس نے مزدوروں کو اقتدار پر قبضے سے محروم رکھا۔ انہوں نے فاشسٹ رجعت کا سر کچل دیا تھا مگر تمام مزدور پارٹیوں، انارکسٹ،

سوشلسٹ، کمیونسٹ اور یہاں تک کہ پوم کی قیادت بورژوا پاپولر فرنٹ کی حکومت میں شامل ہوگئی اور انقلاب کے راستے میں سب سے بڑی دیوار بن گئی۔

کسی نہ کسی طور انہوں نے فاشسٹ بغاوت کے خلاف ہونیوالے جرات مندانہ فوری ردعمل کیساتھ غداری ضرور کی۔ انہوں نے مزدوروں کی طبقاتی تحریک کا راستہ گلی سڑی ریپبلکن بورژوا قیادت کے ساتھ ساز باز کے ذریعے روکا جو اس وقت اپنے علاوہ کسی کی نمائندگی نہیں کر رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد بورژوازی کے ساتھ نہیں بلکہ بورژوازی کے سائے کے ساتھ تھا۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی اکثریت فرانکو کی حمایت کرتی تھی اور بھاگ کر فرانکو کے نیشنل زون میں چلی گئی تھی۔ لیکن ریپبلیکنز نے عوام کی تحریک کے راستے میں ایک رجعتی رکاوٹ کا کام کیا۔ وہ فاشسٹوں کی نسبت مزدوروں اور کسانوں سے زیادہ خوفزدہ تھے اور فاشسٹوں کے آگے ہتھیار ڈالنے کیلئے بھی تیار تھے۔

اس وقت تک کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پارٹیوں کی قیادت کی اکثریت روسی بیوروکریسی کی خارجہ پالیسی کی ایجنٹ بن چکی تھی۔ انہوں نے بلا چون و چراں سٹالن کی ہدایات پر عمل کیا۔ سٹالن کو یہ خوف لاحق تھا کہ سپین یا مغربی یورپ کے کسی بھی ملک میں ایک کامیاب سوشلسٹ انقلاب بیوروکریسی کی طاقت کو کمزور کر کے اس کا تختہ الٹے جانے کی راہ ہموار کرے گا۔ انقلاب سپین کے سلسلے میں روسی مزدور بہت پرجوش تھے اور سٹالن کے اقتدار پر قابض ہونے کے بعد کسی بھی اور واقعہ نے ان کے جذبات کو اتنا نہیں بھڑکایا تھا۔ سٹالنسٹ حکومت کے ذریعے اقتدار پر براجمان رہنے کی کوشش میں بیوروکریسی کو قرون وسطیٰ کے دور کے ہتھکنڈے اپنانا پڑے۔ پرانے بالشویکوں اور انقلاب کی تقریباً تمام قیادت کو ختم کر دیا گیا اور کمیونسٹ پارٹی کے لاکھوں ارکان کو قتل کر دیا گیا۔ اس کی بڑی وجہ سپین کے انقلاب کا ردعمل تھا۔ انقلاب سپین کی فتح ماسکو بیوروکریسی کیلئے موت کی گھنٹی ثابت ہوتی۔

علاوہ ازیں بیوروکریسی لینن کی طرح انقلابی سفارت کاری میں یقین نہیں رکھتی تھی بلکہ ان کی غرض و غایت خالصتاً قوم پرستانہ تھی اس وقت وہ برطانیہ اور فرانس کے سرمایہ داروں کو خوش کر کے جرمنی کے خلاف اتحاد بنانا چاہتے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ انقلابی ریلا فرانس تک پھیل کر دنیا کے سیاسی اور سماجی توازن کو درہم برہم کر دے اور ان کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے۔ لیکن انقلاب سپین کو تباہ کر کے انہوں نے فرانکو کی جیت کو یقینی بنایا جس کے بعد دوسری عالمی جنگ ناگزیر ہوگئی۔ دوسری طرف برطانیہ اور فرانس کی نام نہاد جمہوریتیں ایک طرف غیر جانبداری کا ڈھنڈورا پیٹتی رہیں اور دوسری طرف فرانکو کی ہر

ممکن مدد کرتی رہیں۔سپین میں سٹالن کی ردانقلابی پالیسی نہ صرف برطانوی اور فرانسیسی سامراج کو سوویت یونین کا اتحادی بننے پر رضامند کرنے میں ناکام رہی بلکہ اس کے برعکس اسے ایک انتہائی شدید خطرے سے دوچار کر دیا۔

کمیونسٹ پارٹی کے ایک عام ممبر سے یہ بات منسوب کی گئی کہ ''ہم بعض اوقات سوچتے تھے کہ ہم کس لئے لڑ مر رہے ہیں؟ کیا اس دور کو واپس لانے کیلئے جس سے پہلے ہی واقف ہیں؟ اگر ایسی بات ہے تو اس مقصد کیلئے لڑنا فضول ہے۔ایسی خجالت سے انقلاب برپا کرنے کے باعث لوگ کم ہمتی کا شکار ہو گئے۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہے تھے۔میرا خیال ہے کہ کمیونسٹ پارٹی نے جنگ کے سلسلے میں انتہائی درست سوچ کا مظاہرہ کیا۔'' (32)

سپین کے مزدوروں نے 1931ء سے 1937ء تک کے سات سالہ عرصے میں بار بار اقتدار پر قبضے کی کوشش کی لیکن ہر مرحلے پر ان کی اپنی تنظیمیں ان کے راستے میں دیوار بن گئیں۔انہیں آخری موقع مئی 1937ء میں ملا۔ردانقلاب کے خصوصی فوجیوں کی طرح سٹالنسٹوں نے بارسلونا کے ٹیلی فون ایکسچینج پر قبضہ کرنے کی کوشش کی جو سی این ٹی کے قبضے میں تھی۔اس غداری کے جواب میں مئی 1937ء میں انارکسٹوں اور پوم سے تعلق رکھنے والے مزدوروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔اس تحریک کو بارسلونا کے مزدوروں کی بھاری اکثریت کی حمایت حاصل تھی یہاں تک کہ ان میں عام کمیونسٹ اور سوشلسٹ ممبر بھی شامل تھے۔لیکن ایک بار پھر سی این ٹی اور پوم نے اقتدار پر قبضے سے انکار کر دیا۔

سٹالنسٹ پراپیگنڈے سے قطع نظر پوم ایک ٹراٹسکائیٹ تنظیم نہیں تھی بلکہ اس میں نن اور آندرے جیسے کچھ سابقہ ٹراٹسکائیٹ عناصر موجود تھے۔ چھ ہفتے کے اندر اندر اس کی ممبر شپ چند ہزار سے ستر ہزار تک پہنچ گئی کیونکہ اسے بایاں بازو خیال کیا جاتا تھا اور اس کی قیادت انقلابی دکھائی دینے والے اعلانات کرتی تھی۔اس کا اپنا ریڈیو اسٹیشن اور روزنامہ تھا۔لیکن ٹراٹسکی نے خبردار کیا کہ ایک درست پالیسی کے بغیر، بورژوا ریپبلکن کیخلاف ایک طبقاتی پالیسی کے بغیر پوم نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب راکھ ہو جائیگا۔جلد ہی یہ پیش گوئی درست ثابت ہو گئی۔ایک فیصلہ کن وقت پر اس نے مزدوروں کو شکست سے دوچار کر دیا۔انقلابی پالیسی سے عاری ہونے کے باعث سی این ٹی اور پوم کی قیادت نے مطالبہ کیا کہ مزدور جدوجہد ترک کر کے کام پر واپس چلے جائیں۔وہ اس میں کامیاب بھی رہے مگر اس سے ان کی جان بخشی نہیں ہو سکی اور انقلاب پر بھی اس کے تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ چھ ہفتے کے اندر اندر پوم کے

بڑے بڑے لیڈروں کو جی پی یو کے عقوبت خانوں میں لے جا کر قتل کیا جا چکا تھا۔ پوم کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور سی این ٹی کو نہتا کر دیا گیا۔ اب بورژوا قیادت کے تحت ریاست کی تعمیر نو اور مسلح افواج کو بورژوا طریقوں کے مطابق منظّم کرنے کی راہ ہموار ہو گئی تھی۔

مارچ 1937ء میں پی سی ای کے جنرل سیکرٹری جاس ڈیاس نے اعلان کیا کہ فاشزم کے ایجنٹوں یعنی پوم میں چھپے ہوئے ٹراٹسکائیٹ کو ختم کر دیا جائے۔ یہ ماسکو میں جاری جھوٹے مقدمات میں لگائے جانے والے الزامات کا عکس تھا۔ لیکن سپین میں کی جانیوالی تطہیر کے پیچھے حقیقی قوت سٹالن کی جی پی یو تھی جو سپین کی کمیونسٹ پارٹی کے تمام نمایاں تنظیمی ڈھانچوں میں موجود تھی۔ مثال کے طور پر ہنگری کا بدنام زمانہ ارنو جیرو نامی سٹالنسٹ ایجنٹ پی ایس یو سی کی ہر میٹنگ میں شریک ہوتا تھا۔ تاہم کمیونسٹ پارٹی اور پی ایس یو سی کے لیڈروں نے ان سرگرمیوں میں عملی طور پر حصہ لیا۔ پی ایس یو سی کے اخبار ٹری بال کے ایڈیٹر پیری آرڈیا کا نے اگرچہ انڈریونن کے قتل میں پارٹی کے شریک ہونے کا اعتراف تو نہیں کیا مگر اس بات کا اعتراف ضرور کیا کہ پارٹی پوم کیخلاف کئے جانیوالے اقدامات کی حمایت کرتی تھی۔

''اگرچہ پوم کیخلاف کئے جانے والے اقدامات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا مگر ہم ان کے حق میں تھے۔ بعد ازاں پوم کیخلاف چلائے جانیوالے مقدمے میں پیش کی جانیوالی شہادت نے ہمیں دنگ کر دیا مگر ہمیں احتجاج کرنے کا خیال تک نہیں آیا کیونکہ ہم استغاثہ کے ہم خیال تھے۔'' (33) آرڈیا کا اور اس کے کامریڈ دنگ اس لئے رہ گئے کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ پوم والوں کیخلاف لگائے گئے الزامات بالکل غلط ہیں جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتا ہے کہ ''میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے سے پہلے بی او سی (مزدوروں اور کسانوں کا بلاک جو پوم کے بڑے دھڑوں میں سے ایک تھا) میں رہ چکا تھا اس لئے میں جانتا تھا کہ اگرچہ اس کے جنگجوؤں کے نظریات ہم سے مختلف تھے مگر وہ اپنے انقلابی عقائد کے حوالے سے ایمان دار اور مخلص تھے۔'' (34) اس میں کوئی حیرانگی کی بات نہیں کہ آرڈیا کا نے نن کے قتل کو ایک بوجھل روایت قرار دیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کوئی چیز تبدیل نہیں کر سکتی کہ سپین اور کیٹالونیا کی قیادت کم از کم سپین کے اندر سٹالن کی جی پی یو کی سرگرمیوں میں عملی طور پر ضرور ملوث تھی۔

انقلاب کی ناکامی نے ناگزیر طور پر اس تباہی کو جنم دیا جس کی پیش گوئی ٹراٹسکی کر چکا تھا۔ سٹالنسٹوں نے دائیں بازو کی سوشلسٹ حکومت کی حمایت کی جسے بے شمار شکستوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ریپبلکن محاذ کے پیچھے بورژوا رد انقلاب کی کامیابی کے بعد یہ ناگزیر عمل تھا۔ مزدور طبقہ مایوسی اور کم ہمتی کا

شکار ہوگیا۔ جنگ سے بھی بڑھ کر انقلاب میں مورال ایک کلیدی عامل کا کردار ادا کرتا ہے خالصتاً فوجی حوالے سے پیشہ ور فوج کیخلاف انقلاب کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں تربیت یافتہ افسر اور فوجی امور کے ماہرین شامل ہوتے ہیں۔ عوام کے حق میں واحد عامل ان کا انقلابی جوش و جذبہ ہوتا ہے۔ اس کے بغیر رجعت کی فتح ناگزیر ہوتی ہے۔ سپین میں فتح کی اولین شرط سیاسی تھی یعنی عوام کا اس مقصد پر اعتماد جس کیلئے وہ لڑ رہے تھے۔

اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ سے کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ روس میں بالشویکوں کی فتح سب سے بڑھ کر سیاسی عوامل کا نتیجہ تھی۔ اقتدار مزدوروں کے ہاتھ میں تھا جنہوں نے نہایت جوش وخروش سے اس کا دفاع کیا۔ اسی طرح دیہاتی علاقوں میں کسانوں نے اس زمین کیلئے لڑائی کی جو انہیں اکتوبر انقلاب کے طفیل ملی تھی۔ کچھ سال بعد ماؤزے تنگ نے چین میں کومنتانگ کے خلاف ایک نیم انقلابی جنگ لڑی۔ چین میں ہونے والی خانہ جنگی میں ماؤزے تنگ کی فوج چیانگ کائی شیک کی فوج کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی اور چیانگ کی فوج کو امریکہ نے مسلح کیا تھا۔ ایک سادہ سے انقلابی نعرے ''زمین کسانوں کیلئے''، کی بنیاد پر ماؤ دیہی عوام کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے چیانگ کی فوج کے سپاہیوں کو بھی زمین کی پیش کش کی۔ پورے کے پورے ڈویژن اس کے ساتھ آ ملے اور رجعتی افواج ہوا میں تحلیل ہوگئیں۔ سپین میں بھی ایسا ہونا ممکنات میں سے تھا مگر اس کیلئے ایک حقیقی انقلابی پالیسی کی ضرورت تھی۔

سپین کا انقلاب سٹالن اور بیوروکریسی کیلئے ایک جان لیوا خطرے کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہاں پہلی بار ماسکو نے جان بوجھ کر ایسی پالیسی اپنائی کہ انقلاب کامیاب نہ ہونے پائے۔

اس سے پہلے چین اور جرمنی میں ایسا غلطیوں کے باعث ہوا تھا لیکن یہ مختلف بات تھی۔ سپین میں انقلاب کی کامیابی کا مطلب سٹالن کی حکمرانی کا خاتمہ ہوتا۔ سپین کے مزدوروں کی تحریک نے روسی مزدوروں کے ذہنوں میں یہ امید پیدا کردی کہ یورپ کے دوسرے سرے پر بھی ایک نئی مزدور ریاست قائم ہوجائیگی۔ ان میں ایسا جوش وخروش انقلاب کے بعد سے نہیں دیکھا گیا تھا۔ یہ بات بیوروکریسی کیلئے خطرناک تھی اور اس نے اس کا جواب تطہیری مقدمات کے ذریعے دیا۔

تطہیری مقدمات

ٹراٹسکی نے لکھا تھا کہ ''پہلے پانچ سالہ منصوبے اور ہٹلر کے عروج (33-1931ء) سے پہلے جرمنی میں ہونیوالی عظیم ہلچل نے ایک بار پھر بیوروکریسی کے غلبے کو خطرے میں ڈال دیا۔ کیا ہم ایک لمحے کیلئے بھی اس بات پر شبہ کر سکتے ہیں کہ اگر سپین میں انقلاب فتح یاب ہو جاتا اور فرانسیسی مزدور اپنے مئی، جون 1936ء کے حملے کو نتیجہ خیز بنانے میں کامیاب ہو جاتے تو روسی پرولتاریہ اپنی لڑاکا صلاحیتوں اور ہمت کو دوبارہ حاصل کر لیتا اور رجعتیوں (تھرمیڈور) کو معمولی سی کوشش اقتدار سے محروم کر دیتی؟''(35)

بڑھتے ہوئے روسی مزدور طبقے نے پہلے پانچ سالہ منصوبے کی کامیابیوں سے حوصلہ پا کر عالمی انقلاب کے ڈرامائی اثرات کو دوبارہ محسوس کرنا اور نوکر شاہی کی تجاوزات کی مزاحمت کرنا شروع کر دیا۔ سٹالن کو یہ ڈر تھا کہ مغرب میں اٹھنے والی نئی انقلابی لہر روسی عوام میں بھی انقلابی احساسات کو بیدار کر دے گی۔ یہی وجہ تھی کہ آمرانہ ریاست کو مضبوط بنانے کیلئے سٹالنسٹ دہشت گردی کا بازار گرم کر دیا گیا۔

انقلاب سپین کے روسی مزدور طبقے اور روسی کمیونسٹ پارٹی پر پڑنے والے اثرات سے بوکھلا کر تطہیری مقدمات کو منظّم کیا گیا۔ سپین میں سوشلسٹ انقلاب کی تحریک نے سوویت مزدور طبقے کے دلوں میں عالمی انقلاب کی شمع دوبارہ روشن کر دی۔ سپین کے انقلاب کی کامیابی اور مزید پھیلاؤ کے خوف سے مغربی جمہوریتوں کے ساتھ معاملہ کرنے کی خواہش کے باعث سٹالن نے دیدہ دانستہ طور پر اس انقلاب کا گلا گھونٹ دیا۔ جرمنی (33-1930ء) اور چین (27-1925ء) کے انقلابات کے سلسلے میں ایسا نہیں تھا۔ یہ درست ہے کہ وہاں بھی سٹالن کی پالیسیاں ہی شکست کا باعث بنی تھیں۔ لیکن ایسا دیدہ دانستہ نہیں کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس اس وقت سٹالن بین الاقوامی سٹیج پر کامیابیوں کا خواہش مند تھا۔ لیکن 1936ء تک نیا حکمران ٹولہ مستحکم ہو چکا تھا اور اپنی مراعات کو کسی بھی حقیقی یا تصوراتی خطرے سے بچانے کیلئے بے چین تھا۔ حکمران طبقہ سپین کے انقلاب کو ایک خطرہ سمجھتا تھا۔ سٹالن محسوس کرتا تھا کہ ایک کامیاب انقلاب کمیونسٹ پارٹی کے اندر ان شخصیات کے گرد اک نئی حزب اختلاف کو جمع کر دے گا جن کا اکتوبر انقلاب سے براہ راست تعلق رہا ہے۔ لہٰذا اس خطرے سے چھٹکارا پانے کیلئے اس نے پرانے بالشویکوں کیخلاف ردانقلاب کے الزامات لگانے کے بعد گولی مروا دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

یہ تاریخ کے سب سے بڑے جعلی مقدمات تھے۔ ان مقدمات کا بہانہ لینن گراڈ پارٹی کے لیڈر

سرجی کیروف کے یکم دسمبر 1934ء کو ایک نوجوان کمیونسٹ کے ہاتھوں قتل کو بنایا گیا۔اس اشتعال انگیزی کا اہتمام بذات خود سٹالن نے کیا تھا۔ایسے شواہد موجود ہیں کہ اس وقت حکمران ٹولے میں سٹالن کیخلاف کچھ ہلچل بھی مچی تھی اور ایک نمایاں سٹالنسٹ کیروف کو سٹالن کا ممکنہ جانشین خیال کیا جا رہا تھا۔کیروف کے قتل کے جھوٹے مقدمے کے بعد گھناؤنے مقدمات اور اعترافات کا ایک سلسلہ شروع کیا گیا۔اس وقت سٹالن کے ملوث ہونے اور اعلیٰ سطح پر اس کی تیاری کی حقیقت کو خروشیف نے بیسویں اور بائیسویں کانگریس میں اپنی رپورٹوں میں آشکار کیا:

''کیروف کے قتل کے بعد بڑے پیمانے پر انتقامی کارروائیوں کا آغاز ہوا۔اس کے حقیقی قاتلوں کا سراغ لگانے کیلئے زبردست کوششوں کی ضرورت تھی۔ کیروف کے قتل سے متعلق مواد کا ہم جتنی زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ یہ حقیقت قابل غور ہے کہ کیروف کے قاتل کو اس سے قبل بھی دوبار سکیورٹی والوں چیکسٹ نے سالنی کے قریب گرفتار کیا تھا اور اس کے پاس سے اسلحہ بھی برآمد ہوا تھا۔لیکن کسی کی ہدایت پر اسے دونوں دفعہ رہا کر دیا گیا تھا۔ایک بار پھر یہی شخص مسلح حالت میں سالنی کی اس راہداری میں موجود تھا جس سے کیروف عام طور پر گزرتا تھا اور کسی نہ کسی وجہ سے کیروف کے قتل کے وقت اس کا چیف باڈی گارڈ اس سے بہت پیچھے تھا حالانکہ ہدایات کے مطابق اسے کیروف سے اتنے فاصلے پر نہیں ہونا چاہیے تھا۔

مندرجہ ذیل حقیقت بھی کچھ کم حیران کن نہیں ہے کہ جب کیروف کے چیف باڈی گارڈ کو پوچھ گچھ کے لئے لایا جا رہا تھا اور اس سے یہ پوچھ گچھ سٹالن، مولوٹوف اور وروشیلوف کو کرنا تھی، تو ڈرائیور کے بقول ان پہرے داروں نے جان بوجھ کر گاڑی کو حادثے کا نشانہ بنایا جو اسے پوچھ گچھ کیلئے لے جا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ حادثے میں مر گیا حالانکہ درحقیقت اسے انہی پہرے داروں نے قتل کیا تھا۔

اس طرح کیروف کا محافظ مار دیا گیا اور بعد ازاں اسے مارنے والوں کو بھی گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بظاہر یوں نظر آتا ہے کہ یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ ایک ایسا جرم تھا جس کی منصوبہ بندی بہت احتیاط سے کی گئی تھی۔ ایسا کون کر سکتا تھا؟ اس پیچیدہ کیس کے حالات جاننے کیلئے ایک جامع تفتیش شروع کی جا چکی ہے۔'' (36)

ٹراٹسکی نے ماسکو میں جاری ان مقدمات کو مزدور طبقے کے ہراول دستے کیخلاف ''یک طرفہ خانہ جنگی'' قرار دیا تھا۔اگست 1936ء میں اس نے کہا کہ ''موجودہ تطہیر نے بالشوازم اور سٹالن ازم کے

درمیان محض ایک خون کی لکیر ہی نہیں کھینچی بلکہ ایک خون کا دریا بہا دیا ہے۔' بالشویکوں کی ساری پرانی نسل، درمیانی نسل کے ایک اہم حصے اور بالشویک روایات پر سنجیدگی سے عمل کرنے والی نوجوان نسل کے ایک حصے کے خاتمے سے ثابت ہوتا ہے کہ سٹالن ازم اور بالشوازم سیاسی طور پر ہی نہیں بلکہ جسمانی طور پر بھی ساتھ نہیں چل سکتے۔'' (37)

پرانے بالشویکوں کی ایک پوری نسل کا صفایا کر دیا گیا۔ اس پرانی زار شاہی ریاستی مشینری نے جس کے خلاف لینن نے بار بار خبردار کیا تھا تطہیر کے ذریعے اپنی بالادستی کا ثبوت فراہم کر دیا جس کا مقصد انقلابیوں کا خاتمہ اور بالشوازم کی پوری وراثت کو صفحہ ہستی سے مٹانا تھا۔ اکتوبر انقلاب سے تعلق حقیقت میں موت کا پروانہ بن گیا۔ اس کا اطلاق صرف ٹراٹسکی کے پیروکاروں تک ہی محدود نہیں تھا حالانکہ سب سے اولین اور بنیادی شکار یہی لوگ تھے۔ لیکن جلد ہی بخارین کے پیروکار بھی ان کے ساتھ ہی جیلوں میں پہنچ گئے اور اس کے بعد وہ تمام لوگ جو ماضی سے رابطے کا ذریعہ تھے بشمول بہت سے سٹالنسٹوں کے۔ یہ بالشوازم کیخلاف یک طرفہ خانہ جنگی تھی جسے حکمران ٹولے نے دو بنیادی مقاصد کے حصول کیلئے شروع کیا تھا۔

اولاً اس لئے کہ لیڈر (روسی زبان میں Vozhd جو "Fuhrer" یا "Duce" کا لغوی ترجمہ ہے) کی حکمرانی کو مستحکم کیا جائے، سٹالن اس حقیقت کی پردہ پوشی کرنا چاہتا تھا کہ انقلاب میں اس کا کردار نہایت معمولی نوعیت کا تھا اور پارٹی کے حلقوں میں یہ بات سب اچھی طرح جانتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے اپنے حکمران دھڑے کے ممبر مثلاً ارڈ ژولیکڈ زی وغیرہ سٹالن کے ایک عظیم لیڈر اور استاد ہونے کے تصور کو سنجیدگی سے نہیں لے سکتے تھے اور اسی جرم کی پاداش میں یا تو انہیں قتل کر دیا گیا یا خودکشی پر مجبور کر دیا گیا۔ سٹالن ایسے عینی شاہدوں کی موجودگی میں اطمینان سے نہیں رہ سکتا تھا۔ اس وقت بھی سٹالن میں عظمت کے خبط کی علامات نظر آ رہی تھیں۔ لیکن اسے کسی شخصی یا نفسیاتی مظہر کے طور پر دیکھنا غلط ہوگا۔ نفسیاتی بے راہ روی اتنے بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کی وضاحت نہیں کر سکتی جس سے معیشت متاثر ہوئی، زبردست سماجی خلفشار پیدا ہوا اور یہاں تک کہ سوویت یونین کا وجود بھی اس وقت خطرے میں پڑ گیا جب اس کا دائرہ فوج تک وسیع ہوا۔

ایک غاصب حکمران ٹولے کی حیثیت سے بیوروکریسی کی عجیب و غریب فطرت نے ہر قسم کے تضادات کو جنم دیا۔ اگرچہ بیوروکریسی نے مزدور طبقے کو سیاست سے باہر کر دیا تھا مگر اس کی اپنی بنیاد ان

قومیائے ہوئے ملکیتی رشتوں پر تھی جنہیں انقلاب نے استوار کیا تھا۔ وہ بالشوازم کا نام لینے پر مجبور تھی جب کہ وہ بالشوازم کی تمام روایات کو منظّم انداز میں اپنے پاؤں تلے روندرہی تھی۔ اس قسم کی حرکت پہلی بار نہیں ہوئی ہے۔ 1794ء کے بعد فرانس میں تھرمیڈورین رجعت پرست ٹولہ بھی نام تو انقلاب کا لیتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ پرانے نظام کی مراعات اور روایات بھی بحال کررہا تھا اور (جیکو بن) انقلابیوں پر ظلم بھی ڈھا رہا تھا۔ تمام تنقید کو ختم کرنے کیلئے ان سب کو ختم کرنا ضروری تھا جو اعتراض کرسکتے تھے اور لوگوں کو یا بذات خود بیوروکریٹوں کو یاد دلا سکتے تھے کہ ماضی میں صورت حال کیسی تھی۔

حکمران ٹولے کا غاصبانہ کردار، ان کی مراعات کی ناجائز نوعیت، ان کے ''سوشلسٹ'' اعلانات اور بڑھتی ہوئی عدم مساوات، ان سب کا مطلب تھا کہ نودولتیے بیوروکریٹ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ عوام سے خوف اور عدم تحفظ کے احساس کے باعث وہ ایک ایسے مردآہن کی تلاش میں تھے جو تمام مخالفت کا خاتمہ کرسکے۔ اس مردآہن پر اعتراض کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس پر اعتراض کا مطلب بیوروکریسی پر اعتراض ہوتا۔ اس طرح سے حقیقی یا ممکنہ، تمام مخالفت کا مادی طور پر خاتمہ اور مطلق العنان حکومت کا قیام حکمران بیوروکریسی کے استحکام کی بنیادی شرط ٹھہری۔ سٹالن کی نفسیاتی بے راہ روی اور اس مرض پر مبنی سفاکی اور بڑائی کا خبط تطہیر کے گھناؤنے اور خوفناک کردار کی وضاحت تو کرسکتا ہے لیکن بذات خود اس مظہر کی وضاحت نہیں کرسکتا۔

پرانے بالشویکوں کا خاتمہ

''شکریہ سٹالن!

سولہ عدد پاجی

مادروطن کے سولہ قصاب

اپنے آبا سے جاملے ہیں!

آج آسمان کتنا نیلا ہے

تم نے کئی برسوں کے دکھوں کا مداوا کردیا ہے!

مگر صرف سولہ کیوں؟

ہمیں چالیس دو

ہمیں سینکڑوں دو

ہزاروں۔۔۔

ماسکو دریا پر ایک پل بناؤ

ایک پل ستونوں اور شہتیروں کے بغیر

مردار سوویت کا پل

اور اپنا بے سر کا لاشہ بھی ان میں شامل کردو!''

پہلے مقدمے میں سزائے موت کے اعلان کے بعد 29 اگست 1938ء کو پیرس میں وائٹ گارڈ کے اخبار وزرہوز ڈینی میں مندرجہ بالا نظم شائع ہوئی تھی۔ اکتوبر انقلاب کے دشمنوں کے خوش ہونے کی معقول وجہ موجود تھی۔ ان مقدمات میں ملزمان کی حیثیت سے پیش ہونے والے تمام نمایاں لوگ انقلاب سے پہلے، اس کے دوران اور بعد میں لینن کے قریبی ساتھی رہے تھے۔ شروع میں ان پر روس میں سرمایہ داری کی بحالی کا الزام لگایا گیا لیکن بعد میں 1936ء کے مقدمے میں اسے ترک کر کے 'اقتدار کی ہوس'، سٹالن اور دیگر لیڈروں کو ایک دہشت پسندانہ منصوبے کے ذریعے ختم کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا۔

اس وقت لینن اور ٹراٹسکی کیخلاف لگایا جانیوالا بدترین بہتان یہ ہے کہ سٹالن کی تطہیر اسی سرخ دہشت کا تسلسل تھی جو بالشویکوں نے انقلاب کے بعد شروع کی تھی۔ اس حقیقت سے قطع نظر کہ سٹالن کے جلادی طریقوں کا موازنہ جنگ کا شکار مزدور ریاست کے ان طریقوں سے کرنا ناممکن ہے جو اس نے انتہائی طاقتور اور بے رحم دشمنوں کے خلاف اپنے دفاع میں استعمال کئے تھے، یہ دلیل سب سے اہم سوال کو بھی نظر انداز کرتی ہے کہ یہ دہشت گردی کس کیخلاف کی گئی تھی اور کس مقصد کیلئے کی گئی تھی؟ دوغلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ منافق لوگ فرانسیسی انقلاب کی دہشت کے بارے میں بھی خوف کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ساری تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ کوئی بھی حکمران طبقہ یا گروہ عام طور پر اپنا اقتدار اور مراعات بغیر لڑائی کے نہیں چھوڑتا۔

انقلابی نقطہ نظر سے تشدد کے سوال پر تجریدی انداز میں غور نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر سمجھدار انسان تشدد سے نفرت کرتا ہے اور اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب کسی پر حملہ ہوتا ہے اور اسے اپنے قتل کئے جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو زیادہ تر لوگ اپنے دفاع کے لئے لڑتے ہیں۔ فرانس

اور روس میں انقلابی دہشت ردانقلاب کے تشدد کے جواب میں تھی۔ اگر خود حفاظتی کے تحت شدید نوعیت کے اقدامات نہ اٹھائے جاتے تو ان دونوں صورتوں میں انقلاب کو اس کے اپنے خون میں ڈبو دیا جاتا۔ انقلاب کے ان اقدامات کی کوئی سنجیدگی کے ساتھ کیسے مذمت کر سکتا ہے جو وہ ایسے لوگوں سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے کرتا ہے جو اسے تباہ کرنے کے درپے ہوں؟ ردانقلاب کا تشدد ایک بالکل مختلف چیز ہے۔ ردانقلاب (تھرمیڈور) کے بعد انقلابیوں (جیکوبن) کیخلاف انتہائی خوفناک تشدد کیا گیا مگر اس کے بارے میں بہت کم سننے کو ملتا ہے۔ منافقین اس بارے میں یا تو خاموش رہتے ہیں یا دوغلے پن پر مبنی اخلاقی وعظ سناتے ہیں ''انقلاب اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے'' وغیرہ وغیرہ لیکن اپنے ابھار کے دور میں فرانسیسی انقلاب کا نشانہ ردانقلاب تھا یعنی اشرافیہ، پادری، سٹے باز وغیرہ۔ رجعتی (تھرمیڈور) اور بوناپارٹسٹ دہشت کا شکار ہونے والے انقلابی تھے۔ ان دونوں کے درمیان یہی معیاری فرق ہے۔ جو یہ نہیں دیکھ سکتا وہ کچھ نہیں سمجھ سکتا۔

1922ء میں سوشل انقلابی قیادت پر سوویت ریاست اور اس کے لیڈروں کیخلاف دہشت گردی کے الزامات میں مقدمہ چلایا گیا۔ لیکن سٹالن کے جھوٹے مقدمات اور اس میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ پہلا فرق تو یہ ہے کہ ان پر جو الزامات لگائے گئے تھے سوشل انقلابی واقعی ان جرائم میں ملوث تھے۔ انہوں نے نہ صرف اس کا اعتراف کیا بلکہ اپنے اعمال کا فخریہ اعلان کیا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ روسی مارکسسٹوں کے برعکس جو انفرادی دہشت گردی کے سخت مخالف تھے سوشل انقلابی (بائیں اور دائیں بازو دونوں سے تعلق رکھنے والے) نرودنا یا وولیا پارٹی کی روایات کے وارث تھے جو دہشت گردی کے طریقے کو کھلم کھلا اختیار کرتی تھی۔ اس میں شبے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ نہ صرف یورٹسکی اور وولوڈراسکی جیسے بالشویک لیڈروں کے قتل کے ذمے دار تھے بلکہ لینن پر قاتلانہ حملے کی ذمہ داری بھی انہی پر عائد ہوتی تھی۔ ان سے اعتراف جرم کروانے کیلئے جبر کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اپنے اعمال کو جائز اور درست تصور کرتے تھے۔ زارشاہی دور میں وہ اقدام قتل کے بعد اکثر خود کو صاحب اختیار لوگوں کے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بنیادی فرق تھا۔ سوشل انقلابی قیادت کو نہ صرف اپنے قانونی دفاع کا موقع دیا گیا تھا بلکہ انہیں بیرون ملک سے وکیل بلانے کی بھی آزادی تھی جن میں خاص طور سے قابل ذکر بلجیئم کا سوشل ڈیموکریٹ لیڈر ایمل وانڈی روایلڈی تھا جو کہ ایک مشہور وکیل بھی تھا۔ ان جرائم پر سزائے موت دی جا سکتی تھی مگر سزاؤں کو موخر کر دیا گیا تھا۔ ملزمان میں سے کسی کو سزائے موت نہیں

دی گئی (اگر چہ ان میں سے کچھ کو بعد میں سٹالن نے گولی مروا دی تھی) انہیں اپنے نظریات ترک کرنے کو بھی مجبور نہیں کیا گیا کجا یہ کہ وہ عدالت میں خود اپنے اوپر بہتان طرازی کرتے۔

تطہیری مقدمات میں معاملہ مختلف تھا۔ملزمان کو ایسے خوفناک جرائم کا اعتراف کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا جو انہوں نے نہیں کیئے ہوتے تھے اور جلاد کے حوالے کرنے سے پہلے انہیں خود پر غلاظت اچھالنے پر بھی مجبور کیا جاتا تھا۔ملزمان میں سے صرف ایک کیرس ٹسکی نے عدالت میں اپنے اعتراف جرم سے منحرف ہونے کی کوشش کی تھی۔اسے جی پی یو کے اذیت رسانوں کے سپرد کر دیا گیا اور جب وہ چوبیس گھنٹے کے بعد واپس آیا تو اس نے ہر چیز کا اعتراف کر لیا۔بخارن نے انتہائی سفاکانہ الزمات مثلاً لینن کو قتل کرنے کی کوشش کے الزام کیخلاف مدافعت کی کوشش کی۔اس سلسلے میں ایک سوشل انقلابی بورس کامکوف نے بڑی جرأت سے اس کی مدد کی جسے استغاثہ کے گواہ کی حیثیت سے بلوایا گیا تھا مگر اس نے الزام کی تصدیق کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ جی پی یو کا قیدی ہونے کے ناطے اس کے پاس کھونے کو کچھ نہیں تھا۔علاوہ ازیں بخارن اس کا سیاسی مخالف تھا۔بے شک اسے اس سرکشی کی بہت خوفناک قیمت ادا کرنا پڑی تھی۔بخارن نے اپنا فیصلہ مستقبل کے حوالے کر دیا اس نے اپنا آخری خط اپنی بیوی آنا لیرینا کو زبانی رٹا دیا تا کہ اسے آئندہ نسلوں تک منتقل کیا جا سکے۔وہ اسے ''دعا کی طرح'' بیس سال تک سٹالن کے جبری مشقت کے کیمپوں میں روزانہ دہراتی رہی جہاں سے زندہ بچنے میں وہ معجزانہ طور پر کامیاب رہی۔

اس خط میں بخارن وہ بنیادی فرق واضح کرتا ہے جو ڈزرزنسکی کے تحت پرانی انقلابی چیکا اور سٹالن کی جی پی یو میں موجود تھا:

''پارٹی لیڈروں کی ایک آئندہ آنے والی نسل کے نام''

''میں زندگی کو چھوڑ رہا ہوں۔میں اپنا سر جھکاتا ہوں مگر پرولتاریہ کی درانتی تلے نہیں جو بے رحم ہونے کے ساتھ ساتھ پاکدامن بھی ہے۔اس کی بجائے میں ایک ایسی جہنمی مشینری کے آگے لاچار ہوں جو بظاہر قرون وسطیٰ کے طریقے استعمال کرتی ہے لیکن زبردست قوت کی حامل ہے،منظّم بہتان طرازی کا جال بنتی ہے،کھلم کھلا اور پر اعتماد انداز میں عمل کرتی ہے۔''

''ڈزرزنسکی،لینن کے تحت چیکا یا خفیہ پولیس کا سربراہ تھا،اب موجود نہیں ہے،رفتہ رفتہ چیکا کی شاندار روایات ماضی کا حصہ بن چکی ہیں،وہ روایات جن کے ذریعے انقلابی فکر اس کے تمام اعمال کا احاطہ کرتی تھی،دشمنوں کیخلاف بے رحمی کا جواز فراہم کرتی تھی اور کسی بھی ردانقلاب کے خلاف ریاست کو

تحفظ دیتی تھی۔اس وجہ سے چیکا ایک خصوصی اعتماد، ایک خصوصی اعزاز، ایک اتھارٹی اور عزت حاصل کر چکی تھی۔موجودہ دور میں جی پی یو زیادہ تر اصولوں سے عاری، اوباش اور کھاتے پیتے اہلکاروں پر مشتمل ایک گھٹیا تنظیم ہے جس میں شامل لوگ چیکا کی پہلے والی اتھارٹی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، سٹالن کو لاحق شک کے مرض کی تسکین کیلئے (میں مزید کچھ کہنے سے ڈرتا ہوں) اور عہدے وشان وشوکت کی خاطر اس بات کو سمجھے بغیر اپنے گھٹیا کام سرانجام دیتے ہیں کہ وہ ساتھ ہی ساتھ خود کو بھی تباہ کر رہے ہیں۔تاریخ غلط حرکات کے عینی شاہدوں کو برداشت نہیں کرتی!''

''حیرت انگیز کارنامے سرانجام دینے والی یہ تنظیمیں سنٹرل کمیٹی کے کسی بھی ممبر یا پارٹی کے کسی بھی ممبر کو پیس کر گرد میں تبدیل کر سکتی ہیں، اسے ایک دہشت گرد، غدار، تخریب کار یا جاسوس بنا سکتی ہیں۔اگر سٹالن کو خود پر شبہ ہو جائے تو اس کی تصدیق بھی ایک لمحے میں ہو جائیگی۔''

''پارٹی کے اوپر طوفانی بادل گھر آئے ہیں۔میں کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا، صرف میری موت سے مزید ہزاروں افراد پھنس جائیں گے۔بہر حال ایک، بخارنسٹ تنظیم کی تخلیق بھی ضروری ہے جو کہ حقیقت میں ابھی کوئی وجود نہیں رکھتی کیونکہ میرا سات سال سے پارٹی سے کوئی معمولی سا اختلاف بھی نہیں ہے بلکہ اس کا وجود ان سالوں میں بھی نہیں تھا جب میرا تعلق رائٹ اپوزیشن سے تھا۔مجھے ریوتین، اگلانوف اور رائیکوف کی خفیہ تنظیموں کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا اور ٹامسکی کے ساتھ ساتھ میں بھی کھلے عام اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتا تھا۔''

''میں اٹھارہ سال کی عمر سے پارٹی میں ہوں اور میری زندگی کا مقصد ہمیشہ مزدور طبقے کے مفادات کیلئے جدوجہد رہا اور میں سوشلزم کی فتح کیلئے کام کرتا رہا ہوں۔ان دنوں پراودا جیسے مقدس نام کا حامل اخبار ایک انتہائی قابل نفرت جھوٹ شائع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں یعنی نکولائی بخارن اکتوبر انقلاب کی حاصلات کو تباہ کر کے سرمایہ داری کو بحال کرنا چاہتا ہوں۔ایسی گالی کبھی سننے میں نہیں آئی۔اس جھوٹ کا مقابلہ صرف اسی قسم کی بیہودہ کہانی کر سکتی ہے کہ زار نکولائی رومانوف نے اپنی تمام عمر مطلق العنانی اور سرمایہ داری کیخلاف اور پرولتاری انقلاب کو حقیقت کا روپ دینے کی جدوجہد کیلئے وقف کر رکھی تھی۔''

یہ سطریں پڑھتے وقت ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں تحریر کرنے والے شخص کو لینن ''پارٹی کا چہیتا'' قرار دیتا تھا اور وہ پارٹی کے بڑے نظریہ دانوں میں سے ایک تھا۔سچ ہے کہ بخارین نے بہت سی غلطیاں کیں جن میں سے کچھ بہت سنجیدہ غلطیاں تھیں مگر وہ اپنے قاتلوں کے برعکس ایک سچا انقلابی تھا۔تطہیروں

کا بنیادی مقصد بیوروکریسی اور مارکسزم لینن ازم کی حقیقی روایات کے درمیان ایک خون کی لکیر کھینچنا تھا۔ تاریخ کی گرہ کھولنا ضروری تھا۔ مزدوروں کی جمہوریت اور عالمی انقلاب کی پرانی روایات کو بالکل تباہ کرنا ضروری تھا اور یہ بھی ضروری تھا کہ کوئی ایسی شے باقی نہ بچے جو آئندہ نسلوں کو اکتوبر انقلاب کے حقیقی معانی دوبارہ یاد دلا سکے۔ لہٰذا پرانے بالشویکوں کو اذیتیں دینا اور قتل کرنا ہی کافی نہیں تھا۔ انہیں اپنے آپ پر غلاظت اچھالنے، سرعام اپنے ''جرائم'' کا اعتراف کرنے اور سٹالن کے گن گانے پر مجبور کرنا بھی ضروری تھا۔ زینوویف، کامینیف، بخارن، رائیکوف، راڈک، راکوفسکی اور بہت سے دوسرے انقلابیوں نے اعتراف کیا کہ وہ ساری عمر سامراجی ایجنٹ رہے ہیں۔ ان پر الزامات عائد کرنیوالا چیف پراسیکیوٹر وشسکی نامی ایک منشویک وکیل تھا اور سفید رد انقلابیوں کا شریک کار رہا تھا۔

عملاً تمام بالشویک اولڈ گارڈز کو ختم کر دیا گیا تھا۔ ان شکاروں میں اے وی شومین نامی ایک پرانا پارٹی ممبر بھی تھا جس کے ذمے لینن کی جان بچانے کا فریضہ اس وقت سونپا گیا تھا جب جولائی 1917ء کے بعد اسے روپوش ہونا پڑا تھا۔ 1918ء میں لینن نے لکھا تھا کہ ''شومین ایک پرانا پارٹی کامریڈ ہے جسے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس پر مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔'' تاہم اسے گرفتار کیا گیا اور 1939ء میں وہ مر گیا۔ بہت سے غیر ملکی کمیونسٹ بھی ختم کر دیئے گئے۔ فرٹز پلیٹین نامی سوئس انقلابی جو لینن کا شریک کار تھا اور جس نے 1917ء میں لینن کو سوئٹزرلینڈ سے روس لے جانے والی مشہور ٹرین کا انتظام کیا تھا، زارشاہی، سوئس، رومانیہ اور جرمنی کی جیلوں سے بچ نکلنے کے بعد سٹالن کی جیلوں میں سے ایک میں موت کا شکار ہو گیا۔ پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی کی تمام قیادت کو ختم کر دیا گیا جس میں آئی ایس گینیٹسکی بھی شامل تھا جسے روسی پارٹی میں شامل کرنے کی سفارش لینن نے ذاتی طور پر کی تھی۔

ان تطہیروں میں سوویت کمیونسٹ پارٹی کے بچے کھچے لوگوں کا بھی صفایا کر دیا گیا۔ 1939ء سے 1952ء کے درمیان ایک بھی پارٹی کانگریس نہیں ہوئی حالانکہ خانہ جنگی جیسے مشکل دور میں بھی اس کا اجلاس سال میں ایک بار ضرور ہوتا تھا۔ 1939ء تک سترہویں پارٹی کانگریس میں منتخب کیے جانے والے 139 ممبران میں سے 110 کو گرفتار کیا جا چکا تھا اور یہ وہ کانگریس تھی جس میں سٹالن نے اپوزیشن پر فتح کا جشن منایا تھا۔ اکتوبر 1917ء کی بالشویک پارٹی کی سنٹرل کمیٹی میں سے صرف دو باقی بچے تھے، الیگزنڈرا کولن جسے سفیر بنا کر سویڈن بھیج دیا گیا تھا اور جوزف سٹالن۔ ساری پارٹی ممبر شپ میں سے سٹالن کے اپنے چنے ہوئے طفیلی اور کلہاڑی بردار ہی باقی بچے تھے یعنی مولوٹوف، کاگانوچ، مائیکویان

اور وورو شلوف جیسے لوگ۔

پارٹی کی تاریخ ازسرِ نو لکھی گئی۔ بدنام زمانہ سی پی ایس یو کی تاریخ (بالشویک) شارٹ کورس، جسے سٹالن کے کردار کو عظیم بنانے کی غرض سے دروغ گوئیوں اور کہانیوں کے ایک سلسلے تک محدود کر دیا گیا تھا۔ جان ریڈ کی کتاب ''دنیا کو جھنجھوڑ دینے والے دس دن'' پر پابندی عائد کر دی گئی حالانکہ لینن نے اسے انقلاب کی سچی تصویر کشی قرار دیتے ہوئے اس کی تعریف کی تھی۔ نہ صرف ٹراٹسکی کا نام اور چہرہ تصویروں سے مٹا ڈالا گیا بلکہ کراسین، نوگن، چیچرن اور لیونا چارسکی جیسی شخصیات پر بھی پردہ ڈال دیا گیا۔ بالآخر پارٹی کو انقلابی مزدوروں کے ہراول دستے کی بجائے نوکر شاہی مشینری کے کل پرزے میں تبدیل کرنے کا کام مکمل کر لیا گیا۔ لینن اور ٹراٹسکی پر بہتان طرازی کرنیوالوں کیلئے یہ حتمی جواب ہے۔ بالشوازم اور سٹالنزم کو ایک ہی مظہر قرار دینے کی کوشش کرنیوالوں کی طرف سے ابھی یہ وضاحت ہونا باقی ہے کہ فتح یاب ہونے کیلئے نوکر شاہانہ مطلق العنان حکومت بالشویک پارٹی کو نیست و نابود کرنے، لینن ازم کی تمام باقیات کو اکھاڑ پھینکنے، تاریخ کو ازسرِ نو مرتب کرنے، مزدور جمہوریت کی پرانی روایات کو دفنانے اور انٹرنیشنل ازم کو لاشوں کے انبار تلے دبانے پر کیوں مجبور تھی۔ اگر لینن ازم اور سٹالنزم ایک ہی چیز تھے تو ان کیلئے کسی سمجھوتے پر پہنچنا کیوں ممکن نہیں ہوا؟ ایسا کرنا نہ صرف زیادہ معقول ہوتا بلکہ کم خرچ بھی ہوتا۔ اکتوبر انقلاب کے دشمنوں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ماسوائے ''انقلاب اپنے بچوں کو کھا جاتا ہے'' جیسی باسی کہانیوں کے جن سے کسی بات کی وضاحت نہیں ہوتی۔ تاہم حقیقی معنوں میں معروضی نقطہ نظر سے دیکھنے والے کیلئے اس کا جواب واضح اور ناقابل تردید ہے، بالشوازم اور سٹالن ازم اسی قدر غیر ہم آہنگ ہیں جس قدر انقلاب اور ردِ انقلاب۔ جو حضرات ان چیزوں میں تمیز کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ہمیں ان سے مزید کچھ نہیں کہنا ہے۔

خاندانوں کا صفایا

سٹالن ازم اور بالشوازم کے درمیان خلیج اتنی گہری اور ماضی کی باقیات اور عینی شاہدوں کے خاتمے کی سٹالن کو اتنی شدید ضرورت تھی کہ قتل عام کا دائرہ سرگرم مخالفین کی صفوں سے بڑھ کر دور تک پھیل گیا۔ اس لمبی اور خون ریز سیاہ رات نے صرف سیاسی طور پر سرگرم لوگوں کو ہی متاثر نہیں کیا۔ سٹالن کے کینہ

پروری پر مبنی انتقام کا نشانہ اس کے شکاروں کے خاندان، ان کی بیویاں، بچے، پوتے، پوتیاں اور یہاں تک کہ ان کے پڑوسی بھی بنے۔ گرفتار کردہ سیاسی مخالفین کے بچوں کو چھین کر انہیں خصوصی یتیم خانوں میں رکھا گیا جہاں سے ان کی اکثریت کو غائب کر دیا گیا۔ جبری مشقت کے کیمپوں میں انہیں اپنے بچوں کی تصاویر رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ بخارین کی بیوی آنا لیرینا کا ایک سالہ بچہ اس سے چھین لیا گیا اور اس نے بیس سال بعد اس کی شکل دوبارہ دیکھی۔ کم از کم یہ ضرور ہوا کہ وہ بچ گئی اور آخر کار اس کا بیٹا اسے دوبارہ مل گیا۔ لیکن یہ ایک استثنائی مثال تھی۔

سورڈلوف 1919ء میں ایک فطری موت مرنے کے باعث جلاد کے پھندے سے بچ گیا لیکن اس کے بھائی کو مار دیا گیا۔ آرڈژونیکڈزی کئی سال تک سٹالن کا قریبی ساتھی رہا تھا لیکن جنرل سیکرٹری کا قریبی اتحادی ہونے کے باوجود تطہیروں نے اسے دہلا دیا تھا اور اس نے ان کا نشانہ بننے والے کچھ لوگوں کو بچانے کی کوشش کی۔ 1937ء میں سٹالن نے اسے خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا، "اس کے بڑے بھائی پوپولیا کو گرفتار کر کے خوفناک اذیتیں دینے کے بعد گولی مار دی گئی اور جھوٹ پر مبنی تفتیشی ریکارڈ آرڈژونیکڈزی کو بھجوا دیا گیا۔ سرگو کے بعض انتہائی قریبی دوستوں اور واقف کاروں کو گولی مار دی گئی جب کہ بھاری صنعت میں اس کے بھرتی کردہ بہت سے ایگزیکٹو گرفتار کر لئے گئے۔ سٹالن نے قیدیوں سے تشدد کے ذریعے حاصل کئے گئے جھوٹے حلفیہ بیانات اس تبصرے کے ساتھ اسے بھیجے، کامریڈ سرگو ذرا دیکھو تو آپ کے بارے میں کیا لکھ رہے ہیں۔" (39) آرڈژونیکڈزی سٹالن کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ دوسرے شکاروں کی طرف اس کا جرم بھی یہ تھا کہ وہ ماضی کی یاد دلاتا تھا۔ بہت سے دیگر سٹالنسٹ بھی اسی وجہ سے ختم کر دیئے گئے۔

ٹراٹسکی اور اس کے پیروکاروں پر جو ظلم و ستم ڈھایا گیا اس کی مثال عالمی مزدور تحریک کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اس قاتلانہ دہشت گردی میں اس کے پورے خاندان کا صفایا کر دیا گیا۔ اس کے دونوں داماد پلیٹن والکوف اور نیولسن کو 1920ء کی دہائی میں اپوزیشن سے تعلق رکھنے کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ ٹراٹسکی کی الماتا کی جلاوطنی کے بعد اس کی دونوں بیٹیوں ینا اور زینائیڈا کو تمام مدد سے عاری کر دیا گیا حالانکہ ینا تپ دق کے مہلک مرض میں شدت سے مبتلا تھی۔ اپنے والد پر ظلم و جبر اور خاوند کی گرفتاری نے اسے 26 سال کی عمر میں جون 1928ء میں وقت سے پہلے قبر میں پہنچا دیا۔ ینا اور زینائیڈا کے خاوندوں کو بعد ازاں گولی مار دی گئی۔ 1925ء میں ینا کے ہاں پیدا ہونیوالی بچی وولینا کی دیکھ بھال ٹراٹسکی کی

پہلی بیوی الیگزینڈرا سوکولووسکایا کرتی تھی۔ تاہم جب الیگزینڈرا کو گرفتار کر کے بچی کو سرکاری تحویل میں لیا گیا تو اس کے بعد وہ غائب کر دی گئی۔ ٹراٹسکی کی بڑی بیٹی بھی تپ دق کی مریض تھی اور اپنی بہن کی وفات اور خاوند کی گرفتاری کے باعث شدید ڈپریشن کا شکار تھی۔ جب اس نے اپنے چھوٹے سے بچے وسیوولودوالکوف کے ہمراہ جو بیمار تھا اپنے والد کے پاس پرنکو پو جانے کی اجازت طلب کی تو اسے یہ اجازت تو دے دی گئی مگر اس کی غیر حاضری میں سٹالن کی حکومت نے عیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی شہریت منسوخ کر دی۔ اپنے خاوند اور بیٹی سے ہمیشہ کیلئے جدا ہو جانے کے صدمے کے باعث اس کا ذہنی توازن مزید بگڑ گیا کیونکہ وہ پہلے ہی سے شدید ڈپریشن کی وجہ سے زیر علاج تھا۔ زینائیڈا نے خودکشی کر لی۔

جیسے ہی اس کی بیٹی الیگزینڈرا جو کہ سوویت یونین میں ہی رہ گئی تھی تھوڑی بڑی ہوئی تو اسے جبری مشقت کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ اس کی ماں سوکولووسکایا کا انجام خصوصاً بہت المناک تھا۔ تمام تر خوفناک اذیتوں اور مخالفت کے باوجود وہ اپنی انقلابی سرگرمیوں کے سلسلے میں پرعزم رہی اور اس کی قیمت ادا کی۔ 1935ء میں سائبیریا میں جلاوطن کئے جانے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا کیونکہ سائبیریا میں زندہ رہنے کا عرصہ اس وقت دو یا تین سال سے زیادہ نہیں تھا، علاوہ ازیں اس سے پہلے نہ صرف اس کے اپنے بچے بلکہ اس کے بچوں کے بچے بھی لقمہ اجل بن چکے تھے۔ معجزاتی طور پر الیگزینڈرا اپنی خراب صحت کے باوجود ان کیمپوں میں کئی سال تک زندہ رہی اور اس کا انتقال 1989ء میں ہوا۔ اس وقت صرف وسیوولودوالکوف باقی بچا جو میکسیکو میں رہتا ہے لیکن اس پر بھی ایک قاتلانہ حملہ ہو چکا ہے۔ ٹراٹسکی کا سب سے بڑا بیٹا لیون سیڈوف جس نے انٹرنیشنل لیفٹ اپوزیشن میں نہایت اہم کردار ادا کیا تھا۔ فروری 1938ء میں پیرس میں سٹالن کے ایجنٹوں کے ہاتھوں اس وقت قتل ہو گیا جب وہ ایک آپریشن سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب بخارن پر مقدمہ چل رہا تھا۔ لیکن ٹراٹسکی کیلئے سب سے شدید صدمہ اس کے چھوٹے بیٹے سرجی کی گرفتاری تھی جو سیاسی طور پر سرگرم نہیں تھا اور اپنے والد کے جلاوطن کئے جانے کے بعد وہ سوویت یونین میں ہی رہ گیا تھا۔ اگرچہ وہ بذات خود کوئی سرگرم اپوزیشن ممبر نہیں تھا لیکن اس نے نہایت جرات کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے والد کی مذمت کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر 1937ء میں اسے گولی مار دی گئی اگرچہ اس وقت کسی کو بھی اس بارے میں پتہ نہیں تھا۔

ٹراٹسکی کی دو بہنیں تھیں جن میں سے ایک 1924ء میں فطری موت کا شکار ہو گئی۔ دوسری کا نام اولگا کامینیف تھا جو کامینیف کی بیوی تھی جسے پہلی بار کامینیف کی گرفتاری کے بعد جلاوطن کر دیا گیا تھا پھر

1935ء میں اسے دوبارہ گرفتار کر کے پہلے جیل اور اس کے بعد جبری مشقت کے کیمپ میں بھیج دیا گیا۔ ہزاروں دیگر اپوزیشن سے تعلق رکھنے والوں کے ہمراہ اسے 1941ء میں سٹالن کے حکم پر گولی ماردی گئی۔ ٹراٹسکی کے خاندان پر ظلم وستم یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ اس کے بھانجوں یوری، بورس، برونسٹائن اور الیگزینڈر کامینیف سب کو گولی ماردی گئی۔ اس کا بڑا بھائی الیگزینڈر بھی سٹالن کے شکاروں میں سے ایک تھا۔ دیمری والکوگونوف نے نسبتاً حال ہی میں ٹراٹسکی کی زندگی پر ایک کتاب تحریر کی ہے جو خالصتاً انقلاب دشمن نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور عمومی لحاظ سے قطعاً ناکارہ ہے۔ تاہم اس کی رسائی کے جی بی کی پرانی دستاویزات اور دیگر وسائل تک تھی جو پہلے میسر نہیں تھے۔ اس کتاب سے ٹراٹسکی اور لیفٹ اپوزیشن کی ان تحریروں کی تصدیق ہوتی ہے جو تطہیر کے بارے میں اس وقت لکھی گئی تھیں۔ اس بارے میں اس نے جو کچھ لکھا ہے، وہ قابل ذکر ہے:

''ٹراٹسکی کا بڑا بھائی 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں ورونیز صوبے کی شوگر مل نووکسلیا وسک میں بطور زرعی ماہر کے کام کرتا تھا۔ جیسا کہ مجھے اس علاقے کے رہنے والے اے کے میرونوف نے بتایا وہ ایک ماہر تھا جسے دیہاتی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس کے پاس ایک خوبصورت بگھی بھی تھی جسے دو اعلیٰ نسل کے گھوڑے کھینچتے تھے۔ جب ٹراٹسکی زیر عتاب آیا تو الیگزینڈر کو پارٹی سے خارج کر کے جلاوطن کر دیا گیا اور سرعام اپنے بھائی کو مسترد کرنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس میں زبردست تبدیلی آ گئی اور وہ اپنے اندر سکڑتا چلا گیا گویا اس کا ضمیر اسے اذیت دے رہا تھا۔ اس پچھتاوے کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا تاہم 1936ء کے موسم گرما میں اسے ایک رات اچانک گرفتار کر لیا گیا اور اگلے سال کرسل جیل میں اسے ایک سرگرم اور مسلح ٹراٹسکائیٹ قرار دے کر گولی ماردی گئی۔ سٹالن کا لمبا ہاتھ سب تک پہنچ چکا تھا سوائے اپنے بڑے شکار، اس کی بیوی اور دو بیٹوں کے۔''

''ینا اور زینا کی اموات کے بعد اس کے بیٹوں خصوصاً سرجی کی حفاظت کے سلسلے میں حقیقی خوف محسوس کیا جا رہا تھا۔ اس نے اپنے والد کے ہمراہ ملک چھوڑنے کی بجائے خود کو سائنسی دلچسپیوں کیلئے وقف کر دینے کو ترجیح دی تھی۔ سیاست سے عدم دلچسپی کے باعث پہلے وہ ایک سرکس میں کام کرنا چاہتا تھا مگر بعد ازاں اسے ٹیکنالوجی سے دلچسپی ہو گئی اور اس نے پولی ٹیکنیک پاس کرنے کے بعد وہاں استاد کی حیثیت سے ملازمت کر لی۔ تیس سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے وہ پروفیسر بن چکا تھا۔ اس نے دو دفعہ شادی کی اور اسکی دوسری شادی سے ہونیوالی بیٹی جولیا آج بھی زندہ ہے اور امریکہ میں قیام پذیر ہے۔ جب

میں نے اس کی پہلی بیوی اولگا سے 1989ء میں گفتگو کی تو اس وقت وہ خاصی عمر کی سرگرم اور ذہین خاتون تھی اور فطری طور پر اس نے بھی سٹالن کے مشقتی کیمپوں اور جلاوطنی کا مزہ چکھ رکھا تھا۔ اسے سرجی کے بارے میں کچھ کچھ یاد تھا کہ وہ ایک شرارتی لڑکا تھا، دوسرے لوگوں کو خوش کرنے والا اور قابل شخص تھا۔ واضح طور پر بڑا لڑکا لیوف ہی خاندان کا چہیتا تھا۔ اولگا اور سرجی نے اس وقت شادی کی تھی جب ان کی عمریں بالترتیب بیس سال اور انیس سال تھیں۔''

''جب خاندان کو کریملن سے نکال کر گرانوسکی سٹریٹ بھیج دیا گیا تو ہمارے پاس رہنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ ہمیں جو بھی جگہ ملتی تھی وہیں گزارہ کر لیتے تھے۔ لیوڈیوڈووچ ہمیں ہمیشہ خوش آمدید کہتا تھا۔ میں اس کی گرمجوش اور ہوشیار نیلی آنکھوں سے خصوصاً متاثر ہوتی تھی۔ بظاہر نتالیا کوئی دلچسپ خاتون نہیں تھی۔ پستہ قد اور موٹی ہونے کے علاوہ وہ پرکشش بھی نہیں تھی۔ لیکن یہ بات بالکل عیاں تھی کہ وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ جیسا کہ میں نے کہا سرجی بہت باصلاحیت تھا وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا کامیاب رہتا۔ جب ٹراٹسکی کو جلاوطن کیا گیا تو نتالیا آئیوانوفنا نے مجھ سے کہا: ''سریوژا کا خیال رکھنا۔ اسے چار مارچ 1935ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ ایک المیہ کھیل دکھائی دیتا تھا۔ پانچ افراد آئے اور انہوں نے کئی گھنٹے تلاشی لی۔ وہ سرجی کی کتابیں اور اس کے والد کی تصویر ساتھ لے گئے۔ میرے خاوند کو لبینکا جیل میں بند کر دیا گیا۔ وہ وہاں دو یا تین مہینے رہا۔ اسے بتایا گیا کہ اس پر جاسوسی کرنے، اپنے والد کو بھڑکانے اور توڑ پھوڑ کرنے کے الزامات ہیں۔ بہرحال اسے سائبیریا بھیج دیا گیا۔ اس کی تباہی کا حکم صادر ہو چکا تھا۔

''جنوری 1937ء میں پراودا نے اس سرخی کیساتھ ایک مضمون شائع کیا، ٹراٹسکی کے بیٹے سرجی سیڈوف نے مزدوروں کو زہریلی گیس سے ہلاک کرنے کی کوشش کی، کراسنویارسک انجینئرنگ ورکس کے ایک فورمین لیبی ڈیوف نے اعلان کیا کہ ''ہمارے ساتھ ٹراٹسکی کا بیٹا سرجی سیڈوف ایک انجینئر کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ فاشسٹوں کے ہاتھ بک جانیوالے باپ کے اس ہونہار فرزند نے اس فیکٹری کے بہت سے مزدوروں کو گیس سے ہلاک کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میٹنگ میں زینوویف کے بھتیجے زکس اور فیکٹری کے منیجر سبوٹن کے بارے میں بھی بحث ہوئی جو مبینہ طور پر اسے اور سرجی کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے تھا، تباہی تینوں کا مقدر بن گئی۔ جلد ہی سرجی کو سزا سنا دی گئی، اولگا نے کہا، اسی موسم گرما میں مجھے اس کا ایک پوسٹ کارڈ ملا جو معلوم نہیں وہ کیسے بھجوانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ''وہ مجھے

شمال کی طرف لے جارہے ہیں۔ایک لمبے عرصے کیلئے خدا حافظ‘‘اولگا یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی لیکن اس کے خیال میں افواہوں کے مطابق اسے کولیما میں گولی مار دی گئی تھی۔ درحقیقت اسے 29اکتوبر1937ءکو ہلاک کر دیا گیا تھا۔‘‘(40)

جنرل سٹاف کا قتل عام

ہر قتل کو چھپانے کیلئے دس مزید قتل کرنا ضروری تھے۔سٹالنسٹ پولیس کے قصاب یژوف اور یوگوڈ بذات خود اس تطہیر کا شکار ہوگئے۔مزدوروں کے جمہوری کنٹرول کی عدم موجودگی کی وجہ سے ناگزیر معاشی ابتری کی ذمہ داری ڈالنے کیلئے قربانی کے بکرے تلاش کرنا پڑتے تھے۔روزانہ اہلکاروں کا کوئی نہ کوئی گروہ خودکور دانقلابیوں کا زرخرید قرار دیتا تھا۔خون کا یہ دریا بالشویک مزدوروں اور ہوشیار بیوروکریٹوں کو یکساں طور پر بہالے گیا۔میکسم گورکی جیسی ہر دل عزیز شخصیت جو تطہیر کے شکار لوگوں کیلئے مستقل رحم کی درخواست کرتی رہتی تھی اور سٹالن کیلئے بے چینی کا باعث تھی پراسرار طور پر غائب ہوگئی۔بعدازاں کچھ لوگوں پر اسے زہر دینے کا الزام لگایا گیا اس لئے ہم یہ فرض کرنے میں خود کو حق بجانب خیال کرتے ہیں کہ اس کی موت فطری نہیں تھی۔ادب(اور بڑے پیمانے پر ناخواندگی کے حالات میں ڈرامہ) جس نے انقلاب کے بعد عوام سے رابطے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا بے رحمی سے کچل دیا گیا۔جس کسی کا اکتوبر انقلاب سے مبہم سا تعلق بھی تھا ،اسے ختم کر دیا گیا یہاں تک کہ سٹالن کے کچھ ساتھی بھی ان میں شامل تھے مثلاً آرڈژونیکڈزی۔سرعام ملامت کرنے اور مخبری کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور مشتبہ شخص کے تمام دوستوں اور رشتہ داروں کو جیل بھیج دیا جاتا تھا۔وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے اس خوف کے دور میں ہر پولیس والے کی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ شکار پکڑے تاکہ خود کو سرعام ملامت سے بچا سکے۔بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی کہ وہ اپنے والدین کو سرِعام ملامت کریں۔جنرل پیٹرو جی گریگورینکو کو یاد ہے کہ کس طرح وہ اپنی بیوی کے ہاتھوں مرمت سے بال بال بچا تھا۔یہ جبر انتہائی وسیع پیمانے پر تھا۔کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس دور میں کتنے لوگ لقمہ اجل بنے،ایک اندازے کے مطابق لینن گراڈ کا ہر پانچ میں سے ایک شخص یا تو مارا گیا یا قید ہوگیا یا جلاوطن کر دیا گیا۔ان مقدمات میں ایک بھی درست دستاویز، خط یا شہادت پیش نہیں کی گئی۔واحد ’’شہادت‘‘ ملزموں سے تشدد کے ذریعے حاصل کیا گیا اعتراف جرم ہوتا

تھا۔ کامینیف اور زینوویف نے جو شکست تسلیم کرنے کے باعث ذہنی طور پر پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، اپنے لئے سزائے موت کا خود مطالبہ کیا کیونکہ ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ انہیں چھوڑ دیا جائیگا۔ انہیں سب سے پہلے گولی ماردی گئی۔

جادوگرنیوں کیخلاف مقدمات اور سپین میں ملحدین کیخلاف عدالتی احتساب کے زمانے کے بعد سے لوگوں کی قوت مزاحمت ختم کرنے اور انہیں ناکردہ جرائم کا اعتراف کرنے پر مجبور کرنے کیلئے ایسے طریقے استعمال نہیں کئے گئے تھے۔ اپنی خودنوشت میں سابق سوویت جنرل اور منحرف پیٹروجی گریگورینکو تفصیل سے ان اذیتوں کا ذکر کرتا ہے جو جی پی یو والے اپنے شکاروں کو دیتے تھے اور جن کا عینی گواہ خود اس کا بھائی تھا:

''اس نے تخریب کاری، دہشت گردی اور جاسوسی کے جھوٹے الزامات کے علاوہ ''دشمنوں'' سے جبراً لکھوائی جانیوالی سوانح حیات اور انہیں دی جانیوالی اذیتوں کا ذکر کیا۔۔۔ مار پیٹ، انگلیوں اور جنسی اعضاء کو کچلنا، منہ اور جسم کا سگریٹوں سے داغا جانا، کھڑے رہنے کی سزا، پیاس اور تیز روشنی سے دی جانیوالی اذیت۔''

وہ مزید لکھتا ہے کہ ''کھڑے رکھنے کی اذیت دینے کیلئے اس شخص کو ایک لمبے عرصے کیلئے خصوصی طور پر بنائی گئی ایسی بند جگہ میں کھڑا کیا جاتا تھا جہاں وہ ہل جل نہیں سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ ہوا کی کمی اور تھکن کی وجہ سے قیدی بے ہوش ہو کر نیچے گر جاتا۔ پھر اسے بند جگہ سے نکال کر ہوش میں لایا جاتا اور دوبارہ وہیں بند کر دیا جاتا۔ اتنی دیر تک کھڑا رہنے کی وجہ سے اس کی ٹانگوں میں خون کی گردش بند ہو جاتی اور خون رکنے سے ٹانگیں سوج جاتیں۔ جس شخص کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کی ٹانگیں خوفناک حد تک سوجی ہوئی تھیں، وہ سرگوشی میں بولا ''یہاں موجود لوگوں سے خوفزدہ مت ہونا، میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ یہ سب فاشسٹ ہیں، عوام دشمن اور میں یہاں کسی حادثے یا غلطی کے نتیجے میں پہنچ گیا ہوں۔'' میں بھی ایسا ہی سوچتا تھا لیکن اب میں جان گیا ہوں کہ یہاں کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم خود کو ''عوام کا دشمن'' قرار دیں۔ اس نے آئیون کی تفتیش کے بارے میں بتایا۔ وہ ایک انجینئر تھا اور اس کا تعلق زاپورژے سٹیل ورکس سے تھا۔ بعدازاں اس نے ایک اعتراف نامے پر دستخط کر دیئے جس کے مطابق وہ فیکٹری کو بم سے اڑانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ تفتیش کے بعد اس شخص نے آئیون سے کہا ''وہ ابھی تمہیں اذیت دے رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ شاید تم رہا کر دیئے جاؤ۔ کسی وجہ سے انہیں ایسا کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم رہا کر دیئے جاؤ

تو کوشش کرنا کہ جو کچھ تم نے یہاں دیکھا ہے اسے فراموش نہ کرنا۔'' (41)

خروشیف نے بیسویں کانگریس میں جو کچھ بتایا اس کے مطابق ان میں اور بعد میں قائم کئے جانے والے مقدمات میں سٹالن نے مندرجہ ذیل طریقے استعمال کئے، ''سٹالن تفتیشی جج کو ذاتی طور پر بلا کر ہدایات دیتا تھا اور مشورہ دیتا تھا کہ تفتیش کیلئے کون سے طریقے استعمال کئے جائیں اور یہ طریقے انتہائی سادہ تھے۔ تشدد، تشدد اور ایک بار پھر تشدد۔'' وہ مزید کہتا ہے کہ ''بہت سے گرفتار شدگان سے اعتراف جرم کروانے کیلئے، جن پر ملک دشمن سرگرمیوں کا الزام تھا۔ انتہائی بے رحمانہ اور غیر انسانی تشدد سے مدد لی گئی۔'' بائیسویں کانگریس میں پیش کردہ اپنی رپورٹ میں وہ ان طریقوں کا حوالہ دیتا ہے جو سرخ فوج کے لیڈروں سے اعتراف جرم کروانے کیلئے استعمال کئے گئے۔

''سرخ فوج کے بہت سے سیاسی کارکنوں اور اعلیٰ کمانڈروں کو تباہ کر دیا گیا۔ یہاں موجود نمائندوں میں سے بہت سے ایسے ہیں، میں ان کے نام لے کر انہیں تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا، جو کئی سال جیلوں میں گزار چکے ہیں۔ انہیں مخصوص طریقوں سے یہ تسلیم کرنے پر تیار کیا گیا کہ وہ جرمنی، برطانیہ یا کسی اور کے لئے جاسوسی کر رہے ہیں اور ان میں سے کچھ نے ''اعتراف'' کر لیا۔ یہاں تک کہ جب انہیں بتایا گیا کہ ان کیخلاف الزامات واپس لے لئے گئے تب بھی انہوں نے اپنے پرانے اعترافات پر اصرار جاری رکھا کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے کہ اپنے جھوٹے بیانات پر قائم رہنے سے انہیں ایذا رسانی سے نجات مل جائے گی اور انہیں جلد مار دیا جائیگا۔'' (42)

زندگی کی ہر سطح پر ہونے والی اس تطہیر نے ایسی تباہی مچائی کہ نمایاں پارٹی لیڈروں، فوجی افسران، ٹیکنیشنز، ماہرین شماریات، منصوبہ سازوں، منیجروں اور مزدوروں کو بہا لے گئی۔ سٹالن کی اصطلاح میں ''عوام کے دشمن'' قرار پانے والوں کیخلاف جنون کی فضا پیدا کر دی گئی۔ پانچ سالہ منصوبوں کی ابتدائی کامیابیوں کے بعد جنوری 1934ء میں ہونیوالی سترہویں کانگریس کو ''فاتحین کی کانگریس'' قرار دیا گیا اور اس میں سٹالن نے اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔ کئی سال بعد خروشیف نے اپنی مشہور ''خفیہ تقریر'' میں بتایا کہ اس کانگریس میں شرکت کرنیوالے 1966 مندوبین میں سے 1108 مندوبین پر بعد میں ردانقلابی جرائم کے الزامات عائد کئے گئے۔ خروشیف کے بقول سٹالن نے ''جبر اور جسمانی طور پر ختم کر دینے کی راہ اختیار کی۔''

جنگ سے کچھ ہی عرصہ پہلے تمام جنرل سٹاف کو گرفتار کر لیا گیا اور خانہ جنگی کے زمانے کے انتہائی

قابل فوجی ماہرین جن میں ٹوخاچیوسکی، یاکر اور گامرنگ جیسے لوگ شامل تھے ختم کر دیئے گئے کیونکہ بظاہر سٹالن کو ایک فوجی بغاوت کا خطرہ تھا۔ لاکھوں کو گولی سے اڑا دیا گیا یا جبری مشقت کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا اور سٹالن نے نہایت سنجیدگی سے ان کو جاسوس، کرائے کے قاتل، تخریب کار یا بدترین صورت میں ''ٹراٹسکی فاشسٹ'' قرار دیا۔

تطہیرات نے سرخ فوج کو کاٹ کر رکھ دیا۔ 1937ء اور 1938ء کے دوران 20000 سے 35000 فوجی افسران کو ختم کر دیا گیا۔ نوے فیصد جرنیلوں اور اسی فیصد کرنلوں کو جی پی یو نے قتل کر دیا۔ تین مارشل، تیرہ کمانڈر، ستاون کور کمانڈر، ایک سو دس ڈویژنل کمانڈر، دو سو بیس بریگیڈ کمانڈر اور فوجی اضلاع کے تمام کمانڈنٹ جی پی یو کے فائرنگ سکواڈ کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اس دور میں گرفتار کئے جانیوالوں کی تفصیل کچھ یوں ہے، پانچ میں سے تین مارشل، اول درجے کے چار فوجی کمانڈروں میں سے تین، سینتالیس کور کمانڈروں میں سے چالیس، ایک سو نانوے ڈویژن کمانڈروں میں سے ایک سو چھتیس اور تین سو ستانوے بریگیڈ کمانڈروں میں سے دو سو اکیس کو گرفتار کیا گیا۔ علاوہ ازیں بحریہ کے درجہ اول کے دونوں فلیٹ ایڈمرل، درجہ دوئم کے دونوں فلیٹ ایڈمرل، درجہ اول کے دونوں فوجی کیسار، ستانوے میں سے اناسی ڈویژن کیسار اور چھتیس میں سے چونتیس بریگیڈ کیسار گرفتار کئے گئے۔

اس بارے میں رائے میڈ ویڈیف لکھتا ہے:

''فیلڈ گریڈ اور چھوٹے فوجی افسران بھی بڑے پیمانے پر مارے گئے۔ اس خوفناک حقیقت کو سادہ طور پر یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کسی بھی فوج نے دوران جنگ افسر سٹاف کا اتنا بڑا نقصان برداشت نہیں کیا جتنا سوویت فوج نے اس امن کے دور میں برداشت کیا۔

کیڈروں کی سال ہا سال کی تربیت ضائع ہوگئی۔ فوج کے اندر پارٹی کی پرت میں بہت کمی واقع ہو گئی۔ انفینٹری کے انسپکٹر جنرل کی 1940ء کے موسم خزاں میں مرتب کی گئی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ دو سو پچیس حاضر ڈیوٹی رجمنٹ کمانڈروں میں سے ایک نے بھی کسی ملٹری اکیڈمی میں تعلیم حاصل نہیں کی تھی، پچیس فوجی سکول کے فارغ التحصیل تھے اور بقایا دو سو نے صرف جونیئر لیفٹیننٹ کا کورس کر رکھا تھا۔ 1940ء میں ڈویژن کمانڈروں کے ستر فیصد، رجمنٹ کمانڈروں کے ستر فیصد، فوجی کیساروں اور پولیٹیکل ڈویژنوں کے سربراہوں کے ساٹھ فیصد کو اپنے عہدوں پر فائز ہوئے صرف ایک سال گزرا تھا اور یہ سب کچھ تاریخ کی بدترین جنگ کے آغاز سے کچھ ہی عرصہ پہلے ہوا۔'' (43)

بے شمار لوگ جی پی یو کی جیلوں میں بغیر کوئی سراغ چھوڑے غائب ہو گئے جنہیں یا تو اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا گیا یا گولی مار دی گئی۔ درحقیقت تشدد کے آگے ہتھیار ڈالنے والوں کے مقابلے میں ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جنہوں نے جھوٹے اعتراف جرم کی بجائے جان دینے کو ترجیح دی۔ لاکھوں مزید افراد سٹالن کے جبری مشقت کے کیمپوں کی نذر ہو گئے۔ جہاں فاقہ کشی، کام کی زیادتی، شدید سردی یا بندوق کی گولی نے ان کا کام تمام کر دیا۔ ان کیمپوں میں خوراک کے راشن کی مقدار ہمیشہ فاقہ کشی کے قریب ہوتی تھی جو بعض صورت میں چار سو گرام روزانہ تک تھی اور وہ بھی ہر روز میسر نہیں ہوتی تھی۔ جیلوں میں خوراک کی اتنی قلیل مقدار دینے کے بعد قیدیوں کو کان کنی یا بھاری تعمیراتی کام پر لگا دیا جاتا تھا اور وہ بھی سردی سے منجمد علاقوں میں۔ ذیل میں ایسے ہی ایک کیمپ کی تصویر کشی کی گئی ہے:

''میں ان تمام باتوں کو نہیں دہراؤں گا جو میں نے سنی تو ہیں لیکن ان کا عینی شاہد نہیں ہوں۔ میں صرف یہ بتاؤں گا کہ لوگ درجنوں کے حساب سے روزانہ میری آنکھوں کے سامنے خیموں میں، لوہے کی انگیٹھیوں کے گرد اکٹھے ہو کر سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے بھوک اور سردی سے نڈھال ہو کر، دست کی بیماری اور خوراک کی کمی کا شکار ہو کر کس طرح مر رہے تھے۔

ایڈک میں موت اور بیماری کی اونچی شرح کا سبب یہ حقیقت تھی کہ جب ورکوٹا سے لوگ آئے تو ان کیلئے خیمے تیار نہیں تھے۔ اس لئے کھلے آسمان کے نیچے منجمد زمین پر سونے کی وجہ سے انہیں سردی لگ گئی۔ علاوہ ازیں انہیں کھانے کو بھی کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ باورچی خانہ، بیکری اور غسل خانہ موجود ہی نہیں تھا۔ بھوک سے لاچار ہو کر ان فاقہ کشی کا شکار لوگوں نے کھلے آسمان کے نیچے پڑے ہوئے گلے سڑے آلوؤں پر ہلہ بول دیا۔ آلو چونکہ گلے سڑے تھے اس لئے انہیں کھانے والے تمام افراد دست کی بیماری میں مبتلا ہو گئے اور ان میں موجود زیادہ کمزور لوگ مکھیوں کی طرح مرنے لگے۔ کھلے چولہوں پر رکھی ہوئی دیگچیوں میں ایسی بودار کاڈفش نسل کی مچھلیاں ابالی جاتی تھیں جن میں سے کچھ منجمد ہوتی تھیں اور کچھ منجمد ہونے کے بعد دوبارہ اپنی قدرتی حالت میں واپس آچکی ہوتی تھیں پھر ان ابلی ہوئی مچھلیوں کو براہ راست قیدیوں کے غلیظ ہاتھوں میں تھما دیا جاتا تھا۔ روٹی بالکل دستیاب نہیں تھی۔ اس کی بجائے گندھے ہوئے آٹے کے پیڑے انہی دیگچیوں میں ابال کر دیئے جاتے تھے۔ ایسا ہی ایک آدھا گیلا اور ابلتا ہوا گرم پیڑا ہر قیدی کو پکڑا دیا جاتا تھا جس پر اسے پورا دن گزارا کرنا ہوتا تھا۔ فاقہ کش لوگ جلدی جلدی ندیدوں کی طرح اسے حلق سے اتار لیتے اور پھر اگلے ہی لمحے درد کے مارے پیٹ تھام لیتے۔''(44)

ایسی جہنمی جگہوں میں بھی ٹراٹسکائیٹ اپنی تنظیم اور انقلابی جذبے کو قائم رکھے ہوئے تھے۔وہ سیاسی بحثیں کرتے اور سوویت یونین کے علاوہ عالمی حالات وواقعات پر نگاہ رکھنے کی کوشش کرتے۔سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے ناقابل برداشت دباؤ کے باوجود ایک بھوک ہڑتال منظّم کی جس کی کوئی مثال سٹالن کی جبری مشقت کے کیمپوں میں نہیں ملتی۔اکتوبر 1936ء میں قیدیوں نے ہڑتال کرنے کا اعلان کر دیا۔ٹراٹسکائیٹس کی بیرکوں میں ہڑتال 100 فیصد کامیاب تھی۔یہاں تک کہ اردلیوں نے بھی ہڑتال کی۔ورکوٹا کی کانوں میں ہونیوالی ہڑتال میں تقریباً ایک ہزار قیدیوں نے شرکت کی جو چار ماہ تک جاری رہی اور مارچ 1937ء میں صرف اس وقت ختم ہوئی جب جی پی یو کے ہیڈکوارٹر سے قیدیوں کو یہ تار وصول ہوئی کہ ان کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے ہیں۔لیکن بعد میں جیل کا نظام بدترین شکل اختیار کر گیا۔آخرکار مارچ 1938ء میں ورکوٹا کے ٹراٹسکائیٹس کو ٹنڈرا کے منجمد علاقے میں لے جا کر ٹولیوں کی صورت میں گولی سے اڑا دیا گیا۔

''ٹنڈرا میں سزائے موت کا یہ سلسلہ اپریل کا پورا مہینہ اور مئی میں بھی جزوی طور پر جاری رہا۔عام طور پر ایک دن کے بعد یا دو دن کے بعد تیس یا چالیس قیدیوں کو لے جایا جاتا تھا۔یہ بات قابل غور ہے کہ ہر بار چند عام مجرموں یا عادی مجرموں کو بھی شامل کر لیا جاتا تھا۔قیدیوں کو دہشت زدہ کرنے کیلئے جی پی یو وقتاً فوقتاً مقامی ریڈیو کے ذریعے گولی سے ہلاک کئے جانے والوں کی فہرست جاری کرتی رہتی تھی۔عام طور پر نشریات کا آغاز یوں ہوتا تھا کہ ردانقلابی فساد، تخریب کاری، کیمپوں میں لوٹ مار، کام سے انکار اور فرار کی کوشش کرنے کی وجہ سے مندرجہ ذیل افراد کو گولی ماردی گئی ہے۔اس کے بعد کچھ سیاسی قیدیوں کیساتھ عام مجرموں کے نام ملا کر فہرست سنادی جاتی تھی۔

ایک دفعہ سو افراد پر مشتمل گروہ کو گولی مارنے کیلئے لے جایا گیا جن میں سے اکثریت ٹراٹسکائٹس کی تھی۔روانہ ہوتے وقت انہوں نے انٹرنیشنل گانا شروع کر دیا جس پر کیمپ میں موجود سینکڑوں قیدی بھی ان کے ساتھ آواز ملا کر گانے لگے۔

مئی کے آغاز میں عورتوں کے ایک گروپ کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ان میں یوکرائن کی کمیونسٹ چوسکایا بھی شامل تھی جو 1898ء کے زمانے سے بالشویک آئی این سمیرنوف کی بیوی تھی۔سمیرنوف کی نوجوان بیٹی اولگا کو جو غیر سیاسی تھی اور موسیقی سے جنون کی حد تک لگاؤ رکھتی تھی ایک سال قبل ماسکو میں گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔ان کے علاوہ کوسیر اور میلنائس وغیرہ کی بیویاں بھی گولی کا نشانہ بنیں۔ان میں ایک

عورت ایسی بھی تھی جو بیساکھیوں کے سہارے چلتی تھی۔ جب کسی مرد کو سزائے موت ہوتی تھی تو اس کی بیوی خود بخود سزائے موت کی حق دار قرار پا جاتی تھی اور جہاں تک اپوزیشن کے جانے پہچانے اراکین کا تعلق تھا تو اس کا اطلاق ان کے بارہ سال سے زیادہ عمر کے بچوں پر بھی ہوتا تھا۔'' (45)

''قابیل کی مہر''

تطہیروں کی اس قدر دہشت تھی کہ کچھ عرصے کیلئے سوویت مزدور طبقہ سکتے کا شکار ہو گیا۔ لینن کے انتہائی قریبی ساتھیوں سمیت تمام پرانے بالشویکوں پر نازی جرمنی کی خفیہ پولیس گسٹاپو کے ایجنٹ ہونے کا الزام عائد کر دیا گیا۔ اس طرح اکتوبر انقلاب کے ساتھ زندہ رابطے منقطع ہو گئے۔ اس کی وجہ سے بعد میں آنے والے ایک مرحلے پر رجعت کی راہ ہموار ہو گئی۔ اس ضمن میں بین الاقوامی کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈروں کا کردار خصوصاً بہت مہلک تھا۔ الزامات کی خوفناک نوعیت اور ملزمان کی تاریخ سے واقف ہونے کے باوجود کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈروں نے ملزموں کی مذمت کرنے اور جلادوں کو حق بجانب قرار دینے میں کوئی وقت ضائع نہیں کیا۔ وہ سٹالن ازم کی دلدل میں ایسے غرق تھے کہ کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈروں میں سے کسی نے بھی ان خوفناک تطہیروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کی۔ وہ ماسکو کے خاشامدی بن چکے تھے۔ ان ''کمیونسٹ'' لیڈروں کی سٹالن کے جرائم میں شرکت عالمی مزدور تحریک کی تاریخ کے شرمناک ترین ابواب میں سے ایک ہے۔ انہوں نے ماسکو کی پالیسی کے ہر پیچ و خم میں حصہ لیتے ہوئے پرانے بالشویکوں کے قتل کو جائز قرار دیا اور سٹالن کی شان میں قصیدے پڑھے۔ بیوروکریسی کے تمام تر جرائم کی بے ایمانی سے پردہ پوشی کرتے ہوئے انہوں نے سوویت یونین کے کئی دہائیوں بعد واقع ہونے والے انہدام کی راہ ہموار کی اور یہ لوگ موجودہ تباہی کیلئے بڑی حد تک ذمہ دار ہیں۔

برطانوی سٹالنسٹ اینڈریو روتھ سٹین نے سٹالن کی زندگی میں ہی ایک کتاب لکھی۔ اس کے مطابق ''ان سالوں میں سوویت یونین کے شہریوں نے اپنے ملک کی قوت کو کچھ اس طرح سے محسوس کیا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔'' وہ مزید لکھتا ہے کہ ''1936ء کے موسم بہار کے اواخر میں نازی ایجنٹوں اور ٹراٹسکائیٹ سازشیوں کی گرفتاریوں کے سلسلے کے بعد ایک وسیع تنظیم کے وجود کا انکشاف ہوا۔ ایک ایسی مرکزی دہشت گرد کمیٹی جس میں نہ صرف زینوویف اور کامینیف بلکہ بہت سے نمایاں ٹراٹسکائیٹس بھی شامل تھے۔ مقدمے کے دوران ابتدائی تفتیش اور شہادتوں سے یہ انکشاف ہوا کہ ان جرمنوں کی وساطت

سے جنہیں ٹراٹسکی نے بذات خود سوویت یونین بھیجا تھا یہ تنظیم جرمن گسٹاپو سے قریبی رابطہ قائم رکھے ہوئے تھی۔ زینوویف، کامینیف اور ان کے ساتھیوں کو گولی سے اڑا دیئے جانے کی سزا سنائی گئی۔" (46)

1936ء میں سی پی جی بی کے ایک اور ممبر کی کتاب شائع ہوئی جس میں جھوٹے اعتراف جرم حاصل کرنے کیلئے اذیتیں دیئے جانے کے تصور کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ ایس آر کیمبل نے ایک ٹراٹسکائیٹ اور خانہ جنگی کے ہیرو مورالوف کے مقدمے کے سرکاری ریکارڈ کا ایک حصہ نقل کیا ہے:

"وشسکی: کیا تمہارے ساتھ برا سلوک کیا گیا ہے؟

مورالوف: مجھے آزادی سے محروم کیا گیا ہے۔

وشسکی: لیکن شاید تمہارے خلاف تشدد آمیز طریقے اپنائے گئے ہوں؟

مورالوف: نہیں، ایسا کوئی طریقہ استعمال نہیں کیا گیا۔ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ نووسیرسک میں اور یہاں میرے ساتھ مہذبانہ اور نرمی کا برتاؤ کیا گیا۔" (47)

یہ ایسا دور تھا جب سٹالن کی جیلوں میں اختیار کئے جانے والے جابرانہ ہتھکنڈے اپنی ظالمانہ ترین شکل میں موجود تھے۔ جی پی یو کی سربراہی یوگوڈا کے بعد یژوف کے ہاتھ آنے کے بعد پہلی بار دوران تفتیش اذیت دینے کی اجازت دی گئی تھی۔ اس کے باوجود کیمبل لکھتا ہے:

"ٹراٹسکی ہم سے اس بات پر یقین کرنے کی توقع رکھتا ہے کہ اس کے نمایاں ترین پیروکاروں میں سے ایک نے جس کی سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی سے کبھی نہیں نبھ سکی ایسے جرائم کے ارتکاب کا جو اس سے سرزد نہیں ہوئے تھے نہ صرف اعتراف کر لیا بلکہ درحقیقت یہ جھوٹا بیان بھی دیا کہ اس سے نہایت مہذبانہ سلوک کیا گیا ہے۔" (48)

ایک اور جگہ وہ مورالوف کے مقدمے پر ٹراٹسکی کے تبصرے کو 'پاگل خانے سے جاری کردہ قضیہ' قرار دیتا ہے۔ (49) کیمبل کہتا ہے کہ "ان میں سے کچھ سرگرمیاں جرمن خفیہ سروس کی براہ راست ہدایات کے تحت عمل میں لائی گئیں۔" (50) پھر لکھتا ہے، "بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اہم عہدوں پر فائز تھے۔ بدقسمتی کی بات یہ نہیں ہے کہ غداروں کو گولی ماردی گئی ہے اور بگڑے ہوئے اور کاہل لوگوں کو برطرف کر دیا گیا ہے۔ ٹراٹسکائیٹ غدار بھی تطہیر پر یقین رکھتے تھے۔ ایک ایسی تطہیر جو صرف فاشسٹوں کی فتح کی صورت میں ہی ممکن تھی۔ تطہیر اس احمقانہ خواب کا حتمی اور تباہ کن جواب ہے۔ یہ بیوروکریسی کی فتح کو نہیں بلکہ سوشلسٹ جمہوریت کی فتح کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ بھگوڑوں، غنڈوں اور بزدلوں کے مقابلے میں

سوویت یونین کے عوام کو ظاہر کرتی ہے۔'' (51)

یہ جھوٹا الزام کہ جانے پہچانے انقلابیوں نے سوویت یونین کا تختہ الٹنے کیلئے ہٹلر کے ساتھ تعاون کیا تھا اس وقت فیصلہ کن طور پر غلط ثابت ہو گیا جب دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمن دستاویزات کا جائزہ لیا گیا، ''1945 میں جرمنی کی شکست کے بعد جو بے شمار مواد سامنے آیا ہے اس میں این کے وی ڈی اور گسٹاپو کے درمیان سازش کی کچھ شہادتیں تو ملی ہیں لیکن گسٹاپو اور اپوزیشن کے درمیان رابطے کی کوئی شہادت نہیں ملی۔ آخری بات یہ کہ جہاں تک مقدمے کے دوران ماضی کے واقعات کو استغاثہ کی طرف سے مسخ کر کے پیش کرنے کا تعلق ہے تو ان پر سے ہر وہ شخص پردہ اٹھا سکتا ہے جس کے پاس ایسے وسائل موجود ہوں جو تاریخ دانوں کے پاس موجود ہوتے ہیں۔'' (52)

برطانوی روزنامے ''ڈیلی ورکر'' نے اپنے مضامین میں ملزمان کو سزائے موت دینے کا مطالبہ کرتے ہوئے یہ نعرہ دیا ''رینگنے والے جانوروں کو گولی ماردو۔'' دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانوی کمیونسٹ پارٹی نے برطانوی ٹراٹسکائیٹس کے خلاف ایک پمفلٹ شائع کیا جس کا عنوان تھا ''ہٹلر کے خفیہ ایجنٹ'' انہوں نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ انہیں غیر قانونی قرار دیا جائے۔ یہ اس وقت کی عالمی مزدور تحریک میں سٹالنسٹوں کے غنڈہ گردی پر مبنی طریقوں کی ایک مخصوص مثال ہے۔ تاہم ان الزامات میں کوئی بھی جان نہیں تھی۔ ان میں سے کوئی بھی ان جرائم کا مرتکب نہیں ہوا تھا جن کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ یہ تاریخ کے گھناؤنے ترین جرائم میں سے ایک تھا اور قابیل کی مہر نہ صرف اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں پر ہمیشہ کیلئے ثبت ہو چکی ہے بلکہ ان لوگوں پر بھی ثبت ہو چکی ہے جو تماشائیوں کی حیثیت سے تالیاں بجانے والوں میں شامل تھے۔

اس سلسلے میں یہ دلیل نہیں دی جا سکتی کہ یہ لوگ لاعلم تھے۔ اس تمام دور میں لیون ٹراٹسکی اور اس کے بیٹے لیون سیڈوف نے بے شمار مواد شائع کیا جو الزامات کے جھوٹ کو فیصلہ کن طور پر ثابت کرتا تھا۔ یہ مواد کمیونسٹ پارٹی کے لیڈروں کی دسترس میں تھا۔ ایک مقدمے میں ملزم کی ٹراٹسکی کے ساتھ ناروے میں ہونے والی مبینہ ملاقات پر بہت زور دیا گیا تھا۔ ٹراٹسکی نے ثابت کیا کہ اس ایئرپورٹ پر بیان کردہ تاریخ یا اس کی قریبی تاریخ کو کوئی جہاز نہیں اترا تھا۔ اس سے ملتے جلتے اور بہت سے تضادات بھی موجود تھے۔ 1937ء میں امریکی فلسفی جان ڈیوی کے تحت ایک غیر جانبدار عالمی تحقیقاتی کمیشن نے کریملن کی جانب سے ٹراٹسکی اور اس کے بیٹے لیون سیڈوف کیخلاف لگائے گئے الزامات کی جانچ پڑتال کی۔ کمیشن

کے سامنے جو تفصیلی شہادتیں پیش کی گئیں ان کے باریک بینی سے کئے گئے معائنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ماسکو میں جاری مقدمات جعلی ہیں اور ٹراٹسکی اور سیڈوف ان مخصوص اٹھارہ الزامات سے بالکل بری الذمہ ہیں جو ان کیخلاف لگائے گئے ہیں۔ 1956ء میں ہونے والی بیسویں سی پی ایس یو کانگریس کے خفیہ اجلاس میں خروشیف نے اعتراف کیا کہ یہ مقدمات جعلی تھے اور گولیوں کا نشانہ بننے والے لوگوں نے ان جرائم کا ارتکاب نہیں کیا تھا جن کے الزامات ان پر عائد کئے گئے تھے۔

خروشیف نے سوشلزم کیخلاف کئے گئے ان جرائم کو ایک شخص کے سر تھوپنے کی کوشش کی، گویا ایک آدمی ایسے عفریتی نظام کیلئے ذمہ دار ہو سکتا تھا؟ دوسری جنگ عظیم کے دوران مقبوضہ یورپ میں سوویت انٹیلی جنس نیٹ ورک کے لیڈر لیوپولڈ ٹریپر نے اس خیال کی تردید کی۔ وہ پوچھتا ہے کہ ''جب ان کے قریبی ساتھیوں کو بلا ثبوت سزائیں دی جا رہی تھیں تو وہ خاموش تماشائی کیسے بنے رہے؟ 1956ء کی بیسویں کانگریس کے بعد ان تمام لیڈروں نے جھوٹ موٹ کی حیرت کا اظہار کیا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ خروشیف کی رپورٹ ان کیلئے ایک انکشاف کا درجہ رکھتی ہے۔ حقیقت میں وہ ان لوگوں کے خاتمے کی سازش میں شعوری طور پر شریک تھے جن میں ان کی اپنی پارٹی کے ممبران بھی شامل تھے۔'' وہ مزید لکھتا ہے کہ ''میرے ذہن میں اب بھی اس تاریک دور کی یادیں باقی ہیں جنہیں وقت مٹانے میں ناکام رہا ہے۔ ہمارے اعمال کا محرک کل کے بارے میں خوف اور یہ ذہنی عذاب تھا کہ ہو سکتا ہے یہ ہماری آزادی کے آخری گھنٹے ہوں۔ خوف، جو ہماری ثانوی فطرت بن چکا تھا ہمیں احتیاط پر اکساتا تھا اور اطاعت پر مائل کرتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دوستوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے اور میں خاموش رہا۔ صرف انہی کو کیوں؟ مجھے کیوں نہیں؟ میں اپنی باری کا انتظار کرتا رہا اور خود کو اس انجام کیلئے تیار کرتا رہا۔''(53)

خروشیف کے انکشافات کے باوجود تطہیر کا شکار ہونے والے کم لوگوں کو از سر نو زندگی شروع کرنے کا موقع دیا گیا۔ گورباچوف کے اقتدار میں آنے کے بعد گلاسناسٹ کے جزو کے طور پر اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ضرور ہوئی۔ جولائی 1987ء میں بخارن اور رائیکوف کو الزامات سے بری قرار دیا گیا جنہیں 1938ء میں گولی ماردی گئی تھی۔ فروری 1988ء میں 1938 میں رائیٹ ٹراٹسکائیٹ بلاک کیخلاف دیئے گئے ملٹری کولیجیم کے فیصلے کو سوویت سپریم کورٹ نے کالعدم قرار دے دیا۔ تاہم 1935ء، 1936ء اور 1937ء میں قائم کئے گئے مقدمات اور ان سے قبل ملٹری کولیجیم اور 1932ء اور 1928ء میں قائم کئے گئے جھوٹے مقدمات کے بارے میں فیصلے کو التوا میں ڈال دیا گیا۔ بخارن کو بری کرنے سے

گورباچوف کا خود غرضانہ مفاد وابستہ تھا کیونکہ وہ اس کے خیالات سے کئی نکات پر متفق تھا خاص طور پر منڈی کے دوبارہ قیام کی ضرورت کے حوالے سے۔ جب کہ نومبر 1987ء میں گورباچوف نے ٹراٹسکی کی مذمت ''ایک عیار سیاست دان'' کہہ کر کی اور ٹراٹسکی ازم کو ایک ایسا رجحان قرار دیا ''جس کے نظریات اپنی روح میں سرمایہ دارانہ پوزیشن رکھتے تھے۔'' اس کے مقابلے میں ''سٹالن کی سربراہی میں پارٹی کا سیاسی سنٹر اس نظریاتی جدوجہد میں ٹراٹسکائیٹ اپوزیشن کیخلاف لینن ازم کا دفاع کرتا تھا۔''

اگرچہ تطہیری مقدمات مکمل طور پر جعلی ثابت ہو چکے تھے مگر ٹراٹسکی پر لگائے گئے الزامات کو واپس نہیں لیا گیا اور اسے عفریت ثابت کرنے کی کوششیں پھر سے شروع کر دی گئیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ حکمران ٹولہ ابھی تک اس کے خیالات یعنی بالشوازم لینن ازم کے حقیقی تصورات سے خائف ہے۔ اکتوبر 1988ء میں پراودا اخبار میں ٹراٹسکی پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے ملک سے باہر پراپیگنڈا کر کے سوویت یونین کے اندر سیاسی دہشت گردی کی لہر کو جنم دیا تھا۔

میڈویڈیف کہتا ہے ''خصوصی طور پر جہاں تک ٹراٹسکی کی سرگرمیوں اور المناک انجام کا تعلق ہے تو ان کا محتاط اور باریک بینی پر مبنی سیاسی اور قانونی جائزہ لیا جانا چاہیے۔'' تاہم وہ کہتا ہے کہ ''ٹراٹسکی کبھی بھی گسٹاپو کا ایجنٹ نہیں تھا اور ہمیں یہ بات بھی ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ ماسکو کے تین بڑے مقدمات میں ٹراٹسکی کو اس کی غیر موجودگی میں سنائی جانیوالی سزائے موت صرف کاغذ پر لکھے حروف تک محدود نہیں رہی۔ اس فیصلے پر عملدرآمد 1940ء میں میکسیکو میں بیرونی ممالک میں خصوصی فرائض کی انجام دہی کیلئے متعین این کے وی ڈی کے ایک گروپ نے کیا۔'' (54)

آخری الفاظ کہنے کیلئے ہم ایک ایسے شخص کو دعوت دیتے ہیں جو بذات خود کبھی بھی ٹراٹسکی کا پیروکار نہیں تھا مگر وہ اپنی المناک زندگی کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنے کی اہلیت ضرور رکھتا تھا کہ کیا واقع ہوا تھا۔ کئی دہائیوں کے بعد اپنے ضمیر کا جائزہ لیتے ہوئے لیوپولڈ ٹریپر تطہیر کے دور میں ماسکو یونیورسٹی میں اپنے اذیت ناک تجربات کو یاد کر کے لکھتا ہے:

''یوگوسلاویہ، پولینڈ، لیتھوینیا، چیکوسلواکیہ سے تعلق رکھنے والے سب لوگ غائب ہو گئے۔ 1937ء تک ولہیم پیک اور والٹر البرشٹ کے سوا جرمن کمیونسٹ پارٹی کا کوئی بھی بڑا لیڈر باقی نہیں بچا تھا۔ جابرانہ پاگل پن کی کوئی حدود نہیں تھیں۔ کورین سیکشن کا قلع قمع کر دیا گیا تھا، ہندوستان کے نمائندے غائب ہو گئے تھے، چینی کمیونسٹ پارٹی کے نمائندوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اکتوبر انقلاب کی روشنی کو زیر

زمین قید خانوں کے اندھیروں میں ختم کیا جا رہا تھا۔ انقلاب انحطاط پذیر ہو کر خوف و دہشت کے نظام میں تبدیل ہو چکا تھا اور سوشلزم کے تصورات کا ایک ایسے کٹر عقیدے کے نام پر مذاق اڑایا جا رہا تھا جسے مارکسزم قرار دینے کی جسارت کا حوصلہ ان جلادوں میں اب بھی موجود تھا۔

اس کے باوجود ہم دکھی دل کے ساتھ اور مجہول ہو کر اس مشینری کا ساتھ دیتے رہے جسے ہم خود اپنے ہاتھوں سے حرکت میں لائے تھے۔ ہم جو اس مشینری کے محض کل پرزے تھے پاگل پن کی حد تک خوف کا شکار ہو کر خود اپنی محکومی کے اوزار بن گئے تھے۔ سٹالنسٹ مشین کے خلاف اٹھ نہ کھڑے ہونے والے تمام لوگ ذمہ دار ہیں، اجتماعی طور پر ذمہ دار ہیں۔ میں اس فیصلے سے مستثنیٰ نہیں ہوں۔

لیکن اس وقت احتجاج کس نے کیا تھا اور اس ظلم و ستم کیخلاف صدائے احتجاج کس نے بلند کی تھی؟

ٹراٹسکائیٹس اس اعزاز کے دعوے دار ہو سکتے ہیں۔ اپنے لیڈر کی مثال پر عمل کرتے ہوئے، جسے اس کی ہٹ دھرمی کا صلہ برف توڑنے والے ہتھوڑے کی نوک سے ادا کیا گیا، انہوں نے آخری سانس تک سٹالن ازم کیخلاف جنگ لڑی اور ایسا کرنے والے یہ واحد لوگ تھے۔ عظیم تطہیرات کے دور تک وہ اپنی بغاوت کا اعلان صرف ان برفیلے میدانوں میں ہی کر سکتے تھے جہاں انہیں ختم کرنے کی غرض سے گھسیٹ لایا گیا تھا۔ جبری مشقت کے کیمپوں میں ان کا رویہ قابل تحسین تھا۔ مگر ان کی آوازیں ٹنڈرا میں گم ہو گئیں۔

آج ٹراٹسکائیٹس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان لوگوں کا گریبان پکڑیں جو کبھی بھیڑیوں کے ساتھ مل کر چیخا کرتے تھے۔ تاہم انہیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ انہیں ہم پر ایک بہت بڑی برتری یہ حاصل تھی کہ ان کے پاس ایک جامع سیاسی نظام موجود تھا جو سٹالن ازم کی جگہ لینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ انقلاب سے غداری ہوتے ہوئے دیکھ کر انہیں جو گہرا دکھ پہنچتا تھا اس کے مداوے کے لئے ان کے پاس کچھ تو تھا جسے وہ سینے سے لگا سکیں۔ انہوں نے ''اعتراف'' اس لئے نہیں کیا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ ان کے اعتراف کر لینے سے نہ تو پارٹی کو کوئی فائدہ پہنچے گا اور نہ ہی سوشلزم کو۔'' (55)

کمیونسٹ انٹرنیشنل کا خاتمہ

اپنے عروج کے زمانے میں کمیونسٹ انٹرنیشنل کروڑوں انسانوں کو تحریک دیتی تھی۔ سلطنت روم

کے جبر کیخلاف محکوم عوام کی رہنمائی کرنے والے ابتدائی عیسائیوں اور عرب قوم کو جگا دینے والے اسلام کے بعد یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی انقلابی تحریک تھی۔لینن اور ٹراٹسکی کو توقع تھی کہ روسی انقلاب کے بعد انقلابات کی ایک لہر اٹھے گی جس سے روسی مزدور ریاست کی تنہائی کا خاتمہ ہوجائے گا۔اس مقصد کے حصول کیلئے انہوں نے کمیونسٹ انٹرنیشنل قائم کی تھی۔کمیونسٹ انٹرنیشنل کی پہلی چار کانگریسوں کو انقلابی نظریے کا غیر معمولی خلاصہ سمجھنا چاہیے جس کا مقصد مغربی یورپ امریکہ اور ایشیا کی نوتشکیل شدہ اور ناتجربہ کار کمیونسٹ پارٹیوں کو تعلیم دینا تھا۔یہ تحریریں آج بھی مارکسی نظریات وتصورات کے خزینے کا درجہ رکھتی ہیں۔

اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل انہی خطوط پر چلتی رہتی تو بلاشبہ اس کا نتیجہ ایک یا ایک سے زیادہ ممالک میں انقلاب کی صورت میں برآمد ہوتا جس سے طاقتوں کے رشتے میں بنیادی تبدیلی واقع ہوتی۔لیکن سٹالنسٹ رجعت کے باعث نہ صرف روس بلکہ تمام دیگر ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں میں ایک بنیادی تبدیلی واقع ہوئی۔ یہاں ہم تجربیت پسندی پر مارکسی طریقہ کار کی برتری کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں۔1928ء میں ہی یعنی ایک ایسے وقت جب کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈر حقیقی معنوں میں ایک انقلابی مارکسسٹ انٹرنیشنل چلانے کی کوشش کررہے تھے ٹراٹسکی نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اگر کمیونسٹ انٹرنیشنل نے ایک ملک میں سوشلزم کی تھیوری اپنالی تو اس کے باعث ناگزیر طور پر ایک ایسا عمل شروع کیا جائے گا جو دنیا کی ہر کمیونسٹ پارٹی کو زوال پذیر ہوکر قومی اصلاح پسندی کی طرف مائل کرے۔کمیونسٹ پارٹیوں کے لیڈروں نے اس وقت ٹراٹسکی کی پیش گوئی کا مضحکہ اڑایا تھا۔لیکن آج تاریخ نے ان سے ایک سفاکانہ انتقام لیا ہے۔ستر سال بعد عظیم کمیونسٹ انٹرنیشنل غائب ہوچکی ہے اور ہر جگہ کمیونسٹ پارٹیاں زوال پذیر ہوکر قوم پرستانہ اور اصلاح پسندانہ راہوں پر نکل گئی ہیں بالکل اسی طرح جیسے ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی۔

یہ عمل کل ہی شروع نہیں ہوا۔یہاں تک کہ دوسری جنگ سے پہلے ہی سٹالن کے مہلک اثرات کے تحت کمیونسٹ پارٹیاں بدترین موقع پرستی کا شکار ہوچکی تھیں۔ایک کے بعد دوسرا نشیب وفراز آتا رہا۔ سوشل ڈیموکریٹوں کے ساتھ مصالحت سے لے کر تیسرے دور کی الٹرالیفٹ دیوانگی تک۔کمیونسٹ پارٹیوں نے سوویت یونین اور نام نہاد جمہوریتوں کے درمیان ''فاشزم مخالف اتحاد'' کو فروغ دیا۔اس اتحاد کے جھنڈے تلے انہوں نے سپین اور فرانس کے 1936ء کے انقلاب کے ساتھ اس وقت غداری

کی جب مزدور طبقہ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے سکتا تھا۔ سٹالن کی خارجہ پالیسی کی ضروریات پر عمل کرتے ہوئے ''اتحاد'' کے چبوترے پر انقلاب کو قربان کر دیا گیا۔

ہٹلر کے عروج کے بعد ایک بار پھر سٹالن کی پالیسیوں کے تحت سوویت یونین میں بیوروکریسی کی گرفت کو مزید مضبوط کر دیا گیا۔ اپنی طاقت کو بڑھاتے ہوئے نوکر شاہی ٹولا خود کو سوویت عوام سے بلند سے بلند تر کرتا گیا۔ لیکن انحطاط پذیری کا یہ عمل معیاری تبدیلیوں سے بھی گزرا تھا۔ اولاً تو یہ عالمی مزدور طبقے کو اپنی نااہلی کے باعث شکستوں کا تحفہ دینے کے علاوہ کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اب سٹالن ازم دوسرے ممالک میں مزدوروں کے انقلاب ہی کا مخالف بن چکا تھا۔ ماسکو مقدمات، پرانے بالشویکوں کے قتل عام، تطہیرات، لاکھوں روسی کمیونسٹ مزدور کے قتل اور جلاوطنی نے سوویت یونین کے اندر سٹالنسٹ ردانقلاب کو مکمل کر دیا۔

فرانس اور سپین میں رونما ہونیوالے واقعات ہر انقلابی کے ذہن میں تازہ تھے۔ کامنٹرن نے اس انقلاب کو تباہ کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا جسے کامیاب بنایا جا سکتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے خود کو رد انقلاب کے جنگجو ہراول دستے کے طور پر پیش کیا۔ مزدور طبقے کی شکست کا نتیجہ ناگزیر طور پر ایک نئی عالمی جنگ کی صورت میں برآمد ہوا۔ طرفہ تماشہ یہ کہ جنگ کا آغاز ہٹلر اور سٹالن کے درمیان معاہدے سے ہوا۔ اس طرح سٹالن نے عالمی مزدور طبقے اور کامنٹرن پر نئی ضربیں لگائیں۔ اس نے اب ایک اور قلابازی لگائی اور ایک ''انقلابی'' پالیسی کی ہنرمندانہ جعل سازی کے ساتھ ہٹلر کے مفاد میں امن کی مہم چلائی۔ جیسا کہ ٹراٹسکی نے مارچ 1939ء کو لکھے گئے اپنے مضمون میں سٹالن، ہٹلر سمجھوتے کے بارے میں پیش گوئی کرتے ہوئے لکھا تھا ''حالیہ برسوں میں سٹالن کی خارجہ پالیسی کی بنیادی خاصیت یہ رہی ہے کہ وہ مزدور طبقے کی تحریکوں کی تجارت بھی اسی طرح کرتا ہے جس طرح وہ تیل، میگنیز اور دیگر اشیا کی تجارت کرتا ہے۔'' اس بیان میں زیب داستان کا شائبہ تک موجود نہیں ہے۔ مختلف ممالک میں کامنٹرن کے شعبوں اور محکوم اقوام کی جدوجہد آزادی کی حیثیت اس ریزگاری کی سی تھی جسے سٹالن سامراجی طاقتوں کے ساتھ اپنے معاملات طے کرنے میں استعمال کرتا تھا۔

''جب اسے فرانس کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ فرانسیسی پرولتاریہ کو ریڈیکل بورژوازی کے تابع کر دیتا ہے۔ جب اسے جاپان کیخلاف چین کی مدد کرنا پڑتی ہے تو وہ چینی پرولتاریہ کو منتانگ کے تابع کر دیتا ہے۔ ہٹلر کے ساتھ سمجھوتے کی صورت میں وہ کیا کرے گا؟ ہٹلر کو جرمن کمیونسٹ پارٹی کا گلا

گھونٹنے کیلئے سٹالن کی مدد کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کی موجودہ غیر اہم حالت اس کی پچھلی پالیسیوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن اس امر کا کافی امکان موجود ہے کہ جرمنی میں غیر قانونی کاموں کیلئے دی جانیوالی امداد کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔ یہ ان معمولی رعایتوں میں سے ایک ہے جو اسے دینا پڑے گی اور وہ اس پر ہنسی خوشی رضامند ہو جائیگا۔

ہمیں یہ بھی فرض کر لینا چاہیے کہ فاشزم کیخلاف کامنٹرن جو شور وغوغا برپا کرنے کی کھوکھلی مہم کئی برسوں سے چلا رہی ہے اسے بھی نہایت عیاری سے ختم کر دیا جائے گا۔'' (56)

اس پیش گوئی کی تصدیق حیرت انگیز طور پر 1939ء کے ہٹلر سٹالن معاہدے سے ہوگئی۔

پانچ سال تک سوویت یونین، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی ''جمہوریتوں'' کے درمیان سمجھوتے کا زور وشور سے تقاضا کرنے کے بعد سٹالن نے پھر ایک الٹ بازی لگائی اور 1939ء میں ہٹلر سے سمجھوتہ کر لیا۔ ٹراٹسکی نے انتباہ کیا کہ یہ فاشسٹوں کی بڑی فتوحات کیلئے راستہ ہموار کرنا ہوگا کیونکہ اس سے برطانیہ، فرانس اور دیگر ممالک کے مزدور اپنی راہ کھو بیٹھیں گے۔ اس سے دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا جس کے بارے میں سٹالن کا خیال تھا کہ اتحاد بدلنے کی سفارتی چالاکیوں سے وہ اس سے بچ سکتا ہے۔ اب کمیونسٹ پارٹیوں نے اپنی ''اجتماعی سلامتی'' کی پوزیشن کو الٹ کر ''جنگجو اتحادیوں'' پر حملے شروع کر دیئے۔ مثلاً 40-1939ء کی نام نہاد جھوٹی جنگ میں برطانوی اخبار ''ڈیلی ورکر'' ہٹلر کی شرائط پر امن کا مطالبہ کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ غیر قانونی جرمن کمیونسٹ پارٹی کی بھی یہی پوزیشن تھی۔ فرانس پر جرمنی کے قبضے کے بعد فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی نے جرمنوں کے پاس اپنا اخبار ''لی ہیومینائٹ'' شائع کرنے کی اجازت لینے کی غرض سے ایک وفد بھیجا۔ انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ تاہم ناروے میں نازی قبضے کے دوران چند ماہ تک سی پی کو اخبار شائع کرنے کی اجازت حاصل رہی جس میں ''امن'' وغیرہ کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس سوشل ڈیموکریٹ اخبارات کو بند کر دیا گیا تھا۔ فطری بات ہے کہ جب وہ اپنا غلیظ کام سرانجام دے چکے تو انہیں بھی دبا دیا گیا کیونکہ اس وقت ہٹلر روس پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

سٹالن کی اس پالیسی اور کامنٹرن کی ''بدبودار لاش'' کو نازیوں کے روس پر حملے سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ 1941ء کے بعد ''لائن'' کو پھر تبدیل کر دیا گیا۔ روس پر ہٹلر کے حملے کے بعد کمیونسٹ پارٹیوں کو دوبارہ متحرک کیا گیا کہ وہ ''فاشزم کیخلاف جنگ'' میں ''جمہوریتوں'' کی حمایت کریں۔ برطانوی اخبار ڈیلی ورکر نے دو انچ چوڑی شہ سرخی ان الفاظ کے ساتھ جمائی ''صرف وہی جرمن اچھا ہے

جومردہ ہو۔'' کامنٹرن کو پھر قلابازی لگانی پڑی تا کہ خود کو روز ویلٹ اور برطانوی سامراج کا سنگ در بنا سکے۔لیکن سٹالن کے امریکی اور برطانوی سامراج پر انحصار کے بڑھنے سے سرمایہ دار اتحادیوں کی طرف سے دباؤ میں بھی اضافہ ہوا۔خصوصاً امریکی سامراج کامنٹرن کی تحلیل کا تقاضا اس لئے کر رہا تھا کہ ہٹلر کی شکست کے بعد یورپ میں سماجی انقلاب کے خطرے کے خلاف حتمی ضمانت حاصل کی جاسکے۔

اس طرح طویل تصنع کا خاتمہ ہو گیا۔ 1943ء میں سٹالن نے اس گلی سڑی کامنٹرن کو تحلیل کر دیا تا کہ سامراجیوں کی خوشنودی حاصل کی جاسکے۔اس مجرمانہ پالیسی کا وہ اثر نہیں ہوا جو سٹالن چاہتا تھا۔ 1941ء کے بعد مقبوضہ یورپ میں کمیونسٹ پارٹیوں کے عام ارکان نے مزاحمتی تحریک میں نہایت جرات مندانہ کام سرانجام دیا۔لیکن جب فرانس، اٹلی، بلجیئم اور نو دوسرے ممالک میں کمیونسٹ پارٹیوں کے اقتدار میں آنے کا امکان پیدا ہوا تو وہ متحد حکومتوں میں شامل ہو گئیں۔ جب انہوں نے سرمایہ داری کو بچالیا تو انہیں ٹھڈے مار کر نکال دیا گیا۔اس سے سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔ایک ایسا دور جس میں مغرب اور سٹالن ازم کے درمیان رقابتیں اور سپر پاوروں کے درمیان تناؤ بہت بڑھ گیا۔

باب نمبر 3: پانچ سالہ منصوبہ تطہیرات تک

1۔ ٹراٹسکی۔تحریریں36-1635۔صفحہ 179

2۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 38

3۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 39

4۔ نوی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ صفحہ 174

5۔ وکٹر کریوشنکو میں نے آزادی کو منتخب کیا۔صفحہ 67

6۔ ایلک نوی سوویت یونین کی معاشی تاریخ۔صفحہ 167

7۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 36

8۔ ٹراٹسکی۔تحریریں1929۔صفحہ 136

9۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری صفحہ 94

10۔ ٹراٹسکی تحریریں1929۔صفحہ 369

11۔ ایلک نوی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ صفحہ 231

12۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 82-83

13۔ سٹالن کی تقریریں ٹی کلف کی کتاب روس میں ریاستی سرمایہ داری سے اقتباس۔
صفحہ 5

14۔ ٹی کلف۔روس میں ریاستی سرمایہ داری۔صفحہ 121

15۔ ایضاً۔صفحہ 122

16۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 115-166

17۔ ٹراٹسکی۔تحریریں1929۔صفحہ 284-285

18۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 161-160

19۔ رائے ہاورڈ سٹالن کا انٹرویو۔ مارچ/اپریل کمیونسٹ انٹرنیشنل 1936ء

20۔ میخائل گورباچوف۔ پریسٹرائیکا۔ دنیا اور ہمارے ملک کیلئے نئی سوچیں صفحہ 188-187

21۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 26 صفحہ 252

22۔ ایضاً جلد 29 صفحہ 256

23۔ کارل راڈک۔ جرمن انقلاب اور سوویت پاور بحث۔ صفحہ 35

24۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 28 صفحہ 365-364

25۔ ٹراٹسکی۔ لینن کے بعد تیسری انٹرنیشنل۔ صفحہ 73

26۔ سٹالن مجموعہ تصانیف جلد 9 صفحہ 265

27۔ بریان پیٹرس اور مائیکل ووڈ ہاؤس، برطانیہ میں کمیونزم کی تاریخ صفحہ 99

28۔ جے والٹن۔ آؤٹ آف نائٹ۔ صفحہ 253-252

29۔ ٹراٹسکی۔ تحریریں 34-1933۔ صفحہ 21

30۔ ایضاً۔ ایضاً۔ صفحہ 118-117

31۔ رونالڈ فریزر۔ بلڈ آف سپین (سپین کی خانہ جنگی کی زبانی تاریخ) صفحہ 324

32۔ ایضاً ایضاً۔ صفحہ 328

33۔ ایضاً ایضاً۔ صفحہ 390

34۔ ایضاً ایضاً۔ صفحہ 390

35۔ ٹراٹسکی۔ تحریریں 38-1937۔ صفحہ 40-39

36۔ کمیونزم کا راستہ۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی 22ویں کانگریس کی رپورٹ۔ صفحہ 111

37۔ ٹراٹسکی۔ تحریریں 37-1936۔ صفحہ 423

38۔ انالارینا۔ یہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ صفحہ 344-343

39۔ آر۔ میڈویڈیف۔ تاریخ کو فیصلہ کرنے دو۔ صفحہ 193

40۔ ڈی والکوف گونوف۔ٹراٹسکی صفحہ 354-355

41۔ پی جی گریگورینکو۔یادداشتیں۔صفحہ 96

42۔ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی 22ویں کانگریس کی رپورٹ۔ انقلاب کا راستہ۔صفحہ 113

43۔ آر۔میڈویڈیف۔تاریخ کوفیصلہ کرنے دو۔صفحہ 213-214۔ایڈیشن1976

44۔ سمینہ ڈیٹ۔ایک بالشویک۔لینینسٹ کی یادداشتیں۔صفحہ 170

45۔ ایضاً ایضاً۔صفحہ 215-216

46۔ اے روتھ سٹین۔سوویت یونین کی تاریخ۔صفحہ 239-242

47۔ جے۔آرکیمپ بیل۔سوویت مخالف ٹراٹسکائیٹ سنٹر کا مقدمہ۔صفحہ 231-232

48۔ کیمپ بیل۔سوویت پالیسی اوراس پرتنقید۔صفحہ 250

49۔ ایضاً ایضاً۔صفحہ 252

50۔ ایضاً ایضاً۔صفحہ 220

51۔ ایضاً ایضاً۔صفحہ 236

52۔ سچا پیرو۔سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی۔صفحہ 424

53۔ ایل ٹریپر۔عظیم کھیل ماسٹر جاسوس کی یادداشتیں۔صفحہ 54

54۔ میڈویڈیف۔تاریخ کوفیصلہ کن کرنے دیں۔صفحہ 18-19

55۔ ایل ٹریپر۔عظیم کھیل ماسٹر جاسوس کی یادداشتیں۔صفحہ 55-56

56۔ ٹراٹسکی۔تحریریں۔39-1938۔صفحہ 202-203

باب 4

سٹالنزم کی نوعیت

سوویت یونین کے طبقاتی کردار کے بارے میں تنازعہ

لینن کے مطابق ریاست ''ہمیشہ ایک ایسا مخصوص آلہ رہا ہے جو سماج سے بالاتر لوگوں کے ایسے گروہ پر مشتمل ہوتا ہے جس کا کام مکمل طور پر یا تقریباً مکمل طور پر یا محض حکمرانی کرنا ہوتا ہے۔ لوگ محکوموں اور حکمرانی کے ماہرین میں منقسم ہوتے ہیں، جو سماج سے بالاتر ہو جاتے ہیں وہ حکمران یا ریاستی نمائندے کہلاتے ہیں۔

اس مشینری یا دوسروں پر حکمرانی کرنیوالے گروہ کے قبضہ قدرت میں قوت اور جبر کا ایک مخصوص آلہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے چاہے لوگوں پر اس جبر کا اظہار دور غلامی کی طرح ڈنڈے کی شکل میں ہو یا اس سے بہتر قسم کے ہتھیاروں کی شکل میں یا قرون وسطیٰ میں ظاہر ہونیوالے بارودی اسلحہ کی شکل میں یا پھر بیسویں صدی کے ان ہتھیاروں کی شکل میں جو ٹیکنیک کا شاہکار ہیں اور ان کی بنیادیں جدید ٹیکنالوجی کی جدید ترین حاصلات پر ہیں۔

جبر کے انداز بدل گئے مگر جب سے ریاست وجود میں آئی ہے ہر سماج میں افراد کا ایک ایسا گروہ ضرور موجود رہا ہے جو حکمرانی کرتا ہے۔ حکم دیتا ہے اور غالب ہوتا ہے اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کیلئے اس کے پاس جبر اور تشدد کا ایک آلہ موجود ہوتا ہے جو اس عہد کی ٹیکنیکی ترقی کی سطح کی مناسبت سے بہترین ہتھیاروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان عمومی مظاہر کا معائنہ کر کے اور اپنے آپ سے یہ سوال پوچھ کر ہی ہم ریاست کی اہمیت اور اس کی روح کے بارے میں ایک واضح جواب حاصل کر سکتے ہیں کہ جب طبقات موجود نہیں تھے، جب استحصالی اور استحصال زدہ موجود نہیں تھے تو ریاست کیوں موجود نہیں تھی اور ان طبقات کے ظہور میں آتے ہی کس طرح وجود میں آ گئی۔

ریاست ایک ایسی مشینری ہے جس کا مقصد ایک طبقے پر دوسرے طبقے کی حکمرانی برقرار رکھنا ہے۔'' (1)

جیسا کہ مارکس نے کہا تھا ایسا کیوں ہے کہ مزدور طبقہ بنی بنائی سرمایہ دارانہ ریاستی مشینری پر قبضہ کر کے اسے اپنے مفاد کیلئے استعمال نہیں کر سکتا؟ اس کی وجوہات مابعد الطبیعاتی نہیں بلکہ ایسا چند انتہائی ٹھوس حقائق کی وجہ سے ہے۔ جدید ریاست میں تمام کلیدی عہدے ان لوگوں کے پاس ہوتے ہیں جو حکمران طبقے کے تابع ہوتے ہیں اور ان کا انتخاب بطور خاص ان کی تعلیم، طرز فکر اور حالات زندگی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے تا کہ وہ بورژوازی کے مفادات کی خدمت کر سکیں۔ فوجی افسران، بالخصوص اعلیٰ عہدیداروں، سول ملازمین اور ٹیکنیکی ماہرین کو اپنے تصورات اور نقطہ نظر کے مطابق ڈھالا جاتا ہے تا کہ سرمایہ دار طبقے کے مفادات کی بہتر نگہداشت ہو سکے۔ سماج کے تمام اعلیٰ عہدے سرمایہ دار طبقہ ان افراد کے ہاتھوں میں دیتا ہے جن پر وہ اعتماد کر سکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ داروں کے پاس ریاستی مشینری کا جو آلہ ہے اسے مزدور طبقہ استعمال نہیں کر سکتا بلکہ اسے اس مشینری کو توڑ کر نیست و نابود کرنا پڑے گا۔ ریاستی مشینری کو پاش پاش کر دینے سے کیا مراد ہے؟

ممکن ہے کہ مزدور طبقہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد سرمایہ دار ریاست کے اہلکاروں میں سے بہت ساروں کو یا شاید ان کی اکثریت کو استعمال میں لائے۔ لیکن وہ مزدوروں کی کمیٹیوں اور تنظیموں کے ماتحت ہونگے۔ مثال کے طور پر سوویت یونین میں زار شاہی فوج کی تحلیل کے بعد کے ابتدائی دنوں میں سرخ فوج کو پرانی زار شاہی فوج کے سابقہ افسران کی خدمات حاصل کرنا پڑی تھیں لیکن وہ سیاسی کمیساروں کے زیر کنٹرول تھے۔ اسی طرح سوویت ریاستی مشینری کا بڑا حصہ بھی زار شاہی دور کے سابقہ افسران پر مشتمل

تھا۔ ناموافق تاریخی عوامل کے باعث اس نے بعدازاں روسی نظام کے انحطاط پذیر ہونے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ لینن نے بلاوجہ ہی نہیں کہا تھا کہ سوویت ریاست ایک ''بورژوا زارشاہی مشین ہے جس پر سوشلزم کی پتلی سی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔''

کلاسیکی تصور کے مطابق پرولتاریہ پرانی ریاستی مشینری کو پاش پاش کرنے کے بعد نیم ریاست کی تخلیق کی طرف بڑھتا ہے۔ تاہم وہ پرانے ٹیکنیکی ماہرین کو استعمال کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ لیکن بہترین حالات میں بھی مثال کے طور پر ایک صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملک میں جہاں پڑھا لکھا پرولتاریہ موجود ہو، ریاست کی حیثیت طبقاتی سماج کی نشانی ہوتی ہے جس کے اندر انحطاط پذیری کے امکانات موجود رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مارکسسٹ عوامی کنٹرول پر اصرار کرتے ہیں جس کے ذریعے اس امر کو یقینی بنایا جاسکے کہ ریاست ایک خودمختار قوت کے طور پر فروغ نہیں پائے گی اور جتنی تیز رفتاری سے ممکن ہوسکے اسے سماج کے اندر تحلیل کر دینا چاہیے۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر بعض حالات میں ریاست اپنی اس اساس سے کچھ خودمختاری حاصل کرسکتی ہے جس کی وہ بنیادی طور پر نمائندہ تھی۔ اینگلز نے وضاحت کی تھی کہ اگرچہ بالائی ڈھانچہ، ریاست اور آئیڈیالوجی معاشی بنیاد پر انحصار کرتے ہیں تاہم ان کی اپنی خودمختار حرکت بھی ہوتی ہے۔ ایک لمبے عرصے تک ریاست اور اس طبقے کے درمیان، جس کی یہ ریاست نمائندہ ہوتی ہے، تصادم بھی ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے اینگلز ریاست کے عام طور پر یا مخصوص ادوار میں حکمران طبقے کی براہ راست نمائندہ ہونے کی بات کرتا ہے۔ لہٰذا ہم طبقاتی سماج کو صرف اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جب ہم اس میں کارفرما عوامل کے ہمہ جہت باہم جدلیاتی انحصار اور تضادات کو بھی مدنظر رکھیں۔

سماج کے ارتقا پر غور کرتے وقت ہمیں معاشیات کو ایک غالب عامل خیال کرنا چاہیے۔ اس معاشی بنیاد پر کھڑا ہونیوالا بالائی ڈھانچہ خود کو اس بنیاد سے جدا کر لیتا ہے اور اس کا مخالف بن جاتا ہے۔ آخر انقلاب کے مارکسسٹ نظریے کا نچوڑ بھی تو یہی ہے کہ پیداوار میں بتدریج ہونیوالی تبدیلیاں ایک خاص مرحلے پر پہنچ کر ملکیت اور ریاست کے بالائی ڈھانچے کی پرانی ہیئت سے متصادم ہوجاتی ہیں۔ مارکس کے مطابق ''یہ رشتے پیداواری قوتوں کے فروغ کی شکلوں سے تبدیل ہوکر ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتے ہیں۔'' ایک ایسا گہرا تضاد پیدا ہو جاتا ہے جو صرف اس صورت میں دور ہوسکتا ہے کہ بالائی ڈھانچے کو ختم کر کے سماج کو اسی نئے طریقہ پیداوار کی بنیاد پر ازسرنو منظم کیا جائے جس نے پرانی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

اگرچہ اس سے ریاست کی طبقاتی نوعیت کے سوال کا مکمل احاطہ نہیں ہوتا جس کی تعریف مختلف مواقع پر مختلف طرح سے کی جاتی ہے لیکن آخر کار معیشت اور ملکیتی رشتے فیصلہ کن ثابت ہوتے ہیں۔اسی وجہ سے مارکسسٹ استادوں نے اس وضاحت پر زور دیا کہ آخری تجزیے میں بالا ڈھانچے کا اس سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔جیسا کہ مارکس نے بیان کیا تھا کہ ''معاشی بنیاد میں تبدیلی کے ساتھ ہی تمام تر عظیم الشان بالائی ڈھانچہ کم و بیش تیزی سے تبدیل ہو جاتا ہے۔'' اگر اس شرط کو بالائے طاق رکھ دیا جائے تو بہت سی مصنوعی اور من مرضی کی صورتیں ممکن نظر آنے لگتی ہیں۔اس سے ہم ناگزیر طور پر تاریخ کی بھول بھلیوں میں گم ہو جاتے ہیں اور رہنمائی کیلئے ہمارے پاس کوئی رسی نہیں رہتی۔تاریخ کی یہ رسی سماج کا بنیادی معاشی ڈھانچہ یا ملکیت کی شکل یعنی اس کا قانونی عکس ہوتی ہے۔اینگلز کے الفاظ میں ''ہمارے نزدیک معاشی حالات ہی بالآخر تاریخی ارتقا کو متاثر کرتے ہیں۔''(2)

1773ء میں فرانسیسی انقلابیوں (جیکوبنز) نے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔جیسا کہ مارکس اور اینگلز نے نشان دہی کی تھی انہوں نے بورژوا رشتوں کی حدود پھلانگ کر چند ماہ کے اندر اندر وہ کچھ کردیا جسے سرانجام دینے میں بورژوازی کو کئی دہائیاں لگ جاتیں یعنی فرانس میں جاگیرداری کے تمام نشانات کا مکمل خاتمہ۔ تاہم یہ نظام بورژوا ملکیتی رشتوں کی بنیاد پر ہی قائم رہا۔اس کے بعد فرانسیسی رجعت پسندی (تھرمیڈور) اور پنج رکنی نظامت (ڈائریکٹری) کا دور آیا اور اس کے بعد نپولین بونا پارٹ کی کلاسیکی آمریت قائم ہوئی۔نپولین نے بہت سی جاگیردارانہ ہیئتوں کو از سر نو متعارف کروایا، خود شہنشاہ بن گیا اور ساری قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔لیکن اس سب کے باوجود ہم اسے ایک بورژوا نظام قرار دیتے ہیں۔لوئی ہشت دہم کی بحالی کے باوجود نظام سرمایہ دارانہ رہا اور اس کے بعد ایک نہیں بلکہ دو انقلابات آئے، 1830ء اور 1848ء میں۔ان انقلابات نے اہم سماجی اثرات مرتب کئے۔ان کے نتیجے میں بذات خود ریاست کی نمایاں شخصیات بھی تبدیل ہوئیں۔اس کے باوجود ہم ان دونوں کو بورژوا سیاسی انقلابات قرار دیتے ہیں کیونکہ ان سے صاحب اقتدار طبقہ تبدیل نہیں ہوا یعنی بورژوازی۔

آیئے مزید آگے چلتے ہیں۔1871ء کے پیرس کمیون اور اس کی وجہ سے سماجی رشتوں میں ہونیوالی اتھل پتھل کے بعد بورژوا جمہوریت کے ساتھ تیسری جمہوریہ کو منظّم کیا گیا جو کئی دہائیوں تک قائم رہی۔اس کے بعد پٹین اور پھر ڈیگال حکومت آئی اور اس کے بعد اب تک بہت سی حکومتیں تبدیل ہوئی ہیں۔ایک لمحے کیلئے ان نظام ہائے حکومت کے حیران کن تنوع پر نظر دوڑایئے۔ایک غیر مارکسی کے

نزدیک یہ بڑی لغو بات ہوگی اگر مثال کے طور پر روبز پیری اور ڈیگال یا شیراک کی حکومتوں کو ایک ہی زمرے میں شمار کیا جائے۔ تاہم مارکسسٹ بنیادی طور پر انہیں ایک جیسی ہی خیال کرتے ہیں یعنی سرمایہ دار حکومتیں۔ تو پھر کسوٹی کیا ہے؟ صرف ایک چیز ملکیت کی شکل، ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت۔ اسی طرح زیادہ جدید وقتوں میں ہمیں ایک جیسی معاشی بنیادوں پر قائم بالائی ڈھانچوں کا بڑا تنوع نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر نازی جرمنی کے نظام کا مقابلہ برطانوی پارلیمانی جمہوریت سے کریں۔ سیاسی بالا ڈھانچے کے حوالے سے وہ اس قدر مختلف ہیں کہ بعض غیر مارکسی یا سابق مارکسی مکاتب فکر کو فاشزم میں ایک نیا طبقاتی ڈھانچہ اور ایک بالکل نیا سماجی نظام دکھائی دیتا ہے۔ ہم کیوں کہتے ہیں کہ وہ ایک ہی طبقے اور ایک ہی نظام کی نمائندگی کرتے ہیں؟ جواب یہ ہے کہ بالا ڈھانچوں میں فرق کے باوجود ان سماجوں کی معاشی بنیاد ایک جیسی ہے۔

اکتوبر انقلاب کے بعد کی عبوری ریاست

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں سرمایہ داری سے براہ راست سوشلزم تک پہنچنا ناممکن ہے۔ ایک ترقی یافتہ سماج میں بھی ایک عبوری عرصہ ضروری ہوگا جس میں کچھ وقت تک ریاست کے ساتھ ساتھ زر تبادلہ (پیسہ) اور قدر کا قانون بھی موجود رہے گا۔ لیکن جیسا کہ مارکس وضاحت کرتا ہے مزدور طبقے کو سرمایہ داری جیسی عفریت نما ریاست درکار نہیں ہوگی جو پہلے دن سے ہی رفتہ رفتہ مٹنا شروع کر دے گی۔ اقتدار پر قبضے سے دو ماہ پہلے لینن نے ''ریاست اور انقلاب'' میں لکھا تھا:

''پرولتاریہ کو ریاست کی ضرورت ہوتی۔ یہ بات تمام موقع پرست آپ کو بتا سکتے ہیں لیکن یہ موقع پرست اس میں یہ بات شامل کرنا بھول جاتے ہیں کہ پرولتاریہ کو محض ایک قریب المرگ ریاست درکار ہوتی ہے۔ ایک ریاست جس کی تشکیل اس طرح سے کی گئی ہو کہ وہ فوراً ختم ہونا شروع کر دے اور وہ اپنی موت سے بچنے کیلئے کچھ نہ کر سکے۔''

ایک عبوری ریاست ناگزیر طور پر متضاد کردار کی حامل ہوتی ہے۔ سوویت نظام حکومت کی بنیاد اکتوبر انقلاب کے بعد وجود میں آنے والے نئے ملکیتی رشتوں پر تھی لیکن اس میں بہت سے ایسے عناصر بھی تھے جو پرانے بورژوا سماج سے مستعار لئے گئے تھے۔ ذرائع پیداوار کا قومی تحویل میں لیا جانا سوشلزم

کی طرف روانگی کی اولین شرط ہے لیکن سماج کو انسانی ترقی کے ایک اعلیٰ تر مرحلے تک لے جانے کے امکان کا انحصار پیداواری قوتوں کی سطح پر ہوتا ہے۔ سوشلزم کیلئے انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دار سماج کی نسبت بھی کہیں اعلیٰ درجے کی ٹیکنیک، مزدوروں کی پیداواری صلاحیت اور ثقافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس ماندہ بنیادوں پر سوشلزم کی تعمیر ناممکن ہے۔

''انقلاب سے غداری'' میں ٹراٹسکی عبوری ریاست کے دوہرے کردار کی وضاحت کرتا ہے:

''بورژوا طریقہ تقسیم کو مادی قوت کے فروغ کو تیز تر کر کے یقیناً سوشلسٹ مقاصد کی خدمت کرنا چاہیے لیکن صرف آخری تجزیے میں۔ ریاست شروع ہی سے براہ راست ایک دوہرا کردار اپنا لیتی ہے، جہاں تک ذرائع پیداوار کی سماجی ملکیت کے دفاع کا تعلق ہے اس کا کردار سوشلسٹ ہوتا ہے اور جہاں تک ضروریات زندگی کی تقسیم کیلئے قدر کے سرمایہ دارانہ پیمانے اور اس کے نتائج و عواقب کا تعلق ہے اس کا کردار بورژوا ہوتا ہے۔ کردار کی ایسی متضاد نوعیت شاید کٹر عقیدہ پرستوں اور کتابی عالموں کو بدحواس کر دے مگر ہم اس سلسلے میں ان سے محض تعزیت کا اظہار ہی کر سکتے ہیں۔''(3)

صرف مغربی یورپ بالخصوص جرمنی میں انقلاب کی فتح ہی اس صورت حال کو تبدیل کر سکتی تھی۔ ایک سوشلسٹ فیڈریشن کے اندر جرمنی کی صنعت اور ٹیکنیک کو روس کے قدرتی اور انسانی وسائل کے ساتھ یکجا کر کے ایسے مادی حالات کی تخلیق ممکن تھی جن سے اوقات کار کو کم کر کے ریاست اور صنعت چلانے میں مزدور طبقے کی عملی شرکت کی شرط اولین کو پورا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سوشل ڈیموکریسی کی غداری سے جرمن انقلاب ناکام ہو گیا اور روسی انقلاب ایک پسماندہ ملک کے اندر محدود ہو کر رہ گیا۔ بیوروکریسی کی فتح اس کا براہ راست نتیجہ تھی۔ 1920ء کے بعد سے بیوروکریسی نے مزدور طبقے کی پیدا کردہ قدر زائد کا ایک حصہ قانونی یا غیر قانونی طور پر ہڑپ کرنا شروع کر دیا۔

ایک صحت مند مزدور ریاست میں بھی کسی نہ کسی حد تک یہی صورت حال ہوتی۔ منیجر اور اہلکار قدر زائد کا ایک حصہ ضرور حاصل کرتے ہیں لیکن مارکس کے مطابق یہ ''نگرانی کرنے کی اجرت'' ہوتی۔ لینن کے مطابق یہ ''بورژوازی کے بغیر بورژوا ریاست'' ہوتی یا جیسا کہ ٹراٹسکی کہتا تھا یہ ریاست سرداروں کے بغیر ہوتی یعنی ایک ایسا جنرل سٹاف جس کے اندر کوئی سمورائی نہ ہوتا۔ ایسی ریاست میں اہلکاروں کو کسی قسم کی خصوصی مراعات حاصل نہ ہوتیں۔ لیکن روس میں پیداواری قوتوں اور کلچر کی انتہائی کمتر سطح کے باعث مزدور طبقہ پرانے زارشاہی دور کے اہلکاروں اور فوجی افسروں کے بغیر ریاست کا کاروبار چلانے کا اہل

نہیں تھا جنہوں نے شروع سے ہی اوسط اجرت سے زیادہ اجرت کا تقاضا کیا اور اسے حاصل بھی کر لیا۔ انقلاب کے ایک پسماندہ ملک تک محدود ہو جانے کے باعث یہ ناگزیر تھا۔ یہی بنیادی وجہ ہے جس کے باعث پرولتاریہ اقتدار پر اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکا۔ خانہ جنگی کے بعد ابھرتے ہوئے اہلکاروں نے بتدریج مزدوروں کو راستے سے ہٹا دیا کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ سماج ان کے بغیر نہیں چل سکتا۔

لینن اور ٹراٹسکی کے خیال میں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں مزدوروں کی فتح کے بغیر روسی انقلاب زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے حالات میں سرمایہ دار عناصر اکتوبر انقلاب کی حاصلات کا قلع قمع کر دیں گے۔ ایسا نہیں ہوا حالانکہ 1920ء کی دہائی بالخصوص نئی معاشی پالیسی کے دور میں یہ ممکن ہوسکتا تھا جب بالشویک امیر کسانوں اور نوزائیدہ بورژوازی کے حق میں زبردست رعایتیں دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ لینن نے اپنی آخری بیماری سے کچھ ہی عرصہ قبل ٹراٹسکی کے ساتھ مل کر ایک بلاک بنایا تاکہ بیوروکریسی کیخلاف لڑا جا سکے جس کے بارے میں اسے خوف لاحق تھا کہ وہ ایک کھلے بورژوا ردانقلاب کی فتح کیلئے سازگار حالات پیدا کر رہی تھی۔

جنوری 1921ء میں لینن نے لکھا ''میں نے کہا تھا کہ ہماری ریاست دراصل مزدوروں کی ریاست نہیں بلکہ یہ مزدوروں اور کسانوں کی ریاست ہے، اس بحث کی رپورٹ پڑھنے کے بعد اب میں سمجھتا ہوں کہ میں غلط تھا۔ مجھے کہنا یہ چاہیے تھا کہ مزدوروں کی ریاست ایک تجرید ہے۔ درحقیقت ہمارے پاس ایک مزدور ریاست ہے جس میں مندرجہ ذیل عجیب وغریب خصوصیات ہیں۔ (1) اس میں آبادی کی غالب اکثریت مزدور نہیں بلکہ کسان ہے۔ اور (2) یہ ایک مزدور ریاست ہے جسے بیوروکریسی نے مسخ کر رکھا ہے۔'' (4)

روس کی طبقاتی نوعیت کا سوال آخری وقت تک ٹراٹسکی کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ ایک پرولتاریہ انقلاب کی بنیاد پر اس قسم کی رجعت کا ارتقا کس طرح ہوسکتا تھا؟ سوویت یونین سے نکالے جانے کے کچھ ہی عرصہ پہلے ٹراٹسکی نے اس سوال پر طبع آزمائی کی:

''ہمیں یہ بات صاف اور دوٹوک الفاظ میں کہنی چاہیے، لینن کی موت کے بعد کے پانچ سال سماجی اور سیاسی رجعت کے سال تھے۔ لینن کے بعد آنے والی پارٹی لیڈرشپ غیر دانستہ طور پر لیکن نہایت موثر انداز میں اس رجعت کا وسیلہ اور اظہار بن گئی۔

''ردانقلاب کے برعکس رجعت کے ادوار میں برسراقتدار طبقہ تبدیل نہیں ہوتا۔ جاگیردارانہ مطلق

العنانی کے دوران لبرل اصلاحات کے دور بھی آئے، عظیم انقلابات سے شروع ہونیوالے بورژوازی کے عہد میں پیش رفت کے طوفانی دور بھی آئے اور ارتقائے معکوس کے دور بھی۔ دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ یہ چیز بھی غالب سرمایہ دار طبقے کے عہد میں مختلف پارٹیوں کے برسر اقتدار آنے کا باعث بنتی ہے۔''

''نہ صرف تھیوری بلکہ پچھلے گیارہ سال کا تجربہ بھی ثابت کرتا ہے کہ پرولتاریہ کی حکمرانی کے دوران سماجی اور سیاسی رجعت کا دور بھی آسکتا ہے اور طوفانی پیش رفت کا دور بھی۔ فطری طور پر یہ عمومی رجعت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے فاتح پرولتاری انقلاب کی بنیاد پر رجعت کا معاملہ ہے جو سرمایہ دار دنیا کے مقابلے پر کھڑا ہے۔ ان ادوار کے اتار چڑھاؤ کا تعین طبقاتی جدوجہد کے راستے سے ہوتا ہے۔ رجعت کے ادوار طبقاتی حکمرانی کی بنیاد کو تبدیل نہیں کرتے یعنی ان میں اقتدار ایک سے دوسرے طبقے کے ہاتھوں میں منتقل نہیں ہوتا (اس کا مطلب رد انقلاب ہوگا)۔ لیکن یہ طبقاتی قوتوں کے رشتے میں تبدیلی اور اسی طبقے میں نئی صف بندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں زبردست انقلابی پیش رفت کے بعد آنے والے رجعتی دور کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ پہلے والا شکست خوردہ اور خوفزدہ صاحب جائیداد طبقہ معروضی حالات اور انقلابی لیڈر شپ کی غلطیوں کے باعث اپنی قوتوں کو مجتمع کر کے بتدریج جارحانہ پوزیشن اختیار کرنے لگا اور اس کیلئے اس نے زیادہ تر ریاستی مشینری کو استعمال کیا۔''

''دوسری طرف فاتح طبقہ یعنی پرولتاریہ بیرونی امداد کے بغیر نت نئی رکاوٹوں اور دشواریوں کا سامنا کرنے کی وجہ سے اپنی وہ قوت اور جوش و جذبہ کھو بیٹھا جو انقلاب کے بعد کے ابتدائی ایام میں اس کا طرہ امتیاز تھے، تفریق پیدا ہوئی جس میں بیوروکریسی کو بالادستی حاصل ہوگئی اور وہ زیادہ سے زیادہ اپنے مفادات کیلئے کام کرنے لگی جب کہ بالکل نیچے رہ جانے والے عناصر تھک گئے یا مکمل مایوسی کا شکار ہو گئے۔ پرولتاریہ کی سرگرمی میں کمی کے پہلو بہ پہلو بورژوا طبقات اور سب سے بڑھ کر پیٹی بورژوازی کی وہ پرتیں زیادہ سرگرم ہونے لگیں جو استحصال کے پرانے ہتھکنڈوں کے ذریعے آگے بڑھنا چاہتی تھیں۔

یہ ثابت کرنا غیر ضروری ہے کہ اندرونی رجعت کے یہ تمام عوامل صرف عالمی پرولتاریہ کی بے رحم شکستوں اور سامراجی بورژوازی کی روز بروز بڑھتی ہوئی قوت کی وجہ سے ہی فروغ پا کر طاقت ور ہو سکتے تھے۔''(5)

رجعت اور بوناپارٹ ازم

انقلابات میں رونما ہونیوالے عوامل میں بہت سی مماثلتیں پائی جاتی ہیں چاہے ان انقلابات کی طبقاتی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ 94-1789ء کے عظیم فرانسیسی انقلاب اور روسی انقلاب میں موازنے کے ذریعے مخصوص حدود تک چند بنیادی عوامل پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس کا اطلاق تھرمیڈور جیسی اصلاحات پر ہوتا ہے جس سے مراد 27 جولائی 1794ء کو ہونے والا واقعہ ہے (پرانے انقلابی کیلنڈر کے حساب سے تھرمیڈور کی نو تاریخ) جب انقلابی جیکوبنز کے دائیں بازو نے موقع پرست سنٹر سوونپ سے مل کر روبز پیری کا تختہ الٹ کر اس سیاسی رجعت کی شروعات کی جس کا نتیجہ نپولین بوناپارٹ کی آمریت کی صورت میں برآمد ہوا۔ یہ انقلابی ابھار کے خاتمے اور زوال کے آغاز کو ظاہر کرتا تھا۔ اس کی عکاسی اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ ابھار کے دور (94-1789ء) میں دہشت کا نشانہ بننے والے تقریباً تمام لوگ وہ تھے جو یا تو انقلاب دشمن تھے یا رجعتی قوتوں سے مصالحت کرنا چاہتے تھے جب کہ تھرمیڈور کے بعد دہشت کا رخ انقلابی بائیں بازو کی طرف کر دیا گیا۔

اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ تھرمیڈور یا رجعت انقلاب میں اس مقام کی نشاندہی کرتی ہے جب ایک خاص قسم کی تھکن اور بیزاری ایک پسپائی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس سے کھلی رجعت کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔ فرانس میں یہ مقام اس طور آیا جب ماؤنٹین (نیشنل کنونشن کا انقلابی حصہ) کا ایک جزو ماؤنٹین سے اور عمومی طور پر انقلاب کی طوفان خیزی اور دباؤ سے تھکن کا شکار ہو گیا۔ ''ماؤنٹین'' میں پھوٹ کا نتیجہ رجعتی تھرمیڈور کی صورت میں برآمد ہوا۔ اسی طرح روس میں سٹالنسٹ رجعت کی شروعات کا سراغ خانہ جنگی کے بعد سوویت اہلکاروں اور پیٹی بورژوازی میں پھیلنے والے اس مبہم موڈ میں ڈھونڈا جا سکتا ہے کہ اب انقلابی جدتوں کو ختم کر کے از سر نو نظم و ضبط بحال کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ رجعت کے اس موڈ کا حاصل جمع ایک ملک میں سوشلزم کا نظریہ تھا۔ بے شک ہر تاریخی مماثلت کی طرح تھرمیڈور کی اصطلاح کا استعمال محض ایک تشبیہہ تھی اور اسی لئے اس کا کردار مشروط تھا۔ ٹراٹسکی نے 1929ء میں لکھے جانیوالے مضامین میں اپنی پوزیشن کی وضاحت یوں کی تھی:

''میں یہاں بنیادی طور پر تھرمیڈور کے سوال کا حوالہ دے رہا ہوں اور اسی وجہ سے سوویت ریاست کی طبقاتی نوعیت کے سوال کا بھی۔ تھرمیڈور کا فارمولا بلا شبہ ہر تاریخی مماثلت کی طرح ایک

مشروط فارمولا ہے۔۔۔تھرمیڈور ردانقلاب کے پہلے فاتحانہ مرحلے کی نشاندہی کرتی ہے یعنی اقتدار کی ایک طبقے سے دوسرے طبقے کے ہاتھوں میں منتقلی اگرچہ اس ضمن میں خانہ جنگی تو ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت اس منتقلی پر سیاسی نقاب ڈالے رکھتی ہے کہ جدوجہد ایک ہی پارٹی کے مختلف دھڑوں کے درمیان ہوتی ہے۔اس کا مطلب ایک طبقے سے دوسرے تک اقتدار کی براہ راست منتقلی ہوتا ہے جس کے بعد انقلابی طبقہ مسلح بغاوت کے بغیر اقتدار پر قبضہ نہیں کرسکتا۔اس کیلئے موخرالذکر کو ایک نئی انقلابی صورت حال کی ضرورت ہوتی ہے جس کے پیدا ہونے کا انحصار بہت سی داخلی اور بین الاقوامی پیچیدہ وجوہات پر ہوتا ہے۔''(6)

چند سال بعد ٹراٹسکی نے ''مزدور ریاست، رجعت اور بوناپارٹ ازم کا سوال'' نامی مضمون میں رجعت (تھرمیڈور) کے سوال کا دوبارہ جائزہ لیا۔اس نے وضاحت کی کہ تھرمیڈور کی تشبیہہ کی غلط تشریحات کی گئی ہیں۔ ولادیمیر سمرنوف کے الٹرالیفٹ گروپ اور جمہوری مرکزیت پسند گروپ نے لیفٹ اپوزیشن کی مخالفت میں 1926ء میں کہا تھا کہ پرولتاریہ اپنا اقتدار کھو چکا ہے اور روس میں سرمایہ داری بحال ہو چکی ہے۔

ٹراٹسکی کے خیال میں یہ بالکل غلط بات تھی اور انقلاب کو زندہ دفن کرنے کے مترادف تھی۔تاریخی مماثلات کی مدد کے بغیر ہم تاریخ سے کچھ نہیں سیکھ سکتے۔لیکن ہمیں ان کی حدود، مشابہت اور فرق کو بھی سمجھنا چاہیے۔تھرمیڈور کے حوالے سے بھی یہ بات درست تھی۔

ٹراٹسکی نے لکھا ''1794ء میں تھرمیڈور نے کنونشن کے بعض گروہوں سے اقتدار لے کر دوسرے گروہوں کو منتقل کردیا یعنی فاتح عوام کے ایک حصے سے لیکر دوسرے حصے کو۔کیا تھرمیڈور کی نوعیت ردانقلابی تھی، اس سوال کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم کسی دی گئی صورت میں ردانقلاب کے تصور کو کتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ 1789ء سے 1793ء تک کے سماجی انقلاب کا کردار بورژوا تھا۔ اس نے حقیقت میں خود کو طے شدہ جاگیردارانہ ملکیت کی جگہ آزاد بورژوا ملکیت کو دینے تک محدود کرلیا۔ اس انقلاب کے مقابلے میں ردانقلاب کی کامیابی کیلئے ضروری تھا کہ جاگیردارانہ ملکیت کو دوبارہ بحال کر دیا جاتا۔لیکن تھرمیڈور نے اس جانب پیش رفت کی کوئی کوشش بھی نہیں کی۔روبس پیئر نے دستکاروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی اور پنج رکنی نظامت نے درمیانی بورژوازی کی۔ بوناپارٹ نے بینکوں کے ساتھ اتحاد کرلیا۔تاہم یہ تمام نئی تبدیلیاں جو سیاسی اہمیت کے ساتھ ساتھ سماجی اہمیت کی حامل بھی

تھیں، نئے بورژوا سماج اور ریاست کی بنیاد پر واقع ہوئیں۔

نپولین بوناپارٹ کی اٹھارویں برومئیر بھی اتنی ہی اہم تھی (9 نومبر 1799ء کی بجائے نئی تاریخ جس دن نپولین بوناپارٹ نے اقتدار پر قبضہ کر کے فوجی آمریت قائم کی) جتنا کہ رجعت کا اگلہ مرحلہ تھا۔ دونوں صورت میں سوال یہ نہیں تھا کہ ملکیت کی پرانی شکلیں بحال کی جائیں یا سابقہ حکمران جاگیروں کا اقتدار بحال کیا جائے بلکہ سوال نئے سماجی نظام کی حاصلات کو فاتح ''تیسری ریاست'' کے مختلف دھڑوں کے درمیان تقسیم کرنے کا تھا۔ بورژوازی نے زیادہ سے زیادہ ملکیت اور طاقت حاصل کرنے کی کوشش کی (براہ راست اور فوری طور پر یا نپولین بوناپارٹ جیسے خصوصی ایجنٹوں کے ذریعے) لیکن انقلاب کی سماجی فتوحات کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا بلکہ اس کے برعکس انہیں مضبوط، منظم اور مستحکم بنانے کی کوشش کی۔ نپولین نے بورژوا ملکیت کو تحفظ فراہم کیا بشمول کسانوں کی ملکیت کے جنہوں نے اس نچلے طبقے اور بے دخل کئے گئے مالکان کے دعوؤں کے خلاف تحفظ دیا۔ جاگیردار یورپ نپولین کو انقلاب کی تجسیم سمجھ کر اس سے نفرت کرتا تھا اور اس کے معیاروں کے مطابق یہ بات درست بھی تھی۔'' (7)

یہاں ہمارا واسطہ سیاسی ردانقلاب کے ایک سلسلے سے ہے جن کی بنیاد وہی بورژوا ملکیتی رشتے تھے۔ موازنے کیلئے اسی مماثلت کو استعمال کرتے ہوئے ٹراٹسکی سٹالنزم کے کردار سے پردہ اٹھاتا ہے، استحصال کے ایک نئے طبقاتی نظام کے طور پر نہیں بلکہ مزدور ریاست سے چمٹے ہوئے سماجی طفیلئے کے طور پر۔ قومیائی ہوئی ملکیتی اشکال کی بنیاد پر ایک سیاسی ردانقلاب برپا کیا گیا تھا۔ اقتدار مزدور طبقے کے ہاتھ سے نکل گیا مگر ردانقلاب نے بورژوازی کو بحال نہیں کیا۔ سٹالنسٹ بیوروکریسی نے سیاسی اقتدار کو ہتھیا لیا تھا۔ اس کی وجہ مزدوروں کی ریاست کے انتہائی پس ماندہ حالات میں تنہا رہ جانے کے باعث ابھرنے والے سماجی تضادات تھے۔

بیوروکریسی کے سیاسی ردانقلاب نے مزدوروں کی سوویت جمہوریت کا مکمل صفایا کر دیا مگر اس نے اکتوبر انقلاب کے قائم کردہ نئے ملکیتی رشتوں کو تباہ نہیں کیا۔ مزدوروں سے بالاتر ہو کر بیوروکریسی نے ان داخلی تضادات کو اپنے مفاد میں طے کرنے کی کوشش کی۔ اس نے قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو بنیاد بنا کر پیداواری قوتوں کے فروغ میں ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کیا اگرچہ ٹراٹسکی کے مطابق اس کی قیمت سرمایہ داری کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ادا کرنا پڑی کیونکہ ضیاع، بدانتظامی اور بدعنوانی انتہا درجے کی تھی۔ ان سماجی تضادات کو حل کرنے کی بجائے بیوروکریسی نے ان میں نئے تضادات کا

اضافہ کر دیا۔آخر کار اس نے خود کو پرولتاریہ سے بالا کر کے نوکر شاہانہ مطلق العنانی کا نظام قائم کر دیا جس میں مزدور طبقے کو سیاسی طور پر بے دخل کر دیا گیا جسے نہ تو کوئی حقوق حاصل تھے اور نہ ہی سماج کو چلانے میں اس کی مرضی کو دخل تھا۔

بوناپارٹ ازم کیا ہے؟

واقعات کی بنیاد پر ٹراٹسکی اس قابل ہو گیا کہ سوویت یونین کی طبقاتی نوعیت کے بارے میں اپنے تجزیے کو زیادہ گہرا اور وسیع کر کے اپنے نقطہ نظر کو زیادہ درست کر سکے۔ وہ 1935ء تک بیوروکریسی کیلئے ''سنٹرازم'' کی اصطلاح کو ترک کر کے اس کی نوعیت کو واضح کرنے کیلئے ایک زیادہ مناسب تعریف اپنا چکا تھا یعنی پرولتاری بوناپارٹ ازم کی ایک قسم۔ ٹراٹسکی کے استدلال کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ مارکسی نظریہ ریاست کو از سر نو بیان کیا جائے۔

مارکسسٹوں کے مطابق ریاست کا ظہور ایک ایسے ضروری آلے کے طور پر ہوتا ہے جس کا مقصد ایک طبقے کا دوسرے طبقے پر جبر ہوتا ہے۔ ریاست کی تعریف کئی طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ ریاست کا حوالہ دینے کیلئے مارکسسٹ جو سب سے عام طریقہ استعمال کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ ''نجی ملکیت کے دفاع کیلئے قائم کئے گئے مسلح افراد کے جتھے'' آخری تجزیے میں ریاست کی تمام شکلیں یہی کچھ ہوتی ہیں۔ لیکن عمل میں ریاست فوج اور پولیس سے بڑھ کر اور بھی بہت کچھ ہوتی ہے۔ سرمایہ داری کے تحت بھی جدید ریاست اہلکاروں کی فوج ظفر موج پر مشتمل ایک نوکر شاہانہ عفریت ہوتی ہے جو مزدور طبقے کی پیدا کردہ قدر زائد کا ایک بہت بڑا حصہ ہڑپ کر جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے مانیٹرازم پر یقین رکھنے والوں کے استدلال میں کچھ سچائی بھی ہے جو ریاست کا حجم کم کرنے کا تقاضا کرتے ہیں جو انیسویں صدی کے لبرل عناصر کے ''سستی حکومت'' کے مطالبے کی ہی صدائے بازگشت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جیسا کہ مارکس نے ''فرانس میں خانہ جنگی'' میں وضاحت کی ہے، سستی حکومت کے حصول کا واحد ذریعہ انقلابی طریقے سے بورژوا ریاست کا خاتمہ اور اس کی جگہ پیرس کمیون جیسی مزدور ریاست یا نیم ریاست کا قیام ہے۔

مارکس، اینگلز اور لینن نے وضاحت کی تھی کہ ریاست ایک مخصوص طاقت ہے جو سماج سے بالاتر

ہوتی ہے اور بتدریج اس سے دور ہوتی جاتی ہے۔ایک عمومی قضیے کے طور پر ہم اس بات کو قبول کر سکتے ہیں کہ ہر ریاست ایک مخصوص حکمران طبقے کے مفادات کی عکاسی کرتی ہے۔لیکن اس مشاہدے سے سماج میں ریاست کے مخصوص کردار کا مکمل احاطہ نہیں ہوتا۔حقیقت میں ریاستی نوکرشاہی کے اپنے مفادات ہوتے ہیں جو ضروری نہیں ہے کہ حکمران طبقے کے مفادات سے ہمیشہ ہی ہم آہنگ ہوں بلکہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا براہ راست تصادم ہوجائے۔ مارکس اور لینن کے بقول آخری تجزیئے میں ریاست مسلح افراد کے جتھوں وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ ریاست کی مارکسی تعریف کا نچوڑ ہے۔ یہ عمومی مارکسی اصول اگرچہ بلاشبہ درست ہیں تاہم انہیں مطلق طور پر استعمال کرنے میں بہت زیادہ احتیاط کرنی چاہیے۔سچائی ہمیشہ ٹھوس ہوتی ہے لیکن اگر مخصوص پیچیدگیوں اور ٹھوس حالات کا تجزیہ کیا جائے تو تجریدوں اور غلطیوں کا شکار ہونا ناگزیر ہوجاتا ہے۔ ذرا ملاحظہ کریں کہ اینگلز عمومی اصول وضع کرتے وقت بھی اس سوال کے سلسلے میں کس قدر احتیاط سے کام لیتا ہے۔''خاندان، ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' میں اینگلز لکھتا ہے:

''لیکن اس وجہ سے کہ یہ تضادات، یہ متصادم معاشی مفادات کے حامل طبقات، سماج اور خود کو ایک لاحاصل جدوجہد میں ختم نہ کرلیں تصادم کو معتدل بنانے اور نظم وضبط کی حدود میں رکھنے کیلئے ایک ایسی قوت کا وجود ضروری ہوجاتا ہے جو بظاہر سماج سے بالاتر ہوتی ہے، اور یہ طاقت جو سماج سے ابھری ہے لیکن خود کو اس سے بالاتر رکھتی ہے اور بتدریج اس سے بیگانہ ہوتی جاتی ہے، ریاست ہے۔''(8) بعد ازاں وہ لکھتا ہے''یہ جاننے کیلئے آج کے یورپ پر ایک نظر ڈالنا ہی کافی ہے جہاں طبقاتی جدوجہد اور فتوحات کی رقابت عوامی اقتدار کو اس سطح تک لے آئی ہے جہاں خطرہ ہے کہ یہ تمام سماج اور یہاں تک کہ بذات خود ریاست کو بھی ہڑپ نہ کرجائے۔''

آگے چل کر اینگلز ثابت کرتا ہے کہ ایک بار ظہور میں آجانے کے بعد ریاست بعض مخصوص حدود کے اندر اپنی ایک آزاد تحریک پیدا کرلیتی ہے اور موجود حالات کے اندر اس کیلئے ایسا کرنا ضروری بھی ہوتا ہے،''عوامی اقتدار کا مالک ہونے اور ٹیکس لگانے کے حق کی وجہ سے اب یہ اہل کار خود کو سماج کے ایسے لوگوں کے طور پر پیش کرتے ہیں جو سماج سے بالاتر ہیں۔

ریاست طبقاتی تضادات کو قابو میں رکھنے کی ضرورت کے تحت وجود میں آئی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ اس کا ظہور طبقات کے درمیان شدید لڑائی کے وقت ہوا اس لئے عام طور پر یہ سب سے زیادہ طاقتور اور معاشی طور پر حکمران طبقے کی ریاست ہوتی ہے جو اپنے ذرائع کی وجہ سے سیاسی طور پر بھی حکمران طبقہ ہوتا

ہے اور اس طرح سے استحصال زدہ اور جبر کا شکار لوگوں کو دبانے کیلئے مزید نئے ذرائع حاصل کر لیتا ہے۔ تاہم ایسے استثنائی ادوار بھی آتے ہیں جب برسر پیکار طبقات طاقت میں اس قدر برابر ہوتے ہیں کہ بظاہر ثالث کا کردار ادا کرنے والی ریاست کچھ وقت کیلئے دونوں کے حوالے سے ایک مخصوص خودمختاری حاصل کر لیتی ہے۔'' (9)

اینگلز پھر کہتا ہے ''مہذب سماج میں ریاست درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتی ہے جو تمام عمومی ادوار میں بلا استثنا حکمران طبقے کی ریاست ہوتی ہے اور تمام صورتوں میں لازمی طور پر استحصال زدہ اور جبر کا شکار لوگوں کو دبانے کا آلہ ہوتی ہے۔' (10)

غور کیجئے اینگلز کس طرح انتہائی محتاط اور سائنسی انداز میں اپنا اظہار کرتا ہے۔ ''تمام عمومی ادوار میں'' عام طور پر یہ سب طاقت ور اور معاشی طور پر حکمران طبقے کی ریاست ہوتی ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ اینگلز خوب اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ایسے غیر عمومی اور غیر معمولی حالات بھی ہو سکتے ہیں جن پر مارکسسٹ نظریے کے اس عام اصول کا اطلاق نہ ہو سکے۔ ریاست کے سوال کے سلسلے میں اس جدلیاتی طرز فکر کو مارکس نے لوئی بوناپارٹ کی اٹھارویں برومئیر میں ترویج دی تھی جہاں اس نے بوناپارٹ ازم کے مظہر کی وضاحت کی تھی جس میں ریاست اور حکمران طبقہ معمول سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مارکس اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ کس طرح فوجی طاقت کے نشے میں مدہوش لوئی بوناپارٹ نے ''قانون، نظم وضبط اور خاندان'' کے نام پر اسی بورژوازی کو گولی کا نشانہ بنایا جس کا بظاہر وہ نمائندہ تھا۔ کیا لوئی بوناپارٹ کے تحت بورژوازی حکمران طبقہ تھا؟ اس سوال کا جواب دینے کیلئے مارکسزم کے علم کی قطعاً حاجت نہیں۔ محض ''مسلح افراد کے جتھے'' کا عمومی اصول بورژوازی یا پرولتاری بوناپارٹ ازم کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اگر ہم جدید سماج کی تاریخ کو لیں تو ہمیں کئی ایسی مثالیں ملیں گی جب بورژوازی کو سیاسی طور پر بے دخل کر دیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ حکمران طبقہ رہی۔ یہی ہے جسے ہم بوناپارٹ ازم کہتے ہیں یا مارکس کی زبان میں یہ ''سماج پر ننگی تلوار کی حکمرانی'' ہے۔ آیئے چند مثالیں دیکھتے ہیں۔

چین کے اندر 1927ء میں جب چیانگ کائی شیک نے شنگھائی کے غنڈہ گرد عناصر کی مدد سے وہاں کے مزدور طبقے کو کچل دیا تو وہاں کے بینکاروں نے اس کے اعزاز میں عشائیے دیئے اور اسے تہذیب کا محافظ و مسیحا قرار دے کر اس پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسائے۔ لیکن چیانگ اپنے آقاؤں سے تعریف سے زیادہ مادی نوعیت کی توقعات وابستہ کئے ہوئے تھا۔ اس نے بلا توقف شنگھائی

کے تمام بینکاروں اور امیر صنعت کاروں کو جیل میں ڈال دیا اور کروڑوں کا تاوان وصول کئے بغیر نہیں چھوڑا۔اس نے ان کا کام کر دیا تھا اور اب وہ معاوضے کا طلبگار تھا۔اس نے شنگھائی کے مزدوروں کو سرمایہ داروں کے فائدے کیلئے نہیں کچلا تھا بلکہ اس کی نظروں میں وہ قوت اور پیسہ تھا جو اسے اور اس کے ٹھگوں کے ٹولے کو اس سے حاصل ہونے کی توقع تھی۔تاہم کون کہہ سکتا ہے کہ جیلوں میں پڑے ہوئے بینکار اب بھی حکمران طبقہ نہیں تھے؟ حالانکہ ان کے پاس سیاسی اقتدار نہیں تھا۔چینی بورژوازی نے یقیناً نہایت افسردگی سے ایسے سماج کی پیچیدگی پر غور وفکر کیا ہوگا جہاں مزدوروں سے نچوڑی گئی قدر زائد کا ایک بڑا حصہ ان کے اپنے رکھوالے کتے کھا گئے تھے اور ان کے اپنے طبقے کے بہت سے لوگ جیلوں میں سڑ رہے تھے۔

ایسے حالات میں بورژوازی کو سیاسی طور پر بے دخل کر دیا جاتا ہے، سماج پر ننگی قوت کا غلبہ ہوتا ہے۔قدر زائد کا ایک بہت بڑا حصہ اوپر کا فوجی ٹولہ اور اہل کار ہڑپ کر جاتے ہیں۔لیکن یہ بات ان بیوروکریٹوں کے مفاد میں ہوتی ہے کہ مزدوروں کا سرمایہ دارانہ استحصال جاری رہے لہٰذا وہ بورژوازی کو جی بھر کر نچوڑتے ہیں مگر نجی ملکیت کا تحفظ کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بورژوازی حکمران طبقے کے طور پر برقرار رہتی ہے اگرچہ براہ راست سیاسی اقتدار ان سے چھن چکا ہوتا ہے۔یہ ان لوگوں کے لئے ہمارا جواب ہے جو ریاستی سرمایہ داری کی وکالت کرتے ہیں اور جنہیں یہ دعویٰ سوفسطائی دکھائی دیتا ہے کہ روس ایک مسخ شدہ مزدور ریاست تھی اور سوویت مزدور طبقہ ایسی صورت میں بھی حکمران طبقہ ہو سکتا تھا جب وہ سٹالن کی ایڑی تلے تھا اور ان کی بڑی تعداد جبری مشقت کے کیمپوں میں نظر بند تھی۔اگر ہم سماج کی بنیادی ملکیتی شکلوں سے راہنمائی نہ لیں تو ہمارا بھٹک جانا یقینی ہے۔

تاریخ سے ایسی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں کہ کس طرح حکمران طبقے کے ایک حصے نے دوسرے حصوں پر حملہ کیا اور ریاست سماج سے بالاتر ہوگئی۔مثال کے طور پر برطانیہ میں ''وار آف روزز'' میں حکمران نوابوں کے دو متحارب گروہوں نے قریب قریب ایک دوسرے کا خاتمہ ہی کر دیا تھا۔ہر وقت حکمران طبقے کے وسیع حصے یا تو جیلوں میں ہوتے تھے یا انہیں قتل کر دیا جاتا تھا اور تاج کسی نہ کسی ٹولے کے مہم جوؤں کے قبضے میں ہوتا تھا۔آخر کار ایک نئے شاہی خاندان ٹیوڈر کا ظہور ہوا جس نے مختلف طبقات کے درمیان توازن قائم کر کے ایک مطلق العنان نظام کی داغ بیل ڈالی۔دوسرے ممالک میں بھی اس سے مماثل عوامل وقوع پذیر ہوئے۔مطلق العنانیت کی طبقاتی نوعیت کیا تھی؟ خود کو ایک ایسی قوت کے طور

پر مستحکم بنانے کی کوشش جو سماج سے بالاتر ہو اور اس سے زیادہ سے زیادہ بیگانہ ہوتی جائے، ان مطلق العنان بادشاہوں نے اکثر اوقات نوزائیدہ بورژوازی کی مدد سے جاگیردار اشرافیہ کیخلاف ضربات لگائیں۔ تاہم اس نظام کی طبقاتی نوعیت جاگیردارانہ ہی رہی۔ اس کا تعین رائج ملکیتی رشتوں سے ہوتا ہے نہ کہ حکومت کی سیاسی ہیئت سے۔ غلام داری سماج کے عہد زوال میں بھی ایسی ہی صورتحال موجود تھی۔ رومن شہنشاہ سماج سے بالاتر ہو گئے اور حکمران طبقے کو نہایت سفاکی سے کچلا جو غلام مالکان پر مشتمل تھا اور انہیں پریٹورین گارڈز کے ''منتخب'' کردہ شہنشاہ ٹیکسوں کے ذریعے لوٹتے تھے، گرفتار کرتے تھے، اذیت دیتے اور قتل کرتے تھے۔ بنیادی طور پر مارکس نے اس مظہر کو بیان کرنے کیلئے ''قیصرازم'' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ لیکن ایک غلام ریاست کی حیثیت سے رومن ریاست کی طبقاتی نوعیت میں رتی بھر تبدیلی بھی نہیں آئی اور ''قیصرازم'' کے آہنی تلوے کے نیچے بھی غلام مالکان ہی حکمران طبقے کے طور پر برقرار رہے۔

مارکس، اینگلز اور لینن کی کلاسیکی تجزیئے کی پیروی کرتے ہوئے ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے:

''قیصرازم یا اس کی بورژوا شکل بوناپارٹ ازم تاریخ کے ان لمحات میں منظرعام پر آتی ہے جب دو دھڑوں کے درمیان ہونیوالی شدید جدوجہد ریاستی اقتدار کو قوم سے بالاتر کر دیتی ہے اور بظاہر اسے طبقات سے مکمل آزادی کی ضمانت فراہم کرتی ہے جب کہ حقیقت میں یہ صرف مراعات یافتگان کے دفاع کیلئے ضروری آزادی ہوتی ہے۔'' (11)

موجودہ صدی میں ہم سرمایہ داری کے زوال کے دور میں فاشزم کا مظہر دیکھ چکے ہیں جو اپنے آغاز کے حوالے سے بوناپارٹ ازم سے مختلف ہے لیکن ان دونوں میں بہت سی چیزیں مشترک بھی ہیں۔ بوناپارٹ ازم کے برعکس فاشسٹ نظام ناراض پیٹی بورژوا اور لمپن پرولتاریہ عناصر پر مشتمل ایک بڑی تحریک کے بل بوتے پر اقتدار میں آتا ہے۔ تاہم ایک بار اقتدار میں آجانے کے بعد یہ بہت تیزی سے عوامی حمایت کھو کر بوناپارٹسٹ نظام میں تبدیل ہو جاتا ہے یہ فوج اور پولیس کی حمایت پر تکیہ کرتا ہے۔ ٹراٹسکی نے نازی بیوروکریسی کو ''سمندر کے بوڑھے آدمی'' سے تشبیہہ دی تھی جو بورژوازی کے کندھوں پر سوار تھی اور اسے بحفاظت منزل تک پہنچاتے ہوئے اس پر گالیوں کی بوچھاڑ کرتی تھی، اس کے گنجے سر پر تھوکتی تھی اور اس کی پسلیوں میں اپنی ایڑیاں چبھوتی تھی۔

''مارکسزم کے دفاع میں'' ٹراٹسکی بوناپارٹ ازم اور فاشزم کے درمیان فرق واضح کرتا ہے:

''فاشزم اور پرانے بونا پارٹ ازم میں قدر مشترک یہ ہے کہ دونوں ریاستی اقتدار کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کیلئے طبقات کی دشمنی کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا ہے کہ بونا پارٹ ازم بورژوا سماج کے ابھار کے وقت جب کہ فاشزم بورژوا سماج کے زوال پذیری کے وقت کا ریاستی اقتدار ہے۔''(12)

صرف ہٹلر کے اپنے سرمایہ دار مخالفین کے ساتھ سلوک پر غور کریں۔ سرمایہ دارانہ ملکیت کے محافظ نازیوں نے نہ صرف بورژوازی کو لوٹا اوران کی جائیدادیں ضبط کیں بلکہ ان میں سے چند ایک کو گولی مارنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ اس میں قطعاً کسی شبہے کی گنجائش نہیں کہ نازی ریاست کی طبقاتی نوعیت بورژوا تھی۔ لیکن دوسری طرف جرمن بورژوازی ریاستی غلبہ کھو بیٹھی اور ریاست ہٹلر کے غیر ذمہ دار اور مجرم مہم جوؤں کے ہاتھوں میں چلی گئی جنہوں نے اسے اپنے مفاد میں استعمال کیا۔ یہاں ریاست اور حکمران طبقے کے درمیان تعلق جدلیاتی اور متضاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ 1943ء تک جرمنی کے حکمران طبقے اور ریاست میں تصادم بالکل کھل کر سامنے آچکا تھا۔ اس وقت تک جرمنی جنگ ہار چکا تھا۔ حکمران طبقے کے مفاد کا تقاضا تھا کہ برطانیہ اور امریکہ سے امن کا معاہدہ کرلیا جائے تا کہ سوویت یونین کیخلاف جنگ لڑی جا سکے لیکن ریاست پر قابض نازی ٹولے کیلئے ہتھیار ڈالنے کا مطلب سزائے موت ہوتا۔ جرمن بورژوازی نے فوجی بغاوت (جرنیلوں کی سازش) کے ذریعے ہٹلر کو ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی ہٹلر نے آخری دم تک جنگ لڑی اور جرمنی نے اس کی قیمت اس طرح ادا کی کہ اس کے مشرقی نصف حصہ پر سٹالنسٹ روس کا غلبہ ہو گیا۔

سٹالن ازم: بونا پارٹ ازم کی ایک شکل

ریاست کے کردار کے حوالے سے جس سب سے اہم سوال کا جواب دیا جانا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ کس طبقے کی نمائندگی کرتی ہے؟ ریاست لازماً کسی ایک طبقے کا آلہ ہوتی ہے۔ روس میں یہ کس طبقے کی نمائندگی کرتی تھی؟ یہ سرمایہ دار طبقے کی نمائندہ نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ انہیں 1917ء میں بے دخل کر دیا گیا تھا۔ یہ استدلال نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسانوں کے طبقے یا شہروں میں چھوٹے صاحب جائیداد طبقے کے مفادات کی نمائندگی کرتی تھی۔ یہ واضح طور پر سٹالنسٹ بیوروکریسی کے مفادات کی نمائندگی کرتی

تھی۔لیکن پرولتاری بوناپارٹ ازم کی ایک مخصوص شکل کے طور پر آخری تجزیئے میں قومیائے ہوئے ذرائع پیداوار،منصوبہ بندی اور بیرونی تجارت کی اجارہ داری کا دفاع کرنے کے حوالے سے یہ مزدور طبقے کی نمائندگی کرتی تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں فاشسٹ یا بوناپارٹسٹ نظام کے تحت چاہے ان بدمعاشوں نے بورژوازی کا گلہ ہی کیوں نہ دبا رکھا ہو پھر بھی ایک سرمایہ دار طبقہ موجود رہتا ہے جس کے مجموعی مفاد کی معیشت کام کرتی رہتی ہے اور جس پر یہ طفیلی مواد چپکا رہتا ہے۔بعض رسم پرستوں کا کہنا ہے کہ سوویت بیوروکریسی روس میں ایک نئے حکمران طبقے کا درجہ رکھتی تھی۔لیکن سنجیدہ جائزے سے پتہ چلے گا کہ ایسی بات نہیں تھی۔ان کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ریاست ایک طبقہ ہے۔بیوروکریسی ریاست کی ''مالک'' تھی،ریاست ذرائع پیداوار کی ''مالک'' تھی۔اس لئے بیوروکریسی ذرائع پیداوار کی ''مالک'' تھی لہٰذا وہ ایک حکمران طبقہ تھی۔لیکن یہ اصل مسئلے سے جان چھڑانے والی بات ہے۔درحقیقت وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ریاست ریاست کی مالک ہے۔اس طرح رسمی منطق کے طریقے سے مسئلہ حل کرنے کی کوشش کا انجام لا حاصل تکرار پر ہوتا ہے جس سے کچھ بھی حل نہیں ہوتا۔

تو کیا سوویت سماج میں بیوروکریسی حکمران طبقہ تھی؟اس استدلال میں قطعاً جان نہیں ہے۔سرمایہ دار سماج یا کسی بھی طبقاتی سماج میں چاہے اعلیٰ عہدیداران کتنے بھی مراعات یافتہ کیوں نہ ہوں وہ اس آلے کو حکمران طبقے کی حفاظت کیلئے استعمال کرتے ہیں جن کا ملکیت کے ذریعے ذرائع پیداوار سے براہ راست تعلق ہوتا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ نپولین کن کا نمائندہ تھا۔ہم جانتے ہیں کہ لوئی بوناپارٹی، بسمارک،چیانگ کائی شیک،ہٹلر،چرچل اور ڈیگال کن کے نمائندے تھے۔لیکن سٹالنسٹ بیوروکریٹ کس کی نمائندگی کرتے تھے؟خود اپنی؟یہ واضح طور پر غلط ہے۔اپنی نوعیت کے حوالے سے ہی ریاست بیوروکریٹوں،افسروں،جرنیلوں اور پولیس کے سربراہوں وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے۔لیکن یہ افراد مجموعی طور پر ایک حکمران طبقہ نہیں ہوتے بلکہ ایک طبقے کے آلہ کار ہوتے ہیں چاہے یہ اس حکمران طبقے کے خلاف ہی کیوں نہ کھڑے ہوں۔وہ بذات خود ایک طبقہ نہیں ہو سکتے۔اس ریاستی مشینری میں بیوروکریسی مختلف درجات کے لاکھوں افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔چھوٹے چھوٹے مقامی اہلکار بھی ہوتے ہیں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز معززین بھی۔تو پھر بیوروکریسی کا کون سا حصہ ریاست کا ''مالک'' ہوتا ہے؟تمام بیوروکریٹ تو نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ (بذات خود بیوروکریسی) درجات میں منقسم ہوتے ہیں۔چھوٹا سرکاری اہلکار بھی

بیوروکریسی کا اسی طرح ایک جزو ہوتا ہے جس طرح بڑا بیوروکریٹ۔

''جرمنی، واحد راستہ'' میں ٹراٹسکی بوناپارٹ ازم کے سوال سے اس طرح نمٹتا ہے:

برونگ حکومت کے وقت ہم نے اسے بوناپارٹ ازم (مسخ شدہ بوناپارٹ ازم) قرار دیا تھا یعنی ملٹری پولیس کی آمریت کا نظام۔ جیسے ہی دو سماجی پرتوں یعنی مالک اور محروم، استحصالی اور استحصال زدہ کی کشمکش اپنے نقطہ عروج کو پہنچتی ہے بیوروکریسی، پولیس اور فوج کے غلبے کیلئے حالات سازگار ہو جاتے ہیں۔ حکومت سماج سے آزاد ہو جاتی ہے۔ آیئے ہم ایک بار پھر دہراتے ہیں کہ اگر دو کانٹے مماثلت کے ساتھ کسی کارک میں گاڑ دیئے جائیں تو وہ کارک ایک سوئی کے سرے پر بھی کھڑا ہو سکتا ہے۔ بالکل یہی بات بوناپارٹ ازم کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ایسی حکومت بھی صاحب ملکیت لوگوں کی منشی رہتی ہے۔ تاہم یہ منشی اپنے مالک کی پیٹھ پر بیٹھتا ہے، مار مار کر اس کی گردن سرخ کر دیتا ہے اور بعض اوقات اس کے چہرے پر اپنے جوتے رگڑنے سے بھی باز نہیں آتا۔''

''یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ برونگ حکومت آخری حل تک قائم رہے گی۔ تاہم واقعات کے تسلسل میں ایک اور کڑی درمیان میں آ گئی یعنی سپین حکومت۔ اگر ہم زیادہ درستگی کے طلبگار ہیں تو ہمیں برونگ حکومت کے پرانے مرتبے کی تصحیح کرنا ہو گی۔ برونگ حکومت ایک ابتدائی بوناپارٹسٹ حکومت تھی برونگ محض ایک نقیب تھا۔ بوناپارٹ ازم اپنی کامل شکل میں سپین۔ مشلیچر حکومت میں منظر عام پر آیا۔''

بحران اور زوال پذیری کے عہد کا بوناپارٹ ازم سرمایہ داری کی جوانی کے دور کے بوناپارٹ ازم سے مختلف ہے۔ مختلف تراکیب کے حوالے سے اس کی مختلف اشکال ہو سکتی ہیں جن کا انحصار ٹھوس حالات پر ہوتا ہے۔ نپولین یا اولیور کرامویل کی حکمرانی یعنی کلاسیکی بوناپارٹ ازم کی بنیاد بورژوا سماج کے ظہور پر تھی۔ سرمایہ داری کے عروج کے مرحلے کا بوناپارٹ ازم مضبوط اور پراعتماد ہے۔ پیداواری قوتوں کی زبردست ترقی کی بدولت یہ کچھ استحکام حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن سرمایہ دارانہ زوال کے دور کا بوناپارٹ ازم بڑھاپے سے سٹھیایا ہوا ہوتا ہے۔ سرمایہ دار سماج کے بحران کی پیداوار ہونے کے ناطے یہ اپنے سامنے آنے والے کسی بھی مسئلے کو حل کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ دونوں جنگوں کے درمیانی دور میں بہت سی بوناپارٹسٹ حکومتیں وجود میں آئیں جو انقلاب اور ردانقلاب کی قوتوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں بورژوا جمہوریت کی کمزوری کے سبب سابقہ نوآبادیاتی دنیا میں بہت سی حکومتوں کا کردار بوناپارٹسٹ ہے۔ یہاں ہم کمزور پارلیمانی حکمرانی کے ادوار دیکھتے ہیں جن کے بعد فوجی آمریت

قائم ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس فاشسٹ نظام حکومت میں بورژوازی کو سیاسی اعتبار سے مکمل طور پر بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ تمام جمہوری حقوق کچل دیئے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ تمام اقتدار فاشسٹ طالع آزماؤں کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ جو پیٹی بورژوازی کی بپھری ہوئی قوتوں کو مزدور طبقے کیخلاف لاٹھی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ فاشسٹ نظام حکومت کے تحت پرولتاریہ مکمل طور پر تحلیل ہو جاتا ہے۔

ٹراٹسکی لکھتا ہے کہ ''فاشزم میں بونا پارٹ ازم کا ایک عنصر موجود ہوتا ہے۔ اس عنصر کے بغیر یعنی طبقاتی جدوجہد میں انتہائی شدت آجانے کے باعث ریاستی اقتدار کے سماج سے بالاتر ہوئے بغیر، فاشزم ناممکن ہوتا ہے۔ لیکن ہم شروع سے ہی کہہ رہے ہیں کہ یہ بنیادی طور پر سامراجی زوال کے دور کے بونا پارٹ ازم کا سوال ہے جو بورژوا عروج کے دور کے بونا پارٹ ازم سے معیاری لحاظ سے مختلف ہے۔ جرمنی میں بروننگ اور شلیچر کی وزارتیں اور ہنڈن برگ کی صدارت، فرانس میں پیٹن کی حکومت یہ سب کی سب یا تو غیر مستحکم ثابت ہو چکی ہیں یا لازماً ہو جائیں گی۔ سامراجی زوال کے دور میں ایک خالصتاً بونا پارٹ ازم بالکل ناکافی ہے۔ سامراج کیلئے پیٹی بورژوازی کو متحرک کرنا ناگزیر ہے تاکہ اس کے بوجھ تلے مزدور طبقے کو کچلا جا سکے۔'' (14)

یہ ثابت کرنے کیلئے بے شمار حوالے دیئے جا سکتے ہیں کہ نجی ملکیت یعنی ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت سرمایہ دار ریاست کی اولین شرط ہے۔ ریاست حکمرانی کا آلہ ہے، یہ بذات خود وہ طبقہ نہیں ہو سکتی جو حکمرانی کرتا ہے۔ بیوروکریسی ریاستی مشینری کا محض ایک جزو ہے۔ وہ اس حوالے سے ریاست کی ''مالک'' ہو سکتی ہے کہ وہ سماج سے بالاتر ہو جاتی ہے اور معاشی اعتبار سے غالب یعنی حکمران طبقے سے کسی حد تک خودمختاری حاصل کر لیتی ہے۔ نازی جرمنی میں بھی ایسا ہی ہوا تھا جہاں بیوروکریسی سرمایہ داروں کو حکم صادر کرتی تھی کہ انہیں جنگی مقاصد کیلئے کیا کچھ پیدا کرنا چاہیے اور کیسے پیدا کرنا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ برطانیہ، امریکہ اور دوسرے ممالک میں بھی جنگی معیشت کے سلسلے میں ریاست سرمایہ داروں پر حکم چلاتی تھی کہ انہیں کیا پیدا کرنا چاہیے اور کیسے پیدا کرنا چاہیے۔ اس نے انہیں ایک حکمران طبقے میں تبدیل نہیں کیا۔ کیوں؟ کیونکہ وہ اقدامات نجی ملکیت کے تحفظ اور بحیثیت مجموعی سرمایہ دار طبقے کے مفادات کے دفاع میں کئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ بیوروکریسی صنعت کی منصوبہ بندی اور انتظام کرتی ہے۔ لیکن وہ جس صنعت کی منصوبہ

بندی اور انتظام کرتی ہے وہ کس کی ملکیت ہوتی ہے؟ سرمایہ دار سماج میں منتظم انفرادی اداروں اور ٹرسٹوں میں صنعت کی منصوبہ بندی اور انتظام کرتے ہیں۔ لیکن یہ چیز انہیں ان اداروں اور ٹرسٹوں کا مالک نہیں بنا دیتی۔ مثال کے طور پر برطانیہ کی قومیائی ہوئی صنعتوں کو منتظمین کی بیوروکریسی چلاتی تھی لیکن وہ ان صنعتوں کے مالک نہیں تھے۔ وہ ریاست، سرمایہ دار ریاست کی ملکیت تھیں اور انہیں سرمایہ دار معیشت کے اجتماعی مفاد میں چلایا جاتا تھا۔ سوویت یونین میں بیوروکریسی تمام صنعت کو چلاتی تھی۔ اس حوالے سے یہ بات سچ ہے کہ وہ اپنی معاشی بنیاد سے اس درجے آزاد تھی کہ پوری انسانی تاریخ میں کسی بیوروکریسی یا ریاستی مشینری کو اتنی آزادی نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن جیسا کہ اینگلز یہ بات زور دے کر کہتا تھا اور ہم بھی زور دے سکتے ہیں کہ آخری تجزیے میں معاشی بنیاد فیصلہ کن ہوتی ہے۔

بورژوا ماہرین عمرانیات سماج کی حقیقی طبقاتی بنیاد کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہر طرح کے سماجی گروہوں اور ذیلی گروہوں کو طبقات کا درجہ دینے کیلئے من مرضی کی تعریفوں کا سہارا لیتے ہیں۔ اس کے برعکس مارکسزم ہر طبقے کی تعریف ملکیتی رشتوں کے حوالے سے کرتا ہے۔ اس دلیل کا کوئی سر پیر نہیں ہے کہ منتظمین کی حیثیت سے کام کر کے بیوروکریٹ کسی طور ایک حکمران طبقہ بن جاتے ہیں۔ اس کا یقینی طور پر سرمایہ دار طبقے کی مارکسی تعریف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ بیوروکریسی نے منتظمین کی ایک پرت کے طور پر پیداوار میں ایک کردار ضرور ادا کیا جس طرح سرمایہ داروں کے منتظمین کرتے ہیں۔ لیکن ایک فرق بنیادی ہے۔ مغرب میں منتظمین صنعت کے نجی مالکان کیلئے کام کرتے ہیں (یا بورژوا ریاست کے لئے جو نجی شعبے کی ملازمہ کا کردار ادا کرتی ہے)۔ وہ صنعت کے مالک نہیں ہوتے اور ایک علیحدہ سماجی طبقے کی تشکیل نہیں کرتے۔

منتظمین کے طور پر وہ مارکس کے الفاظ میں ''نگرانی کرنے کی اجرت'' کے حقدار ہوتے ہیں اور بس۔ منتظمین کے سلسلے میں بالکل یہی بات مزدور ریاست میں بھی درست ہے بلکہ ایک صحت مند مزدور ریاست میں بھی جہاں عبوری دور میں ہنر مند مزدور اور غیر ہنر مند مزدور کی اجرت کے درمیان تفریق قائم رہے گی۔ لیکن سٹالنسٹ بیوروکریسی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ مزدور طبقے کی پیدا کردہ دولت کا ایک ضخیم حصہ ہڑپ کر جاتی تھی۔ اس بات کا اس کے انتظامی فرائض یا ''نگرانی کی اجرت'' سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اگر وہ زیادہ حصہ لیتے ہیں تو یہ اسی طرح ہے جیسے فاشسٹ یا بوناپارٹسٹ بیوررکریسی مزدور طبقے کی

پیدا کردہ قدر زائد کا ایک حصہ ہڑپ کر جاتی ہے۔لیکن مارکسی حوالے سے وہ کوئی طبقہ نہیں بلکہ ایک طفیلی ٹولہ ہے۔ٹراٹسکی لکھتا ہے ''دلالی اور دیکھ بھال کے فرائض، سماجی رتبے کو قائم رکھنے کے بارے میں تشویش اور ذاتی اغراض ومقاصد کیلئے ریاستی مشینری کے استحصال کے حوالے سے سوویت بیوروکریسی کسی بھی دوسری بیوروکریسی جیسی ہے خصوصاً فاشسٹ بیوروکریسی جیسی۔لیکن یہ اس سے بہت زیادہ مختلف بھی ہے۔کسی بھی دوسرے نظام میں کسی بیوروکریسی نے غالب طبقے سے اتنی خودمختاری کبھی حاصل نہیں کی۔''(15)

سٹالنسٹ بیوروکریسی کی مراعات کا آغاز وہیں سے ہوتا تھا جہاں اس کے پیداواری فرائض (جیسے بھی تھے) کا اختتام ہوتا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ ان کا ظہور پیداواری شعبے میں نہیں بلکہ تقسیم کے شعبے میں ہوا۔ایسے حالات میں کہ غربت عام تھی یہ فیصلہ کرنا ضروری تھا کہ کس کو کیا ملے گا۔ٹراٹسکی اس کا موازنہ بیکری کے آگے لگنے والی قطار سے کرتا ہے۔اگر روٹی کی قلت ہو اور قطار طویل تو اس کے بدنظمی کا شکار ہونے کا امکان ہوتا ہے۔قطار کو درست کرنے اور ہر کسی کو اس کا حصہ دلانے کیلئے ایک سپاہی کا وجود ضروری ہو جاتا ہے۔اس عمل میں عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ سپاہی ہر کسی سے زیادہ حصہ لے جاتا ہے۔اس سے شاید سپاہی کے بارے میں بہت زیادہ ہمدردانہ رویہ جنم نہ لے سکے لیکن لفظ کے مارکسی معنی میں یہ بات اسے ایک حکمران طبقہ یقیناً نہیں بتاتی!

سٹالنسٹ بیوروکریسی ایک نیا حکمران طبقہ نہیں تھی جیسا کہ برن ہام' شناخت مین' جیلاس' کیورون اورٹونی کلف (ان کے ساتھ بورژوا اور لیبر رائٹ ونگ بھی شامل ہے) دلیل دیتے ہیں اور اس کا پیداواری عمل میں کوئی ضروری کردار نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ اوپر سے بامعنی اصلاحات خارج از امکان ہیں۔ پولینڈ کے جاہل''منحرف'' دانشوروں کا استدلال یہ تھا کہ اگر سرمایہ داری کے تحت آزاد ٹریڈ یونینوں کا قیام ممکن ہے تو ''ریاستی سرمایہ داری'' میں ان کی اجازت کیوں نہیں دی جاسکتی؟ یہ درست ہے کہ سرمایہ داروں کیلئے عام حالات میں بورژوا ''جمہوریت'' (یعنی رسمی جمہوریت جس میں مزدوروں کو بعض حقوق حاصل ہوتے ہیں لیکن یہ فیصلہ حتمی طور پر بینک اور اجارہ داریاں ہی کرتی ہیں کہ بالا آخر کیا ہوگا) سب سے سستا اور محفوظ نظام حکومت ہے جو فاشزم اور بونا پارٹ ازم کے تحت ہونے والی لوٹ مار اور زبردست ضیاع سے کہیں زیادہ قابل ترجیح ہے۔لیکن سٹالن ازم کے تحت جمہوری حقوق سے بیوروکریسی کی حیثیت کو فوری خطرہ درپیش ہو جاتا ہے رسمی جمہوریت اور سٹالن ازم کا آپس میں کوئی جوڑ نہیں۔

ٹراٹسکی اپنے اس نقطہ نظر پر نہایت سختی سے قائم تھا کہ بیوروکریسی ایک نیا حکمران طبقہ نہیں ہے۔ ایوان کریپو کے ساتھ بحث کرتے ہوئے وہ وضاحت کرتا ہے'' اس بار وہ اپنا زبردست استدلال ''انقلاب سے غداری'' کے ایک بیان سے اخذ کرتا ہے جس کے مطابق تمام ذرائع پیداوار ریاست کے ہیں اور ریاست کسی حد تک بیوروکریسی کی ہے۔ کریپو کی خوشی کی انتہا نہیں ہے۔ اگر ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت ہیں اور ریاست بیوروکریسی کی ہے تو بیوروکریسی ذرائع پیداوار کی بھی مالک ہے اور اسی بنا پر ایک صاحب ملکیت اور استحصالی طبقہ بھی ہے۔ کریپو کے بقیہ استدلال کا کردار کم وبیش خالصتاً ادبی نوعیت کا حامل ہے۔ وہ میرے خلاف بحث کے انداز میں ایک بار پھر ہمیں بتاتا ہے کہ رجعتی ''تھرمیڈورین'' بیوروکریسی گھناؤنی غاصب' رجعتی اور خونخوار ہے وغیرہ وغیرہ۔ کیا انکشاف ہے! لیکن ہم نے تو یہ کبھی نہیں کہا کہ سٹالنسٹ بیوروکریسی بہت پارسا ہے۔ ہم تو محض اسے مارکسی حوالے سے ایک طبقے کی خوبی عنایت کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ یعنی ذرائع پیداوار کی ملکیت کے حوالے سے۔'' (16)

ریاست طبقاتی حکمرانی کے جبر کا آلہ ہے۔ ایک مقدس سپاہی ہے۔ لیکن یہ سپاہی حکمران طبقہ نہیں ہے۔ پولیس بے لگام ہوسکتی ہے، ڈاکوؤں میں تبدیل ہوسکتی ہے لیکن اس سے وہ سرمایہ دار، جاگیردار یا غلام دار طبقہ نہیں بن جاتی۔ بیوروکریسی کے طفیلی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ یہ ریاکاری کرنے پر مجبور ہے کہ ایک مراعات یافتہ پرت کے طور پر ان کا کوئی وجود نہیں۔ ٹراٹسکی کے الفاظ میں ''قومی آمدنی کا بڑا حصہ ہڑپ کرنے کے باعث اس کا کردار سماجی طفیلیے کا ہے۔'' وہ اپنی مراعات طاقت کے غلط استعمال کی شکل میں حاصل کرتی ہے۔ وہ اپنی آمدنی چھپاتی ہے۔ ٹراٹسکی لکھتا ہے''انتہائی وسیع اپارٹمنٹ' بہترین گوشت کے قتلے اور یہاں تک کہ رولز رائس کاریں بھی بیوروکریسی کو ایک خودمختار حکمران طبقے میں تبدیل کردینے کیلئے ناکافی ہیں۔'' (17)

لینن اور ٹراٹسکی کے تحت قائم مزدوروں کی جمہوریت کی جگہ سٹالن کے نوکرشاہانہ نظام نے لے لی۔ اگرچہ انقلاب کے ابتدائی ایام کے مقابلے میں سیاسی شکلیں بہت زیادہ مختلف تھیں لیکن جو کچھ باقی بچا وہ تھے قومی ملکیتی رشتے۔ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کا وجود ہی وہ حقیقت تھی جو سوویت یونین میں سیاسی ردانقلاب کے باعث خوفناک حد تک مسخ ہوچکی تھی۔ ''ایک رسولی کا حجم بہت زیادہ ہوسکتا ہے اور وہ کسی جاندار کا خاتمہ بھی کرسکتی ہے لیکن کوئی رسولی کبھی بھی ایک علیحدہ جاندار نہیں بن سکتی۔'' (18)

سوویت بیوروکریسی دیگر نوکرشاہیوں جیسی ہی تھی بالخصوص فاشسٹ بیوروکریسی جیسی مگر ان میں

ایک نہایت اہم فرق تھا۔ فاشسٹ بیوروکریسی کا دارومدار ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت پر تھا اور وہ ایک زوال پذیر نظام کا خوفناک ترین اظہار تھی۔ سٹالنسٹ بیوروکریسی کی بنیاد انقلاب کے بعد قائم ہونے والے نئے ملکیتی رشتوں پر تھی جنہوں نے ایک لمبے عرصے تک زبردست جانداری کا ثبوت دیا۔ ابھی حال تک روسی بیوروکریسی اپنی قوت اور آمدنی کے سرچشمے کے طور پر ریاستی ملکیت کا دفاع کرنے پر مجبور تھی۔ صرف اسی حقیقت نے اس پیداواری قوتوں کے فروغ میں ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے کے قابل بنایا۔ تاہم بہترین دور میں بھی یہ مزدور ریاست پر ایک طفیل خور کی حیثیت سے چپکی رہی اور بدانتظامی، بدعنوانی اور لامحدود ضیاع کا سرچشمہ بنی رہی۔ اس میں برائیاں تھیں، سبھی تھیں لیکن کسی حکمران طبقے کی تاریخی خوبی ایک بھی نہیں تھی۔

جیسا کہ ٹراٹسکی نے لکھا ہے ''اگر یہ بوناپارٹسٹ کھچڑی ایک طبقہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک اسقاط حمل نہیں بلکہ تاریخ کی جائز اولاد ہے۔ اگر اس کی غارت گر طفیلیت سائنسی اصطلاح میں استحصال ہے تو اس کا مطلب ہے کہ دیئے گئے نظام کے ناگزیر حکمران طبقے کی حیثیت سے بیوروکریسی ایک تاریخی مستقبل کی حامل ہے۔'' (19)

یہ بات واضح ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سوویت معیشت نے زبردست پیش قدمی کی ہے مگر اس تحریک کا باعث بذات خود بیوروکریسی نہیں بلکہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت تھی۔ بیوروکریسی روس کی تیکنیکی اور ثقافتی ترقی کی راہ میں زبردست رکاوٹ بن چکی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے کہ بھاری صنعت کی ترقی میں سوویت بیوروکریسی نے ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کیا مگر ساتھ ہی ساتھ زبردست ضیاع کا باعث بھی بنی۔

سٹالن کے تحت ریاست کی اکتوبر انقلاب کے بعد قائم ہونے والی ریاست کے ساتھ سوائے ریاستی ملکیت اور منصوبہ بندی کے کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ اکتوبر انقلاب نے صنعت اور ریاست پر مزدوروں کے انتظام اور کنٹرول کیلئے جو بھی اقدامات متعارف کروائے تھے انہیں ختم کر دیا گیا۔ بیوروکریسی کو مکمل غلبہ حاصل تھا۔ نام نہاد انتخابات ایک ڈھونگ ہوتے تھے جن میں واحد پارٹی کے امیدوار باقاعدگی سے 99 فیصد ووٹ حاصل کر کے منتخب ہوتے تھے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جو ٹیکنیکی اعتبار سے بھی ناممکن ہے (بعض اوقات لوگ اپنے گھر تبدیل کر لیتے ہیں یا فوت بھی ہو جاتے ہیں)۔ مزدور طبقہ بیوروکریسی کے رحم و کرم پر تھا اور اس کے خلاف کام سے برطرفی، جلاوطنی، گرفتاری، دماغی امراض

کے ہسپتالوں میں نظر بندی اور ایسے تمام دیگر ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے جن کے ذریعے ایک مطلق العنان ریاست اپنے لوگوں کو ایک مستقل خوف کی کیفیت میں مبتلا رکھتی ہے۔ جبر کے عمومی آلات کے علاوہ بیوروکریسی کو جاسوسوں، مخبروں اور ٹاؤٹوں کی ایک پوری فوج کی خدمات بھی حاصل تھیں جو ہر ورکشاپ، دفتر، کلاس روم اور رہائشی عمارت میں موجود تھی۔

یہ سچ ہے کہ بعد کے سالوں میں خصوصاً سٹالن کی موت کے بعد بہت سی اصلاحات متعارف کروائی گئیں جن سے معیار زندگی بہتر ہوا اور سماجی خدمات کا شعبہ بھی بہتر ہوا۔ لیکن اس تمام عرصے میں باگ ڈور بیوروکریسی کے مضبوط ہاتھوں میں رہی۔ تمام اصلاحات ہمیشہ اوپر سے نافذ کی گئیں اور ان سے مزدور طبقے اور حکمران ٹولے کے بنیادی تعلقات میں کسی بھی حوالے سے تبدیلی نہیں آئی۔ مزدور جمہوریت کے عنصر کا کہیں کوئی سراغ نہیں تھا۔

نوکرشاہانہ اجتماعیت؟

کیا سٹالنسٹ روس سماج کی کسی ایسی نئی شکل کی نمائندگی کرتا تھا جس کا مارکس یا لینن کو ادراک نہیں تھا ظاہر ہے کہ اگر سٹالن ازم سوشل ازم نہیں ہے یعنی ایک ایسا سماج نہیں ہے جس کی بنیاد انسانی ضروریات کی ہم آہنگ تسکین ہو تو پھر وہ کس کی نمائندگی کرتا ہے؟ کچھ مبصروں نے سوویت یونین کا جائزہ لیا اور وہاں کے تطہیری مقدمات، جبری مشقت کے کیمپوں اور اس نظام کی عمومی آمرانہ نوعیت سے متنفر ہو کر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سٹالن ازم ایک نیا استحصالی معاشرہ ہے اور اس کا ایک اپنا نوکرشاہانہ حکمران طبقہ ہے۔

''نوکرشاہانہ اجتماعیت'' (میکس شناخت مین اور برونو رزی) سے لیکر ''ریاستی سرمایہ داری'' (ٹونی کلف) تک اس کی بہت سی وضاحتیں پیش کی گئی ہیں۔ درحقیقت یہ تصورات اول تا آخر بالکل غلط ہیں۔

ریاستی سرمایہ داری کا نظریہ اس تصور پر قائم کیا گیا تھا کہ روس میں آنے والا سٹالنسٹ سیاسی رد انقلاب سرمایہ داری میں ایک نئے مرحلے کی غمازی کرتا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ''عام'' سرمایہ داری سے کسی طرح بھی مختلف نہیں تھا۔ سوویت معیشت کے بارے میں فرض کیا جاتا تھا کہ وہ سرمایہ داری کے عمومی قوانین کے تابع ہے، وغیرہ وغیرہ تاہم اس استدلال نے خود کو جلد ہی بے شمار تضادات میں گھیرا ہوا پایا۔ باقی چیزوں سے قطع نظر ہم یہ نکتہ ضرور اٹھائیں گے کہ اگر سوویت یونین میں سرمایہ داری تھی (یا ریاستی

سرمایہ داری تھی اس سے اس استدلال کے مواد میں کوئی حقیقی فرق نہیں آتا) تو اس کے قوانین حرکت بھی وہی ہونے ضروری تھے جو سرمایہ داری کے ہیں یعنی ابھار اور کساد بازاری تاہم آپ کچھ بھی جتن کر لیں آپ کو اس قسم کا کوئی مظہر نہیں ملے گا۔ لہٰذا ایک غلط تھیوری اپنانے کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ مارکسزم کے بنیادی نقطہ نظر کو ترک کر دیتے ہیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسی سرمایہ داری ہے جس نے مارکیٹ اکانومی کے بنیادی تضاد پر کامیابی سے قابو پا لیا ہے۔ ایک ایسی سرمایہ داری جس میں بیروزگاری نہیں ہے جو ذرائع پیداوار کو بے مثال ترقی دینے کی اہل ہے اور اسے زائد پیداوار کے بحرانوں کا سامنا بھی نہیں ہے۔

ایسا نتیجہ اخذ کرنے کے بعد، اگر یہ درست ہو، ہمارے لیے مارکسزم کے تمام بنیادی اصولوں کو از سرنو مرتب کرنا ناگزیر ہو جائے گا۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ یہ تمام تصور مارکسی نظریہ ریاست، سماج کی طبقاتی نوعیت اور عبوری دور کو سمجھنے میں مکمل ناکامی کی بنیاد پر قائم ہے۔ سرمایہ داری سے سوشلزم تک عبور کے مرحلے کے بارے میں مارکس اور لینن کا پیش کردہ خاکہ عمومی طور پر درست ہے لیکن سچائی ہمیشہ ٹھوس ہوتی ہے۔ صرف نظری عمومیت کی بنیاد پر پیچیدہ اور متضاد سماجی مظاہر کو سمجھنا ناممکن ہے۔ یہ ایک مفید خاکہ اور نقطہ آغاز تو فراہم کر سکتی ہے مگر کسی چیز کی نوعیت کو صرف حقائق اور عوامل کے محتاط تجزیئے کی بنیاد پر ہی سمجھا جا سکتا ہے جس میں اس کے تمام پہلوؤں اور متضاد رجحانات کو سامنے رکھا جائے۔ اس کے برعکس ایک پہلے سے تیار شدہ تعریف کو درست ثابت کرنے کیلئے اس میں حقائق کو ٹھونسنے کا نتیجہ اسقاط حمل کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کا سب سے نمایاں پہلو اس کی تمام اقسام کا من موجی کردار ہے۔ کسی مسئلے کو حل کرنے کی بجائے یہ بہت سے نئے تضادات کی طرف لے جاتا ہے۔ سٹالن ازم کے بارے میں ٹراٹسکی کی یہ وضاحت کہ یہ مسخ شدہ مزدور ریاست ہے، ایک قسم کا پرولتاری بوناپارٹ ازم ہے اس قدر سادہ اور مارکسی نظریئے سے اس مکمل طریقے سے ہم آہنگ ہے کہ ان تمام چیزوں سے گہری مطابقت رکھتا ہے جن کا ہم نے لینن کی وفات سے لیکر دیوار برلن کے گرنے تک سوویت یونین میں مشاہدہ کیا ہے۔ اس نقطہ نظر کو قبول کرنے سے ہمیں مارکسزم کے بنیادی تصورات کو از سرنو مرتب کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اور صرف یہی ہمیں نئی صورتحال میں سائنسی سمجھ بوجھ اور عمل کیلئے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

ایک جیتے جاگتے اور ارتقا پذیر عمل کو تجریدی تعریفوں اور رسمی منطق کے ذریعے سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

جیسا کی ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی۔ ''بیہودہ فکر کی بنیادی خامی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ وہ ایک ایسی سچائی کے بے حس و حرکت خاکوں سے مطمئن ہونے کی خواہش مند ہے جو ابدی حرکت پر مشتمل ہے۔ جدلیاتی فکر تصورات کو درست اندازوں، درستگیوں اور مخصوص شکل کے ذریعے لچک اور مواد سے معمور کرتی ہے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ انہیں رس اور گودا عطا کرتی ہے جو انہیں کسی حد تک جاندار مظہر کے قریب لے آتا ہے۔

سرمایہ داری عام مفہوم میں نہیں بلکہ ایک مخصوص سرمایہ داری ارتقا کے ایک مخصوص مرحلے پر، عام مفہوم میں مزدور ریاست نہیں بلکہ ایک پس ماندہ ملک کے اندر سامراجی محاصرے کا شکار مزدور ریاست، وغیرہ وغیرہ۔'' (20)

ان نظریات کی تاریخ کافی طویل ہے جن کے مطابق روس میں ریاستی سرمایہ داری قائم تھی۔ سوویت یونین کے حوالے سے نوکر شاہانہ اجتماعیت کا نظریہ برونو رزی اور میکس شناخت مین نے پچاس سال سے زیادہ عرصہ قبل پیش کیا تھا۔ اپنی کتاب ''دنیا کی بیوروکریٹائزیشن'' میں برونو رزی کہتا ہے ''ہماری رائے کے مطابق سوویت سماج، سماج کی ایک نئی قسم کی نمائندگی کرتا ہے جس کی سربراہی ایک نیا سماجی طبقہ کر رہا ہے۔ اجتماعی ملکیت درحقیقت اس طبقے کی ملکیت ہے جس نے ایک نیا اور اعلیٰ پیداواری نظام متعارف کروایا ہے۔ اس میں استحصال فرد سے طبقے کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔'' (21)

پھر لکھتا ہے ''ہماری رائے میں سوویت یونین میں بیوروکریٹ صاحب ملکیت ہیں کیونکہ قوت انہی کے ہاتھوں میں مرکوز ہے۔ وہی ہیں جو معیشت کی رہنمائی کرتے ہیں جیسا کہ بورژوازی کا معمول تھا، وہی ہیں جو اپنے لئے منافع حاصل کرتے ہیں جیسا کہ تمام استحصالی طبقات کا معمول تھا، وہی ہیں جو اجرتیں اور چیزوں کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں، ایک بار پھر یہ بیوروکریٹ ہی ہیں۔'' (22)

آخر میں رزی لکھتا ہے ''استحصال اسی طرح ہوتا ہے جیسے غلام داری سماج میں ہوتا ہے۔ روسی مزدور طبقہ اب پرولتاریہ نہیں رہا۔ روسی مزدور اب محض غلام ہیں۔ اپنے معاشی جوہر اور اس کے سماجی اظہار کے حوالے سے وہ ایک غلام طبقہ ہیں۔'' (23)

مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ بعد ازاں وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ پیداوار میں اضافے کی بنیاد پر یہ نوکر شاہانہ اجتماعیت ''ایک غیر طبقاتی سماج اور سوشلزم'' پر منتج ہو گی۔

اسی نظری اور فکری مغالطے کی بنیاد پر وہ ہٹلر کے جرمنی کو بھی نوکر شاہانہ اجتماعیت قرار دے دیتا ہے۔

برونورزی کا تمام استدلال ہی مکمل طور پر غیر سائنسی ہے۔ سوویت بیوروکریٹ ذرائع پیداوار کی ملکیت کے حوالے سے صاحب جائیداد نہیں تھے۔ وہ سٹاک یا حصص کے مالک نہیں تھے اور نہ ہی وہ وراثت کے ذریعے اپنی جائیداد منتقل کر سکتے تھے۔ وہ مزدور طبقے کے اس طرح مالک نہیں تھے جس طرح روم کے غلام دار اپنے غلاموں کے مالک ہوتے تھے۔ یہ بات ایک اسرار ہی رہتی ہے کہ اسطرح کا طبقاتی سماج ارتقا پا کر سوشلزم میں کس طرح تبدیل ہو جائیگا۔ تاہم ان مضحکہ خیز تصورات کو جیمز برن ہام نے اپنایا اور ''انتظامی انقلاب'' کے مصنف کے طور پر شہرت پائی جس میں سٹالن ازم کو فاشزم اور نئی سودے کاری کا ہم پلہ قرار دیا گیا تھا۔ اس نے سوویت یونین کے خلاف ایٹمی جنگ کی کھلم کھلا وکالت کر کے منفی شہرت کمائی۔ بنیادی طور پر یہ سب کچھ مزدور طبقے کی شکستوں کی وجہ سے درمیانے طبقے کے دانشوروں کی ایک پرت میں پھیلنے والی قنوطیت اور مایوسی کا عکس تھا۔ نوکر شاہانہ اجتماعیت کا تصور ایک نظریے سے بڑھ کر اس پرت کے موڈ کو ظاہر کرتا تھا جس کا سب سے واضح اور شدید ترین اظہار ہمیں جارج آرویل کی کتاب ''1984ء'' کے صفحات میں مستقبل کی خوفناک تصویر کشی کی شکل میں ملتا ہے۔

میکس شاخت مین نے بھی 1940ء میں ٹراٹسکائیٹ تحریک کو چھوڑنے کے بعد نوکر شاہانہ اجتماعیت کے نظریے کو اپنا لیا۔ شاخت مین لکھتا ہے ''مارکس، اینگلز اور ان کے بعد آنے والے عظیم سوشلسٹ اساتذہ کی اس پیش گوئی نے ایک بے رحم حقیقت کا روپ دھار لیا ہے جس کے مطابق سرمایہ داری کا اپنے تضادات کے حل میں ناکامی کے باعث زوال پذیر ہونا یقینی ہے اور یہ کہ نوع انسانی کے سامنے اتنا مسئلہ سرمایہ داری یا سوشلزم میں انتخاب کا نہیں بلکہ سوشلزم یا بربریت کا ہے۔ سٹالن ازم وہ نئی بربریت ہے۔'' (24) وہ اس حد تک چلا گیا کہ سوویت یونین کے مزدور، مزدوروں کی بجائے نوکر شاہانہ ریاست کے غلام ہیں۔ اس کے باوجود وہ اس نوکر شاہانہ اجتماعیت کو سرمایہ داری سے زیادہ ترقی پسندانہ سمجھتا تھا۔

اس کی تنظیم ورکرز پارٹی نے 1941ء کے کونشن میں روس کے بارے میں ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا تھا کہ ''سوشلزم کے نقطہ نظر سے نوکر شاہانہ اجتماعیت پسند ریاست ایک رجعتی سماجی نظام ہے لیکن سرمایہ دار دنیا کے مقابلے میں تاریخی حوالے سے ایک زیادہ ترقی پسندانہ سطح پر ہے۔'' حقیقت میں یہ شاخت مین کی طرف سے اس امریکی پیٹی بورژوا رائے عامہ سے ہم آہنگی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش تھی جو 1939ء کے بعد سے سٹالن ازم کی بہت مخالف ہو چکی تھی۔ اس کا رجحان دائیں بازو کی طرف

بہت زیادہ گیا جس کا نتیجہ امریکی خارجہ پالیسی کی حمایت کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس کے بعد سوویت یونین کی وضاحت کے طور پر نوکرشاہانہ اجتماعیت کا نظریہ متروک ہو گیا۔

کوئی مارکسسٹ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی وجہ سے سوویت ریاست کی طبقاتی نوعیت تبدیل ہو گئی تھی۔ ٹونی کلف نے نہایت بے تکلفی سے بلا وضاحت یہ استدلال ترک کر دیا اور اپنے ریاستی سرمایہ داری کے نظریے کو تقویت دینے کیلئے کئی ایک نئے استدلال وضع کر لئے۔ یہ ہے پچھلے چالیس سالوں میں اس سوال کے حوالے سے اس کی دوسروں سے مستعار لی گئی طرز فکر کا خلاصہ۔

ٹراٹسکی کی رائے ریاستی سرمایہ داری کے بارے میں

1930ء کی دہائی میں ٹراٹسکی نے نوکرشاہانہ اجتماعیت اور ریاستی سرمایہ داری کے نظریہ کو ملیا میٹ کر دیا۔ ٹراٹسکی کے نزدیک سٹالن ازم کو سمجھنے کیلئے بنیادی سوال مارکسی طریقہ کار کا تھا۔ ٹونی کلف کے دعوے کے برعکس ٹراٹسکی سٹالن ازم کے تجزیئے کے سلسلے میں بے لچک اور کٹر ہونے کی بجائے انتہائی جدلیاتی تھا اور وہ ہر مرحلے پر وقوع پذیر ہونے والے عوامل کی متضاد خوبیوں کا باریک بینی سے مطالعہ کرتا تھا۔ وہ رسمی منطق کے اصولوں کی روح کے مطابق نفیس مقولہ ہائے منطقی کی تلاش میں نہیں تھا بلکہ اس نے سوویت یونین کے اندر جو کچھ حقیقتاً وقوع پذیر ہو رہا تھا اسے کھوج نکالا۔

دوسری طرف ریاستی سرمایہ داری کا نظریہ کچھ حلقوں کی طرف سے بدستور پیش کیا جاتا رہا۔ اس کا سب سے حالیہ شارح ٹونی کلف ہے جس کی کتاب پہلی بار 1964ء میں ''روس: ایک مارکسسٹ تجزیہ'' دوسری بار 1974ء میں ''روس میں ریاستی سرمایہ داری'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کی بنیاد اسی نوعیت کی ایک پرانی کتاب، سٹالنسٹ روس کی نوعیت، پر ہے جو جون 1948ء کو شائع ہوئی تھی۔ اس کی نظری کمزوریوں اور اس پر کی گئی تنقید کے بعد اس میں پیش کردہ استدلال میں بعد ازاں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ کلف کی یہ دلیل تھی کہ پانچ سالہ منصوبوں کے پہلے سال یعنی 1928ء میں روس ایک مسخ شدہ مزدور ریاست سے ریاستی سرمایہ داری میں تبدیل ہو گیا تھا کیونکہ یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ ''پانچ سالہ منصوبے متعارف کروانے کے بعد بیوروکریسی کی آمدنی کا بہت بڑا حصہ قدر زائد پر مشتمل ہوتا تھا۔''(25)

تاہم یہ کلیدی استدلال اس وقت ترک کر دیا گیا جب کلف کے سامنے یہ بات واضح کی گئی کہ 1920ء کے بعد سے بیوروکریسی جائز اور ناجائز طریقوں سے مزدور طبقے کی پیدا کردہ قدر زائد کا بڑا حصہ ہڑپ کر رہی تھی۔ جیسا کہ مارکس نے بجا طور پر کہا تھا کہ عبوری دور میں مزدور ریاست میں قدر زائد کو تیز رفتار صنعتی ترقی کیلئے استعمال کیا جائے گا تا کہ ہر ممکنہ تیز رفتاری سے پہلے برابری اور پھر مکمل کمیونزم تک عبور کا مرحلہ طے کیا جائے۔ کلف کا یہ طریقہ کار بالکل مختلف تھا۔ انتہائی سطحی طریقے سے اس نے سوویت یونین کی حقیقت، نوعیت اور اس میں رونما ہونیوالے متضاد عوامل کو سمجھے بغیر روس میں سٹالن ازم کی ظاہری خصوصیت کا جائزہ لیا اور سرمایہ داری کے بعض پہلوؤں کے ساتھ ان کی سطحی مماثلت قائم کر دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی سرمایہ داری کے ساتھ کچھ مماثلتیں بھی تھیں لیکن کچھ بنیادی فرق بھی تھے۔ کلف لکھتا ہے ''روس کے اندر جبری صنعت کاری کی ہولناکیاں، کسانوں پر مسلط کی جانیوالی سفاکانہ اجتماعیت، مزدوروں کے ٹریڈ یونینوں میں منظّم ہونے اور ہڑتال کرنے کے حق سے محرومی اور پولیس کی دہشت، سب کی سب سرمائے کے ارتکاز کی ایک ایسی شرح کے حصول کی ذیلی پیداوار تھیں جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔'' (26) سٹالن ازم میں یہ خصوصیات موجود تھیں لیکن ان کی وجہ سے کسی مبینہ ریاستی سرمایہ داری سماج میں سرمائے کا ابتدائی ارتکاز نہیں تھا۔

ٹراٹسکی نے ان عوامل کی وضاحت یوں کی کہ یہ سرمایہ دارانہ معاشی قوانین کے حرکت میں آنے کا نتیجہ نہیں تھے بلکہ ان کا ظہور سٹالنسٹ بیوروکریسی کے ان اقدامات کی وجہ سے ہوا جو اپنی مراعات یافتہ حیثیت کو مستحکم کرنے کیلئے مغرب کے برابر آنے کیلئے کر رہی تھی۔ بعض دیگر نوکر شاہیوں نے بھی ایسے ہی سفاکانہ اقدامات کئے تھے۔ مثال کے طور پر نازی بیوروکریسی جو ساری دنیا پر غلبے کی متمنی تھی۔ تاہم اس حقیقت سے نظام کی طبقاتی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اگر کلف کی بنیادی طور پر مختلف طرز فکر کو مدنظر رکھا جائے تو اس نے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے ''سٹالن کے روس کی طبقاتی نوعیت کے سلسلے میں ہمارا تجزیہ ٹراٹسکی کے تجزیئے سے مختلف ہے۔'' (27) اہم نقطہ یہ ہے کہ ٹراٹسکی اپنے طریقہ کار اور تجزیئے میں درست تھا اور کلف غلط۔

کلف دعویٰ کرتا ہے کہ سٹالنسٹ بیوروکریسی ایک نیا حکمران طبقہ ہے مگر اس کی تحریروں میں ایسا کوئی حقیقی تجزیہ یا شہادت نہیں ملتی جس سے یہ پتہ چل سکے کہ ایسا طبقہ کیسے اور کیوں ایک سرمایہ دار طبقہ ہے۔ یہ کوئی حادثاتی امر نہیں ہے اس کی وجہ اس کا طریقہ کار ہے۔ ذہن میں پہلے سے موجود ریاستی سرمایہ

داری کے تصور کو نقطہ آغاز بنا کر باقی سب کچھ اس تصور کے ساتھ مصنوعی طور پر جوڑ دیا گیا ہے۔اس نے روسی سماج کے ارتقا اور حرکت کے عمل پر مارکسی نظری طریقہ کار کا اطلاق کرنے کی بجائے عظیم مارکسسٹوں کی کتابیں کھنگال کر اقوال جمع کیئے اور انہیں یکجا کر کے ایک نئے نظریے کو جنم دینے کی کوشش کی۔

مارکسسٹوں کے نزدیک سماجی نظاموں کے تجزیئے کی بنیادی کسوٹی یہ ہے کہ آیا نئی تشکیل پیداواری قوتوں کے ارتقا کا سبب بنتی ہے؟ کلف اس سوال سے دامن بچانے کیلئے سرمایہ داری کی انفرادی شرح اضافہ کے جعلی موازنوں اور اس حقیقت کا سہارا لیتا ہے کہ 1891ء کے بعد سے عالمی صنعتی پیداوار میں واقعی اضافہ ہوا ہے۔لیکن جس چیز کا موازنہ کرنے کی ضرورت ہے وہ سوویت یونین اور باقی سرمایہ دار دنیا کی شرح اضافہ ہے۔مارکسزم کے نظریئے کی اساس یہ ہے کہ پیداواری قوتوں کی مادی ترقی تاریخی ارتقا کی قوت متحرکہ ہے۔ایک نظام کی دوسرے نظام میں تبدیلی کا فیصلہ داخلی عوامل نہیں کرتے بلکہ اس کی جڑیں بذات خود پیداوار کی ضروریات میں موجود ہوتی ہیں۔صرف اور صرف یہی بنیاد ہے جس پر بالائی ڈھانچے کی تشکیل ہوتی ہے یعنی ریاست، آئیڈیالوجی، فنون لطیفہ، سائنس اور حکومت۔یہ سچ ہے کہ بالائی ڈھانچے کا پیداوار پر ایک ضمنی مگر اہم اثر ہوتا ہے اور یہاں تک کہ بعض مخصوص حدود کے اندر جیسا کہ اینگلز نے وضاحت کی تھی، یہ خود حرکت کی صلاحیت بھی حاصل کر لیتا ہے۔لیکن آخری تجزیئے میں پیداوار کی ترقی فیصلہ کن ثابت ہوتی ہے۔مارکس نے سرمایہ داری کے تاریخی جواز کی وضاحت اس حقیقت کے ذریعے کی تھی کہ صنعتی انقلاب کی ہولناکیوں، افریقہ کے رنگدار لوگوں کی غلامی، فیکٹریوں میں بچوں سے لی جانیوالی مشقت اور دنیا بھر میں فتوحات کی خاطر ہونے والی جنگوں کے باوجود پیداواری قوتوں کی ترقی کیلئے یہ ایک ضروری مرحلہ تھا۔مارکس نے ثابت کیا کہ نہ صرف قدیم غلامی بلکہ سرمایہ داری کے ابتدائی ارتقا کے دور کی غلامی کے بغیر دور جدید کی پیداواری ترقی ناممکن ہوتی۔اس کے بغیر سوشلزم کیلئے درکار مادی بنیادیں کبھی تیار نہ ہو پاتیں۔28 دسمبر 1846ء میں پی وی النکوف کو ایک خط میں مارکس نے لکھا:

''براہ راست غلامی کو بورژوا صنعت میں وہی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو مشینری اور قرضوں وغیرہ کو ہے۔غلامی کے بغیر آپ کو کپاس نہیں مل سکتی، کپاس کے بغیر جدید صنعت اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی، غلامی کی وجہ ہی سے نو آبادیوں کی قدر و قیمت ہے، ان نو آبادیوں نے ہی عالمی تجارت کو جنم دیا ہے اور بڑے پیمانے کی صنعت کیلئے عالمی تجارت اولین شرط ہے۔لہٰذا غلامی ایک اہم ترین معاشی عامل ہے۔

''غلامی کے بغیر تمام ممالک سے زیادہ ترقی پسند شمالی امریکہ ایک قبائلی ملک میں تبدیل ہو جاتا۔

اگر شمالی امریکہ کو دنیا کے نقشے سے مٹا دیا جائے تو طوائف الملو کی پھیل جائے گی یعنی جدید تجارت اور تہذیب مکمل طور پر زوال پذیر ہو جائیگی۔"(28)

بلاشبہ غلامی اور صنعتی انقلاب کی ہولنا کیوں کے بارے میں مارکس کے رویے سے ہر کوئی آگاہ ہے۔ یہ دلیل دینا مارکس کی پوزیشن کو بری طرح مسخ کرنے کے مترادف ہوگا کہ چونکہ مندرجہ بالا تحریر مارکس کی ہے اس لئے وہ غلامی اور بچوں سے لی جانیوالی مشقت کا حامی تھا۔ اسی طرح مارکسسٹوں کیخلاف دلیل نہیں دی جاسکتی کہ چونکہ وہ سوویت یونین میں ریاستی ملکیت کے حامی تھے لہٰذا وہ جبری مشقت کی جیلوں اور سٹالن ازم کے دیگر جرائم کو بھی جائز تصور کرتے تھے۔ فرانس اور پروشیا کی جنگ میں مارکس نے جرمن حکمران بسمارک کی جو حمایت کی تھی اس کے پس پردہ بھی ایسے ہی محرکات تھے۔ بسمارک کی "خون اور فولاد" کی پالیسی اور اس کی حکومت کی رجعتی نوعیت کے باوجود مارکس نے فرانس کیخلاف پروشیا کی جنگ کی ناقدانہ حمایت کی تھی کیونکہ قومی بنیادوں پر جرمنی کے اتحاد سے پیداواری قوتوں کے ارتقا کو فروغ حاصل ہوتا۔ پیداواری قوتوں کا فروغ بنیادی کسوٹی تھا آخر کار باقی ہر شے اسی سے جنم لیتی ہے۔

روسی سماج کے کسی بھی تجزیئے کی یہی بنیاد ہونی چاہیے۔ جب کلف ایک بار یہ اعتراف کر لیتا ہے کہ عالمی پیمانے پر سرمایہ داری کے زوال پذیر ہونے کے باوجود روس میں پیداواری قوتوں کے فروغ کے حوالے سے اس کا کردار ترقی پسندانہ ہے تو منطقی طور پر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگا کہ سماج میں یا کم از کم پسماندہ ممالک میں اگلہ مرحلہ ریاستی سرمایہ داری کا ہے۔ متضاد طور پر وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ روسی بورژوازی وہ کردار ادا کرنے کی اہل نہیں ہے جو بورژوازی نے مغرب میں کیا تھا اور اسی وجہ سے پرولتاری انقلاب برپا ہوا۔

اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ روس میں ریاستی سرمایہ داری ہے (جو پرولتاری انقلاب کے باعث وجود میں آئی) تو یہ بات واضح ہے کہ سرمایہ داری کا بحران نا قابل حل نہیں ہے بلکہ یہ سرمایہ داری (ریاستی سرمایہ داری) کے اعلیٰ اور نئے مرحلے کی پیدائش کا دور ہے۔ مارکس کے اس قول سے جو خود کلف نے نقل کیا ہے کہ کوئی بھی سماج منظر عام سے اس وقت تک غائب نہیں ہوتا جب تک اس میں موجود تمام امکانات حقیقت کا روپ نہیں دھار لیتے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس کی دلیل درست ہوتی تو ایک نیا عہد، ریاستی سرمایہ داری کا عہد، ہماری نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہوتا۔ لینن کا یہ خیال کہ سرمایہ داری کا اعلیٰ ترین مرحلہ سامراج ہے، غلط ثابت ہو جاتا۔ پھر تمام مارکسزم کو اول تا آخر از سر نو مرتب کرنا ضروری ہو جاتا۔

ایک برسر اقتدار ٹریڈ یونین

''ریاستی سرمایہ داری'' کے سلسلے میں ہمیں اس قسم کی غیر معقول عقیدہ پرستی نظر آتی ہے جس کا ذکر مارکس نے کیا تھا اور جس سے انقلابی تحریک بھی متاثر ہو سکتی ہے۔ گویا کسی شے کا نام تبدیل کر دو تو اس کا جوہر بھی تبدیل ہو جائے گا! ٹراٹسکی اسے ''اصطلاحاتی انقلاب پسندی'' کہتا تھا۔ لیکن سٹالن ازم کے مظہر پر یہ لیبل چپکا دینے سے اس نظام کا کردار تبدیل نہیں ہو جاتا۔ ایسے طریقہ کار کا مارکسزم سے کوئی واسطہ نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر ریاستی سرمایہ داری یا نوکر شاہانہ اجتماعیت کا تصور درست ہے تو مارکس کا سارا نظریہ ہی یوٹوپیائی بن جاتا ہے۔ آیئے ہم بنیادی قضیہ جات سے آغاز کرتے ہیں۔ مارکس کے نظریئے کے مطابق کوئی بھی سماج تاریخ کے پردے سے اس وقت تک غائب نہیں ہوتا جب تک اس میں موجود تمام امکانات حقیقت کا روپ نہیں دھار لیتے۔ ایک پورے تاریخی عہد کے دوران سوویت نظام نے ایسی بے مثال ترقی کی جو مغرب میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ہمارا سامنا ایک ایسے نئے انقلاب کی بے معنویت سے ہے (ریاستی سرمایہ داری کی وکالت کرنے والوں کے مطابق 1917ء کا پرولتاری انقلاب) جس نے معیشت کو ریاستی سرمایہ داری میں تبدیل کر دیا۔ ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے کہ ''ریاستی سرمایہ داری قرار دے کر سوویت نظام کے معمے کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس اصطلاح کو یہ برتری حاصل ہے کہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس سے کیا مراد ہے۔'' (29)

جہاں ٹراٹسکی نے ملکیت کی شکلوں کی تبدیلی میں مزدور ریاست کا ثبوت حاصل کیا وہاں ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کے حامیوں نے اس کے بالکل برعکس ثبوت حاصل کیا۔ وہ دلیل دے سکتے ہیں کہ ریاست اس وقت تک مزدوروں کی نہیں ہو سکتی جب تک مزدور طبقے کا ریاست پر براہ راست کنٹرول نہ ہو۔ اس صورت میں انہیں اس تصور کو مسترد کرنا پڑے گا کہ ماسوائے اکتوبر انقلاب کے بعد کے چند ماہ کے روس میں مزدوروں کی ریاست کا کبھی بھی وجود رہا ہے۔ یہاں بھی اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ پرولتاری آمریت ہراول دستے کے آلے یعنی پارٹی کے ذریعے نافذ ہوتی ہے اور پارٹی میں پارٹی قیادت کے ذریعے۔ بہترین صورتحال میں بھی ایسا صرف ریاست اور پارٹی کے اندر انتہا درجے کی جمہوریت کے

ذریعے ہی ہوگا۔لیکن آمریت کا اپنا وجود اور سماجی تبدیلی کے حصول کیلئے اس کی ضرورت پہلے ہی گہرے سماجی تضادات کے ثبوت فراہم کر رہے ہیں جو ناموافق تاریخی صورتحال میں ریاست اور پارٹی کے اندر اپنا عکس تلاش کرسکتے ہیں۔نہ ہی پارٹی اور نہ ہی ریاست ازخود اور براہ راست طبقے کے مفادات کی عکاسی کرسکتی ہے۔لینن بلاوجہ ہی ٹریڈ یونینوں کو مزدوروں کی ریاست کیخلاف دفاع کا ایک ضروری عامل اور ساتھ ہی ساتھ ان کی اپنی ریاست کے دفاع کے لئے ڈھال تصور نہیں کرتا تھا۔

یہاں بھی جدلیاتی تجزیئے کی جگہ رسمی فکر کو دینے کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔اس نظریئے کی وکالت کرنیوالے خالص تجریدات کو بنیاد بناتے ہیں یعنی خوفناک پس ماندگی، غربت اور جہالت کے حالات میں تشکیل پانے والی حقیقی مزدور ریاست کی بجائے محض ایک عام مزدور ریاست۔ایک مادیت پسند اس موضوع کو بالکل مختلف انداز میں دیکھتا ہے۔اگرچہ پرولتاریہ سماج کا سب سے زیادہ ہم آہنگ طبقہ ہوتا ہے تاہم یہ بالکل ہی ہم آہنگ نہیں ہوتا۔اس طبقے کی مختلف پرتیں کئی اہم حوالوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں مثلاً ہنرمند اور غیر ہنرمند، پس ماندہ اور ترقی یافتہ، منظّم اور غیر منظّم وغیرہ وغیرہ۔مزدور طبقے کے اندر بھی ویسے ہی عوامل رونما ہوسکتے ہیں جیسے دوسرے طبقات میں ہوتے ہیں اور ان کا انحصار ٹھوس حالات پر ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مفید مماثلت سرمایہ داری کے تحت مزدور تنظیموں کی تاریخ ہے جن کے اندر بعض مخصوص صورتوں میں نوکر شاہی کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔خصوصاً اس وقت جب مزدور سرگرمی سے حصہ نہ لے رہے ہوں۔آخری تجزیئے کے طور پر ٹراٹسکی ایک مزدور ریاست کو ایسی ٹریڈ یونین سے مماثل قرار دیتا ہے جس نے اقتدار پر قبضہ کرلیا ہو۔ایک لمبی ہڑتال کے بعد جب فتح نظر نہ آرہی ہو تو مزدور کاہلی اور بے حسی کا شکار ہونا شروع ہوجاتے ہیں اور اس کی شروعات پس ماندہ ترین عناصر سے ہوتی ہے۔اسی طرح روس میں سال ہا سال کی جنگ، انقلاب اور خانہ جنگی کے باعث مزدور تھک گئے تھے۔رفتہ رفتہ وہ بے عملی کا شکار ہوگئے۔اس کے نتیجے میں کچھ عرصے کے اندر سوویتوں، ٹریڈ یونینوں اور مزدور اقتدار کے دیگر اداروں میں نوکر شاہی کو فروغ حاصل ہوگیا۔ایسا ہی عمل فرانسیسی انقلاب میں بھی دیکھا جاسکتا ہے اگرچہ اس کا طبقاتی مواد مختلف تھا۔اگر مزدور طبقے کی پارٹی (سوشل ڈیموکریسی) کیلئے خصوصاً اس کی قیادت کے باعث، سرمایہ داری کے خارجی دباؤ کے تحت زوال پذیر ہونا ممکن تھا تو مزدوروں کی تشکیل کردہ ریاست کیلئے یہی رخ اختیار کرنا کیوں ناممکن ہے؟ کوئی ریاست طبقے سے آزاد ہونے کے ساتھ

ساتھ (اپنے مفاد میں) انقلاب کی تخلیق کردہ نئی معاشی شکلوں کا دفاع کیوں نہیں کر سکتی؟ درحقیقت معلوم یہ ہوا ہے کہ ایک سماج سے دوسرے سماج میں تبدیلی کا عمل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہے جس کی پیش بینی سائنسی سوشلزم کے بانی اس وقت کر سکے تھے۔

کسی بھی دوسرے سماجی گروہ یا طبقے کی طرح پرولتاریہ کو بھی یہ مراعت حاصل نہیں تھی کہ اس کے غلبے اور سوشلزم تک کی تبدیلی کا راستہ ناگزیر طور پر ہموار ہوگا اور اس طرح وہ بلا تکلف اور سکون کے ساتھ سماج میں غائب ہو جائے گا۔ یہ ایک ممکنہ صورت تھی۔ لیکن سوشل ڈیموکریسی اور سوویت ریاست کی انحطاط پذیری اس وقت کے حالات کے تحت قطعاً حادثاتی نہیں تھی۔ ایک طرح سے یہ ایک طبقے، اس کے نمائندوں اور ریاست کے درمیان پیچیدہ رشتوں کی نمائندگی کرتی تھی اور اس کے باعث تاریخ میں ایک سے زیادہ بار بورژوا، جاگیردار اور غلام دار حکمران طبقوں کو کف افسوس ملنا پڑا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان تاریخی عوامل کی پیچیدگی کی عکاسی کرتی ہے جو فیصلہ کن عنصر یعنی معیشت کے پس پردہ کارفرما ہوتے ہیں۔

ذرا اس ریاستی سرمایہ داری کے شارحین کے میکانکی نقطہ نظر کا موازنہ لینن کے وسیع نقطہ نظر سے کریں۔ لینن نے بار بار ماضی کے عبوری ادوار بالخصوص جاگیرداری سے سرمایہ داری تک کے عبوری دور کے مطالعے پر زور دیا تھا تاکہ روس میں عبوری دور کے قوانین کو سمجھا جا سکے۔ وہ اس تصور کو مسترد کر دیتا کہ اکتوبر انقلاب کے بعد قائم ہونے والی ریاست اگر پہلے سے متصور راستے پر نہ چلی تو وہ مزدور ریاست نہیں رہے گی۔ لینن اچھی طرح جانتا تھا کہ پرولتاریہ، اس کی پارٹی اور قیادت کے پاس کوئی ایسی غیبی طاقت نہیں تھی جو انہیں سرمایہ داری کا تختہ الٹنے کے بعد بغیر تضادات کے سیدھی سوشلزم تک لے جاتی۔ ریاستی سرمایہ داری کے نظریے کے حامیوں کے پیش کردہ نمونوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لینن نے پہلے ہی اس بات پر زور دیا تھا کہ مختلف حالات اور مختلف ممالک میں پرولتاری آمریت کی نوعیت ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوگی۔

یوں لینن نے ایک نقطہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ جاگیرداری سے سرمایہ داری تک کے عبوری دور میں ابھرتی ہوئی بورژوازی کی آمریت کی عکاسی ایک شخص کی آمریت کرتی تھی۔ ایک طبقہ کسی فرد واحد کی شخصی حکمرانی کے ذریعے حکومت کر سکتا ہے۔ بورژوازی پر اس کے اطلاق کی حد تک ٹونی کلف اس تصور کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہے۔ لیکن اس کے استدلال سے صرف یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ پرولتاریہ کی

صورت میں ایسی تبدیلی ناممکن ہوگی۔ کیونکہ فرد واحد کی حکمرانی کا مطلب ہے مطلق العنانی یعنی فرد واحد کی من مرضی پرمبنی آمریت جس میں اس حکمران طبقے کو کوئی سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوتے جن کے مفادات کی نمائندگی وہ آخری تجزیئے میں کرتا ہے۔ لیکن لینن نے یہ تبصرہ صرف یہ ثابت کرنے کیلئے کیا تھا کہ بعض صورتوں میں پرولتاریہ کی آمریت فرد واحد کی آمریت کی شکل میں بھی حقیقت کا روپ دھار سکتی ہے۔ لینن نے اس تصور کو مزید ترویج نہیں دی۔ لیکن آج ہم روس، مشرقی یورپ، چین، کیوبا اور دیگر مسخ شدہ مزدور ریاستوں کے تجربے کی روشنی میں نہ صرف سماج کی حالیہ بلکہ ماضی کی تبدیلیوں کو بھی گہرائی میں سمجھ سکتے ہیں۔

بعض مخصوص حالات میں پرولتاریہ کی آمریت فرد واحد کی آمریت کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ ہم ایک صحت مند ریاست کی نہیں بلکہ اس مسخ شدہ شکل کی بات کر رہے ہیں جو ریاست کی اس طبقے سے علیحدگی کی صورت میں ابھر سکتی ہے جس کی وہ نمائندگی کرتی ہے۔ سٹالنسٹ روس میں یہی صورتحال تھی۔ جب ہم بورژوا سماج کے ارتقا کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے کہ موجود سماجی تضادات میں فرد واحد کی مطلق العنانی اس سماج کے ارتقا کی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ کرامویل اور نپولین کی حکمرانی اس بات کو واضح طور پر ثابت کرتی ہے۔ اگرچہ دونوں کی بنیاد بورژوا تھی لیکن ایک مخصوص مرحلے پر مطلق العنانیت سرمایہ دار سماج کے ارتقا کیلئے ایک سودمند عامل کی بجائے بورژوا پیداوار کے بھرپور اور آزاد ارتقا کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔

تاہم مطلق العنانیت کا آمرانہ نظام بغیر کوئی تکلیف دیئے نہیں مٹ جاتا۔ فرانس اور برطانیہ میں بورژوا مطلق العنانی کو بورژوا جمہوریت میں تبدیل کرنے کیلئے اضافی سیاسی انقلابات کی ضرورت پڑی تھی۔ لیکن بورژوا جمہوریت کے بغیر پیداواری قوتوں کو ان حدود تک بھرپور اور آزادانہ ترقی دینا ناممکن ہو جاتا جو سرمایہ داری کے تحت ممکن ہو سکتی ہے۔ اگر اس کا اطلاق بورژوازی کے تاریخی ارتقا پر ہوتا ہے تو کیا ایک پسماندہ اور الگ تھلگ ملک میں پرولتاریہ پر اس کا اطلاق کہیں زیادہ نہیں ہوگا۔ جہاں پرولتاریہ کی آمریت انحطاط پذیر ہو کر سٹالن یعنی ایک شخص کی آمریت بن گئی تھی؟

اس لئے کہ روسی پرولتاریہ سوشلزم کی راہ اختیار کر سکے ایک نیا انقلاب، ایک اضافی سیاسی انقلاب ضروری تھا جو بوناپارٹسٹ پرولتاری ریاست کو مزدور جمہوریت میں تبدیل کر دیتا۔ یہ ماضی کے تجربات کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ ہے۔ جس طرح سرمایہ داری کئی طوفانی متضاد مراحل سے گزری تھی (ابھی

ان کا خاتمہ نہیں ہوا ہے جس کی گواہی ہمارا اپنا عہد دیتا ہے)، وہی صورتحال روس میں پرولتاریہ کی حکمرانی کو درپیش تھی۔ اسی طرح باہمی ردعمل کے ذریعے مشرقی یورپ اور چین بھی اسی پرولتاری بوناپارٹسٹ مرحلے سے گزرے۔

یہ عجیب وغریب تصور کہ ایک مزدور ریاست کی پیدائش ہر گناہ اور خرابی سے پاک ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ ایک کامل مزدور جمہوریت کی کلاسیکل شکل میں ظاہر ہونا چاہیے ورنہ اس کی مذمت لازماً ایک ''نئی طبقاتی ریاست'' کے طور پر کی جانی چاہیے، ایک مابعد الطبیعاتی خیال ہے جس کا مارکسزم کے مادی طریقہ کار سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ رسمی منطق اور تجریدی فکر کی پیداوار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں سٹالنسٹ انحطاط پذیری کی وضاحت دیئے گئے تاریخی حالات اور ریاست کے باہمی رشتے میں ملتی ہے نہ کہ ماورائے تاریخ تجریدوں میں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی تک روسی ریاست کی طبقاتی نوعیت کا تعین فیصلہ کن طور پر نہیں ہوسکا ہے۔ لیکن ریاستی سرمایہ داری کے خالی خولی اور سطحی نظریئے کے مبلغین سابقہ سوویت یونین میں اس وقت رونما ہونیوالے عوامل پر روشنی ڈالنے سے قطعاً قاصر ہیں۔ اگر سرمایہ داری کی بحالی کی طرف حالیہ تحریک ناکام ثابت ہوتی ہے تو بہت سی تباہیوں اور شورشوں کے بعد بالآخر معاشی عامل (ملکیتی رشتے) فیصلہ کن ثابت ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ بالآخر کون سی ملکیتی شکلیں برتری حاصل کریں گی قومیائی گئی یا نجی ملکیت۔ یہ جدوجہد اب بھی جاری ہے لیکن اس کے نتیجے کا فیصلہ نہیں ہوسکا ہے۔ بلاشبہ اگر ہم اس بات کو تسلیم کرلیں کہ پچھلے ساٹھ، ستر سال سے روس میں سرمایہ داری (یہاں تک کہ ''ریاستی سرمایہ داری'' بھی) قائم رہی ہے تو اس صورت میں یہ ایک ایسی معمولی نوعیت کی تفصیل ہے جس کے بارے میں ہمیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

ایک اذیت ناک تجربے سے گزرنے کے بعد روسی مزدور طبقے کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت اور سرمایہ داری میں واقعی ایک بنیادی فرق موجود ہے۔ جب یہ سطریں تحریر کی جارہی ہیں تو روسی کان کن ماسکو کی بورژوا حکومت کے خلاف ہڑتال پر ہیں۔ مزدوروں کی ایک روز افزوں تعداد ابھرتے ہوئے سرمایہ دار طبقے کی لوٹ مار کیخلاف قومیائی ہوئی صنعت کی باقیات کے دفاع کی ضرورت کو محسوس کررہی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی طور بیوروکریسی کے آگے ہتھیار ڈال رہے ہیں؟ قطعاً نہیں۔ روسی مزدور ابھرتی ہوئی بورژوازی کے خلاف اپنے طریقوں سے لڑیں گے

یعنی ہڑتالوں، مظاہروں اور عام ہڑتالوں کے ذریعے۔ اس راستے پر چلتے ہوئے وہ جلد ہی ماضی کی عظیم روایات کو دوبارہ دریافت کرلیں گے۔ لیکن اس کی اولین شرط سرمایہ دارانہ ردانقلاب کے فوری خطرے کیخلاف بھرپور جدوجہد کی ضرورت کا ادراک ہے۔

جدوجہد کے ذریعے سرمایہ دارانہ ردانقلاب کا راستہ روک لینے کے بعد انہیں اپنی قوت کا احساس ہوگا اور وہ ایسا شعور بھی حاصل کریں گے جو انہیں بیوروکریسی کا تختہ الٹنے اور ایک اعلیٰ سطح پر صحت مند مزدور جمہوریت کو منظّم کرنے کے قابل بنائے گا۔ ایسی تبدیلی 1917ء کی کمزور اور غربت زدہ سوویت ریاست کی طرف واپسی کے مترادف نہیں ہوگی۔ ان ٹیکنیکی اور سائنسی پیش رفتوں کو بنیاد بنا کر جو ماضی میں قومیائی ہوئی معیشت کے باعث ممکن ہوئی تھیں وہ اس قابل ہوں گے کہ فوری طور پر کام کے ہفتے میں کمی کا فرمان جاری کرسکیں۔ ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پانچ سالہ منصوبوں میں جن میں عوام کی شرکت اور جمہوری کنٹرول شامل ہوگا، تمام صورتحال تبدیل ہوجائیگی، ترقی کی موجودہ سطح کے مدنظر فوری طور پر بتیس گھنٹے کا ہفتہ متعارف کروانا ممکن ہوسکتا ہے جس کے بعد اوقات کار میں مزید کمی اور عمومی معیار زندگی اور کلچر کے معیار کو بہتر بنایا جاسکے گا۔ تب مزدور ریاست اس مثالی صورتحال سے کسی حد تک مطابقت پیدا کرسکے گی جس کے بارے میں مارکس اور لینن نے لکھا تھا۔

آج کے دور میں ''ریاستی سرمایہ داری'' کا نظریہ

سوویت یونین کی طبقاتی نوعیت کے بارے میں بحث محض ایک علمی مشق نہیں بلکہ یہ نہایت سنجیدہ عملی نتائج کی حامل ہے۔ ٹراٹسکی نے پہلے ہی انتباہ کردیا تھا کہ جو رجحان ریاستی سرمایہ داری کے غلط نظریئے کو اختیار کرتا ہے اسے ''سامراج'' کا مجہول آلہ کار بننے کا خطرہ درپیش ہوگا۔ لیکن عین اس وقت جب روس اور مشرقی یورپ میں سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک جاری ہے، ریاستی سرمایہ داری کے نظریات ایک انتہائی مہلک کردار ادا کررہے ہیں۔ کلف اور اس کے حامیوں میں نظری گہرائی کی کمی اور اس کے سطحی پن کا ثبوت یہ ہے کہ وہ اس وقت روس میں ہماری نظروں کے سامنے رونما ہونیوالے عوامل کی وضاحت سے قطعاً قاصر ہیں۔ وہ ہر چیز محض اس اوچھے جملے کے ذریعے مسترد کردیتے ہیں کہ بیوروکریسی نے راستہ بدل لیا ہے! جس سے موجودہ یا ماضی کے روسی سماجی نظام کی قطعاً کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔ یہ ہمیں

پیداواری رشتوں، ریاست کی طبقاتی نوعیت یا اس وقت وقوع پذیر ہونے والے ردانقلاب کے سماجی مواد کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا، یہ بالکل منطقی چیز ہے۔ ریاستی ملکیت کی انقلابی اہمیت کو جھٹلانے کے بعد ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کے محافظ اس حقیقت کو بھی جھٹلانے پر مجبور ہیں کہ کوئی ردانقلاب واقع ہو رہا ہے! لہٰذا جب سچائی کا سامنا کرنے کا لمحہ آیا تو ریاستی سرمایہ داری کا تصور نہ صرف نظری طور پر دیوالیہ ثابت ہوا بلکہ عمل میں بھی تباہ کن ثابت ہوا ہے۔

کلف نے ٹراٹسکی کے سوویت یونین کی طبقاتی نوعیت کے تجزیے کو مارکسزم سے ''متصادم'' قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ اس کے مطابق ''ٹراٹسکی کے تجزیے میں ایک نہایت سنجیدہ نوعیت کی خامی تھی، ہیئت پسندی کی طرف قدامت پرستانہ جھکاؤ جو اپنی نوعیت کی وجہ سے ہی مارکسزم سے متضاد ہے جو کہ مواد کو ہیئت پر فوقیت دیتا ہے۔'' (30) یہی نقطہ نظر کلف کے ایک اور نمایاں ساتھی ہیلس ڈنکن کا ہے جو لکھتا ہے ''1927ء کے بعد سوویت یونین میں طبقاتی جدوجہد کا جو تجزیہ ٹراٹسکی نے کیا ہے وہ واضح طور پر غلط ثابت ہو چکا ہے۔'' (31) وہ آگے چل کر لکھتا ہے ''اس میں کوئی شک نہیں کہ 1928ء تک روس میں ایک نیا طبقہ اقتدار پر قابض ہو چکا تھا۔'' کلف کے نظریے کا ایک اور حامی کرس ہارمن کہتا ہے ''لیفٹ اپوزیشن اس بارے میں بالکل واضح نہیں تھی کہ وہ کس لئے لڑ رہی ہے۔ ٹراٹسکی کو مرتے دم تک یقین تھا کہ وہ مشینری جس نے اسے شکار کی طرح جا پکڑا اور قتل کر دیا، ایک مسخ شدہ مزدور ریاست تھی۔'' (32) ہارمن کا دعویٰ ہے کہ ٹراٹسکی اور اس کے حامیوں نے سٹالن ازم کے خلاف مدافعت ضرور کی لیکن ''روس کے بارے میں ان کے اپنے نظریات نے ان کے کام کو مزید دشوار بنا دیا۔'' (33)

1936ء میں ہی ٹراٹسکی نے ایک شاندار استخراج کی مدد سے پیش گوئی کر دی تھی کہ اگر مزدوروں نے اقتدار پر قبضہ نہ کیا تو بیوروکریسی ناگزیر طور پر ذرائع پیداوار کی انفرادی ملکیت کی طرف رخ پھیر لے گی اور ریاستی سرمایہ داری کے وکیلوں کا کیا ہوا؟ انفرادی ملکیت کی بحالی کی تحریک نے ان خواتین و حضرات کو ششدر کر دیا۔ وہ صنعت کی نجکاری اور منصوبہ بندی کے خاتمے کا کیا نعم البدل پیش کر سکتے تھے؟ یہ محض ایک نظری سوال نہیں بلکہ روس کے مزدور طبقے کے مفادات کے حوالے سے ایک نہایت ضروری سوال ہے۔ اس کا ایک ٹھوس جواب دینا ضروری ہے۔ ریاستی سرمایہ داری اس سے کیسے نمٹتی ہے؟

اس حقیقت کے باوجود کہ مغرب کے تمام بورژوا تبصرہ نگار اور بورژوا پریس سرمایہ داری کی بحالی کی ان تحریکوں کی کھلم کھلا پشت پناہی کر رہے ہیں ہارمن دعویٰ کرتا ہے کہ ''کمانڈ اکانومی سے منڈی کی معیشت

کی طرف حرکت آگے یا پیچھے کی جانب قدم نہیں ہے بلکہ یہ سرمایہ دارانہ استحصال کو ایک طریقے کی بجائے دوسرے طریقے سے منظّم کرنے کا قدم ہے!'' (34) کلف کے خیال میں ''نجکاری ایک غیر متعلقہ سوال ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آپ اس بات کو تسلیم کرلیں کہ سرمایہ دارانہ ردانقلاب کئی دہائیاں پہلے وقوع پذیر ہو چکا ہے تو یہ پوزیشن بالکل منطقی ہے۔اب وہ منمنا کر کہتے ہیں کہ وہ سابقہ سٹالنسٹ ریاستوں میں نجکاری کے اسی طرح مخالف ہیں جس طرح مغرب میں مگر یہ ایک اسرار ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔کیا ''سرمایہ داری'' بہرحال زیادہ ترقی پسند ہے؟ اس طرح سے تو اس پوزیشن کی وکالت کرنیوالے بد سے بدتر کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں! اس کے نتائج ان میں سے کچھ لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ان کے ایک نمایاں مقرر نے 1990ء کے سمر سکول میں یہ نقطہ نظر پیش کیا کہ ٹراٹسکی ''قومیائی گئی معیشت کے سلسلے میں کٹر عقیدہ پرست تھا۔'' قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو سوشلزم کی جانب پیش رفت کی شرط اولین قرار دیئے جانے کے تصور کو ہی متنازعہ قرار دینا دراصل ان کے سارے نظریئے میں مضمر ہے لیکن وہ ہم سے اس کے کیا نتائج اخذ کرنے کی توقع رکھتے ہیں؟

اگر نجکاری ''غیر متعلقہ'' سوال ہے اور جو کچھ روس میں رونما ہوا ہے وہ محض ایک ''ذیلی راستہ'' ہے تو اس کی مخالفت کیوں؟ یقیناً یہ بات غیر اہم ہونی چاہیے کہ ابھرتی ہوئی بورژوازی ریاستی سرمایہ داری کی جگہ لیتی ہے یا نہیں؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جن مزدوروں کو نجکاری سے خطرہ درپیش ہے انہیں چیزیں اتنی سادہ دکھائی نہیں دیتیں۔لیکن ریاستی سرمایہ داری کے نقطہ نظر سے دونوں چیزیں ایک ہی جیسی ہیں اس لئے ان کیلئے واحد ٹھوس پوزیشن مکمل غیر جانبداری ہونی چاہیے۔(اس کا اطلاق مغرب میں نجکاری کے سوال پر بھی ہونا چاہیے) تاہم اس نظریے کے حامیوں پر استقامت کا الزام کسی طور نہیں لگایا جاسکتا!

چاہے مشرق ہو یا مغرب، ماضی میں جو کچھ حاصل کیا گیا تھا اس کا دفاع ہر طبقاتی شعور رکھنے والے مزدور کا بنیادی فرض ہے۔روسی انقلاب کی واحد باقی بچ جانیوالی تاریخی دریافت قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت ہے۔یلسن کی حکومت جو بورژوازی کی حامی ہے اور جسے مغربی سامراج تحفظ اور فروغ دے رہا ہے قومیائی ہوئی معیشت کو تباہ کرنے، توڑنے اور نجکاری کے ذریعے بیچ ڈالنے کی کوشش کررہی ہے۔اگر وہ اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب اکتوبر انقلاب کی حاصلات کا مکمل خاتمہ ہوگا۔اس کا مطلب مسخ شدہ مزدور ریاست کی تباہی اور ایک نئی سرمایہ دار ریاست کا قیام ہوگا اور یہی روس کی ابھرتی

ہوئی بورژوازی اور مغربی سامراجیوں کا مقصد ہے۔ صورتحال اس سے زیادہ واضح نہیں ہوسکتی تھی اور اس کے باوجود ریاستی سرمایہ داری کا نظریہ چیزوں کو سر کے بل کھڑا کر کے زیادہ سے زیادہ پراگندگی پھیلانا چاہتا ہے۔

اکتوبر انقلاب کی کامیابی کے بعد سے مارکسسٹوں نے استقامت کے ساتھ ان قومی ملکیتی حقوق کا دفاع کیا ہے جو انقلاب کے بعد وجود میں آئے تھے۔ ہم سٹالنسٹ رجعت یا سٹالنسٹ پالیسیوں کی حمایت نہیں کرتے تھے۔ یہ پالیسیاں انقلاب کا دفاع کرنے کی بجائے اسے کمزور کرنے اور تباہ کرنے میں مدد دے رہی تھیں۔ آخر کار جیسا کہ ٹراٹسکی کا خیال تھا بیوروکریسی نے اپنی حیثیت مستحکم کرنے کی غرض سے سرمایہ داری کی بحالی کی راہ اپنالی۔ مشرقی یورپ اور روس میں گزشتہ چھ سالوں سے یہی کچھ ہو رہا ہے۔ کلف اور اس کے حامیوں کے نزدیک ریاستی سرمایہ داری نہ صرف روس، مشرقی یورپ اور دیگر سٹالنسٹ ممالک میں وجود رکھتی تھی جہاں نجی ملکیت کو ختم کیا جا چکا تھا بلکہ بظاہر 40-1930ء اور پچاس کی دہائیوں میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں بھی وسیع پیمانے پر موجود تھی۔ ہارمن کے الفاظ میں ''بہت سے نام نہاد ترقی پذیر ممالک میں، جہاں انفرادی سرمایہ دار گروہ بہت کمزور تھے اور معیشت کے صنعتی شعبے پر ریاستی غلبے کو نہیں روک سکتے تھے، ریاستی دخل اندازی بڑھ گئی۔'' وہ ریاستی سرمایہ داری کی مختلف اقسام کے حوالے سے مصر، شام، برازیل، ارجنٹائن، سپین، آئرلینڈ اور جنوبی کوریا کی مثالیں دیتا ہے۔

''اس (ریاست) کا رویہ بہت حد تک ویسا ہی تھا جیسا مشرقی یورپ کی ریاستوں کا تھا۔'' ہارمن مزید کہتا ہے کہ ''دنیا بھر میں 1930ء کی دہائی سے لیکر 1970ء کی دہائی تک یہ ایک ایسے رجحان کا اظہار تھا جس میں بحران کا شکار معیشتوں میں انتظامی اور ریاستی سرمایہ دارانہ مداخلت کا سہارا لیا جاتا تھا۔ تاہم سرمایہ دارانہ تاریخ کا یہ مرحلہ اب اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ ریاست اب بھی دخل اندازی کرتی ہے مگر اس کی اثر انگیزی کم ہو رہی ہے۔ مغرب میں اس کا نتیجہ کلاسیکی کساد بازاری کی شکل میں نکلا ہے اور مشرق میں نوکر شاہیاں اس راستے سے بچ نکلنے میں روز افزوں دشواری محسوس کر رہی ہیں۔'' (35)

ہارمن ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے سے ہم آہنگ کرنے کیلئے حقائق کو بری طرح مسخ کرتا ہے۔ پیرون کے تحت ارجنٹائن اور ناصر کے تحت مصر نئے ریاستی سرمایہ دار سماج نہیں تھے بلکہ ایسی سرمایہ دارانہ معیشتیں تھیں جو ریاستی مداخلت کو استعمال کرتی تھیں جو کہ سامراجی دور کے تمام سرمایہ دار ممالک کی خصوصیت ہے تاکہ قومی بورژوازی کے مفادات کو بڑی سامراجی طاقتوں کیخلاف تحفظ فراہم کیا جاسکے۔

ہارمن کی منطق کے مطابق اگر ریاستی مداخلت کی وسعت کو مدنظر رکھا جائے تو ریاستی سرمایہ داری کا نظام عملاً آفاقی ہمہ گیریت کا حامل دکھائی دے گا! بظاہر سوویت یونین اور مغرب کے درمیان سرد جنگ اور کشیدہ تعلقات محض ایک بہت بڑی غلط فہمی کا نتیجہ تھے کیونکہ یہ دو سماجی نظاموں کے درمیان ایک بنیادی مخاصمت نہیں تھی اور آہنی پردے کے دونوں اطراف ریاستی سرمایہ داری پر مبنی ریاستیں صف آرا تھیں۔ اگر وہ سب بنیادی طور پر ایک جیسی ہی تھیں تو پھر جھگڑا کس بات کا تھا، سفارتی اور فوجی کھچاؤ اور اسلحے کی دوڑ کس لئے؟

ماسکو میں کلف کا ہم خیال ڈیوکلراوچ پوچھتا ہے ''ہم سرد جنگ کے خاتمے، سوویت یونین کے انہدام اور امریکہ کی طرف روس کے ابتدائی جھکاؤ کو کس طرح دیکھتے ہیں؟'' بین الاقوامی طور پر بورژوا مبصرین جو کچھ کہتے تھے اس کے باوجود اس کے خیال میں سٹالن ازم کی شکست وریخت امریکی سامراج کی فتح نہیں تھی۔ ''امریکیوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے گئے۔ 1989ء میں عوام کے ہاتھوں ہونیوالی شکستوں سے سنبھلنے کے بعد حکمران طبقے نے اندرونی اور خارجی طور پر اپنی حیثیت کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد دوستی کا واضح اظہار دونوں کیلئے بہت ضروری تھا۔ کریملن کے لئے اپنے عوام کو یقین دہانی کرانی ضروری تھی کہ برے دن گزر گئے ہیں اور اصلاحات انہیں منڈی کی معیشت پر مبنی خوشحال مستقبل کی طرف لے جائیں گی۔'' (36)

کوئی کس حد تک ذہنی انتشار کا شکار ہو سکتا ہے؟ ڈیوکراوچ کے مطابق سٹالن کی ٹوٹ پھوٹ کا نتیجہ ''اندرونی اور بیرونی'' طور پر ریاستی سرمایہ داری کے استحکام کی صورت میں برآمد ہوا ہے! لگتا یوں ہے کہ ڈیوکراوچ ماسکو میں ہونے کے باوجود کسی اور سیارے پر رہتا ہے۔ وہ پیداواری قوتوں کی زوال پذیری، انتشار، عوام کی مفلوک الحالی، سیاسی شورشوں اور فوجی تباہی کو نہیں دیکھ رہا جس کا سامنا روسی عوام کو ہے۔ نہیں، نہ صرف کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ کچھ ایسے پراسرار ذرائع سے جن کو صرف کراوچ ہی سمجھ سکتا ہے سابقہ نظام نے درحقیقت خود کو مضبوط کیا ہے! یہاں ہم مارکسزم کو خدا حافظ کہہ کر سائنس فکشن کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔

بظاہر روس اور مشرقی یورپ کی ''ریاستی سرمایہ داریاں'' اپنے مسائل پر قابو پانے کی غرض سے منڈی کی سرمایہ داری پر مبنی زیادہ روایتی شکل کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں۔ دوسرے الفاظ میں روس اور مشرقی یورپ میں برپا ہونے والی شورشیں خالصتاً ایسے حکمت عملی کے مسائل ہیں جنہیں حل کرنا سرمایہ دار طبقے کے مختلف دھڑوں کا کام ہے۔ ردانقلاب کے بنیادی نکتے نج کاری کو محض ایک چال خیال کیا گیا

کیونکہ ملکیت میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی تھی اور حصص کی فروخت محض ایک وسیلہ تھی تا کہ ''ریاستی سرمایہ دار'' ٹیکس اکٹھا کر سکیں! ان حضرات کے مطابق سوشلسٹ ایک قسم کی سرمایہ داری کیخلاف دوسری قسم کی سرمایہ داری کا دفاع نہیں کر سکتے۔ 1950ء کے عشرے کے شروع میں اس نقطہ نظر کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ٹونی کلف کوریا کی جنگ کے دوران غیر جانبدار رہا جب کہ شمالی کوریا کی مسخ شدہ مزدور ریاست سامراجی حملے کا شکار تھی۔ لیکن ویت نام کی جنگ کے دوران اپنی صفوں میں موجود طالب علموں اور پیٹی بورژوازی کے دباؤ کی وجہ سے امریکی سامراج کے خلاف ''ریاستی سرمایہ دار'' شمالی ویت نام کی حمایت کرنا فیشن میں داخل تھا۔ آج سابقہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کی منصوبہ بند معیشتوں کا رد انقلاب کے خلاف دفاع فیشن میں داخل نہیں لیکن رومانیہ کے طالب علموں کے سرمایہ داری کی بحالی کے مطالبات کی حمایت فیشن میں داخل ہے۔

زندگی غلط نظریئے سے ہمیشہ انتقام لیتی ہے۔ آج ریاستی سرمایہ داری کا تمام مصنوعی ڈھانچہ کھنڈر ہو چکا ہے۔ لیکن اپنی غلطی کو ایمانداری سے تسلیم کرنے کی بجائے وہ اس تباہ شدہ ڈھانچے سے چمٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اب یہ دعویٰ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ کوئی حقیقی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ یہ چیز انہیں فوراً ایک چھوٹی سی غلطی کی طرف لے جاتی ہے یعنی وہ انقلاب اور رد انقلاب میں تمیز کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں! ٹونی کلف اور دیگر حضرات کے نظریئے کی رو سے آج روس میں رد انقلاب کا واقع ہونا ناممکن ہے۔ کیونکہ بیوروکریسی ''ریاست کی مالک'' تھی اور وہی کردار ادا کر رہی تھی جو سرمایہ دار طبقے کا ہوتا ہے اس لئے فرق ہی کیا پڑا ہے؟ اس نقطہ نظر سے ریاستی ملکیت کی نجکاری کی جائے یا نہ کی جائے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ''سرمایہ داری'' پہلے سے موجود ہے۔ لہٰذا اگر آج کا روسی مزدور نام نہاد ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کو قبول کر لے تو وہ ابھرتی ہوئی سرمایہ داری کے مقابلے میں بالکل نہتا ہو جائے گا۔ محض یہی حقیقت نظریئے کی زبردست اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے کافی ہے جس کا جلد یا بدیر عمل میں ظاہر ہونا لازمی ہوتا ہے۔

ٹراٹسکی نے چوتھی انٹرنیشنل کے مینی فیسٹو میں مارکسسٹ پوزیشن واضح کر دی تھی۔ ''یہ درست ہے کہ کسی ایک ملک میں اور وہ بھی پسماندہ ملک میں، ذرائع پیداوار کے قومیائے جانے سے سوشلزم کی تعمیر یقینی نہیں ہو جاتی لیکن یہ سوشلزم کی بنیادی ضرورت یعنی پیداواری قوتوں کی منصوبہ بند ترقی کو آگے بڑھانے کی اہل ضرور ہوتی ہے۔ ذرائع پیداوار کے قومیائے جانے سے اس وجہ سے منہ پھیر لینا کہ ایسا

کرنا اپنے طور پر عوام کی خوشحالی کا باعث نہیں بن جاتا، ایک مضبوط بنیاد کو اس بنا پر تباہ کر دینے کے مترادف ہے کہ دیواروں اور چھت کے بغیر رہنا ناممکن ہے۔ایک طبقاتی شعور رکھنے والا مزدور جانتا ہے کہ پہلے سے حاصل شدہ مراعات کا تحفظ کئے بغیر مکمل آزادی کیلئے کامیاب جدوجہد نا قابل تصور ہے چاہے یہ کتنی معمولی کیوں نہ ہوں۔اس لئے سرمایہ دارانہ رشتوں کیخلاف منصوبہ بند معیشت جیسی عظیم الشان فتح کا دفاع اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔جو لوگ پہلے سے فتح کی گئی پوزیشنوں کا دفاع نہیں کر سکتے وہ کبھی بھی نئی فتوحات حاصل نہیں کر سکتے۔''(37)

باب نمبر 4: سٹالنزم کی نوعیت

1 ۔لینن مجموعہ تصانیف ''ریاست'' جلد 29 صفحہ 477

2۔ ایم ای ایس ڈبلیو۔ اینگلز ڈبلیو بورگییس ۔جلد تین صفحہ 502

.3۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری صفحہ 54

4۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 32 صفحہ 48

5۔ ٹراٹسکی ۔لیفٹ اپوزیشن کا چیلنج ۔1928-1929 صفحہ 304-305

6۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں 1929 صفحہ 178-179

7۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں ۔1934-35 ۔صفحہ 169

8۔ ایم ای ایس ڈبلیو۔ اینگلز ، ریاست ، خاندان کی ابتدا اور نجی ملکیت ۔صفحہ 194

9۔ ایضاً ۔ ایضاً صفحہ 196

10۔ ایضاً ۔ ایضاً صفحہ 201

11۔ لیون ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری ۔صفحہ 277

12۔ ٹراٹسکی ۔مارکسزم کے دفاع میں ۔صفحہ 227

13۔ ٹراٹسکی ، جرمنی ، جرمنی میں فاشزم کیخلاف جدوجہد کا واحد راستہ ۔صفحہ 276

14۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں ۔1939-40 صفحہ 410

15۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری ۔صفحہ 248

16۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں 1937-38 صفحہ 36

17۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں 1933-34 ۔صفحہ 113

18۔ ٹراٹسکی ۔تحریریں 1933-34 صفحہ 19

19۔ ٹراٹسکی ۔مارکسزم کے دفاع میں ۔صفحہ 24 نیویارک ایڈیشن 1970

20۔ ٹراٹسکی مارکسزم کے دفاع میں۔صفحہ 65-66

21۔ بی ریزی لا بیورو کریٹائزیشن ڈومانڈی۔صفحہ 31

22۔ ایضاً صفحہ 56

23۔ ایضاً صفحہ 72-74

24۔ میکس سچ مین۔افسر شاہانہ انقلاب۔صفحہ 32

25۔ ٹی کلف۔سٹالنسٹ روس کی نوعیت۔صفحہ 45

26۔ بینز کلف اور ہارمین،روس،مزدور ریاست سے ریاستی سرمایہ داری تک۔صفحہ 11

27۔ ایضاً صفحہ 12

28۔ ایم ای ایس ڈبلیو۔ مارکس کا پی وی انھنکوف کو پیرس میں خط ۔ جلد ایک
صفحہ 523-524

29۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری۔صفحہ 245

30۔ ٹی کلف،روس مارکسی تجزیہ۔صفحہ 145

31۔ ٹی کلف اور دوسرے چوتھی انٹرنیشنل،سٹالنزم اور انٹرنیشنل سوشلسٹوں کی ابتداء صفحہ 8

32۔ بینز،کلف اور ہارمین،روس،مزدور ریاست سے سرمایہ داری تک۔صفحہ 35

33۔ ایضاً صفحہ 36

34۔ سی ہارمین اور ای مینڈل،ریاستی سرمایہ داری کی کمزوریاں۔صفحہ 79

35۔ سی ہارمین،مشرقی یورپ میں طبقاتی جدوجہد۔1945-83۔صفحہ 327

36۔ انٹرنیشنل سوشلزم نمبر 66 بہار 1995 صفحہ 4-12

37۔ ٹراٹسکی۔تحریریں 1939-40 صفحہ 199

باب5

جنگ سے ڈی سٹالنائزیشن تک

ایک بار پھر: منصوبہ بند معیشت کی فوقیت

دوسری جنگ عظیم پہلی سامراجی جنگ کا ہی تسلسل تھی۔ جرمن سامراج کو دنیا کی ازسرنو تقسیم کی ضرورت تھی۔کلازوٹز کے بقول جنگ دیگر ذرائع (پرتشدد) سے سیاست کا ہی تسلسل ہے۔ٹراٹسکی نے 1931ء میں ہی پیشن گوئی کردی تھی کہ اگر ہٹلر برسراقتدار آ گیا تو جرمنی روس کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔ لیگ آف نیشنز میں شرکت کے باوجود (جسے لینن ''چوروں کا باورچی خانہ'' کہتا تھا) مغربی جمہورتوں کے ساتھ کسی سمجھوتے تک پہنچنے کی سٹالن کی سفارتی کوششیں بارآور ثابت نہ ہوسکیں۔1938ء کے میونخ معاہدے کے بعد ہٹلر نے زیادہ قوت صرف کیے بغیر آسٹریا سے الحاق کرلیا،سوڈیٹن لینڈ کو ضم کر لیا اور پھر مارچ 1939ء میں چیکوسلواکیہ پر قبضہ کرلیا۔ جرمنی کے ساتھ جنگ سے ہر قیمت پر بچنے کی کوشش میں سٹالن نے ایک بالکل متضاد حرکت کی اور 23 اگست 1939ء کو ہٹلر کے ساتھ عدم جارحیت کا معاہدہ کرلیا۔ خارجہ امور کے کیسار لٹوینوف (جو کہ یہودی نژاد تھا) کی جگہ ویاچسلاف مولوٹوف کو لایا گیا۔

ٹراٹسکی نے اعلان کیا کہ ''حقیقت میں ہٹلر کے ساتھ معاہدے پر دستخط محض ایک اضافی پیمانہ ہے جس سے روسی بیوروکریسی کی انحطاط پذیری اور کامنٹرن سمیت عالمی مزدور طبقے کے لیے اسکی حقارت کو ناپا جاسکتا ہے۔''(ا) عام معاہدے کے علاوہ ایک ''اضافی خفیہ پروٹوکول'' بھی تھا جس کے تحت پولینڈ کو روسی اور جرمن دائرہ ہائے اثر میں تقسیم کرلیا گیا اور ایک متحدہ ملک کی حیثیت سے اس کا وجود ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ پالیسی پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی کے لیے نہایت شرمندگی کا باعث بنتی۔ سٹالن کی خوش قسمتی

ہے کہ 1938ء میں پولینڈ کی کمیونسٹ پارٹی کو اس بہانے تحلیل کر دیا گیا تھا کہ اس میں فاشسٹ گھس آئے ہیں! اس کے تقریباً تمام لیڈروں کو جو ماسکو میں جلاوطن تھے، گولی ماردی گئی۔ 9 ستمبر 1939ء کو سوویت وزیر خارجہ نے ماسکو میں نازی سفیر کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا، ''وارسا میں جرمن فوجوں کے داخلے کے سلسلے میں آپ کا بھیجا ہوا پیغام مجھے مل گیا ہے۔ براہ کرم میری طرف سے جرمن حکومت کو مبارکباد پیش کریں۔ (مولوٹوف)'' برطانیہ اور فرانس اس وقت تک جرمن جارحیت کو قبول کرنے کے لیے تیار تھے جب تک جرمن سامراج کے مفادات مشرق کی طرف رہیں تاہم پولینڈ پر حملے سے ان سامراجی ممالک کے ساتھ اس کی جنگ چھڑ گئی۔

ٹراٹسکی نے پیشن گوئی کی تھی کہ دوسری جنگ عظیم سوویت یونین کی قسمت کا فیصلہ کر دے گی یعنی یا تو اس کے باعث سٹالن حکومت کے خلاف ایک کامیاب سیاسی انقلاب آئے گا یا سرمایہ دارانہ ردانقلاب کی فتح ہوگی۔ اول الذکر صورت حال 1917ء کی طرح جنگ کے پیدا ہونے والی انقلابی کیفیت سے جنم لے گی۔ دوسری صورت کا امکان تب ہوگا اگر سرمایہ دار قوتیں روس کو فتح کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ جنگ کے غیر متوقع رخ اختیار کر جانے کے باعث جس کا نتیجہ سرخ فوج کی کامیابی کی صورت میں برآمد ہوا، یہ پیش بینی غلط ثابت ہوگئی۔ یہ عمل اس قدر پیچیدہ تھا کہ ٹراٹسکی جیسا غیر معمولی ذہین شخص بھی اس کی پیش بینی نہیں کر سکا۔ جنگ کے بعد اٹھنے والی انقلابی لہر کو سٹالنسٹ اور اصلاح پسند قیادت نے غلط راستے پر ڈال دیا۔

ٹراٹسکی پر سٹالنسٹ ابلاغ عامہ کی بہتان تراشیوں کے باوجود جو کہ اسے اور اس کے پیروکاروں کو فاشسٹ ایجنٹ قرار دیتا تھا، ٹراٹسکی نے سامراجی جنگ میں غیر جانبداری قطعاً اختیار نہیں کی۔ اگرچہ وہ سٹالنسٹ بیوروکریسی کا تختہ الٹنے کے لیے ایک سیاسی انقلاب کے حق میں تھا تاہم اس نے سامراجی حملے کی صورت میں سوویت یونین کے غیر مشروط دفاع کی ضرورت پر زور دیا۔ امریکی ٹراٹسکائٹس کے کچھ لیڈر جن میں ''نوکر شاہانہ اجتماعیت'' کے نظریئے کی وکالت کرنے والے میکس شاخت مین اور جیمز برن ہام زیادہ نمایاں تھے، سوویت یونین کے دفاع کے خلاف تھے۔ وہ پیٹی بورژوا رائے عامہ کے دباؤ کی عکاسی کر رہے تھے۔ جو ہٹلر سٹالن معاہدے کے بعد سٹالن ازم کے خلاف ہوگئی تھی۔ برن ہام کچھ عرصے کے بعد ٹراٹسکائٹس تحریک کو بالکل ہی چھوڑ گیا اور اپنی کتاب ''انتظامی انقلاب'' میں یہ دعویٰ کیا کہ دنیا ایک نئے قسم کے سماج کی طرف جارہی ہے جس پر منتظمین کی اشرافیہ حکومت کرے گی جب کہ سٹالن ازم، نازی

ازم اور نیوڈبل ازم محض ''منتظمانہ نظریات'' کے ارتقا کے مختلف مراحل تھے۔

معاہدے کے ایک ماہ بعد اور دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر 25 ستمبر 1939ء کو ٹراٹسکی نے اپنی پوزیشن بالکل واضح کر دی:

''فرض کریں کہ ہٹلر اپنے ہتھیاروں کا رخ مشرق کی طرف کر لیتا ہے اور ان علاقوں پر فوج کشی کرتا ہے جو سرخ فوج کے قبضے میں ہیں۔ ان حالات میں چوتھی انٹرنیشنل کے ساتھی کریملن کی اشرافیہ کے سلسلے میں اپنے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی کیے بغیر وقت کا سب سے اہم فریضہ سمجھتے ہوئے آگے آئیں گے اور ہٹلر کے خلاف مسلح مزاحمت پیش کریں گے۔ مزدور کہیں گے کہ 'ہم سٹالن کا تختہ الٹنے کا کام ہٹلر پر نہیں چھوڑ سکتے، یہ فریضہ ہمارا ہے۔' ہٹلر کے خلاف مسلح جدوجہد کے دوران انقلابی مزدور سرخ فوج کے عام فوجیوں کے ساتھ ہر ممکن دوستانہ تعلقات قائم کریں گے۔ ایک طرف ہٹلر کے خلاف ہتھیاروں سے ضرب لگائیں گے تو دوسری طرف بالشویک لینن اسٹ اگلے اور غالباً نزدیکی مرحلے پر سٹالن کا تختہ الٹنے کی راہ ہموار کرنے کے لیے پراپیگنڈا کریں گے۔ ہمیں اس طرح کے نعرے وضع کرنے چاہییں جن سے مزدوروں کو یہ واضح طور پر نظر آئے کہ ہم سوویت یونین میں کس چیز کا دفاع کر رہے ہیں (ریاستی ملکیت اور منصوبہ بند معیشت) اور کس چیز کے خلاف ہم ایک بے رحم جدوجہد کر رہے ہیں (طفیلی بیوروکریسی اور اس کی کامنٹرن)۔ یہ حقیقت ہماری نگاہوں سے ایک لمحے کے لیے بھی اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ سوویت بیوروکریسی کا تختہ الٹنے کا سوال سوویت یونین کے اندر ذرائع پیداوار کی ریاستی ملکیت کے تحفظ کے سوال کے مقابلے میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔''(2)

ہٹلر سٹالن معاہدہ، جس کے بارے میں ٹراٹسکی نے 1934ء میں ہی پیش گوئی کر دی تھی، بلاشبہ عالمی مزدور طبقے کے ساتھ ایک غداری تھی۔ لیکن لندن اور پیرس کی حکومتوں کی طرف سے غم و غصے کا اظہار قطعی طور پر منافقانہ تھا۔ اس دور کے سفارتی کاغذات کا ایک سرسری مطالعہ کرنے والا بھی ایک ہی نظر میں جان لے گا کہ برطانوی اور فرانسیسی سامراج کی پالیسی یہ تھی کہ روس کو الگ تھلگ رکھا جائے اور ہٹلر کو اس امید پر مشرق (چیکوسلواکیہ) میں رعائتیں دی جائیں کہ وہ انہیں بھول کر روس پر حملہ آور ہو جائے۔ وہ ایک ایسی صورتحال کا خواب دیکھ رہے تھے جس میں روس اور جرمنی ایک دوسرے سے لڑ کر نڈھال ہو جاتے اور اس کے بعد وہ آ کر دونوں کا صفایا کر دیتے۔ سٹالن نے محض پہل قدمی کرتے ہوئے برلن کے ساتھ ایک سمجھوتے پر دستخط کر دیئے اور اس طرح ہٹلر کو مغرب کی طرف رخ کرنے کی آزادی دے دی۔

ایک عمومی اصول کے طور پر ایک صحت مند مزدور ریاست بھی سرمایہ دار حکومتوں کے ساتھ چالوں میں ملوث ہوکر ان کے تضادات سے ماہرانہ انداز میں فائدہ اٹھاتی۔ جنگ سے بچنے کے لیے بعض اوقات کسی انتہائی رجعتی حکومت سے معاہدہ کرنا بھی ضروری ہوسکتا ہے جس کے ساتھ ساتھ اس کا تختہ الٹنے کے لیے تحریک کی حوصلہ افزائی اور حمایت بھی جاری رہتی ہے۔ مثال کے طور پر 1918ء میں برسٹ لٹوسک کے معاہدے کے حوالے سے صورتحال ایسی ہی تھی۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ سٹالن کی پالیسیوں کی وجہ سے ہی ہٹلر اقتدار میں آیا اور سوویت یونین کو شدید خطرہ درپیش ہوگیا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح سٹالن نے اس پالیسی پر عمل درآمد کیا اس کا لینن کے بین الاقوامی طریقوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ایک بار پھر عالمی مزدور طبقے کو روسی بیوروکریسی کے تنگ نظری پر مبنی قومی مفادات پر قربان کر دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے اس چالبازی نے سوویت یونین کو تحفظ نہیں دیا بلکہ اسے زیادہ بڑے خطرے سے دوچار کردیا۔

ایلیا اہرن برگ اپنی یاداشتوں میں لکھتا ہے کہ ''فرانس سے ماسکو واپس آنے کے بعد یہ دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ نازیوں کے بارے میں بھی کسی تنقیدی حوالے کا سختی سے نوٹس لیا جاتا تھا اور مجھ سے توقع رکھی جاتی تھی کہ میں جرمن سفارتخانے کے احاطے میں لیکچر دوں گا۔ نازی مظالم کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا جاتا تھا۔ جرمنی کے ساتھ تجارت کو عروج حاصل ہو رہا تھا اور ہر کسی کو بالواسطہ طور پر احساس دلا دیا گیا تھا کہ برلن کے ساتھ تعلقات اچھے اور دوستانہ ہیں۔''(3) 1939ء کے موسم خزاں سے سوویت یونین نے فاشزم مخالف پروپیگنڈا بالکل بند کر دیا تھا۔ اب فرانس اور برطانیہ دشمن بن گئے تھے۔ جیسا کہ مولوٹوف اسے بیان کرتا ہے ''پچھلے چند ماہ سے جارحیت اور جارح جیسے تصورات ایک نئے ٹھوس مواد کے حامل بن گئے ہیں اور انہوں نے نئے معنی اپنا لیے ہیں۔۔۔ اب جرمنی جنگ کے جلد از جلد خاتمے اور امن کے قیام کے لیے تگ ودو کر رہا ہے جب کہ فرانس اور برطانیہ جو کل تک جارحیت کے خلاف مہم چلا رہے تھے اب جنگ کو جاری رکھنا چاہتے ہیں اور امن کو قائم کرنے کے خلاف ہیں۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں، کردار تبدیل ہوگئے ہیں۔ اس لیے جمہوریت کی جدوجہد کے غلط جھنڈے تلے ہٹلر ازم کی تباہی، کے نام پر جنگ کرنا احمقانہ ہی نہیں مجرمانہ بھی ہے۔''(4)

سٹالن اور اس کا ٹولہ برلن کی خوشنودی کے حصول کے لیے ناقابل یقین حد تک چلے گئے۔ ذیل میں ایک جرمن سفارت کار کی ڈائری سے لیا گیا معاہدے کا جشن منانے کے لیے منعقدہ دعوت کا احوال

ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سٹالن ہٹلر سے مصالحت کے لیے کس حد تک جانے کو تیار تھا:

''جام صحت: دوران گفتگو جناب سٹالن نے بے ساختہ طور پر فیوہرر کا جام صحت کچھ یوں تجویز کیا، میں جانتا ہوں کہ جرمن قوم اپنے فیوہرر سے کس قدر محبت کرتی ہے لہٰذا میں ان کی صحت کا جام پینا پسند کروں گا۔ مسٹر مولوٹوف نے وزیر خارجہ اور سفیر شولن برگ کی صحت کے جام تجویز کیے۔ مسٹر مولوٹوف نے سٹالن کی طرف جام اچھالتے ہوئے تبصرہ کیا کہ سیاسی تعلقات میں یہ تبدیلی سٹالن کی وجہ سے آئی تھی جس کی مارچ کی تقریر کو جرمنی میں بہت بہتر طور پر سمجھا گیا تھا۔ جناب مولوٹوف اور جناب سٹالن نے بار بار عدم جارحیت کے معاہدے، جرمن روس تعلقات کے نئے دور اور جرمن قوم کے لیے جام تجویز کیے۔ رائخ وزیر خارجہ ربن تھروپ نے جواب میں مسٹر سٹالن کا جام صحت تجویز کرنے کے علاوہ سوویت حکومت اور جرمنی اور سوویت یونین کے درمیان تعلقات کی مزید بہتری کے لیے جام تجویز کیے۔'' (ہینک۔ ایک نازی سفارتکار، ماسکو 24 اگست 1939ء)

یہ ان تمام حدود سے تجاوز کرنے کے مترادف ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ایک حقیقی لینن اسٹ حکومت کو اپنی حفاظت کی غرض سے کسی بیرونی رجعتی حکومت کے ساتھ معاملات طے کرنے چاہئیں۔ اس کے بعد صورتحال مزید بدتر ہوگئی۔ ''خیر خواہی'' کے ثبوت کے طور پر سٹالن نے فاشزم کے خلاف لڑنے والے جرمنوں، یہودیوں اور کمیونسٹوں کو بے رحم گسٹاپو کے حوالے کر دیا۔ ان میں سے کم از کم ایک مارگریٹ بوبر نیومین نامی خاتون معجزانہ طور پر ہٹلر اور سٹالن کے جبری مشقت کے کیمپوں کے بارے میں کتابیں تحریر کرنے کے لیے زندہ بچ گئی۔ یہاں تک کہ امور داخلہ کے سربراہ لاورنٹی بیریا نے جیل خانوں کی انتظامیہ کو خفیہ حکم کے ذریعے منع کیا کہ جیل کے محافظ سیاسی قیدیوں کو فاشسٹ کہہ کر نہ بلائیں! یہ حکم صرف اس وقت واپس لیا گیا جب 1941ء میں ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ آئندہ پیش آنے والے خوفناک تصادم کے لیے عالمی مزدوروں کو تیار کرنے کے لیے یہ سب کچھ نامناسب تھا۔

سوویت یونین نے اپنی مغربی سرحدوں کو مضبوط بنانے کی خاطر واضح طور پر ایک مدافعانہ چال چلتے ہوئے تیز رفتاری سے اسٹونیا، لٹویا، لیتھوینیا، بیسا ربیہ اور شمالی بوکووینا پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اسکی فن لینڈ پر قبضے کی مہم بری طرح ناکام رہی جس سے تمام دنیا پر واضح ہو گیا کہ تطہیرات کے باعث سرخ فوج کمزور ہو چکی ہے۔ ہٹلر نے اس حقیقت کی جانب مناسب توجہ دیتے ہوئے اپنے جرنیلوں کے سامنے بھی اس پر تبصرہ کیا۔ وہ روس پر حملے کی پہلے ہی سے تیاری کر رہا تھا۔ لیکن سٹالن نے اس امکان کو بھی تسلیم کرنے سے

انکار کر دیا اور جرمنی کے ساتھ تعاون جاری رکھا۔ جب ہٹلر نے یوگوسلاویہ پر فوج کشی کی تو سٹالن نے بیلجیئم، یونان اور یوگوسلاویہ کے سفارتخانے بند کر دیئے اور اس طرح جرمن حکمرانوں کو اپنی رضا مندی سے آگاہ کر دیا۔

جب 1940ء میں جرمنی نے فرانس پر قبضہ کر لیا تو سٹالن کو یقین ہو گیا کہ وہ اپنی چالوں سے ہٹلر کی توجہ مغرب کی طرف مبذول کرانے اور سوویت یونین کی طرف سے ہٹانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ مولوٹوف نے فیوہرر (ہٹلر) کو مبارکباد کا پیغام بھی بھیج دیا! کامنٹرن کے تمام شعبوں کو یہی لائن اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس پالیسی سے فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کو یہ امید بندھی کہ شاید اس کا وجود قانونی طور پر برقرار رہے اور اسے اپنے اخبار لی ہیومنائٹ شائع کرنے کی اجازت بھی مل جائے۔ یہ خوش فہمی صرف اس وقت دور ہوئی جب کمیونسٹ پارٹی کے عام ارکان کو بڑے پیمانے پر گرفتار کر کے گولی سے اڑایا گیا۔ اس دوران پراودا اخبار نے نازی ذرائع ابلاغ سے بیانات نقل کیے کہ کس طرح روس کے ساتھ سمجھوتے کی وجہ سے جرمنوں کو ''مغرب میں اپنی مہم کو کامیابی سے آگے بڑھانے'' کا موقع فراہم ہوا ہے۔(6)

کریملن میں براجمان آقاؤں کا دراصل یہ خیال تھا کہ وہ سکون کے ساتھ جرمنی اور برطانیہ کی لڑائی کے منظر سے لطف اندوز ہونگے۔ ایک انقلابی بین الاقوامیت پر مبنی تناظر کو مکمل طور سے ترک کرنے بعد وہ سراب دیکھنے میں مگن تھے جب کہ ہٹلر ان کے خلاف تباہ کن ضرب لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی چیز نے سوویت یونین کو اس کے بدترین دشمن کے مقابلے میں نہتا کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز سے لے کر جون 1941ء میں ہٹلر کے روس پر حملہ آور ہونے تک روس سے نازی جرمنی کو ہونے والی برآمدات میں زبردست اضافہ ہوتا رہا۔ 1938ء سے 1940ء کے درمیان جرمنی کو برآمدات 85.9 ملین روبل سے بڑھ کر 736.5 ملین ہو گئیں جن سے ہٹلر کو جنگی تیاری میں بہت مدد ملی۔

تطہیرات کے نتائج

اس کے برعکس 1941ء میں سوویت یونین جنگی تیاری کے حوالے سے نہایت خستہ حالت میں تھا۔ تطہیری مقدمات میں اس کے جنرل سٹاف کا بہت بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا جس میں انتہائی قابل افسر بھی

تھے۔ سٹالن کی تطہیرات کی پھیلائی ہوئی تباہی محض سوویت یونین کی عسکری صلاحیت تک محدود نہ تھی۔ معیشت بھی اس سے بہت بری طرح متاثر ہوئی تھی۔ اب اس کا اعتراف وہ لوگ بھی کر رہے ہیں جو کل تک تطہیرات سمیت سٹالن کے ہر فعل کو جائز قرار دیتے تھے۔ کم وبیش اسی دور میں یال یونیورسٹی کے شائع کردہ ایک جائزے میں روسی معیشت پر تطہیرات کے تباہ کن اثرات کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے روزنامے میں اس رپورٹ کو بلاتبصرہ شائع کیا گیا تھا:

''رابرٹ امان لکھتا ہے، علاوہ ازیں 38-1937ء کی تطہیرات میں کیمیاوی صنعت سے تعلق رکھنے والے قابل ترین منتظمین اور سائنسدان یا تو جیلوں میں ڈال دیئے گئے یا انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔ تطہیرات کا براہ راست نشانہ بننے سے بچ جانے والے شل ہو کر رہ گئے تھے۔ ناکامی کی صورت میں سزائیں اس قدر شدید تھیں کہ ایسے فیصلے کرنے سے ہر قیمت بچنے کی کوشش کی جاتی تھی جن میں کوئی خطرہ، جدت یا ذاتی پہل قدمی کا شائبہ بھی موجود ہو۔

ان رویوں کے جاری رہنے سے کیمیاوی صنعت اور دیگر سوویت صنعتوں کی طویل المیعاد ترقی پر جو نقصان دہ اثرات مرتب ہوئے ہیں ان کے بارے میں جتنی مبالغہ آرائی کی جائے وہ کم ہے۔ دفاعی سامان تیار کرنے والی صنعتیں بھی اس سے محفوظ نہیں تھیں۔ ہالووے لکھتا ہے، سٹالن کی پالیسیوں سے سوویت ملٹری اور صنعتی قوت میں جو بھی اضافہ ہوا ہو لیکن 1930ء کی دہائی میں ہونے والی تطہیرات اور جبر و تشدد نے سوویت یونین کی دفاعی صلاحیت کو بہت بری طرح متاثر کیا تھا۔''(7)

جنگ کے آغاز میں سرخ فوج کی لڑاکا صلاحیت کو نقصان پہنچانے والا بنیادی عامل تطہیرات میں اس کے بہترین جرنیلوں اور کیڈروں کا خاتمہ تھا۔ اکتوبر انقلاب کے بعد باصلاحیت اور شاندار فوجی پرت سامنے آئی تھی جن میں کئی ایک انتہائی شاندار فوجی سوچ رکھتے تھے جیسے یاکر، تخاچیفسکی اور گامروغیرہ۔ یہ بات عام لوگوں کو معلوم نہیں کہ ''بلٹز کریگ'' (برق رفتار جنگ) جرمنوں کی ایجاد نہیں تھی۔ جرمن فوج نے اسے روسیوں سے نقل کیا تھا۔ جنگ سے بہت عرصہ قبل، جب کہ برطانیہ اور فرانس کے فوجی سربراہوں کو ابھی تک یقین تھا اگلی جنگ بھی پہلی جنگ کی طرح پوزیشن کی جنگ ہوگی، تخاچیفسکی کی غیر معمولی ذہانت نے اسے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر اکسایا کہ دوسری جنگ عظیم ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے ساتھ لڑی جائے گی۔ جب تخاچیفسکی اور اس کے ساتھیوں کو تطہیرات کے دوران قتل کر دیا گیا تو ان کی جگہ ورشیلوف، تیموشنکو اور بدیونی جیسے سٹالن کے لنگوٹیئے یاروں نے لے لی جن کا خیال تھا کہ آئندہ جنگ گھڑسوار فوج کے

ساتھ لڑی جائے گی! ورشیلوف جیسے دوسرے درجے کے اور نااہل آدمی کو وزارت دفاع کا سربراہ بنا دیا گیا جس کے اردگرد بھی اسی کی قبیل کے لوگ جمع تھے۔ سٹالن کی ان مخلوقات کو کلیدی عہدے ان کی ذاتی اہلیت کی بنا پر نہیں بلکہ حکمران ٹولے سے غلامانہ وفاداری رکھنے کی وجہ سے دیئے گئے تھے۔

سابق جرنیل گریگورنکو اس دوران مرکزی سوویت ملٹری اکیڈمی میں لیکچرار تھا۔ وہ فوجی تطہیرات کے تباہ کن اثرات کو کچھ اس طرح بیان کرتا ہے کہ ''اکیڈیمی نے ابھی کام شروع ہی کیا تھا کہ تخاچیفسکی، ابوریوچ، یاکر اور دیگر افسروں کے خلاف جھوٹے مقدمات نے تخاچیفسکی کی ترتیب دی ہوئی ہر شے کو مشکوک بنا دیا۔ سٹالن کو یہ اکیڈمی، سٹالن ازم مخالف فوجی مرکز، نظر آنے لگی اور اس کے خلاف مہم کا آغاز ہو گیا۔ گرفتاریاں 1936ء کے موسم سرما میں شروع ہوئیں اور 1937ء میں ان میں شدت آ گئی۔ تخاچیفسکی کا جمع کردہ انتہائی قابل عملہ تقریباً ختم کر دیا گیا۔

''ان عہدوں پر نااہل یا ناتجربہ کار لوگوں کو فائز کر دیا گیا۔ اس کے بعد نئے اساتذہ میں سے کچھ کو گرفتار کر لیا گیا جس سے باقی لوگ خوفزدہ ہو گئے اور اپنی ملازمتوں کے حوالے سے ان کا جوش و خروش ختم ہو گیا۔ پرانے اساتذہ کا ترتیب دیا ہوا نصاب اب استعمال نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ ''عوام دشمن'' تھے۔ نئے اساتذہ جلد بازی میں اپنے لیکچر کا خلاصہ تیار کرتے اور سٹالن کے نزدیک ناپسندیدہ نظریات پیش کرنے کے الزام سے بچنے کے لیے ان میں گھسے پٹے اور دقیانوسی تصورات شامل کر دیتے۔'' وہ مزید لکھتا ہے ''جنگ کے بارے میں ایگروف، تخاچیفسکی اور یاکر کا وضع کردہ نظریہ پس پشت ڈال دیا گیا۔'' (8)

1956ء میں خروشیف نے ان تمام باتوں کا اعتراف کر لیا:

''خصوصاً جنگ کے آغاز کے حوالے سے 41-1937ء کے دوران فوجی کمانڈروں اور سیاسی کارکنوں کو ختم کرنے کے انتہائی نقصان دہ نتائج برآمد ہوئے جو سٹالن کے شکوک و شبہات اور بہتان تراشیوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ ان سالوں کے دوران فوجی کیڈروں کے مخصوص حصوں کے خلاف جبر و تشدد کیا گیا جو لغوی معنوں میں کمپنی اور بٹالین کی سطح سے شروع ہو کر اعلیٰ فوجی مرکزوں تک محیط تھا۔ اس دوران سپین اور مشرق بعید میں فوجی تجربہ حاصل کرنے والے لیڈروں کے کیڈر کا تقریباً مکمل طور پر صفایا کر دیا گیا۔''

''فوجی کیڈروں کے خلاف وسیع پیمانے پر جبر و تشدد کی پالیسی سے فوجی ڈسپلن کو بھی نقصان پہنچا کیونکہ کئی سال تک ہر عہدے کے افسروں اور یہاں تک کہ پارٹی اور کوسومول (kosomol) میں

موجود سپاہیوں کو بھی یہ بات سکھائی جاتی تھی کہ اپنے سے بڑوں کو پوشیدہ دشمنوں کے طور پر بے نقاب کریں۔(ہال میں موجود لوگوں میں حرکت) یہ بالکل فطری امر ہے کہ اس کی وجہ سے جنگ کے پہلے عرصے میں فوجی ڈسپلن پر منفی اثرات مرتب ہوئے۔''

''اور جیسا کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں جنگ سے پہلے ہمارے پاس نہایت شاندار فوجی کیڈر موجود تھے جن کی پارٹی اور مادر وطن سے وفاداریاں شک وشبے سے بالاتر تھیں۔ یہاں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ ان میں سے جو لوگ جیلوں کی اذیتیں برداشت کرنے کے باوجود بچ گئے تھے انہوں نے جنگ کے ابتدائی دنوں سے ہی خود کو محبِّ وطن ثابت کر دیا اور مادر وطن کے لیے بہادری سے لڑے، یہاں میرے ذہن میں روکوسوفسکی (جس کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ جیل میں تھا)، گورباٹوف مارسکوف (جو موجودہ کانفرنس میں شریک ہے)، پوڈلاس (یہ ایک نہایت اعلیٰ کمانڈر تھا جو محاذ جنگ پر کام آ گیا) اور بہت سے دیگر کامریڈ آرہے ہیں۔تاہم ایسے بہت سے کمانڈر جبری مشقت کے کیمپوں اور جیلوں میں ختم ہوگئے اور دوبارہ کبھی فوج میں شامل نہیں ہوسکے۔ان تمام چیزوں نے وہ صورتحال پیدا کی جو جنگ کے آغاز پر موجود تھی اور جس سے ہماری مادر وطن کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔''(9)

ابھی تک دوسری جنگ عظیم کے سلسلے میں بہت سے غلط تصورات موجود ہیں، خصوصاً سٹالن کے کردار کے حوالے سے۔ایلک نووی (جو عام طور پر روس پر تبصروں کے حوالے سے خاصا تیز فہم ہے) کے مطابق ''جرمنی کی زبردست قوت روس سے زیادہ تھی اور مقبوضہ یورپ کی تمام تر صنعت پر اس کی دسترس تھی۔اس کی فوجیں پوری طرح مسلح تھیں اور یہ اسلحہ اور ساز وسامان میدان جنگ میں اپنی کارکردگی کا امتحان دے چکا تھا۔پچھلے عشرے میں زبردست کوششوں اور قربانیوں کے باوجود سوویت یونین معاشی اور فوجی لحاظ سے پیچھے رہ گیا تھا۔''(10)

حقیقت یہ ہے کہ سوویت یونین پر نازی حملے کے وقت سرخ فوج کی مجموعی فائر پاور جرمن فوج کے مقابلے میں زیادہ تھی۔اس کے باوجود سوویت افواج کو بہت تیزی سے گھیرے میں لے کر ختم کر دیا گیا یہ بے مثال تباہی کسی معروضی کمزوری کا نہیں بلکہ بری قیادت کا نتیجہ تھی۔سرخ فوج کے بہترین کیڈروں کو ختم کرنے کے بعد سٹالن کو ہٹلر کے ساتھ اپنی چالبازیوں پر اتنا اندھا اعتماد تھا کہ اس نے ان بے شمار رپورٹوں پر کوئی کان نہیں دھرا جن میں اطلاعات دی گئی تھیں کہ جرمن حملے کی تیاری کر رہے ہیں۔متوقع جرمن حملے کے پیش نظر سوویت یونین کی مغربی سرحد پر ایک زبردست دفاعی حصار یعنی منسک کا قلعہ بند علاقہ قائم کیا

گیا تھا جسے سٹالن کے احکامات پر توڑ دیا گیا۔ بظاہر اس کا مقصد برلن کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔ گریگورینکو، جس نے جنگ سے قبل ان قلعہ بندیوں کی تعمیر پر کام کیا تھا، ان کے گرائے جانے پر اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''قلعہ بندیوں کا مقصد قابل بھروسہ طریقے سے حملے کی غرض سے جمع ہونے والی فوج کو ڈھال مہیا کرنا اور دشمنوں کی طرف سے اس اجتماع کو تتر بتر کرنے کی کوششوں کو ناکام بنانا تھا۔ جب فوج حملہ کرتی تو یہ قلعہ بند علاقے بھی گولہ باری کے ذریعے اپنے فوجیوں کی مدد کرتے۔ اس کے برعکس ہمارے مغربی قلعہ بند علاقوں نے ان میں کوئی بھی فریضہ ادا نہیں کیا۔ دشمن پر ایک بھی گولہ چلائے بغیر انہیں منہدم کر دیا گیا۔''

''مجھے معلوم نہیں کہ مستقبل کے مورخ ہمارے عوام کے خلاف کیے گئے اس جرم کی وضاحت کس طرح کریں گے۔ ہم عصر تاریخ دان اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں خود بھی کوئی وضاحت پیش نہیں کر سکتا۔ سوویت حکومت نے بحیرہ بالٹک سے لے کر بحیرہ اسود تک ساری مغربی سرحد پر عوام سے اربوں روبل (میرے اعداد و شمار کے مطابق یہ 120 ارب روبل سے کم نہیں) نچوڑ کر نا قابل تسخیر قلعہ بندیاں تعمیر کی تھیں۔ پھر اس کے بعد جنگ سے کچھ ہی عرصہ پہلے یعنی 1941ء کے موسم بہار میں 1200 کلومیٹر طویل ان قلعہ بندیوں میں طاقتور دھماکے گونج اٹھے۔ سٹالن کے ذاتی حکم پر لوہے اور کنکریٹ سے بنی ہوئی یہ قلعہ بندیاں جن میں ایک، دو یا تین موکھے (توپوں کے لیے بنائے گئے جھروکے) کمانڈ اور آبزرویشن پوسٹ موجود تھیں۔ ہزاروں مستقل قلعہ بندیاں دھماکے سے اڑا دی گئیں۔ ہٹلر کے باربروسا منصوبے کے لیے اس سے بہتر تحفہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔''(11)

جیسا کہ خروشیف نے وضاحت کی تھی اگر سٹالن نے یہ مجرمانہ حرکات نہ کی ہوتیں تو سوویت یونین جرمن حملے کے وقت یوں بے خبری میں نہ دھرا جاتا:

''کیا ہمارے پاس ایسی تیاریوں کے لیے درکار وقت اور صلاحیتیں موجود تھیں؟ ہاں ہمارے پاس وقت بھی تھا اور صلاحیتیں بھی۔ ہماری صنعت پہلے ہی اتنی ترقی یافتہ تھی کہ وہ سوویت فوج کو اس کی ضرورت کی ہر شے مہیا کر سکتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ یوکرائن، شمالی قفقاز اور ملک کے دیگر مغربی علاقوں پر دشمن کے قبضے کے نتیجے میں ہم دوران جنگ اپنی آدھی صنعت اور اہم صنعتی اور زرعی پیداوار دینے والے علاقوں سے ہاتھ دھو چکے تھے اس کے باوجود سوویت یونین ملک کے مشرقی علاقوں میں ملک کے

مغربی علاقوں سے لائی ہوئی مشینری نصب کر کے فوجی ساز وسامان جمع کرنے اور اپنی مسلح افواج کو وہ تمام چیزیں مہیا کرنے کے قابل ہو گیا جو دشمن کو تباہ کرنے کے لیے ضروری تھیں۔

اگر ہماری صنعت کو فوج کو ضروری سامان مہیا کرنے کے لیے وقت پر مناسب انداز میں متحرک کیا جاتا تو ہمارے جنگ میں ہونے والے نقصانات یقیناً کم ہوتے۔

تاہم اسے وقت پر متحرک نہیں کیا گیا اور جنگ کے ابتدائی دنوں میں ہی یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ ہماری فوج اچھی طرح مسلح نہیں تھی اور ہمارے پاس کافی تعداد میں توپیں، ٹینک اور ہوائی جہاز موجود نہیں تھے جن کی مدد سے دشمن کو پیچھے دھکیلا جا سکتا۔

سوویت سائنس اور ٹیکنالوجی نے جنگ سے پہلے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں کے نہایت شاندار نمونے تیار کیے تھے۔ لیکن ان کی بڑے پیمانے پر تیاری کو منظّم نہیں کیا گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جنگ شروع ہونے کے بعد ہی فوجی ساز وسامان کو جدید بنانے کا کام شروع کیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سوویت سرزمین پر دشمن کے حملے کے وقت ہمارے پاس پرانی مشینری بھی کافی تعداد میں موجود نہیں تھی کیوں کہ اسے اسلحہ کی تیاری میں استعمال نہیں کیا جا رہا تھا اور نہ ہی نئی مشینری کافی تعداد میں موجود تھی جسے ہم نے اسلحہ کی تیاری کے لیے متعارف کروانے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔

فضائی توپ خانے کی صورت حال خصوصاً بہت خراب تھی اور ہم نے ٹینک شکن گولوں کی پیداوار کو بھی منظّم نہیں کیا تھا بہت سے قلعہ بند علاقے اس وقت نا قابل دفاع ثابت ہوئے جب ان پر حملہ ہوا کیونکہ وہاں سے پرانے ہتھیار ہٹا لیے گئے تھے اور نئے ہتھیار ابھی نصب نہیں ہوئے تھے۔ افسوس ہے کہ یہ سلسلہ صرف توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں تک ہی محدود نہیں تھا۔ جنگ کے آغاز پر ہمارے پاس اتنی رائفلیں بھی موجود نہیں تھیں کہ ہم جنگ کے لیے بھرتی ہونے والوں کو مسلح کر سکیں۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں میں نے کامریڈ مالنکوف کو کیف سے ٹیلی فون پر بتایا کہ عوام نے نئی فوج کے لیے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ اسلحہ مانگ رہے ہیں۔

مالنکوف نے جواب دیا، ہم آپ کو اسلحہ نہیں بھیج سکتے۔ ہم اپنی تمام رائفلیں لینن گراڈ بھیج رہے ہیں آپ کو اپنی مدد کے تحت خود کو مسلح کرنا پڑے گا۔ (حال میں موجود لوگوں میں حرکت ہوئی) اسلحہ کی یہ صورتحال تھی۔'' (12)

اس حقیقت کے باوجود کہ سرخ فوج کی مجموعی فائر پاور جرمنوں سے زیادہ تھی، تطہیرات نے اسے

بالکل اپاہج بنا کر رکھ دیا۔ یہی وہ فیصلہ کن عنصر تھا جس نے 1941ء میں ہٹلر کو حملے کی ترغیب دی۔ نیورمبرگ مقدمے میں مارشل کیٹل نے گواہی دی کہ بہت سے جرمن جرنیلوں نے ہٹلر کو روس پر حملے کے خلاف خبردار کیا تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ سرخ فوج ایک ناقابل تسخیر قوت ہے۔ اسے مسترد کرتے ہوئے ہٹلر نے کیٹل کو بنیادی وجہ بتائی، ''بہترین اعلیٰ افسروں کا خاتمہ سٹالن 1937ء میں کر چکا ہے اور نئی نسل ابھی ویسے ذہن مہیا نہیں کر سکتی جن کی انہیں ضرورت ہے۔'' 9 جنوری 1941ء کو روس پر حملے کی تیاری کے سلسلے میں ہونے والی ایک میٹنگ میں ہٹلر نے جرنیلوں سے کہا ''ان کے پاس اچھے جرنیل موجود نہیں ہیں۔''(13)

گریگورینکو لکھتا ہے، ''ہماری ابتدائی شکست کا باعث اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز لوگ تھے۔ ہزاروں قابل فوجی کمانڈر برطرف کر دیئے گئے تھے، سرحدی فضائی اڈوں کو مناسب طور پر ترقی نہیں دی گئی تھی۔ ہمارا فضائی دفاع بالکل ناکافی تھا، ہمارے ٹینک یونٹوں اور ٹینک شکن دفاع کو سٹالن کی ضد کے باعث جنگ سے فوراً پہلے بہت حد تک کم کر دیا گیا تھا۔ ہمارے قلعہ بند علاقوں کو تباہ کر دیا گیا اور ہمارے فوجیوں کی تربیت زمانہ امن کے تقاضوں کے مطابق ہوئی تھی۔ ہم تیار نہیں تھے۔ ہم نے جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد اس مجرمانہ عدم تیاری کی قیمت ادا کی۔ میں نے سٹالن کو بڑا مجرم گردانا مگر میں نے ورشیلوف، تیموشنکو، گولوکوف اور ژوکوف کا ذکر بھی کیا۔ ہماری ناکامیوں کے لیے فاشسٹوں کو الزام نہیں دیا جا سکتا بلکہ ان کے لیے ہم خود ذمہ دار ہیں۔''

''ریکارڈ روم میں رکھا جائے''

وسط جون 1941ء تک ہٹلر سوویت سرحد پر زبردست فوجی وسائل جمع کر چکا تھا۔ 40 لاکھ جرمن فوجی سرحد پر حملے کی غرض سے جمع ہو چکے تھے۔ ان کے علاوہ 3500 ٹینک، تقریباً 4000 طیارے اور 5000 توپیں اور مارٹر بھی تھے۔ اس جنگی تیاری کو خفیہ رکھنے کی کوششیں کی گئیں لیکن اس کے بے پناہ حجم کے باعث سرحدی یونٹوں، سوویت خفیہ سروس اور یہاں تک کہ برطانوی اور امریکی حکومتوں کے اہلکاروں کی طرف سے بھی بے شمار رپورٹیں سوویت حکومت کو پیش کی گئیں۔ سٹالن نے ان رپورٹوں پر عمل کرنے کی بجائے ان پر ''ریکارڈ روم میں رکھا جائے'' یا ''فائل میں لگا دیا جائے'' لکھ دیا۔ اس کی تصدیق جنرل

ژوکوف نے اپنی کتاب ''Reflections and Reminiscences'' میں کی ہے۔ جب سوویت فوجی کمان نے سوویت فوج کو الرٹ کرنے کے لیے اجازت طلب کی تو سٹالن نے انکار کر دیا۔ اس نے یہ بات تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا کہ ہٹلر حملہ کرے گا۔ ائر مارشل اے نو ویکوف لکھتا ہے ''جرمن طیارے سوویت یونین کی حدود کی فضائی خلاف ورزیاں کر رہے تھے لیکن ہمیں انہیں روکنے کی اجازت نہیں تھی۔''(15)

کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی بیسویں کانگریس میں تقریر کرتے ہوئے خروشیف نے کہا کہ 3 اپریل 1941ء کو چرچل نے سوویت یونین میں اپنے سفیر سٹیفورڈ کرپس کے ذریعے ذاتی طور پر سٹالن کو خبردار کیا کہ جرمنوں نے سوویت یونین پر حملے کی غرض سے اپنے فوجی یونٹوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ چرچل نے اپنی تحریروں میں اس بات کی تصدیق کی ہے کہ اس نے ''سٹالن کو خبردار کرنے اور اس کو درپیش خطرے کی طرف توجہ دلانے'' کی کوشش کی تھی۔ چرچل نے 18 اپریل اور اس کے بعد کے دنوں میں اپنے پیغامات میں بار بار اس پر زور دیا۔ خروشیف نے کہا ''تاہم سٹالن نے ان انتباہوں کو نظر انداز کر دیا۔ اس سے بڑھ کر سٹالن نے یہ حکم دیا کہ اس قسم کی معلومات پر سنجیدگی سے کان نہ دھرے جائیں تا کہ ایسا نہ ہو کہ اس سے فوجی کارروائیوں کا آغاز ہو جائے۔''

''ہمیں یہ بات زور دے کر کہنی چاہئے کہ سوویت علاقوں پر جرمنوں کے فوجی حملے کے متعلق معلومات ہمارے اپنے فوجی اور سفارتی ذرائع سے بھی حاصل ہو رہی تھیں تاہم چونکہ لیڈرشپ کا مزاج ایسی معلومات کے خلاف تھا اس لیے ایسے اعداد و شمار بھجوانے والے ان کی جانچ پڑتال احتیاط سے کرتے تھے اور خوف کا شکار رہتے تھے۔''

''مثال کے طور پر 6 مئی 1941ء کو سوویت ملٹری اتاشی کیپٹن فورڈنتسوف نے برلن سے اطلاع بھیجی کہ سوویت شہری بوزر نے بحریہ کے ڈپٹی اتاشی کو بتایا ہے کو ہٹلر کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والے ایک جرمن آفیسر کے مطابق جرمنی 14 مئی کو فن لینڈ، بالٹک ممالک اور لٹویا کے راستے سوویت یونین پر حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ماسکو اور لینن گراڈ پر بھی زبردست حملے کئے جائیں گے اور سرحدی شہروں میں چھاتہ بردار اتارے جائیں گے۔''

''اپنی 22 مئی 1941ء کی رپورٹ میں برلن میں موجود نائب ملٹری اتاشی خلوپوف نے پیغام بھیجا 'جرمن فوج کے حملے کے لیے 15 جون کی تاریخ مقرر کی گئی ہے مگر ممکن ہے کہ اس کا آغاز جون کے

پہلے دنوں میں کر دیا جائے۔''

''18 جون 1941ء کو لندن سفارتخانے سے بھیجی گئی تار میں لکھا تھا کہ اس وقت کرپس کو مکمل یقین ہے کہ جرمنی اور سوویت یونین میں فوجی تصادم ناگزیر ہے اور یہ وسط جون تک شروع ہو جائے گا۔ کرپس کے مطابق جرمنوں نے اس وقت 147 ڈویژن فوج (اس میں ہوائی فوج اور سروس یونٹ بھی شامل ہیں) روسی سرحدوں کے ساتھ ساتھ جمع کر رکھی ہیں۔''

''خطرات کے بارے میں آگاہ کیے جانے کے باوجود ملک کو دفاع کے لیے تیار کرنے اور بے خبری میں دھر لیے جانے کے خلاف کوئی اقدامات نہیں کیے گئے۔''(16)

مزید یہ کہ ''ہم اس سلسلے میں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کر سکتے کہ سوویت یونین پر ہٹلر کی فوج کے حملے سے ذرا قبل کیف کے خصوصی فوجی علاقے کے سربراہ کرپونوس (جو بعد ازاں محاذ پر مارا گیا تھا) نے سٹالن کو لکھا کہ جرمن فوجیں دریائے بوگ پر موجود ہیں، جنگ کی تیاری کر رہی ہیں اور غالباً عنقریب اپنے حملے کا آغاز کر دیں گی۔ کرپونوس نے اس بارے میں یہ تجویز پیش کی کہ دفاع کو مضبوط کیا جائے تین لاکھ افراد کو سرحدی علاقوں سے محفوظ مقامات تک پہنچایا جائے اور کئی جگہوں پر مضبوط دفاعی علاقے قائم کئے جائیں مثلاً ٹینکوں کو روکنے والی خندقیں، فوجیوں کی خندقیں وغیرہ وغیرہ۔''

''ماسکو نے اس تجویز کا جواب یوں دیا کہ ایسا کرنا اشتعال انگیزی ہوگا، کہ سرحدوں پر اس قسم کی دفاعی تیاری نہیں کرنی چاہیے اور یہ کہ جرمنوں کو ہمارے خلاف فوجی اقدامات کے آغاز کے لیے کوئی بہانہ ہاتھ نہیں آنا چاہیے۔ لہٰذا ہماری سرحدیں دشمن کا حملہ پسپا کرنے کے لیے مناسب طور پر تیار نہیں تھیں۔ جب فاشسٹ فوجوں نے واقعی سوویت علاقے پر فوج کشی کر دی اور جنگ کا آغاز ہو گیا تو ماسکو نے حکم جاری کیا کہ گولہ باری کا جواب نہ دیا جائے۔ کیوں؟ اس کی وجہ یہ تھی کہ بالکل عریاں حقائق کے باوجود سٹالن کا خیال تھا کہ جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی اور جو کچھ ہو رہا ہے وہ جرمن فوج کے چند ڈسپلن کی خلاف ورزی کرنے والے حصوں کی اشتعال انگیز کارروائی ہے۔ جس کے ردعمل کے نتیجے میں جرمنوں کو جنگ کے آغاز کا جواز مل سکتا ہے۔''

''مندرجہ ذیل حقیقت بھی سب کے علم میں ہے کہ جرمن فوج کے سوویت علاقے پر فوج کشی کے وقت ایک جرمن شہری سرحد عبور کر کے آیا اور بتایا کہ جرمن فوجوں کو 22 جون کو تین بجے سوویت پر حملہ کرنے کا حکم مل چکا ہے۔ سٹالن کو فوراً یہ خبر پہنچا دی گئی لیکن اس نے یہ انتباہ بھی نظر انداز کر دیا۔''

”جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں ہر چیز کو نظر انداز کر دیا گیا۔ بعض فوجی کمانڈروں کی وارننگ کو، دشمن فوج کے بھگوڑوں کے بیانات کو اور یہاں تک کہ دشمن کی کھلی جارحیت کو بھی۔ کیا پارٹی اور ریاست کے سربراہ کی طرف سے اس انتہائی اہم تاریخی موقع پر چوکس ہونے کی یہ کوئی اچھی مثال ہے؟ اور واضح حقائق سے پہلو تہی اور لاپرواہی کے رویے کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ابتدائی گھنٹوں اور دنوں میں دشمن ہمارے سرحدی علاقوں میں ہماری فضائیہ، توپخانے اور دیگر فوجی سازوسامان کا بڑا حصہ تباہ کر چکا تھا، اس نے ہمارے فوجی کیڈروں کی بڑی تعداد کو ختم کر دیا اور فوجی قیادت کو غیر منظّم کر دیا، جس کے نتیجے میں ہم دشمن کو اپنے ملک کے اندر دور تک گھس آنے سے روکنے میں ناکام رہے۔“(17)

ناقابل یقین طور پر کسی جرمن حملے کی صورت میں دفاع کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ بہت سے روسی ٹینکوں پر عملہ موجود نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جب ہٹلر نے واقعی حملہ کر دیا تو سٹالن نے سرخ فوج کو مزاحمت نہ کرنے کا حکم دیا۔ لہٰذا ابتدائی انتہائی اہم 48 گھنٹوں کے لیے انتہائی طاقتور سوویت افواج مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ سرخ فضائیہ زمین پر ہی تباہ کر دی گئی۔ اعلیٰ قیادت کے مفلوج اور پراگندگی کا شکار ہونے کی وجہ سے چند ابتدائی ہفتوں میں بہت بڑا علاقہ دشمن کے قبضے میں چلا گیا۔ لاکھوں سوویت سپاہی بغیر کسی مزاحمت کے گرفتار ہو گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہتر قیادت کے تحت جرمن حملہ آوروں کو جنگ کے آغاز پر ہی واپس پولینڈ کی طرف پسپا کیا جا سکتا تھا، 1941ء میں ہی ہٹلر کو ایک فیصلہ کن شکست سے دوچار کیا جا سکتا تھا، جنگ کو بہت پہلے ہی ختم کیا جا سکتا تھا، جس سے بیلا روس، مغربی روس اور یوکرائن شدید نقصانات سے بچ جاتے۔ جو خوفناک تکالیف سوویت یونین کے عوام نے برداشت کیں وہ سٹالن اور اس کے رفقائے کار کی اختیار کردہ پالیسیوں کا براہ راست نتیجہ تھا۔

سٹالن جرمنی کے خلاف جنگ سے اس لیے خوفزدہ تھا کہ اس کے خیال میں یہ اس کا تختہ الٹے جانے کا سبب بن سکتی تھی۔ وہ فوج سے خصوصاً خوفزدہ تھا۔ 40-1939ء کی فن لینڈ کی مہم کی ناکامی کے بعد اس نے تطہیرات کے دوران قید کیے جانے والے ہزاروں افسروں کی رہائی کا حکم دے دیا لیکن میڈویڈیف کا کہنا ہے کہ ”1942ء میں سٹالن نے سرخ فوج کے افسروں کے ایک بڑے گروپ کو جبری مشقت کے کیمپوں میں گولی سے اڑا دینے کا حکم دے دیا تھا، اس کا خیال تھا کہ سوویت جرمن محاذ پر غیر موافق صورتحال پیدا ہونے کی صورت میں یہ لوگ اس کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتے ہیں۔“(18)

جنگ کے خاتمے کے بعد کریملن نے سٹالن کو ”عظیم جنگی لیڈر“ بنا کر پیش کرنے کی زبردست

کوششیں کیں۔ یہ بات معمولی سے قریبی جائزے کی متحمل بھی نہیں ہوسکتی۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح سٹالن کی پالیسیوں نے سوویت یونین کو ہٹلر کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا تھا۔ جب ہٹلر نے حملہ کیا تو روسی قیادت بھگدڑ کا شکار ہوگئی۔ سٹالن بدحواس ہوکر روپوش ہوگیا۔ اس کی حرکتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مکمل شکست تسلیم کر چکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے ''جنرالیسیمو'' کا خطاب اختیار کیا اور حب الوطنی کی عظیم جنگ میں اپنے کردار کو زیب داستان سے آراستہ کیا۔ حقیقی صورتحال کا اظہار خروشیف نے درج ذیل پیرائے میں کیا تھا:

''اس بات کو فراموش کرنا درست نہیں ہوگا کہ محاذ جنگ پر پہلی شدید تباہی اور شکست کے بعد سٹالن سمجھتا تھا کہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ اس نے ان دنوں جو تقاریر کی تھیں ان میں سے ایک میں اس نے کہا ''وہ سب کچھ جو لینن نے تخلیق کیا تھا ہم سے ہمیشہ کے لیے چھن چکا ہے۔'' اس کے بعد عرصے تک سٹالن نے فوجی کاروائیوں کی نگرانی کرنا چھوڑ دی اور قطعاً کچھ بھی نہیں کیا۔ اس نے عملی طور پر قیادت اس وقت سنبھالی جب پولیٹیکل بیورو کے ارکان نے اس سے ملاقات کی اور اسے بتایا کہ محاذ جنگ پر صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے فوری طور پر کچھ اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔''

''لہٰذا جنگ کے ابتدائی عرصے میں ہماری مادر وطن پر جو خطرات منڈلا رہے تھے ان کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بذات خود سٹالن پارٹی اور قوم کی راہنمائی کے لیے غلط طریقے استعمال کر رہا تھا۔ تاہم ہم صرف اس وقت کی بات نہیں کر رہے جب جنگ شروع ہوئی اور اس کی وجہ سے ہماری فوج میں زبردست بدنظمی پھیلی اور زبردست نقصان ہوئے۔ جنگ شروع ہونے کے بعد بھی سٹالن نے اضطراب اور ہسٹیریا کے باعث غیر معقول فوجی حکمتِ عملی کے ذریعے ہماری فوج کو شدید نقصان پہنچایا۔''

''سٹالن کو محاذ جنگ پر رونما ہونے والی حقیقی صورتحال کی کوئی سمجھ بوجھ نہیں تھی۔ یہ فطری امر تھا کیونکہ حب الوطنی کی جنگ کے تمام عرصے میں نہ تو اس نے محاذ کے کسی حصے کا معائنہ کیا اور نہ ہی کسی آزاد شدہ شہر کا ماسوائے موزائنک ہائی وے پر تھوڑی سی موٹر سواری کرنے کے اور وہ بھی اس وقت جب محاذ جنگ نسبتاً پرسکون تھا۔ اس واقعہ کو موضوع بنا کر مختلف النوع تخیلاتی کہانیاں لکھی گئیں اور بہت ساری پینٹنگز بنائی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ سٹالن کاروائیوں میں دخل اندازی بھی کر رہا تھا اور ایسے احکامات صادر کر رہا تھا جن میں محاذ جنگ کے کسی مخصوص حصے کی حقیقی صورتحال کا کوئی خیال تک نہیں رکھا جاتا تھا جس سے لامحالہ بہت سی جانوں کا ضیاع ہوتا تھا۔''

''اس حوالے سے میں ایک حقیقت آپ کے سامنے رکھنا چاہوں گا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سٹالن محاذوں پر ہونے والی کاروائیوں کی راہنمائی کیسے کرتا تھا۔ اس کانگریس میں مارشل بگرامیان بھی موجود ہیں جو ایک وقت میں جنوب مغربی محاذ کے ہیڈ کوارٹر میں چیف آف آپریشنز تھے۔ میں جو کچھ کہنے جا رہا ہوں وہ اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

''1942ء میں جب خارکوف کے علاقے میں ہماری فوج کے لیے ایک انتہائی خطرناک صورتحال پیدا ہوگئی تو ہم نے بجا طور پر فیصلہ کیا کہ اس فوجی کاروائی کو موخر کر دیا جائے جس کا مقصد خارکوف کا محاصرہ کرنا تھا کیونکہ حقیقی صورتحال ایسی تھی کہ اس کاروائی کے جاری رہنے سے ہماری فوج کے لیے انتہائی تباہ کن نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ ہم نے سٹالن سے رابطہ کر کے اسے بتایا کہ صورت حال کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے عملی منصوبے میں ردو بدل کریں تاکہ فوج کے ایک کافی بڑے حصے کو تباہی سے بچایا جا سکے۔ عقل سلیم کی نفی کرتے ہوئے سٹالن نے ہمارے مشورے کو رد کر دیا اور خارکوف کے محاصرے کی غرض سے کی جانے والی کاروائی کو جاری رکھنے کا حکم دے دیا جب کہ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت ہماری فوج کے کئی گروہ بذات خود گھیرے میں آ کر ختم کر دیئے جانے کے خطرے سے دوچار تھے۔''

''میں نے واسیلیفسکی سے ٹیلی فون پر استدعا کی:

'الیگزنڈر میخائلووچ ایک نقشہ لو اور کامریڈ سٹالن کو وہ صورتحال سمجھاؤ جو یہاں پیدا ہو چکی ہے۔'

ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سٹالن کاروائیوں کی منصوبہ بندی ایک گلوب پر کرتا تھا۔ (ہال میں ہلچل ہوئی) ہاں کامریڈز وہ گلوب لے کر اس پر محاذ جنگ کی لکیر کھینچا کرتا تھا۔''(19)

جنگ کے ابتدائی دنوں میں لاکھوں سوویت فوجی قیدی بنا لیے گئے تھے۔ سرخ فوج کو اس کے بعد پہنچنے والے نقصانات زیادہ شدید اس لیے تھے کہ سٹالن انسانی زندگیوں کی صورت میں ادا کی جانے والی قیمت سے قطع نظر سامنے سے حملہ کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ جب سرخ فوج نے 1941ء کے اواخر میں جوابی حملہ کیا تو سٹالن کا تقاضا یہ تھا کہ فوجی چالوں کے ذریعے دشمن کے پہلوؤں تک پہنچنے کی کوشش کرنے کی بجائے تمام دیہات یکے بعد دیگرے قبضے میں لے لیے جائیں۔ خروشیف نے وضاحت کی کہ ''اس کی وجہ سے ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا۔۔۔ یہاں تک کہ بالآخر ہمارے جرنیل جن کے کاندھوں پر جنگ کا سارا بوجھ تھا صورتحال کو تبدیل کر کے اپنی فوجی کاروائیوں میں لچک پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے جس سے فوری طور پر محاذ پر ایسی سنجیدہ تبدیلیاں واقع ہوئیں جو ہمارے حق میں تھیں۔''(20)

نومبر 1941ء کے آخر تک سوویت پسپائی کی وجہ سے ہم جو علاقہ کھو چکے تھے اس میں ہماری کوئلے کی پیداوار کا 63 فیصد، خام لوہے کا 68 فیصد، فولاد کا 58 فیصد، ایلومینیم کا 60 فیصد، ریلوے لائنوں کا 41 فیصد، چینی کا 84 فیصد، اناج کا 38 فیصد اور سووروں کا 60 فیصد شامل تھا۔ کچھ بڑے علاقے جن میں لینن گراڈ قابل ذکر ہے موثر طور پر کٹ چکے تھے۔ بنیادی خام مال اور ساز وسامان کی رسد کا بہت بڑا حصہ اچانک چھن گیا تھا اور تیز رفتار جرمن پیش قدمی سے اور بہت کچھ خطرے میں پڑ گیا تھا۔ شکست کو سامنے دیکھ کر اور اپنا تختہ الٹے جانے کے خوف سے سٹالن نے بادل نخواستہ اپنے نکمّے اور نااہل مسخروں کو نکال کر ان کی جگہ زیادہ قابل کمانڈروں کو دی جنہیں بطور خاص اسی مقصد کے لیے جیلوں سے رہا کیا گیا تھا:

”اپنی جان کے خوف اور اقتدار سے مکمل محرومی کے خطرے کو سامنے دیکھ کر اسے سمجھ آئی کہ جنگ کامیابی سے لڑنے کے لیے اسے ماہرین کی ضرورت ہے اور ان کی تلاش میں اس نے ایسے لوگوں کی طرف رجوع بھی کیا جنہیں اس نے قید کر رکھا تھا۔ لوگوں کو جیل سے رہا کر کے اعلیٰ فوجی عہدوں پر فائز کیا گیا۔ دیگر لوگوں کے علاوہ ان میں روکوسوفسکی اور گورماٹوف بھی شامل تھے مگر ظاہر ہے اس سے مسئلہ مکمل طور پر حل نہیں ہوسکا۔ مسلح افواج کی قیادت میں سٹالن کی فاتر العقل دہشت گردانہ سرگرمی سے جو شگاف پیدا ہوا تھا اسے انفرادی اینٹوں سے پُر کرنا ناممکن تھا۔“ (21)

پانسہ پلٹتا ہے

دوران جنگ ہی تیزی سے نئے جنرل سٹاف کو ترویج دی گئی۔ سوویت افسران کی نئی نسل نے گولیوں کی بوچھاڑ کے سائے تلے اپنی تربیت مکمل کی۔ ان کا انتخاب چھوٹے افسران سے کیا گیا تھا جو اکتوبر انقلاب اور خانہ جنگی کی روایات کے مطابق پروان چڑھے تھے۔ خروشیف اور بڈیونی جیسے لوگ چپ چاپ کھڈے لائن لگا دیئے گئے۔ تطہیرات کے دوران گرفتار کیے گئے لوگوں کو جیلوں سے رہا کر کے سرخ فوج کی قیادت ان کے ہاتھوں میں دے دی گئی۔ یہ باصلاحیت افسران تخاچیفسکی جیسے فوجی معاملات میں غیر معمولی ذہانت رکھنے والے شخص کے انقلابی مکتبہ فکر کی پیداوار تھے۔ ان کے تحت سرخ فوج نے ایسی قابل دید پیش قدمی کی جس کی نظیر جنگوں کی ساری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس طرح محض معاشی شعبے میں ہی نہیں بلکہ فوجی صلاحیت کے شعبے میں بھی انقلاب نے ثابت کر دیا کہ وہ کیا کچھ کرنے کی

صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے سرخ فوج کا 17-1914ء کی زار فوج سے موازنہ کرنا ہی کافی ہوگا۔ جنگ میں روس کی شاندار فتح بذات خود سرمایہ دارانہ طوائف الملوکی پر منصوبہ بندی پر مبنی قومی معیشت کی برتری کی سب سے بڑی تصدیق ہے۔

ابتدا میں کچھ ہچر مچر کرنے کے بعد سوویت حکومت نے بہت بڑے پیمانے پر انسانی اور مادی وسائل کے انخلا پر عمل درآمد کیا۔ جولائی اور نومبر 1941ء کے درمیان کم از کم 1523 صنعتی کارخانوں کو، جن میں سے کم از کم 1360 بڑے کارخانوں کے زمرے میں آتے تھے، اکھاڑ کر ان علاقوں سے ہٹالیا گیا جنہیں خطرہ درپیش تھا۔ یہ ایک ناقابل یقین کارنامہ تھا جس کی مثال کسی جنگ کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ جرمن پیش رفت کے ساتھ ساتھ کئی لاکھ لوگوں کا مشرق کی جانب انخلا عمل میں لایا گیا۔ تاہم روسی معیشت کو بھاری ضربیں لگیں۔ نومبر 1941ء تک تین سو سے زائد اسلحہ ساز فیکٹریاں جرمنوں کے قبضے میں جا چکی تھیں۔ اسی سال یعنی 1941ء کی کل صنعتی پیداوار نومبر 1940ء کی پیداوار کا صرف 51.7 فیصد تھی۔ 1940ء سے 1942ء کے درمیان پیداوار میں زبردست کمی واقع ہوئی۔ خام لوہے کی پیداوار 13.1 سے 5.4، کوئلہ 165.9 سے 75.5، تیل 31.1 سے 22 اور بجلی کی پیداوار 48.3 ملین کلوواٹ سے کم ہو کر 29.1 ملین کلوواٹ رہ گئی۔ 1942ء میں جرمنوں نے شمالی قفقاز اور ڈان کے علاقے پر قبضہ کر لیا جو ابھی تک روس کے پاس موجود علاقوں میں غلے کی کاشت کے بہترین علاقے تھے۔ اس کے علاوہ مائیکوپ کے تیل کے کنوئیں بھی جرمنوں کے قبضے میں آگئے اور کچھ عرصے کے لیے باکو سے تیل کی رسد بھی بند ہوگئی۔ فصلیں تباہ ہوگئیں۔ پسپائیوں اور شکستوں کے باوجود مارچ 1942ء میں پیداوار میں اضافے کا رجحان شروع ہوا۔

اینگلز نے ایک بار کہا تھا کہ محصور معیشت پر سرمایہ داری کے قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔ جب زندگی اور موت کی کشمکش کا سامنا ہوتا ہے تو بورژوازی منصوبہ بندی، مرکزیت اور صنعت کو قومی تحویل میں لینے جیسے اقدامات کا سہارا لیتی ہے۔ یہ حقیقت بذات خود ان تمام حضرات کے لیے ایک تباہ کن جواب کی حیثیت رکھتی ہے جو ہر وقت منڈی کی معیشت کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ برسبیل تذکرہ دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور امریکہ میں معیارِ زندگی میں اس حقیقت کے باوجود بہتری ہوئی کہ پیداوار کا بڑا حصہ جنگی مقاصد کی نظر کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح دوران جنگ مغرب میں بھی مرکزی منصوبہ بندی (بے شک یہ جزوی تھی کیونکہ سرمایہ داری کے تحت حقیقی منصوبہ بندی ممکن ہی نہیں) کی برتری کچھ زیادہ متنازعہ نہیں تھی۔

لیکن جہاں تک سوویت کا سوال ہے قومی منصوبہ بندی کی واضح برتری پوری طرح ثابت ہوگئی خاص طور پر جب اسے سخت ترین کسوٹی یعنی ایک خونریز جنگ کے دوران پرکھا گیا۔

صورتحال کو ایک شاندار انداز میں پلٹایا گیا جو فتح کی کلید بن گئی۔ صنعت کو از سر نو منظّم کیا گیا اور اسے زیادہ موثر بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ ماہرین کو سٹالن کے مشقتی کیمپوں سے رہا کرنے کے بعد جنگی صنعتوں میں کام پر لگایا گیا۔ 1940ء میں قومی آمدنی کا 15 فیصد حصہ فوجی مقاصد کے لیے وقف کیا گیا تھا۔ 1942ء میں یہ شرح 55 فیصد تک پہنچ چکی تھی۔ ایلک نووی کے مطابق ''غالباً کسی بھی وقت کسی جگہ وقف کی جانے والی سب سے زیادہ شرح ہے۔'' قومیائی ہوئی معیشت کی وجہ سے ہی یہ ممکن ہو سکا تھا۔ جیسا کہ ایلک نووی مزید وضاحت کرتا ہے ''اس میں کوئی شک نہیں کہ پچھلے دس سال کا مرکزی منصوبہ بندی کا تجربہ بہت معاون ثابت ہوا۔ وسائل پر اپنی گرفت کو مضبوط بنانے کے عمل میں حکومت نے سہ ماہی اور یہاں تک کہ ماہانہ منصوبوں کا سہارا لیا اور زمانہ امن کی نسبت کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ۔

''سامان کی تقسیم کے کام کو زیادہ کامیابی سے کیا گیا تاکہ دستیاب سامان اور ایندھن کو مختلف ضرورتوں کی ترجیحات کے مطابق فراہم کیا جائے جس کا فیصلہ انتہائی بااختیار دفاع کی ریاستی کمیٹی کرتی تھی۔ اگست 1941ء میں ایک ہنگامی منصوبہ تیار کیا گیا جو سال کے بقیہ حصے اور 1942ء کے سال کا احاطہ کرتا تھا۔ اس کے بعد سالانہ معاشی و فوجی منصوبے بنائے گئے اور ساتھ ہی ساتھ طویل المیعاد منصوبے بھی جن میں 47-1943ء تک کے لیے یورال کے علاقے کے لیے منصوبہ بھی شامل تھا۔'' (22) سوویت معیشت کی زبردست برتری کو ثابت کرنے کے لیے یہ چند حقائق ہی کافی ہیں۔

سوویت صنعت نہ صرف بہت بڑی تعداد میں فوجی ساز و سامان بنانے کی اہلیت رکھتی تھی بلکہ اس کے بنائے ہوئے ٹینک، طیارے اور توپیں بہت اعلیٰ معیار کی تھیں اور اسی نوع کے جرمن جنگی آلات سے برتر تھیں۔ یہ اور اس کے ساتھ ساتھ انقلاب کی حاصلات کے دفاع کے لیے مزدور طبقے کے عزم نے اس تصادم اور بالآخر یورپ میں دوسری جنگ عظیم کے نتیجے کا تعین کیا جو درحقیقت سوویت یونین اور نازی جرمنی کے درمیان زبردست مقابلہ تھا۔ اگرچہ جنگ کے آغاز پر ہٹلر کو زبردست برتری حاصل تھی اور اس کے پاس مقبوضہ یورپ کے تمام وسائل موجود تھے لیکن اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ دنیا کی حیرت زدہ نگاہوں کے سامنے سرخ فوج نے ایک ایسے جھٹکے سے سنبھالا لیا جو دوسرے کسی بھی ملک کے خاتمے کا باعث ہوتا، خود کو از سر نو منظّم کیا اور جوابی حملہ کر کے جرمن فوج کو دھکیلتے ہوئے برلن تک پہنچ گئی۔

اگرچہ جنگ کا پانسہ 1942ء کے آخر میں پلٹنا شروع ہو گیا تھا۔ لیکن آزاد کرائے گئے علاقے بعض اوقات سوویت معاشی طاقت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے تھے۔ نازیوں نے ہر شے تباہ و برباد کر دینے کی پالیسی اپنا رکھی تھی۔ اس طرح 1943ء میں (سوویت) یوکرائن کی کل صنعتی پیداوار 1940ء کی کل پیداوار کا محض 1.2 فیصد تھی۔ اس کے باوجود سوویت عوام نازی حملہ آوروں کے خلاف آزادی کی جنگ جاری رکھے ہوئے تھے۔ اگر نازی افواج فتحیاب ہو جاتیں تو روسی عوام کو اس کے خوفناک نتائج بھگتنا پڑتے۔ ان حقائق نے سرخ فوج کو وہ ہمت و جرأت دی جو ہٹلر کو شکست دینے کا باعث بنی۔ جرمن فوج کی پیش قدمی کو بالآخر سٹالن گراڈ میں روک لیا گیا۔ مشرقی محاذ پر کرسک کی جنگ میں پانسہ پلٹ گیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ جنگ کی سب سے فیصلہ کن لڑائی تھی۔ ایک خوفناک معرکہ ہوا جس میں دونوں اطراف سے دس دس ہزار ٹینکوں نے حصہ لیا اور کامیابی سرخ فوج کے حصے میں آئی۔

برسبیل تذکرہ، اس تمام عرصے کے دوران سوویت یونین کی سرحد سے ذرا دور ایران میں ایک بہت بڑی برطانوی فوج تعینات رہی۔ سٹالن نے چرچل سے کہا کہ یہ برطانوی فوج چونکہ بے کار پڑی ہے اس لیے اسے مشرقی محاذ پر سرخ فوج کی اعانت کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس کے جذبہ الفت سے سرشار اتحادی برطانیہ نے جوابی طور پر تجویز پیش کی کہ جو روسی فوج سرحد پار حفاظت پر معمور ہیں انہیں ہٹا لیا جائے اور محاذ پر بھیج دیا جائے تو برطانوی فوج ازراہ عنایت ان کی جگہ سرحد کی حفاظت کے فرائض سنبھال لے گی۔ یہ حقیقت ہے کہ چرچل سرخ فوج کی شکست کا منتظر تھا تاکہ وہ خانہ جنگی کے دوران کی پالیسی کو دہراتے ہوئے تیل کی دولت سے مالا مال باکو پر قبضے کے لیے برطانوی فوج کو حکم صادر کر سکے جب برطانوی فوج نے قفقاز پر فوج کشی کی تھی اور یہ ایک ایسی بات تھی جسے سٹالن جیسا شخص بھی سمجھ سکتا تھا!

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ موجود رہیں جب کہ سوویت سرزمین پر انتہائی فیصلہ کن جنگیں لڑی جا رہی تھیں۔ چرچل کی بدقسمتی سے جنگ کا خاتمہ سرخ فوج کی فتح کی صورت میں ہوا جس نے انتہائی تیز رفتاری سے یورپ کے مرکزی حصے کی جانب پیش قدمی کی۔ رفتہ رفتہ جرمنوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا حالانکہ سٹالن کے پاگل پن پر مبنی پالیسیوں کی وجہ سے روسی نقصانات بہت زیادہ شدید تھے۔ اس کی وجوہات فوجی سے زیادہ سیاسی تھیں۔ اگر سوویت یونین نے بین الاقوامیت پر مبنی پالیسی اپنا کر جرمن مزدوروں سے ہٹلر کا تختہ الٹنے کی اپیل کی ہوتی، خصوصاً پہلی جرمن شکستوں کے بعد، تو اس کے نتائج بہت بہتر برآمد ہوتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک سوشلسٹ جرمنی کے سوویت یونین کے ساتھ برادرانہ

فیڈریشن میں یکجا ہونے کا پیش منظر جرمن مزدوروں اور سپاہیوں کے دل و دماغ میں ضرور گھر کر لیتا۔

اس طرح برلن کی طرف پیش قدمی کے دوران سرخ فوج نے جو بے پناہ نقصانات اٹھائے ان سے بچنا ممکن ہو جاتا۔ فتح جلد حاصل ہو جاتی اور اس کی بہت کم قیمت ادا کرنا پڑتی۔ لیکن سٹالن نے تنگ نظر قوم پرستی پر مبنی پالیسی اپنائی۔ اس پالیسی کی عکاسی کرتے ہوئے ایلیا اہرن برگ نے اعلان کیا کہ ''اگر جرمن مزدوروں نے سرخ جھنڈوں سے ہمارا استقبال کیا تو سب سے پہلے انہیں گولی ماردی جائے گی۔'' ایسی پالیسی نے اس بات کو یقینی بنا دیا کہ جرمن فوج ایک ایک انچ زمین کے لیے بھرپور مزاحمت کرے۔ اس سے دونوں اطراف کے بھاری نقصانات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ سامراجی قوتوں کے اندازے کی زبردست غلطی کے نتیجے میں روسی اتحادیوں سے پہلے برلن پہنچ گئے۔ ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو زیادہ خطرہ فوجی شکست سے نہیں بلکہ ان سستی اشیائے صرف سے ہوگا جو ایک سامراجی فوج اپنے ساتھ لے کر آئے گی۔ مگر ہوا یوں کہ ہٹلر کی افواج اشیائے صرف لانے کی بجائے گیس چیمبر لے کر آئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف مزدور طبقے نے بلکہ کسانوں نے بھی شیروں کی طرح سوویت یونین کا دفاع کیا۔

جنگ میں سوویت یونین کی فتح وہ بنیادی عامل ہے جس کے باعث سٹالنسٹ نظام 1945ء کے بعد کئی دہائیوں تک قائم رہا۔ روس اور باقی دنیا کے مزدوروں کو بظاہر لگ رہا تھا کہ بیوروکریسی ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کر رہی ہے اور اس نے نہ صرف ہٹلر کے خلاف منصوبہ بند معیشت کا دفاع کیا بلکہ اس نے قومی ملکیت کی اشکال کو مشرقی یورپ اور بعد ازاں چین تک پھیلا دیا۔ درحقیقت یہ انقلابات وہاں سے شروع ہوئے تھے جہاں روسی انقلاب کا خاتمہ ہوا تھا یعنی بونا پاٹ ازم کی خوفناک حد تک مسخ شدہ حکومتیں۔ ایسے نظاموں کے وجود میں آنے سے ماسکو کی نوکرشاہی کمزور ہونے کی بجائے ایک لمبے تاریخی عرصے کے لیے انتہائی مضبوط ہو گئی۔

سٹالن کی چالیں

تمام سامراجی طاقتوں کے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ چرچل نے بالکل غلط حساب لگایا تھا مگر یہی حال سٹالن، ہٹلر اور روزویلٹ کا بھی تھا۔ ہٹلر کو یقین تھا کہ سوویت مزاحمت کو نہایت آسانی سے

ختم کیا جاسکتا ہے۔ جرمنی کے چیف آف جنرل سٹاف جنرل ہیلڈر کو توقع تھی کہ سوویت یونین کو چار ہفتوں میں شکست ہو جائے گی۔ جرمنی کے وزیر خارجہ جان ربن ٹروپ کا خیال تھا کہ آٹھ ہفتے لگیں گے اور امریکہ کے محکمہ جنگ کا خیال تھا کہ چار سے بارہ ہفتے لگیں گے۔ برطانوی فوج روس کو 6 ہفتے سے زیادہ نہیں دے رہی تھی۔ سٹالن کی حکومت اور زبردست قربانیوں کے باوجود جنگ نے اکتوبر انقلاب کے قائم کردہ نئے ملکیتی رشتوں کے قابل عمل ہونے کو ہر شک شبے سے بالا کر دیا۔

سوویت یونین کی فتح نے اتحادیوں کے تناظر کو چکنا چور کر دیا جن کو یہ امید تھی کہ نازی جرمنی اور سٹالن کا روس اس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک دونوں نڈھال نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ خود آ کر ان کا صفایا کر دیں گے۔ ہیری ٹرومین کے الفاظ میں ''اگر ہم دیکھیں کہ جرمنی جنگ جیت رہا ہے تو ہمیں روس کی مدد کرنی چاہئے اور اگر دیکھیں کہ روس جیت رہا ہے تو جرمنی کی مدد کرنی چاہئے اور اس طرح انہیں ایک دوسرے کے زیادہ سے زیادہ لوگ مارنے کا موقع فراہم کریں۔'' (23)

1945ء کے یوم مئی کے موقع پر برلن میں رائخ ستاگ پر سرخ پرچم لہرا رہا تھا۔ اس سے کچھ دن بعد جرمن ہائی کمانڈ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ لیکن ابھی سے سامراجی سوویت یونین کے خلاف چالیں چلنا شروع ہو گئے تھے۔ امریکیوں کا ایک ایسے موقع پر ہیروشیما اور ناگا ساکی پر ایٹم بم گرانا جب جاپان کو واضح طور پر شکست ہو چکی تھی اور وہ امن کی درخواست کر رہے تھے کوئی فوجی مقصد حل نہیں کر سکتا تھا بلکہ یہ سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں کے لیے ایک واضح انتباہ تھا۔

1944ء اور 1945ء کے درمیان تہران، ماسکو، یالٹا اور پوٹس ڈیم میں ہونے والی تین بڑی کانفرنسوں میں سٹالن نے سامراجی طاقتوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی بڑی کوشش کی۔ چرچل نے سٹالن کے ساتھ اکتوبر 1944ء میں ہونے والی اپنی گفتگو کچھ یوں تحریر کی ہے:

''موقع کاروبار کے لیے مناسب تھا لہٰذا میں نے کہا 'آئیں ہم اپنے بلقان کے معاملات طے کر لیتے ہیں۔ ہماری فوجیں رومانیہ اور بلغاریہ میں موجود ہیں۔ وہاں ہمارے مفادات ہیں، مشن اور ایجنٹ ہیں۔ ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ جہاں تک برطانیہ اور روس کا تعلق ہے تو کیا یوں ہو سکتا ہے کہ رومانیہ پر آپ کا غلبہ 90 فیصد ہو اور یونان پر ہمارا 90 فیصد ہو اور یوگوسلاویہ پر پچاس پچاس فیصد؟' جب یہ بات ترجمہ کر کے سنائی جا رہی تھی تو میں نے آدھا صفحہ لے کر یہ تحریر کیا:

رومانیہ: روس 90 فیصد۔۔۔ باقی 10 فیصد برطانیہ

یونان: برطانیہ (امریکہ کے ساتھ مل کر) 90 فیصد۔۔۔روس 10 فیصد

ہنگری: 50/50 فیصد

یوگوسلاویہ: 50/50 فیصد

بلغاریہ: روس 75 فیصد۔۔۔باقی 25 فیصد برطانیہ''

''میں نے یہ کاغذ سٹالن کی طرف سرکا دیا جو اس وقت تک ترجمہ سن چکا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر اس نے اپنی پنسل نکالی اور اس پر ٹک کا بڑا سا نشان لگا کر واپس ہمیں دے دیا۔ یہ سب کچھ طے کرنے میں اتنا ہی وقت لگا جتنا کہ بیٹھنے میں لگتا ہے۔ اس کے بعد طویل خاموشی چھا گئی۔ پنسل سے نشان زدہ کاغذ میز کے درمیان پڑا تھا۔ آخر کار میں نے کہا'' کیا اسے بدنیتی خیال نہیں کیا جائے گا کہ ہم نے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں سے متعلق ان معاملات کو اس قدر لاپرواہی اور سرد مہری سے طے کر دیا تھا؟ آیئے ہم اسے جلا دیتے ہیں۔ سٹالن نے کہا نہیں اسے آپ رکھیں۔''

اس طرح مختلف ممالک کو سٹالن یا سامراجیوں کے دائرہ اثر میں آنا تھا۔ سٹالن نے یونان میں آنے والے انقلاب سے ہاتھ دھو لیے۔ اس نے یوگوسلاویہ کے ایک لیڈر میلون ڈی جولاس سے کہا:

''یونان میں آنے والے انقلابی ابھار کو ختم ہونا پڑے گا۔ اسے روکنا ضروری ہے اور جتنی جلد ممکن ہو سکے۔'' (25) اور چرچل کے مطابق ''سٹالن ہمارے اکتوبر میں ہونے والے سمجھوتے پر سختی اور وفاداری سے قائم رہا اور ایتھنز کی سڑکوں پر ہفتوں کمیونسٹوں سے ہونے والی ہماری لڑائی کے دوران پراودا یا ازوستیا نے ملامت کے لیے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔'' وہ چاہتا تھا کہ ماؤ چیانگ کائی شیک کے ساتھ عارضی صلح کر لے۔ یوگوسلاویہ میں سٹالن شاہ پیٹر کے تحت مطلق العنانی کی بحالی کے حق میں تھا۔

جیسا کہ ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی جنگ کا خاتمہ ایک انقلابی ابھار لایا۔ ترقی یافتہ ممالک میں مزدوروں نے سوشلسٹ انقلاب کی جانب پیش رفت کی اور نوآبادیاتی عوام میں زبردست جوش وخروش پیدا ہوا۔ لیکن کروڑوں انسانوں کی اس تحریک کا رخ یورپی براعظم میں سٹالنسٹوں نے اور برطانیہ میں لیبر حکومت نے تبدیل کر دیا۔ مقبوضہ یورپ کے کئی حصوں میں 1941ء کے بعد نازیوں کے خلاف کمیونسٹ پارٹیوں کے کارکنوں کی جرأت مندانہ مزاحمت کے باعث کمیونسٹ پارٹیوں کو زبردست عوامی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔

جنگ کی خونریزیوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ایک انقلابی راستے کی جستجو میں عوام نے

کمیونسٹ پارٹیوں کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔لیکن سٹالن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ماسکو کی ہدایت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے مزدوروں کی انقلابی تحریک کو روکنے کے لیے فرانس، اٹلی، بیلجیئم اور فن لینڈ میں کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادتوں نے بورژوا پارٹیوں کے ساتھ مل کر مشترکہ حکومتیں تشکیل دیں۔ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں مزدور طبقے کی اقتدار پر قبضے میں ناکامی وہ سیاسی بنیاد تھی جس کے نتیجے میں جنگ کے بعد کا عروج ممکن ہوا۔اسی نے نوآبادیاتی ممالک میں وقوع پذیر ہونے والے انقلابات کی قسمت کا قبل از وقت فیصلہ کر دیا۔

مشرقی یورپ جنگ کے بعد

جیسا کہ ٹراٹسکی نے قدرے متذبذب انداز میں اپنی آخری تحریروں میں پیش گوئی کر دی تھی، روس میں پرولتاری بوناپارٹسٹ حکومت کئی عشروں تک رہی۔اولاً یہ دوسری جنگ عظیم میں سوویت یونین کی فتح کا نتیجہ تھا جس کے باعث عالمی پیمانے پر طاقت کا توازن تبدیل ہو گیا۔ثانیاً یہ کہ بوناپارٹسٹ طریقوں سے انقلاب کے مشرقی یورپ تک پھیلنے سے اکتوبر 1917ء جیسی صحت مند مزدور ریاستیں وجود میں نہیں آئیں۔ بلکہ سٹالن کے ماسکو کی طرز پر خوفناک حد تک مسخ شدہ مزدور ریاستیں قائم ہوئیں۔روس کی جنگ میں فتح اور جرمن اور اطالوی فاشزم کی شکست کے بعد یورپ میں عوامی ابھار نے ایک ایسی زبردست انقلابی لہر کو جنم دیا جو سارے براعظم سے سرمایہ داری کو بہالے جانے پر تلی ہوئی تھی۔تاہم جنگ میں روس کی فتح کے پیچیدہ اور متضاد نتائج پیدا ہوئے۔عارضی طور پر ہی سہی لیکن ایک پورے تاریخی عہد کے لیے سٹالن ازم کو زبردست تقویت حاصل ہو گئی۔جنگ کی خونریزی اور تباہ کاریوں نے سوویت یونین کو انتہائی کمزور اور نڈھال کر دیا جب کہ امریکہ کی معیشت کو نہ صرف کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ امریکہ فوجی اور معاشی طاقت کے لحاظ سے اپنے عروج پر تھا۔لیکن عالمی سطح پر طبقاتی قوتوں کے توازن اور قوموں کے موڈ کی وجہ سے سامراجی قوتیں روس کے خلاف ایک نئی جنگ کے آغاز سے معذور تھیں۔

اب اس پیمانے پر بھی مداخلت ناممکن تھی جیسی پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد کی گئی تھی۔اس کے برعکس اتحادی مشرقی یورپ اور ایشیا کے کچھ حصوں پر روسی غلبے کو برداشت کرنے پر مجبور تھے جنہیں وہ رجعتی زارشاہی کے حوالے کرنے پر بھی کبھی تیار نہ ہوتے۔روسی بیوروکریسی نے اتنے وسیع علاقے پر غلبہ

حاصل کرلیا تھا جس کا زاروں کے روس نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔

مشرقی یورپ میں سرمایہ داری کا خاتمہ اور سٹالن ازم کا نفاذ جس عجیب وغریب عمل کے ذریعے واقع ہوا اس کی وضاحت میں نے اس وقت شائع کی جانے والی مختلف تحریروں میں کی تھی۔ مشرقی یورپ میں نازیوں اور ان کے کاسہ لیس ملک دشمنوں کی شکست کے بعد پیدا ہونے والے ریاستی اقتدار کے خلا کو فاتح سرخ فوج کی قوت نے پُر کیا۔ دوران جنگ ان علاقوں کی کمزور بورژوازی کو بڑی حد تک ختم کردیا گیا، جرمن سامراج کے اندر ضم کرلیا گیا یا ان کی حیثیت نازیوں کے معمولی ساتھیوں جیسی رہ گئی تھی۔ جنگ سے قبل بھی وہ مشرقی یورپ میں نسبتاً کمزور حیثیت رکھتے تھے کیونکہ جنوبی امریکہ کی ریاستوں کی طرح اس علاقے کی ریاستیں بھی عام طور پر بڑی طاقتوں کی نیم نوآبادیاں تھیں۔ اس علاقے کی بالکنائزیشن اور حکمران طبقے کی بورژوا جمہوری انقلاب کے فریضے کے ادا کرنے کی عدم دلچسپی کے باعث یہاں جنگ سے پہلے کی حکومتیں مسلسل بحرانوں کا شکار رہتی تھیں۔ کم وبیش تمام کی تمام حکومتیں کمزور قسم کی فوجی طاقتیں تھیں جن کی عوام میں حقیقی جڑیں موجود نہیں تھیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جنگ میں روس کی فتح نے کچھ ممالک میں تیزی سے اور کچھ میں ذرا دیر کے بعد عوامی ابھار کو فروغ دیا۔ سوشلسٹ انقلاب روزمرہ کا معمول بن چکا تھا۔ یہ بات نہ صرف بورژوازی بلکہ کریملن کے لیے بھی خطرناک تھی جو مزدوروں کی آزاد تحریک سے خطرہ محسوس کرتا تھا۔ مزدوروں کے اکتوبر جیسے سوشلسٹ انقلاب سے بچنے کے لیے وہ اپنے ایجنٹوں سے یہ اعلان کرواتے تھے کہ ابھی سوشلسٹ انقلاب کے لیے مناسب وقت نہیں ہے۔ اس کی بجائے انہوں نے عوامی جمہوریت قائم کرنے کے دعوے کئے۔ بیوروکریسی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے مختلف طبقات کو بوناپارٹسٹ انداز میں بڑی مہارت سے استعمال کیا۔ چال یہ چلی جاتی تھی کہ مختلف طبقات کے درمیان پاپولر فرنٹ بنا کر ''قومی اجتماعیت'' پر مبنی حکومت تشکیل دی جاتی تھی۔ تاہم ماضی میں قائم کیے جانے والے پاپولر فرنٹ کے مقابلے میں اس کی بنیاد اور مقاصد مختلف تھے۔

سپین میں پاپولر فرنٹ کا مقصد یہ تھا کہ مزدوروں کے انقلاب کو ختم کرکے نئی ابھرتی ہوئی مزدور ریاست اور مزدوروں کے اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ مقصد بورژوازی بلکہ بورژوازی کے ساتھ اتحاد کرکے، فیکٹریوں اور مسلح مزدور ملیشیاؤں سے مزدوروں کے کنٹرول کا گلا گھونٹ کر اور بورژوازی کے زیر تسلط سرمایہ دارانہ ریاست کو ازسرنو قائم کرکے حاصل کرلیا گیا۔ اس پالیسی کی وجہ سے جنگ کے خاتمے تک

خط تقسیم کے دونوں اطراف ملٹری پولیس کی آمریتیں قائم ہو چکی تھیں۔

مشرقی یورپ کی ٹوٹی پھوٹی بورژوازی یا اس کے سائے کے ساتھ اتحاد کے مقاصد سرمایہ داروں کو اقتدار واپس لوٹانے سے مختلف تھے۔ سابقہ پاپولر فرنٹوں میں ریاست کی حقیقی طاقت یعنی مسلح افراد کے جتھے، پولیس اور ریاستی مشینری بورژوازی کے ہاتھوں میں تھی جب کہ مزدور پارٹیوں کی حیثیت ضمنی تھی۔ مشرقی یورپ میں ایک آدھ اہم ترمیم سے قطع نظر حقیقی قوت یعنی مسلح افراد کے جتھوں اور ریاستی مشینری کا کنٹرول سٹالنسٹوں کے ہاتھوں میں تھا۔ بورژوازی کی حیثیت ضمیمے کی سی تھی جس کے پاس حقیقی طاقت موجود نہیں تھی۔ پھر اتحاد کیوں؟ یہ ایک نقاب کا کام دیتا تھا جس کے نیچے ماسکو کے ماڈل پر ایک مضبوط ریاستی مشین کو تعمیر کر کے مستحکم بنایا جا سکتا تھا۔

زرعی اصلاحات متعارف کروانے اور جاگیرداروں کو بے دخل کرنے کی وجہ سے انہوں نے وقتی طور پر کسانوں کی رضامندی یا حمایت حاصل کر لی۔ اپنے زیر کنٹرول ایک طاقتور ریاست کو تعمیر اور مستحکم کرنے کے بعد انہوں نے اگلے مرحلے کی جانب توجہ مرکوز کی۔ مزدوروں کی مدد سے انہوں نے بورژوازی کی مخالفت شروع کر دی جس کی اب مزدوروں اور کسانوں کے خلاف استعمال کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور انہوں نے رفتہ رفتہ بورژوازی کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ بورژوازی بیرونی سامراج کی مدد کے بغیر فیصلہ کن مدافعت کرنے سے قاصر تھی۔ رفتہ رفتہ ایک ایسا آمرانہ نظام متعارف کروا دیا گیا جو ماسکو ماڈل سے قریب تر تھا۔ بورژوازی کے خاتمے اور بڑے پیمانے پر صنعت کاری کے آغاز کے بعد بیوروکریسی کسانوں کے خلاف ہو گئی اور زراعت میں اجتماعی کاشت کاری کے راستے پر گامزن ہو گئی۔

مشرقی یورپ اور اس کے فوراً بعد چین میں مسخ شدہ نوکرشاہانہ مزدور ریاستوں کے قیام سے یہ اثر پڑا کہ ایک پورے تاریخی عہد کے لیے سٹالن ازم مضبوط ہو گیا۔ یورپی سرمایہ داری کی کمزوری اور سوویت یونین کے تقویت حاصل کر جانے سے امریکی سامراج کے لیے ایک خطرناک صورتحال پیدا ہو گئی اور اسے یورپی طاقتوں یعنی فرانس، جرمنی اور اٹلی کے علاوہ جاپان کو امداد دینے اور مضبوط کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ 1947ء میں یورپی سرمایہ داری کی تعمیر نو کے لیے مارشل پلان کا اعلان کیا گیا۔ اس امداد کی قیمت کے طور پر مغربی اتحاد پر امریکی غلبہ تسلیم کر لیا گیا۔ بین الاقوامی تعلقات پر دو سپر پاورز کا غلبہ تھا جس میں ایک جانب امریکی سامراج تھا تو دوسری جانب روسی بیوروکریسی تھی۔ مارچ 1946ء میں امریکہ میں فلٹن

کے مقام پر چرچل نے بحیرہ بالٹک سے بحیرہ ایڈریاٹک تک پھیلے ہوئے ایک آہنی پردے کی بات کی۔ یہ دو سماجی نظاموں کے درمیان شدید سفارتی، سیاسی اور عسکری رقابت یعنی سرد جنگ کے آغاز کا اعلان تھا۔ 1947ء میں فرانس اور اٹلی کی حکومتوں سے سٹالنسٹوں کو نکال باہر کیا گیا اور دو سال کے اندر اندر نیٹو کی تشکیل کے ساتھ ساتھ جرمنی کو مشرقی اور مغربی حصے میں تقسیم کر دیا گیا۔

چین میں فتح

ایک ایسا ہی عمل اس وقت دیکھنے میں آیا جب ماؤ نے 1949ء میں ایک کسان فوج کی مدد سے چین میں اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ روسی انقلاب کے واقع ہونے تک لینن بھی کسی پس ماندہ ملک میں پرولتاری انقلاب کی فتح کے امکان کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ 49-1944ء کا انقلاب 1917ء کے یا 27-1925ء کے چینی انقلاب کے نمونے پر برپا نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک کسان جنگ تھی جو اس وجہ سے ہوئی تھی کہ بورژوازی بورژوا جمہوری انقلاب کے فرائض یعنی جاگیرداری کا خاتمہ، قومی یکجہتی اور سامراجیوں کا انخلا وغیرہ پورے کرنے سے بالکل قاصر تھی اور اس کا نتیجہ چینی سٹالنسٹوں کی فتح کی صورت میں برآمد ہوا۔ چینی قوم اور دنیا بھر کے پسے اور کچلے ہوئے مزدوروں اور کسانوں کے لیے یہ ایک بہت عظیم پیش رفت تھی۔ حقیقت میں روسی انقلاب کے بعد چین میں آنے والا انقلاب انسانی تاریخ کا دوسرا بڑا واقعہ تھا۔ 800 ملین افراد پر مشتمل ایک زبردست قوم عالمی تاریخ کی اگلی صف میں آ کھڑی ہوئی اور آج تک اسے یہ حیثیت حاصل ہے۔ حالانکہ قبل از انقلاب غیر ملکی آقا ان کے ساتھ بے زبان جانوروں کے ریوڑ جیسا سلوک کرتے تھے۔

اگرچہ اس نے دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا لیکن 1949ء کا انقلاب کسی طور بھی 1917ء کے انقلاب جیسا نہیں تھا۔ 1949ء میں چینی سٹالنسٹوں کا پروگرام ایک عشرے بعد کیوبا میں پیش کیے جانے والے کاسترو کے پروگرام سے بنیادی طور پر مختلف نہیں تھا یعنی قومی بورژوازی کے ساتھ اتحاد اور پچاس یا سو سال کے عرصے پر محیط قومی سرمایہ داری کا دور۔ اسی لئے کئی امریکی بورژوا انہیں ''زرعی اصلاحات نافذ کرنے والے'' خیال کرتے ہیں۔ صرف برطانیہ میں موجود مارکسی رجحان سٹالنسٹوں اور دیگر کے خلاف دلائل دیتے ہوئے واضح کرتا تھا کہ نہ صرف ماؤ کی فتح اور ایک مسخ شدہ مزدور ریاست کا قیام ناگزیر

ہے بلکہ ایک مخصوص مرحلے پر ماسکو اور چینی بیوروکریسی کے درمیان پھوٹ بھی ناگزیر ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ماؤ اور چینی کیمونسٹ پارٹی کا پروگرام سرمایہ داری اور ''قومی جمہوریت'' پر مبنی تھا۔

کسان جنگ کے ذریعے اقتدار حاصل کرنے کے لیے چیانگ کائی شیک کی فوج کے سپاہیوں کو زمینیں دی گئیں۔ پھر فوجی فتح کے حصول کے بعد جاگیرداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا گیا لیکن ایک ایسے عجیب بوناپارٹسٹ انداز میں کہ مزدور طبقہ اس میں شعوری طور پر شریک نہیں تھا۔ بعدازاں اسے معمول کی چیز سمجھ کر لیا گیا اور یہاں تک کہ نوآبادیاتی ممالک میں برپا ہونے والے انقلابات میں اسے ماڈل کے طور پر قبول کر لیا گیا۔ مگر مارکس اور لینن کے تصورات سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ تاریخ میں یہ سوال کبھی بھی نظری یا علمی طور پر نہیں اٹھایا گیا تھا کہ کلاسیکی خطوط پر لڑی جانے والی کسان جنگ کے نتیجے میں ایک مزدور ریاست وجود میں آسکتی ہے چاہے وہ کتنی بھی مسخ شدہ کیوں نہ ہو۔

بعض وجوہات کی بنا پر جن کا ہم یہاں ذکر نہیں کریں گے چین کے مزدور خانہ جنگی کے تمام عرصے میں غیر متحرک رہے۔ درحقیقت یہاں ہمارے سامنے اس بات کی مکمل مثال موجود ہے جس میں ایک طبقے یعنی سرخ فوج کی شکل میں کسانوں نے ایک دوسرے طبقے یعنی مزدور طبقے کے فرائض کو پورا کیا اور تاریخ میں ایسا پہلی بار نہیں ہوا۔ جرمنی میں ''جنکرز'' نے بورژوا جمہوری انقلاب کے فریضے ادا کئے اور جاپان میں یہی فرائض جاگیردارانہ انقلاب نے ادا کئے۔ لیکن جب ایک طبقے کے تاریخی فرائض دوسرا طبقہ ادا کرتا ہے تو ناگزیر طور پر کچھ بگاڑ ضرور پیدا ہوتا ہے۔ کچھ چیزوں کا تعلق اس حقیقت سے بھی ہے۔

ماضی میں کسان فوج سوشلسٹ انقلاب کا نہیں بلکہ (بورژوا) بوناپارٹ ازم کا کلاسیکی آلہ تھا۔ بالکل بوناپارٹسٹ انداز میں کسانوں پر مشتمل سرخ فوج کو بنیاد بناتے ہوئے ماؤ نے مختلف طبقات کے درمیان توازن برقرار رکھ کر اپنے اقتدار کو مستحکم کیا۔ اس نے مزدوروں اور کسانوں کا سہارا لے کر ماسکو کی طرز پر ایک ریاست استوار کی جس کے بعد وہ بغیر کوئی تکلیف اٹھائے بورژوازی سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ ٹراٹسکی کے بقول شیر کو مارنے کے لیے بندوق کی ضرورت ہوتی ہے اور جوں کے لیے محض انگلی کا ناخن ہی کافی ہوتا ہے! پہلے بورژوازی، مزدوروں اور کسانوں کے درمیان توازن قائم کیا تاکہ مزدوروں کو اقتدار میں آنے سے روکا جاسکے جس کے بعد ماؤ اور سٹالنسٹ قیادت نے بورژوازی کو بے دخل کیا اور بعدازاں مزدور جمہوریت کے لیے جو بھی عناصر ابھرے تھے انہیں کچل ڈالا۔

پھر بیوروکریسی نے واحد پارٹی قیادت کی آمریت کو ترویج دی جس کا مرکز فرد واحد یعنی ماؤ کی

بوناپارٹسٹ آمریت تھی۔ ظاہر ہے کہ سوشلزم تو ایک طرف رہا ایسے نظام کا ایک صحت مند مزدور ریاست سے بھی کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس کی 1917ء میں روس کے اندر رونما ہونے والے پرولتاری انقلاب سے کوئی قدر مشترک نہیں تھی جہاں پرولتاریہ اپنے اقتدار کا ذریعہ مزدوروں اور کسانوں کی منتخب کردہ سوویتوں کو بناتا تھا۔ ماؤ پرست نظام شروع ہی سے ایک مسخ شدہ ریاست تھی جس پر ایک پارٹی کی آمریت مسلط تھی۔ 1949ء کے چینی انقلاب کا آغاز وہاں سے ہوا جہاں روسی انقلاب کا خاتمہ ہوا تھا۔

مارکسسٹ نظریئے نے سوشلسٹ انقلاب اور سوشلزم تک عبوری دور کی ذمہ داری مزدور طبقے پر یونہی عائد نہیں کردی۔ مزدور طبقے کی آزادی بذات خود مزدور طبقے کا فریضہ ہے! یہ توثیق بلا جواز نہیں ہے۔ پیداوار میں اپنے یکتا کردار کی وجہ سے پرولتاریہ کو جو خصوصی شعور حاصل ہوتا ہے وہ کسی دوسرے طبقے کو نہیں ہوتا۔ چھوٹے صاحب جائیداد کسان میں اس شعور کے فروغ پانے کا امکان سب سے کم ہے۔ اس طبقے کو بنیاد بنا کر لایا جانے والا انقلاب اپنی نوعیت کی وجہ سے زوال پذیری اور بوناپارٹ ازم کا لازماً شکار ہوگا۔ جنگ عظیم دوم کے بعد کے دور میں بہت سے غیر ترقی یافتہ ممالک میں اس کی کامیابی کی وجہ یہی ہے کہ پرولتاری بوناپارٹسٹ آمریت ریاست، پارٹی، صنعت کے اعلیٰ عہدیداروں اور سائنس اور فنون لطیفہ سے لاتعلق رہنے والے دانشوروں کی مراعات کا تحفظ کرتی ہے۔

اس عمل کو نارمل سمجھنا مارکسی نقطہ نظر سے انحراف کرنا ہے۔ اس کی وضاحت صرف چین میں سرمایہ داری کے تعطل، سامراجیت کے اپاہج پن، سٹالنسٹ روس میں ایک طاقتور مگر مسخ شدہ بوناپارٹسٹ ریاست کے وجود اور سب سے بڑھ کر دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں مزدور انقلاب کی فتح میں ہونے والی تاخیر سے ہی ہوسکتی ہے۔ نو آبادیاتی ممالک انتظار نہیں کرسکتے تھے۔ ان کے مسائل بہت گھمبیر تھے۔ سرمایہ داری کی بنیاد پر آگے بڑھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ نو آبادیاتی ممالک میں راستے سے انحراف کی یہی وجہ تھی۔ لیکن سوویت یونین کی طرح اس کی قیمت دوسرا سیاسی انقلاب ہوگا۔ جس سے سماج، ریاست اور صنعت کا کنٹرول مزدور طبقے کے ہاتھ میں آجائے گا۔ صرف اسی طرح سوشلزم کی طرف عبور کی حقیقی معنوں میں شروعات یا اس سمت میں قدم اٹھانے کا آغاز ہوسکے گا۔

بعدازاں کیوبا میں بھی یہی عمل دہرایا جائے گا جہاں کاسترو ایک گوریلا جنگ کے ذریعے اقتدار میں آیا۔ نہ صرف مزدور طبقے بلکہ کسانوں اور پیٹی بورژوازی کی وسیع پرتوں کی نو آبادیاتی ممالک کے شہروں میں ''سوشلزم'' کے لیے حمایت کی وجہ جدید دور میں نو آبادیاتی ممالک کے اندر جاگیرداری اور

سرمایہ داری کا مکمل تعطل تھا۔اس کی ایک اور وجہ روسی اور چینی انقلابات اور صنعت اور معیشت میں ان کی وجہ سے ہونے والی زبردست ترقی بھی تھی۔ یہی عوامل تھے جنہوں نے پرولتاری بوناپارٹ ازم کی ترویج کی بنیاد رکھی۔آخری تجزیے میں ریاست مسلح افراد کے جتھوں پر مشتمل ہوتی ہے۔چیانگ کائی شیک کی فوج اور پولیس کی شکست اور تباہی اور کیوبا میں بٹسٹا کی فوج کی تباہی کے بعد اقتدار بالترتیب ماؤ اور کاسترو کے ہاتھوں میں آگیا۔اس حقیقت سے قطعاً کوئی فرق نہیں پڑا کہ ماؤ نام نہاد کمیونسٹ اور کاسترو ایک پیٹی بورژوا ڈیموکریٹ تھا۔

ان ممالک میں کلاسیکی خطوط پر مزدوروں کے اقتدار میں آجانے سے روسی بیوروکریسی کی حکمرانی پر نہایت تیزی سے منفی اثرات مرتب ہوتے۔لیکن مشرقی یورپ اور چین میں بورژوا ریاست کی تباہی کے بعد اس کی جگہ بوناپارٹسٹ نظام حکومت نے لے لی۔انہوں نے وہیں سے آغاز کیا جہاں سے روسی انقلاب کا خاتمہ ہوا تھا۔ایسی حکومتوں کے قیام سے ماسکو کو کوئی خطرہ درپیش نہیں تھا۔اس کے برعکس ایک پورے عہد کے لیے بیوروکریسی کی جکڑ بندی کو تقویت دی۔

مغربی یورپ، جاپان اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں سوشلسٹ انقلاب کی تاخیر کے باعث نوآبادیاتی عوام مزید انتظار نہیں کرسکتے تھے۔انہوں نے سامراجیت کے خلاف نہایت جرات مندانہ جدوجہد کی جو ناگزیر طور پر جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خلاف انقلابی جنگ میں تبدیل ہوگئی جیسا کہ ویت نام میں ہوا۔ پیروں سے ننگے ویتنامی کسانوں کی فوج نے امریکہ کو تاریخ میں پہلی مرتبہ شکست سے دوچار کیا۔الجزائر کے مزدوروں اور کسانوں نے ایک طویل اور خون ریز جدوجہد کے بعد فرانسیسی سامراج کو براہ راست حکمرانی ختم کرنے پر مجبور کردیا۔سابقہ نوآبادیاتی ممالک میں آنے والے انقلابات کو کچلنے میں سامراجیوں کی ناکامی کی بہت بڑی وجہ امریکہ اور یورپ میں عوامی مخالفت تھی۔ جب کوئی فوج مزید لڑنا نہ چاہے اور جب یہ باوردی مزدور 'نہیں' کہہ دیں تو انہیں دنیا کی کوئی طاقت نہیں ہلا سکتی۔اس حقیقت سے اس امر کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کو آزادی کیوں دی گئی اور امریکی سامراج چیانگ کائی شیک کے شانہ بشانہ لڑنے کے لیے فوج کیوں نہ بھیج سکا اگرچہ اس نے اسلحہ بہت بڑی مقدار میں بھیجا تھا۔جس میں سے زیادہ تر سرخ فوج کے ہاتھ لگ گیا۔

ماؤ کی قیادت میں ہونے والی 49-1944ء کی کسان جنگ ایک طرح سے 27-1925ء کے شکست خوردہ انقلاب سے ہی ماخوذ تھی مگر مزدور طبقے کے کردار کے حوالے سے بالکل ہی مختلف تھی۔ یہ

کسان جنگ پہلے گوریلا جنگ کی طرز پر لڑی گئی اور آخر کار کسانوں کی افواج کے ہاتھوں شہروں کی تسخیر پر ختم ہوئی۔ سابقہ انقلابات کے برعکس سوشلسٹ انقلاب کو مزدور طبقے کی شعوری شرکت اور کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ایسا کوئی انقلاب نہیں آسکتا جو پرولتاریہ کی آمریت پر منتج ہو۔ جیسا کہ لینن اور مارکس کا خیال تھا اور نہ ہی اس کے بغیر سوشلزم کی سمت عبوری دور کا آغاز ہوسکتا ہے۔

ایک ایسا انقلاب تاریخ کے پیش کردہ فرائض کی سطح تک کبھی بلند نہیں ہوسکتا جس کی بنیادی طاقت کسان ہوں۔ کسان ایک آزاد کردار ادا نہیں کرسکتے وہ یا تو بورژوازی کی حمایت کریں گے یا پرولتاریہ کی۔ جہاں پرولتاریہ انقلاب کی قیادت نہ کر رہا ہو، بورژوا سماج کے تعطل کا شکار ہونے کی وجہ سے کسان فوج کو بورژوازی کی بے دخلی، مختلف طبقات کے درمیان بوناپارٹسٹ پینتروں اور سٹالنسٹ روس کے ماڈل پر ایک ریاست کی تعمیر کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چین، یوگوسلاویہ اور بعدازاں کیوبا، ویت نام، برما اور دیگر بہت سے پرولتاری بوناپارٹسٹ ممالک میں ایسا ہی ہوا تھا۔

تاہم چینی انقلاب کی فتح، جس کی شروع میں سٹالن نے مخالفت کی تھی، اور مشرقی یورپ میں سرمایہ داری کا تختہ الٹے جانے سے طاقتوں کا عالمی توازن عالمی سامراج کے خلاف ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان انقلابات نے ترقی یافتہ ممالک میں اسی قسم کی انقلابی لہر پیدا نہیں کی جیسی 1917ء کے اکتوبر انقلاب کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ان تمام صورتوں میں سرمایہ داری کا تختہ ایسے بوناپارٹسٹ انداز میں الٹایا گیا جس میں مزدوروں کا کردار ثانوی حیثیت رکھتا تھا۔ ان تمام صورتوں میں قائم ہونے والی حکومتیں سٹالنسٹ روس کی طرز پر تھیں جن میں پولیس کی دہشت تھی، عدم مساوات تھی، آزادی عنقا تھی اور یہ خوفناک حد تک مسخ شدہ نوکر شاہانہ ریاستیں تھیں۔ ایسی حکومتیں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مزدوروں کے لیے کوئی بنیادی کشش نہیں رکھتی تھیں۔

سٹالن سے خروشیف تک

جنگ میں سٹالنسٹ روس کی فتح کے بعد 1949ء کے چینی انقلاب اور مشرقی یورپ میں سٹالنسٹ حکومتوں کے قیام نے روسی نظام کو ایک پورے تاریخی عہد کے لیے تقویت بخش دی۔ کامیابی سے سرشار سٹالنسٹ اپنے نظام کو ''سوشلزم کی واحد ممکنہ شکل'' کے طور پر پیش کرنے کے قابل ہوگئے۔ تاہم سٹالنسٹ

بیوروکریسی کے بظاہر قائم ودائم رہنے کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ اس سارے دور میں وہ پیداواری قوتوں کو فروغ دینے میں واقعی کامیاب رہی۔ایک پسماندہ ملک سے ترقی پا کر روس روئے زمین کی دوسری بڑی صنعتی قوت اور فوجی لحاظ سے سب سے بڑی قوت بن گیا۔

1945ء کے بعد ایک لمبے عرصے تک ''جرمن معجزے'' اور ''جاپانی معجزے'' کے بارے میں گفتگو کرنا فیشن میں داخل تھا۔اگر یہ پیش رفتیں بھی حقیقی تھیں مگر جنگ عظیم کے بعد تعمیرنو کے عرصے میں سوویت یونین نے جو زبردست پیش رفت کی اس کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔روئے زمین کے کسی ملک نے ایسی بربادی کا سامنا نہیں کیا تھا۔2 کروڑ 70 لاکھ افراد مارے گئے، صنعت اور انفراسٹرکچر بری طرح تباہ ہو گیا۔یہ تھی ساڑھے چار سال تک روسی سرزمین پر لڑی جانے والی جنگ کی فرد میزان۔علاوہ ازیں جرمنی اور جاپان کے برعکس سوویت یونین کو مارشل پلان کے فوائد بھی حاصل نہیں تھے۔اس کے باوجود پانچ سال کے اندر جنگ میں ہونے والی تباہی پر قابو پا لیا گیا اور ایسا بیرونی امداد سے نہیں بلکہ وسائل کے منصوبہ بندی پر مبنی استعمال اور عوام کی زبردست کوششوں کے نتیجے میں ہوا۔

ماسکو میں برطانوی انٹیلی جنس کا سابقہ افسر ہونے کے ناطے ایڈورڈ کرینکشا کو کسی بھی طور پر سوویت یونین کا ہمدرد خیال نہیں کیا جا سکتا۔مگر اس نے سوویت معیشت کی پیش رفت کا جو جائزہ پیش کیا ہے اسے بڑی حد تک معروضی تصور کیا جا سکتا ہے۔علاوہ ازیں اس زمانے میں اکثر مغربی مبصرین بھی اس کے ہم خیال تھے۔صرف اس وقت اکتوبر انقلاب کو دفن کرنے میں جس ناشائستہ جلد بازی کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے اس کے زیر اثر وہ تاریخی حقائق کی پردہ پوشی پر اتر آئے ہیں تا کہ ثابت کیا جا سکے کہ منصوبہ بند معیشت سے کچھ حاصل نہیں ہو سکا تھا۔مندرجہ ذیل اعداد و شمار جو کرینکشا کی کتاب ''خروشیف کا روس'' سے لیے گئے ہیں صورت حال کو بالکل واضح کر کے دکھاتے ہیں:

''پہلے پانچ سالہ منصوبے کے آغاز پر 1928ء میں سٹیل کی پیداوار 4.3 ملین ٹن تھی، کوئلے کی 35.5 ملین ٹن اور تیل کی پیداوار 11.5 ملین ٹن تھی جب کہ بجلی کی پیداوار 1.9 ملین کلوواٹ تھی۔پہلے منصوبے کے اختتام پر 1934ء میں پیداوار میں حسب ذیل اضافہ ہوا۔سٹیل 9.7 ملین ٹن، کوئلہ 93.9 ملین ٹن، تیل 24.2 ملین ٹن، بجلی کی پیداوار 6.3 ملین کلوواٹ۔''

''1940ء میں سوویت یونین پر جرمن حملے کے وقت پیداوار کچھ یوں تھی، سٹیل 18.3 ملین ٹن، کوئلہ 166 ملین ٹن، تیل 31 ملین ٹن اور بجلی کی پیداوار 11.3 ملین کلوواٹ۔1945ء میں جنگ کے

خاتمے کے موقع پر پیداوار میں کچھ اس طرح کی ہوئی:

سٹیل 11.2 ملین ٹن، کوئلہ 149.3 ملین ٹن، تیل 19.4 ملین ٹن، بجلی کی پیداوار 10.7 ملین کلوواٹ۔ یہ حقیقت مدنظر رکھی جانی چاہئے کہ زیادہ تر بھاری صنعت کو مشرق میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور اسے اولین ترجیح دی گئی تھی۔"

"1946ء میں سٹالن نے نئے اہداف مقرر کیے۔ سب سے پہلے ملک کی حالت کو بحال کیا جانا تھا اور اس کے بعد معیشت کو بہت وسیع کیا جانا تھا تاکہ اس کے بقول سوویت یونین "حادثات سے مکمل طور پر محفوظ" کیا جا سکے۔ اس کے ذہن میں کم از کم تین عدد پانچ سالہ منصوبوں کا سلسلہ تھا۔ اس کے 1960ء تک کے لیے نئے اہداف یہ تھے، سٹیل 60 ملین ٹن، کوئلہ 500 ملین ٹن، تیل 60 ملین ٹن۔ یہ سٹالن کے تصور کا نقطہ عروج تھا۔ 15 سال کے عرصے میں ان اہداف کے حصول کا مطلب نہ صرف بیرونی مبصرین بلکہ روسی مبصرین اور بذات خود سٹالن کے نزدیک کم از کم 15 سال کے عرصے پر محیط سوویت عوام کی بے ثمر محنت اور بدحالی ہوتی۔"

"اور جب 1960ء میں ہدف پورا کر لیا گیا تو سوویت پیداوار امریکہ کی 1950ء کی پیداوار سے پھر بھی کم تھی، سٹیل 90 ملین ٹن، کوئلہ 700 ملین ٹن اور تیل 250 ملین ٹن۔"

"حقیقت میں ہوا کیا تھا؟ تمام صورتوں میں سٹالن کے 1960ء تک مقرر کردہ اہداف سے پیداوار کہیں بڑھ گئی تھی، 1958ء میں سٹیل کی پیداوار 1960ء کے لیے مقرر شدہ پیداوار سے صرف دو ملین ٹن کم تھی، کوئلے کے لیے 1960ء کا ہدف پورا کر لیا گیا تھا، 1960ء کے لیے تیل کے ہدف کے مقابلے میں پیداوار تقریباً دگنی ہو گئی تھی یعنی 113 ملین ٹن۔"

"اگرچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ڈیمری یروشوف نے کچھ زیادہ ہی شیخی بگھاری تھی (سوویت یونین 1956ء میں 60 ملین ٹن سے کافی کم مقدار میں سٹیل پیدا کر رہا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ 1965ء میں بھی 100 ملین کے ہدف سے کم پیداوار ہوئی یعنی 91-86 ملین ٹن کے قریب) لیکن یہ واقعی درست بات ہے کہ رفتار انتہائی تیز ہے۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ساتھ ہی ساتھ ملک میں خوشحالی اور فکر کی آزادی میں اضافہ ہو رہا ہے خصوصاً معاشی شعبے کے اندر۔"

"جنوری 1959ء میں پیش کیا جانے والا سات سالہ منصوبہ ایک پراعتماد فتح کا شادیانہ تھا اور خروشیف کی زبان میں اس کا خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے "تخت یا تختہ"۔ نئے اہداف کے مقابلے میں

سٹالن کے خواب بھدے اور دقیانوسی دکھائی دیتے ہیں، سٹیل 91 ملین ٹن، کوئلہ 609 ملین ٹن اور تیل 240 ملین ٹن۔'' وہ مزید لکھتا ہے ''اس کا مطلب ایک جذبہ انتقام کے ساتھ امریکہ کا پیچھا کرنا ہے۔'' (26)

ایک اور تبصرہ نگار لیونارڈ شپیرو، جس پر سوویت یونین کا دوست ہونے کا قطعاً شبہ نہیں کیا جا سکتا، لکھتا ہے:

''1948ء میں یہ ملک ایک بار پھر اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں اس نے جنگ کی تباہ کاریوں پر قابو پانا شروع کر دیا تھا۔ 1947ء کے بعد ہونے والی بحالی واقعی قابل تحسین تھی۔ 1947ء میں مجموعی صنعتی پیداوار ابھی 1940ء کی سطح کو نہیں پہنچ پائی تھی۔ 1948ء میں پیداوار اس سطح کو عبور کر چکی تھی اور سٹالن کی زندگی کے آخری سال یعنی 1952ء میں یہ اس کے مقابلے میں سوا دو گنا ہو چکی تھی۔ پہلے سے طے شدہ پالیسی کے مطابق زیادہ پیش رفت ذرائع پیداوار کی مد میں ہوئی لہٰذا 1952ء میں اس ضمن میں ہونے والی ترقی 1940ء کے مقابلے میں اڑھائی گنا تھی جب کہ اشیائے صرف کی پیداوار میں ڈیڑھ گنا سے کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوا تھا۔'' (27)

کیا یہ اعداد و شمار حساب کتاب میں ہیرا پھیری کا نتیجہ ہو سکتے ہیں؟ یہی مصنف ایک فٹ نوٹ کی شکل میں اضافہ کرتا ہے۔ ''ہو سکتا ہے سرکاری اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر پیش کیے گئے ہوں (وہ قاری کی توجہ مطالعے کی طرف دلاتا ہے جس میں 'معمولی نوعیت کی تنقید' کی گئی ہے) لیکن تمام مغربی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ 1947ء کے بعد ہونے والی صنعتی بحالی کی شرح قابل داد تھی۔'' (28)

یہ بات درست ہے کہ معیار زندگی پست رہا۔ قیادت کی پالیسی یہ تھی کہ اشیائے صرف کی پیداوار کے مقابلے میں بھاری صنعت پر زیادہ توجہ مرکوز کی جائے اگرچہ جنگ میں ہونے والی زبردست تباہی کے باعث ایسا ہونا کسی حد تک ناگزیر بھی تھا۔ لیکن جب تک پیداواری قوتوں کو ترقی دی جاتی رہی مزدور یہ محسوس کرتے رہے کہ سماج آگے کی طرف جا رہا ہے۔ ملک میں بھی فاشزم کے خلاف زبردست فتح اور چین اور مشرقی یورپ میں سرمایہ داری کا تختہ الٹے جانے پر جوش و خروش پایا جاتا تھا۔ صحت اور تعلیم کے شعبوں میں بھی مزید پیش رفت ہوئی۔ معیشت میں پیش رفت اور ناخواندگی کے تقریباً مکمل خاتمے کی وجہ سے سوویت یونین میں طاقتوں کا ایک نیا تناسب ظاہر ہوا۔ تاہم مزدوروں کی پیدا کردہ دولت کا کثیر حصہ بیوروکریسی ہڑپ کر جاتی تھی جب کہ سوویت یونین میں وسائل کی تقسیم کے سلسلے میں بھی مزدوروں سے

قطعاً کوئی رائے نہیں لی جاتی تھی۔

معیارِ زندگی کی پستی اور مادی دشواریوں (رہائش کے مسئلے کی نوعیت خاص طور پر بہت سنگین تھی) کے باوجود ایک عمومی رجائیت کی فضا پائی جاتی تھی۔موجودہ صورتحال بالکل اس کے متضاد ہے۔ معیارِ زندگی کی بربادی جو سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک سے منسلک ہے کسی رجائیت کا موٴجب نہیں بن سکی بلکہ اس سے مستقبل کے بارے میں عدم اعتماد اور خوف ہی پیدا ہوا ہے۔آبادی میں اضافے کی شرح کے حوالے سے بآسانی ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جنگ کے بعد شرح پیدائش میں تیز رفتاری سے اضافہ ہوا۔ پچھلے پانچ سال کے عرصے میں نہ صرف روس بلکہ تمام مشرقی یورپ میں بھی شرح پیدائش میں زبردست کمی واقع ہوئی ہے۔ یہ انتہائی ابتدائی نوعیت کا انسانی ردعمل ہمیں سماج کی طرف لوگوں کے حقیقی رویے کے بارے میں کسی بھی انتخابی اعدادوشمار کے مقابلے میں زیادہ بہتر آگہی دیتا ہے۔

ان داخلی اور خارجی کامیابیوں کے باعث بیوروکریسی مستقبل کے بارے میں نہایت پرامید تھی۔ ان کی قوت اور وقار میں بھی اسی قدر اضافہ ہوا جس قدر بذات خود روس کا ہوا تھا۔ برسرِ اقتدار ٹولے کا خیال تھا کہ اس کا ''تاریخی مشن'' صدیوں تک جاری وساری رہے گا۔ساتھ ہی ساتھ مراعات یافتہ اہلکاروں اور عوام کے درمیان خلیج پیداوار میں ترقی کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتاری سے وسیع ہوتی گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے باعث تفریق میں اضافہ جاری رہا۔پارٹی اور ریاست کے اعلیٰ اداروں میں براہ راست رشوت متعارف ہوئی جسے ''پاکتی'' کہا جاتا تھا۔اعلیٰ اہلکاروں کو ماہانہ بنیادوں پر تنخواہ کے علاوہ بھی ایک لفافہ دیا جاتا تھا جس میں خطیر رقم موجود ہوتی تھی۔ یہ ادائیگیاں مخصوص ذرائع سے کی جاتی تھیں جن پر کوئی ٹیکس نہیں دیا جاتا تھا اور انہیں بالکل خفیہ رکھا جاتا تھا۔میڈویڈیف لکھتا ہے ''بذات خود سٹالن اور پولٹ بیورو کے اراکین پر اٹھنے والے اخراجات کا کوئی حساب نہیں رکھا جاتا تھا۔ بے شمار دیہی بنگلوں اور شہری رہائش گاہوں، گھریلو ملازمین کی کثیر تعداد کے علاوہ ان کے محافظوں اور سٹاف پر اٹھنے والے اخراجات کی مد میں سالانہ کروڑوں روبل خرچ ہوتے تھے۔ اور جہاں تک سٹالن پر ہونے والے اخراجات کا تعلق ہے تو ان کا حساب کرنا تقریباً ناممکن ہے۔''(29) بیوروکریسی کی آمدنی کے ذرائع ''قانونی'' بھی تھے اور ''غیر قانونی'' بھی۔

ٹراٹسکی کہتا ہے ''بیوروکریسی اپنی مراعات طاقت کے ناجائز استعمال کی شکل میں حاصل کرتی ہے۔وہ اپنی آمدنی چھپاتی ہے، وہ ایک ایسا جھوٹا تاثر دیتی ہے گویا ایک خصوصی سماجی گروہ کے طور پر اس کا

کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اس کا قومی آمدنی کے ایک ضخیم حصے کو ہڑپ کر جانا، ایک طرح سے سماجی طفیلیت ہے۔" (30) یہ حقیقت سٹالن اور دیگر سوویت لیڈروں کی "بیوروکریسی" کے خلاف چلائی جانے والی بے شمار آمرانہ مہموں سے قطعاً متصادم نہیں جن کا مقصد نوکر شاہی ٹولے کو کمزور کرنا نہیں بلکہ اسے مضبوط بنانا تھا۔

جنگ عظیم کے بعد کے سالوں میں صنعتی مزدوروں کی حقیقی اجرت اور اعلیٰ ترین عہدیداروں کی تنخواہ کے درمیان فرق ناقابل یقین حد تک بڑھ گیا تھا۔ مزدوروں اور منیجروں کے درمیان تنخواہ کا فرق عام طور پر سرمایہ دار مغرب سے بھی زیادہ تھا۔ رائے میڈویڈیف لکھتا ہے "ایک چھوٹے سے تحقیقی ادارے کے اندر جس کا تعلق جسمانی محنت کرنے والے پیشہ ور مزدوروں کی تربیت کے مسائل سے تھا، میں نے دس برس تک کام کیا۔ اس ادارے میں سب سے کم تنخواہ پانے والے ریسرچ اسسٹنٹ کی تنخواہ جو 60 یا 70 روبل ہوتی تھی اور سب سے زیادہ تنخواہ پانے والے یعنی سیکشن ہیڈ کی تنخواہ کا تناسب ایک اور پندرہ یا ایک اور بیس تھا۔ اکیڈیمی آف سائنسز کے بڑے اداروں میں بغیر ڈگری کے لیبارٹری اسسٹنٹ یا جونیئر ریسرچ ورکر اور شعبے کے انچارج کی تنخواہ کا تناسب ایک اور تیرہ کا تھا۔"

"سوویت وزارتوں اور اہم فوجی اداروں میں کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ تنخواہوں کی شرح کا تناسب ایک اور بیس بلکہ ایک اور تیس تک ہے۔ لیکن اگر ہم ان بہت سی خدمات کو بھی اس میں شامل کرلیں جو اہلکاروں کو سرکاری خرچے پر حاصل ہوتی ہیں (خوراک کے کوپن، علاج معالجہ، چھٹیاں، گاڑی وغیرہ) تو مالی حوالے سے مجموعی طور پر یہ شرح ایک اور پچاس اور بعض اوقات ایک اور سو تک ہو جاتی ہے۔" (31) یہ فرق سرمایہ دار مغرب کے مقابلے میں بھی بہت زیادہ تھا۔

یہ صورتحال غیر معینہ مدت تک جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ مزدور طبقہ بعض مخصوص حالات کے تحت قربانیاں دینے کو تیار ہوتا ہے۔ خصوصاً اگر اسے یقین ہو کہ وہ سوشلسٹ خطوط پر سماج کی تبدیلی کے لیے لڑ رہا ہے۔ لیکن ایسے یقین کی شرط یہ ہوتی ہے کہ قربانی مساوی طور پر دی جائے۔ لیکن جب مزدوروں کی کوششوں اور قربانیوں کا غلط استعمال کرتے ہوئے مٹھی بھر افراد کو بے پناہ مراعات دے دی جائیں تو جلد یا بدیر اس دھوکہ دہی کا نتیجہ ایک دھماکے کی صورت میں برآمد ہوگا۔ ایک ایسے سماج کے لیے یہ بات اور بھی زیادہ درست ہے جو سوشلزم اور کمیونزم کا جھوٹا نام لیوا ہو۔

سٹالن کی آخری تطہیر

لارڈ ایکٹن کا مشہور زمانہ قول ہے ''طاقت بدعنوانی کی طرف لے جاتی ہے اور مطلق طاقت مطلق طور پر بدعنوان بناتی ہے۔'' ہر قسم کی آمرانہ حکومتوں پر بظاہر یہی اثر پڑتا ہے۔ مطلق العنانیت پر مبنی نظام حکومت، جس میں ہر قسم کی تنقید پر پابندی ہوتی ہے، فرد کے ارادے اور معروضی حقیقت کے درمیان فرق کو دھندلا کر کے آخر کار ذہن کو غیر متوازن کرنے کا باعث بن جاتا ہے۔ ہٹلر کے سلسلے میں تقریباً یقینی طور پر ایسا ہی ہوا تھا اور آخری وقت میں سٹالن کا دماغ بھی واضح طور پر ہل گیا تھا۔ کسی بھی قسم کی پابندی یا کنٹرول کی عدم موجودگی کے باعث وہ خود کو قادر مطلق سمجھنے لگا تھا۔ عوام کے خوف نے بیوروکریسی کو اپنے قائد کے گرد اکٹھا کر دیا کیونکہ وہ انکی مراعات کے لیے ضمانت فراہم کرتا تھا۔ معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جبر کی شدت میں اور سٹالن کی شخصیت کی پرستش میں بھی اضافہ ہوا۔ پارٹی کی انیسویں کانگریس میں ہمیں شخصیت پرستی کا سب سے مضحکہ خیز اظہار نظر آیا۔ ذیل میں مالنکوف کی اختتامی تقریر سے کچھ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

''کامریڈ سٹالن کی حال ہی میں شائع ہونے والی تحریر مارکسسٹ لینن اسٹ نظریئے اور ہماری تمام عملی سرگرمیوں کے لیے انتہائی اہمیت کی حامل ہے، اس کا نام 'سوویت یونین میں سوشلزم کے معاشی مسائل' ہے۔ (دیر تک زور زور سے تالیاں بجائی گئیں)

لہٰذا ہماری آئندہ پیش رفت کے لیے پارٹی نے جو منصوبے بنائے ہیں ان کی بنیاد معاشی قوانین اور کمیونسٹ سماج کی تعمیر کی سائنس کا وہ علم ہے جو کامریڈ سٹالن نے مہیا کیا ہے۔ (زوردار تالیاں دیر تک بجتی رہیں)۔

کامریڈ سٹالن نے جدید سرمایہ داری کے ابتدائی قانون اور سوشلزم کے بنیادی معاشی قوانین دریافت کر کے مارکسی سیاسی معاشیات میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔'(!)

''کامریڈ سٹالن کی دریافت، کامریڈ سٹالن ثابت کرتے ہیں، کامریڈ سٹالن نے ہمیں راستہ سمجھایا ہے، کامریڈ سٹالن نے دریافت کیا، کامریڈ سٹالن نے انکشاف کیا ہے۔۔۔''

''کامریڈ سٹالن کی تحریریں اس غیر معمولی اہمیت کا واضح ثبوت ہیں جو ہماری پارٹی نظریے کو دیتی ہے۔۔۔ کامریڈ سٹالن مستقل طور پر مارکسی نظریے کو فروغ دیتے رہے ہیں۔۔۔ کامریڈ سٹالن نے سماجی

ترقی کے آلے کی حیثیت سے زبان کے فعل کو دریافت کیا ہے اور مستقبل میں قومی ثقافتوں اور زبانوں کی ترقی کے امکانات کی نشاندہی کی ہے۔''

اور بالآخر دادِ تحسین کے لیے بجائی جانے والی زوردار تالیوں کے طویل اور بہت زیادہ طویل وقفوں کے بعد:

''لافانی لینن کے بینر تلے۔۔۔عظیم سٹالن کی خرد سے بھرپور قیادت میں آگے بڑھو کمیونزم کی فتح کی طرف۔''

''(رپورٹ کے اختتام پر تمام نمائندوں نے کھڑے ہو کر کامریڈ سٹالن کو دیر تک زوردار تالیاں بجا بجا کر خراجِ تحسین پیش کیا۔ حال کے تمام حصوں سے یہ نعرے سنائی دے رہے تھے، عظیم سٹالن زندہ باد، شاباش ہمارے پیارے سٹالن، ہمارا پیارا قائد اور استاد کامریڈ سٹالن زندہ باد۔)''(32)

ان ساری باتوں سے مطمئن نہ ہوتے ہوئے سٹالن روس میں 38-1936ء کے دور جیسی مزید خون ریز تطہیرات کا سلسلہ شروع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسے کسی پر بھی اعتماد نہیں رہا تھا۔ ایسے لوگوں کو بھی پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا جو زندگی بھر سٹالنسٹ رہے تھے۔ 1952ء میں سٹالن نے مولوٹوف اور وروشیلوف جیسے وفادار اور کٹھ پتلی لوگوں پر بھی برطانوی جاسوس ہونے کا الزام لگایا اور ان کی اعلیٰ سطحی اجلاسوں میں شرکت پر بھی پابندی عائد کر دی۔ میکویان کو ترکی کا جاسوس قرار دیا گیا اور یہاں تک کہ سٹالن نے بیریا کو بھی دیس سے نکال دیا! بائیسویں کانگریس میں خروشیف نے سٹالن کے حلقے میں خوف و ہراس کی فضا کو یوں بیان کیا ''سٹالن اپنی ہی میز پر بیٹھے کسی کامریڈ سے کہتا 'تمہاری نظریں کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی ہیں'، اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ جس کامریڈ کی نظریں مبینہ طور پر بدلی بدلی دکھائی دے رہی تھیں وہ مشکوک ہے۔''(33)

جنوری 1953ء میں پراودا اخبار نے ڈاکٹروں کی ایک نام نہاد سازش کی خبر دی جس کے مطابق ''تخریب کار ڈاکٹروں کے ایک گروہ'' کو گرفتار کر لیا گیا تھا جو ''روس کے نمایاں راہنماؤں کو ختم کرنا'' چاہتے تھے۔ ان میں سے اکثر یہودی تھے اور ان پر الزام لگایا گیا کہ ان کا تعلق ''جائنٹ'' نامی یہودی تنظیم سے تھا جسے امریکی سامراج کی مدد سے چلایا جا رہا تھا۔ گرفتار شدگان میں سے تین پر برطانوی انٹیلی جنس کے لیے کام کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔ یہودیوں کے خلاف ''کاسموپولٹین ازم اور صہونیت'' کے پردے میں مہم چلائی گئی۔ پراودا نے ''ردِ انقلاب'' کے خطرے کے خلاف مہم چلانی شروع کر دی۔ یوں محسوس ہوتا

تھا کہ ایک تطہیر کی آمد آمد ہے جس نے حکمران ٹولے میں خوف و ہراس کی لہر دوڑا دی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سٹالن ان سب کو ختم کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میڈویڈیف لکھتا ہے ''تمام علامات سے ظاہر ہوتا تھا کہ 1937ء پھر آ رہا ہے۔'' (34) لیکن ان کا محرک محض ذاتی مفاد نہیں تھا کیونکہ ایک بڑے پیمانے پر ہونے والی تطہیر سے بیوروکریسی کی حیثیت کو خطرہ لاحق ہو جاتا۔

سٹالن کے اقدامات ساری بیوروکریسی کے لیے خطرہ بن رہے تھے۔ صرف یہی بات نہیں کہ وہ بالائی پرت کو قتل کرنے کے درپے تھا۔ سوویت یونین نے ابھی بمشکل جنگ کی تباہ کاریوں سے بحال ہونا شروع کیا تھا۔ اسے ایک اور تطہیر کے انتشار اور پاگل پن کی نذر کرنے کے انتہائی تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ تاہم 5 مارچ 1953ء کو اچانک سٹالن کا انتقال ہو گیا۔ اگر اسے قتل نہ بھی کیا گیا ہو، اور تمام شواہد اسی جانب اشارہ کرتے ہیں، تو بھی اس کی موت کے لیے اس سے زیادہ مناسب وقت کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے فوراً بعد ڈاکٹروں کی سازش کے کیس کو جعلی قرار دے دیا گیا۔ سارے نظام کو خطرے میں ڈال دینے والی خونی تطہیر کی بجائے ضرورت اس امر کی تھی کہ نوکر شاہانہ حکمرانی کو برقرار رکھنے کے لیے اوپر سے اصلاحات نافذ کی جائیں۔

سٹالن کی موت نے بیوروکریسی کے اندر اقتدار کی جدوجہد کو جنم دیا۔ بیوروکریسی اپنی جکڑ بندی کو ڈھیلا کرنے پر مجبور ہو گئی۔ نیچے سے آنے والے انقلاب سے بچنے کے لیے اوپر سے کی جانے والی اصلاحات کی ضرورت تھی۔ مشرقی جرمنی کی حکومت پہلے ہی زبردست احتجاجوں کے باعث ہل رہی تھی۔ جبری مشقت کے کیمپوں میں بڑے پیمانے پر بغاوتیں ہوئیں جنہیں خون ریزی کے ذریعے دبا دیا گیا۔ مزدوروں اور دانشوروں کی بے چینی نئی انتہاؤں کو چھونے لگی۔ خروشیف کی سرکردگی میں ''اصلاحات'' کے حامی اقتدار پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جیسا کہ خروشیف نے اپنی یادداشتوں میں وضاحت کی ہے، بیوروکریسی نرمی کے نتیجے میں شروع ہونے والی تحریک سے خوفزدہ تھی۔ لیکن ان کے پاس کوئی اور چارہ کار نہیں تھا۔ خروشیف لکھتا ہے ''مجھ سمیت لیڈرشپ میں موجود لوگ اس نرمی کے حق میں تھے۔ ہم خوفزدہ تھے، صحیح معنوں میں خوفزدہ۔ ہمیں یہ ڈر تھا کہ یہ پگھلاؤ کسی سیلاب کا سبب نہ بن جائے جسے ہم روکنے کے قابل نہ ہوں اور وہ ہمیں بہا لے جائے۔ یہ ہمیں کس طرح ڈبو سکتا تھا؟ یہ سوویت دریا کے کناروں کے اوپر سے بہتا ہوا ایک طوفانی لہر بن کر ہمارے سماج کی تمام رکاوٹوں اور حفاظتی بندوں کو بہا لے جاتا۔ قیادت کے نقطہ نظر کی رو سے یہ ایک نامناسب تبدیلی ہوتی۔ ہم اس بہاؤ کی پیش رفت کو

ایک ایسے راستے پر لگانا چاہتے تھے جو صرف ان تخلیقی قوتوں کو تحریک دے جو سوشلزم کو تقویت دینے کا باعث بن سکیں۔'' (35) قاری کو چاہیے ''سوشلزم'' کی بجائے ''بیوروکریسی'' کی حکمرانی پڑھے۔اس کے نتیجے میں سرکردہ ہارڈ لائن سٹالنسٹوں کی تطہیر عمل میں لائی گئی۔ ریاستی خفیہ پولیس کا محاسبہ کیا گیا اور بیریا کو گولی سے اڑا دیا گیا۔ بہت زیادہ سخت گیر قوانین کو ختم کر دیا گیا اور وارکوٹا اور دوسرے کیمپوں میں قیدیوں کی شورشوں کے بعد جبری مشقت کے کیمپوں کی تعداد میں کمی کر دی گئی۔ سیاسی قیدیوں کے علاوہ تمام قیدیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کر دیا گیا۔

بھاری صنعت کی تعمیر پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کی وجہ سے پیدا ہونے والے عدم توازن کو جزوی طور پر درست کر کے اشیائے صرف کی پیداوار میں بہتری کی طرف توجہ دی گئی۔ پیداوار بڑھانے کے لیے خروشیف نے قیمتوں میں اصلاحات لانے کے علاوہ کئی دیگر اقدامات بھی کیے۔مزدوروں کو عام نوعیت کی مراعات دی گئیں۔ فیکٹریوں کے نظام کی سخت گیری کو کم کیا گیا۔اوسط اجرت 1955ء میں 715 روبل تھی جو بڑھ کر 1958ء میں 778 روبل ہوگئی۔سرکاری پرائس انڈکس میں 1954ء سے 1980ء تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ بہت سی اشیا کی قیمتوں میں کمی کی گئی۔ 1957ء میں ایک مہم شروع کی گئی جس کا مقصد گوشت، دودھ اور مکھن کی پیداوار کو امریکہ کے مقابلے پر لانا تھا۔اجتماعی کام سے حاصل ہونے والی مجموعی آمدنی اجناس اور نقد رقم کو ملا کر 1952ء میں 47.5 ہزار ملین تھی جو بڑھ کر 1957ء میں 83.8 ہزار ملین ہوگئی۔ 1950ء سے 1958ء کے درمیان فی کس حقیقی کھپت میں 66 فیصد اضافہ ہوا اور مجموعی طور پر یہ 1944ء کے مقابلے میں تین گنا تھا۔

سوویت یونین اب ماضی کی ایک پسماندہ معیشت نہیں تھا بلکہ دنیا کی دوسری بڑی سپر پاور کے طور پر ابھر رہا تھا۔اب اس کی تقریباً آدھی آبادی شہروں میں رہتی تھی۔اس کے مزدوروں کی تعداد 1928ء میں 3.8 ملین تھی جو بڑھ کر ڈرامائی طور پر 1955ء میں 17.4 ملین ہوگئی۔اس کے مقابلے میں امریکہ میں اسی عرصے کے دوران صرف ایک تہائی تعداد کا اضافہ ہوا۔ 1928ء میں سوویت یونین میں صنعتی مزدوروں کی تعداد امریکہ کی نسبت ایک تہائی تھی جبکہ 1955ء میں یہ تعداد امریکہ سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد سوویت پرولتاریہ کی تعداد میں ہر سال بیس سے تیس لاکھ کا اضافہ ہوا۔مغرب کے مقابلے میں یہ فیکٹریاں انتہائی دیوہیکل تھیں جہاں پرولتاریہ کا ارتکاز ہو رہا تھا۔مثال کے طور پر گورکی کار پلانٹ میں دو لاکھ مزدور کام کرتے تھے۔تولگیاتی فیکٹری میں 170,000 مزدور کام کرتے تھے۔ یہ

دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے طاقت ور مزدور طبقہ تھا۔

نوجوان مزدوروں کے لیے تنخواہ میں کٹوتی کے بغیر اوقات کار میں کمی متعارف کروائی گئی، چھٹیاں زیادہ کی گئیں اور ہفتے کے اوقات کار میں دو گھنٹے کمی کی گئی جب کہ بتدریج یومیہ کام کے وقت کو سات گھنٹے تک لایا جاتا تھا۔ زچگی کے دوران تنخواہ کے ساتھ چھٹی کو 112 دن کیا جاتا تھا۔ پنشنوں اور معذوری کی صورت میں ملنے والی ادائیگیوں میں اضافہ کیا گیا، اوسط پنشن میں 81 فیصد اضافہ ہوا۔ رہائشی مکانات کی تعمیر کا بہت بڑا پروگرام شروع کیا گیا۔ 1950ء سے 1970ء تک بیس سالوں میں سوویت یونین میں غذا کی فی کس کھپت میں دوگنا، قابل خرچ آمدنی میں چار گنا اور دیرپا اشیا کی خریداری میں 12 گنا اضافہ ہوا۔(36)

1956ء کی بیسویں پارٹی کانگریس میں خروشیف نے اپنی مشہور ''ڈی سٹالنائزیشن'' تقریر کی۔ ہر جرم کو سٹالن کے سر منڈھ دیا گیا۔ کہا گیا کہ اصل مسئلہ ''شخصیت پرستی'' کا تھا۔ سٹالن کو جھوٹے مقدمات، قتل و غارت، جبر، جبری مشقت کے کیمپوں اور روسی عوام کے علاوہ چھوٹی قوموں کے خلاف کیے گئے تمام گھناؤنے جرائم کے لیے موردِ الزام ٹھہرایا گیا۔ لیکن فردِ واحد یہ سارے کام کس طرح کر سکتا تھا؟ ایسی پوزیشن کا مارکسزم سے کوئی واسطہ نہیں کیونکہ مارکسزم تاریخ کی وضاحت ''عظیم افراد'' کے حوالے سے نہیں کرتا۔ تاریخ کا مادی تصور وضاحت کرتا ہے کہ اگر کوئی خیال پیش کیا جاتا ہے (چاہے یہ خیال غلط ہی کیوں نہ ہو) اور اسے عوامی حمایت حاصل ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سماج کے اندر موجود کسی نہ کسی گروہ یا طبقے کے مفادات کی نمائندگی کرتا ہے۔ لہٰذا اگر سٹالن پرولتاریہ کی نمائندگی نہیں کرتا تھا تو پھر وہ کس کی نمائندگی کرتا تھا؟ خود اپنی! نہیں۔ سٹالن لاکھوں اہلکاروں پر مشتمل نوکرشاہی ٹولے کی نمائندگی کرتا تھا جن کا پارٹی اور حکومت پر غلبہ تھا اور جو صنعت، سماج اور ریاست کو اپنے مفادات کے لیے چلاتے تھے۔

سٹالن کو لعنت ملامت کرنے کے بعد خروشیف نے ''کامریڈ'' بیریا کی طرف رخ کیا اور اسے ایک ''ذلیل تخریب کار اور غلیظ دشمن قرار دیا جس کے ہاتھ ہزاروں کمیونسٹوں اور وفادار سوویت عوام کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اس بدمعاش نے حکومتی طاقت کے حصول کے لیے بے شمار انسانوں کا خون کیا تھا۔'' یہ بات یقیناً درست تھی لیکن اس کا اطلاق صرف بیریا پر ہی نہیں بلکہ ان تمام بیوروکریٹوں پر ہوتا ہے جنہوں نے بہتر سے بہتر ملازمتوں اور مراعات کے حصول کے لیے زور و شور سے سٹالن کے جرائم میں شراکت کی تھی۔

سوویت سامراجیت؟

یہ کہنا درست نہیں ہے کہ جیسا کہ بورژوا اور ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کے حامی کہتے ہیں کہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کے تعلق کی نوعیت سامراجی تھی۔ لوگوں کو عام طور پر اس بات کا علم نہیں ہے کہ اگرچہ جنگ کے بعد کے ابتدائی عرصے میں ماسکو نے مشرقی یورپ کا خون ضرور نچوڑا مگر درحقیقت مشرقی یورپ کے ممالک سے اس کی تجارت کی شرائط ان کے حق میں بہت زیادہ سازگار تھیں۔ اصولاً روس ان ممالک کی اشیا عالمی منڈی کی قیمت سے زیادہ قیمت پر خریدتا تھا اور بدلے میں انہیں تیل اور گیس عالمی منڈی کے مقابلے میں کم نرخوں پر مہیا کرتا تھا۔ درحقیقت سوویت یونین مشرقی یورپ کو چھوٹ دے رہا تھا جو سامراجی رشتے کی بالکل ضد ہے۔

یہ سچ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد ابتدائی عرصے میں روسی بیوروکریسی نے مشرقی یورپ کو لوٹا تھا۔ وہ نہ صرف جرمنی اور ہنگری بلکہ یوگوسلاویہ سے بھی پوری پوری صنعتیں اکھاڑ کر روس لے گئے۔ جنگ کے بعد یوگوسلاف لیگ آف کمیونسٹس کے ایک نمایاں رہنما ملووان ڈیجولاس کو ماسکو بھیجا گیا تاکہ وہ دیگر اشیا کے علاوہ ریل گاڑیوں کے انجنوں اور ڈبوں وغیرہ کی واپسی کے لیے بھی گفت وشنید کرے جو روس لے جائی گئی تھیں۔ ڈیجولاس نے اپنی یاداشتوں میں روس کی بیرونی تجارت کے وزیر اے آئی میکویان کے ساتھ گفتگو کو یوں رقم کیا ہے:

''میکویان نے ہمارا استقبال سردمہری سے کیا۔ اس کے انداز سے بے چینی ظاہر ہو رہی تھی۔ ہماری درخواستوں میں یہ بات بھی شامل تھی کہ روس اپنے مقبوضہ علاقوں سے ہاتھ لگنے والے ریل کے ڈبے ہمیں واپس دے دے جن کا وعدہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا کیونکہ ان ریل کے ڈبوں میں سے زیادہ تر یوگوسلاویہ سے لے جائے گئے تھے اور پٹری کے سائز میں فرق کے باعث روسی انہیں استعمال نہیں کر سکتے تھے۔''

''میکویان نے سردمہری سے پوچھا 'آپ کن شرائط پر ان کی واپسی چاہتے ہیں، کس قیمت پر؟'
میں نے کہا کہ آپ تحائف کے طور پر واپس کر دیں۔

اس نے تندی سے جواب دیا کہ میرا کام تجارت کرنا ہے نہ کہ تحائف بانٹنا۔'' (37)

یہ چھوٹا سا واقعہ اعداد وشمار کے کسی بھی انبار سے زیادہ ماسکو کی بیوروکریسی کے اپنے مشرقی یورپ کے ''بھائیوں'' کے ساتھ متکبرانہ اور آمرانہ رویے کو ظاہر کرتا ہے۔ تاہم مارکسی اصطلاح میں یہ تعلق قطعاً

سامراجی نہیں تھا جیسا کہ بعدازاں اس تعلق کے اپنی ضد میں تبدیل ہونے کے بعد انکشاف ہوا۔

صنعتوں کے قومیائے جانے اور منصوبہ بندی پر مبنی نظام کے قیام سے ان ممالک کی معیشتوں نے زبردست شرح ترقی حاصل کی جس سے یہ ممالک ماضی کی پسماندہ زرعی معیشتوں کی بجائے جدید صنعتی ممالک بن گئے۔ سوویت یونین ان کی اشیا کے لیے ایک بہت بڑی منڈی کی حیثیت رکھتا تھا جو عالمی سرمایہ دار معیشت کے زبردست اتار چڑھاؤ سے محفوظ تھی۔ علاوہ ازیں وہ سستے خام مال کے حصول کا ذریعہ بھی تھا۔

اگر ہم جنگ کے بعد کے ابتدائی عرصے سے صرف نظر کر لیں تو سوویت یونین نے ایک سامراجی طاقت کی طرح مشرقی یورپ کا استحصال کرنے کی بجائے درحقیقت اسے کئی عشروں تک مالی اعانت دی۔ سوویت یونین میں معیار زندگی عام طور پر مشرقی یورپ کے ممالک کے مقابلے میں کم تر تھا۔ زیر غور عرصے میں تجارت میں تبدیلی کا رجحان پیدا ہوا جو مشرقی یورپ کی بجائے عالمی منڈی کی طرف ہو گیا۔ 1960ء میں اس کی 52 فیصد تجارت مشرقی یورپ کے ساتھ تھی جو 1979ء تک 44 فیصد رہ گئی اگرچہ یہ شرح اب بھی بہت اونچی تھی۔

اس وقت عالمی منڈی کی قیمت کے مقابلے میں مشرقی یورپ کو سوویت تیل 17 فیصد کم قیمت پر مہیا کیا جا رہا تھا۔ ماضی میں یہ شرح اور بھی زیادہ تھی مگر یہ اب بھی بہت فائدہ مند تھی خاص طور پر اگر ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ اسرائیل اور مصر کے درمیان ہونے والی چھ روزہ جنگ کے بعد تیل کی قیمتوں میں زبردست اضافے سے مغربی دنیا سخت پریشانی کا شکار تھی۔ صرف تیل کی قیمتوں میں زبردست رعایت کا مطلب 2.9 بلین ڈالر سالانہ کی چھوٹ تھا۔ اس کے سوویت یونین علاوہ اپنے کومیکون (یہ مشرقی یورپ میں یورپی یونین کا متبادل تھا) کے ساتھی ممالک سے عالمی منڈی کے مقابلے میں زیادہ قیمت پر اشیا درآمد کرتا تھا۔

1960ء کی دہائی سے لیکر سوویت یونین کے انہدام تک کیوبا کو ایک ملین ڈالر روزانہ کی چھوٹ دی جاتی تھی۔ مثال کے طور پر 1978ء میں روس نے کیوبا سے 40 سینٹ فی پاؤنڈ کے حساب سے چینی خریدی جب کہ عالمی مارکیٹ میں اس کی قیمت 18 سینٹ فی پاؤنڈ تھی۔ 1977ء میں کیوبا نے روسی تیل 7.40 ڈالر فی بیرل کے حساب سے خریدا جب کہ عالمی مارکیٹ میں تیل کی قیمت 20.50 ڈالر فی بیرل تھی یعنی 60 فیصد کی رعایت۔ 1966ء سے 1978ء کے عرصے میں سوویت یونین نے کیوبا کو

13 بلین ڈالر کی امداد دی جو ایک چھوٹے سے جزیرے کے لیے بہت خطیر رقم ہے۔اس میں بلا سود قرضے بھی شامل تھے۔اس کے برعکس مغرب نام نہاد ''امداد'' کے ذریعے تیسری دنیا کے ممالک کا خون نچوڑ رہا ہے یعنی انتہائی اونچی شرح سود پر دیئے جانے والے قرضے جن کے باعث پچھلے کئی عشروں میں بڑے پیمانے پر دولت سابقہ نوآبادیوں سے امیر سامراجی ممالک کو منتقل ہوئی ہے۔صرف ان دو مثالوں کے موازنے سے ہی سوویت یونین کے ''سامراجی'' طاقت ہونے کا جھوٹ صاف ظاہر ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کیا جانا چاہئے کہ قومیتوں پر جبر نہیں کیا گیا تھا۔روبس پیئر نے ایک بار یہ عمیق نقطہ اٹھایا تھا کہ سنگینوں سے مسلح مشنریوں کا کوئی استقبال نہیں کرتا۔مثال کے طور پر پولینڈ اور ہنگری کی آزادی کی روسی زارشاہی کے ہاتھوں طویل عرصے تک پامالی کا تقاضا تھا کہ ان ممالک کے ساتھ تعلقات کو بڑے حساس طریقے سے طے کیا جاتا جیسا کہ لینن نے سوویت یونین میں شامل جارجیا اور دیگر غیر روسی قومیتوں کے ساتھ تعلقات کے سلسلے میں وکالت کی تھی۔اس کی بجائے روسی بیوروکریسی نے مشرقی یورپ کی اقوام کی قومی امنگوں کی رتی بھر پرواہ نہیں کی۔ہر جگہ ماسکو نے اپنے جیسی حکومتیں قائم کر دیں۔کٹھ پتلی حکومتیں جو غلامانہ انداز میں کریملن کی ہر ہدایت پر بلاچون و چراں عمل کرتی تھیں۔کسی قسم کا انحراف برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔کمیونسٹ پارٹیوں میں بے رحمی سے تطہیر کی گئی اور اسی قسم کے نام نہاد مقدمات عمل میں لائے گئے جیسے جنگ سے پہلے ماسکو میں چلائے گئے تھے۔

مطلق اقتدار نے بے جا خوف کی کیفیت کو جنم دیا۔سٹالن کو ہر طرف دشمن ہی دشمن دکھائی دے رہے تھے لہٰذا اس نے مشرقی یورپ کی کمیونسٹ پارٹیوں میں خون ریز تطہیر شروع کر دی جس کے براہ راست نتیجے میں یوگوسلاویہ کے ساتھ پھوٹ پڑ گئی۔ٹیٹو کے خلاف اپنے جھگڑے کی وجہ سے سٹالن نے تمام مشرقی یورپ میں ٹیٹو کے فرضی حامیوں کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم کر دیئے۔یہی دور تھا جب چیکوسلاویہ میں سلانکی کے خلاف، ہنگری میں رائک (Rajk) کے خلاف اور بلغاریہ میں کوسٹوف کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔سلانکی اور دس دیگر افراد کے خلاف ''جاسوسی اور تخریب کاری'' کے الزامات ثابت کرنے کے بعد انہیں گولی سے اڑا دیا گیا۔1963ء میں پراگ سپریم کورٹ نے ان فیصلوں کو کالعدم قرار دے دیا۔رائک (Rajk) اور اس کے ساتھیوں کو گسٹاپو کے ایجنٹ قرار دے کر پھانسی چڑھا دیا گیا۔1956ء میں انہیں ''الزامات کے غلط ہونے'' کی وجہ سے باعزت بری کیا گیا۔ٹرائکو کوسٹوف کو روس اور بلغاریہ کے درمیان تجارت کو سبوتاژ کرنے کے الزام میں گولی ماردی گئی۔جیورجی دیمتروف جس

کا خیال تھا کہ ٹیٹو کے ساتھ مل کر بلقانی ریاستوں کی فیڈریشن قائم کی جائے غالباً جی پی یو کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس مجتمع شدہ تلخی اور ناراضگی کا اظہار بالآخر 1953ء اور 1956ء کی بغاوتوں کی صورت میں ہوا۔

انقلابِ ہنگری

سٹالن کی موت کے فوراً بعد 1953ء کے موسم گرما میں مشرقی جرمنی کے مزدوروں نے ایک انقلابی تحریک چلائی۔ اس کا آغاز برلن کے تعمیراتی مزدوروں کی ایک اچانک ہڑتال سے ہوا۔ کام کی زیادتی اور ناقابل برداشت حالات کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے انہوں نے اوزار چھوڑ کر سٹالن سڑیٹ پر مارچ کیا اور نعرے لگائے جن کی نوعیت بتدریج سیاسی ہوتی گئی۔ اس مظاہرے نے ایک ایسی عوامی تحریک کو جنم دیا جو مشرقی جرمنی کے سٹالنسٹ نظام حکومت کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ حکومت بے بس ہوگئی۔ لیکن ماسکو اس قسم کی تبدیلی برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے کریملن نے تحریک کو کچلنے کے لیے ٹینک بھیج دیئے۔

1956ء میں تحریک ایک بار پھر ابھری لیکن اس بار یہ پولینڈ میں ابھری جو پولینڈ کے مزدور طبقے کی اس طویل جدوجہد کا آغاز تھا جو وہ نوکر شاہانہ حکمرانی سے چھٹکارا پانے کے لیے کر رہا تھا۔ تین عشروں تک پولینڈ کے عوام نے وقتاً فوقتاً بیوروکریسی کے اقتدار سے آزادی کی کوشش کی جسے برداشت کرنا اس لیے بھی زیادہ مشکل تھا کہ اسے پولینڈ کے عوام پر روس کے تاریخی جبر کے ساتھ شناخت کیا جاتا تھا۔ پولینڈ کا پرولتاریہ ایک غیر واضح انداز میں مزدوروں کی جمہوریت کے لیے جدوجہد کر رہا تھا جو انہیں اپنے گھر کے مالک کی حیثیت سے عزت و وقار کی زندگی گزارنے کے قابل بنا دے اور قابل نفرت غیر ملکی حکمرانی کی غلامی سے نجات دلائے۔

وہی ہوا جس کا بیوروکریسی کو خوف تھا۔ یعنی بیسویں کانگریس میں خروشیف کے سٹالن کے جرائم کا پردہ فاش کرنے سے بارود کے ڈھیر کو آگ لگ گئی۔ برف پگھلتے ہی سیلاب آ گیا۔ جون 1956ء میں ماسکو کی بھگدڑ سے فائدہ اٹھا کر پولینڈ کے عوام اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوزنان سے شروع ہونے والی عام ہڑتال جلد ہی سارے ملک میں پھیل گئی۔ مزدوروں نے فیکٹریوں میں کونسلیں قائم کر لیں جو سوویت طرز کی تھیں اور ان کے ذریعے مزدوروں کو اقتدار منتقل ہو سکتا تھا۔ لیکن تحریک پر کمیونسٹ پارٹی کا غلبہ ہو گیا جس کی قیادت ولادی سلاف گوملکا (سٹالن کے دور میں قید کیا گیا تھا) کے ہاتھ میں تھی اور اس نے

اصلاحات اور آزادی کا اعلان کردیا۔

نام نہاد ''سوشلزم کے پولش راستے'' نے بیوروکریسی کی حکمرانی کے تسلسل کے لیے ستر پوشی کا کام کیا۔لیکن یہ وقتی طور پر قوم پرستی کے خطوط پر چلنے والی تحریک کو پٹڑی سے اتارنے میں کامیاب رہا۔آٹھ لاکھ مظاہرین نے گومُلکا کی حمایت میں جلوس نکالا جو پولینڈ کی بیوروکریسی کا نمائندہ تھا اور حقیقتاً ماسکو سے رعائتیں حاصل کرنے کے لیے پولینڈ کے عوام کا سہارا لے رہا تھا۔اس حقیقت کو سمجھتے ہوئے کہ فوج کشی کا مطلب زبردست خونریزی ہوگا خروشیف نے ایک ناگزیر بات کو تسلیم کرتے ہوئے گومُلکا سے سمجھوتہ کرلیا، اسے یہ تسلی ضرور تھی کہ پولینڈ کی ''برادر'' بیوروکریسی پرانے خطوط پر چلے گی اور مزدور طبقے کو اقتدار میں نہیں آنے دے گی۔

خروشیف ابھی سٹالن کی مذمت سے فارغ ہی ہوا تھا کہ اکتوبر میں ہنگری کا انقلاب برپا ہوگیا۔ ہنگری میں آنے والا 1956ء کا انقلاب مزدور طبقے کی طرف سے ہنگری کو ایک صحت مند مزدور ریاست میں تبدیل کرنے کی کوشش تھی۔مزدوروں نے انقلابی کمیٹیاں تشکیل دیں جنہیں وہ سوویت نہیں کہتے تھے کیونکہ سٹالنسٹوں کی حکمرانی نے اس لفظ کو بدنام کردیا تھا۔جبلی طور پر انہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کے تصورات کی طرف واپس لوٹنے کی کوشش کی۔اگر ہنگری کا انقلاب کامیاب ہوجاتا تو اس کا مطلب روس میں نوکر شاہانہ نظام کا خاتمہ ہوتا۔اسی وجہ سے خروشیف نے اسے خون میں نہلا دیا۔سٹالنسٹ ذرائع ابلاغ نے ہنگری کے مزدوروں کی اس تحریک کو''فاشسٹ''اور''ردانقلابی'' قرار دے کر اس کی مذمت کی۔تاہم ہنگری میں قیام پذیر روسی فوجیوں کو انقلاب سے ہمدردی تھی اور وہ عوام کے ساتھ تھے۔ایک حصہ ان سے جاملا اور قابل نفرت اے وی او (خفیہ پولیس) کے خلاف جنگ میں شریک ہوگیا۔اگر کوئی بین الاقوامیت پر مبنی پروگرام کی حامل باشعور قیادت اس وقت موجود ہوتی تو یہ سارے مشرقی یورپ اور روس کی مکمل تبدیلی کا نقطہ آغاز بن سکتا تھا۔اسی سال پولینڈ میں ہڑتال ہوئی اور سی پی ایس یو کی بیسویں کانگریس میں خروشیف کے ہاتھوں سٹالن کی مذمت کے بعد بذات خود روس میں بھی ہلچل ہو رہی تھی۔

کیونکہ ہنگری میں موجود سوویت فوجی بھروسے کے قابل نہیں رہے تھے اس لیے ماسکو نے انہیں واپس بلا لیا اور ان کی جگہ سوویت مشرق بعید کے پسماندہ فوجیوں کو بھیجا گیا جنہیں بتایا گیا تھا کہ انہیں برلن میں ایک فاشسٹ بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجا جا رہا ہے۔انہیں ٹینکوں کے ذریعے میدان میں بھیجا گیا کیونکہ اس طرح ان کا عوام کے ساتھ ملنے اور دوستی کرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

دشمن کی بے پناہ برتری کے باوجود ہنگری کے مزدور شیروں کی طرح لڑے۔ انہوں نے دو عام ہڑتالیں اور دو مسلح بغاوتیں کیں، روسی حملے سے پہلے بھی اور روسی حملے کے بعد بھی، جو ظاہر ہے کہ فاشسٹوں کا طریقہ کار نہیں ہے جیسا کہ سٹالنسٹ دعویٰ کرتے ہیں۔ کئی سال بعد ایک روسی افسر نے جو دوسری جنگ عظیم میں لڑ چکا تھا ایلن وڈز کو بتایا کہ اس نے اس قدر شدید مزاحمت کبھی نہیں دیکھی، 1945ء میں برلن پر قبضے کے وقت بھی نہیں۔ لیکن ایسی بین الاقوامی قیادت کے فقدان کے باعث جو روسی فوجیوں کو جیت سکتی، ہنگری کے مزدوروں کی شکست ناگزیر تھی۔

ہنگری کے 1956ء کے انقلاب میں ہمیں کئی اسباق ملتے ہیں۔ اول یہ کہ جیسا ٹراٹسکی نے کہا تھا پرولتاریہ کی ایک عام بغاوت کا سامنا کرتے ہی بیوروکریسی میں پھوٹ پڑ گئی۔ انتہائی بدعنوان اور بدمعاش عناصر پر مشتمل ایک معمولی اقلیت کے علاوہ، جو زیادہ تر خفیہ پولیس سے تعلق رکھتے تھے، کوئی بھی مزاحمت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ کمیونسٹ پارٹی کے ہزاروں عام ارکان اپنے کارڈ پھاڑ کر انقلاب کے دھارے میں شامل ہو گئے۔ اِمرے ناگی کی حکومت ہوا میں معلق ہو کر رہ گئی تھی۔ تمام طاقت ورکرز کونسلوں کے ہاتھوں میں آ گئی خاص طور پر بڈاپسٹ کی ورکرز کونسلوں کے ہاتھوں میں جو خالصتاً فیکٹریوں سے منتخب ہو کر آنے والے مزدوروں پر مشتمل تھیں۔ ان مزدور کونسلوں کا پروگرام زیادہ تر لینن کے ان چار نکات سے ملتا جلتا تھا جو اس نے 1917ء میں مزدور اقتدار کی اولین شرائط کے طور پر پیش کیے تھے۔ ان نکات میں ہنگری کے مزدوروں نے ایک نئے اہم نکتے کا اضافہ یہ کیا کہ ریاست پر کسی ایک پارٹی کی اجارہ داری نہیں ہوگی۔ سٹالنسٹ آمریت کے تجربے کے بعد مزدور طبقہ کبھی بھی کسی ایک پارٹی کو اقتدار نہیں دے گا۔

کونسل کے بیان میں لکھا ہے ''آج یعنی 14 نومبر 1956ء کو مزدوروں کی ضلعی کونسلوں نے عظیم تر بڈاپسٹ کی مرکزی کونسل تشکیل دی۔ مزدوروں کی مرکزی کونسل کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ بڈاپسٹ کی فیکٹریوں کے تمام مزدوروں کے نام پر مذاکرات کرے اور فیصلہ کرے کہ ہڑتال کو جاری رکھنا ہے یا کام پر واپس جانا ہے۔ ہم سوشلزم کے اصولوں کے ساتھ اپنی ناقابل شکست وفاداری کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت خیال کرتے ہیں اور اس کے دفاع کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔'' (38)

ایک معمولی سے عرصے میں مزدوروں نے بہت تیز رفتاری سے سیکھا۔ اس کا ثبوت اس حقیقت سے ملتا ہے کہ ریڈیو بڈاپسٹ سے جاری ہونے والی پہلی اپیل میں اقوام متحدہ سے امداد طلب کی گئی تھی

لیکن آخری اپیل دنیا بھر کے مزدوروں سے کی گئی تھی۔ یہ پیرس کمیون جیسا جرأت مندانہ واقعہ تھا۔ اس سے ثابت ہوا کہ اگر تحریک پھیلتی، جس کا بہت زیادہ امکان تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر 1917ء کی بالشویک پارٹی جیسی شعوری قیادت موجود ہوتی، تو روس کے اندر کیا کچھ رونما نہیں ہوسکتا تھا۔ شروع ہی سے انہیں پولینڈ، تمام مشرقی یورپ اور سب سے بڑھ کر سوویت یونین کے مزدوروں سے انقلابی اپیل کرنا چاہئے تھی۔ یا تو عظیم ترین فتح حاصل ہوتی یا عظیم ترین شکست کا سامنا کرنا پڑتا۔ 1956ء میں ہنگری کے مزدوروں کے پاس اس کے علاوہ کوئی متبادل موجود نہیں تھا۔

روس میں سیاسی انقلاب میں تاخیر اور نوکرشاہانہ نظام کے مزید 35 سال تک برقرار رہنے سے عوام کے شعور پر نہایت منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کم از کم وقتی طور پر سٹالن ازم کے تعطل کی وجہ سے سرمایہ داری کی طرف ایک تحریک نے جنم لیا ہے۔ اس سے ملنے والا سبق بالکل واضح ہے۔ انقلابی پارٹی اور قیادت کا کوئی نعم البدل نہیں۔ ایسے کسی خودکار نظام کا کوئی وجود نہیں جس کے ذریعے ایک نسل کے تجربات دوسری نسل میں منتقل ہوسکیں۔ پارٹی کی عدم موجودگی میں ہر نسل کے لیے ایک تکلیف دہ عمل کے ذریعے خود اپنے تجربات کے ذریعے از سرِ نو سیکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لینن کیڈروں پر مشتمل ایک ہراول پارٹی کی ضرورت پر زور دیتا تھا جو طبقے کی یاداشت کا کام کرے۔ 1956ء سمیت بعد کی تاریخ نے اس حتمی ضرورت کو ثابت کردیا ہے۔ بدقسمتی سے مشرقی یورپ اور روس کے مزدور طبقے کو تمام اسباق نئے سرے سے سیکھنا پڑیں گے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ضرور سیکھیں گے۔

4 اکتوبر 1957ء کو روس نے پہلا سپوتنک مصنوعی سیارہ خلا میں بھیجا اس کے بعد 1961ء میں پہلے انسان کو خلا میں بھیجا گیا۔ سوویت خلائی پروگرام میں کام کرنے والوں کی تعداد امریکہ کے مقابلے میں دگنی تھی۔ روسی بیوروکریسی اس قدر پر اعتماد تھی کہ سی پی ایس یو کی اکیسویں کانگریس میں اعلان کیا گیا کہ بیس سال کے اندر اندر ''کمیونزم کی تعمیر'' (!) کرلی جائے گی۔

اکتوبر 1961ء میں ہونے والی بائیسویں کانگریس میں خروشیف نے روس کے اس ارادے کا اعلان کیا کہ 1980ء تک وہ امریکہ کو پیچھے چھوڑ دے گا۔ خروشیف نے اعلان کیا ''اس وقت تک سوویت صنعت میں پیداواری کارکردگی امریکہ کی موجودہ سطح کے مقابلے میں تقریباً سو فیصد زیادہ ہو جائے گی۔ ہم تمہیں دفن کردیں گے!'' (39)

آج کل اسے بیکار کی شیخی قرار دے کر مسترد کردیا جاتا ہے۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ دس فیصد

شرح ترقی کے ساتھ سوویت یونین کا بیس سال کے اندر امریکہ سے آگے نکل جانا عین ممکن تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سوویت یونین میں کمیونزم تو ایک طرف رہا سوشلزم کی تعمیر بھی مکمل ہو سکتی کیونکہ کمیونزم سے مراد ہے ایک غیر طبقاتی سماج جس میں عدم مساوات، ریاست اور زرِ تبادلہ ماضی کا قصہ بن چکے ہوں اور قوانین اور جبر کی جگہ آزاد پیداکاروں کی ایسوسی ایشن لے چکی ہو۔ تاہم منصوبہ بند معیشت کے باعث ماضی کا پسماندہ روس صنعت، سائنس اور ٹیکنیک کی ترقی میں اس مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں سوشلزم کی جانب پیش رفت کے لیے حالات انتہائی سازگار تھے جس کے بارے میں مارکس نے کہا تھا کہ اس کے لیے کم ازکم انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک کی سطح کے برابر ہونا ضروری ہے۔ اب سوویت یونین امریکہ کے قریب قریب پہنچ چکا تھا۔ راستے میں صرف بیوروکریسی حائل تھی اور بیوروکریسی نے ہنگری میں یہ بات ثابت کردی تھی کہ اسکا مٹ جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

اب چاہے وہ کچھ بھی کہتے ہوں لیکن سوویت معیشت کی تیز رفتار ترقی سے مغرب کے حکمران طبقات خطرہ محسوس کرنے لگے تھے۔ 1960ء کی دہائی کے دوران روس کی صنعتی پیداوار امریکہ کے مقابلے میں 75 فیصد ہوگئی تھی۔ بیوروکریسی کو یقین تھا کہ وہ ہمیشہ حکمران رہے گی۔ بظاہر سٹالنسٹ نظام حکومت کا خیال یہ تھا کہ صورتحال صرف بہتری کی جانب بڑھ سکتی ہے اور ان کے راستے میں کوئی حائل نہیں ہوسکتا۔ آخری دور میں بیوروکریسی کے استحکام کی وضاحت مسلسل اونچی شرح ترقی سے ہوتی ہے۔ سٹالن کے تحت بیوروکریسی ننگی دہشت کے ذریعے حکومت کرتی تھی۔ لیکن کم وبیش آخری تین دہائیوں میں اس کی حکمرانی کے قائم رہنے کی بڑی وجہ مزدور طبقے کا جمود تھا اور اس کی وضاحت دو عوامل سے ہوتی ہے، ایک طرف تو سامراجی مداخلت کا خوف تھا اور دوسری طرف عوام یہ محسوس کرتے تھے کہ سب کچھ کرنے کے باوجود بیوروکریسی ابھی سماج کو آگے کی جانب لے جانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ لیکن اب وہ تمام عوامل جن کی وجہ سے بیوروکریسی اتنے لمبے عرصے تک قائم رہنے کے قابل ہوئی تھی جدلیاتی طور پر اپنی ضد میں تبدیل ہو چکے تھے۔

زراعت اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری رہی۔ بے چینی کی بڑی وجہ غذائی اجناس کی قلت اور قیمتوں میں اضافہ تھا۔ 1963ء میں فصل اچھی نہیں ہوئی اور روس کو بڑے پیمانے پر مغرب سے گندم درآمد کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ڈبل روٹی اور بالخصوص آٹا سپلائی کرنے میں دشواری پیش آئی۔ بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ خروشیف کی پالیسی کا مقصد اوپر سے اصلاحات نافذ کرنا تھا تاکہ نیچے سے ہونے والے

سماجی دھماکے سے بچا جا سکے۔ ہنگری میں ہونے والے واقعات اس نظام کے لیے ایک سنجیدہ انتباہ تھے کہ اسے کیا توقع رکھنی چاہئے۔ تاہم یہ پالیسی بھی خطرے سے خالی نہیں تھی۔ فرانسیسی تاریخ دان اور ماہر عمرانیات الیکسس ڈی تاکول نے اپنی کلاسیکی تحریر 'پرانا نظام اور فرانسیسی انقلاب' میں لکھا ہے کہ شخصی آمریت کے لیے سب سے خطرناک لمحہ وہ ہوتا ہے جب وہ جبر کے لمبے عرصے کے بعد تھوڑی سی چھوٹ دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا اظہار نوووچرکاسک میں رونما ہونے والے واقعات کی شکل میں ہوا جن کے بارے میں عام طور پر خاموشی اختیار کی جاتی رہی ہے۔

نوووچرکاسک کی بغاوت

2 جون 1962ء کو فوج نے جنوبی روس کے شہر نوووچرکاسک کے مرکزی چوک میں ہونے والی ریلی میں موجود ہڑتالیوں اور عام لوگوں پر گولی چلا دی۔ نامعلوم تعداد میں بہت سے لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے ہلاک ہو گئے۔ اس دور میں بھی بغاوت کی خبر کو اس قدر مکمل طور پر دبا دیا گیا کہ مقامی ریڈیو نے بھی اس کی خبر نشر نہیں کی۔ صرف کئی سال بعد گلاسناسٹ کے دور میں کیمپوں سے زندہ بچ کر آنے والوں کے ذریعے ان رپورٹوں نے گردش کرنا شروع کر دیا۔ تب بھی ان پر عمومی طور پر یقین نہیں کیا جاتا تھا۔ ایک آمرانہ ریاست نہایت شدت سے اطلاعات کو چھپاتی ہے تاکہ تحریک پھیلنے نہ پائے۔

جبر کی شدت اور اطلاعات کے پھیلاؤ پر مکمل پابندی سے ثابت ہوتا ہے کہ حکمران ان واقعات سے شدید خطرہ محسوس کرتے تھے۔ یہ ہڑتال ایک وسیع احتجاجی تحریک کا حصہ تھی جو حکومت کی طرف سے اسی ماہ قیمتوں میں اضافے کے اعلان کے باعث ابھری تھی۔ کارگنڈا، تمرتاؤ، الیگزینڈروف، میوروم اور دیگر کئی شہروں میں بھی تحریکیں ابھری تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی تحریک نوووچرکاسک جیسی وسعت اختیار نہ کر سکی۔ یہاں ایک نوزائیدہ سیاسی انقلاب کے تمام عناصر نظر آتے تھے۔

اس واقعے کا انتہائی تفصیلی چشم دید بیان اس واقعہ میں حصہ لینے والے ایک شخص پیوٹر سیوڈا نے لکھا تھا جو ایک مزدور تھا اور سٹالن کی تطہیرات کا شکار ہونے والے پرانے بالشویک کا بیٹا تھا۔ کے جی بی کی جیلوں اور جبری مشقت کے کیمپوں میں کئی سال گزارنے کے بعد سیوڈا نے بڑی دشواری سے تمام دستیاب اطلاعات اکٹھی کیں جنہیں 1980ء میں انڈرگراؤنڈ پریس (سیمیزدت) نے شائع کیا۔ اگرچہ

عمر کے آخری حصے میں اس کا رجحان انارکزم کی طرف ہو گیا تھا مگر ان واقعات کے وقت اور اپنی عمر کے زیادہ تر حصے میں وہ خود کو ایک لینن اسٹ اور ''بغیر پارٹی کا بالشویک'' سمجھتا تھا۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہڑتال بالکل بے ساختہ نوعیت کی تھی۔اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا جب کہ مزدوروں کو کمیونسٹ پارٹی اور سرکاری یونینوں سے باہر منظّم ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں تھا جو مزدوروں کی بجائے انتظامیہ کا دفاع کرتی تھیں یکم جنوری کو نوووچرکاسک کے ریلوے انجن بنانے کے بڑے کارخانے نیز (Nevz) میں تنخواہوں میں 30 سے 35 فیصد کمی کر دی گئی۔اسی دن حکومت نے اعلان کیا کہ گوشت اور ڈیری کی اشیا کی قیمتوں میں 35 فیصد تک اضافہ کر دیا جائے گا۔مزدوروں کے لیے یہ اونٹ کی کمر پر آخری تنکا تھا۔انہیں اور بھی کئی شکایتیں تھیں جن میں رہائشی مکانات کی کمی کا معاملہ سرفہرست تھا۔مزدوروں کی شکایات کے سلسلے میں انتظامیہ کی بے حسی اور حماقتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔سیوڈا لکھتا ہے:

''فیکٹری مزدوروں میں ہڑتال کے لیے مہم چلانے کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔ ہڑتال کی کال دینے والے گروہ کے نمودار ہونے کی دیر ہوتی تھی کہ فوراً کام روک دیا جاتا تھا۔ہڑتالیوں کا حجم برف کے تودے کی طرح بڑھ رہا تھا۔اس وقت فیکٹری میں تقریباً 14 ہزار مزدور کام کر رہے تھے۔فیکٹری کے گراؤنڈ اور فیکٹری انتظامیہ کے دفتر کے قریب والا چوک مزدوروں سے بھر گیا۔ہڑتالی اس چوک میں سما نہیں رہے تھے۔'' (40)

فوری مطالبات کی نوعیت معاشی تھی اور نعرے کچھ اس طرح کے تھے، ''ہمیں گوشت اور مکھن دو'' اور ''ہمیں رہنے کے لیے گھروں کی ضرورت ہے!'' تحریک پھیلی ضرور لیکن اس میں نظم وضبط برقرار رہا۔ جبلی طور پر مزدوروں نے سپاہیوں سے دوستی اور میل جول بڑھایا۔مقامی چھاؤنی کے سپاہیوں کا رویہ ہمدردانہ تھا اور انہیں استعمال نہیں کیا جا سکتا تھا:

''کام ختم ہونے تک نوووچرکاسک چھاؤنی سے پہلے فوجی دستے چوک میں پہنچ چکے تھے لیکن وہ مسلح نہیں تھے۔لوگوں کے پاس پہنچنے کے بعد وہ ہجوم میں گھل مل گئے۔فوجی اور ہڑتالی مزدور ایک دوسرے سے دوستی کرنے لگے،انہوں نے ایک دوسرے کو گلے لگایا اور ایک دوسرے کا منہ چوما۔ہاں! انہوں نے ایک دوسرے کو چوما۔افسروں کے لیے فوجیوں کو ہڑتالیوں سے الگ کر کے اکٹھے کرنا اور واپس لے جانا دشوار ہو گیا۔'' (41)

ہنگری کی طرح یہاں بھی ماسکو کو مزدوروں کے خلاف استعمال کرنے کے لیے پسماندہ دیہاتی فوجی (اس بار قفقاز کے علاقے سے) لانے پڑے۔ ہڑتالیوں کے غصے کا رخ بتدریج حکومت کے خلاف ہوتا جا رہا تھا۔ حکومتی دفاتر پر قبضے کے مطالبات کیے گئے۔ پھر ہڑتالی مزدوروں کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ تحریک کا حجم بدستور بڑھتا رہا:

''ہر طرف سے لوگ قطاروں کی شکل میں شہر کی طرف آنے لگے اور سرخ جھنڈے اور لینن کی تصویریں بھی نظر آنے لگیں۔ مظاہرین انقلابی گیت گا رہے تھے۔ ہر شخص پر جوش تھا، انہیں اپنی قوت پر اعتماد اور اپنے مطالبات کے جائز ہونے کا پورا یقین تھا۔ مظاہرین کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی تھی۔''

''ریل کی پٹڑی اور توزلوف دریا پر بنے پل کی طرف بڑھتے ہوئے مظاہرین نے پل پر موجود دو ٹینک اور مسلح فوجیوں کو دیکھ لیا۔ مجمعے کی رفتار پہلے کم ہوئی اور پھر وہ ایک جگہ ٹھہر گیا اور انقلابی گیتوں کی جگہ خاموشی چھا گئی۔ پھر یہ مجمع جس میں کندھے سے کندھا ٹکرا رہا تھا سست روی سے آگے کی طرف بڑھا۔ کچھ لوگوں نے چیخ کر کہا ''مزدور طبقے کو راستہ دو!'' پھر سب نے یک زبان ہو کر اسے دہرانہ شروع کر دیا۔ ٹینک کے عملے اور مسلح فوجیوں نے مظاہرین کو روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہیں ٹینکوں پر چڑھنے میں بھی مدد دی۔ لوگوں کا مجمع پل کے ناکے کی دونوں اطراف پھیل گیا۔ جوش و خروش میں اضافہ ہو گیا، انقلابی گیتوں کی لے بلند تر، زیادہ ہم آہنگ اور زیادہ طاقتور ہو گئی۔'' (42)

آخر کار ہڑتالیوں نے فوجیوں کو ایک طرف دھکیل کر سی پی ایس یو کمیٹی کی عمارت پر قبضہ کر لیا۔ اس موقعے پر مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دے دیا گیا۔ اس وقت بھی فوجی شش و پنج کا شکار تھے۔ ایک فوجی افسر نے اس قسم کا حکم دینے کی بجائے خودکشی کرنے کو ترجیح دی۔

''کئی عینی شاہدوں کا بیان ہے کہ جب افسر کو گولی چلانے کا حکم ملا تو اس نے فوجیوں کو یہ حکم دینے سے انکار کرتے ہوئے اس فوجی ٹولے کے سامنے خود کو گولی مار لی۔ تاہم بالآخر فوجیوں نے گولی چلا دی۔ پہلے ان کا رخ اوپر درختوں کی جانب تھا جن پر بچے موجود تھے جو خوف سے، زخمی ہو کر یا موت کا شکار ہو کر نیچے گر پڑے۔ اس طرح سے پارٹی، ریاست اور فوج مختلف النوع افکار کو مٹاتے رہے تھے۔ پارٹی اور عوام کا اتحاد سوشلسٹ ریاست کے جمہوری کردار کا لازمی خاصہ ہوتا ہے مگر یہاں اس کے الٹ تھا۔ اس کے بعد مشین گنوں کا رخ مجمع کی طرف کر دیا گیا۔'' (43)

اس کے بعد چلائے جانے والے خفیہ مقدمات میں سات افراد پر ''بدمعاشی'' اور ''ہنگامہ پروری''

کا الزام ثابت کر کے گولی سے اڑا دینے کی سزا دی گئی۔ نامعلوم تعداد میں لوگوں کو دس سے پندرہ سال قید کی سزا سنائی گئی جب کہ اس میں مرنے اور معذور ہونے والوں کی تعداد کا ابھی علم نہیں ہو سکا۔ گرفتار شدگان کو بیرونی دنیا سے رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ نوووچرکاسک میں کرفیو لگا دیا گیا۔ اس بغاوت کی تمام خبروں کو دبا دیا گیا۔ کریملن نے ان واقعات کو سنجیدگی سے لیا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ خروشیف کے نمبر دو میکویان کو اس شہر میں بھیجا گیا۔ قیادت کے فقدان اور کسی واضح حکمت عملی کے بغیر یہ شورش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے خروشیف کا تختہ الٹے جانے کا عمل زیادہ تیز ہو گیا۔

باب نمبر 5: جنگ سے ڈی سٹالنائزیشن تک

1۔ ٹراٹسکی ۔مارکسزم کے دفاع میں 4-5 نیویارک ایڈیشن 1970ء

2۔ ٹراٹسکی ۔مارکسزم کے دفاع میں صفحہ 20-21

3۔ ایلک نومی۔سٹالنزم اوراس کے بعد صفحہ 81

4۔ میڈویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں صفحہ 730

5۔ رابرٹ بلیک۔ برطانیہ میں سٹالنزم صفحہ 130

6۔ پراود 26 اگست 1940ء

7۔ مارننگ سٹار 5-8-82

8۔ گریگورنیکو کی یاداشتیں صفحہ 91-92

9۔ این ایس خروشیف۔کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 20 ویں کانگریس کی رپورٹ صفحہ 24-25

10۔ ایلک نووی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ صفحہ 273

11۔ گریگورنیکو کی یاداشتیں صفحہ 46-47

12۔ این ایس خروشیف۔کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی ویں کانگریس کی رپورٹ صفحہ 24-25-1956ء

13۔ میڈویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں صفحہ 214

14۔ گریگورنیکو کی یاداشتیں صفحہ 332

15۔ میڈویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں صفحہ 332

16۔ این ایس خروشیف۔کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی کانگریس کی خصوصی رپورٹ صفحہ 24-25

17۔ ایضاً ۔ ایضاً

18۔ آرمیڈ ویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں صفحہ 312

19۔ این ایس خروشیف۔کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 20 ویں کانگریس کی رپورٹ صفحہ 24-25

20۔ ایضاً ۔ ایضاً

21۔ گریگورنیکو کی یاداشتیں صفحہ 211

22۔ ایلک نوی۔سوویت یونین کی معاشی تاریخ صفحہ 278-279

23۔ ہوروونز۔ فری ورلڈ کلوسز صفحہ 61

24۔ ڈبلیو چرچل۔عروج وزوال صفحہ 227-228

25۔ ایم ڈجلیس۔سٹالن سے ملاقاتیں صفحہ 140-141

26۔ گرینگ شا۔خروشیف کا روس صفحہ 25-27

27۔ سچا پیرو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی صفحہ 510

28۔ سچا پیرو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی صفحہ 511

29۔ میڈویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں صفحہ 843

30۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری صفحہ 249-250

31۔ آرمیڈ ویڈیف۔سوشلسٹ جمہوریت صفحہ 224-225

32۔ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 19 ویں کانگریس کی رپورٹ صفحہ 134-144

33۔ 22 ویں کانگریس کی رپورٹ، کمیونزم کا راستہ صفحہ 111

34۔ آرمیڈ ویڈیف۔تاریخ کو فیصلہ کرنے دیں صفحہ 558

35۔ خروشیف۔این خروشیف کو یاد ہے صفحہ 78-79

36۔ ایف ہالیڈے۔دوسری سرد جنگ کی شروعات صفحہ 138-139

37۔ ایم ڈجلیس۔سٹالن سے ملاقاتیں صفحہ 130

38۔ بل لوکلس۔ہنگری میں عینی شاہد صفحہ 177

39۔ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 22 ویں کانگریس کی رپورٹ کمیونزم کا راستہ صفحہ 515

40۔ رشین لیبر ریویو نمبر 2 صفحہ 45 1993ء

41۔ رشین لیبر ریویو نمبر 2 صفحہ 46 1993ء

42۔ رشین لیبر ریویو نمبر 2 صفحہ 48 1993ء

43۔ رشین لیبر ریویو نمبر 2 صفحہ 49 1993ء

باب نمبر 6

دورِ جمود

خروشیف کا زوال

اگلے برس فصل اچھی ہوئی لیکن وہ خروشیف کو بچانے میں ناکام رہی۔نوکرشاہی نے فیصلہ کیا کہ معاملات بہت آگے بڑھ چکے ہیں اور یہ کہ موجودہ قائد کی پالیسیاں سارے نظام کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔انہیں خوف تھا کہ اوپر سے کی جانے والی اصلاحات ایک سیلاب کا راستہ ہموار کردیں گی جیسا کہ ڈی ٹاکول نے پیش گوئی کی تھی اور انہوں نے وہی کچھ کیا جس کی خطرے سے دوچار کسی آمریت سے توقع کی جاسکتی تھی۔انہوں نے ''غیر ذمہ دار اصلاح پسندانہ مہم جوئی'' کے خاتمے کے لیے ایک سازش تیار کی۔ اکتوبر 1964ء میں خروشیف کو ہٹا دیا گیا۔حسب معمول نہ کوئی کانگریس ہوئی نہ وضاحتیں اور نہ ووٹ ڈالے گئے۔''پیارے قائد نکیتا سرگئیوچ'' کو اس کے قریبی ساتھیوں نے ایک (بغاوت) کے ذریعے برطرف کردیا۔کم ازکم نوکرشاہانہ قسم کی سیاست میں کسی ممنونیت کا اظہار نہیں ملتا۔جس شخص کو عالمی کمیونسٹ پریس نے شیر بنا رکھا تھا راتوں رات ایک غیر اہم شخص بن گیا۔نہ کوئی سرگوشی سنائی دی نہ ہی سوالات اٹھائے گئے اور کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت نے نئی لائن بلاچون وچراں اختیار کرلی۔اس سے ہمیں میکسم گورکی کی ایک بات یاد آتی ہے جس نے لکھا تھا:

''سوال: جب تمہیں کوئی شخص گرتا دکھائی دیتا ہے تو تم کیا کرتے ہو؟

جواب: اسے دھکا دے دیتا ہوں۔''

بیوروکریسی کو امید تھی کہ اوپر سے تبدیلی لانے سے صورتحال بہتر ہو جائے گی۔ لیونڈ برژنیف اقتدار میں آ گیا۔ اس نے فوراً ماضی کی ناکامیوں کے لیے خروشیف کو موردالزام ٹھہرایا، اس کی کئی اصلاحات واپس لے لیں اور اس سلسلے میں وہ اتنا آگے نکل گیا کہ 1964ء کے اعداد وشمار چھپائے جو خروشیف کے بہت زیادہ حق میں جاتے تھے۔لیکن برژنیف کے تحت سٹالن ازم کا بحران زیادہ شدید ہو گیا اور شرح ترقی کم ہوتے ہوئے تقریباً تین فیصد یا اس سے بھی کم ہو گئی۔ اس سست روی کو ختم کرنے کے لیے نئے اقدامات کی ضرورت تھی۔

اولاً برژنیف اقتصادی خود کفالت (''ایک ملک میں سوشلزم'') پر مبنی رجعتی یوٹوپیا عملاً ختم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ معیشت میں جان ڈالنے کی کوشش میں بیوروکریسی نے مایوسی کے عالم میں عالمی مارکیٹ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ دراصل، حیران کن طور پر، اسے برژنیف کے آئین کا حصہ بنا دیا گیا اور تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ عالمی تجارت میں شرکت کو کسی آئینی اصول کے درجے پر فائز کیا گیا! غالباً یہ حقیقت حکمران طبقے کے اندرونی تصادموں کی عکاسی کرتی تھی۔

لینن اور ٹراٹسکی سوویت یونین کی عالمی تجارت میں شرکت کے حق میں تھے لیکن وہ اسے امرت دھارا نہیں سمجھتے تھے بلکہ محض اسے سانس لینے کی مہلت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے، جب تک ترقی یافتہ ممالک کے فتح یاب مزدور سوویت یونین کی مدد کو نہیں پہنچ جاتے۔ سوویت یونین اس وقت ایک بہت پسماندہ ملک تھا۔ ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی کہ معاشی طور پر ترقی حاصل کرنے کے بعد سوویت یونین کو اقتصادی خود کفالت کو مجبوراً ترک کر کے عالمی معیشت میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینا پڑے گا۔ لیکن اس کی وجہ سے مغرب میں آنے والے بحران ماضی کے مقابلے میں زیادہ اثر انداز ہونگے اگرچہ پیداوار میں کمی کے حوالے سے ان کا اثر معمولی ہوگا۔ تاہم اس کے سیاسی نتائج کہیں زیادہ اہم ہونگے۔

لینن نے بجا طور پر جہاں تک ممکن ہو سکے سوویت معیشت کو عالمی معیشت کے ساتھ منسلک کرنے کی ضرورت پر زور دیا تھا۔ تاکہ عالمی تقسیم محنت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ آخر کار برژنیف کے تحت کوتاہ بین سٹالنسٹ بیوروکریسی اقتصادی خود کفالت کی پالیسی کو ترک کر کے کم از کم محدود پیمانے پر عالمی منڈی میں شرکت کرنے پر مجبور ہو گئی۔

عالمی منڈی میں شرکت کے باعث غیر ذمہ دار اور بے قابو بیوروکریسی پر جزوی طور پر قدغن لگ سکتی تھی۔ سرمایہ داری نظام کے تحت مارکیٹ کے ذریعے لاگو ہونے والا قانونِ قدر کسی حد تک ایسی بندش

لگا تا ہے۔ یہ درست ہے کہ بڑی اجارہ داریاں منڈی کے عمل کو اپنے مفادات کے لیے توڑتی مروڑتی رہتی ہیں۔ موجودہ دور میں عالمی تجارت کے 90 فیصد حصے پر 500 بڑی کمپنیاں حکمت عملیوں کے تحت جمع کردہ سٹاک، سٹہ بازی کے ذریعے فنڈز کی نقل وحرکت، سیاسی دباؤ اور براہ راست رشوت ستانی کے ذریعے مزدور طبقے کی محنت کا معمول سے بڑا حصہ ہضم کر جاتی ہیں تاہم آخر کار انہیں بھی قدر کے قانون کی بنیاد پر کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

مارکسی نقطہ نظر سے عالمی معیشت میں سوویت یونین کی شرکت نہ صرف ناگزیر تھی بلکہ ترقی پسندانہ بھی تھی۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو کے صفحات میں مارکس اور اینگلز نے وضاحت کی تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام عالمی معیشت کو واحد اور باہمی انحصار پر مبنی اکائی بناتا ہے۔ اس کے اجزا میں سے کسی ایک کو انتہا درجے مسخ کیے بغیر علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ سوویت یونین کا نصف صدی سے زیادہ کا تجربہ اس دعوے کی تصدیق کا کافی ثبوت فراہم کرتا ہے۔ عالمی منڈی میں شرکت سے سوویت معیشت عالمی تقسیم محنت سے فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ اس کے سائنس دانوں اور ہنر مندوں کی دسترس جدید ترین تصورات اور تیکنیک تک ہوتی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنا موازنہ دنیا کی ترقی یافتہ ترین معیشتوں سے کرنے پر مجبور تھا اور اس آئینے میں اسے اپنا عکس تمام تر خامیوں سمیت نظر آتا تھا۔

1970ء کی دہائی کے آخر میں سوویت یونین کی کل تجارت 123 بلین ڈالر تھی جو کہ ایک نمایاں اضافہ تھا مگر سوویت معیشت کے حجم کو مدنظر رکھا جائے تو یہ ابھی تک ناکافی تھا۔ اگر ہم چھوٹے سے ملک ہالینڈ کے اعداد وشمار کو سامنے رکھیں (جو یقیناً اپنی مجموعی داخلی پیداوار کا غیر معمولی حصہ برآمد کرتا ہے) جو 132 بلین ڈالر ہیں تو یہ فرق فوراً واضح ہو جاتا ہے۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں سوویت یونین کی بیرونی تجارت اور اس کی مجموعی داخلی پیداوار 4 فیصد سے بڑھ کر 9 فیصد ہوگئی۔ تاہم اس دور میں چونکہ عالمی تجارت بہت تیزی سے فروغ پا رہی تھی اس لیے اس کا حقیقی حصہ مجموعی طور پر 4.3 فیصد سے کم ہو کر 3.8 فیصد رہ گیا۔ ذیل میں عالمی تجارت میں 1979ء میں سوویت یونین کا حصہ اور دوسرے ممالک سے اس کا موازنہ بیان کیا گیا ہے۔

1979ء میں عالمی تجارت میں فیصدی حصہ:

سوویت یونین	3.8	جاپان	6.5
ہالینڈ	4.1	مغربی جرمنی	10.1

اٹلی	4.6		
برطانیہ	6.0	امریکہ	12.3
فرانس	6.4	دیگر ممالک	46.2

اس میں مزید اضافہ کیا جانا چاہئے کہ اگرچہ عالمی تجارت میں امریکہ کا حصہ 12.3 فیصد تھا تاہم یہ اس کی مجموعی داخلی پیداوار کا محض 6 فیصد تھا۔ بعدازاں اس صورتحال میں تبدیلی واقع ہوگئی۔ معیار زندگی میں کمی اور داخلی طلب میں آنے والی گراوٹ کے سبب امریکہ نے جارحانہ پالیسی اختیار کرلی ہے جس کا نقصان اس کے حریفوں کو ہوا جن میں سرفہرست جاپان ہے۔ 1980ء کی دہائی میں اس نے عالمی تجارت کے لیے مخصوص داخلی پیداوار کے 6 فیصد حصے میں اضافہ کر کے اسے 13 فیصد کر دیا اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ 2000ء تک اسے بڑھا کر 20 فیصد کر دیا جائے۔ یہ اس کے بڑے حریفوں کے خلاف ایک قسم کے اعلان جنگ کے مترادف ہوگا (کم از کم تجارتی جنگ) جو اتنی ہی شدومد کے ساتھ عالمی منڈیوں میں اپنا حصہ بڑھانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ایسی صورتحال میں روسی سرمایہ داری نظام کا مستقبل زیادہ تابناک دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن اس موضوع پر ہم بعد میں بات کریں گے۔

اگر اسے ایک ہم آہنگ اکائی کے طور پر جوڑا جاتا تو بذات خود سوویت بلاک میں بھی زبردست امکانات موجود تھے۔ کومیکون ایک ایسی اکائی تھی جو 450 ملین افراد پر مشتمل تھی۔ اس کی صنعت ترقی یافتہ تھی، اس کے پاس بے شمار سائنس دان اور ہنرمند موجود تھے۔ وسیع زرعی زمین موجود تھی اور اس کے معدنی وسائل کم وبیش لامحدود تھے۔ اس وقت کی یورپین اکانومک کمیونٹی (ای ای سی) کے مقابلے میں کومیکون کی آبادی 180 ملین زیادہ تھی۔ اگر اس میں ایک ارب چینیوں کا اضافہ کر دیا جائے تو معاشی ترقی کے زبردست امکانات واضح ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے اولین شرط یہ تھی کہ سوویت یونین، مشرقی یورپ اور چین پر مشتمل ایک سوشلسٹ فیڈریشن تشکیل دی جاتی۔

اس کی راہ میں حائل واحد رکاوٹ بیوروکریسی کے تنگ نظری پر مبنی قومی مفادات تھے اور وہ اپنے ''سوشلسٹ'' ہمسائیوں کے خلاف اپنی سرحدوں کے دفاع پر کمربستہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ کومیکون کے ممالک کے درمیان معاشی جڑت ای ای سی کے رکن ممالک کے مقابلے میں کم تھی۔ اس طرح ایک ملک میں سوشلزم کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے باعث ان تمام ممالک کی ترقی میں مادی حوالے سے رکاوٹ پیدا ہوئی۔ سمجھداری سے اپنے وسائل کو یکجا کرنے کی بجائے ہر قومی بیوروکریسی نے اپنی بھاری صنعت

قائم کرنے پر اصرار کیا جس میں البانیہ جیسا چھوٹا سا ملک بھی شامل تھا اور ظاہر ہے کہ اس کے بہت نقصان دہ نتائج برآمد ہوئے۔ حتمی دیوالیہ پن یہ تھا کہ چین اور روس کی افواج ایک دوسرے کو ایک ایسی مصنوعی اور بے جواز سرحد کے دفاع کے لیے قتل کر رہی تھیں جسے انیسویں صدی میں روسی زار اور چینی شہنشاہ نے قائم کیا تھا۔

سوویت یونین ترقی کی دوڑ میں پیچھے

حتمی پیش رفتوں نے مسئلے کو جڑ سے ختم نہیں کیا۔ ترقی تو ہوئی لیکن اگر تناسب کو مدنظر رکھا جائے تو انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مقابلے میں فرق برقرار رہا جیسا کہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے۔

1979ء میں فی کس جی ڈی پی (یو ایس ڈالروں میں) کچھ اس طرح تھا:

مغربی جرمنی	11730	مشرقی جرمنی	6430
امریکہ	10630	چیکوسلواکیہ	5290
فرانس	9950	سوویت یونین	4110
جاپان	8810	ہنگری	3850
برطانیہ	6320	پولینڈ	3830
اٹلی	5250	بلغاریہ	3690

(ورلڈ بینک، عالمی ترقیاتی رپورٹ 1981ء صفحہ نمبر 135)

تاہم اگر سوویت یونین 10 فیصد اوسط شرح ترقی برقرار رکھتا تو اس فرق کو آسانی سے کم کیا جا سکتا تھا۔ اگر اس نے تین فیصد سالانہ کی شرح ترقی کو بھی برقرار رکھا ہوتا تو 1990ء تک وہ ای ای سی اور جاپان کی 1980ء کی سطح کو پہنچ چکا ہوتا۔ یہ بھی ایک زبردست پیش رفت ہوتی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس سے سوویت یونین ٹوٹنے سے بچ جاتا اور سابقہ سوویت یونین کی اقوام موجودہ تباہی سے بچ جاتیں۔ اس سلسلے میں صرف یہی کافی ہوتا کہ کم از کم اتنی ہی شرح ترقی حاصل کر لی جاتی جو اس وقت مغرب کی اوسط شرح ترقی تھی۔ منصوبہ بند معیشت کی صلاحیت کے مدنظر اس کا حصول بہت آسان ہونا چاہیے تھا۔

درحقیقت 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں کا عرصہ واضح طور پر ثابت کرتا ہے کہ ایسا ہدف حقیقی امکانات کے مقابلے میں بہت حقیر تھا۔ تاہم یہ بات مجرمانہ اور باعث شرم ہے کہ بیوروکریسی اس حقیر ہدف کو حاصل کرنے کی اہل بھی نہیں تھی۔

1960ء کی دہائی تک پہنچتے پہنچتے شرح ترقی اور اس کے ساتھ ساتھ معیار زندگی میں بھی کمی آنا شروع ہو چکی تھی۔ 60-1951ء کی دہائی کے دوران صنعتی پیداوار میں اضافے کی شرح 10 فیصد سے زیادہ تھی اور اس دہائی میں اوسط سالانہ اضافہ 12 فیصد کے قریب تھا۔ لیکن 1963ء اور 1964ء میں سرکاری طور پر اعلان کردہ صنعتی شرح ترقی 8 فیصد سے گر گئی جو 1933ء کے علاوہ زمانہ امن میں کم ترین شرح تھی۔ یہ کوئی حادثاتی امر نہیں ہے کہ مئی 1961ء میں متعدد معاشی جرائم کے لیے سزائے موت متعارف کروادی گئی تھی۔ صرف 1967ء میں صنعتی پیداوار میں 10 فیصد اضافہ ہوا جب کہ اس دہائی میں اوسط سالانہ ترقی کی شرح گر کر 8.5 فیصد رہ گئی۔

سوویت معاشی ترقی میں کمی کی وجہ نئی سرمایہ کاری میں کمی نہیں تھی۔ سوویت ماہر معیشت وی کدروف اپنے اکتوبر 1966ء میں لکھے جانے والے ایک مضمون میں انکشاف کرتا ہے کہ سرمایہ کاری بہت بڑے پیمانے پر کی گئی تھی۔ ''مجموعی سرمایہ کاری کے حوالے سے سوویت یونین امریکہ کے قریب قریب (تقریباً ''90 فیصد'') ہے اور پیداواری سرمایہ کاری اور مجموعی ارتکاز کے حوالے سے اسے قابل قدر برتری حاصل ہو چکی ہے۔ لیکن چونکہ یہ برتری ایسے حالات میں حاصل کی گئی ہے کہ جس میں ہماری قومی آمدنی امریکہ کی قومی آمدنی کا محض 62 فیصد ہے اس لیے سوویت معیشت پر ایک خاص دباؤ محسوس کیا جا رہا ہے۔''(1)

دباؤ کے باوجود یہ زبردست سرمایہ کاری اسی مناسبت سے مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے میں ناکام رہی۔ وہ آگے چل کر لکھتا ہے:

''سات سالہ منصوبے کے دوران دس لاکھ سے زیادہ خراد مشینیں، دوسو سے زیادہ فورج اور ڈائی پریس اور بہت سی خودکار اور کنٹینیوس فلو لائنز متعارف کروائی گئیں لیکن ان کی پیداواری صلاحیت عام طور پر کافی کم تھی۔ عام طور پر سوویت یونین میں موجود مشینیں امریکہ کے مقابلے میں کم پرانی ہیں اگرچہ ان کے ڈیزائن زیادہ پرانے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سوویت یونین فی کس مزدور پر ہونے والی سرمایہ کاری میں تو امریکہ کی سطح تک نہایت تیزی سے پہنچ رہا ہے لیکن حقیقی پیداواری صلاحیت میں نہیں۔''

زراعت میں صورتحال اس سے بھی زیادہ خراب تھی۔ کدروف لکھتا ہے ''زرعی پیداوار کا انحصار

بہت حد تک تکنیکی آلات اور مزدوروں کی استعداد کار پر ہوتا ہے۔اس ضمن میں سوویت یونین امریکہ سے کافی پیچھے ہے۔سوویت یونین میں 1000 ہیکٹر قابل کاشت زمین کے لیے 13.7 ٹریکٹر ہیں جبکہ امریکہ میں 40.8 ہیں،اسی طرح کمبائن ہاروسٹرز کی تعداد بالترتیب 3.9 اور 15.7 ہے۔''

بیوروکریسی جس تعطل کا شکار تھی اس کا واضح اظہار سوویت یونین کی معاشی ترقی کے اعدادوشمار سے ہوتا ہے۔دوسری عالمی جنگ سے پہلے پانچ سالہ منصوبوں کے دوران روس کی سالانہ شرح ترقی 20 فیصد تھی۔1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں بھی شرح ترقی 10.11 کے لگ بھگ تھی۔یہ شرح بھی دوسری بڑی سرمایہ دار طاقتوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔اگرچہ یہ درست ہے کہ بعض اوقات جاپان کی شرح ترقی 13 فیصد تک پہنچ جاتی تھی لیکن یہ ایک استثنائی تھی۔جس دور کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس میں یہ سوویت یونین کی مستقل شرح ترقی تھی یعنی ہر سال اور بغیر کسی کساد بازاری کے۔بڑی سرمایہ دار معیشتیں زیادہ سے زیادہ 6-5 فیصد (برطانیہ کی شرح ترقی ،زوال پذیری کے سبب اس سے بھی کافی کم تھی) تھی اور وہ بھی ہر سال نہیں۔جاپان کے زیادہ شرح ترقی حاصل کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکی ایٹمی تحفظ کے باعث اس کا اسلحہ پر خرچ کم تھا (مجموعی قومی پیداوار کا 1 فیصد) اور وہ اپنی قدر زائد کا ایک بڑا حصہ سرمایہ کاری پر صرف کرتا تھا۔تمام دیگر مسائل کے ساتھ ساتھ اسلحہ سازی کی شکل میں بھی ایک بہت بڑا بوجھ موجود تھا۔امریکہ کے 8 فیصد کے مقابلے میں سوویت یونین کی مجموعی داخلی پیداوار کا 11-10 فیصد حصہ اسلحہ سازی پر خرچ ہوتا تھا۔اس طرح دونوں ممالک کے مزدور جو دولت پیدا کرتے تھے اس کا بہت بڑا حصہ ایسی اشیا کی پیداوار پر مشتمل ہوتا تھا جو قطعاً بےکار تھیں۔اس کی وجہ یہ حقیقت بھی تھی کہ سوویت یونین خود کو باقی دنیا سے الگ تھلگ کرنے اور خود کفالت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔یہ اعدادوشمار ایک ملک میں سوشلزم کے نظریئے کا دیوالیہ پن پوری سفاکی کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں۔

تیکنیکی پیش رفت

1990ء کی دہائی میں جب کہ معیشت ابھی پس ماندہ تھی اور بھاری صنعت کی تعمیر کے فریضے نسبتاً آسان تھے تو اوپر سے آمرانہ احکامات صادر کرکے نتائج حاصل کئے جاسکتے تھے حالانکہ اس کی بھیانک قیمت ادا کرنا پڑتی۔تاہم بعدازاں سوویت یونین میں مختلف اقسام کی دس لاکھ اشیا بنائی جاتی تھیں اور ایک

جدید معیشت کے حساس اور پیچیدہ باہمی رشتوں کی وجہ سے عوام کی شرکت کے بغیر نوکر شاہی کے غلبے نے مکمل انتشار کی کیفیت پیدا کر دی۔ سرمایہ داری کے قوانین حرکت قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کے قوانین حرکت سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ کم از کم ماضی میں سرمایہ داری کے تحت منڈی کا میکنزم غیر تسلی بخش کارکردگی کے خلاف ایک بے قاعدہ اور بنی بنائی بندش کا کام کرتا تھا (اگر چہ آج کل بڑی اجارہ داریاں مارکیٹ کو اپنے مفادات کے تابع کرنے کے قابل ہوگئی ہیں جس سے سارا عمل ہی مسخ ہو گیا ہے۔) لیکن ایک ایسے سماج میں منڈی کے خود کار میکنزم کا اطلاق نہیں ہوتا جہاں تمام معیشت ریاست کے ہاتھوں میں ہو۔ واحد ممکنہ قدغن منصوبے کی تیاری اور اس کے نفاذ کے ہر مرحلے پر عوام کا شعوری کنٹرول اور جانچ پڑتال ہے۔

ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو جمہوریت کی اس طرح ضرورت ہوتی ہے جیسے انسانی جسم کو آکسیجن کی۔ مزدوروں کے جمہوری کنٹرول اور انتظام کے بغیر، آزاد ٹریڈ یونینوں اور بلاخوف تنقید اور بحث ومباحثے کے بغیر ناگزیر طور پر بڑے پیمانے پر بدعنوانی، ضیاع اور اقربا پروری کو فروغ حاصل ہوا تھا۔ چوری اور ہیرا پھیری نے ناقابل تصور پیمانے پر فروغ پایا۔ سوویت یونین ایک ایسا برصغیر تھا جس میں بے شمار ادارے موجود تھے۔ سٹالن کے دور میں اہم ترین سے لے کر حقیر ترین معاشی فیصلے ماسکو میں موجود پندرہ وزارتیں کرتی تھیں۔ اگر ان وزارتوں کا عملہ ذہین وفطین اشخاص پر مشتمل ہوتا تو بھی مزدوروں کی جمہوریت پر مبنی ضروری جانچ پڑتال کے بغیر ہر قسم کی ہیرا پھیری اور بدانتظامی ناگزیر ہو جاتی۔ جب معیشت کم وبیش پس ماندہ تھی تو بیوروکریسی کی وجہ سے ہونے والے اضافی اخراجات ایک بہت بڑا ضیاع تھے لیکن انہیں برداشت کیا جا سکتا تھا کیونکہ معیشت بہت تیزی سے ترقی کر رہی تھی۔

ایک جدید اور پیچیدہ معیشت (جیسی کہ اس وقت روس بن چکا تھا) ایک بہت نازک میکانزم ہوتا ہے۔ بھاری صنعت، زراعت اور سائنس کے درمیان درست تعلقات ایک آمرانہ انتظامی ٹولے کے ذریعے قائم نہیں کیے جا سکتے۔ مسابقت کی عدم موجودگی میں بدعنوانی اور ہیرا پھیری سے بچنے کا واحد ذریعہ سماج کا شعوری کنٹرول یعنی مزدور طبقے کا جمہوری انتظام ہے۔ سوویت یونین اور مشرقی یورپ کا بحران مغرب میں سرمایہ داری کے بحران جیسا نہیں تھا جو کہ بنیادی طور پر زائد پیداوار کا بحران ہے جس کا اظہار زائد پیداواری صلاحیت کے بحران کی شکل میں ہوتا ہے اور یہ پیداوار کے سرمایہ دارانہ نظام کا خاصہ ہے۔ سٹالن ازم کا بحران منصوبہ بندی اور کنٹرول کے نوکر شاہانہ نظام کا بحران تھا جو منصوبہ بند معیشت کی برتری

کی جڑیں کاٹ رہا تھا۔ مغرب میں پیداواری قوتوں کو نجی ملکیت اور قومی ریاست کا سامنا ہے جبکہ روس اور مشرقی یورپ میں پیداواری قوتوں کو قومی ریاست کے ساتھ ساتھ نوکر شاہانہ کنٹرول کی دیوار کا سامنا تھا۔ اس کا سب سے واضح اظہار ٹیکنالوجی کے فیصلہ کن شعبے میں دکھائی دیا تھا۔ لہٰذا سوشلزم کے لیے جمہوریت ایک ''اضافی'' شے نہیں جو اختیاری ہو بلکہ بنیادی اولین شرط ہے۔ نوکر شاہانہ منصوبہ بندی اپنی حدود کو پہنچ چکی تھی۔ اس حقیقت کا اظہار نہ صرف روس بلکہ مشرقی یورپ کے ممالک کی بتدریج گرتی ہوئی شرح ترقی میں نظر آتا ہے۔

شرح ترقی	1950-55ء	1955-60ء	1960-65ء	1965-70ء
سوویت یونین	11.3	9.2	6.3	4.3
چیکوسلواکیہ	8.3	7.1	1.8	4.0
پولینڈ	8.6	6.6	5.9	6.7
بلغاریہ	12.2	9.7	6.5	4.5

1970ء کی دہائی میں شرح ترقی میں مزید کمی ہوئی اور 1979ء تک سوویت یونین کی ترقی میں اضافے کی شرح محض 3.6 فیصد تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سوویت یونین کی پیداواری قوتوں کی ترقی میں بیوروکریسی کا نسبتاً ترقی پسندانہ کردار اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ وہ معیشت کی راہ میں ایک ٹھوس رکاوٹ بن چکی تھی۔ 1960ء اور 1970ء کی دہائیوں میں مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں اوسط کے حوالے سے کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا تھا۔ لیکن 1975ء سے 1980ء کے درمیان یہ کم ہو کر 3.4 فیصد ہو چکا تھا اور 1982ء تک اس کی شرح 2.5 فیصد سالانہ گر چکی تھی۔ 1949ء میں مجموعی قومی پیداوار میں محض 0.9 فیصد اور 1980ء میں 1.5 فیصد اضافہ ہوا۔ سٹالن ازم کی نوکر شاہانہ جکڑ بندی اب قومیائی ہوئی معیشت اور منصوبہ بندی پر کی جانے والی پیش رفت کا گلا بری طرح گھونٹ رہی تھی۔ شرح اضافہ (جو ایک وقت دنیا میں سب سے زیادہ تھی) اب کم ہو کر سرمایہ دار مغرب کی سست رفتار شرح سے مختلف نہیں رہی تھی۔ بیوروکریسی نے اگر ماضی میں کوئی ترقی پسندانہ کردار ادا کیا بھی تھا تو اب اس کا خاتمہ ہو چکا تھا۔

ابتدائی پانچ سالہ منصوبوں کے درمیان زبردست بے روزگاری اور شدید ترین کساد بازاری کے باعث سرمایہ داری پیداواری قوتوں کی ترقی کی راہ میں ایک کڑی دیوار ثابت ہوئی تھی۔ سوویت یونین کروڑوں انسانوں کی امیدوں کی آماجگاہ تھا۔ نہ صرف مزدور بلکہ بہترین دانشور بھی سوویت یونین کی

طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ 1970ء کی دہائی تک صورتحال، کم از کم ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے حوالے سے، تبدیل ہو چکی تھی۔ نوکر شاہانہ آمرانہ نظام اور اس کی جامد معیشت مغربی یورپ، امریکہ اور جاپان کے عوام کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی تھی۔ اور ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا کیونکہ وہ 1980ء کی دہائی کے ابھار کے دور میں سرمایہ داری کے مقابلے میں کم شرح سے پیداواری قوتوں کو ترقی دے رہے تھے۔

آج کل سوویت یونین کی ٹیکنالوجی کے شعبے میں کسی بھی قابل قدر پیش رفت کو مسترد کرنا فیشن میں داخل ہے۔ یہ ایک جھوٹ ہے۔ سوویت یونین نے جو سائنس دان اور انجینئر پیدا کیے وہ اگر مغرب کے مقابلے میں بہتر نہیں تھے تو کمتر بھی نہیں تھے۔ اس کا ثبوت ہمیں صرف خلائی پروگرام اور اسلحہ سازی کے شعبوں میں ہی نہیں بلکہ خاص طور پر بڑے پیمانے کے مشکل پراجیکٹوں میں بھی ملتا ہے۔ فنانشل ٹائمز نے آج سے دس سال سے زیادہ عرصہ قبل 8 فروری 1986ء کو لکھا تھا ''پچھلے پندرہ سال میں انتہائی مشکل حالات میں سائبیریا کے ویرانوں میں حاصل کی جانے والی ترقی کا موازنہ انجینئرنگ کے کارنامے کے طور پر اپنی وسعت اور دشواری کے حوالے سے پانامہ نہر کی تعمیر سے کیا جاسکتا ہے۔'' اس قسم کے پراجیکٹوں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔ سوویت سائنس دانوں اور ہنرمندوں کی ایجادات اور دریافتوں کی تعداد حیران کن ہے۔ یہ ایک ایسا شعبہ تھا جس میں وہ امریکہ کے برابر پہنچ چکے تھے اور درحقیقت جاپان، برطانیہ اور فرانس سے آگے نکل گئے تھے۔ 19 نومبر 1986ء کو گارڈین تحریر کرتا ہے:

''نئی ایجادات کے حوالے سے روس اور امریکہ ہم پلہ ہیں۔ دونوں تقریباً 80,000 سالانہ کے حساب سے انہیں رجسٹر کرا رہے ہیں جو کہ جاپان کی 50,000 اور فرانس اور برطانیہ کے دس، دس ہزار کے مقابلے میں بہت زیادہ ہیں۔ اس وقت بیس ہزار سے زیادہ ایجادات روس نے بیرون ملک رجسٹر کرا رکھی ہیں جن سے اسے لائسنس فیسوں کی صورت میں 100 ملین ڈالر سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ نئی سوویت ایجادات کے دستیاب ہونے کے بعد ان اعداد و شمار میں تیز رفتاری سے اضافہ ہوگا۔ اسی ماہ بظاہر انہوں نے بجلی کی 1500 کلوواٹ کی ٹرانسمیشن لائن مکمل کر لی ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور لائن ہے۔''(2)

لیکن سوویت سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبردست صلاحیت کو کبھی بھی حقیقت کا روپ دھارنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ زراعت کی طرح یہاں بھی وہ مغرب جیسے نتائج حاصل نہیں کر سکے تا کہ دستیاب ایجادات اور ٹیکنالوجی سے استفادہ حاصل کیا جا سکے حالانکہ سرمایہ کاری کی سطح مقابلتاً زیادہ اونچی تھی۔ ہر

سطح پر نوکر شاہانہ نظام نے بریکوں کا کام دیا۔ 1980ء کی دہائی تک روسی معیشت انتہائی پیچیدہ شکل اختیار کر چکی تھی جس میں پچاس ہزار کارخانے مختلف اقسام کی دو کروڑ اشیا بنا رہے تھے۔ نوکر شاہانہ کنٹرول کے پرانے ہتھکنڈے اب پیداوار کا گلہ گھونٹ رہے تھے۔ 1982ء میں نمایاں سوویت عالموں نے 256 صفحات پر مشتمل ایک مطالعاتی جائزے میں معیشت کو درپیش مسائل کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ اس میں آٹھ اقسام کی سوویت صنعتوں کا جائزہ لیا گیا تھا جن میں کیمیکلز، مشین ٹولز، انڈسٹریل پراسیس کنٹرول اور دفاعی صنعت شامل ہیں۔

''انہوں نے غیر لچکدار منصوبہ بندی، انتظامی ڈھانچوں اور ضابطوں، سائنس کو صنعت سے علیحدہ کرنے کے باعث پیدا ہونے والے مسائل، اس کی نوکر شاہی اور انتظامی ٹوٹ پھوٹ کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے۔ انہوں نے قدامت پسندی اور جمود کے عام ہونے کے بارے میں بات کی ہے جس میں جدت پسندی کو بے جا تصور کیا جاتا ہے، مسابقت کے عناصر کی عدم موجودگی، فروخت کنندگان کی منڈی میں موجودگی اور پیداکار اور صارف کے درمیان طویل المعیاد تعلقات کی عدم موجودگی کی بات کی ہے۔'' (3)

پراودا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے ریاستی کمیشن کے سینئر وائس چیئر مین وادیم ترا پیزنیکوف نے تبصرہ کیا:

''اکثر اوقات سوویت فیکٹریاں نئی مشینیں لگا کر نئی اشیا پیدا کرنے کی نسبت دقیانوسی مشینوں پر اشیا پیدا کر کے زیادہ فائدے میں رہتی ہیں۔ جدت یعنی جدید ترین ایجادات کا فیکٹریوں میں عملی اطلاق وہ کلیدی مسئلہ ہے جس کا سوویت منصوبہ سازوں کو سامنا ہے اور جس کا ذکر سوویت ذرائع ابلاغ میں اکثر و بیشتر ہوتا رہتا ہے۔ سوویت یونین کے پاس دنیا کے کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلے میں زیادہ سائنس دان اور انجینئر ہیں اور نظری تحقیق کے بہت سے شعبوں میں اسے فوقیت حاصل ہے اور کئی ایک شعبوں میں اس کے عملی اطلاق میں بھی اس نے پیش رفت حاصل کی ہے مگر ترقی یافتہ ترین سرمایہ دار ممالک کے مقابلے میں سوویت ٹیکنالوجی کی عمومی سطح اور نئی ایجادات کو جذب کرنے کی صلاحیت کم ہے اور زیادہ تر روسی اشیا سرمایہ داری کی پیش کردہ بہترین اشیا کا برآمدی منڈی میں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔'' (4)

جدید ٹیکنالوجی کے دیگر شعبوں مثلاً صنعتی روبوٹوں کے سلسلے میں بھی یہ بات درست تھی۔ 1980ء میں کومیکون دنیا بھر میں موجود 14000 صنعتی روبوٹوں کا صرف 3.6 فیصد استعمال کر رہی تھی جبکہ اس

کے مقابلے میں مغربی جرمنی کا حصہ 9.3 فیصد اور جاپان کا 43 فیصد تھا۔ تاہم اس کے بعد کومیکون کا 1990ء تک کے پانچ سالہ دور میں دو لاکھ صنعتی روبوٹ لگانے کا منصوبہ تھا جن میں سے نصف سوویت یونین میں لگائے جانے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے پیمانے پر مائیکرو پروسیسروں اور چھوٹے بڑے کمپیوٹروں کی تیاری کے ساتھ ساتھ الیکٹرونکس کے نئے شعبوں، روبوٹوں، ایٹمی قوت اور جدید ٹیکنالوجی کے دیگر شعبوں کو ترقی دینے کے منصوبے تیار کئے گئے۔

ایسی کوئی معروضی وجہ نہیں تھی کہ یہ اہداف حاصل نہ کئے جا سکتے۔ لیکن یہ حاصل نہ ہو سکے۔ روس اور مشرقی یورپ میں سائنس دانوں، ہنرمندوں کی بہت بڑی تعداد کے موجود ہونے کے باوجود وہ مغرب جیسے نتائج حاصل نہ کر سکے۔ اس تمام عرصے کے دوران کمپیوٹر جیسے بہت سے شعبوں میں مشرق اور مغرب کے درمیان فرق بڑھتا رہا۔ صرف اسی سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ماضی میں پیداواری قوتوں کو ترقی دینے میں اگرچہ بیوروکریسی نے ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کیا تھا لیکن اب یہ اس ترقی کے راستے میں دیوار بن چکی تھی۔

ان خیالات میں مزید ایک اضافہ کرنا ضروری ہے۔ سرمایہ داری کی طرف واپسی کے رجحان نے روس میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی میں مدد دینے کی بجائے انتہائی تباہ کن اثرات مرتب کئے ہیں۔ سوویت یونین کی تیکنیکی پیش رفت کی صرف ایک مثال دینا ہی کافی ہوگا یعنی اسکا خلائی پروگرام۔ اس شعبے میں سوویت یونین کی برتری پر کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دنیا بھر میں سب سے آگے تھا۔ مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اگر آج بھی 'میر' پروگرام اور اس کے خلائی سٹیشن ماضی کے شاندار کارناموں کا ثبوت فراہم کرتے ہیں لیکن سرمایہ داری کی طرف واپسی نے نہایت شرمناک انداز میں سوویت کامیابی کی اس داستان کو نقصان پہنچایا ہے۔ 1996ء میں جن 27 خلائی سٹیشنوں کو روانہ کرنے کا پروگرام تھا فنڈز میں کمی کی وجہ سے ان میں سے صرف 11 کو روانہ کیا جا سکا۔ خلائی پروگرام پر اخراجات کے سلسلے میں دنیا بھر میں روس آج 19 ویں نمبر پر ہے۔

لینن نے کئی مرتبہ وضاحت کی تھی کہ روس کے مستقبل کو عالمی سرمایہ داری کی پوزیشن سے، خاص طور پر اس کے ترقی یافتہ ترین ممالک جن میں امریکہ سرفہرست ہے، الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ زبردست پیش رفتوں کے باوجود بہت سے شعبوں میں امریکی معیشت کے مقابلے میں نسبتاً پسماندہ ہی رہا۔ مثال کے طور پر رقبے میں چھوٹے ہونے کے باوجود امریکہ میں ریلوے لائن کی لمبائی روس کے

مقابلے میں اڑھائی گنا زیادہ تھی۔ کمپیوٹروں اور خود کار مشینری کے سلسلے میں بھی سوویت یونین بہت پیچھے تھا۔ 1972ء میں میڈیڈیف نے اپنی کتاب میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا ''امریکہ میں بجلی کی پیداوار اب بھی سوویت یونین کے مقابلے میں دگنی سے زیادہ ہے۔ امریکہ اپنی جغرافیائی حدود کے اندر روس کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا زیادہ تیل اور تین گنا زیادہ قدرتی گیس پیدا کرتا ہے۔ 1960ء کی دہائی کے آخر میں سوویت یونین امریکہ اور جاپان کے مقابلے میں ایک چوتھائی تعداد میں ٹرک بناتا تھا۔ ہم اٹلی، جاپان، فرانس اور مغربی جرمنی جیسے ممالک کے مقابلے میں کہیں کم تعداد میں کاریں بناتے ہیں۔ امریکہ ہمارے مقابلے میں تقریباً بیس گنا زیادہ کاریں بناتا ہے۔''

''ہم امریکہ کے مقابلے میں نصف اور جاپان کے مقابلے میں ایک چوتھائی تعداد میں ریڈیو بناتے ہیں۔ فریج بنانے کے سلسلے میں ہم اس سطح پر ہیں جہاں امریکہ 1950ء میں تھا۔ پلاسٹک اور مصنوعی ریشے کی پیداوار کے سلسلے میں ہم اٹلی سمیت تقریباً تمام یورپی ممالک سے پیچھے ہیں اور امریکہ ہمارے مقابلے میں چھ گنا زیادہ بناتا ہے۔ 1970ء میں جاپان نے ہمارے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ اور امریکہ نے دس گنا زیادہ مصنوعی ریشہ بنایا۔''(5)

بنیادی کمزوری یہ تھی کہ مزدوروں کی پیداواری صلاحیت میں مناسب اضافہ نہ کیا جا سکا۔ مارکس نے اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آخری تجزیے میں کسی معاشی نظام کی کامیابی کا دارومدار مزدوروں کی پیداواری صلاحیت یا صرف شدہ محنت کے وقت میں کمی پر ہوتا ہے۔ پیداواری صلاحیت میں اضافہ ضرور ہوا لیکن سب سے ترقی یافتہ سرمایہ دار معیشت امریکہ کے ساتھ فرق بہت زیادہ تھا۔ پانچ سالہ منصوبوں کی کامیابی کے نتیجے میں ان دو ممالک کے درمیان فرق میں کافی کمی واقع ہوئی تھی۔ یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہئے کہ انقلاب سے پہلے کا زارشاہی روس معاشی طور پر آج کل کے تیسری دنیا کے ممالک کی طرح تھا نہ کہ ترقی یافتہ ممالک کی طرح۔ 1913ء میں روسی صنعت میں مزدوروں کی کارکردگی کے بارے میں جو اندازہ لگایا گیا تھا وہ امریکہ کے مقابلے میں 25 فیصد کا تھا۔ 39-1937ء میں امریکہ کے مقابلے میں 40 فیصد ہو چکا تھا۔

جنگ کے بعد کے دور میں اگرچہ کارکردگی میں اضافہ تو ضرور ہوا لیکن اس میں اضافے کی شرح کم ہو گئی۔ 60-1956ء کے درمیان صنعتی کارکردگی میں اضافے کی سالانہ شرح 6.5 فیصد تھی جب کہ 65-1961ء کے دوران یہ کم ہو کر 4.6 فیصد رہ گئی۔ 1980ء میں صنعت میں کام کرنے والا ایک

امریکی مزدور 2.8 روسی مزدوروں کے برابر پیداوار دیتا تھا یعنی دوسرے لفظوں میں سوویت یونین میں مزدوروں کی عمومی پیداواری کارکردگی امریکہ کے مقابلے میں ایک تہائی تھی۔ پیداوار کی مجموعی مقدار سے زیادہ یہ اعداد وشمار حاصل کردہ معاشی ترقی کی سطح میں حقیقی فرق کو واضح کرتے ہیں۔اس لیے یہ فیصلہ کن اہمیت کے حامل ہیں۔مغرب کے مقابلے میں پسماندگی اور بالخصوص پیداواری کارکردگی کے شعبے میں پسماندگی بیوروکریسی کے لیے قلیدی سوال کی حیثیت رکھتی تھی۔زیادہ بڑا مزدور طبقہ اور ہنر مندوں اور انجینئروں کی دوگنا تعداد رکھنے کے باوجود 1960ء کی دہائی کے وسط میں سوویت یونین امریکہ کے مقابلے میں 65 فیصد پیداوار دیتا تھا۔مزدوروں کی دوتہائی تعداد صحیح طور پر کام کرنے کی اہل نہیں تھی اور پیداوار کا کم ازکم ایک تہائی حصہ بدانتظامی، ہیرا پھیری، تخریب کاری اور چوری کی وجہ سے ضائع ہوجاتا تھا۔

زراعت، کمزور ترین کڑی

زراعت کی صورتحال اس سے کہیں زیادہ بدتر تھی۔ برژنیف کے دور میں چار سوویت زرعی مزدور مل کر اتنی پیداوار دیتے تھے جتنی ایک امریکی مزدور دیتا تھا۔سوویت زراعت 1930ء کی دہائی میں ہونے والی جبری اجتماعی کاشت سے سنبھل نہیں پائی تھی جب کسانوں نے فصلیں تباہ کر دی تھیں اور پالتو جانوروں کو ذبح کر کے کھا ڈالا تھا۔گھوڑوں اور سوروں کی تعداد میں 55 فیصد اور بھیڑوں کی تعداد میں 66 فیصد کمی ہوئی تھی وغیرہ وغیرہ۔ 1930ء اور 1955ء کے درمیان فی کس کے لحاظ سے زرعی پیداوار (تیکنیکی فصلوں کو چھوڑ کر) اور زمینوں پر پائے جانے والے جانوروں کی تعداد (سوروں کے لیے اسکا اطلاق صرف 1953ء کے لیے ہے) 1916ء کے مقابلے میں کم تھی اور سینگوں والے جانوروں اور گائیوں کے سلسلے میں نہ تو 1913ء اور نہ ہی 1928ء کی سطح کو پہنچا جاسکا۔ زمین کی پیداواری صلاحیت بہت ہی کم رہی۔ 1982ء میں رپورٹ دی گئی تھی کہ روس میں ایک زرعی مزدور 6 افراد کے لیے خوراک مہیا کرتا ہے جبکہ امریکہ میں یہ تعداد 40 تھی۔تمام تر وسائل اور سرمایہ کاری کے باوجود سوویت معیشت ان عوامل سے استفادہ حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ برژنیف بھی سوویت زراعت کے مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہا۔اس کے برعکس وہ بتدریج بدتر ہوتے چلے گئے۔

اس کا براہ راست اثر معیار زندگی پر پڑا۔خوراک کے مندرجہ ذیل اعداد وشمار سے روس اور امریکہ

کے درمیان معیار زندگی کے فرق کا پتہ چلتا ہے۔ روس میں 48 فیصد حرارے (کیلوریز) زیادہ تر ڈبل روٹی وغیرہ سے حاصل کیے جاتے تھے جبکہ امریکہ میں اس کی شرح 22 فیصد تھی۔ دوسری طرف مچھلی اور گوشت سے حاصل کردہ حراروں کی شرح صرف 8 فیصد تھی جب کہ امریکہ میں یہ شرح 20 فیصد تھی۔ سوویت شہری امریکیوں کی نسبت نصف مقدار میں گوشت کھاتے تھے بلکہ پولینڈ والوں سے بھی کم کھاتے تھے۔ اس بنیادی سطح پر بھی روس پسماندہ تھا۔ سوویت یونین کو اناج درآمد کرنا پڑتا تھا۔ صرف 1984ء میں اس پر 6.5 ارب ڈالر خرچ ہوئے۔ جبکہ روسی زراعت میں ممکنہ طور پر اتنی صلاحیت موجود تھی کہ ساری دنیا کو خوراک مہیا کر سکے۔

زراعت صنعت کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہے کیونکہ یہاں ہمارا سابقہ فطری اور انسانی عناصر سے پڑتا ہے۔ زراعت میں پیداواری صلاحیت میں دیرپا ترقی کے حصول کے صرف دو ذرائع ہیں یا تو عمومی طور پر بہتر تیکنیک اور مشینری استعمال کی جائے یا کام کرنے والوں کو زیادہ بہتر طور پر ترغیب دی جائے۔ دراصل یہ دونوں چیزیں پہلو بہ پہلو کام کرتی ہیں۔ اگر جدید مشینری مہیا کر بھی دی جائے لیکن جب تک دیہی مزدوروں کو دستیاب آلات کو بہترین انداز میں استعمال کرنے کی ترغیب نہ دی جائے تو مطلوبہ نتائج کا حصول ممکن نہیں ہوسکتا۔ ایسی ترغیبات صرف دو طرح کی ہوسکتی ہیں یا تو کسان یا دیہی پرولتاریہ اخلاقی لحاظ سے تحریک حاصل کرے اور اسے سوشلزم کی ضرورت کا یقین ہو جائے یا اسے مادی فوائد کی پیش کش کی جائے۔ روسی بیوروکریسی ان میں سے کچھ بھی دینے سے قاصر تھی۔ سوشلسٹ بنیادوں پر مسئلہ آسانی سے حل ہوسکتا تھا لیکن کسانوں میں ایک مختلف نوعیت کا شعور متعارف کروانے کا مطلب ہوتا ہے کہ سماج سے اس کے رشتے کو تبدیل کیا جائے، دیگر پیداکاروں سے رابطہ ہو، فیصلے جمہوری بنیادوں پر ہوں اور امداد باہمی وغیرہ۔ ایک نوکرشاہانہ نظام کی بنیاد پر ایسا ہونا ناممکن ہے۔

جنگی کمیونزم کے انتہائی مشکل حالات میں بالشویک اناج کے جبری حصول پر مجبور تھے تاکہ شہروں میں موجود فاقہ کشی کا شکار مزدوروں کو خوراک مہیا کی جاسکے۔ یہ وہ وقت تھا جب صنعت بند ہو جانے کی وجہ سے کسانوں کو ان کی پیداوار کے عوض اشیا مہیا کرنا ناممکن تھا۔ لیکن اسے کبھی بھی ایک ایسے عارضی اقدام کے علاوہ کچھ نہیں سمجھا گیا جس کے لیے مزدور ریاست ایک ایسی غیر معمولی صورت میں مجبور تھی جب بذات خود انقلاب کا وجود خطرے میں تھا۔ جلد ہی یہ پالیسی ترک کر دی گئی اور اس کی جگہ اناج کی آزاد منڈی اور نئی معاشی پالیسی کو متعارف کروایا گیا۔ لینن اور ٹراٹسکی اجتماعی کاشتکاری کو مثال کے ذریعے

بتدریج رائج کرنے کے حق میں تھے اوراس دوران انہوں نے کوآپریٹوز کی حوصلہ افزائی کی۔لیکن بندوق کے زور پراجتماعی کاشتکاری کو کسانوں پر جبری مسلط کرنے کے امکان پرانہوں نے کبھی غور نہیں کیا جس طرح سٹالن نے 1930ء کی دہائی میں کیا تھا۔اس خوفناک پالیسی نے سوویت زراعت کوتباہ کردیا تھا۔ یہ زبردست قحط اور لاکھوں انسانوں کی موت کا باعث بنی۔سوویت زراعت سٹالن کی اس مجنونانہ اور مجرمانہ پالیسی کے اثرات سے کبھی بھی پوری طرح نجات حاصل نہیں کرسکی۔

کسی بھی معاملے کی نسبت یہاں ہمیں نوکرشاہی کا مطلقانہ تصور زیادہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے موسم کومورِدِالزام ٹھہرانے کی کوشش کی۔ یہ سچ ہے کہ روسی موسم سرما ایسے مسائل پیدا کرتا ہے جو معتدل آب وہوا کے خطوں میں دیکھنے کونہیں ملتے لیکن جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ان پر بڑی حد تک قابو پانا ممکن ہوسکتا تھا۔مسئلہ موسم کا نہیں بلکہ دیہی آبادی کے غیر موافق رویے کا تھا۔جہاں اناج ذخیرہ کرنے کے لیے گودام تعمیر بھی کیے گئے تھے وہاں بھی اکثر اوقات اناج کو گلنے سڑنے کے لیے باہر چھوڑ دیا جاتا۔ٹریکٹر ڈرائیور کورقبے کے لحاظ سے ادائیگی کی جاتی تھی اس لیے ہل جتنا کم گہرا چلایا جاتا اس کے لیے اتنا ہی سودمند تھا۔ یہاں نوکرشاہانہ نظام کی ساری برائیاں سوگنا بڑھ گئی تھیں یعنی بدانتظامی، ہیراپھیری، ترسیل کا ناقص انتظام اورروسی دیہی علاقوں کے پسماندہ حالات نے مل کر بڑے پیمانے پرتخریب کاری کوجنم دیا۔

ماضی میں زراعت کونظرانداز کیا گیا تھا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔اب مسئلہ سرمایہ کاری کی کمی کا نہیں تھا۔ بیوروکریسی زراعت میں وسیع پیمانے پر سرمایہ کاری کررہی تھی اوراب ہر سوملین کی سرمایہ کاری میں اس کا حصہ ایک تہائی تھا۔اس کے باوجود وہ مطلوبہ نتائج حاصل نہ کرسکے۔مثال کے طور پرامریکہ اپنی مجموعی قومی آمدن کا محض پانچ فیصد زراعت پر صرف کرتا تھا مگراس نے کہیں بہتر نتائج حاصل کئے۔اجتماعی فارموں پر کی جانے والی بڑے پیمانے کی کاشت کاری اورٹریکٹروں کے ذریعے کاشتکاری کے باوجود سرکاری طور پر اعتراف کیا گیا کہ زرعی مزدوروں کی پیداواری صلاحیت امریکہ کے مقابلے میں ایک چوتھائی ہے۔آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ (27 ملین) زراعت سے منسلک تھا یعنی امریکہ کے مقابلے میں چھ گنا اور سوویت یونین میں امریکہ کے مقابلے میں فی ٹریکٹر بیس گنا زیادہ مزدور موجود تھے۔روسی اجتماعی کاشتکار کی اوسط اجرت صنعتی مزدور کے مقابلے میں نصف تھی۔ ہر سال بیس لاکھ نوجوان دیہات کو چھوڑ کر جارہے تھے۔ زراعت کو بہت زیادہ چھوٹ حاصل تھی جس کی مقدار کل سرمایہ کاری کا 27 فیصد تھی۔

روس دنیا میں سب سے زیادہ ٹریکٹر بنانے والا ملک تھا۔اس کا زیرکاشت رقبہ امریکہ کے مقابلے

میں دوتہائی زیادہ تھا۔تاہم کمتر معیار اور دیکھ بھال مناسب نہ ہونے کے سبب سوویت ٹریکٹر کی اوسط عمر پانچ یا چھ سال ہوتی تھی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال تین لاکھ نئے ٹریکٹروں کی ضرورت پیش آتی تھی۔ٹریکٹروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود اجتماعی فارموں پر فی ٹریکٹر سالانہ کارکردگی میں 1960ء کی دہائی میں حقیقتاً کمی واقع ہوئی جو 67-1960ء کے دوران 17 فیصد تھی۔سوویت یونین ایک وسیع و عریض برصغیر تھا۔تاہم امریکہ کے مقابلے میں زراعت میں صرف ایک تہائی ٹرک استعمال ہوتے تھے۔

میڈویڈیف نے 1972ء میں لکھا تھا ''اس وقت امریکہ کے زرعی مزدوروں کے پاس اتنے ہی اچھے ذرائع پیداوار ہیں جتنے صنعتی مزدوروں کے پاس ہیں بلکہ بعض حوالوں سے اسے برتری حاصل ہے۔ امریکی صنعتی مزدوروں کے پاس اپنے سوویت مدمقابل کے 5.4 ہارس پاور کے مقابلے میں 39 ہارس پاور کی صلاحیت موجود تھی۔ 1967ء تک امریکہ کے صنعتی مزدوروں کو حاصل طاقت بڑھ کر 78 ہارس پاور یعنی دگنی ہو چکی تھی۔اسی دوران یہ سوویت یونین میں بڑھ کر 8.8 ہارس پاور ہوگئی یعنی اس میں 65 فیصد اضافہ ہوا۔''

1966ء سے 1970ء کے درمیان اجتماعی فارموں کو پندرہ لاکھ ٹریکٹر مہیا کیے گئے جبکہ گیارہ لاکھ پچاس ہزار ٹریکٹروں کو متروک قرار دیا گیا۔پانچ لاکھ کمبائن ہارویسٹرز بھی مہیا کیے گئے لیکن ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ متروک قرار دیئے گئے۔اس سے 1966ء کی تیسویں پارٹی کانگریس میں برژنیف کی تقریر سے جھلکنے والی پریشانی کی وضاحت ہوجاتی ہے:

''سنٹرل کمیٹی ایک اور مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری خیال کرتی ہے یعنی اجتماعی اور ریاستی فارموں پر مشینری کا استعمال۔دیہی علاقوں میں ٹریکٹروں، لاریوں، کمبائن ہارویسٹروں اور دوسری مشینوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہورہا ہے۔وہاں ہونے والی محنت صنعتی کام کی شکل اختیار کررہی ہے۔تاہم حالیہ برسوں میں مشینوں اور ٹریکٹروں کے استعمال کے حوالے سے بنیادی اعشاریے گراوٹ کو ظاہر کررہے ہیں۔مشینیں استعمال کرنے والے کاریگروں میں نوکری چھوڑ جانے کا رجحان زیادہ ہے جس سے کام کرنے والوں کی تعداد میں اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا ہے۔یہ تمام چیزیں مشکلات پیدا کرنے کا سبب بنتی ہیں۔کھیتوں میں استعمال ہونے والی مشینری کی دیکھ بھال کے مراکز میں جہاں تک ممکن ہوسکے زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے۔سیلخوز ٹیکنیکا اداروں، اجتماعی اور ریاستی فارموں کو جدید آلات فراہم کیے جائیں اور مشین آپریٹرز کو بہتر تربیت اور زیادہ مادی ترغیبات دی جائیں۔'' وغیرہ وغیرہ۔(7)

اس رپورٹ کے بین السطور میں ہمیں اجتماعی فارموں کی ایک ایسی تصویر دکھائی دیتی ہے جس میں مشینری پرانی، فرسودہ یا گھٹیا معیار کی ہے اور مسلسل خراب رہتی ہے، غیر تربیت یافتہ اور جذبے سے عاری مزدور ہیں، جو نہ تو ان مشینوں کی دیکھ بھال کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی مرمت اور انہیں انتہائی بنیادی فرائض کی بجا آوری پر آمادہ کرنے کے لئے بھی مادی ترغیبات کی شکل میں رشوت دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔صورت حال اس وقت سے اب تک کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوئی جب ٹراٹسکی نے لکھا تھا:

''ٹریکٹر سوویت معیشت کا افتخار ہیں۔لیکن اس کے مؤثر استعمال کی شرح بہت کم ہے۔پچھلے صنعتی سال میں 81 فیصد ٹریکٹروں کو بڑی مرمتوں کی ضرورت درپیش آئی۔علاوہ ازیں ان کی بہت بڑی تعداد عین کاشت کے موسم میں دوبارہ خراب ہوگئی۔''(8)

1950ء کی دہائی میں خروشیف کی اصلاحات کے نتیجے میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا۔لیکن برژنیف کے دور میں صورت حال اور زیادہ خراب ہوگئی۔1950ء کی دہائی میں زرعی پیداوار کی سالانہ ترقی کی شرح 4.9 فیصد تھی۔1960ء کی دہائی میں یہ کم ہوکر 3 رہ گئی اور بعدازاں گر کر دو فیصد ہوگئی اور 1970ء کی دہائی میں درحقیقت زرعی پیداوار میں زوال آیا۔حالانکہ زراعت میں سرمایہ کاری بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔زراعت کل قومی سرمایہ کاری کا 20 فیصد حصہ حاصل کرتی تھی جو جنگ سے پہلے کے مقابلے میں دگنا تھا۔کھاد کی پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا۔اس کے باوجود امریکہ کے مقابلے میں زمین کی پیداوار کی مالیت 4/5 حصے کم تھی۔زراعت میں مزدوروں کی پیداواری صلاحیت بہر طور کم ہی رہی۔جزوی طور پر اس کی وجہ دیہات سے نوجوانوں کی نقل مکانی اور اس سے پیدا ہونے والی افرادی کمی تھی۔1980ء تک زمینوں پر کاشت کرنے والوں کی تعداد 20 فیصد رہ گئی اور ان میں سے بھی زیادہ تر بوڑھے لوگ تھے۔مگر اس سے ہر چیز کی وضاحت نہیں ہوجاتی۔مغربی یورپ میں دیہات سے شہروں کی طرف ہونے والی نقل مکانی اس سے بھی زیادہ تھی لیکن وہاں زراعت میں پیداواری صلاحیت میں زبردست اضافہ دیکھنے کو ملا۔

اصل وجہ بیگانگی کا شکار زرعی شعبے میں کام کرنے والی افرادی قوت کی مجہول مدافعت اور تخریب کاری اور اس کے ساتھ ساتھ نوکر شاہانہ نظام کی بدعنوانی، نااہلی، بدانتظامی اور زبردست ضیاع تھی۔برژنیف نے دیہی علاقوں میں کام کرنے والوں کو راغب کرنے کیلئے چھوٹے چھوٹے نجی قطعہ اراضی تقسیم کیے۔درحقیقت اس نے اسے اپنے نئے آئین کی تیرھویں شق میں شامل کر دیا تھا۔صورت حال کو دیکھتے

ہوئے یہ قدم اٹھانا بے جا نہ تھا۔ جب تک ذرائع پیداوار مناسب حد تک ترقی پا کر دیہی آبادی کو بہتر معیار زندگی کی ضمانت فراہم نہ کر دیں اور جب تک جدید مشینری سے آراستہ اجتماعی فارم چھوٹے پیمانے کی انفرادی کاشتکاری پر اپنی برتری کا عملی مظاہرہ نہ کر دیں قصبات میں بالعموم اور دیہات میں بالخصوص چھوٹے کاروباروں کو رعائتیں فراہم کرنا ضروری ہیں۔ برژنیف کے دور میں چھوٹے نجی قطعہ ہائے اراضی کل زرعی رقبے کا محض 3 فیصد تھے لیکن وہ ایک تہائی گوشت، دودھ اور سبزیاں، ایک تہائی سے زیادہ انڈے اور حیران کن طور پر اون کا پانچواں حصہ فراہم کرتے تھے۔

حکمران دیہی علاقوں کے سنجیدہ مسائل کے سلسلے میں پریشان تھے کیونکہ زراعت اور اشیائے صرف کی پیداوار کے درمیان براہ راست تعلق ہے اور اسی وجہ سے معیار زندگی سے بھی ہے۔ الیکسی کوسیجن نے 1966ء کی پارٹی کانگریس میں پیش کی جانے والی معاشی رپورٹ میں حقیقی اجرتوں کی شرح ترقی میں کمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے جزوی طور پر مزدوروں کی کم ترین پیداواری صلاحیت کے ساتھ ساتھ زراعت سے بھی منسلک کیا:

''زراعت کی سست روی کی وجہ سے خوراک اور ہلکی صنعتوں سے متعلق اہداف حاصل نہ کیے جا سکے اور اس سے قومی آمدنی کی ترقی اور قومی خوشحالی کی ترقی کی رفتار کم ہوگئی۔''(9)

مسلسل خراب فصلوں کا نتیجہ 1972ء میں تباہی کی صورت میں برآمد ہوا۔ مارچ 1974ء میں حکومت نے 225 ملین ٹن پیداوار کے حصول کا اعلان کیا۔ تاہم اناج ذخیرہ کرنے والے گوداموں کی کمی کے باعث صرف 180 ملین ٹن پیداوار کو بچایا جا سکا۔ اس تباہی کا براہ راست تعلق نوکر شاہانہ بدانتظامی تھی جو سوویت زراعت کیلئے لعنت بن چکی تھی۔ گوداموں کی قلت، ٹرانسپورٹ کی کمی یا محض نا اہلی کی وجہ سے اناج کو کھلے آسمان تلے گلنے سڑنے کیلئے چھوڑ دیا گیا۔ بعدازاں سوویت قیادت نے زرعی مسائل پر قابو پانے کی کوشش کی مگر لا حاصل۔ مسئلہ بذات خود نوکر شاہانہ نظام کی جبلت میں پوشیدہ تھا۔

1970ء کی دہائی میں معیار زندگی

جنگ سے پہلے جب سٹالن نے ایک ''پر مسرت زندگی'' کی صبح کے آغاز کا اعلان کیا تھا تو ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ سوویت یونین میں ہر مزدور کے حصے میں صرف ایک پاؤں کا جوتا آتا ہے۔ برژنیف کے دور

میں ایسی صورت حال نہیں تھی۔ 1979ء میں سوویت یونین دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ جوتے تیار کر رہا تھا اور ہر شخص کے پاس اوسطاً پانچ جوڑے موجود تھے۔ سٹالن کی موت کے بعد تیس سال تک کھپت 3.6 فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھی۔ معیار زندگی میں دوگنی بہتری ہوئی۔ یہ درست ہے کہ 1970ء کی دہائی میں بھی سوویت یونین میں معیار زندگی مغرب کے مقابلے میں بہت کم تر تھا۔ تاہم برژنیف کے دور میں کھپت مسلسل بڑھتی رہی جیسا کہ ذیل کے اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے۔

سوویت معیار زندگی 78-1965ء:

	1965ء	1978ء
ماہانہ اجرت	96.5 روبل	159.9 روبل
ڈاکٹروں کی تعداد	554000	929000
ٹی وی رکھنے والے خاندان	24 فیصد	82 فیصد
فریج رکھنے والے خاندان	11 فیصد	78 فیصد
فی کس رہائشی جگہ (شہروں میں)	10 مربع میٹر	12.7 مربع میٹر
گوشت کا فی کس استعمال	41 کلو	57 کلو
سبزیوں کا فی کس استعمال	72 کلو	90 کلو
آلوؤں کا فی کس استعمال	142 کلو	120 کلو
روٹی یا اناج کا فی کس استعمال	156 کلو	140 کلو

(گارڈین 17 اگست 1981ء اور ایف۔ ہالینڈے کی کتاب دوسری سرد جنگ کی تیاری کے صفحہ نمبر 139 سے لیے گئے اعداد وشمار)

تاہم 1970ء کی دہائی میں معیار زندگی کی ترقی کی شرح میں بتدریج کمی واقع ہوئی جیسا کہ ذیل کے اعداد وشمار ثابت کرتے ہیں۔

78-1966ء کے دوران کھپت میں اضافہ:

70-1966ء	5 فیصد
75-1971ء	2.9 فیصد
78-1976ء	2.1 فیصد

اسی دورانیے میں غذائی اشیا کی کھپت میں ہونے والا اضافہ کچھ ایسے تھا:

1966-70ء	4.2 فیصد
1971-75ء	1.7 فیصد
1976-78ء	0.6 فیصد

مارکس کا خیال تھا کہ سوشلزم کی سمت بڑھنے کا نقطہ آغاز معیار زندگی کی اعلیٰ سطح ہوگا۔ مردوزن کی مادی ضروریات کی مکمل تسکین کے بعد ہی ایک ایسی سطح تک پہنچنا ممکن ہوگا جہاں ایسی خواہشات وضروریات لوگوں کی زندگیوں اورافکار پر غالب نہ ہوں اور ایک معیاری لحاظ سے اعلیٰ سطح کی انسانی تہذیب کیلئے راہ ہموار ہوسکے۔ جب تک قلت اوراس کے باعث مادی اشیا کے حصول کی ذلت آمیز جدوجہد کا وجود باقی ہے، طبقاتی بربریت اوراس سے وابستہ برائیوں پر کبھی بھی قابونہیں پایا جاسکے گا۔ ایسی صورت میں غیرطبقاتی سماج کا تصورایک سراب ہی رہے گا اور جوں جوں ہم اس کی سمت بڑھیں گے وہ پرے ہٹتا جائے گا۔ اس سے سوویت سماج کی مختلف پرتوں میں بیوروکریٹوں کی منافقانہ تقاریر کے بارے میں پائے جانے والے شکوک وشبہات اور بے اعتباری کی وضاحت ہوتی ہے جوخودتو عیاشی کی زندگی گزارتے تھے لیکن عام سوویت شہری کمیاب اشیا کے حصول کیلئے لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے ہونے پر مجبور تھے۔

اس کے باوجود یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ماضی کے مقابلے میں سوویت آبادی کے معیار زندگی میں ڈرامائی تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ 1980ء کی دہائی کے وسط میں گارڈین اخبار میں شائع ہونیوالی ایک رپورٹ کے مطابق:

''اب تقریباً ہرگھر میں ٹی وی اورریفریجریٹر موجود ہے۔ ستر فیصد گھروں میں واشنگ مشین چالیس فیصد میں ویکیوم کلینز اورتقریباً پندرہ فیصد کے پاس کاریں موجود ہیں۔ کم وبیش نصف کے پاس موپڈ یا موٹر سائیکل موجود ہے۔'' (10)

علاوہ ازیں یہ اعدادوشمار پوری کہانی نہیں سناتے ہیں۔ معیارزندگی میں یہ اضافہ افراطِ زر کے بغیر حاصل کیا گیا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ بنیادی ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں کی سطح کوکم رکھا گیا تھا۔ روٹی اس قدرسستی تھی کہ کسان اپنے پالتو جانوروں کواناج کی بجائے روٹی کھلاتے تھے۔ کم کرائے خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ مغرب میں ایک مزدوراپنی اجرت کا ایک تہائی سے نصف تک کرائے کی مد میں ادا کرتا ہے جب کہ سوویت یونین میں صورت حال بالکل مختلف تھی۔ 200 روبل ماہانہ اجرت میں سے

صرف دس روبل کرائے پر خرچ ہوتے تھے جس میں گرم پانی، سنٹرل ہیٹنگ اور کم از کم ماسکو میں لوکل فون کال کی سہولت شامل تھی۔ تعلیم بالکل مفت تھی، علاج معالجہ مفت تھا، بے روزگاری نہیں تھی اور ٹریڈ یونینوں کے زیر انتظام چلائے جانے والے تفریحی مقامات پر چھٹیاں گزارنا بالکل مفت تھا۔ سوویت یونین کا پبلک ٹرانسپورٹ کا نظام غالباً دنیا بھر میں بہترین تھا جس میں کرائے نہایت کم تھے مثال کے طور پر ماسکو میں کسی بھی جگہ جانے کیلئے کرایہ پانچ کوپک تھا۔

تاہم ان سہولتوں کے باوجود بھی کم از کم انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مقابلے میں معیار زندگی کمتر رہا۔ رہائشی مکانات کی کمی شدید مسئلہ بنی رہی۔ آبادی کی اکثریت کے لئے رہائشی سہولتوں کی کمی تھی اور بعض صورتوں میں یہ ناقابل برداشت حد تک خراب تھی۔ ایک چوتھائی خاندانوں کا کچن یا غسل خانہ یا پھر دونوں مشترکہ تھے۔ مزدوروں کو اب ابتدائی دور کی محرومیوں کا سامنا نہیں تھا۔ کم از کم بنیادی ضروریات زندگی کی کوئی حقیقی قلت نہیں تھی۔ قطاریں ضرور لگتی تھیں لیکن بالآخر لوگوں کو وہ اشیا مل جاتی تھیں جن کا ان کو انتظار ہوتا تھا۔ ٹراٹسکی نے جنگ سے پہلے کہا تھا کہ معیار بیوروکریسی کے لیے ایک ہاتھ نہ آنے والا بھوت تھا۔ عام طور پر صارف کی بنیادی ضرورت کی اشیا کمتر معیار کی حامل ہوتی تھیں۔ جمہوری کنٹرول کے فقدان کا سب سے شدید اظہار اشیائے صرف کے شعبے میں نظر آتا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جو سماج ''سوشلزم'' تعمیر کر چکنے کا دعویدار ہو اس میں آبادی کی مادی خوشحالی کو خالصتاً روٹی اور آلوؤں کی یا گوشت اور مکھن کی کھپت کے حوالے سے نہیں پرکھا جا سکتا۔

معاشی ترقی اور معیار زندگی کے درمیان بڑا گہرا تعلق ہے۔ سب سے بڑھ کر بھاری اور ہلکی صنعت کے ساتھ ساتھ صنعت اور زراعت کے درمیان درست توازن ایک بنیادی سوال ہے۔ 1971ء میں ہلکی صنعت کی وزارت کو 7.6 ملین جوڑے جوتوں کے بارے میں شکایت موصول ہوئی، اس کے علاوہ ہوزری کے 1.5 ملین جوڑوں، 1.7 ملین سویٹروں اور 175,000 سوٹوں کے بارے میں شکایات موصول ہوئیں۔ 1971ء کے پہلے چھ ماہ میں صرف ماسکو میں پرچون فروشوں نے 33 ملین روبل قیمت کی صنعتی اشیا مسترد کر دیں۔ اسی سال مسترد شدہ صنعتی اشیا کے ضمن میں ہونے والا کل نقصان 600 ملین روبل تھا جب کہ ایک رسالے فنانس یو ایس ایس آر نے تبصرہ کیا تھا کہ ''ایسے نقصانات حقیقتاً اس سے بہت زیادہ'' ہیں۔ 1970ء اور 1971ء میں رشین سوویت ریپبلک کی وزارت تجارت کے انسپکٹریٹ نے جن صنعتی اشیا کی پڑتال کی ان میں سے 50 فیصد سرکاری طور پر مقرر کردہ کم از کم معیار پر پوری نہیں

اترتی تھیں۔اس کے نتیجے میں گوداموں میں موجود نا قابل فروخت اشیا کے ذخیرے میں ہر سال اضافہ ہوتا گیا۔ 1968ء سے 1971ء کے درمیان نہ بکنے والی فالتو اشیا فروخت کا 52-32 فیصد تھیں۔ 1972ء کے آغاز تک فالتو اشیا کی مالیت 3400 ملین روبل تک پہنچ گئی۔

یہاں ہمیں نوکر شاہانہ منصوبہ بندی کی بنیادی خامی دکھائی دیتی ہے۔مزدور طبقے کی عملی شرکت اور جمہوری کنٹرول کا فقدان ناگریز طور پر ضیاع کے بے قابو پھیلاؤ، بدعنوانی اور بدانتظامی کی طرف لے جاتا ہے۔یہ بات ہمیشہ درست تھی یہاں تک کہ سوویت یونین کے بہترین دور میں بھی، لیکن ایک ایسی پیچیدہ اور جدید معیشت کے حالات میں جب وہ مختلف اقسام کی دس لاکھ اشیا تیار کر رہی تھی اس نے ایک ڈراؤنے خواب کا روپ دھار لیا۔زیر مطالعہ دور میں سوویت پریس نوکر شاہانہ نااہلی کی ناقابل یقین مثالوں سے بھرا ہوتا تھا۔ذیل میں اس کی ایک مخصوص مثال دی جا رہی ہے:

''کپڑا جتنا مہنگا ہوگا ہدف پورا کرنے کے لیے اتنے ہی کم لباس بنانے پڑیں گے! ماڈل جس قدر سستا ہوگا ہدف پورا کرنے کے لیے اتنی ہی زیادہ کاریں بنانی پڑیں گی اور اس کے لیے اضافی پیداواری صلاحیت اور افرادی قوت درکار ہوگی۔ایک بار میرے انجینئر نے بلب جلتا چھوڑ دینے پر مجھے یوں شاباش دی 'بہت اچھے! ہم جتنی زیادہ توانائی خرچ کریں گے ہمیں اتنا ہی زیادہ بونس ملے گا!' منصوبہ بندی اور جانچ پڑتال کے لیے اگر کسی بھی مقداری پیمانے کو بنیاد بنایا جائے گا تو وہ ناگریز طور پر یک طرفہ ہوگا اور آخر کار نقصان دہ ثابت ہوگا۔اگر پیمانہ ٹنوں میں ہوگا تو پیداوار بھاری ہو جائے گی۔اگر پیمانہ روبل ہوگا تو پیداوار مہنگی ہو جائے گی۔ اگر صارف کی تسکین کو بنیاد بنایا جائے تو پیداوار کا حجم کبھی بھی پیمانہ نہیں ہوسکتا۔''(11)

مزدور طبقے کی شراکت اور جمہوری کنٹرول کی عدم موجودگی میں خالصتاً مقداری نقطہ نظر اپنانے سے نہایت مسخ شدہ اور بھیانک نتائج برآمد ہوئے:

''اگر ڈائریکٹر کی جان محض چند ڈیزائنوں کے جوتے بنا کر چھوٹ سکتی ہے تو وہ پیداوار کو لمبے عرصے تک جاری رکھ کر اخراجات کم کر سکتا ہے۔اگر وہ بڑے سائز کی بجائے چھوٹے سائز کے جوتوں پر توجہ دیتا ہے تو وہ چمڑے کی کھپت میں کمی لا سکتا ہے اور آخری بات یہ کہ اگرچہ جوتوں کی قیمت ریاست مقرر کرتی ہے لیکن مختلف اقسام کے جوتوں پر اسے مختلف منافع ملے گا۔ڈائریکٹر اسی قسم کے جوتوں میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر سکتا ہے جن پر اسے زیادہ منافع ملتا ہو۔''

''اس بات کا انحصار ڈائریکٹر کی بارگیننگ پوزیشن پر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک جا سکتا ہے۔ ماضی میں یہ پوزیشن درحقیقت بہت اچھی رہی ہے۔ ہمیشہ صارفین کی ضرورت سے کم پیدا کیا گیا ہے۔ اس طرح ہول سیل سے معاملہ کرنے میں آسانی رہی ہے کیونکہ وہ کوئی بھی چیز فروخت کر سکتے تھے اور پھر فروخت کنندہ کی منڈی میں پیداکاروں کی ناراضگی کیوں مول لی جائے؟ اس نظام کے نتائج کے بارے میں صرف آخری خریداری کرنے والا ہی تلخ شکایات کرتا تھا۔''(12)

ٹراٹسکی نے کہا تھا کہ معاشی ترقی کو محض حجم کے حوالے سے ناپنا ایسے ہی ہے کہ جیسے کسی شخص کی قوت کے ثبوت کے لیے محض چھاتی کی پیمائش کو بنیاد بنانے کی کوشش کی جائے۔ اہداف کے حصول کے لیے محض مقداری نقطہ نظر کو سامنے رکھنے کے نتیجے میں انتہائی بھاری اور بے ڈھب گاڑیاں بنیں تاکہ ٹنوں میں مقرر شدہ ہدف پورا کیا جا سکے۔ یا اتنے ہزار جوتے بنائے جائیں مگر سب کے سب بائیں پاؤں کے لیے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مزدور ایسی ''اغلاط'' کو بھانپ جائیں گے مگر تحریر و تقریر کی آزادی اور آزاد ٹریڈ یونینوں کی غیر موجودگی میں ان کی مذمت کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ زیادہ کھلی تنقید سے صرف برطرفی، قید اور پاگل خانے میں داخلے جیسے مسائل ہی پیدا ہو سکتے تھے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ سر نیچا اور منہ بند کر کے ہر مہینے کے آخر میں تنخواہ لے لی جائے اور امید رکھی جائے کہ معاملات بہتر ہو جائیں گے جیسا کہ بظاہر بعض صورتوں میں ہو بھی رہا تھا۔

1986ء کی پارٹی کانگریس میں گورباچوف نے سوویت یونین کی ہلکی صنعت کی پوزیشن اس طرح بیان کی:

''پچھلے سال لاکھوں میٹر کپڑا، لاکھوں جوڑے چمڑے کے جوتے کے اور دوسری بہت سی اشیائے صرف یا تو فیکٹریوں کو واپس کر دی گئیں یا انہیں گھٹیا درجے کی اشیا قرار دے دیا گیا۔ نقصانات کافی زیادہ تھے یعنی خام مال کا نقصان اور لاکھوں مزدوروں کی محنت کا ضیاع۔'' اس نے مزید کہا کہ ''آج بیوروکریسی ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ نوکر شاہی کی مسخ شدہ شکلوں کا اظہار وہاں زیادہ شدید ہوتا ہے جہاں لوگ اپنے کام کے لیے پوری طرح جواب دہ نہ ہوں۔''(13)

تمام تر عوامی کنٹرول سے آزاد ہونے کے باعث بیوروکریسی نے انتہائی غیر ذمہ دارانہ رویہ اپنا لیا۔ انہوں نے اسی قسم کی کوتاہ بینی اور سماج کے وسیع تر مفادات سے مجرمانہ غفلت کا رویہ اپنایا جیسا بڑی بڑی اجارہ داریوں کا ہے۔ ماحولیات کے سلسلے میں بھی وہ عام طور پر اتنے ہی برے تھے جتنے بورژوا۔ اس کا

ثبوت چرنوبل کا حادثہ، بحیرۂ یورال کی تباہی، بحیرۂ کیسپین اور جھیل بیکال کی زہر آلودگی اور آرکیٹک میں ایٹمی جہازوں کا ڈبویا جانا ہے۔

زبردست افراتفری اور انتشار کا سراغ ہمیں طرح طرح کی بے شمار وزارتوں کے پھیلاؤ سے ملتا ہے۔ صرف مشین ٹول بنانے کے شعبے میں ہمیں مختلف قسم کی گیارہ وزارتیں نظر آتی ہیں مثلاً عام مشین سازی کی وزارت اور بھاری مشین سازی کی وزارت وغیرہ۔ ٹرانسپورٹ کی پانچ وزارتیں تھیں۔ اس صورت حال سے پیدا ہونے والے مسائل کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر وسطی ایشیا میں قدرتی گیس دریافت ہوئی۔ لیکن اس کو کام میں لانے کے آغاز کیلئے 27 مختلف وزارتوں اور محکموں سے دستخط کروانے پڑے۔ اس عمل میں سات سال کا عرصہ لگا اور اس کے بعد گیس ختم ہو چکی تھی۔

معیار کا مسئلہ

سوویت اشیائے صرف کا معیار اتنا خراب نہیں تھا جتنا بورژوازی کے ذرائع ابلاغ آج کل ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہر حال اصولاً کوئی ایسی وجہ موجود نہیں تھی کہ ان اشیائے صرف کا معیار مغرب میں تیار کردہ اشیا سے زیادہ خراب ہوتا۔ جن شعبوں میں معیار پر مناسب توجہ دی جاتی تھی وہاں بہت اچھی اشیا تیار ہوتی تھیں۔ دفاعی صنعت میں یہی صورتحال تھی جہاں جنرل اچھے معیار پر اصرار کرتے تھے اور انہیں ملتا بھی تھا۔

خلائی پروگرام کے سلسلے میں بھی یہی صورتحال تھی۔ لیکن محض اتنا ہی نہیں۔ روزنامہ گارڈین نے اپنے 19 نومبر 1996ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع کیا جس میں روس سے مغرب کو برآمد کی جانے والی بعض برآمدات کی کامیابی کے بارے میں حیران کن اعداد و شمار کا انکشاف کیا گیا ہے:

''جب ہم ٹیکنالوجی میں روس کی شاندار کارکردگی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ تو ہمارا دھیان عام طور پر خلائی تحقیق اور بہت سی فوجی استعمال کی اشیا کے اعلیٰ معیار کی طرف ہی جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فوجی ہیلی کاپٹر اور نئی آبدوزوں کے بیرونی حصے میں استعمال ہونے والا ٹائیٹینیم کا خول اور ڈھانچہ مغرب کی دھات سازی کے مقابلے میں کافی بہتر خیال کیا جاتا ہے۔''

''لیکن بہر حال ہم خلائی اور دفاعی ساز و سامان کو سوویت یونین کی تیکنیکی صلاحیتوں سے الگ

کر کے دیکھتے ہیں۔ ہم اسے فوجی سپر پاور ہونے کے ساتھ منسلک کر سکتے ہیں اور اس یقین میں سکون و اطمینان تلاش کرتے ہیں کہ کمپیوٹروں، کاروں اور اشیائے صرف جیسی فیصلہ کن چیزوں میں مغرب کو عمومی برتری حاصل ہے۔''

''شاید ہمیں از سرِ نو غور کرنا چاہئے۔ پچھلے سال کے پہلے چھ مہینوں میں برطانیہ نے روس سے سنوکر کیپ نامی 30,000 ریفریجریٹر اور 32,000 ٹی وی پکچر ٹیوبیں درآمد کیں۔ بیلجیئم نے ٹی وی سیٹ اور الیکٹرک ریزر اور فرانس نے کافی گرائنڈر، بجلی کی استریاں اور ائر کنڈیشنر خریدے۔ ہالینڈ نے 60,000 کیمرے اور الیکٹرک ہیئر کلپ خریدے اور یہاں تک کہ جاپانیوں نے سوویت ٹی وی سیٹ خریدے۔ تیسری دنیا میں چائیکا سلائی مشین اور آربیٹا پنکھے رفتہ رفتہ روایتی جاپانی اور مغربی منڈیوں میں جگہ بنا رہے رہیں۔''

دراصل اس تصویر کی نوعیت متضاد تھی مثال کے طور پر سوویت لانگ پلے ریکارڈوں پر حقیقی ریکارڈ شدہ آواز بہت اچھی تھی اور اگر مغرب کے مقابلے میں بہتر نہیں تھی تو اس کی ہم پلہ ضرور تھی مگر اسے پرسنگ میں خراب کر دیا جاتا تھا۔ 28 نومبر 1995ء کے پراودا میں ایک روسی مبصر نے مغربی اشیا کے مقابلے میں سوویت یونین کی بعض اشیا کے دیرپا ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ مصنف نے بجا طور پر اس فرق کو ضروریات زندگی کی پیداوار کی بنیاد پر مبنی منصوبہ بند معیشت اور منافع کے حصول پر قائم منڈی کی معیشت کے تضاد سے منسلک کیا ہے۔ جس میں نمائش، اشتہار بازی اور ہر طرح کا ضیاع شامل ہوتا ہے۔

''ہماری معیشت جو مال تیار کر کے پیش کرتی تھی وہ سوویت سماج کے لیے بالکل مناسب تھا اور اصولاً مغربی منڈی یا صارف سماج کے لیے قطعاً نامناسب تھا۔ مثال کے طور پر ڈیزائن کی بجائے چیز کو دیرپا بنانے پر زیادہ کوشش صرف کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس منڈی کا مقصد اشیا کی عمر کو کم کرنا ہوتا ہے تاکہ لوگ اشیا اور خدمات کی کھپت پر مجبور رہیں۔''

وہ مزید لکھتا ہے:

''ایک ہی کلاس کی دو کاروں کو دیکھیں، ایک کو فضول خرچ معیشت اور دوسری کو کفایت شعار معیشت کیلئے تیار کیا گیا ہے۔ ژیگولی کار میں انجن کے ان تمام پرزوں کو جہاں عام طور پر گڑبڑ ہوتی ہے ایسی جگہوں پر لگایا گیا ہے کہ آپ آٹو شاپ کی مدد کے بغیر ان تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ آپ بغیر کسی مکینک کی مدد کے اسے استعمال کر سکتے ہیں اور مسائل خود حل کر سکتے ہیں۔ سٹریون میں، جو اسی کلاس کی

فرانسیسی کار ہے، یہی پرزے اس طرح لگائے گئے ہیں کہ ان تک رسائی نہیں ہوسکتی۔ ہر چھوٹی موٹی خرابی دور کرنے کی خدمات کے عوض آپ کو پیسے ادا کرنا پڑتے ہیں۔ اگر آپ کو بریکر جوڑ تبدیل کرنا ہیں تو 80 ڈالر لگتے ہیں، اگر جنریٹر برش گھس گیا ہے تو نئے جنریٹر کے لیے 300 ڈالر ادا کریں اور اگر پمپ بیلٹ تبدیل کرنے کی ضرورت پڑے تو انجن نکالنا پڑے گا۔

''جیسا کہ سب کو معلوم ہے، مغرب میں اشیائے صرف کی پیداوار میں محنت اور لاگت کا نصف تو اس کی پیکنگ (جو ڈیزائن کا ایک حصہ ہے) میں لگ جاتا ہے۔ روس میں منڈی سے مقابلے کی اہلیت رکھنے والی صنعتوں کے قیام کا کیا مطلب ہے؟ اس کا مطلب ہے اجنبیوں اور ایک مختلف طرز زندگی رکھنے والے لوگوں کے لئے پیداوار دینا جو خود بذات خود ایک لغو بات ہے (یا اس کا مطلب روس کو شعوری طور پر ایک نو آبادی بنانا ہے) اس میں کوئی شک نہیں کہ 90 فیصد روسی آبادی پیکنگ کی وجہ سے ایک مقابلتاً بہتر چیز دگنے داموں خریدنے کی بجائے چینی خریدنے کیلئے اپنے تھیلے اور کھلا تیل خریدنے کے لیے اپنی بوتلیں لانا پسند کریں گے۔''

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ معیار کی عمومی سطح مغربی پیمانوں کے لحاظ سے بہت کمتر تھی۔ کلر ٹی وی اپنے استعمال کے پہلے سال میں اوسطاً دو بار مرمت کے لیے لے جانا پڑتے تھے۔ وہ دھماکے سے پھٹ بھی جاتے تھے۔ کسی وجہ سے جوتے خصوصاً خراب کوالٹی کے تھے۔ مراعات یافتہ افسران کی رسائی خصوصی دکانوں تک تھی اس لیے ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا عام مزدور طبقے کے لیے تیار ہونے والی اشیا کے معیار کی انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی جب کہ فیکٹریوں کے منتظمین کو صرف منصوبے میں مقرر کیے گئے اہداف کو حجم کے حوالے سے پورا کرنے سے دلچسپی تھی۔ اگر اس کے لیے معیار میں گراوٹ آتی ہے تو پھر کیا ہوا؟

دیگر حوالوں سے حالات زندگی میں بہتری کی بہت گنجائش موجود تھی۔ ماسکو میں بھی اچھے باروں، قہوہ خانوں اور ریستورانوں جیسی تفریحی جگہوں کی قلت تھی۔ ان کے لئے قطاریں لگانا پڑتی تھیں اور درحقیقت ان کی وجہ سے شراب نوشی کا مسئلہ زیادہ سنگین ہوگیا تھا۔ لوگ گلیوں میں شراب پیتے نظر آتے تھے۔ دور دراز کے علاقوں میں صورت حال اس سے بھی بدتر تھی۔ سائبیریا کے دو لاکھ آبادی کے شہر نیز نی یوٹووسک میں 1980ء کی دہائی میں ایک بھی سینما گھر موجود نہیں تھا۔ شہروں کی منصوبہ بندی کرنے والے عام لوگوں کی تفریحی ضروریات کو پورا کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اہل کاروں کو اس قسم کے مسائل درپیش نہیں تھے۔

سوویت یونین کی صورت حال کو عالمی پیمانے پر موجود صورت حال سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ایک ملک میں سوشلزم کے رجعتی تصور کا ناکام ہونا یقینی امر تھا۔ سوویت عوام کو باقی دنیا سے الگ تھلگ رکھنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود انہیں ناگزیر طور پر مغرب میں زندگی کی سطح کے بارے میں علم ہوجاتا اور وہ اس سے اپنا موازنہ کرتے۔ لینن نے اسی کے بارے میں تنبیہہ کی تھی جب اس نے کہا تھا کہ سوویت یونین کے مستقبل کا تعین بالآخر عالمی پیمانے پر ہوگا۔ جوں جوں لوگوں کو علم ہوتا کہ مغربی صارفین کو کم قیمت پر بہتر کوالٹی کی اشیا دستیاب ہیں توں توں ان کی بے چینی میں اضافہ ہوتا۔ یہ فرق اس حقیقت سے ظاہر ہوتا تھا کہ مغربی کرنسی تک رسائی رکھنے والے لوگ قطاروں میں کھڑے ہوئے بغیر نام نہاد سفارتی دکانوں سے اعلیٰ مغربی اشیا حاصل کر سکتے تھے۔

درحقیقت سرکاری اعداد وشمار معیار زندگی کے سلسلے میں جتنا بتاتے ہیں اتنا ہی چھپاتے بھی ہیں۔ یہ ہمیں آبادی کی مختلف پرتوں کو ملنے والی اجرتوں کی مختلف سطحوں کے بارے میں کچھ نہیں بتاتے۔ سوویت اعداد وشمار میں اس سوال سے ہمیشہ احتراز کیا جاتا تھا۔ اوسط کا عام حوالے سے استعمال گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ اس سے ہمیں ان دو کسانوں کی کہانی یاد آتی ہے جن میں ایک کے پاس نو گائیں تھیں اور دوسرے کے پاس ایک۔ ''اوسطاً'' ان دونوں کے پاس پانچ گائیں تھیں! ایک صحت مند مزدور ریاست کی طرح اجرتوں اور مراعات میں تفریق کو بتدریج کم کرنے کی بجائے سوویت معیشت کی ترقی نے عملاً اس سے متضاد عمل کیا۔

خروشیف اور برژنیف کے تحت یہ خلیج کم ہونے کی بجائے بتدریج وسیع ہوتی رہی۔ اس میں شک نہیں کہ عوام کا معیار زندگی بہتر ہوا لیکن بیوروکریسی کی آمدنی اور مراعات (قانونی اور غیر قانونی) میں اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اضافہ ہوا۔ اعلیٰ ترین حکمران شخصیات کے حوالے سے یہ بات اور بھی زیادہ درست تھی۔ برژنیف مہنگی کاروں کے شوق اور اپنے عیاشیانہ طرز زندگی کے لیے مشہور تھا۔ نکسن کے بارے میں ہم فرض کر سکتے ہیں کہ وہ خاصی خوشحال زندگی گزارتا تھا لیکن ماسکو کے دورے کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ وہ برژنیف کا طمطراق اور عیاشانہ طرز زندگی دیکھ کر بہت حیران ہوا جس کے گھر کے تہہ خانے میں نہانے کا تالاب موجود تھا۔

وڈوڈ اور برنسٹائن نے نکسن کے اقتدار سے محروم ہونے کے بارے میں لکھی جانے والی اپنی کتاب ''آخری ایام'' میں برژنیف اور اعلیٰ بیوروکریٹوں کے طرز زندگی کی ایک چھوٹی سی جھلک پیش کی ہے:

''صدر (نکسن) کی طرف سے برژنیف کو معمول کے مطابق سیکرٹری صاحب کے وسیع ذخیرے میں شمولیت کیلئے ایک امریکی کار کا تحفہ دیا جارہا تھا۔ 1972ء اور 1973ء کی پہلی دو سربراہ ملاقاتوں میں دس دس ہزار ڈالر قیمت کی دو کاریں دی گئیں تھیں جن میں ایک کیڈلک لیموزین اور دوسری لنکن کانٹینینٹل تھی۔ اس بار 5578 ڈالر کی شیورلٹ مونٹے کارلو کار دی جارہی تھی جو ایک ایسے گیراج کے شایان شان نہیں تھی جس میں پہلے پی سٹرون، ماسیراتی، رولزرائس، مرسیڈیز سیڈان اور برژنیف کی پسندیدہ نئی مرسیڈیز 300 ایس ایل جیسی کاریں موجود تھیں۔ لیکن برژنیف کو موٹر ٹرنڈ نامی رسالے سے معلوم ہو چکا تھا کہ مونتے کارلو کو سال کی بہترین کار قرار دیا گیا ہے اور اس نے جتلا دیا تھا کہ وہ یہی کار لینا پسند کرے گا۔''

چیکوسلوواکیہ کا ایک اعلیٰ سفارتکار جان سیجنا جو بھاگ کر مغرب میں چلا گیا تھا اپنی یادداشتوں ''ہم تمہیں دفن کر دیں گے'' میں لکھتا ہے ''برژنیف واڈکا اور پلسنر بیئر کا بہت شوقین ہے اور ہم اسے یہ چیزیں براہ راست ماسکو بھیجا کرتے تھے۔ اسے مغربی لباس بھی بہت پسند ہیں۔ جب بھی وہ پراگ آتا تو ہماری پولٹ بیورو شاپ (جہاں سے حکمران ٹولے کے افراد اپنی عیاشی کیلئے ایسی اشیا کی خریداری کر سکتے تھے جو عام لوگوں کو دستیاب نہیں تھیں) کے ڈائریکٹر کو اٹلی اور مغربی جرمنی جا کر اس کی آمد سے پہلے خصوصی سٹاک کے حصول کا اہتمام کرنا پڑتا تھا۔'' مشرقی یورپ کے بیوروکریٹ حکمرانوں کے سلسلے میں بھی یہ بات درست تھی۔ اپنے پیش رو الیکسی سیپکا کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے سیجنا لکھتا ہے ''وہ ذاتی طور پر لاکھوں ڈالرز کا مالک تھا جن کا اس نے کبھی حساب کتاب نہیں دیا اور وہ ان کے ذریعے اپنے لیے اور اپنے دوستوں کے لیے بنگلے، کاریں اور زیورات خریدتا تھا۔ مثال کے طور پر اس کی بیوی کے پاس سترہ فرکوٹ تھے۔''

سوویت پریس بدعنوانی اور معاشی جرائم کی مثالوں سے بھرا ہوتا تھا۔ مگر یہ حقیقی صورت حال کا معمولی سا نمونہ ہوتا تھا۔ بہت بڑی بڑی تنخواہوں کے علاوہ پارٹی اور ریاست کے اہل کار ہر سطح پر عوامی وسائل کی لوٹ مار میں مصروف تھے۔ 1974ء میں وزیر ثقافت مسز فاریٹسوا کو ریاستی فنڈز کی خرد برد کے الزام میں برطرف کر دیا گیا تھا۔ فنانسی یو ایس ایس آر کے مطابق جولائی 1976ء میں تین سو اداروں میں تحقیقات کی گئیں۔ اس میں انکشاف کیا گیا کہ بیلان میں ''شہر کے ڈیپارٹمنٹل سٹور میں چھپے ہوئے چوروں کے ٹولے نے جن کی سربراہی سابقہ منیجر کر رہا تھا'' 116,500 روبل اڑا لیے۔ تماسک میں

463,000 روبل کی ہیرا پھیری کی گئی۔ جارجیا میں ''قیادت کے اندر موجود چوروں'' کو بے نقاب کیا گیا۔ جب پولیس نے ایک سرکاری اہل کار کے گھر پر چھاپہ مارا تو ''انہیں معلوم ہوا کہ اس کی جائیداد میں 12 کاریں، 47 ٹیپ ریکارڈ اور ٹی وی کے علاوہ تین ہزار شراب کی بوتلیں بھی شامل ہیں۔ اس کے پاس تین والگا کاریں، 23 ڈنر سیٹ، 74 سوٹ اور جوتوں کے 149 جوڑے موجود تھے۔ ماسکو ریڈیو کی رپورٹ کے مطابق اس نے برے وقت کے لیے بھی کچھ چیزیں چھپا کر رکھی تھیں جن میں 753,000 روبل نقد، 18,300 روبل مالیت کے بانڈ اور سونے کی 39 گھڑیاں بھی شامل تھیں۔''

اس مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے ''فشریز کے ڈپٹی وزیر کو مچھلی کے اچار (کیویئر) کے ڈبوں پر نمک لگی مچھلی کا لیبل لگا کر سوویت یونین سے برآمد کرنے کے فراڈ میں ملوث ہونے کے الزام کے تحت گولی ماردی گئی۔ اس نے دارالخلافے کی بہترین دکانوں کے سوا نتظامی اہل کاروں کے خلاف تیس لاکھ روبل مالیت کی اشیا چوری کرنے کے تیس سے زیادہ کیس نمٹانے تھے۔ اس نے بتایا کہ اہل کار دس لاکھ کی رشوت لے کے اس میں سے تین چوتھائی رقم رشوت کے طور پر آگے دے دیتے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ 193 میں سے 156 خریداریوں میں ان کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ اس کے بعد منافع منظّم انداز میں اوپر سے لے کر نیچے تک بانٹ لیا جاتا تھا۔''(14)

برژنیف کی اولاد اور حکمران ٹولے کا طرز زندگی عام طور پر ایسا ہی تھا۔ 1980ء میں ''سوچی کیویئر'' سیکنڈل میں 300 اہل کاروں کی گرفتاری کے بعد بدعنوانی میں ملوث ہونے کے شبہے میں برژنیف کے خاندان کے خلاف بھی تفتیش کی گئی۔ سوویت مزدوروں کی پیدا کردہ دولت کا بڑا حصہ اس طرح سے ضائع ہو رہا تھا۔ ٹیکسٹائل کے شعبے سے وابستہ ایک بیوروکریٹ نے حیران کن طور پر سات ملین پاؤنڈ کی رقم جمع کر رکھی تھی، اگرچہ ابھرتی ہوئی بورژوازی نے ریاست سے جو اربوں کی رقم لوٹی ہے اس کے مقابلے میں یہ رقم کچھ بھی نہیں۔ بیوروکریسی کی طفیلیت منصوبہ بند معیشت کی جڑوں کو ہی کھوکھلا کر رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ بیوروکریسی اور عوام کے درمیان خلیج مزید وسیع ہوتی جا رہی تھی۔ حکمران ٹولے کی تمام نفسیات ہی تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کے نتائج اگلے مرحلے میں نظر آنے شروع ہو گئے۔

برژنیف کے تحت ریاست کی صورت حال

برژنیف نے بھی 1978ء میں سوویت یونین کا نیا آئین متعارف کرواتے وقت سٹالن کی طرح اس بات کو مسترد کر دیا کہ سوویت ریاست میں رفتہ رفتہ مٹنے کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔اس کے برعکس اس کا اصرار تھا کہ ''ہماری ریاست بتدریج کمیونسٹ خود اختیاری میں تبدیل ہو رہی ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہ ایک طویل عمل ہے۔لیکن یہ بتدریج آگے بڑھ رہا ہے۔ہمیں یقین ہے کہ نیا سوویت آئین کمیونسٹ تعمیر کے اس اہم مقصد کے حصول میں موثر طور پر مدد کرے گا۔'' لیکن اس ساری خطابت کے پیچھے کمیونزم کی طرف رواں دواں ریاست نہیں بلکہ زندگی کی تمام جہتوں پر حاوی ایک بہت بڑی نوکر شاہانہ مشینری موجود تھی۔''رفتہ رفتہ مٹنے'' کی بجائے یہ اور زیادہ طاقتور اور بدوضع ہوتی جا رہی تھی۔ یہ ''پرولتاریہ کی ڈکٹیٹرشپ'' نہیں بلکہ پرولتاریہ پر ایک وسیع اور جابر نوکر شاہانہ مشینری کی ڈکٹیٹرشپ تھی۔

لینن کا خیال یہ تھا کہ سماج کی پیداواری صلاحیت بڑھنے اور عوام کے معیار زندگی اور ثقافتی سطح کے بلند ہونے کے بعد ریاست اور سماج کو چلانے کا کام مزدور طبقے کے افراد باری باری سرانجام دیں گے۔ اس طرح بذات خود ریاست سماج میں زیادہ جذب ہوتی چلی جائے گی۔اس کی بجائے برژنیف کے تحت مطلق العنان عفریت کی شکل میں موجود ریاست پہلے سے زیادہ جابر، بدعنوان اور عوام کی اکثریت سے دور ہوتی چلی گئی۔

اس حقیقت کی وضاحت ''سامراجی گھیراؤ'' یا ''پرانے نظام کی باقیات'' کے وجود کے ذریعے نہیں کی جا سکتی جیسا کہ سٹالن ازم کے معذرت خواہ عام طور پر بہانہ سازی کرتے ہیں۔لینن اور ٹراٹسکی کے تحت ایک کمزور، جنگ زدہ اور 21 فوجوں کے حملے کی شکار ریاست نے ایک ایماندارانہ جمہوری نظام کو قائم رکھا تھا جو مزدور طبقے کے تمام حقوق کو تحفظ دیتا تھا۔ 1960ء کی دہائی کے اواخر تک سوویت یونین روئے زمین کا دوسرا طاقت ور ترین ملک بن چکا تھا جس کے پاس جدید صنعت کے علاوہ ایک زبردست فوج بھی موجود تھی۔اس کے باوجود نظام جمہوری حقوق کے حوالے سے معمولی سی رعایت دینے سے بھی قاصر تھا۔اس کی وجہ بیرونی خطرات نہیں تھے بلکہ بیوروکریسی خود اپنے عوام کے ساتھ محو جنگ تھی۔

جہاں تک دوسرے بہانے کا تعلق ہے تو کون سی ''باقیات'' کی بات ہو رہی ہے؟ اکتوبر انقلاب کے نصف صدی بعد ''سرمایہ دارانہ باقیات'' کے خطرے کے بارے میں گفتگو بالکل کھلی بکواس تھی۔ وہ مدت ہوئی غائب ہو چکے تھے اور ان میں سے زیادہ تر بذات خود نوکر شاہی کی مشینری کا حصہ بن چکے تھے۔ پرانی زار شاہی ریاست کے وارث موثر طور پر روس پر غالب تھے۔ بعد کے تجربات سے ثابت ہوا کہ

اکتوبر انقلاب کی فتوحات کو اصل خطرہ ان کی جانب سے نہیں بلکہ اس حریص اور ندیدے ٹولے کی جانب سے درپیش تھا جس نے اپنی نا اہلی، ہیرا پھیری اور چوری سے منصوبہ بند معیشت کی جڑیں کھوکھلی کی تھیں اور جس کا ایک حصہ خود کو جابر مافیا سرمایہ داروں کے نئے طبقے میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لینن اور ٹراٹسکی کے تحت ریاست اور معیشت کی انتہا درجے پسماندگی، سامراجی مداخلت اور سرمایہ دارانہ ردانقلاب کے خطرے کے باعث طبقاتی دشمنوں کے خلاف کسی حد تک جبر ضروری ہو گیا تھا۔ مزدور ریاست کی انتہا درجے کی کمزوری کی وجہ سے بعض اوقات جدوجہد بہت تلخ شکلیں اختیار کر لیتی تھی۔ آج کل بالشوازم کو بدنام کرنے کی مہم کے جزو کے طور پر بے ضمیر قسم کے مصنف اس جبر کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور اسے سٹالن کی تطہیرات کے دوران ڈھائے جانے والے خوفناک مظالم کے ساتھ منسلک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان حالات میں بھی مزدور جمہوریت کو بے مثال فروغ حاصل ہوا جس کی تباہی سٹالن کی لیفٹ اپوزیشن کے خلاف لڑائی کے دوران واقع ہوئی جو لینن کے جمہوریت اور بین الاقوامت پر مبنی تصورات کے دفاع میں ڈٹی ہوئی تھی۔

اکتوبر انقلاب کے فوراً بعد کے دور میں مزدور طبقے کو جو آزادی اور جمہوریت حاصل تھی اس کی جگہ انتخاب میں دھاندلی کے نظام نے لی جس میں سب کچھ پہلے ہی سے اوپر سے یعنی مراعات یافتہ حکمران ٹولے کی طرف سے طے ہوتا تھا۔ لینن کے تصور کے مطابق مزدوروں کے اقتدار کے آغاز ہی سے ریاست رفتہ رفتہ مٹنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کی بجائے ہمیں ریاستی مشینری کا زبردست فروغ دیکھنے کو ملا۔ اس کی مادی بنیاد موجود تھی۔ نئے ''زار'' بڑی شدت سے اپنی لوٹ کے مال اور بے جا مراعات کا دفاع کرتے تھے۔ وہ ''کمیونزم کی تعمیر'' اور ''نئے سوویت انسان'' کے بارے میں بھی گفتگو کرتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے انحراف اور اظہار کی آزادی کو دباتے بھی تھے۔

ریاستی جبر و تشدد نے نئی اور نفیس تر (اگرچہ یہ کم بے رحمانہ نہیں تھیں) شکلیں اختیار کر لیں۔ برژنیف کے دور میں جرائم کے خلاف ضابطے کو جو پہلے ہی کافی ظالمانہ تھا انحراف کا مقابلہ کرنے کیلئے مزید سخت بنا دیا گیا۔ دفعات نمبر 1-193 اور 3-193 کے اضافے سے استبداد کے امکانات بہت زیادہ بڑھ گئے۔ گرفتاری کیلئے سوویت حکومت کو تباہ کرنے کی نیت کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ مظاہروں (اگرچہ ضابطوں میں یہ لفظ استعمال نہیں کیا گیا تھا) اور ریاست میں انتشار پھیلانے کی غرض سے کسی بھی قسم کے مواد کی تقسیم کے جرائم کیلئے بالترتیب تین سال کی قید اور تین سال کے لیے مشقتی کیمپ میں نظر بندی کی سزا

تجویز کی گئی تھی۔

اس اقدام کے خلاف دوسروں کے علاوہ مشہور سوویت موسیقار دیمتری شوستا کووچ اور پرانے بالشویکوں کے ایک گروہ نے بھی احتجاج کیا۔لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔احتجاج بے سود رہا اور دسمبر 1966ء میں سپریم سوویت نے اس قانون کی توثیق کردی۔جنوری 1967ء تک منحرف مصنفین کے خلاف گرفتاریوں کا سلسلہ عمل میں آچکا تھا جن کے خلاف جھوٹے مقدمات چلے اور انہیں جبری مشقت کے کیمپوں میں بھیج دیا گیا۔ایسے مقدمات کے خلاف احتجاج کرنے والوں کو ان کی ملازمتوں سے برطرف کر دیا گیا اور ہراساں کیا گیا۔جامعات کے اساتذہ کو ان کی ڈگریوں اور اعزازات سے محروم کر دیا گیا۔

کسی بھی قسم کی آزاد سوچ کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔مصنفین کو حکمرانوں کی اجازت کے بغیر کوئی بھی چیز شائع کرنے کی اجازت نہیں تھی۔اس قسم کی کسی بھی کوشش پر طویل المعیاد قید اور جبری مشقت (بالترتیب سات سال اور پانچ سال) کی سزائیں دی جاتی تھیں۔ انا طولی مارچنکو کی ''Testimony''میں ان کیمپوں کی جو ہولناک تصویر کشی کی گئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ کچھ حوالوں سے ان کیمپوں کے حالات سٹالن کے دور کی نسبت بہتر ہوئے تھے لیکن بعض حوالوں سے صورت حال اس سے بھی بدتر تھی۔علاوہ ازیں اکثر اوقات جیل پہنچنے کے بعد قیدیوں کو پتہ چلتا تھا کہ ان کی قید کی مدت میں چند سالوں کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور اس مدت کے اختتام پر انہیں بتایا جاتا تھا کہ ان کے خلاف سات یا دس سال کی سزا مزید ہو جائے گی۔اس طرح درحقیقت قیدیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا اور ان کے زندہ باہر آنے کے امکانات ختم ہو جاتے۔

تاہم سیاسی قیدیوں کو دماغی امراض کے ہسپتالوں میں محبوس رکھنے کی مکروہ حرکت اس سے بھی کہیں زیادہ بدتر تھی۔مغرب میں کی جانے والی تنقید سے بچنے کی کوشش میں انہوں نے منحرفین کو دماغی امراض کے ہسپتالوں میں داخل کرنا شروع کر دیا۔دیگر افادیتوں سے قطع نظر اس میں ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ملزمان پر مقدمہ نہیں چلانا پڑتا تھا۔محض دو ڈاکٹروں کے دستخطوں کی بنیاد پر بالکل صحیح الدماغ لوگوں کو نظر بند کر دیا جاتا تھا۔ظاہر ہے کہ ''سوشلسٹ جنت'' کے بارے میں شکایت کرنے والا شخص پاگل ہی ہوسکتا تھا! دوسروں کے علاوہ جنرل پیٹرو گریگورینکو اور ژورس میڈیڈویف بھی اسی غیر انسانی سلوک کا نشانہ بنے جس سے دنیا بھر میں سوشلزم کا نام بدنام ہوا۔سٹالن کے دور میں بھی ایسا ہوتا تھا لیکن برژنیف کے دور میں اسے

مزید ترویج دے کر راسخ کیا گیا اور وسعت دی گئی۔ ایسی خوفناک جگہوں میں کئی سال گزارنے والے گریگوریئنکو نے لکھا ہے کہ:

''سمولنسک صوبے میں ساچیوفکا کے مقام پر ایک نیا نفسیاتی امراض کا ہسپتال کھولا گیا تھا۔ پھر چر نیا خوفسک میں ایک اور کھولا گیا۔ کام بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ 1960ء کی دہائی کے آخر اور 1970ء کی دہائی میں خصوصی نفسیاتی ہسپتال اتنی تیزی سے بنے جیسے بارش کے بعد کھمبیاں اُگتی ہیں۔ میرے علم میں دس سے زیادہ جگہیں ہیں، کازان، لینن گراڈ، سائچوفکا، ڈیپروفسک، سورولوفسک، الماتا، اوریال اور ان کے علاوہ پولتاوا کیف علاقے میں تعمیر کیا جانے والا ایک خصوصی نفسیاتی امراض کا سینی ٹوریم۔ علاوہ ازیں تمام صوبائی نفسیاتی ہسپتالوں میں جبری علاج کے شعبے بنائے گئے تھے۔ اس طرح ذہنی طور پر متوازی سیاسی قیدیوں کو شدید بیماریوں کے درمیان کھپانے کے وسیع مواقع پیدا کیے گئے تھے۔''(15)

اور وہ ان جہنمی جگہوں کی خوفناک جھلک دکھاتا ہے، ''ہمارے جبری علاج کے نظام کا ہولناک پہلو یہ ہے۔ پاگلوں میں محبوس ایک صحت مند شخص جانتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اردگرد موجود اذیت کا شکار لوگوں جیسا بن سکتا ہے۔ یہ چیز بے خوابی کے شکار حساس طبیعت لوگوں کیلئے اور بھی زیادہ خوفناک ہوتی ہے جو خود کو ہسپتالوں کی آوازوں سے محفوظ رکھنے کے قابل نہیں ہوتے۔''

''نفسیاتی امراض کا خصوصی ہسپتال عورتوں کی سابقہ جیل کی عمارت میں ہے جو سیاسی قیدیوں کے لیے لینن گراڈ کی سب سے بڑی اور بدنام جیل کریستی کے پہلو میں واقع ہے۔ عام قید خانوں کی طرح یہاں بھی صرف کوٹھڑیوں کی چھتوں پر معمول کی پارٹیشن ہے۔ عمارت کا اندرونی حصہ خالی ہے۔ پہلی منزل کی راہداری سے آپ پانچویں منزل کی چھت پر موجود شیشے کی چھت کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کنواں نما جگہ میں اوپر نیچے سفر کرتی ہوئی آوازوں میں شدت اور گونج پیدا ہوتی ہے۔ سٹالن کے دور میں اس حقیقت کو نفسیاتی ایذا رسانی کیلئے استعمال کیا جاتا تھا۔''

''خوش قسمتی سے میں اس قابل تھا کہ ہسپتال میں رونما ہونے والی زیادہ تر باتوں کو نظر انداز کر سکوں۔ میری چھت پر کوئی شخص کئی کئی دن تک ناچتا رہتا تھا اور صرف اسی وقت خاموشی چھاتی تھی جب وہ تھکن کے مارے بے ہوش ہو جاتا تھا لیکن میں اس کا عادی ہو گیا اور اسے نظر انداز کر دیتا تھا۔ لیکن ایک بات جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا اور جو مجھے کبھی کبھی راتوں کو نیند سے جگا دیتی تھی وہ رات کے وقت سنائی

دینے والی وحشیانہ چیخ تھی جس میں شیشہ ٹوٹنے کی آواز بھی شامل تھی۔ میں صرف تصور ہی کرسکتا ہوں کہ کسی ایسے شخص کو اس سے کس قدر اذیت ہوتی ہوگی جس کا اعصابی نظام اردگرد کی ہر چیز سے متاثر ہوتا ہو۔''

'' خصوصی نفسیاتی ہسپتال کے مریض کو ایک قیدی جیسے لولے لنگڑے حقوق بھی حاصل نہیں ہوتے۔ اسے کوئی حقوق حاصل نہیں۔ ڈاکٹر اس کے ساتھ جو جی چاہے کرسکتا ہے اور کوئی بھی شخص نہ تو مداخلت کرے گا اور نہ ہی اس کا دفاع کرے گا۔ اس کی شکایات ہسپتال سے باہر نہیں جاسکتیں۔ اس کے لیے امید کی صرف ایک کرن موجود ہوتی ہے اور وہ ہے ڈاکٹروں کی ایمانداری۔''(16)

کچھ ڈاکٹر واقعی ایمان دار تھے اور مریضوں کو بدترین قسم کے سلوک سے بچانے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن چونکہ سارا نظام کے جی بی (خفیہ پولیس) کے کنٹرول میں تھا اور بدنام زمانہ پروفیسر لنٹس جیسے چیف ڈاکٹر کے جی بی کے حاضر ڈیوٹی افسران تھے اس لیے ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ نظام کا مجموعی تصور ہی یہ تھا کہ قیدی کو تمام حقوق سے محروم رکھا جائے۔ ''وہ کلی طور پر ان ہسپتالوں کے عملے کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔''(17)

یہ تمام ہولناک مظالم ایک ایسے وقت میں ہو رہے تھے جب سوویت یونین کی حکومت بدستور ''کمیونزم کی تعمیر'' کے دعوے کر رہی تھی یعنی انسانی تہذیب کی اعلیٰ ترین شکل کی تعمیر، ایک ایسا سماج جس میں ریاست کا وجود مٹ چکا ہو اور جبر کی جگہ سماج کے ارکان کے درمیان آزادانہ اور رضا کارانہ باہمی تعاون لے چکا ہو۔ کمیونسٹ پارٹیوں کی قیادت آج ہاتھ مل مل کر اور منمناتے ہوئے ان ہولناکیوں کے خلاف احتجاج کرتی ہے جن کے بارے میں بظاہر ان کے علاوہ ہر کسی کو علم تھا۔ لیکن کہیں بھی وہ اس بات کی وضاحت کرتے نظر نہیں آتے کہ ''حقیقی سوشلزم'' کے تحت اس طرح کے ہولناک مظالم کس طرح واقع ہوسکتے تھے۔ لہٰذا ان تمام چیزوں کی پردہ پوشی کرتے ہوئے انہیں محض چند افراد کے آمرانہ افعال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے ان باتوں کو حادثات کا درجہ حاصل ہوجاتا ہے (اور یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی وضاحت نہیں کی جاسکتی) اور اس کا مطلب ہے کہ اس قسم کی چیز کسی بھی سماج میں واقع ہوسکتی ہے جس میں سوشلسٹ سماج بھی شامل ہے۔ سوشلزم کے لیے کیسی زبردست اشتہار بازی ہے! درحقیقت ایک مارکسسٹ اس کی وضاحت نہایت آسانی سے یوں کرسکتا ہے کہ اس کے ذریعے مراعات یافتہ حکمران ٹولے نے سماج کی اکثریت کے خلاف اپنے اقتدار اور دولت کا تحفظ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار اس سچائی کو گرفت میں لے لیا جائے تو یہ کوئی عجیب یا حادثاتی امر نہیں رہتا۔ اس سے محض ایک ایسا رویہ

جنم لیتا ہے جو تاریخ کے کسی بھی ایسے سنجیدہ طالب علم کے لیے عام فہم ہے جو جانتا ہے کہ اینگلز کے بقول کسی بھی سماج میں جہاں فنون لطیفہ، وسائل اور حکومت پر کسی اقلیت کی اجارہ داری ہو وہاں یہ اقلیت اپنے مفاد میں اس حیثیت کا صحیح اور غلط استعمال کرے گی۔

سرمایہ دارانہ نظام کے لیے سرمایہ دار ضروری ہیں۔ وہ ''ذرائع پیداوار کے مخزن'' ہوتے ہیں۔ سرمایہ داری نظام سرمایہ کاری کے لیے درکار فنڈ کے واحد سرچشمے یعنی نجی منافع کے بغیر کام نہیں کر سکتا۔ لہٰذا قدر زائد کی ہوس اس نظام کی قوت متحرکہ ہے۔ مزدور اس کو معمول کی چیز تصور کرتے ہیں۔ مزدور اپنی محنت سے پیدا ہونے والی قدر زائد کے زیادہ بڑے حصے کا تقاضا تو کر سکتا ہے لیکن اسے یہ تقاضا کرنے کا خیال کبھی نہیں آتا کہ مالکان کو منافع بالکل نہیں ملنا چاہئے۔ لیکن بیوروکریسی کی مادی دولت کہاں سے آتی تھی؟ معاشی نقطہ نظر سے وہ محض اتنے ہی کے مستحق تھے جسے مارکس نگرانی کرنے کی اجرت کہتا تھا۔ اس سے زیادہ وہ جو کچھ بھی حاصل کرتے تھے وہ پیداواری معاونین کے طور پر نہیں بلکہ چوروں، طفیلیوں اور بدمعاشوں کے طور پر کرتے تھے۔

اس لیے انتہائی بنیادی نوعیت کے جمہوری حقوق بھی انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے تھے کیونکہ سب سے پہلے اٹھایا جانے والا نکتہ مراعات میں کٹوتیوں کے سلسلے میں ہوتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی نقطہ نظر سے یہ بالکل درست تھا۔ لیکن بیوروکریسی کے نقطہ نظر سے یہ موت کا پیغام ثابت ہوتا۔ یہ ہے آمرانہ نظام کی حقیقی مادی بنیاد۔

عوام کی شراکت میں اضافے اور انتظامیہ کے مزید سادہ ہونے کی بجائے عفریت نما نوکر شاہی مشینری کو استحکام ملا جس کے اندر مزدوروں اور افسران کے درمیان شرح تناسب کسی بھی سرمایہ دار قوم کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ اس کے مقابلے میں ایک بہت بڑے ملٹری، انڈسٹریل کمپلیکس کی حامل ہونے کے باوجود امریکی ریاست بہت چھوٹی دکھائی دیتی تھی۔ سماج کے آگے بڑھنے میں مدد و معاون ثابت ہونے کی بجائے وزارتوں، محکموں اور ذیلی محکموں اور ان کی کاغذی کاروائیوں، احکامات اور سرخ فیتے نے پیداواری قوتوں کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹوں کا کردار ادا کیا۔ سماج اور مزدور طبقے کے مفادات کی بجائے اہل کاروں کی فوج ظفر موج کے خود غرضانہ مفادات پالیسی کا تعین کرتے تھے۔

سب سے زیادہ مجرمانہ بات یہ ہے کہ برژنیف کے دور میں سوویت یونین میں ایسے مادی حالات موجود تھے کہ وہ سوشلزم کی جانب پیش قدمی کا کم از کم آغاز تو کر ہی سکتا تھا۔ تاریخی طور پر سماج کی طبقات

میں تقسیم کا تعین محنت سے اور سب سے بڑھ کر ذہنی اور جسمانی محنت کی تقسیم سے ہوتا ہے۔ لیکن اب اس تقسیم کے خاتمے کے لیے مادی بنیاد موجود تھی۔ 1917ء میں روس کے اندر صرف 40 لاکھ مزدور تھے اور 1980ء میں سوویت یونین میں 12 کروڑ مزدور تھے یہ دنیا کا سب سے بڑا اور غالباً سب سے زیادہ پڑھا لکھا مزدور طبقہ تھا۔

صنعت، سائنس اور ٹیکنالوجی کی زبردست ترقی کی بنیاد پر مزدور جمہوریت بھرپور طور پر نشوونما پا سکتی تھی۔ اس کی اولین شرط یہ تھی کہ صنعت اور ریاست کو چلانے کا کام مزدور طبقے کے ہاتھوں میں ہو۔ تمام پارٹیوں اور رجحانات کو اپنی رائے کے دفاع کے مکمل حقوق حاصل ہونے چاہئیں تھے بشمول ان چند خبطیوں کے جو سرمایہ داری کی طرف واپسی چاہتے تھے۔ حقیقی مزدور جمہوریت پر مبنی اس قسم کا نظام سوشلزم کی طرف پیش قدمی کے آغاز کی تیاری ہوتا۔ لیکن اس کی اولین شرط یہ تھی کہ بیوروکریسی کا تختہ الٹا جاتا جو ہر قیمت پر اقتدار سے چمٹے رہنے کا تہیہ کیے ہوتے تھی۔

سوویت یونین کے اپنی پسماندگی پر قابو پا کر ایک جدید معیشت میں تبدیل ہو جانے سے یہ تصادم کم ہونے کی بجائے زیادہ واضح اور نا قابل برداشت ہو گیا۔ بیوروکریسی کی حکمرانی بدستور ایک ایسی نا قابل عبور رکاوٹ بنی رہی جو سوشلزم کی جانب پیش رفت کی راہ میں حائل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جبر میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہو گیا جب کہ لینن کے نقطہ نظر کے مطابق سماجی تضاد کی مادی بنیاد ختم ہونے کی وجہ سے اس میں کمی آنا چاہیے تھی۔ درحقیقت سوویت یونین سوشلزم سے دور ہو رہا تھا۔ تفریق بڑھتی جا رہی تھی سماجی مخاصمتوں میں شدت آ رہی تھی اور بیوروکریسی کی حکمرانی روز بروز نا قابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ آمرانہ ریاست اس حقیقت کا محض واضح ترین اظہار تھی نہ کہ اس کی وجہ۔

آرٹ اور سائنس

''مجھے حیرت ہے کہ آپ ایک شاعر کے بیوروکریسی کے خلاف آواز اٹھانے پر حیران ہیں کیونکہ شاعر اور بیوروکریٹ کے الفاظ ہی بے میل ہیں۔'' (یوجنائی یفتوشینکو)

اکتوبر انقلاب نے ثقافت اور فنون لطیفہ کو زبردست آزادی بخشی تھی۔ انقلاب کے باعث فنکاروں، شاعروں اور موسیقاروں کی ایک پوری نسل نے نئی بلندیوں کو چھوا تھا۔ لیکن یہ تخلیقی تحریک

انقلاب کے زوال اور سٹالنسٹ نظام کے ہم رقاب فن دشمن جبر اور فکری گھٹن کے ماحول میں زندہ نہ رہ سکی۔ سماجی زندگی کے کسی بھی دوسرے شعبے سے زیادہ سائنس اور فنون لطیفہ کو اپنے پر پھیلانے کیلئے آزادی کی ضرورت تھی۔ یہ آزادئ فکر، بحث و مباحثے اور اختلاف کے ماحول میں بہتر نشوونما پاتے ہیں۔ لیکن اطاعت گزاری، معمول اور نوکر شاہانہ سختی کے مردہ ہاتھ کے نیچے آکر مرجھا جاتے ہیں۔

فنون لطیفہ کے بارے میں سٹالنسٹ رویے کو آمرانہ ریاست کے عمومی طریقہ کار سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ فاشزم پر بھی اس کا اتنا ہی اطلاق ہوتا ہے جتنا سٹالن ازم پر حالانکہ ان کی سماجی و معاشی بنیاد بالکل مختلف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مارکسزم کی مسخ شدہ نوکر شاہانہ نقل حکمران نسل کے تصور، نسل پرستی کے زہر اور سامراجیت کے اس کشید کردہ عرق کے مقابلے میں زیادہ قابل ترجیح ہے جو فاشسٹ نظریئے کی اساس ہے، بالکل اسی طرح جیسے بینکوں اور اجارداریوں کی حکمرانی کے مقابلے میں قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت زیادہ قابل ترجیح ہے۔ تاہم سائنس اور فنون لطیفہ کے ساتھ ان کے سلوک میں واضح مماثلت پائی جاتی ہے جو حادثاتی نہیں ہے۔ ایک آمرانہ ریاست سماجی زندگی کے کسی ایسے شعبے کو قبول نہیں کرسکتی جو مکمل طور پر اس کے تابع نہ ہو۔ ہٹلر نے نہ صرف سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیوں اور یونینوں پر پابندی عائد کی بلکہ یہاں تک کہ مزدوروں کے شطرنج کلب بھی بند کر دیئے۔

سٹالنسٹ بیوروکریسی نے فنکاروں اور لکھاریوں پر سخت کنٹرول رکھا کیونکہ پارٹیوں اور یونینوں کی عدم موجودگی میں مزدوروں اور دانشوروں کی مخالفت اظہار کے دیگر ذرائع اختیار کرسکتی تھی۔ ادب خاص طور پر خطرناک تھا۔ لیکن تصویری فنون اور یہاں تک کہ موسیقی بھی نظام مخالف مقاصد کیلئے استعمال ہوسکتی تھی۔ اس لیے مصنفین اور موسیقاروں کی ''یونین'' کی قیادت میں موجود ریاست کے بھاڑے کے ٹٹو سرکاری طور پر سند یافتہ ''سوشلسٹ پسندی'' کی راہ سے تھوڑا سا ادھر ادھر ہونے والوں پر بھی کڑی نظر رکھتے تھے۔ ذرا اس گھٹن زدہ ماحول کا موازنہ 1920ء کی دہائی کی پرجوش فنکارانہ زندگی سے کریں جس میں فکر اور اسلوب کے حوالے سے متنوع مکاتب موجود تھے مثلاً مستقبلیت، منتہایت، استعاریت، تصوریت، تعمیریت اور بہت سے دوسرے اسلوب جب کہ بعد کی دہائیوں میں صرف بے روح پیروکاری تھی پھر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کسی طرح ایک عظیم موقع ضائع ہوگیا۔

عظیم روسی شاعر ولادیمیر مایا کوفسکی ان چند گنے چنے مشہور مصنفین میں سے ایک تھا جو انقلاب سے پہلے بالشویکوں کے ساتھ سرگرم طور پر ہمدردی رکھتے تھے (ان میں میکسم گورکی بھی تھا)۔ سرجی یسن

اور الیگزنڈر بلوک جیسے مشہور شاعر انقلاب کے ساتھ ہم سفروں جیسی ہمدردی رکھتے تھے (یہ اصطلاح ٹراٹسکی نے 1920ء کی دہائی میں ایجاد کی تھی) جب کہ مایا کوفسکی اس کے ساتھ دل و جان سے تھا اور اس کی شاعری میں اس کا اظہار ہوتا تھا جس سے اسے ''انقلاب کے نقیب'' کی عرفیت ملی۔ بعد کے سالوں میں اس کی شاعری اور ڈراموں میں اکثر روسی بیوروکریسی کے خلاف تند و تیز مزاحیہ تنقید موجود ہوتی تھی۔ 1930ء میں اس نے خودکشی کر لی جس کے بارے میں کم و بیش یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ نوکرشاہانہ رجعت کے خلاف بطور احتجاج کی گئی تھی۔

بہت سے اور لوگوں نے خود اپنی جان تو نہیں لی لیکن وہ تطہیرات کا شکار ہو کر سٹالن کے قید خانوں میں ختم ہو گئے۔ ایک اور عظیم روسی شاعر اوسپ مینڈل شٹام کا بھی یہی حشر ہوا۔ 1932ء کے بعد یہ نظام فنکاروں اور لکھاریوں سے مکمل اطاعت کا تقاضا کرتا تھا۔ بورس پیسرناک نے دس سال کے عرصے کے لیے لکھنا چھوڑ دیا۔ دوران جنگ اس نے کچھ شاعری شائع کروائی لیکن ژدانوف کی تطہیرات کے خلاف احتجاجاً پھر خاموشی اختیار کر لی اور 'ڈاکٹر ژواگو' کی اشاعت سے پہلے کچھ نہیں لکھا جسے سویڈن میں نوبل پرائز دیا گیا لیکن روس میں اس پر فوراً پابندی لگا دی گئی۔

موسیقی کے شعبے میں شوستاکووچ اور پرکوفیف جیسے عظیم موسیقاروں کی سرعام تذلیل کی گئی اور ان کے کام کی ژدانوف جیسے جاہل بیوروکریٹوں نے مذمت کی جو ثقافت کے شعبے میں وائی شسکی جیسے لوگوں کا نعم البدل تھا۔ تطہیری مقدمات کی طرح یہاں بھی انہیں جھوٹے اعتراضات پر مجبور کیا گیا۔ اس کے باوجود ان کے بہترین شاہکاروں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ شوستاکووچ کے اوپیرا "The Lady Macbeth of Mtensk" اور پروکوفیف کی چھٹی سمفنی پر سٹالن نے پابندی عائد کر دی تھی اور روس میں کئی سال تک یہ پابندی عائد رہی۔

سٹالن کے دور میں سائنس بیوروکریسی کے ہاتھوں میں تھی جو فیصلہ کرتی تھی کہ کون سی تھیوریاں حکمران ٹولے کیلئے قابل قبول ہیں اور کون سی قابل ملامت لہٰذا جینیات کے شعبے میں سوویت تحقیق لائسینکو کی غلط تھیوریاں قبول کرنے کی وجہ سے کئی سال تک رکی رہی جسے سٹالن کی سرپرستی حاصل تھی۔ لسانیات کے شعبے میں بھی یہی صورت حال تھی جہاں سال ہا سال تک 'مار' کے بوگس نظریات عالموں پر مسلط رہے یہاں تک کہ 'باس' نے اپنی موت سے قبل غیر متوقع طور پر لسانیات پر کتاب لکھ ڈالی جس سے 24 گھنٹے کے اندر صورت حال بالکل الٹ ہو گئی۔

اس سے بھی بدتر بات یہ تھی کہ سائبر نیٹکس جیسی کلیدی نوعیت کی سائنس کو بورژوا رجعتی بکواس قرار دے کر اس پر فی الواقع پابندی عائد کر دی گئی۔ محض اس اقدام کی وجہ سے سوویت یونین کمپیوٹر کے بارے میں تحقیق کے اہم شعبے میں کئی سال پیچھے رہ گیا۔ گمک تھیوری کے سلسلے میں بھی کسی نہ کسی وجہ سے یہی صورت حال تھی۔ آئن سٹائن پر بھی شبہ کیا جاتا تھا اگرچہ ماہرین طبیعات پر بہت زیادہ سختی نہیں تھی کیونکہ سٹالن ہر ممکنہ تیز رفتاری سے ایٹم بم بنانے کے لیے بے چین تھا۔ صرف خالص ریاضی کو مکمل آزادی حاصل تھی اور غالباً وہ بھی اس لیے کہ بیوروکریٹ اس کے سر پیر سے ناواقف تھے! احتجاج کی جرأت کرنے والوں کو سرد مہری کا سامنا کرنا پڑتا تھا، ان کی ترقی روک لی جاتی تھی اور یہاں تک کہ گرفتار بھی کر لیا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں ہر کوئی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسا ماحول نہیں تھا جس سے عظیم پیش رفتوں اور جدت پسندانہ فکر کی حوصلہ افزائی ہوتی۔

علاوہ ازیں اس حقیقت کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ سوویت سائنس دان عالمی پیمانے پر پائی جانے والی جدید ترین سائنسی سوچ سے عام طور پر کٹے ہوئے تھے ماسوائے ان رسائل و جرائد کے جو انہیں مہیا کیے جاتے تھے اور ان حالات میں جو تصویر سامنے آتی ہے وہ بہت زیادہ حوصلہ افزا نہیں۔ اسی سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ بہت سے اچھے سائنس دانوں کے ہوتے ہوئے بھی وہ مغرب جیسے نتائج حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہے۔ سائنس کی ترقی کے لیے تنقید کرنے، تجربات کرنے اور غلطیاں کرنے کی آزادی ضروری ہے۔

فلسفے کے ضمن میں بھی ایسی ہی صورت حال موجود تھی۔ سٹالنسٹ نظام کے لیے یہ امر باعث مذمت ہے کہ سوویت یونین ستر سال تک مارکسی فلسفے یا معاشیات پر کوئی بھی حقیقی کام پیش کرنے سے قاصر رہا۔ ایک برصغیر کے تمام تر وسائل پر دسترس رکھنے کے باوجود وہ اس قابل نہیں تھے کہ برٹش میوزیم کی مطالعہ گاہ میں تن تنہا کام کرنے والے شخص کے کارہائے نمایاں کا مقابلہ کر سکتے۔ سٹالنسٹ نظام کے نام نہاد مارکسزم لینن ازم پر یہی تبصرہ کافی ہے۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ اس کے تحت طالب علم نسلوں پر جو جامد اور بے جان عقائد ٹھونسے جاتے تھے وہ بے توجہی کی نظر ہو جاتے تھے اور اس سے صرف یہ ہوا کہ بہت سے سنجیدہ نوجوانوں اور دانشوروں کی نظروں میں بھی مارکس ازم کی ساکھ خراب ہو گئی۔

یہ کوئی حادثاتی امر نہیں کہ مشرقی یورپ میں بیوروکریسی کے خلاف اولین ہلچل کی شروعات دانشوروں کی طرف سے کی گئیں۔ روشن خیال طبقہ سماج میں ایک آزاد کردار ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا

لیکن یہ ایک انتہائی حساس پیمانہ ہے جس سے سماج کی گہرائیوں میں پرورش پانے والے کھچاؤ کا اندازہ انتہائی ابتدائی مراحل میں ہوسکتا ہے۔اس سے عام طور پر یہ غلط خیال پیدا ہوتا ہے کہ طالب علم ایک انقلابی تحریک چلا سکتے ہیں جب کہ درحقیقت وہ محض گزشتہ عرصے میں جمع ہونے والے آتش گیر مواد کے لیے چنگاری کا کام کرتے ہیں۔ 1968ء میں فرانس میں یہی صورت حال تھی اس کے علاوہ پولینڈ میں کرُکٹ سرکل اور 1956ء میں ہنگری کے پٹوفی سرکل کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔

سوویت یونین کے اندر بھی دانشوروں میں بے چینی پائی جاتی تھی۔ سٹالن کی موت کے بعد سوویت لکھاریوں کے ایک حصے نے محتاط انداز میں سرکاری سنسرشپ کے خلاف اپنے حقوق کا دفاع کرنا شروع کردیا۔سرکاری سوویت ادب اپنی موت آپ مر رہا تھا۔ویرا انبر نامی شاعرہ نے بڑی جرأت سے یہ بات کہی کہ جب تک ''وہی پرانا ڈیم اور وہی پرانی بھاپ کی طاقت سے کھدائی کرنے والی مشین'' ہماری شاعری کے موضوع ہیں نہ تو سوویت شاعری کسی نے پڑھنی ہے اور نہ ہی پڑھے گا۔نام نہاد ''نرمی'' کے دور میں ڈرامہ نگار 'زورن' کا ایک ڈرامہ شائع ہوا جس میں اس نے ایک پرانے انقلابی کرپی چیف اور اس کے بیٹے پیوٹر، جو کہ پارٹی بیوروکریٹ اور کیریئراسٹ ہے، کے مابین مخاصمت کی عکاسی یوں کی ہے۔

کرپی چیف کہتا ہے ''ملک مزید طاقتور ہوگیا ہے اور لوگ امیر تر ہوگئے ہیں۔لیکن محنتی اور خوش دلی سے کام کرنے والوں کے پہلو بہ پہلو غیر محسوس طریقے سے بہت سے تمہارے جیسے وائٹ کالر اشرافیہ، لالچی اور خود پسند لوگ بھی ظاہر ہوگئے جو عوام سے بہت دور ہیں۔''

''میں صرف اپنے ملک کے عظیم محنت کشوں کے پہلو بہ پہلو کام کرتا تھا۔ میں کام کرتا تھا اور مجھے اقتدار کے چسکے کا علم نہیں تھا۔لیکن تمہیں اس ذائقے کا بچپن سے علم ہے اور تم نے یہ زہر پی لیا ہے۔''(18)

زورن کا ڈرامہ حکمرانوں کی برداشت سے باہر تھا۔سوویت سکایا کلچرا نے اس پر احتجاج کیا:

''اس قسم کی مفسدانہ بکواس ایک ایسا شخص ہی کرسکتا ہے جو زندگی کے حقائق سے بالکل ناواقف ہو اور ہمارے اردگرد جو کچھ ہورہا ہے اس سے جان بوجھ کر چشم پوشی کر رہا ہو۔کون سا شخص ایسا ہے جو نہیں جانتا کہ سوویت وزارتوں اور محکموں وغیرہ کی تمام تر سرگرمی کا مقصد مزدور طبقے کے انتہائی اہم مفادات کی ہر وقت دیکھ بھال کرنا ہے اور اسی وجہ سے ہمارے یہاں لفظ ''اقتدار'' کا مطلب ہے تابعدار، خوش کن اور سوویت یونین کے ہر مرد وزن کی اعلیٰ اور نفیس ترین امیدوں اور خواہشوں کا محور اور یہ کہ ہمارے عوام اپنے

عوامی اقتدار پر نا قابل شکست اعتماد رکھتے ہیں، گرمجوشی اور اولاد جیسا پیار دیتے ہیں؟''

کسی فنکار کے لیے محض آمرانہ ریاست کو قبول کر لینا ہی کافی نہیں تھا۔ اس پر ''نا قابل شکست اعتماد'' کرنے کے علاوہ ''اولاد کی طرح گرم جوش محبت کا اظہار'' بھی ضروری تھا۔ بالفاظ دیگر فن کار سے عصمت فروشی کی توقع رکھی جاتی تھی کہ وہ ریاست اور بیورو کریسی کے گن گائے۔ علاوہ ازیں وہ یہ سب کچھ پورے خلوص اور صدق دل کے ساتھ کرے ورنہ اسے ''مفسدانہ بکواس'' کرنے والا غدار قرار دے کر اس کی مذمت کی جاتی تھی۔ کیا اس میں کوئی حیرت کی بات ہے کہ اگر اس نظام نے بہترین فنکاروں اور دانشوروں کو خود سے بیگانہ کر دیا؟ مصنفوں، موسیقاروں اور فن کاروں کی یونین محض پولیس کے ذیلی شعبے تھے جن میں رائٹرز یونین کے چیئر مین اور پرانے سٹالنسٹ فادئیف جیسے ٹاؤٹ اور ایجنٹ شامل تھے۔

ادیبوں کی تحقیر کی گئی اور 1954ء کے موسم گرما تک تمام نمایاں ادبی جریدوں میں شدید نظم وضبط بحال کر دیا گیا اور ان میں سے تین کے ایڈیٹروں کو برطرف کر دیا گیا۔ حکومت کے ردعمل کی وجوہات کا ادب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہیں خوف یہ تھا کہ دانشوروں کی مخالفت عوام کے مجتمع شدہ عدم اطمینان کے لیے مرکزی نقطہ نہ بن جائے اور وہ ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھے۔ دودنتسیف کے ناول "Not By Bread Alone" کی اشاعت نے نوجوانوں میں تنقید اور مخالفت کی ایک نئی لہر کو ہوا دی جو فیکٹریوں تک پھیل گئی:

''حکام پریشان ہوگئے۔ سارے روس کے اندر یونیورسٹیوں اور ٹیکنیکل کالجوں کے طالب علم دیواری اخبارات اور منشوروں کی نقول کے ذریعے بغاوت کا اظہار اور تقاضا کرنے لگے جو سوویت نظام کے خلاف نہیں بلکہ بدعنوانی، علم دشمنی اور حکمرانوں کی بوجھل اور جابرانہ روایات کے خلاف تھی۔ جب یہ موڈ فیکٹریوں تک پھیل گیا اور جب کرونسٹاٹ اور ولادی واستک میں دیواری اخبارات نظر آنے لگے اور فیکٹریوں میٹنگوں میں سرکاری مقررین کا ناطقہ بند ہونے لگا تو صورت حال واضح طور گھمبیر ہوگئی۔''(19)

نوجوان شاعر یوجینی یوٹوشینکو بیوروکریسی کا سخت مخالف تھا لیکن انقلاب کا ہمیشہ دفاع کرتا تھا۔ اکتوبر 1956ء میں اس نے جرأت مندی سے ایک نظم شائع کی جو نام نہاد ڈی سٹالنائزیشن کی مہم کے خلاف سوال اٹھاتی تھی:

''تبدیلیاں یقیناً ہوئی ہیں، لیکن تقریروں کے پس پردہ

کوئی تاریک کھیل کھیلا جا رہا ہے
ہم بولتے ہیں اور ایسی چیزوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں جن کا کل ہم ذکر نہیں کرتے تھے
ہم ان چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتے جو ہم نے خود کی تھیں۔''

جب حکومت نے انقلاب ہنگری سے ہمدردی رکھنے والے طلبا کے خلاف کاروائی کی تو یوٹوشینکو کو کومسومول (نوجوان کمیونسٹوں کی تنظیم) سے نکال دیا گیا۔ زبردست جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے ایک نظم میں جوابی حملہ کیا جو کسی نہ کسی طور نووی میر میں شائع ہوگئی۔

''کتنا خوفناک ہے کبھی کچھ نہ سیکھنا
مسند انصاف پر جلوہ افروز ہونے کے حق کا دعویٰ کرنا
باغی، صاف دل جوانی کو موردِ الزام ٹھہرانا
ناپاک عزائم کے لیے
متعصّبانہ شبہ نیکی سے عاری ہوتا ہے
اندھے منصف عوام کی خدمت نہیں کرتے!''

ادیبوں کے خلاف مقدمات

کئی سال بعد 1988ء میں یوٹوشینکو نے رائٹرز یونین میں بیوروکریسی کے خلاف ایک جرأت مندانہ تقریر کرتے ہوئے پارٹی کے اعلیٰ عہدیداران کی مراعات کی مذمت کی جسے ہم نے اس باب کے شروع میں نقل کیا ہے۔ برژنیف کے دور میں ڈی سٹالنائزیشن کی مہم نے فنکارانہ اظہار کا دروازہ کم از کم ادھ کھلا چھوڑ رکھا تھا۔ لیکن پہلے بیان کی جا چکی وجوہات کی بنا پر ایک آمرانہ ریاست آزادیٔ اظہار کے سلسلے میں معمولی سی رعایت دینا بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ خروشیف کے تجربے نے حکمران ٹولے پر واضح کر دیا کہ ایسا کرنا خطرناک ہے۔ دروازہ مکمل طور پر بند کر دیا گیا سنیاوسکی اور ڈیسیل جیسے ادیبوں پر چلائے جانے والے بدنام زمانہ مقدمات تمام فن کار حلقوں کے لیے ایک سنجیدہ تنبیہہ تھے کہ وہ معمول سے ہٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ایک بار پھر انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ یا تو سب کچھ سر جھکا کر برداشت کریں یا نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیں۔ اس جبر و ستم کا نتیجہ یہ ہوا کہ فنکاروں اور دانشوروں کے ایک حصے کا رویہ سوویت

مخالف ہوگیا جس نے نظام کو مزید نقصان پہنچایا۔

پارٹی میں موجود بھاڑے کے ٹٹوؤں نے لینن سے اس بات کو منسوب کرنے کی کوشش کی کہ ادیبوں کو صرف ''عمومی راستے'' کی عکاسی کرنی چاہئے۔ یہ بات اول تا آخر غلط ہے۔ لینن کے مضامین پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ باتیں سیاق وسباق سے علیحدہ کر کے اخذ کی گئی ہیں۔ لینن پارٹی پریس کے حوالے سے بات کر رہا تھا جو عام ادب سے بالکل مختلف چیز ہے۔ پارٹی ایک رضا کارانہ اتحاد ہوتا ہے۔ کوئی بھی اس میں شرکت پر مجبور نہیں ہوتا۔ لیکن اس بات کی توقع رکھنا بالکل معقول بات ہے کہ پارٹی کے عوامی جرائد پارٹی کے تصورات کی عمومی عکاسی کریں۔ لیکن لینن نے اس اصول کا اطلاق ریاست پر کرنے کے بارے میں کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دیگر معاملات میں الجھے رہنے کے سبب لینن نے ادب اور فنون لطیفہ کے بارے میں بہت کم لکھا۔ اس کا ادبی ذوق قدرے قدامت پسندانہ تھا اور کلاسیکی ادب کی طرف مائل تھا۔ مثال کے طور پر اسے مایاکووسکی کی شاعری پسند نہیں تھی جو اس کے ذوق کے حوالے سے بہت جدید تھی۔ انقلاب کے بعد ایک موقع پر کاغذ کی بہت زیادہ قلت ہوگئی اور اسے یہ دریافت کر کے بہت پریشانی ہوئی کہ مایاکووسکی کی شاعری کا بڑا ایڈیشن شائع کیا جا رہا ہے لیکن اس کے دماغ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ وہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے اس کی اشاعت رکوا دے۔ لینن اور ٹراٹسکی کے تحت فن کاروں اور ادیبوں کو کام کرنے اور تجربات کرنے کی بہت زیادہ آزادی حاصل تھی۔ اس سے سوویت اقتدار کے ابتدائی دور میں ادب اور فنون لطیفہ کے غیر معمولی طور پر پھلنے پھولنے کی وضاحت ہوجاتی ہے۔

ادب اور فنون لطیفہ پر سٹالنسٹ آمریت کے انتہائی مضر اثرات مرتب ہوئے۔ اس کہ وجہ سے شعبہ ثقافت سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا ایک حصہ سرمایہ دارانہ رجعت کے حامیوں کے ساتھ مل گیا۔ ''آزادی'' کے مطالبے کو ادھر سے حمایت حاصل ہوتی تھی۔ لیکن مارکیٹ اکانومی کی طرف تحریک کا مطلب روسی ثقافت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ بدمعاش، مافیا والے اور راتوں رات امیر بننے کے خواہش مند تاجر پرانے بیوروکریٹوں سے کم علم دشمن نہیں ہیں۔ تعلیم اور ثقافت کے لیے ریاستی اخراجات میں کٹوتی کھلی تہذیب سوزی ہے۔ اس کے اثرات فوری بھی ہیں اور متوقع بھی۔

بے روزگاری اور غربت سے دانشور بھی اس طرح متاثر ہوتے ہیں جیسے مزدور۔ بولشوئی تھیٹر جیسے قومی اداروں میں فن کا معیار گر گیا ہے۔ ہونہار جوان موسیقار آئر لینڈ اور سپین کے دوسرے درجے کے

قصباتی آرکسٹراؤں میں کام کرنے کے لیے ملک چھوڑ کر جارہے ہیں۔ یوکرائن کی موسیقی کی درسگاہوں کے پروفیسر چند سکوں کے لیے پیرس کی گلیوں میں سیاحوں کے آگے گاتے بجاتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح ثقافت کی دنیا پرانی زنجیروں کی بجائے نئی زنجیروں میں پابستہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ دولت کی اجارہ داری کے ذریعے فرد کو غلام بنانا، اس پر جبر کرنا اور خاموش کرانا اتنا ہی آسان ہے جتنا ریاستی کنٹرول کے ذریعے۔ اس کا مطلب محض ایک قسم کی غلامی کا تبادلہ دوسری قسم کی غلامی سے کرنا ہے۔

اسی دوران ثقافتی نوسر بازوں اور موقع پرستوں کی ایک نئی نسل مافیا سرمایہ داروں کے ذوق پر پورا اترنے کی کوشش کررہی ہے۔ ان میں سے کچھ لکھ پتی بن چکے ہیں جیسے جارجیا کا بت تراش زورل سیری ٹیلی جو نامعلوم وجوہات کی بنا پر ماسکو کے پبلک مقامات پر مجسموں کی تنصیب کے ٹھیکوں پر اجارہ داری رکھتا ہے۔ اس کا کام اس قدر مشکوک اور کمتر ہے کہ ایک پارک کے منتظمین نے اس کا مجسمہ ایک گمنام گوشے میں نصب کر دیا ہے جہاں اس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ سیری ٹیلی آج کل اس عمارت میں رہائش پذیر ہے جو پہلے جرمن سفارت خانہ ہوتی تھی۔ اس راستے پر چلتے ہوئے آرٹ، ادب اور سائنس کا کوئی حقیقی مستقبل نہیں ہوسکتا۔ صرف سوشلسٹ جمہوریت کا حقیقی نظام ثقافت کے آزادانہ فروغ کے لیے زرخیز زمین مہیا کرسکتا ہے۔ سوشلزم کی تعریف ایک بار ٹراٹسکی نے یوں کی تھی ''لالچ کے بغیر انسانی تعلقات، رشک اور غیبت کے بغیر دوستی، گھٹیا حساب کتاب کے بغیر محبت۔'' ایسے سماج کے حصول کی جدوجہد ان مردوزن کے لیے ایک اعلیٰ نصب العین ہے جنہوں نے اپنی زندگیاں ہم آہنگی، سچائی اور خوبصورتی کی تلاش کے لیے وقف کررکھی ہیں۔

لینن کے برعکس ٹراٹسکی نے آرٹ اور لٹریچر پر بہت کچھ تحریر کیا۔ 1920ء کی دہائی میں مختلف مکاتب فکر کے درمیان ہونے والی گرما گرم بحثوں میں شرکت کے لیے وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتا ہے۔ اس کی تحریریں ''ادب اور انقلاب'' کے عنوان کے تحت شائع ہوئیں جس میں فنون لطیفہ کے بارے میں مارکسی اور طبقاتی رویے کا دفاع کیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ ہر مکتبہ فکر کے بارے میں مارکسی نقطہ نظر کے حوالے سے اپنی آرا دیتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی فنکاروں پر اپنی بالشویک پارٹی کے نظریات مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی کجا یہ کہ وہ ان سے ''اولاد جیسی محبت'' اور ''ناقابل شکست اعتماد'' کا تقاضا کرتا۔ پیار اور اعتماد حاصل کیے جاتے ہیں، نہ تو ان کا تقاضا کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی یہ سنسر شپ اور قانون کے ذریعے نافذ کیے جاسکتے ہیں۔

کئی برس بعد بھی جب ٹراٹسکی میکسیکو میں جلاوطنی کے دوران بالشوازم، لینن ازم کی قوتوں کو دوبارہ جمع کرنے کی کوشش کر رہا تھا اس نے تخلیقی دانشوروں کو فراموش نہیں کیا۔ یکم جون 1938ء کو اس نے ایک خط میں مندرجہ ذیل سطور تحریر کیں:

''رجعتی بیوروکریسی کی آمریت نے ایک پوری نسل کی دانشورانہ سرگرمی کا یا تو گلا دبا دیا یا اس کی عصمت فروشی کی۔ ناممکن ہے کہ آپ ان سوویت پینٹنگز اور مجسموں کی نقول دیکھ کر گھن محسوس نہ کریں جن میں برشوں سے مسلح اہلکار بندوقوں سے مسلح اہلکاروں کی زیرنگرانی اپنے حاکموں کو 'عظیم اور فطین' شخصیات کے طور پر اجاگر کر رہے ہوتے ہیں جن میں درحقیقت فطانت یا عظمت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ سٹالنسٹ عہد کا فن تاریخ میں پرولتاری انقلاب کے کسی بھی دور کے عمیق ترین زوال کے سب سے قابل دید اظہار کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔''

''صرف ایک انقلابی تحریک کا نیا ابھار ہی فن کو نیا تناظر اور امکانات عطا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے چوتھی انٹرنیشنل فن کی راہنمائی کرنے یعنی دوسرے الفاظ میں احکامات دینے یا طریقے تجویز کرنے کا فریضہ اپنے سر نہیں لے سکتی۔ فن کے بارے میں ایسا رویہ اپنانے کا سودا صرف ماسکو میں بیٹھے خدائی کے نشے میں سرشار بیوروکریٹوں کے سر میں ہی سما سکتا ہے۔ آرٹ اور سائنس سرپرستوں کے ذریعے اپنی بنیادی فطرت کو نہیں پاتے بلکہ آرٹ اپنے وجود کے حوالے سے ہی انہیں مسترد کرتا ہے۔ تخلیقی انقلابی سرگرمی کے اپنے داخلی قوانین ہوتے ہیں، اس وقت بھی جب یہ شعوری طور پر سماجی ترقی کی خدمت سرانجام دے رہی ہو۔ انقلابی آرٹ کا جھوٹ، منافقت اور مصلحت آمیزی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر عوام کی انقلابی تحریک نے شک پرستی اور قنوطیت کے ان بادلوں کو ہٹایا جو آج انسانیت کے افق کو تاریک کیے ہوئے ہیں تو شاعر، فنکار، مجسمہ ساز اور موسیقار اپنی راہیں اور طریقے خود دریافت کر لیں گے۔ تخلیق کاروں کی نئی نسل کو یقین دہائی کروائی جانی چاہئے کہ پرانی انٹرنیشنلز کا چہرہ انسانیت کے ماضی کی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ مستقبل کی۔'' (20)

باب نمبر 6: جمود کا دور

1۔ ورلڈ مارکسسٹ ریویو۔ اکتوبر 1966ء بحوالہ برطانیہ میں سٹالنزم صفحہ 385-383

2۔ دی گارڈین۔ 19 نومبر 1986ء

3۔ مارننگ سٹار۔ 5 اگست 1982ء

4۔ مارننگ سٹار۔ 5 اگست 1982ء

5۔ آرمیڈ وڈیڈیف۔ سوشلسٹ جمہوریت پر صفحہ 5-6

6۔ آرمیڈ وڈیڈیف۔ سوشلسٹ جمہوریت پر صفحہ 12

7۔ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 23 ویں کانگریس کی رپورٹ صفحہ 89-90

8۔ ٹراٹسکی۔ انقلاب سے غداری صفحہ 12

9۔ کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 23 ویں کانگریس کی رپورٹ صفحہ 175

10۔ دی گارڈین 7 فروری 1986ء

11۔ منیجر۔ نومبر 1976ء بحوالہ لٹریچر گزیٹیا

12۔ ڈیوڈ گرینک۔ سرخ ایگزیکٹو صفحہ 34

13۔ دی ٹائمز۔ 2 جولائی 1986ء

14۔ فنانشل ٹائمز۔ 2 جولائی 1986ء

15۔ گریگورینکو۔ یادداشتیں صفحہ 408-409

16۔ ایضاً صفحہ 295

17۔ ایضاً صفحہ 407

18۔ گرینک شا۔ خروشیف کا روس صفحہ 108

19۔ گرینک شا۔ خروشیف کا روس صفحہ 115-116

20۔ ٹراٹسکی تحریریں 38-1937ء صفحہ 351-352

باب نمبر 7

پریسٹرائیکا کا مفہوم

ایک حتمی رکاوٹ

بیوروکریسی کا خیال تھا کہ وہ زارشاہی کی طرح ہزار سال حکومت کرے گی۔ تاہم ایک قلیل عرصے میں ہی اس کے خواب دھول بن گئے۔ صرف اڑھائی نسلوں کے دوران بیوروکریسی کا وہ ترقی پسندانہ کردار بھی ختم ہوگیا جو اس نے کسی حد تک ماضی میں ادا کیا تھا۔ سماج کی ترقی میں ایک نسبتی رکاوٹ ہونے کی بجائے اب یہ ایک حتمی رکاوٹ بن چکی تھی۔ لہٰذا جو ایک مستقبل اور طے شدہ نظام دکھائی دینا شروع ہوگیا تھا اب اپنی اس شکل میں سب کے سامنے موجود تھا جو ہمیشہ سے اس کی اصلیت تھی یعنی ایک عارضی تاریخی انحراف جس کا آنے والے دور میں خاتمہ یقینی تھا۔ 1970ء کے اواخر تک اس کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا۔

سوویت معیشت کے ایک کلیدی شعبے سے لی گئی مندرجہ ذیل مثال کو لیجئے۔ گیس اور تیل کے پرانے کنوؤں سے پیداوار ختم ہوتی جارہی تھی لیکن سوویت یونین کے پاس صرف مغربی سائبیریا میں ہی ان کے تقریباً لامحدود ذخائر موجود تھے جنہیں وہ ترقی نہیں دے سکتے تھے۔ کیوں؟ صرف 1983ء کے ایک سال کے دوران سوویت یونین کے 20 فیصد تیل کے کنویں بند پڑے تھے جس کی وجہ دیکھ بھال کی کمی، نااہل انتظامیہ اور مزدوروں کی قلت تھی۔ یہ کنویں متوقع تعداد سے 20000 زیادہ تھے۔ تیل کے کنوؤں پر کام کرنے والے مزدوروں کی قلت کیوں تھی؟ نوکرشاہانہ منصوبہ بندی میں سارا زور پیداوار پر

دیا جاتا تھا۔ایسی چیزوں کو عام طور پر کم ترجیح دی جاتی تھی۔اس حقیقت کے مدنظر کہ روس میں تیل اور کوئلے کے ذخائر عام طور پر انتہائی دور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں پائے جاتے ہیں اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ بہت سے مزدور وہاں نہیں جانا چاہتے، زیادہ اجرتوں کے باوجود وہاں جانے والے مزدوروں کی تعداد کم تھی۔

آخری دہائیوں میں حکمران ٹولے نے ہر طرح کی ترکیبیں آزمائیں جن میں انہیں کبھی مرکز کے تحت لایا گیا کبھی مرکز سے الگ کیا گیا مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔آئزک ڈوشر جیسے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بیوروکریسی اصلاحات کے ذریعے اپنے وجود کو ختم کر لے گی۔اے بسا آرزو کہ خاک شدہ! مراعات یافتہ حکمران ٹولہ مزدور طبقے کی پیٹھ سے اترنے کے علاوہ اس کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ہر سال دس لاکھ مختلف قسم کی اشیاء تیار کرنے والی جدید معیشت کو سماج کی اکثریت کے شعوری کنٹرول اور شرکت کے بغیر مناسب انداز میں منظّم نہیں کیا جا سکتا تھا۔لیکن مزدور جمہوریت پر مبنی نظام متعارف کروانے کا مطلب بیوروکریسی کے اقتدار اور مراعات کا فوری خاتمہ ہوتا جسے وہ قبول نہیں کر سکتی تھی۔

تیس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہم نے وضاحت کی تھی ہر سال روسی مزدوروں کی پیدا کردہ دولت کا 30 سے 50 فیصد حصہ بیوروکریسی کی بدانتظامی، چوری اور بدعنوانی کے ہاتھوں ضائع ہو جاتا ہے۔ 1970ء کی دہائی کے وسط تک اس کی معاشی ترقی کی شرح عالمی معاشی ابھار بلکہ معاشی زوال کے سالوں کے دوران بھی بڑی سرمایہ دار طاقتوں کے مقابلے میں کم ہوگئی۔1979ء میں جی ڈی پی میں 0.9 فیصد اضافہ ہوا۔ 1980ء میں 1.5 فیصد اور 82-1981 میں تقریباً 2.5 فیصد اضافہ ہوا۔ بیوروکریسی معیشت کو روکنے کے لیے بریکوں کا کام کر رہی تھی جو دہائیوں سے سست رفتاری کا شکار تھی اور اس کی وجہ طفیلی بوجھ، انتشار یا سیدھی سیدھی تخریب کاری تھی۔

ہر طرف پھیلی ہوئی بدعنوانی اور جرائم کا کینسر سوویت سماج کو اوپر سے نیچے تک گھن کی طرح کھا رہا تھا۔ بیوروکریسی کے ہاتھوں ریاست کی شرمناک لوٹ مار پر کافی کچھ لکھا گیا اور سوویت پریس میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔1984ء میں ماسکو کے مرکزی علاقے کے ایک نہایت اعلیٰ فوڈ سٹور گیسٹر ونوم نمبر 1 کے مینیجر کو بدعنوانی کے الزام میں گولی مار دی گئی۔جب پولیس نے اس کے باغیچے کی کھدائی کی تو اس میں گلے سڑے نوٹوں کی گڈیاں ملیں جنہیں خرچ کرنے کا اسے وقت نہیں ملا تھا۔1970ء کی دہائی کے اواخر تک نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ صرف بال پین اور جینز ہی نہیں بلکہ سٹیل، کوئلہ اور تیل بھی بلیک

مارکیٹ میں ملتے تھے۔ مغرب میں اسے ''متوازی منڈی'' کہا جاتا تھا۔

سوویت پریس میں ایک ڈیپارٹمنٹل سٹور کے منیجر کے کیس کے بارے میں بھی لکھا گیا جس نے پہلے دن اپنے سٹاف کو جمع کر کے اعلان کیا کہ وہ کسی قسم کی چوری، بدعنوانی یا اقربا پروری برداشت نہیں کرے گا اور وصول کی جانے والی اشیا کی صرف سرکاری قیمت ادا کی جائے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر اس سٹور کو دیوالیہ پن کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اسے کوئی بھی شے وصول نہیں ہوئی اور سٹور کے شلیف خالی پڑے تھے۔ منیجر نے اس سے ضروری نتائج اخذ کرتے ہوئے مروجہ طریقہ کار اختیار کر لیا۔ اس قسم کی لاکھوں مثالیں موجود تھیں۔

1980ء کی دہائی کے آغاز تک سوویت سماج ایک بند گلی میں پہنچ چکا تھا۔ پورا نوکر شاہانہ نظام تلوار کی نوک پر کھڑا تھا۔ نہ صرف سماجی تعلقات بلکہ صنعت کی ترقی میں بھی۔ سوویت یونین کی معاشی بنیاد اور اس کی نوکر شاہانہ قیادت کے کردار کے درمیان تضادات اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ حکمران بیوروکریسی سمت کے تعین کے حوالے سے کئی شاخوں میں منقسم ہو چکی تھی۔ 81-1980ء میں پولینڈ میں سالیڈیریٹی کے گرد ابھرنے والی مزدوروں کی عوامی تحریک اپنے واضح انقلابی امکانات کے باعث ان عوامل کے حوالے سے ایک تنبیہہ کا درجہ رکھتی تھی جو کوئی قدم نہ اٹھانے کی وجہ سے روس میں رونما ہو سکتے تھے۔ یہاں تک کہ عمر رسیدہ برژنیف بھی اس بڑھتے ہوئے عدم اطمینان کو ختم کرنے کی امید میں نام نہاد سوویت ٹریڈ یونین قیادت کو لعنت ملامت کرنے لگا وہ مزدوروں کے مفادات کی ''نمائندگی'' نہیں کر رہی۔ حکمران ٹولہ واضح طور پر پریشانی میں مبتلا تھا۔

نظام کی کہنہ سالی کی عکاسی اس کے بڑھاپے کی بیماریوں کا شکار قیادت کرتی تھی جو ایک مذاق بن گیا تھا۔ برژنیف کو کریملن کے ڈاکٹروں اور سپیشلسٹوں نے مصنوعی طور پر زندہ رکھا حالانکہ وہ چلتی پھرتی لاش تھا۔ یہ کوئی حادثاتی امر نہیں تھا۔ حکمران ٹولے میں گہری تقسیم موجود تھی اور وہ مستقبل کے بارے میں پریشان تھا۔ انہیں خوف تھا کہ برژنیف کی موت سیلاب کی راہ ہموار کر دے گی۔ جب آخر کار وہ اگلے جہاں سدھارا تو انہوں نے پیرانہ سالی کی بیماریوں کا شکار ایک اور بوڑھے کونسٹنٹن چیرننکو کے انتخاب پر سمجھوتہ کر لیا۔ لیکن وہ بھی انہیں جلد ہی داغ مفارقت دے گیا۔ یوری آندروپوف کے کے جی بی کے پس منظر کی وجہ سے قدرے زیادہ قدر آور شخصیت کا حامل شخص دکھائی دیتا تھا۔ متناقض طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کا حقیقت سے زیادہ قریبی رابطہ ہے کیونکہ آمرانہ ریاست میں صرف خفیہ پولیس والوں کے پاس

ہی بہتر معلومات ہوتی ہیں۔اس بات کا امکان ہے کہ اسے صورتحال کی سنگینی کا احساس تھا اور وہ اوپر سے کسی قسم کی اصلاحات نافذ کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔لیکن آندروپوف بھی غیر متوقع طور پر فوت ہو گیا اور اس کا قدرے جوان متوسل میخائل گورباچوف اس کی جگہ مسند نشین ہوا۔

حکمران ٹولے کا یہ قابل ترین نمائندہ بحیثیت مجموعی حکمران ٹولے کے اقتدار اور مراعات کے تحفظ کی خاطر اسی بیوروکریسی کے ایک حصے کے خلاف ضربات لگانے کو تیار تھا جس پر اسی کا انحصار تھا۔اسی طرح سے روسی زارشاہی نے بھی ایک صدی سے زیادہ عرصے تک 1861ء میں دی جانے والی غلام کسانوں کی آزادی جیسی انتظامی اصلاحات کے ذریعے خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔اس نظام نے طبقات کے درمیان توازن قائم رکھتے ہوئے بعض اوقات بیوروکریسی کے کچھ حصوں اور خواص کے مفادات پر حملے کیے اور یہاں تک کہ ایسا کرنے کے لیے ''عوام'' کا سہارا لینے کی بھی کوشش کی۔

1985ء میں پارٹی سیکرٹری کے طور پر گورباچوف کا انتخاب ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ گورباچوف نے کمیونسٹ پارٹی کی ستائیسویں کانگریس اور جنوری 1987ء میں سنٹرل کمیٹی میں جو تقریریں کیں وہ اس عمل میں ایک نئے مرحلے کی غمازی کرتی تھیں۔بدعنوانی، ضیاع اور نااہلی کے خلاف کریملن قیادت کی تقریریں کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن گورباچوف کی اصلاحات پچھلے تیس سال کے کسی بھی اقدام سے بڑھ کر تھیں۔اس نے معیشت پر سے بالخصوص اور روسی سماج پر سے بالعموم شاہی کی گرفت کم کرنے کا مطالبہ کیا۔گورباچوف نے زیادہ ''جمہوریت'' کی وکالت کی یعنی بعض مخصوص شرائط کے تحت فیکٹری منیجروں کا انتخاب، کمیونسٹ پارٹی کے اندر انتخابات اور اسی طرح کی دیگر اصلاحات، معیشت پر سے جکڑ بندی ختم کرنے اور معاشی ترقی کو مہمیز دینے کے لیے سٹالنسٹ نظام میں اصلاحات کی ان کوششوں کو ضروری خیال کیا جا رہا تھا۔اس عمل کو گلاسناسٹ اور پریسٹرائیکا کا نام دیا گیا۔ان مطالبات کا حقیقی مزدور جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں تھا جو نوکر شاہانہ نظام سے کوئی میل نہیں رکھتی بلکہ ان کا مقصد جمود کی شکار سوویت معیشت کی بدترین رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔سوویت معیشت کا بحران، بیوروکریسی میں پڑی ہوئی پھوٹ جس کی یہ ''اصلاح'' پر مبنی اقدامات نمائندگی کرتے تھے، سوویت یونین کے اس پر آشوب دور کی علامات تھیں۔نظام کی اصلاح کی مہم کے دوران گورباچوف نے سوویت یونین کی تمام ریاستوں میں موجود بدعنوانی، جرائم اور بے اطمینانی کے کھولتے ہوئے دیگچے سے جزوی طور پر ڈھکنا ہٹا دیا۔گورباچوف کو احساس تھا کہ سماجی دھماکے کا خطرہ مول لیے بغیر صورت حال کو جاری نہیں رکھا جا سکتا۔سوویت سماج میں

بے انتہا بے چینی پھیل چکی تھی۔ سوویت ذرائع ابلاغ میں بدعنوانی کی ہزاروں مثالیں پیش کی جا چکی تھیں۔

27 ویں پارٹی کانگریس میں رپورٹ پیش کرتے ہوئے گورباچوف نے بجا طور شیخی بگھاری کہ پچھلے پچیس سال میں ''ہماری معیشت کے پیداواری اثاثوں میں سات گنا اضافہ ہوا۔ ہزاروں کی تعداد میں نئے ادارے تعمیر کیے گئے اور نئی صنعتیں لگائی گئیں۔ قومی آمدنی میں 300 فیصد، صنعتی پیداوار میں 400 فیصد اور زراعت میں 70 فیصد اضافہ ہوا۔ جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد کچھ سالوں میں امریکی معیشت کی سطح کا حصول مشکل نظر آتا تھا لیکن 1970ء کی دہائی کے شروع میں ہمارے لیے سائنسی، ٹیکنیکی اور معاشی حوالے سے اس کے بہت حد تک قریب ہونا اور بعض کلیدی اشیا کی پیداوار میں اس پر برتری لے جانا ممکن ہوا۔ یہ پیش رفتیں عوام کی بے پناہ کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ان سے ہم روسی شہریوں کی خوشحالی میں خاطر خواہ اضافہ کرنے کے قابل ہوئے۔''

تاہم گورباچوف یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ ''اس کے ساتھ ہی ساتھ 1970ء کی دہائی میں مشکلات پیدا ہونا شروع ہو گئیں اور معاشی ترقی کی شرح میں واضح طور پر کمی ہونے لگی۔ اس کے نتیجے میں سی پی ایس یو پروگرام میں مقرر کیے گئے اہداف اور یہاں تک کہ نویں اور دسویں پانچ سالہ منصوبوں کے کمتر اہداف کو بھی حاصل نہ کیا جا سکا۔ نہ ہی ہم اس عرصے کے لیے طے کیے گئے سماجی پروگرام پر ہی مکمل طور پر عمل درآمد کر سکے۔ سائنس، تعلیم، صحت، کلچر اور روزمرہ خدمات کی مادی بنیاد پچھڑنے لگی، زبردست وسائل کی حامل معیشت قلتوں کا شکار ہو گئی۔ سماج کی ضروریات اور پیداوار کی حاصل کردہ سطح میں موثر طلب اور اشیا کی رسد میں ایک خلیج پیدا ہو گئی۔''

گورباچوف نے زرعی شعبے میں بیوروکریسی کے ہاتھوں ہونے والے شدید ضیاع پر سے بھی پردہ اٹھایا ''فصلوں کی کٹائی، ٹرانسپورٹ ذخیرہ کرنے اور پروسیسنگ کے دوران ہونے والے نقصانات میں کمی کرنے سے فوری طور پر خوراک کے ذخائر میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے پاس زبردست امکانات موجود ہیں، ہمارے صارفانہ وسائل میں 20 فیصد تک اضافہ ہو سکتا ہے اور بعض اشیا کے سلسلے میں یہ اضافہ 30 فیصد تک بھی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ازیں نقصانات کو ختم کرنے پر اسی قدر پیداوار حاصل کرنے کے مقابلے میں ایک تہائی سے کچھ ہی زیادہ لاگت آئے گی۔''

آخر میں اس نے کہا ''آج پارٹی اور سارے عوام کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ معاشی ترقی کی راہ میں حائل نامناسب رجحانات کا رخ یکسر تبدیل کر دیا جائے، اسے مناسب تحریک دی جائے اور عوام کی تخلیقی

صلاحیتوں، پہل گامی اور حقیقی انقلابی تبدیلی کے لیے مواقع پیدا کیے جائیں۔''

مزدوروں کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے بیوروکریسی پر آمرانہ حملے کیے گئے:

''کنٹرول کے ڈھیلے ہونے اور کئی دیگر وجوہات کی بنا پر ایک واضح مالکانہ ذہنیت رکھنے والے افراد کے گروہ ظاہر ہو گئے ہیں جن کا سماج کے بارے میں رویہ حقارت آمیز ہے۔ مزدور طبقے نے بجا طور پر ایسی چیزوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا سوال اٹھایا ہے۔ مستقبل قریب میں ایسے اضافی اقدامات کا اٹھایا جانا ضروری خیال کیا جا رہا ہے جن کے ذریعے طفیلیوں، سوشلسٹ ملکیت کو لوٹنے والوں، رشوت خوروں اور ایسے تمام دیگر افراد کا قلع قمع کیا جا سکے جو ایک ایسے راستے پر چل رہے ہیں جو ہمارے نظام کے کام پر مبنی فطرت سے میل نہیں کھاتا۔'' مزید یہ کہ ''ہم بجا طور پر ہر قسم کی کوتاہیوں اور ان کے ذمہ دار افراد پر برہم ہیں یعنی کرائے کے مصنفین، کاہل، غاصب، گمنام خطوط لکھنے والے، چھوٹے بیوروکریٹ اور رشوت خور۔''(1) اس بات کا اعتراف بھی کیا گیا کہ پارٹی قیادت ''زندگی سے رابطہ کھو چکی ہے'' اور یہ کہ وہ ''خوشامد اور اعلیٰ شخصیات کی بے لگام تعریفوں'' (2) کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔

محتاط انداز میں اوپر سے آغاز کرتے ہوئے گورباچوف نے کسی حد تک تنقید کی آزادی کی حوصلہ افزائی کی لیکن ہمیشہ طے شدہ حدود کے اندر۔ سوویت پریس ان غنڈوں کی حرص و ہوس کی داستانوں سے بھرا پڑا تھا جن کے پاس سرکاری گاڑیاں تھیں، جو بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرتے تھے اور جن کے اخراجات پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ غلامانہ انداز میں بیرونی کمیونسٹ پارٹیوں کے اخبارات میں یہ کہانیاں بلا تبصرہ شائع کی گئیں۔ یہ لوگ کئی دہائیوں تک سٹالن کے ہر جرم کو جائز قرار دیتے اور سوویت یونین میں ''سوشلزم کے معجزوں'' کا ذکر کرتے رہے تھے اور اب یہی لوگ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ بالکل متضاد باتیں کر رہے تھے۔

گورباچوف اور سٹالن

یہ بات کم لوگوں کو یاد ہو گی کہ بذاتِ خود سٹالن نے بھی بیوروکریسی کے خلاف ضربات لگانے کیلئے عوام کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی۔ پہلے دو پانچ سالہ منصوبوں کے دوران سٹالن بیوروکریٹوں کی حرص پر قابو پانے کی کوشش کرنے پر مجبور ہو گیا جو مزدور طبقے کی پیدا کردہ قدرِ زائد کے بڑے حصے کو ہضم کرنا شروع

ہو گئے تھے۔سٹالن کا ارادہ تھا کہ خفیہ رائے شماری کے ذریعے اپنی ہی افسر شاہی کو دبائے۔ بورژوا پارلیمنٹ کی نقالی کی گئی مگر اس میں صرف ایک ہی پارٹی تھی جو ظاہر ہے کہ ایک سوانگ تھا۔ اگر ایک سے زیادہ امیدوار کھڑے بھی ہوتے تو صرف وہی امیدوار کامیاب ہوتا ہے جسے پارٹی کی حمایت وقبولیت حاصل ہوتی۔ تاہم سٹالن کو یہ اصلاحات عملاً نافذ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں انقلاب سپین کے بعد وہ اصلاحات کا ارادہ ترک کر کے تطہیرات پر کمر بستہ ہو گیا۔ اہلکاروں کی حرص وطمع کو قابو میں رکھنے کا صرف ایک طریقہ باقی بچا تھا اور وہ تھا پولیس کا جبر اور دہشت۔ مگر اس سے ایک نئی اور زیادہ خوفناک بدعنوانی جنم لیتی ہے جو سماج کو منتشر اور غیر منظّم کر کے سوشلزم سے قریب تر لانے کی بجائے اس مقصد سے دور لے جاتی ہے۔

ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ کس طرح بظاہر جمہوری دکھائی دینے والا سٹالن کا آئین درحقیقت ''بیوروکریسی کے خلاف کوڑے'' کی طرح استعمال کے ارادے سے بنایا گیا تھا۔ دیگر باتوں کے علاوہ بوناپارٹسٹ حکمرانی کا مقصد مختلف گروہوں اور طبقات کے درمیان توازن قائم کرنا ہوتا ہے یعنی ایک دھڑے کو دوسرے دھڑے کے خلاف استعمال کرتے ہوئے مزدوروں، کسانوں اور بذات خود بیوروکریٹوں کے درمیان توازن کا قیام۔ اسی طرح گورباچوف کو نوکر شاہی ٹولے کے ایک حصے کے خلاف ضربات لگانے کے لیے جس نے ریاست اور معیشت پر اپنی طفیلی گرفت کے باعث بہت کچھ حاصل کر لیا تھا مزدور طبقے کا سہارا لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ گورباچوف اوپر سے نپی تلی اصلاحات نافذ کرنا چاہتا تھا مگر جیسا کہ ہم نے اس وقت کہا تھا کہ یہ ایک ناممکن امر تھا۔ بیوروکریسی کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی تمام دبی ہوئی قوتیں آزاد ہو گئیں۔

1930ء کی دہائی میں مزدور طبقہ روسی سماج کا بیس فیصد تھا جب کہ 1980ء کی دہائی کے وسط تک یہ تقریباً ستر فیصد ہو چکا تھا۔ روس اب ایک پس ماندہ ملک نہیں رہا تھا بلکہ یہ ایک جدید معیشت کا حامل ملک تھا جس کا مزدور طبقہ دنیا بھر میں سب سے بڑا تھا۔ یہ اصلاحات مزدور طبقے کو آزادانہ طور پر متحرک ہونے پر اکسا سکتی تھیں۔ گورباچوف کے مقاصد کی محدود نوعیت سے قطع نظر یہ عوام کو متحرک کر سکتے تھے۔ اگر ایک بار مزدور کسی حد تک کنٹرول حاصل کر لیتے تو وہ ناگزیر طور پر مزدور جمہوریت کی راہ اختیار کرتے اور پوچھتے کہ بیوروکریسی نگرانی کی اجرتوں سے زیادہ کیوں وصول کرتی ہے؟ بیوروکریسی کے لیے مراعات، دیہی رہائش گاہیں، خصوصی کاریں، خوراک کی خصوصی دکانیں وغیرہ وغیرہ کیوں ضروری ہیں؟

جنہیں صرف پارٹی اور ریاست کے اعلیٰ اہل کار ہی استعمال کر سکتے ہیں؟

شیر کی پشت پر سواری کرنے والے شخص کے لیے اس سے اترنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ ایک بار یہ نام نہاد اصلاحات شروع کرنے کے بعد گورباچوف کے لیے اپنے جاری کردہ عمل کو ختم کرنا ناممکن ہو گیا۔ گورباچوف نے بھی سٹالن کی طرح سارے نظام کے گناہوں کا ازالہ کرنے کے لیے نچلے، درمیانے اور یہاں تک کہ بعض اعلیٰ بیوروکریٹوں کو بھی قربانی کا بکرا بناتے ہوئے ان کے خلاف اقدامات کیے۔ اس طرح گورباچوف نے پارٹی کے 156 علاقائی عہدیداران میں سے 46 کو اپنے اقتدار کے پہلے گیارہ ماہ میں بے دخل کر دیا۔

ان اصلاحات کی تہہ میں یہ مقصد کارفرما تھا کہ لاگتی کارگزاری کے ذریعے مزدوروں کی پیداواری کارکردگی میں اضافہ کیا جائے۔ حکومت کو امید تھی کہ سختی اور ترغیب کو یکجا کر کے سوویت مزدوروں سے زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ گورباچوف نے سٹاخانوازم کے پرانے سٹالنسٹ طریقہ کار کا از سر نو اجرا کرنے کی بھی کوشش کی جو ایک ایسے مزدور کے نام سے منسوب ہے جو مبینہ طور پر ایک شفٹ میں ایک سوٹن کوئلہ پیدا کرتا تھا، یعنی معمول سے چھ گنا زیادہ! یہ نتائج کی بنیاد پر ادائیگی کے اس شدید استحصالی طریقہ کار کی انتہائی شدید شکل تھی جسے امریکہ میں (ٹیلرازم) کہا جاتا تھا۔ سٹالن کے دور میں مزدوروں کے خصوصی جتھے تشکیل دیئے گئے تھے جن کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ پیداوار کے معمول کی غیر معمولی طور پر اونچی شرحیں قائم کریں۔

ٹراٹسکی نے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس وقت عوام کی نسبت خصوصی مزدوروں پر مبنی اقلیت کو تحریک دینا زیادہ آسان تھا لیکن اس نے اس تضاد کی بھی وضاحت کی کہ کس طرح بزعم خود ''سوشلزم کی تعمیر'' کا دعویٰ کرنے والا سماج سرمایہ داری کی بدترین استحصالی صورتوں کی نقالی کرتا تھا۔ اس کی وجہ سے مساوات کی جانب پیش قدمی کی بجائے مزدور طبقے کے اندر ایک مراعات یافتہ پرت قائم ہوئی۔ اگرچہ ان خصوصی مزدوروں (سٹیخانوائٹس) میں سے کچھ ایمان دار بھی تھے لیکن ان کی اکثریت کیریئراسٹ اور خوشامدی تھی، مزدوران سے نفرت کرتے تھے۔ 1930ء کی دہائی میں بھی یہ پیچھے کی جانب قدم تھا۔ لیکن اگر اسے ایک جدید معیشت کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو جس کے بارے میں مفروضہ قائم کیا گیا تھا کہ وہ ''کمیونزم'' کی جانب رواں دواں ہے تو یہ تضاد اور بھی شدید لگتا ہے۔

ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ ''سوویت نظام کے تحت بھی اجرتی مزدور کے ماتھے سے غلامی کا

ذلت آمیز داغ مٹ نہیں جاتا۔ کام کے مطابق ادائیگی حقیقت میں جسمانی مشقت اور بالخصوص غیر ہنرمند کے مقابلے میں دماغی کام کرنے والے کو زیادہ ادائیگی، اکثریت کے لیے ناانصافی، جبر اور مجبوریوں کا جب کہ ایک قلیل تعداد کے لیے مراعات اور خوشحال زندگی کا سرچشمہ ہے۔''

ٹراٹسکی آگے چل کر لکھتا ہے ''اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کی بجائے کہ سوویت یونین میں اجرت اور تقسیم کے بورژوا اصول ابھی تک نافذ العمل ہیں آئین (سٹالن کا متعارف کردہ 1936ء کا آئین) کے مصنفین نے اس اٹوٹ مارکسی اصول کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ دوسرے حصے کو غیر معینہ عرصے کے لیے التوا میں ڈالتے ہوئے پہلے کی حقیقت کا روپ دھار چکنے کا اعلان کر کے اسے میکانکی انداز میں کام کی مقدار کی مناسبت سے ادائیگی کے سرمایہ دارانہ اصول سے منسلک کرتے ہوئے 'سوشلزم کے اصول' کا نام دے کر اس جھوٹ پر آئین کا ڈھانچہ تعمیر کر لیا!''

ٹراٹسکی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے ''ساتھ ہی ساتھ، اور یہ کوئی غیر اہم بات نہیں ہے کہ قانون کے ذریعے کسان مزدور یا دفتری مزدور کی جھونپڑی، گائے اور گھریلو ساز و سامان کو تحفظ دے کر بیوروکریٹ کی شہری رہائش گاہ، سمر ہاؤس، گاڑی اور ذاتی استعمال و آسائش کی ان تمام اشیا کو بھی قانونی تحفظ فراہم کر دیا گیا جو اس نے سوشلسٹ اصول کی بنیاد پر حاصل کی ہوتی ہیں یعنی ہر ایک سے اس کی صلاحیتوں کے مطابق ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق۔ نیا بنیادی قانون لازمی طور پر بیوروکریٹ کی گاڑی کا تحفظ کسان کی بیل گاڑی کے مقابلے میں زیادہ موثر طور پر کرے گا۔''(3)

اس تعطل سے نجات حاصل کرنے کے لیے گورباچوف نے مزدوروں سے اپیلیں کر کے اور نوکر شاہی کے بدعنوان ترین عناصر کو عبرت ناک سزائیں دے کر معیشت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ تاہم گورباچوف مزدوروں کے مفادات کی نمائندگی نہیں کرتا تھا۔ اس کی اصلاحات کا مقصد اہل کاروں کی ''غیر قانونی'' مراعات کے خلاف لڑنا اور ''قانونی'' مراعات میں بتدریج اضافہ کرنا تھا۔ اس کے دور حکومت میں آمدنی میں تفریق پہلے سے زیادہ ہو گئی جو لینن کے تصورات سے بالکل برعکس تھی۔

درحقیقت گورباچوف کی تجاویز کا لینن کی جمہوریت یا حقیقی سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بیوروکریسی مزدور طبقے سے خوفزدہ تھی۔ قانونی و غیر قانونی مراعات، رشوت خوری اور چوری میں تخفیف ضروری ہو گئی تھی۔ تاہم ایسا کرتے وقت گورباچوف بنیادی طور پر نوکر شاہانہ ٹولے کی مراعات میں مداخلت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ''جائز'' مراعات میں اگر اضافہ نہیں تو کم از کم انہیں برقرار رکھنا ضروری تھا۔

گورباچوف نے نہایت احتیاط کے ساتھ سٹالن کی اس مسخ شدہ تعریف کو پیش کیا۔ ''ہم سوشلزم کے اس اصول کو مکمل طور پر بحال کر رہے ہیں: ہر ایک سے اس کی قابلیت کے مطابق ہر ایک کو اس کے کام کے مطابق۔'' (4) مارکس کی بنیادی ضابطہ بندی کو جان بوجھ کر مسخ کیا گیا۔ مارکس نے وضاحت کی تھی کہ کمیونزم کے تحت کام کرنا مجبوری نہیں ہوگی بلکہ سماج کا ہر رکن ''اپنی صلاحیت کے مطابق'' حصہ ڈالے گا۔ اس غیر طبقاتی سماج میں اشیا کی اس قدر بہتات ہوگی کہ ہر کوئی ''اپنی ضروریات کے مطابق'' حصہ لے سکے گا۔ اس کا گورباچوف کے عہد کی صورت حال سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اسے محض اس کی پالیسیوں کو خوبصورتی سے پیش کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔

نوکرشاہانہ بدانتظامی

نوکرشاہی کی بدانتظامی نے سوویت معیشت میں ہر طرح کی خرابیوں کو جنم دیا تھا۔ کچھ شعبے نہایت جدید تھے جب کہ دیگر شعبوں کو سرمایہ کاری سے یکسر محروم رکھا گیا تھا۔ مثلاً یورال میں واقع لیکینو بس ساز فیکٹری جو 1970ء میں بھی چالیس سال پرانی مشینوں سے ایک ہی ماڈل بنا رہی تھی۔ اس کے باوجود گورباچوف کا اصرار تھا کہ مزدور معیاری اشیا پیدا کریں بصورت دیگر انہیں سزا کا مستحق قرار دیا جائے۔ لیکن پرانی مشینری، سرخ فیتے اور بدانتظامی کے باعث مقررہ معیار پر پورا اترنا تقریباً ناممکن تھا۔ لہٰذا بہت سے مزدوروں کے لیے پریسٹرائیکا بدتر اجرتوں اور حالات کار کا پیغام ثابت ہوا۔ دراصل مغربی مالکان کی طرح بیوروکریسی بھی بحران سے نکلنے کے لیے مزدوروں پر دباؤ بڑھا رہی تھی، یعنی مزدور کے خون پسینے کی قیمت پر پیداوار بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

یہ بات بڑی اہم ہے کہ گورباچوف نے اپنی کتاب ''پریسٹرائیکا'' میں صرف ایک بار کسی نظری سوال پر قلم اٹھایا اور وہ بھی اجرتوں میں تفریق کو جائز اور سوشلزم کی روح کے مطابق قرار دینے کے لیے! غربت، محرومی اور پسماندگی کے حالات میں جب مزدور طبقہ نیم خواندہ اور کسان ناخواندہ تھے بالشویک بورژوا ماہرین کو بڑی بڑی تنخواہیں ادا کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن لینن اور ٹراٹسکی کے نزدیک ایک جدید معیشت کے تحت ایسی عدم مساوات کو برداشت کرنا، ناقابل معافی جرم ہوتا۔ لینن کا خیال تھا کہ جوں جوں سوویت معیشت ترقی کرے گی یہ عدم مساوات بتدریج کم ہوتی جائے گی۔ سوویت یونین کے ایک جدید صنعتی ملک

بننے کے بعد جس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ مزدور طبقہ موجود تھا اس قسم کی تفریق کا موجود ہونا سوشلسٹ دشمنی اور مارکسسٹ دشمنی کے مترادف تھا۔اس کے باوجود اکتوبر انقلاب کے 70 سال بعد یہ ناہمواری کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی تھی۔لینن کے نقطہ نظر کے مطابق تفریق کے بتدریج خاتمے اور زیادہ سے زیادہ مساوات کی بجائے گورباچوف اس تفریق میں اضافہ کر رہا تھا۔سٹالن کی طرح گورباچوف نے بھی مزدور اشرافیہ کی ایک خصوصی مراعات یافتہ پرت، جسے پیداوار سے منسلک خصوصی تنخواہیں ملتی تھیں، تشکیل دے کر بیوروکریسی کی بنیاد کو وسیع کرنے کی کوشش کی۔مسئلہ یہ ہوا کہ تفریق میں اضافہ ہونے ،مزدور کو مزدور اور فیکٹری کو فیکٹری کے خلاف کھڑا کرنے سے رنجشوں کی آگ کو مزید ہوا ملی۔یہ کوئی حادثاتی امر نہیں تھا کہ اکتوبر انقلاب کی سالگرہ پر تقریر کرتے ہوئے گورباچوف نے کہا کہ اس کی اصلاحات کی مخالفت نہ صرف بیوروکریسی بلکہ اجتماعی محنت گاہوں میں بھی ہو رہی ہے۔یہ اس بات کی علامت تھی کہ بیوروکریسی ان بڑھتی ہوئی ہڑتالوں سے جن کا پہلی بار اخبارات میں وسیع پیمانے پر ذکر ہو رہا تھا خطرہ محسوس کر رہی ہے۔مثال کے طور لیکینو بس ساز فیکٹری میں مزدوروں نے بونسوں کی عدم ادائیگی کے باعث تنخواہوں میں ہونے والی 70-60 روبل کی کمی کے خلاف احتجاج کے طور پر تین دن تک ہڑتال کی۔سوشلزم کی جانب پیش قدمی کا مطلب ناہمواری میں کمی ہونا چاہیے نہ کہ اسے تقویت دینا جیسا کہ گورباچوف کر رہا تھا۔لہٰذا ایک ایسی صورت میں سوویت یونین میں ''سوشلزم'' کے حصول کی دلیل مضحکہ خیز تھی جب ریاست خوفناک حد تک وسعت اختیار کر چکی تھی۔اس کے باوجود دنیا بھر میں سٹالنسٹ قیادتوں اور بائیں بازوں کے اصلاح پسندوں نے ''جمہوری سوشلزم'' پیش کرنے پر گورباچوف کی تعریف کی۔

تاہم سوویت یونین اب لینن کے زمانے کا کمزور، غربت زدہ اور جنگ کا شکار ملک نہیں رہا تھا۔جیسا کہ گورباچوف نے خود ذکر کیا تھا کہ سوویت یونین اب ایک وسیع اور دولت مند ملک تھا۔اگر مزدور واقعی ریاست، صنعت اور سماج کا نظم ونسق سنبھال لیتے تو نوکر شاہی کی پیدا کردہ رکاوٹیں فوراً ہی دور ہو جاتیں۔بیوروکریسی کے مردہ ہاتھ کی گرفت سے آزاد ہو کر منصوبہ بند معیشت تیز رفتاری سے آگے بڑھتی۔عوام کے جوش وخروش اور پہل گامی کی بنیاد پر ایک ہی پانچ سالہ منصوبے کے دوران سماج کی دولت میں بہت اضافہ کیا جا سکتا تھا۔

1919ء میں سیکسونی اور بویریا میں مزدوروں کے اقتدار پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد لینن نے ان سے اپیل کی کہ کام کے اوقات کو کم کر کے سات گھنٹے روزانہ کر دیا جائے تاکہ مزدور صنعت اور ریاست کو

چلانے میں حصہ لے سکیں۔ گورباچوف کا دعویٰ تھا کہ وہ لینن کے تصورات کی طرف واپسی چاہتا ہے لیکن درحقیت میں حقیقی لینن ازم سے اسی قدر دور تھا جس قدر سٹالن۔ اگر روسی مزدوروں اور کسانوں سے اپیل کی جاتی کہ وہ سماج اور صنعت کا نظم ونسق اپنے ہاتھوں میں لے لیں تو اوقات کار میں فوری کمی ممکن ہوسکتی تھی جو حقیقی مزدور جمہوریت پر مبنی نظام کی شرط اولین ہے۔

یہ بات آج بھی درست ہے۔ اگر چہ مافیا سرمایہ داری کے پیدا کردہ گھناؤنے انتشار کے باعث ممکن ہے کہ ابتدائی پیش رفت ان حقیقی امکانات کے مقابلے میں سست رفتار ہو جو منصوبہ بند معیشت نے تخلیق کیے تھے۔ لیکن عوام کی شرکت اور جمہوری کنٹرول کے تحت ایک یا زیادہ سے زیادہ دو پانچ سالہ منصوبوں میں تمام صورت حال تبدیل ہو جائے گی۔ ترقی کی موجودہ سطح کے پیش نظر ہی 32 گھنٹے پر مشتمل کام کا ہفتہ متعارف کروایا جاسکتا ہے جس میں جلد ہی مزید کمی کی جاسکتی ہے۔ ایسے اقدامات سے نہ صرف روس بلکہ تمام دنیا میں صورت حال تبدیل ہوسکتی ہے۔

گزشتہ چھ یا سات دہائیوں میں روس کے اندر سوشلزم کی جانب پیش رفت کے آغاز کے لیے مادی حالات تیار ہو چکے تھے۔ درحقیقت اب سوشلزم کی جانب پیش رفت کے لیے درکار وہ سائنسی اور ٹیکنیکی وسائل دستیاب تھے جو 1917ء میں موجود نہیں تھے۔ انتہائی قدامت پسندانہ اندازوں کے مطابق بھی ان حالات میں 1980ء کی دہائی کی سوویت معیشت اس وقت کی شرح ترقی سے دو یا تین گنا بہتر شرح ترقی حاصل کرسکتی تھی جو سرمایہ داری کے تحت ممکن بہتر نتائج سے کہیں بڑھ کر ہوتی۔ مسلسل کوشش سے دس سال کے اندر سوویت یونین نہ صرف مجموعی پیداوار کے حوالے سے امریکہ کو پیچھے چھوڑ دیتا بلکہ مزدوروں کی پیداواری کارکردگی کے حوالے سے بھی، جو کہ معاشی ترقی کی سب سے بنیادی علامت ہے۔ اس بنیاد پر سوشلزم کی جانب پیش رفت حقیقی معنوں میں ممکن ہو جاتی جس سے فنون لطیفہ، سائنس اور ٹیکنیک کو بے مثال فروغ حاصل ہوتا۔

گورباچوف کا پیش کردہ حل یہ تھا کہ ''نظم ونسق کو جمہوری بنایا جائے، اس میں اجتماعی کام کے اداروں کے کردار کو بڑھایا جائے، نیچے سے کنٹرول کو مضبوط کیا جائے اور معاشی اداروں کے کام کی پبلسٹی کی جائے اور ان کے احتساب کو یقینی بنایا جائے۔'' مگر اس کے اعلان کردہ ارادے محض خالی خطاب ثابت ہوئے کیونکہ اس سمت میں کوئی بھی سنجیدہ قدم نوکرشاہانہ غلبے کے خلاف ضرب کاری لگانے کے مترادف ہوتا۔ اس کا ارادہ کسی بھی صورت میں اس حد تک جانے کا نہیں تھا۔ تبدیلیاں محض ظاہری تھیں۔ اگر چہ کچھ

فیصلوں میں شامل کرنے کی غرض سے ایک خاص حد تک مزدوروں سے صلاح مشورے کی اجازت دے دی گئی تھی مگر مزدوروں کے حقیقی کنٹرول اور انتظام کو متعارف نہیں کروایا گیا۔اس کے باوجود گورباچوف نے اپنی جذبات انگیز خطابت کو جاری کہا:

''منتخب اداروں کو اپنی مشینری کی جانب زیادہ سخت رویہ اپنانا چاہیے۔ہم اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کر سکتے کہ طویل عرصہ تک اپنے عہدوں پر فائز رہنے والے ایگزیکٹو حضرات میں جدت طرازی کی کمی واقع ہونے لگتی ہے، وہ خود ساختہ اداروں کے ذریعے خود کو عوام سے دور کرنے لگتے ہیں اور یہاں تک کہ بعض اوقات ان منتخب اداروں کے کام میں سے خارج ہونے لگتے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ایک ایسا لائحہ عمل بنایا جائے جس کے ذریعے سوویتیں اور سبھی سماجی ادارے اس قابل ہوسکیں کہ ہر انتخاب کے بعد ذمہ دار ایگزیکٹو حضرات کے کام کا جائزہ لینے اور تصدیق کرنے کے بعد عملے کے افراد کو تبدیل کر سکیں۔''

''ہمارے عہد میں ملک کا انتظام چلانے کے لیے سماجی تنظیموں کی زیادہ سے زیادہ سرگرم شرکت ضروری ہوگئی ہے۔تاہم جب ہم اپنی سماجی تنظیموں کے کام کا اس زاویئے سے جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان میں اکثر مناسب پہل گامی کی صلاحیت سے محروم ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے کچھ نوکر شاہانہ انداز میں ایک باقاعدہ سٹاف کے ذریعے کام کرتی ہیں اور عوام پر بہت کم انحصار کرتی ہیں۔دوسرے لفظوں میں عوامی اجتماعیت یعنی سماجی تنظیموں کے آزادانہ کردار کو حقیقت کا روپ نہیں دیا جارہا۔''

27 ویں پارٹی کانگریس میں گورباچوف نے تقریر کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ تمام ٹیم لیڈروں کے لیے انتخابی اصول پر عمل کیا جائے اور پھر اسے بتدریج انتظامی عملے کے کچھ اور درجوں تک وسیع کیا جائے مثلاً فورمین ، شفٹ، سیکٹریا شاپ سپرنٹنڈنٹ اور ریاستی فارموں کے منیجر۔ وہ معیشت کو آگے بڑھانے کے لیے آخری حدود تک جارہا تھا لیکن وہ آگ سے کھیل رہا تھا۔ جہاں تک مزدوروں کا تعلق ہے تو ایک بار ''انتخاب'' کو متعارف کروانے کے بعد اس کا اختتام کہاں ہوتا؟

یہ حقیقت کہ جنوری 1987ء میں اسے اپنی تقریر میں ''کمیونسٹ'' پارٹی کے تمام عہدوں کے لیے انتخاب کا سوال اٹھانے پر مجبور ہونا پڑا۔یہ بات اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ فورمینوں وغیرہ کے انتخاب کے سلسلے میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بیوروکریسی نے اس نام نہاد اصول کا راستہ بند کر دیا۔

گورباچوف ان ''اصلاحات'' کو بذات خود پارٹی کی بیوروکریسی کے خلاف کوڑے کی طرح استعمال کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ سوویت سماج کی حقیقی صورت حال کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ گورباچوف نے بے فکری سے سٹالن کی طرح خفیہ بیلٹ کو پارٹی کی نچلی سے اعلیٰ ترین سطحوں کے انتخابات میں استعمال کرنے کی کوشش کی تاکہ بیوروکریسی کے زیادہ رجعتی حصوں کی حوصلہ شکنی کی جاسکے جو سوویت ریاست کی بلاروک ٹوک لوٹ ماری کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔

ٹراٹسکی وضاحت کرتا ہے ''سرمایہ دارانہ سماج میں خفیہ بیلٹ کا مقصد استحصالیوں کی دہشت کے خلاف استحصال زدگان کا دفاع کرنا ہوتا ہے۔ اگر عوامی دباؤ کے تحت بورژوازی آخر کار ایسی اصلاح نافذ کرنے پر مجبور ہو بھی گئی تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ اپنی ریاست کو کم از کم اس پست حوصلے سے جزوی طور پر نجات دلانے میں دلچسپی رکھتی تھی جو اس نے خود متعارف کروائی تھی۔ لیکن بظاہر کسی سوشلسٹ سماج میں استحصالیوں کی کوئی دہشت نہیں ہوسکتی۔''

''سوویت شہریوں کا کس کے خلاف دفاع کرنا ضروری ہے؟ جواب واضح ہے بیوروکریسی سے۔ سٹالن کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتا ہے۔ اس سوال کے جواب میں کہ خفیہ انتخابات کیوں ضروری ہیں اس نے حرف بہ حرف یہ بات کہی: کیونکہ ہم سوویت عوام کو یہ آزادی دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان لوگوں کو ووٹ دیں جنہیں وہ منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا آج ایک معتبر ذریعے سے انسانیت کو یہ علم ہوا ہے کہ ابھی سوویت عوام ان لوگوں کو ووٹ نہیں دے سکتے جنہیں وہ منتخب کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا جلد بازی ہوگی کہ نیا آئین مستقبل میں واقع انہیں یہ موقع فراہم کرے گا۔'' (5)

نوکرشاہانہ نظام اپنے جوہر کے حوالے سے گورباچوف کے زمانے میں بھی ویسا ہی رہا جیسا وہ بیوروکریسی کی حکمرانی کے سارے عہد میں رہا تھا۔ بیوروکریسی کے خلاف کوڑا استعمال کرنے کی کوشش کا ناکام ہونا یقینی امر تھا۔ ٹراٹسکی نے لکھا تھا ''یہ عمرانیات کا نہیں بلکہ مادی مفاد کا سوال ہے۔'' معیشت مزدور طبقے کے کنٹرول اور شرکت کے بغیر ترقی نہیں کرسکتی تھی۔ گورباچوف مزدوروں کے کنٹرول اور شراکت کے کچھ عناصر کے ساتھ غلبہ قائم رکھنے کا جوا کھیل رہا تھا۔ تاہم عوام کے جزوی کنٹرول جیسی کوئی چیز وجود نہیں رکھتی۔ یا تو کنٹرول مزدوروں کے ہاتھ میں ہوتا ہے یا اسے واپس لے لیا جاتا ہے۔ جزوی کنٹرول کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔

طفیلی ٹولہ

یہ گورباچوف کی پوزیشن کی بنیادی خامی تھی۔ زیادہ پہل گامی کی حوصلہ افزائی (اور اس طرح مزدوروں سے زیادہ پیداوار کا حصول جس کے ساتھ ساتھ بیوروکریسی کے ٹھاٹھ باٹھ اور مراعات کا دفاع بھی مقصود تھا) ایک ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش تھی۔ سوویت معیشت کو دوبارہ متحرک کرنے، بدعنوانی کے خاتمے اور مزدور طبقے کو ترغیب دینے کے لیے مزدوروں کو منظم ہونے، بحث مباحثہ کرنے اور تنقید کرنے کی آزادی دینا ضروری تھا۔ لیکن یہ ناممکن تھا۔ مزدور جو پہلا سوال اٹھاتے وہ لاکھوں اہل کاروں، ان کی بیگمات، مفت خوروں اور حاشیہ برادروں کی مراعات کی طفیلی نوعیت کے بارے میں ہوتا۔ معاشی نقطہ نظر سے گورباچوف کسی بھی حوالے سے اس استدلال کا جواب نہیں دے سکتا تھا جس کی سیدھی سادھی وجہ یہ ہے کہ وہ حکمران ٹولے کے مادی مفادات کی نمائندگی کرتا تھا۔

19 ملین افراد پر مشتمل بیوروکریسی کا بڑا حصہ وہ لوگ تھے جو بیوروکریٹوں کی اولاد یا ان کی اولاد کی اولاد تھے۔ اب ان میں خصوصی حکمران ذات کی وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو قدیم ہندوستان کی غالب ذات جیسی تھیں یعنی وہ عام مزدوروں کی سوچ اور زندگی سے بہت دور ہو چکے تھے۔ گورباچوف کی عطا کردہ نئی شکل کے باوجود بذات خود بیوروکریسی بہت زیادہ پست حوصلہ، منقسم اور قنوطی ہو چکی تھی۔ ستر سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد اکتوبر انقلاب کی روایات و تصورات سے تمام رابطے منقطع ہو چکے تھے۔ جارج آرویل نے اپنی مشہور کتاب ''جانوروں کا باڑہ'' میں سوروں اور کسانوں کی ایک میٹنگ کی تصویر کشی کی ہے جس میں ایک گروہ کو دوسرے سے ممیّز کرنا ناممکن تھا۔ نوکر شاہانہ حکمرانی کی دو نسلوں نے مراعات یافتہ اہل کاروں کی ایسی پرت پیدا کر دی جو مزدور طبقے اور اکتوبر کے تصورات سے بالکل کٹی ہوئی تھی۔

اپنی بڑی بڑی تنخواہوں اور مراعات کے علاوہ وہ عوام سے بالکل الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے، ان کے لیے خصوصی دکانیں، ہوٹل، ہسپتال اور تفریح گھر تھے اور یہاں تک کہ خصوصی ساحل سمندر بھی تھے۔ ان کی بیگمات کو سردی میں قطاروں میں کھڑا نہیں ہونا پڑتا تھا۔ دیگر شہریوں کے برعکس وہ بیرون ملک سفر کر سکتے تھے، غیر ملکی کرنسی تک رسائی حاصل تھی اور انہیں عیاشی کا وہ سارا سامان ملتا تھا جو باقیوں کے لیے ممنوع تھا۔ اگرچہ سرکاری طور پر اس کا اعتراف نہیں کیا جاتا تھا لیکن غیر ملکی زبانوں کے خصوصی سکولوں کے مہین پردے کے پیچھے پرائیویٹ سکولوں کے ہم پلہ سکول موجود تھے جہاں بیوروکریسی کے

بچوں کی کم وبیش اجارہ داری تھی۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے اس گروہ کے نقطہ نظر کا مزدور طبقے یا سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں تھا:

''یہ انتہائی امیر لوگوں کا گروہ ہے۔ نہایت امیر اور نہایت مراعات یافتہ لوگوں کے بیٹے اور بیٹیاں جن کا کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جو کسی چیز میں یقین نہیں رکھتے (بغاوت میں بھی نہیں) اور جن کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے والدین کے سوچی (Sochi) بنگلوں کو پام بیچ (Palm Beach) کی نقلوں میں تبدیل کر دیں۔ وہ درآمد شدہ یورپی لباس پہنتے ہیں، بے تحاشہ پیتے ہیں، معاشقوں اور زنا کاریوں میں مصروف رہتے ہیں، جوا کھیلتے ہیں اور ڈانس کرتے ہیں۔ عوام کو مویشی اور دانشوروں کو ریاکار اور بیزار کن خیال کرتے ہیں۔ وہ تقریباً سارا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آتے جاتے ہیں لہٰذا یہ بہت کم نظر آتے ہیں۔''(6)

19 فروری 1986ء کو شائع ہونے والے گارجین میں لکھا ہے ''لیکن پارٹی کے خواص کے ان بچوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ عام سیاست کے حوالے سے بھی یہ ایک نئے طبقے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اور ان کے بچے بھی اب مراعات یافتہ سکولوں میں جا رہے ہیں۔ آج ایک سوویت مڈل کلاس موجود ہے، شائستہ اور نفیس، جن میں پرانے باہمی مراسم موجود ہیں اور جو نومن کلچر سے بالکل الگ تھلگ ہے۔''

خواص کا عیاشانہ طرز زندگی کوئی راز نہیں تھا۔ گرانوفسکی سٹریٹ میں موجود خصوصی کریملن سپر مارکیٹ، خصوصی کریملن کلینک کے بالکل ساتھ واقع تھی۔ اسی مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے ''پارٹی کے اعلیٰ اہلکاروں کے لیے مخصوص ہسپتالوں کی رسائی مغربی ادویات تک ہے، ان کے پاس دیہی جاگیریں ہیں اور پرتعیش فلیٹس ہیں جو انہیں ملازمتوں کے طفیل ملتے ہیں۔''

''وہ (برژنیف) تسلیم کرتا تھا کہ وہ ایک خوشحال زندگی بسر کرتا ہے مگر اس کی تنخواہ ایک اعلیٰ فیکٹری منیجر سے زیادہ نہیں ہے جسے بونس وغیرہ شامل کرنے کے بعد تقریباً 200 پاؤنڈ فی ہفتہ ملتے ہیں۔ اس بیان کو ہضم کرنا سوویت ذرائع ابلاغ کے لیے بھی بہت مشکل کام تھا۔''

جہاں تک بیوروکریسی کا تعلق ہے انقلاب نے اسے بے مثال قوت اور مراعات سے نوازا تھا۔ اگر زورن کے ڈرامے کے کردار کریچیف کے الفاظ میں کہا جائے تو یہ ''عوام سے کٹے ہوئے، حریص اور خود پسند سفید پوش ارسٹوکریٹ'' تھے۔ پرانے سٹالنسٹ اہل کار بدعنوان غنڈے تھے لیکن کم از کم ان کا پرانی

روایات سے کچھ تعلق ضرور تھا۔لیکن اب ہمارے سامنے اشرافیہ کی ایک نئی نسل تھی جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئی تھی،فرانسیسی عطروں کی عادی تھی، مہنگے غیر ملکی سوٹ اور کیڈلک کاریں استعمال کرتی تھی۔ رئیسہ گورباچوف ایسی مخلوقات کا ایک کلاسیکی نمونہ تھی۔اس کے بارے میں پیری کارڈن وضاحت کرتا ہے رئیسہ ''میری دکان پرآنے والی نمایاں غیر ملکی شخصیات کی انتہائی پرکشش بیگمات میں سے ایک تھی۔'' طرفہ تماشہ ہے کہ بیگم گورباچوف ماسکو یونیورسٹی میں مارکس ازم، لینن ازم پر لیکچر دیا کرتی تھیں اگرچہ یہ بات ہمارے تصور سے باہر ہے کہ وہ کس قسم کا مارکس ازم تھا۔

1920ء کی دہائی میں لیفٹ اپوزیشن سے تعلق رکھنے والے سوسنوفسکی نے بیوروکریسی کے عروج کے حوالے سے'' آٹو موبائل حرم فیکٹر'' کی اصطلاح ایجاد کی تھی۔ بلند پروازی کے متمنی بیوروکریٹ، بورژوا اور ارسٹوکریٹ گھرانوں کی لڑکیوں سے شادیاں رچاتے اور ان کے نقطہ نظر اور عادات کونقل کرتے۔اہل کاروں کی بڑی بڑی گاڑیاں اور''لپی پوتی خواتین'' دیکھ کرفرانسیسی انقلاب کے رجعتی دور کے ایک ایسے ہی مظہر کے بارے میں گراکس بابف کے احتجاج کی یاد تازہ ہوجاتی ہے جب سابقہ (جیکوبن)انقلابیوں نے اشرافیہ کے ساتھ دعوتیں اڑانا اوران کی لڑکیوں سے شادیاں رچانا شروع کردیا تھا۔''تھرڈولو یہ تم کیا رہے ہو؟ آج وہ تم سے بغل گیر ہو رہے ہیں اور کل وہ تمہارا گلا گھونٹ دیں گے۔'' ہوشیار بیوروکریٹوں کا یہ ٹولہ جس کی نمائندگی گورباچوف کررہا تھا جس رجعتی پیٹی بورژوا کردار کا مالک تھا اس کا واضح ترین اظہار ان کی بیگمات کے ذریعے ہوتا تھا۔

درحقیقت سوویت یونین کے حکمران مغرب کے حکمران طبقے کے مقابلے میں بھی عوام سے کہیں زیادہ الگ تھلگ ہوچکے تھے۔اس حقیقت کا اظہار 1988ء میں ہونے والی سی پی ایس یو کی خصوصی کانفرنس کے مندوبین میں سے ایک نے اپنی تقریر میں کیا۔(بر سبیل تذکرہ 1941ء کے بعد اس نوعیت کی یہ پہلی کانفرنس تھی)۔''ہم اپنے لیڈروں کے مقابلے میں صدر ریگن اور ملکہ برطانیہ کی پوزیشن سے زیادہ بہتر طور پرآگاہ ہیں۔''(7)

جس قدر یہ حکمران ٹولہ سرمایہ داری کے زیر اثر آتا گیا اسی قدر یہ سوویت سماج سے الگ تھلگ اور بیگانہ ہوتا گیا۔ یہاں تک ہمیں اس کی بہت واضح مثال نظر آتی ہے کہ اینگلز کا کیا مطلب تھا کہ جب وہ ریاست کے حوالے سے کہتا ہے کہ'' سماج سے بالاتر طاقت جو بتدریج اس سے بیگانہ ہوتی چلی جاتی ہے۔'' بالخصوص سفارتی حلقے کے اعلیٰ عہدیداران مغرب کے بورژوا حلقوں کے ہم نوالہ وہم پیالہ بن

گئے۔ وہ واضح طور پر اس تجربے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ ایڈورڈ شیورناڈزے اسی پرت کی نمائندگی کرتا تھا۔ پرانے کندہ ناتراش اور جاہل بیوروکریٹوں کے برعکس جو کوئی غیر ملکی زبان بھی نہیں بول سکتے تھے یہ نئی پرت تعلیم یافتہ، ہوشیار اور کاسموپولیٹن تھی۔ ان کی ذہنیت پیٹی بورژوا نو دولتیوں جیسی تھی جو بڑی بورژوازی کے ساتھ معاملات کے حوالے سے اصلاح پسند لیڈروں کا خاصہ رہی ہے جس میں خوف اور رشک کے جذبات ایک پوشیدہ اور غلامانہ ستائش سے باہم دست وگریبان ہوتے ہیں۔

نوکرشاہی کی سڑن نام نہاد ''پریسٹرائیکا'' (جسے جلد ہی سوویت مزدوروں نے "کٹاسٹرائیکا" کا نام دے دیا تھا) کے عہد سے زیادہ کبھی بھی اس قدر واضح نہیں تھی۔ گورباچوف اتنا ہوشیار ضرور تھا کہ اسے اس بات کا ادراک ہو گیا کہ اگر قیادت نے فوری اقدامات نہ اٹھائے تو سب کچھ جام ہو جائے گا۔ اس وقت تک یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ سرمایہ داری کی طرف واپسی کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہ بات کم و بیش یقینی ہے کہ اس وقت تک بیوروکریسی میں سرمایہ داری کے حامی عناصر اقلیت میں تھے۔ لیکن گورباچوف ایسے عوامل کو حرکت میں لا چکا تھا جن کی ایک اپنی ہی منطق تھی۔

بے چینی کا ابال

خروشیف کی طرح گورباچوف کی اصلاحات نے بھی معیشت کو ابتدا میں کچھ سہارا دیا۔ پھر بھی مزدور جمہوریت کے تحت معیشت جو کچھ حاصل کر سکتی تھی اس کے مقابلے میں 4 فیصد کا ہدف مضحکہ خیز حد تک حقیر تھا۔ پچھلے سال کے مقابلے میں ستمبر 1986ء تک صنعتی پیداوار میں 5.6 فیصد اضافہ ہوا جس کی بڑی وجہ گورباچوف کی کارکردگی میں اضافے کی مہم تھی۔ یہ اعداد و شمار برژنیف کے دور کی نسبت بہتر تھے لیکن یہ اس شرح ترقی سے بھی کم تھے جو سرمایہ دار معیشتوں کو ابھار کے ادوار میں حاصل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسے ملک میں ہو رہا تھا جس کے پاس دنیا بھر کے انجینئروں، ہنرمندوں اور سائنس دانوں کی 25 فیصد تعداد اور دنیا کے وسائل کا چھٹا حصہ موجود تھا! یہ نسبتاً بہتر شرح ترقی بھی جزوی طور پر کچھ تراش خراش اور حد سے زیادہ نااہل اور بدعنوان اہل کاروں کو برطرف کرنے سے حاصل ہوئی تھی۔ گورنمنٹ کے تقریباً پچاس فیصد وزیر اور چیئرپرسن اور تیس فیصد پارٹی سیکرٹری حضرات برطرف کیے گئے۔ تقریباً دو لاکھ اہل کاروں کو برطرف کیا گیا۔ 19 ملین بیوروکریٹوں کے مقابلے میں یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اس کے

باوجود لیگا شیف کی سرکردگی میں بیوروکریسی کے اس حصے نے زبردست مزاحمت شروع کردی جو اصلاحات کا مخالف تھا۔ مزدور جمہوریت کی قدغن نہ ہونے کے باعث بیوروکریٹوں کے پاس پریسٹرائیکا سے پہلوتہی کرنے کے ہزاروں طریقے موجود تھے۔

درحقیقت ان اصلاحات نے بیوروکریسی کے مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان میں اضافہ کیا اور شدت پیدا کی۔ ''اصلاحات'' کی راہ پر چلنے کے لیے گورباچوف کو نوکر شاہانہ ٹولے کے مختلف دھڑوں کے درمیان توازن قائم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ کئی ایک مواقع پر اس نے اصلاحات کا راستہ روکے جانے کی صورت میں استعفیٰ دینے کی دھمکی دی۔ اس کا مقصد بیوروکریسی کی زیادہ قدامت پرستانہ پرتوں کو انتباہ کرنا تھا۔ لیکن بیوروکریسی اپنی نوکر شاہانہ فطرت کو کبھی بھی ترک نہ کرتی۔ اس کے برعکس وہ اپنی مراعات یافتہ حیثیت کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جہاں تک ''جمہوریت'' کا تعلق ہے تو چند ایک ثانوی رعایتوں کے علاوہ کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ عوام اچھی طرح آگاہ تھے کہ دھاندلی نیچے سے اوپر تک ہر چیز میں سرایت کر چکی ہے۔ انتخابات میں ایک سے زیادہ امیدوار متعارف کروانے کا مقصد ایک پارٹی کے آمرانہ نظام کے وجود کو چھپانا تھا۔ لیکن تمام امیدواروں کا تعلق یا تو کمیونسٹ پارٹی سے ہوتا تھا یا انہیں پارٹی کے پروگرام سے متفق ہونا پڑتا تھا یعنی بات ایک ہی تھی۔ نیچے سے اوپر کی بجائے یہ نظام اوپر سے نیچے کام کرتا تھا۔ سر کے بل کھڑے اہرام کی طرح۔ گورباچوف نے نظام کے بارے میں عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کا سہارا لیا جسے اس وقت تک گوارا کیا جا سکتا تھا جب تک مغرب میں کشش کا کوئی انقلابی محور موجود نہ ہو۔ لیکن گورباچوف کے امریکی سامراج کے ساتھ سمجھوتے کے اندرون ملک نہایت دور رس نتائج برآمد ہوئے۔ بیوروکریسی کئی دہائیوں سے ''بیرونی خطرے'' کو مزدوروں کی جانب سے کسی بھی مخالفت کو مفلوج کرنے کے لیے استعمال کرتی چلی آئی تھی۔ اس کی افادیت کو اب سخت نقصان پہنچا تھا۔

نوکر شاہانہ نظام کے تعطل نے جس کا اظہار معیشت کی سستی سے ہوتا تھا سوویت سماج کی تمام پرتوں کی نفسیات پر اثر ڈالا اور سب سے پہلے بیوروکریسی کو متاثر کیا۔ حکمران ٹولے کو اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ وہ سماج کو آگے لے جانے کے قابل نہیں رہا۔ یہ احساس بتدریج بڑھتا گیا کہ وہ اب ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن چکا ہے اور یہ بیماری تمام سماج میں نفوذ کر گئی۔ دانشوروں میں عدم اطمینان کے باعث مستقل ہیجان کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ نوجوان، جنہوں نے اکتوبر انقلاب کا علم بلند کیا تھا اور نہایت

بہادری سے خانہ جنگی میں حصہ لیا تھا اور اپنی تمام تر توانائیاں پہلے پانچ سالہ منصوبوں میں لگا دی تھیں اب مکمل طور پر بدل ہو چکے تھے۔ بے چینی کا اظہار کثرت شراب نوشی اور غنڈہ گردی کی وبا سے ہوتا تھا جس سے سب سے زیادہ بے عمل پرتوں کی مایوسی کی عکاسی ہوتی تھی۔ موجودہ دور تک سوویت یونین میں نوجوانوں کی حالت سٹالن ازم کے کردار پر بدترین تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ تین نسلوں کے بعد ہمیں بددلی کی تمام علامات دکھائی دیتی ہیں یعنی کثرت شراب نوشی، لمپنا ئزیشن، چوری، غنڈہ گردی اور ہر طرح کا سماج دشمن رویہ۔

زارشاہی کی تمام تر وحشیانہ خصوصیات میں سے ایک گھٹیا ترین خصوصیت یہ تھی کہ اس کے ریاستی بجٹ کا نصف سے زیادہ حصہ واڈ کا کی اجارہ داری سے حاصل ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ روس میں شراب نوشی کی ایک لمبی تاریخ ہے جو حیران کن طور پر طویل عرصے پر محیط ہے۔ بارہویں صدی میں لکھی جانے والی کتاب ''گزرے دنوں کی داستاں'' میں اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ کیف کے شہزادے ولادیمیر نے اسلام کو مسترد کرتے ہوئے عیسائیت کے حق میں یہ دلیل دی تھی کہ ''روسی عوام کے لیے شراب نوشی خوشی کا سرچشمہ ہے۔'' لیکن روسی زندگی میں واڈ کا کے کردار کو اکثر اوقات ایسے مظاہر سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا مسرت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ شراب کا ضرورت سے بڑھا ہوا استعمال زیادہ تر مایوسی و بددلی کی عکاسی کرتا ہے۔ پہلے پہل بالشویکوں نے واڈ کا کے استعمال کے خلاف اقدامات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سٹالن کے تحت واڈ کا کی ریاستی اجارہ داری کو ٹیکس کے حصول کا کارآمد ذریعہ خیال کرتے ہوئے از سرِنو متعارف کروا دیا گیا۔ یہ قدم روس میں ''سوشلزم'' کی تعمیر کے دعوے سے براہ راست متصادم تھا۔

دوسری جنگ کے بعد کی چار دہائیوں میں خالص الکوحل کے استعمال میں چار گنا اضافہ ہوا، آبادی کا ہر ساتواں فرد عادی شرابی شمار ہوتا تھا، سکولوں میں کثرب شراب نوشی کا آغاز ہو گیا، شراب نوشی کے باعث پیدائشی طور پر ذہنی اور جسمانی معذور بچوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ 1985ء میں ازوستیا نے رپورٹ شائع کی کہ 27 ملین مزدور ایسے ہیں جن کی کثرت شراب نوشی سنجیدہ مسئلے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ نشے میں ہونے یا شراب نوشی کے باعث بیمار ہونے کے باعث وہ ہفتے میں دو روز کام پر نہیں آتے۔ ماسکو کی 800 فیکٹریوں کا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ کام کے آخری گھنٹے کے دوران صرف دس فیصد مزدور اپنے کام پر موجود ہوتے ہیں۔

گورباچوف نے اس پر پابندی لگانے کا حکم دے دیا۔ 1986ء میں ماسکو میں واڈ کا کی دس میں

سے نو دکانیں بند کردی گئیں اوراس کے باعث شروع میں الکوحل کا استعمال 40 فیصد کم ہوگیا۔تاہم حقیقی مزدور جمہوریت کے نظام کی عدم موجودگی میں ایسے اقدامات کا بھی الٹا نتیجہ برآمد ہوا جو غالباً اپنی جگہ بالکل درست تھے۔الکوحل کے استعمال کو کم کرنے کی کوشش سے فی الحقیقت صحت میں بہتری پیدا ہوئی مگر یہ دودھاری تلوار ثابت ہوئی اوراس کے نتیجے میں ریاستی آمدنی میں بہت کمی واقع ہوگئی۔1985ء میں ٹیکسوں میں 30 فیصد کمی واقع ہوئی اور نہ ہی اس اقدام سے کثرت شراب نوشی کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہوسکا جو ایک ایسی برائی تھی جس میں جڑیں نوکر شاہانہ آمریت کے پیدا کردہ حالات میں موجود تھیں جو معاشرے کی وسیع پرتوں میں روزافزوں پراگندگی اور بیگانگی پیدا کررہے تھے۔ان دنوں روسی پریس میں ایسے واقعات کا ذکر عام تھا کہ لوگ کولون پینے کے باعث بیمار ہورہے ہیں۔غیر قانونی طور پر شراب کشید کرنے والوں کی گرفتاری کی شرح پچھلے سال کے مقابلے میں 1987ء میں دگنی ہوکر 440000 تک پہنچ گئی۔1988ء تک غیر قانونی شراب کشید کرنے والی بھٹیاں ریاستی فیکٹریوں کے مقابلے میں چالیس سے پچاس فیصد زیادہ شراب تیار کررہی تھیں۔ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ پائلٹ الکوحل ملا جہاز کا ایندھن اور اینٹی فریز چرا کر پی رہے ہیں۔یہ وسیع پیمانے پر موجود مایوسی اور بددلی کی بہت واضح نشانی تھی۔

اس جابرانہ نظام نے نوجوانوں پر شدید ترین اثرات مرتب کیے جنہوں نے نام نہاد کمیونسٹ پارٹی کی آمرانہ حکمرانی کے خلاف کھلی تشکیک اور بدگمانی کا اظہار کرنا شروع کردیا۔سوویت ویکلی نے آٹھ نومبر 1990ء کو ایک جائزہ شائع کیا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ سوویت یونین کے صرف 14 فیصد نوجوان سی پی ایس یو پر اعتماد کرتے ہیں۔سکولوں میں ان پر مارکسزم لینن ازم کی جو مضحکہ خیز شکل مسلط کی جاتی تھی وہ اس کے خلاف ردعمل کا اظہار کرتے تھے۔اسی جائزے میں یہ شرمناک دعویٰ بھی کیا گیا تھا کہ ان کی صرف 20-15 فیصد تعداد سوشلزم میں یقین رکھتی ہے۔لوگوں میں وسیع پیمانے پر پھیلی ہوئی مایوسی اور تشکیک کا اظہار اس قسم کے سیاسی لطیفوں میں بھی ہوتا تھا کہ ''ہم حقیقی کمیونزم تک پہنچ چکے ہیں یا ابھی مزید خرابی متوقع ہے؟'' اس میں کوئی شک نہیں ان نوجوانوں کی رسائی مارکس ازم اور سوشلزم کے حقیقی تصورات تک کبھی بھی نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کا پالا صرف اس کی بے جان اور دماغ کو سن کردینے والی مضحکہ خیز نقل سے ہی پڑا تھا۔ان کے علم میں آنے والا واحد ''سوشلزم'' ایک آمرانہ عفریت تھا۔کسی متبادل کی عدم موجودگی میں انہوں نے فرار کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔

ٹریڈ یونین کے اخبار ''ٹروڈ'' نے اس مظہر کو نیم مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے لیکن نفس مضمون اس

قدر خوفناک ہے کہ حقیقی مزاح کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی:

''ماسکو کے شرابیوں میں ہر لوشن بطور خاص بہت مقبول ہے لیکن اگر یہ دستیاب نہ ہو تو کارانو وانامی کولون کی ایک بوتل 65 کوپک میں مل جاتی ہے۔کارمن نامی پرفیوم سے ہر قیمت پر پرہیز کیا جائے جس کے پینے سے خریدار کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس کا گلہ کاٹ دیا گیا ہے۔''

گورباچوف کے اقدامات کسی کو بھی بے وقوف نہیں بنا سکے۔ ہر سمت پھیلی تشکیک کی عکاسی مندرجہ ذیل چٹکلے سے ہوتی ہے:

ایک شخص دکان پر جاتا ہے اور بیئر کی ایک بوتل طلب کرتا ہے جس کی قیمت گزشتہ روز 50 کوپک تھی۔ دکان ملازم اس سے ایک روبل وصول کرتا ہے۔

...... لیکن کل تو اس کی قیمت اس سے آدھی تھی۔

...... ہاں، لیکن آپ کو گلاسناسٹ کے لیے سو فیصد مزید ادا کرنا ہوگا۔

خریدار بڑے تردد کے ساتھ ایک روبل ادا کرتا ہے مگر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ملازم اسے 50 کوپک واپس لوٹا رہا ہے۔

...... لیکن آپ تو کہہ رہے تھے اس کی قیمت ایک روبل ہے؟

...... درست فرمایا۔ 50 کوپک گلاسناسٹ کے لیے ہیں۔ بیئر تو ہمارے ہاں موجود ہی نہیں۔

ایک دیوہیکل صفر

معاشی صورت حال انتہائی دگرگوں تھی۔ 4 فیصد کا بخیلانہ ہدف بھی پورا نہیں کیا جا سکا تھا۔ 1986ء میں نئے پانچ سالہ منصوبے کے آغاز کے بعد شرح ترقی تقریباً 2 فیصد سالانہ رہی تھی۔ ماہر معاشیات ایبل اگن بیگیان نے انکشاف کیا کہ 90-1989ء میں شرح ترقی عملاً صفر تھی۔ لیکن فی کس آمدنی میں درحقیقت کمی واقع ہوئی تھی۔ پریسٹرائیکا کے لیے یہ موت کا پیغام تھا۔ علاوہ ازیں عالمی منڈیوں میں شرکت نے صورت حال کو بہتر بنانے کی بجائے مزید خراب کر دیا۔ بیوروکریسی کا خیال تھا کہ عالمی منڈی میں شرکت سے ان کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ ایک دہائی میں بیرونی تجارت سوویت جی ڈی پی کے چار فیصد سے بڑھ کر 9 فیصد ہو گئی۔ کچھ عرصے کے لیے اس سے مدد ضرور ملی خصوصاً ٹیکنالوجی کے

شعبے میں۔لیکن اس نے کچھ نئے تضادات کو بھی جنم دیا جن کا اندازہ ماسکو میں بیٹھے تنگ ذہن اناڑی قبل از وقت نہیں لگا سکے تھے۔سوویت یونین کے لیے مغرب کا قرضہ جو 1938ء میں 14 بلین ڈالر تھا اب دگنا یعنی 28 بلین ڈالر ہو چکا تھا۔سوویت معیشت کی وسعت کے پیش نظر یہ قرضہ نسبتاً معمولی تھا لیکن اس سوال کے حوالے سے ایک زبردست انتباہ تھا کہ ''کون غالب آئے گا؟''

معاشی بحران کا احساس گرتے ہوئے معیارزندگی، لمبی قطاروں اور خوراک کی قلت سے ہوتا تھا۔ ایک ہزار بنیادی اشیا میں سے دکانوں میں مستقل طور پر صرف چار عدد ہی دستیاب تھیں۔ یہ نوکر شاہانہ انتشار کا نتیجہ تھا۔ریکارڈ فصل پیدا ہوئی تھی اور اناج اور آلو وافر مقدار میں موجود تھے۔لیکن وہ دکانوں تک نہیں پہنچتے تھے۔قیمتوں میں اضافے کی توقع میں بڑی مقدار میں چیزیں ذخیرہ کر لی گئی تھیں۔ بندرگاہوں میں دس لاکھ ٹن غذا گل سڑ رہی تھی۔ٹریڈ یونین اخبار ٹروڈ نے مثال دی تھی کہ جن شیلفوں میں تازہ پھل اور سبزیاں ہونے چاہییں تھے وہاں صرف بلغاریہ سے درآمد شدہ آڑوؤں کے ٹن پڑے تھے۔اس کے باوجود کہ 1984ء میں زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا تھا۔اس کے بعد صورت حال مزید بدتر ہو گئی۔ آٹھ نومبر 1990ء کے سوویت ویکلی کے مطابق ''اس وقت سات کروڑ لوگ یعنی کل آبادی کا ایک چوتھائی حصہ روٹی پر گزارا کر رہا ہے۔''

18 اکتوبر 1990ء کو پراودا اخبار نے اپنے ایک مضمون میں سماجی اور معاشی ٹوٹ پھوٹ کی ایک انتباہ انگیز تصویر کشی کی:

''صورت حال بدستور بدتر ہو رہی ہے۔ پیداوار گر رہی ہے اور معاشی رسد کے رابطے ٹوٹ رہے ہیں۔علیحدگی پسندی کے رجحانات تقویت پکڑ رہے ہیں۔صارفین کی منڈی کی حالت خراب ہے۔بجٹ کا خسارہ اور ریاست کے قرض واپس کرنے کی صلاحیت پر اعتماد خطرناک حدود کو پہنچ چکے ہیں۔ جرائم اور سماج دشمن رویوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔زندگی دشوار ہو رہی ہے، کام کرنے کی ترغیبات کمزور ہو رہی ہیں اور مستقبل پر اعتماد ختم ہو رہا ہے۔معیشت کی حالت انتہائی خطرناک ہے۔''

خوراک اور دیگر اشیا کی قلتوں سے پورے پورے علاقے متاثر ہو رہے تھے۔اس ادراک نے عوام کی بے اطمینانی کے لیے جلتی کا کام کیا تھا کہ یہ قلتیں مصنوعی ہیں یعنی نا اہلی اور تخریب کاری کا نتیجہ ہیں۔واڈکا دکانوں سے چوری کر کے مہنگے داموں بلیک مارکیٹ میں فروخت کی جا رہی تھی۔دکانوں میں سگریٹ ناپید تھے لیکن فیکٹریوں میں بکثرت موجود تھے۔گوشت گوداموں میں پڑا سڑ رہا تھا۔صرف 66

فیصد طلب پوری ہورہی تھی۔ جیسے ہی اشیا دکانوں میں آتیں لوگ ذخیرہ کرنے کی نیت سے انہیں خرید لیتے جس سے قلتوں میں مزید اضافہ ہوجاتا۔ سرکاری پریس نے اعتراف کیا کہ ''گذشتہ چار سالوں میں مختلف قسم کی 13000 اشیا دکانوں سے غائب ہوچکی ہیں۔''(8)

الکوحل کے خلاف اختیار کردہ پالیسی ناکام ہوگئی اور ایک بار پھر واڈکا کے لیے لمبی لمبی قطاریں لگنے لگیں۔ 22 اگست 1990ء کو مجتمع شدہ غصہ اور پراگندگی دونوں ابل کر باہر آگئے۔ چلیابسک میں الکوحل کی سپلائی منقطع ہونے کے باعث ہنگامہ ہوگیا۔ جب ملیشیا موقع پر پہنچی تو ہجوم نے اس پر بھی حملہ کردیا اور پیچھے ہٹنے پر مجبور کردیا:

''اس کے بعد ملیشیا کے سپاہیوں نے ڈھالیں جوڑ کر قدیم رومن طرز کا دفاعی حصار قائم کرلیا لیکن ہاتھوں سے تشکیل دیا ہوا یہ قلعہ بھی غضب ناک ہجوم کے حملے کی مزاحمت نہ کرسکا۔ ہنگامہ کرنے والوں نے ملیشیا کو چاروں اطراف سے گھیر کر نزدیک سے ان سپاہیوں پر پتھروں کی بارش کی۔''(9)

بعد ازاں منظر عام پر آنے والے سیکنڈل کے باعث چلیابسک میں صورت حال مزید خراب ہوگئی۔ جب انسپکٹروں نے کمیونسٹ پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں ایک خفیہ گودام دریافت کیا جو انواع واقسام کی خوردنی اشیا سے بھرا ہوا تھا۔ اسی مضمون میں اعتراف کیا گیا تھا کہ ''جب واڈکا کے سلسلے میں ہنگامہ ہوا تو اسی قسم کی سماجی وسیاسی صورت حال بہت سے دیگر سوویت شہروں میں بھی موجود تھی۔'' دوسرے الفاظ میں عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہورہا تھا اور کوئی بھی واقعہ ایک دھماکے کو جنم دے سکتا تھا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ عوام کے ذہنوں سے ریاست کی جابرانہ قوت کا خوف ختم ہونا شروع ہوگیا تھا۔ لیکن کسی سنجیدہ متبادل یعنی کسی انقلابی پارٹی اور پروگرام کی عدم موجودگی میں عوام کے عدم اطمینان کو کوئی موثر راستہ نہ مل سکا۔

نظام کے تعطل کا شکار ہونے پر بیورکریسی کے ایک بڑے حصے نے نئے راستے کی تلاش میں مغرب کی طرف دیکھنا شروع کردیا جو ابھی تک ایک عارضی اور مصنوعی ابھار کے دور سے گزر رہا تھا۔ نوکرشاہانہ ٹولے کے نمائندوں کو اپنے مغرب کے روز افزوں دوروں کے دوران لکھ پتیوں، سفارتکاروں اور صدور سے میل جول کے مواقع میسر آئے۔ وہ اس چمک دمک کا مقابلہ اس تعطل اور جمود سے کرتے جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کر آتے تھے اور یہ موازنہ انہیں زیادہ خوش کن نہیں لگتا تھا۔ اسی طرح بیوروکریسی کے ایک حصے میں بتدریج بطور ایک ماڈل کے مغرب کا تصور جڑیں پکڑنے لگا۔

اس سے سوویت یونین اور سی پی ایس یو کی قیادت کے مکمل نظریاتی دیوالیہ پن کا ثبوت فراہم ہوتا تھا۔ گورباچوف اور شیورڈ ناڈزے جیسے جلد متاثر ہو جانے والے سطحی لوگ جال میں پھنس گئے۔ تمام بیوروکریٹوں کی طرح انہوں نے اپنے سکول کے زمانے میں اس بکواس کے کچھ ٹکڑے ادھر ادھر سے جمع کر رکھے تھے جسے سوویت یونین میں مارکس ازم لینن ازم کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن حقیقی مارکس ازم ان کے لیے ایک بند کتاب تھا۔ طبقاتی نقطہ نظر سے قطعاً نابلد ہونے کا ثبوت گورباچوف نے اپنے اس مخصوص جاہلانہ تبصرے میں دیا کہ "سرمایہ دار بھی انسان ہیں" دوسرے الفاظ میں مغربی رہنماؤں کے ساتھ آمنے سامنے بیٹھ کر اختلافات کو دور کیا جا سکتا تھا۔ گویا یہ دو غیر ہم آہنگ سماجی نظاموں کے درمیان ناقابل مصالحت اختلافات کا نہیں بلکہ "پرسنل کیمسٹری" کا سوال تھا!

ساتھ چھوڑ جانے والے صرف یہی لوگ نہیں تھے۔ بلغاریہ کے "کمیونسٹ" لیڈر ٹوڈور ژیفکوف نے 1990ء میں اعتراف کیا کہ اسے بہت عرصہ پہلے سے یقین تھا کہ سوشلزم مردہ اور ناقابل عمل ہو چکا ہے۔ سٹالنسٹ بغاوت کے لیڈر جیروز یلسکی نے اس زبردست غلطی کے لیے پولینڈ کے عوام سے معذرت طلب کی! اچانک اسے بھی ادراک ہوا کہ "سرمایہ داری ہی واحد راستہ ہے۔" ایسے لوگوں کے لیے انحراف محض ایک منطقی اقدام تھا کیونکہ عملاً تو یہ لوگ مدتوں پہلے سوشلزم سے منہ موڑ چکے تھے۔ ٹراٹسکی اس سلسلے میں نصف صدی پہلے ہی پیش گوئی کر چکا تھا کہ بیوروکریسی محض اقتدار اور مراعات پر غاصبانہ قبضے پر ہی قانع ہو کر نہیں بیٹھ جائے گی بلکہ نجی سرمایہ دار بن کر اپنی اور اپنے بچوں کی حیثیت کو مستحکم کرنے کی کوشش کرے گا۔

شروع میں گورباچوف نے انتہا پسندوں کی طرف سے سرمایہ داری کی طرف تیز رفتار واپسی کے مطالبات کے خلاف مزاحمت کی کوشش کی۔ رژکوف کی پوزیشن بھی اس سے ملتی جلتی تھی اور وہ منڈی کے عناصر کے ساتھ ساتھ معیشت کی بنیاد ریاست کے ہاتھوں میں برقرار رکھنے کے حق میں تھا۔ بیوروکریسی کے مخالف دھڑوں کے درمیان گورباچوف مسلسل کشمکش و پیچ کا شکار رہا۔ اس دوران جرنیل، یونین ٹریٹی اور سوویت یونین کو درپیش خطرے کے بارے میں بے چین ہو رہے تھے۔ آخر کار 1990ء کے اواخر میں گورباچوف نے اپنے منصوبے کا خاکہ شائع کر دیا۔ یہ نیک ارادوں اور متضاد خیالات کا ایک مایوس کن ملغوبہ تھا۔

کرنسی کو مستحکم کرنے کے لیے بیرونی تجارت کو ہارڈ کرنسی فنڈ کے ذریعے فنانس کیا جانا تھا۔ نج

کاری ہوگی مگر صرف چھوٹے کاروباروں کی اور وہ بھی صرف ایک حد تک، قیمتوں میں لچک پیدا ہو جائے گی، مرکزیت کو ختم کیا جائے گا (مگر سوویت یونین برقرار رہے گا) اور ظاہر ہے کہ اجرتوں کی ڈی ریگولیشن بھی کی جائے گی۔ متوازن بجٹ بنایا جائے گا جس کا خسارہ جی ڈی پی کے 3 فیصد سے کم ہوگا (ماسترخت معاہدے میں یورپی یونین کی ریاستوں کے لیے بھی یہی شرائط ہیں اور وہ انہیں ناممکن الحصول پا رہے ہیں) جس کے لیے سخت کریڈٹ کنٹرول پر عمل کیا جائے گا۔ وہ اس سے مخصوص رجائیت پسندانہ نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ ''ایک متوازی معیشت ابھرنی چاہیے جس میں منڈی کے اندر اشیائے صرف اور خدمات کی افراط ہوگی''۔ لیکن یہ ایک ایسے شخص کی رجائیت پسندی تھی جو پہاڑ کی چوٹی سے چھلانگ لگانے والا ہو۔

گورباچوف نے ''سوشلزم'' اور ''کمیونزم'' کے بارے میں زبانی جمع خرچ جاری رکھا مگر اس کا مجموعی رویہ اس امر کی غمازی کرتا تھا کہ اسے اس پر قطعاً یقین نہیں ہے۔ اس کا ثبوت اس کے بی بی سی کو دیئے گئے اس انٹرویو سے ملتا ہے جس میں اس نے اس بیہودہ کہانی کا اعادہ کیا کہ اگر فروری انقلاب کامیاب ہو جاتا تو روس میں سب کچھ ٹھیک ہو جاتا! اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ فروری یا اکتوبر کو سمجھنے سے مکمل طور پر محروم تھا۔ ہم اس سوال پر کسی اور باب میں بحث کر چکے ہیں لہٰذا اس پر مزید گفتگو ضروری نہیں ہے۔ لیکن اکتوبر انقلاب کے 70 برس بعد سی پی اس یو کے سیکرٹری جنرل کا اس قدر خبیثانہ بکواس کرنا انتہائی قابل مذمت بات ہے۔

اگرچہ ریگن اور دیگر مغربی لیڈر کھلے عام گورباچوف کو ایک بڑی شخصیت قرار دیتے تھے لیکن وہ اس کی پیٹھ پیچھے خوب ہنستے ہوں گے۔ سرد مزاج اور حسابی کتابی امریکی سیاستدان اور سفارت کار مارے بے یقینی کے اپنی آنکھیں ملتے ہوں گے! سوویت یونین کا گلہ گھونٹنے اور اسے نیچا دکھانے کے مصمم ارادے پر قائم ان نفیس انسانوں نے جلد ہی اس حادثاتی پیٹی بورژوا عنصر کو شکست تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ آج تک گورباچوف ''مغربی جمہوریت'' اگر زیادہ صحت کے ساتھ کہا جائے تو ''بذات خود جمہوریت'' کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہے۔ یہ ایک ایسے مڈل کلاس اصلاح پسند کی خوبی ہے جو سمجھتا ہے کہ وہ متصادم طبقاتی مفادات میں مصالحت کروا سکتا ہے۔ جہاں تک موخر الذکر کا تعلق ہے تو اس کے انتہائی قابل رحم خصی پن کو چھپانے کے لیے عملی حقیقت پسندی محض برگ انجیر کا کام دیتا ہے۔

گورباچوف غالباً روس میں سرمایہ داری کی بحالی نہیں چاہتا تھا تاہم اس نے اس کے لیے راہ ہموار کی اور پھر ابھرتی ہوئی بورژوازی کے دھڑے نے اسے راستے سے ہٹا دیا جس کی قیادت اس کا پروردہ

یلسن کرر ہا تھا۔ وہ اس نام نہاد اصلاح کو ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر قبول کرنے کو بالکل تیار تھا اگر چہ وہ اس کے گھناؤنے نتائج کے بارے میں بے بسی سے منمنا بھی رہا تھا۔ اس حوالے سے بھی وہ مغرب کے سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کی ایک سچی نقل ہے جو سرمایہ داری کو گلے لگانے کے لیے تو تیار ہیں لیکن ان چیزوں کو قطعاً پسند نہیں کرتے جو اس کا ناگزیر نتیجہ ہوتی ہیں۔

گورباچوف کے بارے میں خوش فہمیاں

یہ بات ناقابل یقین لگتی ہے کہ بائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں کی کتنی بڑی تعداد گورباچوف سے دھوکہ کھا گئی تھی۔ صرف دائیں اور بائیں بازو سے تعلق رکھنے والے اصلاح پسند ہی نہیں بلکہ کچھ خودساختہ ''ٹرائسکائیٹ'' بھی اس ''عظیم مصلح اور مدبر'' کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک دوسرے پر گر پڑ رہے تھے۔ یہ لوگ سائے اور حقیقت میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے عاری تھے۔ درحقیقت گورباچوف حکمران ٹولے کے مفادات کا محافظ تھا۔ یہ بات بجا ہے کہ اس کا امیج پرانے سٹالنسٹ لیڈروں سے مختلف تھا۔ لیکن یہ فرق طریقہ کار کے حوالے سے زیادہ تھا اور مواد کے حوالے سے کم۔

سٹالن کے دور کے اکھڑ، تنگ نظر اور جاہل نو دولتیوں کے برعکس گورباچوف ایک مہذب پڑھا لکھا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا بیوروکریٹ تھا۔ وہ اس تعطل سے بخوبی آگاہ تھا جس کا نوکر شاہانہ نظام شکار تھا۔ عوام کی شرکت اور جوش و جذبے کے بغیر کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ سرمایہ داری کے تحت بھی صورت حال یہی ہے۔ اگر مزدور اپنی پہل گامی اور ذہانت کو استعمال میں نہ لائیں اور بعض اوقات مشینری کو چالو رکھنے والے اصولوں سے تھوڑا بہت انحراف نہ کریں تو اکثر بڑی فیکٹریاں بند ہو جائیں۔ برطانیہ میں ہر سال ''تجاویز کے ڈبوں'' کے طفیل کروڑوں پاؤنڈ بنائے جاتے ہیں۔ یہ بات مزدوروں کے کنٹرول اور انتظام پر مبنی نظام کے زبردست امکانات کو ظاہر کرتی ہے جس سے مزدوروں کی تخلیقی صلاحیت، ذہانت اور پہل گامی کو پوری طرح مہمیز دی جا سکتی ہے۔

بہت سے لوگ اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ روسی بیوروکریسی اپنی اصلاح کر سکتی ہے۔ ان میں ایک قابل تاریخ دان رائے میڈویڈیف تھا جس نے نظام کے مقابلے پر کھڑا ہونے کے سلسلے میں اگر چہ زبردست ذاتی جرات کا مظاہرہ کیا لیکن حقیقی معنوں میں ایک ہم آہنگ مارکسی تجزیہ وضع کرنے میں ناکام

رہااورایک جال میں پھنس گیا۔رائے میڈ ویڈیف بیورو کریسی کے بائیں دھڑے کی نمائندگی کرتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ نظام سختی سے قانونی اورآئینی طریقہ کار اپناتے ہوئے اپنی اصلاح کرے۔وہ کہتا ہے''جہاں تک سیاسی جدوجہد کے لیے اختیار کیے جانے والے ذرائع کا تعلق ہے توانہیں قطعی طور پرقانونی اور آئینی ہونا چاہیے۔بعض انتہا پسند گروہ ایسے بھی ہیں جو غیر قانونی طریقوں میں یقین رکھتے ہیں مثال کے طور پر زیرزمین چھاپہ خانوں کی تنظیم وغیرہ۔''(10)

اس کے بعد وہ اپنے مخالفین میں سے ایک کا بیان نقل کرتا ہے جو بیوروکریسی کے بارے میں واضح طور پر ایک درست سوچ رکھتا تھا:

''تم سمجھتے ہو کہ قیادت کسی حد تک جمہوریت کی حمایت کرے گی لیکن اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قیادت خود اپنا خاتمہ کر لے اور تمام تر سیاسی تاریخ اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ ایسی توقع غیر حقیقی ہوتی ہے۔کوئی بھی حکومت اپنی مرضی سے پیچھے نہیں ہٹتی۔''

''تمہارے تصورات اس حوالے سے نقصان دہ ہیں کہ ان سے یہ خوش فہمیاں جنم لیتی ہیں کہ اصلاحات کے بارے میں تمہارے مجوزہ پروگرام کو باآسانی حقیقت کا روپ دیا جاسکتا ہے۔تمہارا خیال ہے کہ سماجی اور سیاسی حالات میں تبدیلی آنے سے تازہ قوتیں ریاستی مشینری کا حصہ بن کر اس کے نوکر شاہانہ چکر کو تبدیل کر دیں گی۔لیکن اس سے صرف ایک خود کار اور بے ساختہ عمل کے غلط تصور کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان تازہ قوتوں کو زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔''(11)ایک بار پھر میڈ ویڈیف یہ کہہ کر بازی ہار جاتا ہے کہ''زیادہ جلد بازی میں کی گئی اصلاحات سوشلسٹ بلاک کے لیے مسائل کھڑے کر سکتی ہیں(جیسا کہ چیکوسلوواکیہ کے تجربے سے ثابت ہوا ہے)''(12)ظاہر ہے کہ مزدور طبقہ بیوروکریسی کا جوا اتار پھینکنے کے لیے جو بھی تحریک شروع کرے گا اس سے''مسائل''پیدا ہوں گے۔لیکن یہ تصور کرنا کہ حکمران ٹولہ لڑے بغیر ہتھیار ڈال دے گا احمقوں کی جنت میں رہنے کے مترادف تھا۔

اس کی دوسری مثال آئزک ڈوشر ہے۔اس کا نام اکثر اوقات ٹراٹسکی کے ساتھ لیا جاتا ہے جس کی وجہ اس عظیم انقلابی کی تین جلدوں پر محیط سوانح حیات ہے۔لیکن سیاسی طور پر ان دونوں کے مابین حتی الامکان فاصلہ پایا جاتا ہے۔درحقیقت سٹالن کی سیاسی سوانح حیات میں آئزک ڈوشر سٹالن کے کردار کو عظیم بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اس کی تصویر کشی ردانقلابی بیوروکریسی کے لیڈر کی بجائے اس طرح کی گئی

ہے گویا وہ ایسا عظیم انقلابی تھا جسے سمجھنے میں غلطی کی گئی ہے۔

''سٹالن ایک متضاد المیہ تھا، تخلیقی انقلاب کا قائد بھی تھا اور اس کا استحصال کرنے والا بھی۔ کرامویل کی طرح وہ تمام مراحل اور تبدیلیوں کے دوران انقلاب کے تسلسل کی تجسیم ہے اگرچہ پہلے مرحلے میں اس کا کردار کم نمایاں تھا۔ روبس پیر کی طرح اس نے اپنی ہی پارٹی کو خون میں نہلا یا اور نپولین کی طرح ایک نیم قدامت پسندانہ اور نیم انقلابی سلطنت قائم کی اور انقلاب کو اپنے ملک کی سرحدوں سے باہر لے گیا۔ جو کچھ سٹالن نے سرانجام دیا اور ان میں سے بہتر کاموں کو مستقبل کی خاطر محفوظ کرنے اور پوری قدر و قیمت عطا کرنے کی غرض سے انہیں اسی سختی سے صاف کرنا اور نئی شکل دینا ضروری ہے جس طرح کرامویل کے بعد انگریزی انقلاب اور نپولین کے بعد فرانسیسی انقلاب کو پاک صاف کر کے انہیں نئی شکل دی گئی تھی۔"(13)

ڈوشر کبھی بھی ٹراٹسکی یا مارکس ازم کے لیے اس کی عظیم خدمت یعنی سٹالن کے تجزیئے کو نہیں سمجھ پایا۔ ٹراٹسکی کی تین جلدوں پر محیط سوانح حیات میں درست وہی کچھ ہے جو ڈوشر نے ٹراٹسکی سے مستعار لیا ہے ورنہ اس کی نظریہ سازی کی کوششوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ وہ ''چوتھی انٹرنیشنل کے حوالے سے مکمل شکست'' اور ''روس میں اصلاحات اور انقلاب کے بارے میں ٹامک ٹوئیوں'' کو ٹراٹسکی کی خام خیالی قرار دے کر مسترد کر دیتا ہے۔(14) حقیقت یہ ہے کہ آج روس میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے سٹالن ازم کے بارے میں ٹراٹسکی کے تصورات کو سمجھے بغیر گرفت میں لانا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ محض ''ٹامک ٹوئیاں'' نہیں تھیں بلکہ حالات و واقعات نے اس کے نظریات کی سچائی کو پوری طرح ثابت کر دیا ہے۔ آئزک ڈوشر کی اپنی پیش بینی کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔

سٹالن کی موت کے بعد خروشیف کی نام نہاد ڈی سٹالنائزیشن کا استقبال ڈوشر نے ایک عظیم پیش رفت کے طور پر کیا۔ ٹراٹسکی کی سوانح حیات کی تیسری جلد میں ڈوشر مندرجہ ذیل نتیجہ اخذ کرتا ہے۔

''یہ بات واضح ہے کہ سٹالن ازم کے تحت بھی سوویت سماج کئی شعبوں میں زبردست ترقی کر رہا تھا اور یہ ترقی جسے قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا سٹالن ازم کو توڑ رہی تھی اور اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ ٹراٹسکی کے دور میں اس ترقی کی میزان کھینچنا قبل از وقت تھا اور اس ضمن میں اس کی کوششیں غلطیوں سے عاری نہیں تھیں اور آج بھی یعنی ربع صدی بعد بھی صورت حال بالکل واضح نہیں ہے۔ مگر یہ چیز بالکل واضح ہے کہ سوویت سماج کامیابی کے ساتھ بھاری بوجھوں سے نجات حاصل کرنے

اور عہد سٹالن سے ورثے میں ملنے والے زبردست اثاثوں کو ترقی دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ 1960ء کی دہائی میں سوویت یونین میں 1930ء یا 1950ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں کے مقابلے میں کہیں کم غربت، کہیں کم عدم مساوات اور کہیں کم جبر ہے۔ تضاد اس قدر واضح ہے کہ نوکر شاہانہ اجتماعیت کی قائم کردہ نئی آمرانہ غلامی کا ذکر کرنا ترتیب زمانی میں غلطی پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے۔ یہ معاملہ اب بھی بحث طلب ہے کہ آیا سوویت بیوروکریسی ایک نیا طبقہ ہے۔ یہ بات شک وشبے سے بالاتر ہے کہ سٹالن کے بعد کی پہلی دہائی میں ہونے والی اصلاحات چاہے کتنی بھی متضاد اور ناکافی کیوں نہ ہوں مگر انہوں نے بہت حد تک نوکر شاہانہ آمریت کو معتدل اور محدود کیا ہے اور عوامی خواہشات کی تازہ لہریں سوویت سماج کو زیادہ تیز رفتاری سے تبدیل کر رہی ہیں۔'' (15)

ڈوشر ہمیشہ اس خوش فہمی کا شکار رہا کہ بیوروکریسی خود کو ڈی بیوروکریٹائز کر کے سوشلزم متعارف کروا سکتی ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط تھی۔ تاریخ میں کسی بھی حکمران طبقے یا ٹولے نے اقتدار اور مراعات کو جدوجہد کے بغیر نہیں چھوڑا۔ ٹراٹسکی کی یہ پیش گوئی ہزار گنا زیادہ درست تھی کہ بیوروکریسی اپنی مراعات کو تقویت دینے کے لیے اقتدار کو مزدور طبقے کے حوالے کرنے کی بجائے سرمایہ داری کا سہارا لے گی۔ گورباچوف کی اصلاحات کو مغرب میں آنے والے عارضی معاشی ابھار سے ہم زمان ہونے کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو یہ بات اور بھی درست لگتی ہے۔

ڈوشر کا مرکزی تھیسز غیر مارکسی اور مکمل طور پر رسمی منطق پر مبنی کردار کا حامل تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی اگر بیوروکریسی کا ظہور روس کی پس ماندگی کے باعث ہوا تھا تو سماج کے معاشی اور ثقافتی اعتبار سے اعلیٰ تر سطح پر پہنچنے پر اسے بلا اذیت خود بخود غائب ہو جانا چاہیے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ سماج کے بنیادی طبقاتی تضادات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ کسی بھی طبقاتی سماج میں ایک بار ظہور پذیر ہو جانے کے بعد ریاست ایک خود مختار حرکت اور زندگی حاصل کر لیتی ہے۔ تمام تاریخ ڈوشر کے تھیسز سے بالکل متضاد ثبوت فراہم کرتی ہے۔ فیصلہ کن مرحلے پر بھی جب پیداواری قوتیں مروجہ ملکیتی رشتوں سے تجاوز کر چکی ہوتی ہیں حکمران طبقہ اور اس کی ریاست تاریخی ارتقا کی منطق کے آگے سپر نہیں ڈال دیتے۔ وہ اس وقت بھی اپنے اقتدار اور مراعات کو برقرار رکھنے کے لیے لڑتے ہیں جب وہ ترقی کے تقاضوں سے کھلم کھلا متصادم ہوں۔ سرمایہ داری نظام بہت عرصے سے پیداواری قوتوں کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے مگر اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ دار طبقہ رضا کارانہ طور پر اقتدار پرولتاریہ کے حوالے کر دے گا!

پیداواری قوتوں کی ترقی سے ریاست کی نوعیت کا از خود تعین نہیں ہو جاتا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو نہ صرف روسی بلکہ کوئی بھی انقلاب غیر ضروری ہوتا اور تمام انسانی تاریخ ترقی کی سمت ایک ہموار اور بتدریج رونما ہونے والے ارتقا پر مبنی ہوتی مگر جیسا کہ سکول جانے والا ہر بچہ جانتا ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے۔ انقلاب کا ناگزیر ہونا اس حقیقت سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی بھی حکمران طبقے یا ٹولے نے کبھی بھی اس طرح ہتھیار نہیں ڈالے۔ روسی بیوروکریسی بھی کوئی استثنا نہیں ہے۔ خصوصاً سٹالن کے ہاتھوں اکتوبر انقلاب کی نمائندگی کرنے والوں کے خاتموں کے بعد۔ جس طرح تطہیرات کے دوران ایک خون کے سمندر سے گزر کر بیوروکریسی نے اقتدار قائم کیا تھا وہ اس بات کی علامت تھا کہ یہ حکمران ٹولا اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے کچھ بھی کر گزرے گا۔ جیسا کہ ٹراٹسکی نے کہا تھا ''آج تک کسی بھی شیطان نے اپنے پنجے رضا کارانہ طور پر نہیں کاٹے۔ سوویت بیوروکریسی لڑائی کے بغیر اپنی حیثیت سے دستبردار نہیں ہوگی۔ ترقی لازمی طور پر انقلاب کے راستے کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔'' (16)

ڈوشر کا تمام تر استدلال مکمل طور پر منشوازم کی روایتی سوچ پر مبنی تھا یہ اسی منطق کی عکاسی کرتا ہے جو اصلاح پسندی کی ہے، جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ عمومی طور پر انقلاب ایک غیر ضروری زحمت ہے۔ اس کی ''حقیقت پسندی'' درحقیقت ایک غیر نفیس تجربیت پسندی تھی جس میں تاریخ کے بارے میں سمجھ بوجھ کا مکمل فقدان تھا۔ یہ اسی قسم کی ذہنیت ہے جو مغرب کے سوشل ڈیموکریٹ لیڈروں کو سوشلزم ترک کرنے اور بالآخر مارکیٹ اکانومی کی راہ اختیار کرنے کی طرف لے جاتی ہے یعنی اصلاحات سے رد اصلاحات کی طرف۔ اس طرح یہ مبینہ حقیقت پسندی بدترین قسم کا یوٹوپیا ثابت ہوتی ہے۔

ڈوشر کا پیش کردہ یہ تصور کہ بیوروکریسی خود اپنی اصلاح کرلے گی سوویت یونین کے ریڈیکل ''دوستوں'' کو امید دلاتا تھا اور سوشلزم کی طرف بلا اذیت عبور کا خواب دکھاتا تھا۔ حقیقت میں مزدور طبقے کی ایک بڑی تحریک کے بغیر ایسا ہونا ناممکن تھا۔ کامیابی یا ناکامی کا دارومدار بیوروکریسی کی نیک خواہشات پر نہیں بلکہ مکمل طور پر مزدور طبقے کی اپنی آزادی کے لیے لڑنے پر رضامند ہونے پر تھا۔ ہنگری کے تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح مزدور طبقے کی ایک وسیع انقلابی تحریک بیوروکریسی میں پھوٹ ڈال کر ایک بہت بڑی تعداد کو سیاسی انقلاب کے لیے جیت سکتی ہے۔ اس کے برعکس گورباچوف کی نام نہاد اصلاحات کا مقصد نیچے سے آنے والے انقلاب کی راہ روکنا اور بیوروکریسی کی حکمرانی کو قائم رکھنا تھا۔ ان اصلاحات نے محض بیوروکریسی کے ایک بڑے حصے کے سرمایہ داری کی طرف جانے کی راہ ہموار کی

جنہوں نے اپنی مراعات کے خاتمے کو قبول کرنے کی بجائے سرمایہ داری کو قبول کر لیا۔آج کے دور میں ڈوشر کے نظریات تاریخی دلچسپی سے بھی عاری ہو چکے ہیں۔انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لیے یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ اپنی موت سے کچھ عرصہ قبل ڈوشر کی بیوہ ٹمارا ڈوشر نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے جرات مندی سے اعتراف کیا کہ اس سوال پر ٹراٹسکی کا موقف ہمیشہ سے درست تھا۔اس عہد کی طرف نظر دوڑانے پر یہ بات نا قابل یقین لگتی ہے کہ مارکس ازم تو ایک طرف رہا، روسی تاریخ کے بارے میں انتہائی بنیادی علم رکھنے والا شخص بھی گورباچوف اور اس کی پالیسیوں کے بارے میں کس طرح خوش فہمی کا شکار ہو سکتا ہے۔اس کے باوجود نام نہاد مارکسیوں نے گورباچوف کی تعریفوں کے پل باندھے اور بیوروکریسی کے خود کو ختم کرنے کا عجیب وغریب نظارا دیکھنے کے لیے ماسکو کا سفر بھی اختیار کیا! بلاشبہ، ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کی وکالت کرنے والے اس سے متاثر نہیں ہوئے کیونکہ جہاں تک ان کی سوچ کا تعلق تھا تو روس میں سرمایہ داری پہلے سے موجود تھی۔پھر یہ سارا اودھم کس لیے؟

جب تمام دیگر رجحانات گورباچوف کو عظیم مسیحا قرار دے رہے تھے صرف ہمیں نے کہا تھا کہ اس کی اصلاحات کی ناکامی یقینی ہے اور یہ ایک حادثاتی پیٹی بورژوا شخصیت ہے جسے حالات و واقعات بہا لے جائیں گے، اگرچہ اس وقت ہمارا خیال تھا کہ ایسا سیاسی انقلاب کے نتیجے میں ہو گا نہ کہ سرمایہ داری کی جانب تحریک کے نتیجے میں جسے ہم اس مرحلے پر غلط طور پر خارج از امکان قرار دیتے تھے۔مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ مزدوروں کے کنٹرول اور انتظام پر مبنی لینن اسٹ نظام از سر نو متعارف کروایا جاتا جو اس وقت روس میں موجود ترقی یافتہ معیشت کی بنیاد پر آسانی سے ممکن ہو سکتا تھا۔لیکن گورباچوف کے ذہن میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔صورت حال میں بہتری لانے کی بجائے گورباچوف کی اصلاحات نے عدم استحکام کا ایک اور عنصر متعارف کروا دیا جس سے نظام کی تحلیل کا عمل اور تیز ہو گیا۔صرف دو ممکنہ متبادل موجود تھے۔سیاسی انقلاب کی طرف مزدور طبقے کی تحریک کی عدم موجودگی میں توازن نہایت تیزی سے سرمایہ کی طرف واپسی کے حق میں ہو گیا۔

یلسن کی جذبات انگیز خطابت

ہم نے شروع دن سے ہی یہ پیش گوئی کی تھی کہ گورباچوف کی اصلاحات چند سالوں کے لیے

عارضی طور پر موثر ثابت ہوسکتی ہیں۔ یہ بات ہم پر واضح تھی کہ گورباچوف یا تو مرکزیت اور جبر کی راہ دوبارہ اختیار کرے گا یا ہوسکتا ہے کہ خروشیف کی طرح اسے منظر سے ہٹا دیا جائے۔ گورباچوف کی اصلاحات میں بنیادی خامی یہ تھی کہ معاشی ترقی کے لیے مغرب کی طرح زیادہ تر بوجھ مزدور طبقے پر ڈالا گیا تھا جس میں کام کی رفتار کو تیز کرنا، کارکردگی کی مناسبت سے معاوضہ، ریاستی چھوٹ میں کٹوتیاں اور یہاں تک کہ فیکٹریوں کی بندش بھی شامل تھی۔ سوویت سیاسی معاشیات جس اتھاہ گندگی میں ڈوب چکی تھی اس کا ثبوت اس حقیقت سے فراہم ہوتا ہے کہ گورباچوف کے مالیاتی مشیر مغربی ماہرین معیشت کی نقالی کرتے ہوئے عین اس وقت مارکیٹ اکانومی کے عناصر متعارف کروانے کی کوشش کر رہے تھے جب یہ نظام عالمی پیمانے پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ مارکسی سمجھ بوجھ کے فقدان کے باعث وہ 90-1982ء کے اس عارضی ابھار سے مرعوب ہو رہے تھے جو ایک تاریخی حادثے کے سبب سوویت یونین کے بحران سے ہم زمان تھا۔

اس وقت بیوروکریسی کا ایک دھڑا سرمایہ داری کے سنہرے دنوں کی واپسی کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ سٹالن ازم کے تعطل سے مایوس ہونے کے بعد وہ بتدریج مغرب کے معاشی ابھار سے متاثر ہو رہے تھے۔ اس مقام پر نوکر شاہانہ انتشار اور تخریب کاری سے ایک ایسی صورتحال پیدا ہو چکی تھی کہ سرکاری معیشت دانوں کے مطابق 3 فیصد فیکٹریاں نقصان میں جا رہی تھیں۔ تھیچر کے پیروکاروں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ابیل اگن بگیاں جیسے ماہرین معاشیات بھی اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہزاروں فیکٹریوں کے بند کیے جانے کے حق میں تھے۔ یہی لوگ دلیل دیتے تھے کہ خوراک اور کرایہ پر چھوٹ پر بہت خرچ آتا ہے جسے ختم کر کے قیمتوں کو اپنی سطح خود متعین کرنے کا موقع دیا جانا چاہیے۔ چند سال بعد اس مشورے کو عملی جامہ پہنا دیا گیا جس کے روسی عوام پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے۔ لیکن ابھی تک گورباچوف عوام کے ردعمل کے خوف سے یہ راستہ اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بورس یلسن سورڈ پووسک سے تعلق رکھنے والا ایک جاہ طلب شخص تھا جس نے پریسٹرائیکا کے انتہائی بے باک وکیل کی حیثیت سے نام کمانے کی کوشش کی۔ وہ ایک فطری خطیب تھا اور اداکارانہ اشاروں اور اداؤں کا شوقین۔ اب اس نے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا اور مارکیٹوں کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے سرکاری گاڑی اور ڈرائیور کی خدمات سے انکار کرتے ہوئے کریملن جانے کے لیے زیر زمین ریل گاڑی کا استعمال شروع کر دیا اور نوکر شاہانہ مراعات کے خلاف با آواز بلند احتجاج کیا۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ اس وقت اسے ماسکو میں ایک خصوصی مقبولیت حاصل ہوئی جہاں اسے بدعنوانی کے خلاف خطیبانہ حملوں کی وجہ سے خوب داد ملی۔

جبر پر مبنی نوکر شاہانہ کنٹرول اس قدر نقصان پہنچا چکا تھا کہ بڑے پیمانے کی بدعنوانی اور کالے دھندے کے بغیر معیشت بہت پہلے ہی جامد ہو چکی ہوتی۔ مزدور اس سے بخوبی آگاہ تھے اور قیادت سنبھالنے کے فوراً بعد گورباچوف نے بھی اس کا کھلے عام اعتراف کیا تھا ''اگر آپ اپنے فلیٹ کی مرمت کروانا چاہیں تو اس کام کے لیے آپ کو یقیناً کوئی جز وقتی کارکن تلاش کرنا پڑے گا اور اسے کسی تعمیراتی جگہ سے مطلوبہ مواد چوری کرنا پڑے گا۔'' (17)

یہاں تک کہ بلیک مارکیٹ کا سہارا لیے بغیر ماسکو میں بھی پانی کے نلکوں کی مرمت جیسی بنیادی خدمات کا حصول ناممکن تھا۔ دوسرے شہروں اور علاقوں کے سلسلے میں بھی یہ بات درست تھی جیسا کہ 1986ء کی پارٹی کانگریس میں یلسن کی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے ''اس (یلسن) نے پوچھا کہ سوویت یونین میں اقتدار کا مرکز ہونے کے ناطے سی سی سیکرٹریٹ نے ازبکستان اور کرغیزیہ میں ہونے والی وسیع پیمانے کی بدعنوانی کے سلسلے میں کوئی قدم کیوں نہیں اٹھایا۔ (وسطی ایشیا کی دو ریاستیں جہاں تمام کی تمام پارٹی قیادت کو ہٹا دیا گیا تھا)۔ مسٹر یلسن نے پوچھا کہ پچھلے پانچ سال سے پارٹی کانگریسوں میں وہی مسائل بار بار کیوں اٹھائے جا رہے ہیں؟ اتنے سالوں کے بعد بھی ہم اپنی زندگیوں سے اختیارات کے غلط استعمال، سماجی ناانصافی اور بیوروکریسی کی جڑوں کو اکھاڑ پھینکنے میں کامیاب کیوں نہیں ہو سکے ہیں؟ مسٹر یلسن نے کہا کہ اسی لاکھ کی آبادی کے شہر ماسکو کی معیشت جمود کا شکار ہے اور پبلک ٹرانسپورٹ، خریداری کے مراکز اور علاج معالجے کی سہولتیں ناکافی ہیں۔''(18)

یلسن نے کانگریس میں ایک اور موقع پر کہا کہ ''کئی سالوں تک پرچون کا تمام شعبہ بدعنوانی کے دور سے گزرا ہے اور آج ہمیں اس کا پھل کھانا پڑ رہا ہے۔ اگر ہم عملے کا مسئلہ حل نہیں کر سکتے، اگر ہم بے ایمان لوگوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے اور تمام شعبے کو صاف نہیں کر سکتے تو قلتیں باقی رہیں گی اور باقاعدگی سے مصنوعی خسارے ہوتے رہیں گے۔''(19) یلسن نے ماسکو کی مقامی پارٹی کے جن ورکرز کو نکالا ان کی تعداد 4 فیصد سے کم نہیں تھی لیکن یہ اس پر انتشار صورت حال کو حل کرنے کے لیے کافی ثابت نہیں ہو سکی جس کا ذکر اس نے پارٹی کانگریس میں کیا تھا اور نہ ہی رشوت کے الزام میں نکالے جانے والوں کی بڑی تعداد کو در پردہ دیگر ملازمتوں میں واپس لیے جانے سے روکا جا سکا۔ ساتھ ہی ساتھ یلسن

کی مہم نے حقیقت میں ماسکو کی معاشی صورت حال کو مزید بدتر کر دیا کیونکہ بدعنوانی اور کالا دھندا ہی وہ تیل تھا جو بیوروکریسی کے تحت چلنے والی معیشت کو چالو رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ فیکٹریوں کو مہیا کیے جانے والے خام مال کی فراہمی کا دارومدار بھی بلیک مارکیٹ پر ہوتا تھا تا کہ نوکر شاہانہ نظام کی پیدا کردہ رکاوٹوں سے چھٹکارا پایا جاسکے۔

اس تجربے نے ایک بار پھر ثابت کیا کہ بدعنوانی کے خلاف چلائی جانے والی مہم کو جس دیوار کا سامنا ہے اسے توڑنے کے لیے نوکر شاہانہ ریاست کا مکمل خاتمہ اور مزدور جمہوریت کا قیام ہی واحد راستہ ہے اور ایسی کسی بات پر غور کرنے کی بجائے یلسن اور اس کے لنگوٹیوں نے سرمایہ داری کا راستہ اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ تاہم یلسن کے ''عوامی'' اقدامات سے بیوروکریسی کا قدامت پسند دھڑا ناراض ہو گیا جنہیں خوف تھا کہ گلاسناسٹ کی پالیسی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے۔ یلسن کا اخراج اس بات کی واضح علامت تھی کہ گورباچوف کی اصلاحات مشکلات کا شکار ہو رہی ہیں۔

یلسن اپنی مقبولیت میں اضافے کے لیے مساوات کا حامی ہونے کا جھوٹا تاثر دیتا تھا۔ لیکن بعد میں کیا ہوا؟ موجودہ دور میں اس جنٹلمین نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر روسی ریاست کو لوٹا ہے۔ اس ''مساوات کے دعویدار'' کے دور حکومت میں سات امیر ترین لیٹروں کا آدھے ملک پر قبضہ اور غلبہ ہے جب کہ کروڑوں روسی غربت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کئی کئی مہینوں تک اجرتیں ادا نہیں کی جاتیں۔ خوب مساوات ہے! درحقیقت موجودہ دور میں روس کے اندر عدم مساوات نہ صرف پہلے سے زیادہ ہے بلکہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ اس کی صورت حال مغربی یورپ، امریکہ یا جاپان میں شرفا کی سرمایہ دارانہ حکومتوں کی بجائے فلپائن میں مارکوس کی ''رفیق سرمایہ دار'' حکومت سے زیادہ مشابہ ہے۔ یہ حقیقت مزدور طبقے سے پوشیدہ نہیں ہے جو اپنے طور پر نتائج اخذ کر رہا ہے اور کسی کو بھی یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مارکوس کی حکومت کا کیا حشر ہوا تھا۔

باب نمبر 7: پریسٹرائیکا کا مفہوم

1۔ دی ٹائمز 86-6-26

2۔ ڈیلی ٹیلی گراف 86-6-26

3۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری صفحہ 259-260

4۔ گورباچوف اپنے ملک اور دنیا کیلئے نئے خیالات صفحہ 31

5۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری صفحہ 264-265

6۔ گرینگ شا۔خردشیف کا روس صفحہ 134

7۔ وال سٹریٹ جرنل 88-7-5

8۔ سوویت ویکلی 90-11-1

9۔ سوویت ویکلی 90-11-1

10۔ میڈویڈیف سوشلسٹ جمہوریت پر صفحہ 314

11۔ میڈویڈیف سوشلسٹ جمہوریت پر صفحہ 313

12۔ ایضاً صفحہ 314

13۔ ڈیوشر، سٹالن سیاسی سوانح حیات صفحہ 569-57

14۔ ایضاً صفحہ 513

15۔ ڈیوشر ٹھکرایا ہوا پیغمبر صفحہ 511-512

16۔ ٹراٹسکی ۔انقلاب سے غداری صفحہ 287

17۔ فنانشل ٹائمز 86-7-2

18۔ فنانشل ٹائمز 86-2-28

19۔ دی گارڈین 86-1-29

باب 8

خارجہ پالیسی سے قومی سوال تک

اسلحہ سازی پر اٹھنے والے اخراجات

عالمی سرمایہ داری اور سٹالن ازم کے بحرانوں میں زبردست مماثلت پائی جاتی تھی۔ بیوروکریسی کی حکمرانی اور اجارہ داریوں کی حکمرانی دونوں ہی شریانوں کی سختی کی بیماری سے مغلوب ہوگئی تھیں۔ دونوں نظاموں میں ضیاع، انتشار اور طوائف الملو کی نے سرایت کر کے پیداواری قوتوں کے فروغ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر دی تھی۔ دونوں اطراف سے ایک دوسرے کی خامیوں پر انگشت نمائی کی جاتی تھی۔ لیکن سماج کی ترقی میں ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے کی صلاحیت دونوں میں سے کسی میں بھی نہیں تھی۔ مغرب میں پیداواری قوتیں نجی ملکیت اور قومی ریاست کی حدود سے تجاوز کر چکی تھیں۔ مشرق میں واقع پرولتاری بوناپارٹسٹ ممالک نوکرشاہانہ کنٹرول اور منصوبہ بندی کے بحران کا شکار تھے۔ علاوہ ازیں تیسری دنیا کے غربت زدہ ممالک کے سامراجی استحصال کا بحران بھی شدت اختیار کر چکا تھا۔ جنگ اور غربت سرمایہ داری نظام کے تضادات کا ناگزیر حصہ ہیں۔

ابتدائی سوویت ریاست اسلحہ پر بہت کم خرچ کرتی تھی۔ سوویت ریپبلک کی بنیادی قوت اس کی بین الاقوامیت پر مبنی پالیسی اور عالمی مزدوروں کی حمایت میں مضمر تھی جس نے بالشویکوں کے خلاف 1918-21ء کی فوجی مداخلت کو ناکام بنایا تھا۔ لینن اور ٹراٹسکی نے مزدور ریاست کے دفاع کی مادی ضروریات کی طرف بھی توجہ دی لیکن ان کا اصرار تھا کہ بنیادی ترجیح عوام کی فلاح و بہبود اور معیار زندگی کی بہتری کو دی جانی چاہیے۔ آخری تجزیئے میں عالمی مزدور طبقے کی حمایت کے ساتھ ساتھ یہی چیز مزدور

ریاست کے تحفظ کی حقیقی ضمانت فراہم کرسکتی تھی۔

سٹالنسٹ رجعت کی فتح کے ساتھ ہی یہ سب کچھ تبدیل ہو گیا۔ اپنی محدود اور احمقانہ سوچ کے باعث بیوروکریسی نے اسلحہ سازی کے زبردست پروگرام کے ذریعے عالمی اکھاڑے میں سامراجیت کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کا مکمل انحصار فوجی قوت اور سفارتی چال بازیوں پر تھا۔ سرد جنگ کے تمام عرصے میں فوجی اخراجات سوویت یونین پر ایک بھاری بوجھ بنے رہے۔ مغرب اور روس کے درمیان اسلحہ کی دوڑ میں شدت آنے اور ماسکو اور بیجنگ کی رقیب بیوروکریسیوں کے درمیان مجرمانہ تصادم کے باعث اسلحہ پر ہونے والے اخراجات میں تیزی سے اضافہ ہوا اور سوویت مزدور طبقے کی پیدا کردہ دولت کا روز افزوں حصہ اس کے لئے صرف ہونے لگا۔

اس کے نتیجے میں سوویت یونین میں ایک طاقت ور ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس تشکیل پا گیا جس کے اپنے مفادات تھے۔ صنعتی پیداوار کا ایک بہت بڑا حصہ یعنی تقریباً 6% بالواسطہ طور پر فوجی شعبے کیلئے مختص ہونے لگا جو سوویت معیشت پر ایک خوفناک بوجھ تھا۔ امریکہ کی طرح سوویت ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس بھی بیوروکریسی کے فوجی دھڑے کے وقار اور مفادات کی دیکھ بھال پر ضخیم رقوم خرچ کرتا تھا۔ اگر مشرق و مغرب دونوں کے یہ اخراجات پیداواری مقاصد کے لئے استعمال کئے جاتے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سے خوفناک غربت کا شکار تیسری دنیا کے ممالک، سرمایہ دار ممالک اور بذات خود سوویت یونین کے تمام سماجی و معاشی مسائل حل کیے جا سکتے تھے۔ لیکن یہ تصور کرنا کہ ان مخاصمتوں کو باہمی ''نیک نیتی'' سے حل کیا جا سکتا تھا ان یوٹوپیائی سوشلسٹوں کے تصورات کی طرف واپسی ہو گی جنہیں یقین تھا کہ سرمایہ داروں کی ''نیک نیتی'' پر انحصار کرتے ہوئے انہیں سوشلزم کو قبول کرنے پر رضامند کیا جا سکتا ہے۔ خارجہ پالیسی بھی داخلی پالیسی کی طرح ایک طرف سامراجیوں اور دوسری طرف سٹالنسٹ بیوروکریسی کے خود غرضانہ مفادات کی عکاسی کرتی تھی۔

صرف 1961ء کے دوران ہی سوویت یونین کے فوجی اخراجات میں 30 فی صد کا زبردست اضافہ کیا گیا۔ کینیڈی انتظامیہ کے تحت امریکہ کے تباہ کن ہتھیاروں میں اضافے سے خوفزدہ ہو کر روس نے بین الاقوامی ایٹمی میزائلوں کی پیداوار 1960ء کی دہائی کے وسط تک 50 سے بڑھا کر 200 کر دی۔ مزید میزائل بردار آبدوزیں تیار کی گئیں۔ بحری جہازوں کے بیڑے نے سمندروں میں امریکی فوجوں کے ساتھ مسابقت کی تیاری شروع کر دی۔ سرد جنگ میں شدت آنے سے اسلحہ کی دوڑ نے قیمتی

وسائل کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہڑپ کرنا اور معیشت پر زبردست دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

مسلح فوجیوں اور ٹینکوں کی تعداد کے حوالے سے روس کو یورپ میں روایتی فوجی برتری حاصل تھی۔ مغرب میں ایٹمی اسلحہ کی تیاری اور فروغ کو اس عدم توازن پر قابو پانے کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ امریکہ اور سوویت یونین کے فوجی مدوں میں اخراجات کے اندازوں میں بہت فرق تھا تاہم 1980ء کے اعداد و شمار معیشت پر پڑنے والے زبردست بوجھ کی واضح نشاندہی کرتے ہیں۔ سوویت اعداد و شمار اپنے فوجی خراجات 17 بلین روبل یا تقریباً 26 بلین ڈالر ظاہر کرتے تھے جب کہ سوویت فوجی اخراجات کے بارے میں امریکی اعداد و شمار 185 بلین ڈالر تھے۔ روسی اعداد و شمار بہت کم کر کے دکھائے گئے ہیں لیکن امریکی اندازے بھی بہت بڑھا چڑھا کر پیش کئے گئے ہیں۔ سٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مطابق جو کہ اطلاعات کا نسبتاً زیادہ قابلِ بھروسہ اور آزاد ذریعہ ہے روس نے 1980ء میں 107 بلین ڈالر جب کہ امریکہ نے 111 بلین ڈالر اسلحہ پر خرچ کئے۔

سوویت یونین کے دفاع کیلئے لینن اور ٹراٹسکی نے زیادہ تر انقلابی پروپیگنڈے اور عالمی مزدور طبقے سے بین الاقوامی اپیل کا سہارا لیا تھا۔ لیکن اب بیوروکریسی ایسا کرنے سے قاصر تھی کیونکہ مغرب میں مزدور طبقے کی انقلابی تحریک ان کی حکمرانی کی بنیاد کو ہی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ بہر طور ایک پارٹی کا مکروہ آمرانہ نظام جس کی معیشت بیوروکریسی کے بوجھ سے سست روی کا شکار تھی ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مزدوروں کے لئے کسی خصوصی کشش کا حامل نہیں تھا اگرچہ تیسری دنیا کے عوام کے حوالے سے یہ بات درست نہیں ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ دفاعی اخراجات کا بوجھ مغرب کے علاوہ سوویت یونین اور اس کے اتحادی ممالک کی معیشتوں کو کچلنے لگا۔ تاہم سامراجی طاقتیں سوویت یونین کے ساتھ کسی سمجھوتے کے ذریعے اسلحہ کی پیداوار کو بہت زیادہ کم کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔ بہت زیادہ کٹوتی کرنے سے نیٹو ممالک میں ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس متاثر ہوتا۔ اس سے ان سرمایہ دارانہ اداروں کی ایک انتہائی اہم منڈی سکڑ جاتی جنہیں متروک اسلحہ کی جگہ نئے اسلحہ جات کو ترقی دینے یعنی سکریپ تیار کرنے کے لئے پیسے دیئے جاتے تھے۔ سرمایہ داری نظام کے تحت کوئی بھی بڑی کٹوتی ابھرتے ہوئے معاشی بحران کو زیادہ شدید کر سکتی تھی۔ سٹالن ازم کے تحت یہ ملٹری بیوروکریسی کے وقار کے مفادات کے منافی حرکت ہوتی۔

تاہم بڑھتے ہوئے تضادات نے سامراجی طاقتوں کو کسی ''سمجھوتے'' کی تلاش پر مجبور کر دیا۔ تمام

سامراجی طاقتیں فوجی اخراجات کے بوجھ کو محسوس کرتی تھیں اور کسی حد تک ان اخراجات میں کمی کی خواہش مند تھیں۔ سوویت یونین میں برژنیف کے دور میں بالخصوص دفاعی شعبے میں کی جانے والی سرمایہ کاری مجموعی قومی پیداوار کے 15 فیصد تک پہنچ گئی جس سے دوسرے شعبوں کے اخراجات میں کمی واقع ہوئی اور ترقی کی شرح کم ہوگئی۔ سالٹ معاہدہ اور دیگر سمجھوتوں کے ذریعے امریکہ کے ساتھ کسی متوازن تعلق کے حصول کی کوشش کا مقصد جزوی طور پر بے جا فوجی اخراجات میں کمی اور جزوی طور پر عالمی توازن کے حصول کی سعی ناکام تھا۔ دونوں غیر ہم آہنگ سماجی و معاشی نظاموں کے درمیان موجود تضادات کے باوجود طرفین جدلیاتی حوالے سے یہ محسوس کرتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ درحقیقت وہ ایک دوسرے کا سہارا لیتے تھے۔ سرمایہ دار اپنے نظام کا جواز فراہم کرنے کی کوشش میں مشرق کی آمرانہ حکومتوں پر انگشت نمائی کرتے تھے جب کہ روسی بیوروکریسی اپنی مراعات یافتہ گروہی حکمرانی کا جواز فراہم کرنے کے لئے ویت نام، مغرب میں پائی جانے والی (بے روزگاری) اور نسل پرستی کی طرف انگلی اٹھاتی تھی۔

ان میں سے کوئی بھی فریق دوسرے کے خلاف کوئی سنجیدہ قدم اٹھانے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک دوسرے کے دائرہ ہائے اثر کو تسلیم کرتے تھے۔ انہوں نے رفتہ رفتہ ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کو بھی فروغ دیا۔ لیکن اس سے ان کے حقیقی تعلق میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سرمایہ دار دنیا اور مسخ شدہ مزدور ریاستوں میں موجود قومیائی ہوئی ملکیتی اشکال کے درمیان بنیادی مخاصمت کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ عالمی تعلقات کو جوں کا توں رکھنے اور ایک عارضی صلح کا ماحول قائم کرنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود صورت حال کشیدہ ہی رہی۔ کسی بھی لمحے دنیا کے ایک یا دوسرے حصے میں دھماکہ ہونے سے سارا ڈھانچہ متاثر ہوسکتا تھا اور پوشیدہ مخاصمتیں سامنے آسکتی تھیں۔

صدر کارٹر کے قومی سلامتی کے مشیر زبگنیف برزنسکی نے ''دی نیویارکر'' کو ایک حیران کن انٹرویو دیا تھا جسے پڑھ کر ''ڈاکٹر سٹرینجی لوف'' نامی فلم کے پاگل جوہری سائنس دان کی یاد تازہ ہو جاتی ہے: ''یہ کہنا غیر درست سوچ کی علامت ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے نسلِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ ایک خود غرضانہ سوچ ہے۔ بے شک یہ ایک ہولناک تصور ہے لیکن خالصتاً شماریاتی حوالے سے دیکھا جائے تو اگر امریکہ اپنا تمام تر ذخیرہ سوویت یونین پر اور سوویت یونین اپنا تمام تر ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ امریکہ پر استعمال کرتا ہے تو بھی اس سے انسانیت کا خاتمہ نہیں ہو جائے گا۔ یہ خود بینی ہے۔ اس

روئے زمین پر اور اقوام بھی بستی ہیں۔" (1)

ریگن انتظامیہ کے دور میں بھی فوجی اور سرکاری حلقوں میں ایٹمی جنگ کی صورت میں سوویت یونین کو تباہ کرنے کی امریکی صلاحیت کے بارے میں بحثیں کی گئیں۔ کولن گرے اور کیتھ پین کے مطابق (جو بعدازاں امریکی حکومت کی ملازمت میں چلے گئے تھے)

:"واشنگٹن کو ایسے جنگی مقاصد کی نشاندہی کرنی چاہیے جن کا نصب العین سوویت سیاسی اتھارٹی کی تباہی اور بعد از جنگ ایسے عالمی نظام کا ظہور ہو جو مغربی اقدار سے مطابقت رکھتا ہو۔۔۔سوویت یونین اپنی حد سے بڑھی ہوئی مرکزیت کے باعث جس کا نچوڑ ماسکو میں موجود وسیع بیوروکریسی ہے، اس قسم کے حملے کا نہایت آسانی سے نشانہ بن جانا چاہیے۔" (2)

بعدازاں ان مصنفین کو سرکاری ملازمتیں دی گئیں اور امریکہ کے فوجی حلقوں میں ان کے نظریات کو رفتہ رفتہ مزید پذیرائی حاصل ہوئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی رائے حکمران طبقے کے فیصلہ کن حصوں کی سوچ کی نمائندگی نہیں کرتی تھی جو سمجھتے تھے کہ ایٹمی جنگ ایک حقیقت پسندانہ انتخاب نہیں ہے۔ ہر طرف ایک بڑی تباہی کا خوف موجود ہونے کے باوجود عالمی جنگ کا کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ جدید صورت حال میں دونوں عالمی طاقتوں کے درمیان ایٹمی جنگ کا مطلب ناگزیر طور پر مکمل باہمی تباہی ہوتا۔ سرمایہ دار طبقہ تفریح کی غرض سے نہیں بلکہ بیرونی منڈیوں پر قبضے، خام مال کے حصول اور دائرہ ہائے اثر قائم کرنے کی غرض سے جنگ کرتا ہے۔ ایٹمی جنگ کا مطلب باہمی تباہی اور کرہ ارض کا خاتمہ ہوتا اور یہی وجہ ہے کہ جنگ نہیں چھڑی۔

اس بات کو سمجھتے ہوئے کہ کسی بھی سماج کو استحکام دینے میں پیداواری قوتوں کا فروغ کلیدی اہمیت رکھتا ہے گورباچوف نے فوجی اخراجات میں کمی کو اپنا مقصد بنایا تا کہ زیادہ سے زیادہ اشیائے صرف پیدا کی جائیں اور سوویت عوام کی بڑھتی ہوئی بے چینی کے مدنظر اس کے معیار زندگی کو بہتر بنایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ سامراج کے ساتھ مذاکرات میں گورباچوف اس سے کہیں زیادہ رعائتیں دینے پر تیار تھا جتنی اسے جواباً پیش کی جاتی تھیں۔ 1980ء کی دہائی میں سامراج اور سٹالنسٹ بیوروکریسی کے درمیان عارضی صلح کی ایک اور وجہ سابق نوآبادیوں کے حد سے متجاوز استحصال کے خطرناک سماجی عواقب بھی تھے۔

سامراج کو نوآبادیوں کی طرف سے واجب الادا قرضے 1300 بلین ڈالر تک پہنچ چکے تھے۔ بڑھتی ہوئی شرح سود اور اس وسیع ہوتی ہوئی خلیج کے باعث تیسری دنیا کے عوام کی محنت کے استحصال میں

شدت آ گئی جس کی وجہ خام مال اور کھانے پینے کی اشیا کی نسبتاً کم قیمت تھی۔ جو کم ترقی یافتہ معیشتوں میں پیداوار کی غالب اشکال تھیں جب کہ تیار شدہ اور صنعتی اشیا کی نسبتاً زیادہ قیمتیں تھیں جنہیں ترقی یافتہ مما لک میں تیار کیا جاتا تھا۔ اس سنگدلانہ استحصال نے انہیں غربت کی ان سطحوں تک گرادیا جو پچھلے پچاس سال میں کسی بھی وقت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ دھماکوں اور انقلابات کے لئے یہ ایک کارگر نسخہ تھا۔

پرامن بقائے باہمی

1914ء سے آج تک کی عالمی تاریخ معاہدوں اور سمجھوتوں کے قیام کی تاریخ ہے جن کے نتیجے میں مزید دھماکے ہوئے۔ ہٹلر کے خلاف جنگ کے دوران نام نہاد جمہوری طاقتوں اور سوویت یونین کے درمیان طے پانے والا عارضی سمجھوتہ جاپانی اور نازی حکومتوں کے شکست کھانے کے بعد زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکا۔ جنگ کے اختتام سے کچھ پہلے روس کی جاپان کے خلاف جنگ میں شرکت کے سلسلے میں اتحادی طاقتوں میں ایک سمجھوتہ طے پایا تھا لیکن سامراجی طاقتوں نے اس پالیسی کو تبدیل کر دیا۔ جاپانی ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار تھے لیکن اس کے باوجود صدر ٹرومین نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر دو ایٹم بم گرانے کا حکم صادر کر دیا۔ یہ بم سوویت یونین کو خبردار کرنے کے لئے تھے کہ اگر اس نے امریکی سامراج کی مرضی پر عمل نہ کیا تو اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔ تاہم سٹالن کو اس بات کا ادراک تھا کہ سامراجی فوجی جنگ سے تھک چکے ہیں اور جنگ کے ختم ہوتے ہی گھر واپس جانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ روسی فوج نے منچوریہ پر حملہ کر دیا اور صرف دس دن کے اندر اندر جاپانی فوج کو شکست دے دی۔ اس طرح یہ بم اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہے۔

بین الاقوامی تعلقات تیزی سے سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں اسلحہ کی دوڑ کا آغاز ہو گیا جس نے 39-1933ء کے دوران ہٹلر کے از سر نو مسلح ہونے کے زبردست پروگرام کو بھی مات کر دیا۔ لیکن اسلحہ کی اس دوڑ میں کسی کو برتری حاصل نہ ہو سکی۔ جونہی ایک سپر پاور کسی شعبے میں برتری حاصل کرنے کی کوشش کرتی دوسری سپر پاور فوراً ہی جوابی کاروائی کر کے توازن بحال کر دیتی۔ سرد جنگ کے بعد ایک دیتانت (détente) کا دور آیا مگر اس کا کردار غیر مستحکم تھا۔ اسلحہ کی دوڑ نے ایک اور مقصد بھی پورا کیا جو یہ تھا کہ مغرب اور سوویت یونین نے اپنے اپنے عوام کی توجہ داخلی مسائل کی بجائے بیرونی

دشمن پر لگا دیں۔ امریکہ نے تیسری دنیا میں ہونے والے دھاکوں کی ذمہ داری سوویت یونین اور سوویت بیوروکریسی کے کاندھوں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف روسی بیوروکریسی نے قدرے بہتر جواز کے ساتھ خود کو ایک ایسے محصور قلعے کے طور پر پیش کیا جسے سامراج سے خطرہ تھا۔

مختلف معاشی و سماجی نظاموں کے درمیان ''امن بقائے باہمی'' لینن کا نہیں بلکہ سٹالن کا خیال تھا۔ لینن نے جولائی 1919ء میں آٹھویں پارٹی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''ہم صرف ایک ریاست میں نہیں بلکہ ریاستوں کے نظام میں رہ رہے ہیں۔ اور یہ بات ناقابل تصور ہے کہ سامراجی ریاستوں کے پہلو بہ پہلو سوویت ریپبلک زیادہ لمبے عرصے تک اپنا وجود قائم رکھ سکے۔ آخر کار ان میں سے ایک دوسرے کو تسخیر کرے گی۔ اس انجام سے پہلے سوویت ریپبلک اور بورژوا ریاستوں کے درمیان متعدد خوفناک تصادم ناگزیر ہیں۔'' (3)

صرف ایک سال بعد سوویت یونین کے اندر مداخلت کرنے والی غیر ملکی افواج کی شکست کے بعد لینن نے کہا ''جنگ کے بعد امن قائم ہو چکا ہے لیکن ہم یہ نہیں بھولے ہیں کہ جنگ پھر ہوگی۔ جب تک سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں موجود ہیں ہم امن سے نہیں رہ سکتے۔ آخر کار ان میں سے ایک دوسرے کو تسخیر کرے گا۔ موت کا گیت یا تو سوویت ریپبلک کے لئے یا پھر عالمی سرمایہ داری کے جنازے پر گایا جائے گا۔ یہ جنگ کے دوران آنے والا امن کا عارضی وقفہ ہے۔''

دو سال بعد لینن نے نئی سوویت ریاست اور سامراجیوں کے درمیان موجود تعلقات کا خلاصہ یوں بیان کیا ''ہمارے درمیان ایک مخصوص توازن موجود ہے، اگرچہ یہ انتہائی نازک اور غیر مستحکم ہے۔ تاہم ایک سرمایہ دارانہ ماحول میں اس قسم کا توازن ہی قائم ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا دورانیہ طویل نہیں ہوگا۔'' سوویتوں کی آٹھویں کانگریس میں لینن نے اسی خیال کا اعادہ کیا تھا ''ہم ایک لمحے کے لئے بھی یقین نہیں کر سکتے کہ سامراجی طاقتوں کے ساتھ تجارتی تعلقات دیرپا ثابت ہوں گے۔ سکون کا یہ وقفہ عارضی ہوگا۔ انقلابات اور عظیم تصادموں کی تاریخ کا تجربہ ہمیں یہ سبق سکھاتا ہے کہ جنگیں بلکہ جنگوں کا ایک سلسلہ ناگزیر ہے۔ سرمایہ دار ممالک کے پہلو بہ پہلو ایک سوویت ریپبلک کا وجود (سرمایہ دار ممالک کے درمیان گھری ہوئی سوویت ریپبلک) سرمایہ داروں کے لئے اس قدر ناقابلِ برداشت ہے کہ وہ جنگ دوبارہ شروع کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے۔'' (4) اور لینن کی پیش گوئی اس وقت درست ثابت ہوئی جب دوسری جنگِ عظیم کے ڈراؤنے خواب نے ''پرامن بقائے باہمی'' کا خاتمہ

کردیا۔

یہ سچ ہے کہ نسبتاً قلیل عرصوں کے لئے ''پرامن بقائے باہمی'' پر عمل درآمد کیا گیا۔ لیکن دو متضاد سماجی نظاموں کے تضادات نے ناگزیر طور پر ناقابلِ مصالحت مخاصمتوں کو جنم دیا۔ سٹالن ازم کی ٹوٹ پھوٹ پر سامراجیوں کی مجنونانہ خوشی اور روس اور مشرقی یورپ میں سرمایہ دارانہ ردانقلاب کے لئے ان کی حمایت سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جنگ کے بعد کے تمام عرصے میں سٹالن ازم اور سامراج کے درمیان وقفے وقفے سے سمجھوتوں اور سفارتی بحرانوں کا سلسلہ جاری رہا۔ 1955ء میں سوویت بیوروکریٹوں اور سامراجیوں کے درمیان جنیوا میں ملاقات ہوئی جو پوسٹ ڈیم میں ہونے والی ملاقات کے دس سال بعد ہوئی تھی۔ مذاکرات کا دوبارہ آغاز 1959ء میں خروشیف کے دورہ امریکہ کے موقع پر ہوا۔ 1961ء میں کیوبا کے میزائلوں کے بحران کے بعد مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں اگلے سال ایٹمی دھماکوں پر پابندی (این ٹی بی ٹی) کا معاہدہ طے پایا۔ 1969ء میں نکسن انتظامیہ کے حکومت سنبھالنے کے بعد ان تعلقات کے نتیجے میں دیتانت اور تخفیف اسلحہ پر بات چیت اور سمجھوتے طے پائے۔ کابل کی ماسکو نواز حکومت کو سہارا دینے کے لئے افغانستان میں روس کی مداخلت اور ریگن کے امریکی صدر منتخب ہونے کے بعد دونوں عالمی طاقتوں کے درمیان سفارتی تعلقات خراب ہونا شروع ہو گئے جس کے نتیجے میں بعض سیاسی تجزیہ نگاروں کے بقول ''دوسری سرد جنگ'' کا آغاز ہو گیا۔

روس، امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے درمیان مذاکرات اور ریگن گورباچوف سربراہ ملاقات کے بارے میں فرض کیا گیا تھا کہ ان سے ''عالمی امن'' کی ضمانت فراہم ہو گی۔ ان سربراہ ملاقاتوں سے یہ خوش فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ عالمی امن اور بین الاقوامی ہم آہنگی (پرامن بقائے باہمی) کا حصول سٹالنسٹ نوکرشاہیوں اور سامراجیوں کے درمیان ''نیک خواہش'' کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ بات بنیادی طور پر غلط ہے۔ سرمایہ دار ممالک میں آنے والے 1980ء کی دہائی کے معاشی ابھار کے ساتھ ساتھ سامراج کے اندرونی تضادات اور سٹالنسٹ ریاستوں کے بحران نے عالمی طاقتوں میں ایک باہمی سمجھوتے پر پہنچنے کی عارضی خواہش کو جنم دیا تھا لیکن بنیادی سچائی یہ تھی کہ معاملہ دو بالکل متضاد سماجی نظاموں کا تھا جو غیر معینہ عرصے تک ایک دوسرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ بنیادی مخاصمت کو محض عارضی طور پر ہی کم کیا جا سکتا تھا۔

1980ء کی دہائی میں گورباچوف مایوسی کے عالم میں عالمی سامراج کے ساتھ کسی قسم کے سمجھوتے

پر پہنچنے کے لئے بے چین تھا۔ سرمایہ دار طاقتوں کے ساتھ سمجھوتے کی کوشش میں سوویت قیادت نے انقلاب کی حکمتِ عملی کو کھلم کھلا ترک کر دیا اور طبقاتی جدوجہد کی ضرورت سے انکار کر دیا۔ حقیقت میں وہ صرف اس پوزیشن پر مہر تصدیق ثبت کر رہے تھے جو انہوں نے مدت سے اختیار کر رکھی تھی۔ مشرقی جرمنی کے سابق سٹالنسٹ ایرک ہونیکر نے نہایت بے شرمی سے برطانوی اخبار ''مارننگ سٹار'' میں لکھا ''انسانوں میں سماج کے مختلف بلکہ مخالف طبقات کے لوگ بھی شامل ہیں۔ ان کا دائرہ مزدور طبقے سے لے کر خود مالیاتی سرمائے کے حلقوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہم بین الاقوامی تعلقات کو کسی بھی طور بندھی ٹکی طبقاتی جدوجہد تک محدود کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔''

اسی طرح گورباچوف کے دورہ برطانیہ کے موقع پر 5 اپریل 1988ء کے ''مارننگ سٹار'' نے یہ پر مسرت اعلان کیا ''نئی سوچ امن، سلامتی اور انصاف جیسی آفاقی انسانی اقدار پیش کرتی ہے، اقدار جو ہماری قومیت، مذہب، نظریئے یا طبقے سے قطع نظر ہم سب میں مشترک ہیں؛ اقدار جو اس قسم کے تمام اختلافات سے بالاتر ہیں۔''

یہ جذبات بدترین قسم کی یوٹوپیا پرستی پر مبنی تھے۔ گورباچوف سٹالن سے ناطہ توڑنے کا دعوی کرتا تھا جس پر وہ بیوروکریسی کے تمام گزشتہ جرائم کا الزام دھرتا تھا۔ تاہم اس نے سٹالن ازم کے بنیادی تصورات کو اپنا رکھا تھا جن کے مطابق روسی سماج ایک طرف بیوروکریسی اور دوسری طرف مزدور طبقے میں منقسم تھا۔ وہ سٹالن کی اس بکواس کو بھی قبول کرتا تھا کہ سرمایہ دار ریاستوں اور ایک مسخ شدہ مزدور ریاست یعنی سوویت یونین کے درمیان ''پر امن بقائے باہمی'' غیر معینہ عرصے کے لئے قائم رہ سکتی ہے۔ تاہم عالمی تعلقات کو طے شدہ بلاکوں کی شکل میں منجمد کر دینے کی کوشش ناگزیر طور پر ناکام ہوگئی جس سے عالمی تاریخ میں ایک نئے اور پر آشوب دور کا آغاز ہوا۔ مشرقی یورپ کی نوکر شاہانہ حکومتیں بکھرنے لگیں اور بحران کا شکار ہوگئیں جبکہ یہ بات سٹالنسٹوں اور سامراجیوں دونوں کے لئے غیر متوقع تھی۔

مشرقی یورپ کا بحران

سٹالن ازم کے بحران نے مشرقی یورپ کو بالخصوص زیادہ شدت سے متاثر کیا کیونکہ قومی جبر کے احساس نے نوکر شاہانہ نظام کے تعطل کو مزید گھمبیر کر دیا تھا۔ پولینڈ کے مزدور طبقے کی شاندار انقلابی

روایات نے بارہا اپنا اظہار کیا' پہلے 1956ء میں پھر 76-1970ء اور 1980ء میں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ 81-1980ء میں پولینڈ کے جرات مند مزدور طبقے نے نوکر شاہانہ نظام قریب قریب الٹ ہی دیا تھا۔ طاقتور سولیڈ یریٹی تحریک اپنے ایک کروڑ ارکان کی مدد سے اقتدار پر قبضہ کر سکتی تھی۔ المیہ یہ ہوا کہ پولینڈ کی اس انقلابی تحریک کے ساتھ سولیڈ یریٹی کی قیادت نے غداری کی جس پر لیخ ولیسا جیسے اصلاح پسند مشیروں اور کیتھولک مسلک سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کا غلبہ تھا۔ یہ پرت حکمران بیوروکریسی سے سمجھوتہ چاہتی تھی جو سیاسی انقلاب کی سمت بڑھتی ہوئی مزدور طبقے کی تحریک سے خوفزدہ تھی۔ سٹالنسٹ حکومت کے ساتھ سمجھوتے کی اس کوشش کے نتیجے میں تحریک کو شکست ہوئی اور اقتدار جنرل جیروزلسکی کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ 1982ء میں سولیڈ یریٹی پر پابندی لگا دی گئی۔ تاہم نظام کے تعطل اور ہڑتالوں میں اضافے کے باعث جیروزلسکی نے سولیڈ یریٹی کی اصلاح پسند قیادت میں ناچاقی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ آخر کار کمیونسٹ پارٹی کی قیادت نے پولینڈ کو نوزائیدہ سرمایہ داروں کے حوالے کر دیا جس میں عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ نجی شعبے کے ہاتھوں فروخت ہونے والی فرموں کا بڑا حصہ پرانی اشرافیہ کے ہاتھوں میں آ گیا۔

حکومت ولیسا پر زیادہ سے زیادہ انحصار کرتے ہوئے اس کے حامیوں کو اپنے دائرہ اثر میں شامل کرنے اور مزدوروں کو عملی اقدامات سے روکنے کے لئے استعمال کرنے لگی۔ گول میز کانفرنس پہلی بار اگست 1988ء میں ہوئی اور پھر فروری 1989ء میں سیاسی اصلاحات اور معاشی استحکام کے لئے کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی غرض سے مذاکرات کا آغاز ہوا۔ ''سمجھوتے اور وفادارانہ تعاون'' کی توقع رکھنے والے وزیر داخلہ لیفٹیننٹ جنرل کززاک نے کہا کہ اگر کوئی سمجھوتہ ہو گیا تو سولیڈ یریٹی کو قانونی قرار دے دیا جائے گا۔ مذاکرات کے دوران ولیسا نے ہڑتالوں کو عارضی طور پر معطل کرنے کی کال دی اور وہ بیوروکریسی کے اصلاح پسند دھڑے کے ساتھ تعاون کے لئے بے چین نظر آتا تھا۔ اپریل میں کفایت شعاری کے پرگرام اور مارکیٹ اکانومی کی جانب پیش رفت کا سمجھوتہ طے پا گیا۔

پرانے سٹالنسٹ نظام کی ٹوٹ پھوٹ شدید داخلی تضادات کے نتیجے میں عمل میں آئی تھی۔ 1989ء کے انتخابات میں سولیڈ یریٹی کی فتح ایک ایسی بورژوا حکومت کی فتح کو ظاہر کرتی تھی جو پولینڈ میں سرمایہ داری کی بحالی کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی۔ ولیسا کا بطور صدر انتخاب اس جانب ایک مزید قدم تھا۔ جولائی 1989ء میں سولیڈ یریٹی نے ایوان زیریں (سیم) کی ان 35 فیصد سیٹوں پر

فیصلہ کن فتح حاصل کی جن پر انتخابات لڑنے کی اسے اجازت دی گئی تھی۔ سینٹ میں انہیں 100 میں سے 99 نشستیں حاصل ہوئیں۔ حکومت میں سے 33 اراکین پہلا انتخابی مرحلہ جیتنے کیلئے درکار 50 فیصد ووٹ نہ ملنے کے باعث نااہل قرار دے دیئے گئے۔ جیروزلسکی نے سولیڈیریٹی کو حکومت میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ ولیسا نے جیرزلسکی سے کہا کہ سولیڈیریٹی اسے صدر کے طور پر قبول کرلے گی۔ اس نے پی یو ڈبلیو پی پر زور دیا کہ وہ مزید ''اصلاحات'' کرے۔ ایک بار حکومت میں آجانے کے بعد سولیڈیریٹی کی قیادت نے مزدور طبقے سے منہ پھیر لیا۔ ایک آزمودہ روایت کا اعادہ کرتے ہوئے ماضی کے منحرف اور پرانے وقتوں میں ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کے حامی جیسک کورون کو محنت کی وزرات کا قلمدان سونپا گیا۔ یہ چور شکاری کو جانوروں کا نگران مقرر کرنے کے مصداق تھا۔ وال سٹریٹ جرنل نے 10 نومبر 1989ء کو کورون کے یہ الفاظ نقل کیے۔ ''ایک طویل عرصے تک عوام ہڑتال نہیں کر سکتے تھے اس لیے ضروری تھا کہ کوئی ان کی خاطر لڑے۔ میں نے یہی کام کیا۔ میں ہڑتالوں کے سلسلے میں تعاون کیا کرتا تھا۔ اب میرے لئے ضروری ہے کہ انہیں ختم کروں۔'' اس ماہ تقریباً 44 برس بعد پولینڈ اور ویٹیکن (Vatican) کے درمیان مکمل سفارتی تعلقات قائم ہو گئے۔

جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی سامراجیوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے میں کوئی سستی نہیں دکھائی۔ جارج بش نے فوراً ہی پولینڈ کا دورہ کیا اور جیروزلسکی کی جانب سے متعارف کروائی جانے والی اصلاحات کو ''ناگزیر'' قرار دے کر ان کا استقبال کیا۔ فنڈ کا وعدہ کیا گیا مگر ان کی مقدار نہایت قلیل تھی۔ بش نے گڈانسک شپ یارڈ کا دورہ کیا جہاں 20000 کے مجمع نے اس کا استقبال کیا۔ پھر وہ ہنگری گیا جہاں 10000 افراد نے اس کا استقبال کیا۔ بعدازاں اس نے پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے فری مارکیٹ کے قیام کے لئے ہنگری کی جانب سے کی جانے والی اصلاحات کو سراہا، ریاستی کنٹرول کی مذمت کی اور کثیر الجماعتی سیاست کی ضرورت کو اجاگر کیا۔ بڈاپسٹ کی کارل مارکس یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے اس نے کہا کہ وہ ہنگری میں منڈی کی طرف پیش رفت کے سلسلے میں بین الاقوامی امداد پر زور دے گا۔

اگست تک پولینڈ کی قومی اسمبلی ٹیڈیوس میندوویکی کو وزیر اعظم منتخب کر چکی تھی جس کی حکومت میں سولیڈیریٹی کے علاوہ متحدہ کسان پارٹی اور جمہوری پارٹی بھی شامل تھیں۔ اس وقت کی سولیڈیریٹی 1980-81ء کے مقابلے میں ایک بالکل مختلف تنظیم بن چکی تھی۔ اس کی ممبرشپ 10 ملین سے کم ہو کر

2.2 ملین رہ گئی تھی۔ایک عشرے کے دوران وہ منقسم ہو کر سیاسی طور پر انحطاط پذیر ہو چکی تھی۔مزدوروں کی شراکت میں کمی کے ساتھ ساتھ اس کی قیادت بورژوازی کی جانب جھکتی گئی۔1990ء تک اس کی ممبر شپ کم ہو کر 1 ملین رہ گئی۔

دوسری جانب پرانی سرکاری یونین (OPZZ) کے ممبران کی تعداد 5 ملین تھی اور وہ نج کاری کے خلاف ہڑتالوں کی دھمکی دے رہی تھی۔تجربے کی بنیاد پر مزدور ولیسا کے خلاف ہو رہے تھے۔در حقیقت (OPZZ) کوئی حقیقی ٹریڈ یونین نہیں بلکہ بیوروکریسی کا ایک حصہ تھا۔لیکن نظام کے بحران کا شکار ہونے کی وجہ سے اس نے ریاست سے نسبتاً زیادہ سے زیادہ آزاد ہو کر منظّم انداز میں مزدوروں کے مفادات کا دفاع کرنا شروع کر دیا۔انہیں سولیڈیریٹی کی حمایت سے بننے والی میزوویکی حکومت کے کفایت شعاری کے پروگرام کی مخالفت پر مجبور ہونا پڑا۔کسانوں کی طرف سے ردعمل اور بھی زیادہ شدید تھا جنہیں مارکیٹ اکانومی کے باعث تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔

ولیسا سرمایہ دارانہ ردانقلاب کا پر جوش چمپیئن بن گیا اور پولینڈ میں غیر ملکی سرمایہ کاری کی ہمت افزائی کے لیے بیرونی دورے کرنے لگا۔اس نے امریکہ کے کاروباری حضرات کو بتایا کہ ''ہمیں پولینڈ کی اسی فیصد معیشت کے لئے خریداروں کی تلاش ہے۔وہ ہمیں پولینڈ میں نہیں مل سکتے کیونکہ پولینڈ والے بہت غریب ہیں۔'' اس طرح پولینڈ کی قوم پرستی کے علمبرداروں نے سب سے زیادہ بولی دینے والے غیر ملکیوں کے ہاتھوں معیشت فروخت کرنے کا کام شروع کر دیا۔1980-81ء میں عوامی تحریک کی راہنمائی کرنے والے اب بیوروکریسی کے اس دھڑے کا حصہ تھے جو سرمایہ داری کی حامی تھی۔لیکن معجزانہ تبدیلی کی یہ کوئی واحد مثال نہیں تھی۔سابق سٹالنسٹ لیڈروں نے مارکیٹ اکانومی کے لئے اپنا ''کمیونزم'' ترک کر دیا۔12 ستمبر 1989ء کو ''دی ٹائمز'' نے رپورٹ دی ''استعفوں کی بھرمار ہو گئی ہے کیونکہ بیوروکریٹ نجی کمپنیوں میں جا رہے ہیں یا کچھ صورتوں میں ان ریاستی کمپنیوں کے حصص خرید رہے ہیں جن کی ابھی ابھی نجکاری ہوئی ہے اور جنہیں وہ چلایا کرتے تھے۔'' دوسری سٹالنسٹ ریاستوں کی طرح اس وقت مزدور طبقے کی کچھ پرتوں میں بھی سرمایہ داری کے بارے میں خوش فہمیاں پائی جاتی تھیں۔وارسا کے قریب واقع ارسس ٹریکٹر فیکٹری میں کام کرنے والے 10 ہزار مزدوروں نے ہڑتال کی دھمکی دیتے ہوئے اپنے کارخانے کی نج کاری کا مطالبہ کیا''اور انقلابی تبدیلی متعارف کروانے میں ناکام رہنے پر انتظامیہ کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار کیا۔''(5) یہ بات سٹالن ازم کے دیوالیہ پن اور بیوروکریسی کے

پیدا کردہ اس تعطل پر ایک تباہ کن تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے جس کا پولینڈ شکار تھا۔ تاہم پانچ سال کے اندر اندر ان خوش فہمیوں کو مکمل طور پر ختم ہو جانا تھا۔ اس سے ملتا جلتا عمل ہنگری کی سوشلسٹ پارٹی کے حوالے سے رونما ہوا۔

گورباچوف نے پی یو ڈبلیو پی پر زور دیا تھا کہ وہ مشترکہ حکومت میں شامل ہو جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وزارتِ داخلہ اور وزارتِ دفاع حاصل کر لی۔ نئی بورژوا رجحان رکھنے والی مشترکہ حکومت نے تیز رفتاری سے کفایت شعاری کے اقدامات متعارف کروائے۔ فنانس منسٹر بلسیر وز کا منصوبہ یہ تھا کہ کلیدی ریاستی چھوٹ ختم کر دی جائے، تنخواہوں کی انڈیکسنگ تبدیل کی جائے، سوشل سکیورٹی کا از سر نو جائزہ لیا جائے، قیمتوں پر کنٹرول ختم کیا جائے، مالیاتی پالیسی سخت کی جائے، اخراجات میں کمی کی جائے اور نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ سٹاک ایکسچینج دوبارہ کھول دی گئی اور زلوٹی (پولش کرنسی) کی قیمت میں کمی کر دی گئی۔ تاہم پہلی پانچ کمپنیوں کی نج کاری کے لئے صرف ساٹھ افراد کی قطار لگی۔ نام نہاد "تعمیر نو" کے بارے میں بہت خوف اور بے چینی پائی جاتی تھی جس سے بڑے پیمانے کی بیروزگاری اور فرموں کے دیوالیہ ہونے کا خطرہ تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق اپوزیشن کے منحرف امیدوار ٹائی مسکی کو انتخابات کے پہلے مرحلے میں ووٹ دینے والوں کی 40 فیصد تعداد کا کہنا تھا کہ انہوں نے نج کاری کے خوف کی وجہ سے ووٹ دیئے ہیں۔

میزوویکی حکومت کے وحشیانہ حملوں کے نتیجے میں ہونے والی وسیع بے روزگاری، پیداوار میں کمی اور قیمتوں میں اضافے نے یکبارگی مزدور طبقے کو سکتے میں مبتلا کر دیا۔ لیکن اس کی تہہ میں موجود بے چینی نے انتخابی محاذ پر خود کو واضح طور پر ظاہر کیا۔ کفایت شعاری کے پروگرام کی مخالفت بڑھنے کے نتیجے میں صدارتی انتخابات میں میزوویکی تیسرے نمبر پر آ گیا۔ جس طرح سے ان پالیسیوں پر عمل درآمد ہو رہا تھا اس کے باعث ولیسا ان سے لاتعلقی برتنے پر مجبور ہو گیا اور کہا کہ ان میں عام آدمی کے احساسات کا خیال نہیں رکھا گیا۔ سابق "کمیونسٹ" بیوروکریٹوں کے نجی مالکان میں تبدیل ہونے کا نظارہ ان عوامل میں سے ایک تھا جنہوں نے نفرت وحقارت کی آگ کو سب سے زیادہ بھڑکایا۔

14 جولائی 1990ء کے شمارے میں دی انڈیپنڈنٹ نے لکھا "پولینڈ میں سرمایہ داری کی طرف واپسی کی دوڑ میں شامل کچھ تیز ترین افراد میں بذاتِ خود کمیونسٹ بھی شامل ہیں۔ جن کمیونسٹ اداروں کی سب سے پہلے نج کاری ہوئی ان میں غذا کو منجمد کرنے والی بہت بڑی کمپنی اگلوپول بھی شامل تھی۔ اس

کے حصہ داروں میں ایک سابق نائب وزیرِ اعظم، سابق کٹھ پتلی کسان پارٹی کا ایک لیڈر اور چند ایک کمیونسٹ ادارے شامل ہیں۔ اتفاق سے اس کا پہلا ڈائریکٹر بھی زراعت کا نائب وزیر تھا جس نے اس کے لیے بڑی بڑی ریاستی امدادی رقوم کا اہتمام کیا۔۔۔کمیونسٹ اشرافیہ کے ریاستی فرموں کی لوٹ کھسوٹ میں سب سے آگے ہونے کی وجہ سے پولینڈ کے دوسرے لوگ سخت غصے میں ہیں۔''

اس طرح پولینڈ میں سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک نے اطمینان وخوشحالی کے نئے دور کا آغاز کرنے کی بجائے اور زیادہ گہرے تضادات کو جنم دیا ہے۔ دی گارڈین کے الفاظ میں ''جو لوگ اپنی معیشتوں کو منڈی کی معیشت میں تبدیل کرنے میں کامیابی چاہتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے شہریوں کو سخت اذیت میں مبتلا کریں۔ کامیابی کی خواہش جتنی شدید ہوگی انہیں اسی قدر زیادہ اذیت دینا پڑے گی۔'' مشرقی یورپ کے بڑھتے ہوئے بحران کی وجہ سے گورباچوف نے جتلا دیا تھا کہ کریملن پولینڈ یا مشرقی یورپ کے کسی بھی ملک کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا۔ وہ ان ممالک کو مشکلات سے نکالنے کی قیمت ادا کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ سوویت یونین کو بذاتِ خود بھی بڑھتے ہوئے قومی مسائل کا سامنا تھا جو بالٹک کی ریاستوں کے علاوہ جارجیا، آذربائیجان اور دوسری سوویت جمہوریاؤں میں اسے درپیش تھے۔ درحقیقت گورباچوف نے اولڈ گارڈ کے خلاف جو کہ اس کی پالیسیوں کی مخالفت کرتے تھے مشرقی یورپ کے ''اصلاح پسند'' لیڈروں کا سہارا لیا۔ اس نے ہونیکر کی مخالفت کی تھی اور جب جون 1989ء میں مغربی جرمنی کے دورے کے دوران اس سے دیوار برلن کے بارے میں سوال کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ '' کچھ بھی ابدی نہیں ہے۔'' اور یہ کہ ''ایک بار وہ حالات ختم ہو جائیں جنہوں نے اس کی ضرورت کو جنم دیا تھا تو یہ غائب ہوسکتی ہے''۔ اس طرح اپنے ارادوں سے قطع نظر گورباچوف نے عملاً مشرقی یورپ کے سٹالنسٹ لیڈروں کو ان کے حال پر چھوڑ کر مغرب کی طرف سے مداخلت کی راہ ہموار کر دی۔

سامراجی ممالک قرضے دینے کے وعدے کر رہے تھے اور یہاں تک کہ سرمایہ داری کی بحالی میں مدد دینے کے لئے ایک مارشل پلان کا ذکر بھی کر رہے تھے۔ تاہم یہ سب کچھ زبانی جمع خرچ کی حدود سے آگے کم ہی بڑھا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد شروع کئے جانے والے مارشل پلان اور موجودہ صورتحال کے درمیان فرق کو ایک ہی نظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ امریکہ نے 1948ء اور 1952ء کے درمیان 13 بلین ڈالر مہیا کیے تھے جو آج کل کی قیمتوں کے مطابق 69 بلین ڈالر بنتے ہیں اور اس کے علاوہ 13.9

بلین ڈالر۔ یہ قرضے اور امداد اس غرض سے دیئے گئے تھے کہ جنگ کے بعد کی یورپی معیشت کو انقلاب کے خطرے کے خلاف سہارا دیا جا سکے۔ اس کے مقابلے میں سابق سٹالنسٹ ممالک کو دی جانے والی رقوم معمولی تھیں۔ مغرب ان حکومتوں کے استحکام کے سلسلے میں بہت محتاط ہے اور زیادہ بڑی مالی امداد دینے سے ڈرتا ہے کیونکہ وہ با آسانی غائب ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ 26 ستمبر 1989ء کا وال سٹریٹ جرنل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''یہ پیچیدہ ہے، یہ سیاسی طور پر پیچیدہ ہے، معاشی طور پر پیچیدہ ہے اور انسانی حوالے سے پیچیدہ ہے۔''

مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ میں سٹالن ازم کی ٹوٹ پھوٹ بالکل مختلف انداز میں ہوئی۔ وہاں عوام میدان عمل میں آ گئے اور نوکر شاہانہ حکومتیں ریت کے گھروندوں کی طرح ڈھے گئیں۔ 1989ء کے نومبر، دسمبر میں بڑے پیمانے پر ہونے والے عوامی مظاہروں نے مشرقی جرمنی، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی حکومتوں کا خاتمہ کر دیا۔ دیوارِ برلن منہدم ہو گئی اور سٹالن ازم کا خاتمہ ہو گیا۔ تحریک کے پھیلاؤ کے ڈر سے بلغاریہ کی کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار پر قائم رہنے کی غرض سے اپنی ''اصلاح'' کرنے کا فیصلہ کیا۔ دسمبر میں ہونے والی دو گھنٹے کی کامیاب ہڑتال کے بعد پارٹی نے اپوزیشن (یو ڈی ایف) کے ساتھ مذاکرات شروع کرنے کی حامی بھر لی۔

مشرقی جرمنی میں ہیجان

عام طور پر اس بات کا ادراک نہیں کیا جاتا کہ شروع میں مشرقی جرمنی کے پرولتاریہ کی تحریک سرمایہ داری کے حق میں نہیں بلکہ سیاسی انقلاب کی سمت میں تھی۔ مشرقی جرمنی کے مزدور طبقے کے ابتدائی مظاہرے بیوروکریسی کا تختہ الٹنے اور جمہوری سوشلزم متعارف کروانے کے لیے کئے گئے تھے۔ ہونیکر حکومت کا دعویٰ تھا کہ اس نے مئی 1989ء کے کمیونل انتخابات میں 98.85 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے۔ تاہم اگست، ستمبر اور شروع اکتوبر میں 30 ہزار سے زائد لوگوں نے اپنے پاؤں سے ووٹ ڈالے یعنی وہ مغرب کی طرف ہجرت کر گئے۔ اکتوبر میں لیپزگ میں ہونے والے مظاہرے پہلے پچاس ہزار نفوس پر مشتمل تھے پھر ایک لاکھ اور بالآخر تین لاکھ تک پہنچ گئے۔ اس کے لئے بہت جرات درکار تھی۔ سٹالنسٹ تشدد پر اتر سکتے تھے۔ درحقیقت انہوں نے اس بارے میں سنجیدگی سے غور بھی کیا۔ لیکن گوربا

چوف سمجھتا تھا کہ اس کے نتیجے میں ہونے والا دھا کہ جرمنی کی سرحدوں تک ہی محدود نہیں رہے گا۔مشرقی جرمنی کا پرولتاریہ بہت مضبوط تھا، اور مشرقی جرمنی چین نہیں تھا۔ درحقیقت شش وپنج کی تکلیف دہ کیفیت نے حکومت کو اپاہج کر دیا تھا۔

طاقت گلیوں میں منتقل ہوگئی ۔حکومت کی کمزوری کو محسوس کرتے ہوئے عوام کی ہمت میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔مظاہرین کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا۔اگلے ماہ 5 لاکھ افراد نے مشرقی برلن میں مظاہرہ کیا۔ ماسکو کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی نے اپنا اقتدار بچانے کی غرض سے اوپر سے اصلاحات متعارف کروانے کی کوشش کی۔ ہونیکر کی جگہ ایگان کرنز کو لایا گیا اور ایک نئی حکومت تشکیل دی گئی۔ بدقسمتی سے سب سے بڑے اپوزیشن گروپ نیوفورم کے پراگندگی کے شکار رہنما نہ تو اپنی منزل سے واقف تھے اور نہ ہی راستے سے۔اقتدار کا سوال واضح اور جرات مندانہ انداز میں اٹھائے بغیر عوام کو زیادہ عرصے کے لئے ایک مستقل ہیجان کی کیفیت میں رکھنا ناممکن ہے۔

تحریک کا آغاز ہنگری آسٹریا کی سرحد کھلنے سے ہوا جو دیوار برلن میں پڑنے والا پہلا شگاف تھا۔ کسی واضح متبادل کی عدم موجودگی میں فرار کا رجحان شدت اختیار کر گیا۔12-11 نومبر کے اختتامی ہفتہ کے دوران تقریباً 20 لاکھ افراد بھاگ کر مشرقی جرمنی سے مغربی جرمنی پہنچ گئے۔اب یہ لاکھوں لوگ مشرقی جرمنی کی روکھی پھیکی زندگی کے مقابلے میں یورپ کی امیر ترین سرمایہ دار معیشت مغربی جرمنی میں دستیاب اشیائے صرف کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے تھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس بات کا بہت اثر ہوا۔تاہم اگر مزدوروں اور نوجوانوں کے سامنے قابل نفرت بیوروکریسی کا تختہ الٹنے، مشرقی جرمنی میں مزدور جمہوریت نافذ کرنے اور پھر پولینڈ، چیکوسلواکیہ، ہنگری، روس اور مغرب کے مزدوروں سے بین الاقوامی اپیل کرنے کا انقلابی پیش منظر رکھا جاتا تو صورتِ حال تبدیل ہوسکتی تھی۔

چند ماہ کے اندر مشرقی جرمنی کی سٹالنسٹ حکومت ریت کے گھروندے کی طرح ڈھے گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مشرقی جرمنی میں سرمایہ داری کسی متبادل کی عدم موجودگی کے باعث کامیاب ہوئی۔مغرب کے شوروغوغا کا مقابلہ کرنے کے لئے کوئی متبادل نہیں پیش کیا گیا۔سٹالنسٹ حکومت اپنی ساکھ کھو بیٹھی تھی۔ عوام آزادی کے لئے بے چین تھے۔مزید برآں مغربی جرمنی نے متحدہ جرمنی کے حق میں پروپیگنڈہ کیا۔مشرقی جرمنی کی معیشت کے زوال کو دیکھتے ہوئے بہت سے لوگوں نے اتحاد کو بلند معیار زندگی کا

راستہ خیال کیا۔مغربی جرمنی کا طاقت ور سرمایہ دارانہ نظام جرمنی کے اتحاد کی خاطر بہت بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار تھا اور اس مہنگی پالیسی کے باعث پبلک فنانس کو زبردست دھچکا لگا۔مشرقی جرمنی کے مارک کا مغربی جرمنی کے مارک سے ایک کے مقابلے میں ایک کی بنیاد پر تبادلہ مشرقی جرمنی کے عوام کو یہ جتلانے کے لئے ایک زبردست رشوت کی پیش کش تھی کہ انہیں بھی متحدہ جرمنی میں مغربی جرمنی جیسا معیار زندگی میسر ہوگا۔ یہ وعدہ جھوٹا تھا لیکن ایک حقیقی سوشلسٹ متبادل کی عدم موجودگی میں جرمن اتحاد کے حق میں پیش کیا جانے والا استدلال یک طرفہ طور پر جیت گیا۔مشرقی جرمنی کا نظام تیزی سے ٹوٹ رہا تھا۔ سرحدیں کھول دی گئیں۔

ماسکو نے ناقابل یقین ترش روئی کے ساتھ اعلان کیا کہ یہ تبدیلیاں بہتری کے لئے ہیں۔مشرقی جرمنی کے عوام کو کئی دہائیوں تک غاصبانہ نظام تلے دبائے رکھنے کے بعد اب یہ شریف لوگ سرمایہ داری کی بحالی پر اطمینان کا اظہار کر رہے تھے۔لیکن جو کچھ ہوا وہ مشرقی جرمنی کے مزدوروں کی حقیقی خواہشات کی عکاسی نہیں کرتا تھا۔اتحاد کے چند برس بعد لئے جانے والے رائے عامہ کے ایک جائزے سے ظاہر ہوا کہ سابق مشرقی جرمنی کے عوام کی ایک واضح اکثریت نے سابقہ نظام کے بارے میں پوچھے جانے والے سوال کے جواب میں کہا کہ وہ بالکل ہی برا نہیں تھا اور یہ کہ وہ سوشلزم کی حمایت کریں گے بشرطیکہ وہ جمہوری بنیادوں پر قائم ہو۔اس کا مطلب ہے کہ مشرقی جرمنی کے مزدور اور نوجوان سرمایہ داری کے لئے نہیں بلکہ حقیقی سوشلزم کے لیے لڑ رہے ہیں۔اگر وہ کامیاب نہیں ہوئے تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہوں نے کوشش کرنے میں کوئی کسر اٹھا رکھی تھی بلکہ اس کی وجہ ایسی قیادت کا فقدان تھا جو اپنے نام کی لاج رکھ سکتی۔سامراجی اپنی قسمت پر یقین نہیں کر پا رہے تھے۔بش نے کہا کہ وہ اس پر نازاں ہے۔کوہل جرمن اتحاد کے چیمپئن کے طور پر سامنے آیا۔حقیقت میں اسے اس زبردست ہجرت کے باعث اس عمل پر مجبور ہونا پڑا جس سے دونوں حکومتوں کو تباہی کا خطرہ درپیش تھا۔اس وقت تک منڈی کی معیشت اور مشرق کی سستی مزدوری کو مغرب کے سرمائے اور جدید صنعت کے ساتھ جوڑنے کے امکانات کے بارے میں بہت خوش فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں۔کسی سنجیدہ مارکسسٹ متبادل کی عدم موجودگی اور گورباچوف کی رضامندی کے ساتھ یہ اتحاد مغرب کی شرائط پر روبہ عمل لایا گیا۔اس سے تحریک کا رخ سیاسی انقلاب کی طرف سے مڑ گیا اور مشرقی جرمنی کے مزدور طبقے کو شکست ہوگئی۔

مشرقی جرمنی کی کمیونسٹ پارٹی نے کرنز کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور بذریعہ ووٹ اپنا نام تبدیل

کر کے جمہوری سوشلسٹ پارٹی رکھ لیا۔اس کی جگہ نئی موڈرو حکومت نے مئی 1990ء میں نئے آزادانہ انتخابات کروانے کا وعدہ کیا اور پھر انہیں مارچ میں قبل از وقت کروایا۔مشرقی جرمنی کی تاریخ میں پہلی بار موڈرو کو حکومت میں بہت سے غیر کمیونسٹوں کی بھی شرکت کی اجازت دینے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔مارچ 1990ء کے عام انتخابات کا نتیجہ قدامت پسند کرسچین ڈیموکریٹوں کی فتح کی صورت میں برآمد ہوا جنہوں نے اتحاد کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔کوہل کی شہرت اور مالی امداد کے بل بوتے پر انہوں نے مغربی جرمنی کے ساتھ ''تیز رفتار مالیاتی اور سیاسی اتحاد'' کی مہم چلا کر تقریباً 50 فیصد ووٹ حاصل کر لئے۔عوامی تحریک کی راہنمائی کا اعزاز حاصل ہونے کے باوجود نیوفورم اور دیگر اپوزیشن جماعتوں کے اتحاد نے محض 2.9 فیصد ووٹ حاصل کیے۔یہ نتیجہ حیران کن نہیں تھا۔ایک ایسی صورتِ حال میں جب بنیادی سوالات بالکل واضح طور پر اٹھائے جا رہے ہوں نیک نیتی پر مبنی لیکن پراگندگی کا شکار غیر واضح درمیانی رستے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔سیاسی انقلاب کی جانب پیش قدمی یا سرمایہ داری کی طرف واپسی۔ان حالات میں کوئی بھی دوسرا راستہ قابلِ عمل نہیں تھا۔

چیکوسلواکیہ، رومانیہ اور ہنگری

چیکوسلواکیہ کے مزدوروں نے 1948ء میں کمیونسٹ پارٹی کے اقتدار پر قبضے کا خیر مقدم کیا تھا۔چیک سٹالنسٹ اس قدر پر اعتماد تھے کہ انہوں نے مزدوروں کو بھی مسلح کر دیا اگرچہ جلد ہی یہ ہتھیار واپس لے لئے گئے۔لیکن سٹالنسٹ حکمرانی کے تجربے نے جلد ہی مایوسی پیدا کر دی۔اس وقت چیکو سلواکیہ مشرقی یورپ میں ترقی یافتہ معیشت کا حامل واحد ملک تھا۔پڑھے لکھے مزدور طبقے اور مضبوط صنعتی بنیاد کے باعث اس نے دیگر حکومتوں کے مقابلے میں بہتر نتائج حاصل کیے اور یہاں معیارِ زندگی بھی بہتر تھا۔لیکن 1968ء میں چیکوسلواکیہ کی بیوروکریسی کے لبرل دھڑے اور الیکزینڈر ردوبسک کی طرف سے محدود اصلاحات نافذ کرنے کی نیم دلانہ کوشش کو کچلنے کی غرض سے کیے گئے روسی حملے نے نوکر شاہانہ نظام کے خلاف عدم اطمینان کو اور شدید کر دیا۔روسی بیوروکریسی کے وحشیانہ رویے نے نوجوانوں کی ایک پوری پرت کو مخالف کر لیا۔روسی ٹینکوں کا استقبال اس قسم کے نعروں سے کیا گیا تھا ''لینن جاگو برژنیف پاگل ہو گیا ہے'' جیسے ہی جبر میں کمی ہوئی مجتمع شدہ تلخی اور محرومی کا لاوا پھٹ پڑا۔

ہمسایہ ملک مشرقی جرمنی میں ہونے والے عوامی مظاہروں اور دیوار برلن کے انہدام نے چیکو سلواکیہ کی تحریک کو زبردست مہمیز دی اور وہ اس سے بھی آگے بڑھ گئی۔ عام ہڑتال ہوئی۔ سارے ملک میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ سٹالنسٹ حکومت نے تحریک کو طاقت سے کچلنے کی کوشش کی مگر اس کا الٹ نتیجہ برآمد ہوا۔ 24 نومبر کو اڑھائی لاکھ افراد نے ویسلاس سکوائر میں مظاہرہ کیا۔ دو دن بعد مظاہرین کی تعداد 5 لاکھ کو پہنچ گئی۔ کمیونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل میلوس جیکس کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

ماسکو کی جانب سے دباؤ پڑنے پر پراگ حکومت نے سوک فورم کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے۔ 27 نومبر کو لاکھوں مزدوروں نے دو گھنٹے کی عام ہڑتال کی حمایت کی جو چالیس سال میں چیکو سلواکیہ میں ہونے والی پہلی ہڑتال تھی۔ سٹالنسٹوں کو شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور انہوں نے بلغاریہ اور مشرقی جرمنی سے بھی پہلے پارٹی کے اس ''راہنما کردار'' کو ختم کر دیا جس کی ضمانت آئین میں فراہم کی گئی تھی۔ چیکوسلواکیہ کی کمیونسٹ پارٹی کو اپنے لیڈروں کو چیکوسلواکیہ پر معاہدہ وارسا ممالک کی چڑھائی کی مذمت کرنے پر مجبور ہونا پڑا جنہیں 1968ء میں روسی ٹینکوں نے ''منتخب'' کیا تھا۔ انہوں نے ایک نئی حکومت کے ذریعے اقتدار پر براجمان رہنے کی کوشش کی جس میں اکثریت غیر کمیونسٹوں کی تھی۔ یہ ایک ذلت آمیز پسپائی تھی جو اپنی جانیں بچانے کی غرض سے اختیار کی گئی تھی۔ دسمبر میں صدر ہساک نے استعفیٰ دے دیا اور اس کی جگہ بورژوازی کے حامی سابق منحرف، واکلیو ہیول کو منتخب کر لیا گیا۔ مشرقی جرمنی کی طرح یہاں بھی صورتِ حال ایک سیاسی انقلاب کی تھی لیکن داخلی عامل کی عدم موجودگی کے باعث اس کا رخ تبدیل ہو گیا۔

بورژوازی کی حامی سوک فورم حکومت نے اعلان کیا کہ وہ یکم جنوری 1991ء سے فری مارکیٹ اکانومی کا پہلا مرحلہ متعارف کروا رہی ہے جس میں توانائی کی قیمتوں میں 390 فیصد اضافہ بھی شامل ہے۔ تھیچرازم کے پیروکار وزیر خزانہ ویکلا ووکلاز نے آئندہ دو یا تین برس میں ریاستی ملکیت میں موجود ایک لاکھ سٹوروں اور دکانوں کی فروخت کا منصوبہ تیار کیا۔ ریاست کی 80 ہزار چھوٹی جائیدادوں کی نیلامی عمل میں لائی گئی جس کے بعد بڑی کمپنیوں کی نجکاری عمل میں لائی جانی تھی۔ لیکن 12 نومبر 1990ء کے فنانشل ٹائمز کے مطابق ''تبدیلی کے قانون کے تحت بڑے پیمانے کی نجکاری اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ثابت ہو گی۔'' اس ''عوامی سرمایہ داری'' کی تخلیق کے لیے شہریوں کو واؤچر جاری کیے گئے! تاہم نجکاری کی ذمہ داری سنبھالنے والے وزیر تریسکا نے اعتراف کیا کہ اسے کمپنیوں کی خریداری کے سلسلے میں

خریداروں کی بھیڑ لگنے کی توقع نہیں ہے۔اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کمپنیوں میں سے بہت بڑی تعداد کے برقرار رہنے کی کوئی امید نہیں۔

چیکوسلواکیہ حکومت سال نو کے موقع پر اٹھائے گئے کفایت شعاری کے اقدامات کے خلاف عوامی ابھار کے خوف سے بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئی۔کلاز نے انتباہ کیا''مجھے ڈر ہے کہ چیکوسلواکیہ یکم جنوری سے شروع ہونے والے عبوری دور پر قابو نہیں پا سکے گا۔۔۔چیکوسلوواکیہ میں ہم تلوار کی دھار پر زندگی گزار رہے ہیں۔''بڑھتے ہوئے معاشی انتشار نے وسیع بے چینی کو جنم دیا تھا اور اس کے نتیجے میں نومبر کے مقامی انتخابات میں سٹالنسٹوں کو تقویت ملی تھی۔چیک جمہوریہ کی قسمت جرمنی کے ساتھ وابستہ ہے۔چیکو سلوواکیہ کی مجرمانہ تقسیم کی ذمہ داری جرمن سامراج کے سر ہے جو چیک اور سلوواک دونوں کے مفادات کے خلاف تھی اور ریفرنڈم ہونے کی صورت میں اس منصوبے کو شکست ہو جاتی۔لیکن پراگ میں جرمن سامراج کے ایجنٹ کلاز نے اس امر کو یقینی بنایا کہ عوام کی رائے نہ لی جائے۔

رومانیہ میں تحریک مزید آگے بڑھی اور چاؤشسکو کی حکومت کا تختہ تشدد کے ذریعے الٹ دیا گیا۔ 1956ء میں ہنگری میں چلنے والی مزدور طبقے کی کلاسیکی تحریک کے خطوط پر چلتے ہوئے حکومت کو ملیا میٹ کر دیا گیا۔1989ء میں 21 سے 25 دسمبر کے درمیان چاؤشسکو نے اجرتوں میں اضافے کے وعدوں سے عوام کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جن کا مذاق اڑایا گیا۔جس ریلی سے وہ خطاب کر رہا تھا وہ منتشر ہو کر حکومت مخالف احتجاج میں بدل گئی اور بعد ازاں حفاظتی دستوں سے شدید تصادم ہوئے۔یہ تصادم پورے ملک میں ہوئے۔سارا نظام انقلاب کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ہنگامی حالات کے نفاذ نے محض صورتِ حال کو بدتر کرنے میں مدد دی۔عوام نے ٹی وی اور ریڈیو سٹیشنوں پر ہلہ بول دیا اور چاؤشسکو اپنی بیوی سمیت بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔فوج مزدوروں کے ساتھ شامل ہو گئی اور حفاظتی دستوں کو شکست دینے میں تعاون کیا۔اس شورش میں 10 ہزار افراد ہلاک ہوئے۔اپوزیشن نے نیشنل سالویشن فرنٹ تشکیل دیا۔ چاؤشسکو خاندان کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔اقتدار مزدوروں کے ہاتھ میں تھا اور ان کے حوالے سے نیشنل سالویشن فرنٹ کے ہاتھ آ گیا جس کی سربراہی ایون الیسکو کر رہے تھے۔صورتِ حال روس کے فروری 1917ء کے انقلاب سے مماثل تھی۔نیشنل سالویشن فرنٹ نے نئی حکومت تشکیل دی اور دسمبر کے اواخر میں کئی فرمان جاری کیے اور اپریل میں آزادانہ انتخابات کا وعدہ بھی کیا گیا اور مغربی بورژوازی ان انتخابات میں نیشنل سالویشن فرنٹ کی فیصلہ کن فتح سے دہشت زدہ ہو گئی۔انہوں نے 66

فیصد ووٹ اور دوتہائی سیٹیں حاصل کر لیں۔ الیسکو 86 فیصد ووٹ حاصل کر کے صدر بن گیا۔ بورژوازی کی کھلم کھلا حمایت کرنے والی جماعتوں کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رومانیہ کے مزدوروں نے انقلاب برپا کیا تھا اور یہی حقیقت ان کے شعور کا تعین کرتی تھی۔

یہ درست ہے کہ نیشنل سالویشن فرنٹ سمیت تمام پارٹیاں مارکیٹ اکانومی کے تصور کو قبول کرتی تھیں لیکن اپوزیشن لیڈروں رتیو اور کمپسو نے سرمایہ داری کو تیزی سے متعارف کروانے کو اپنی انتخابی مہم کا مرکزی نقطہ بنایا۔ انہوں نے فرنٹ کے لیڈروں پر ''کمیونسٹ''، غیر مخلص اور نجکاری کے سلسلے میں نیم دلانہ رویہ رکھنے کا الزام لگایا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ راتیو اور کمپسو کے خلاف ووٹ دینا سرمایہ داری کے خلاف ووٹ دینے کے مترادف تھا۔ نیشنل سالویشن فرنٹ کے سابق سٹالنسٹوں نے زبردست فتح حاصل کی۔ بلاشبہ اس سے سرمایہ داری کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کے موڈ کی عکاسی ہوتی تھی۔ وہ سوشلزم چاہتے تھے مگر آمریت نہیں۔ فیکٹریوں میں مزدوروں کے کنٹرول کے عناصر موجود تھے جن میں سے بہت سی فیکٹریاں مزدوروں کی کمیٹیاں چلا رہی تھیں۔ پرانے مینجر برطرف کر کے نئے مینجر منتخب کئے گئے جنہیں مزدوروں کا اعتماد حاصل تھا۔ بہت سی فیکٹریوں کے مزدور مسلح تھے اور وہ فیکٹری میں ہونے والے اجلاسوں میں کندھوں پر رائفلیں ڈال کر آتے تھے۔ حفاظتی دستوں اور چاؤشسکو حکومت سے تعاون کرنے والے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار یا قتل کر دیا گیا۔ سیاسی انقلاب کے تمام عناصر موجود تھے مگر ایک بار پھر داخلی عنصر موجود نہیں تھا۔ مزدوروں کی تحریک کو ایک شعوری اور منظم اظہار عطا کرنے کے لئے کوئی انقلابی پارٹی موجود نہیں تھی۔

ان حالات کی وجہ سے نیشنل سالویشن فرنٹ کے سابق سٹالنسٹ خلا کو پر کرنے اور تحریک کو غلط راستے پر ڈالنے کے قابل ہو گئے۔ مزدوروں نے پرانے نظام کا تختہ الٹ دیا تھا لیکن وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔ ''سوشلزم'' کے بارے میں زبانی جمع خرچ کے باوجود نیشنل سالویشن فرنٹ کے لیڈر عملی طور پر سرمایہ داری کی جانب بڑھنا چاہتے تھے لیکن صریحاً بورژوا اپوزیشن کے مقابلے میں سست رفتاری کے ساتھ۔ اس وقت کے وزیراعظم پیٹر رومن کے الفاظ میں ''زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ہماری اپوزیشن ہمیں بتاتی تھی کہ ہم رومانیہ کی معیشت کی کبھی اصلاح نہیں کریں گے کہ حکومت اصلاح کے بارے میں صرف باتیں کرنا چاہتی ہے لیکن پرانے نظام کو کبھی تبدیل نہیں کرے گی۔ ان دلائل سے آپ بخوبی آگاہ ہیں کہ ہم ابھی تک حقیقی معنوں میں کمیونسٹ ہیں۔ آج یہ بات کون کہہ سکتا ہے جب ہم مارکیٹ

اکانومی کو متعارف کروانے کے لیے ٹھوس اقدامات اٹھا رہے ہیں۔‘‘(6)

ہنگری میں بیوروکریسی کے اندر پھوٹ پڑنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اصلاح پسند دھڑے نے مارچ 1990ء کے انتخابات میں ایک سنجیدہ چیلنج کے سامنے آنے کے خوف سے اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے۔ ہنگری کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی کی قیادت آزادانہ انتخابات اور اپوزیشن پارٹیوں کی قانونی حیثیت تسلیم کرنے والے انتخابی نظام پر رضامند ہوگئی۔ مشرقی جرمنی کی طرح نیچے سے اٹھنے والے انقلاب کا راستہ روکنے کے لئے اوپر سے اصلاحات نافذ کرنے کی یہ ایک نیم دلانہ کوشش تھی۔ انہوں نے ایسوسی ایشنوں کے بارے میں ایک نیا قانون منظور کر کے سرمایہ داری کی بحالی کا رستہ بھی کھول دیا جو 5 اکتوبر 1989ء کے فنانشل ٹائمز کے مطابق ’’مغربی طرز کی سرمائے کی منڈی کے ڈھانچے کی تشکیل کرتا ہے اور اس قسم کی کمپنیوں کو دوبارہ زندہ کرتا ہے جو کمیونسٹ اقتدار سے پہلے بھی دیکھنے میں نہیں آتی تھیں۔‘‘ 500 تک کی تعداد میں ملازمین رکھنے والی نجی جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کی ملکیت کو قانونی قرار دیا گیا۔ نیشنلائزیشن کے بعد بند کیے جانے کے چالیس سال بعد جولائی 1988ء میں بڈاپسٹ سٹاک ایکسچینج کو دوبارہ کھول دیا گیا۔ اس سے ریاستی اثاثوں کی نجکاری کا عمل شروع ہو گیا اور اگست تک ہنگری اور غیر ملکی سرمائے کے 600 مشترکہ منصوبے شروع ہو چکے تھے۔ گورباچوف نے ہنگری کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی کے سیکرٹری کارولی گراز کے ساتھ ملاقات میں ان اقدامات کی منظوری دے دی۔

نام نہاد آزاد ٹریڈ یونینوں کے قیام کے جواب میں سرکاری یونین زوٹ نے اپنا آئین معطل کر کے خودمختار ٹریڈ یونینوں کی فیڈریشن کی شکل میں خود کو از سرِ نو منظم کر لیا۔ اکتوبر 1989ء میں پرانی ہنگری کی سوشلسٹ ورکرز پارٹی نے اپنا نام تبدیل کر کے ہنگرین سوشلسٹ پارٹی رکھ لیا اور آئینی اصلاحات کے بارے میں اپوزیشن کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے۔ یہ امرے پوز گے کے سرمایہ داری کے حامی دھڑے کی فتح تھی جو ایک زیادہ سوشل نجکاری اور ملی جلی معیشت چاہتا تھا۔ مکمل تطہیر کے بعد نومبر میں ہنگرین سوشلسٹ پارٹی نے دوسری انٹرنیشنل میں شمولیت کی درخواست دے دی۔ جو بچے رہے انہوں نے کچھ سٹالنسٹ گروپ بنا لیے۔

اپوزیشن پارٹیوں کو آزادی سے کام کرنے کی اجازت دینے کے لیے ایک نیا آئین متعارف کروایا گیا۔ انتخابی نظام تبدیل کر دیا گیا اور فیکٹریوں وغیرہ میں پارٹیوں کے کام پر موثر انداز میں پابندی عائد کر

دی گئی اور ورکرز گارڈ کو ختم کر دیا گیا۔اس کے نتیجے میں یورپین یونین اور امریکہ نے مالی امداد کا وعدہ کیا۔ عام انتخابات کے بعد ہنگرین ڈیموکریٹک فورم کا جوزف انتال وزیرِ اعظم بن گیا۔نجکاری نئی بورژوا حکومت کی اولین ترجیح تھی۔انتال نے صنعت کی تیز رفتار نجکاری کے لیے اقدامات اٹھائے جس کا آغاز 30 بڑے اداروں اور 40000 چھوٹے خدمات مہیا کرنے والے اداروں کی نجکاری سے کیا گیا۔انہوں نے بجٹ کے خسارے پر قابو پانے اور منڈی کی معیشت کو فروغ دینے کے لئے آئی ایم ایف کے ساتھ ایک معاہدہ بھی کیا۔

دی انڈیپینڈنٹ نے اپنے 28 نومبر 1990ء کے شمارے میں رپورٹ دی کہ دکانوں کے سلسلے میں مارکیٹ اکانومی کی طرف تبدیلی تیزی سے جاری ہے۔ہنگری کے باشندے خوراک اور دیگر ضروری اشیا کے لئے کم وبیش مغرب کے برابر قیمتیں ادا کر رہے ہیں،حکومت نے تنخواہوں کو مشرقی یورپ کی سطح پر منجمد کر رکھا ہے اور ضابطوں کی بھول بھلیاں ہنگری میں مغربی کاروباری حضرات کی سرمایہ کاری کی راہ میں حائل ہیں۔ہنگری کے چیمبر آف کامرس کے صدر ٹولنے نے شیخی بگھاری کہ ہنگری سرمایہ داری کی بحالی کے سلسلے میں مشرقی یورپ کے تمام ممالک سے آگے ہے! بعدازاں انتال نے 1991ء کو ہنگری کے لئے ''آزمائش کا سال'' قرار دیا تھا۔

تاہم عبوری دور کی ہلچل نے حکومت کے اندر پھوٹ اور بحران کو جنم دیا۔معاشی پالیسی پر زور شور سے بحث مباحثے ہوئے۔مشرقی یورپ کے باقی ممالک کی طرح منڈی کے تجربے نے ہنگری کے عوام کی جانب سے ایک ردعمل کو جنم دیا۔1990ء میں ہی دی انڈیپینڈنٹ آن سنڈے یہ گلہ کر رہا تھا:

''پچھلے سال کمیونزم کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد پیدا ہونے والی رجائیت کی جگہ مستحکم جمہوریتوں اور منڈی کی معیشتوں کی تعمیر سے منسلک مسائل کے ادراک نے لے لی ہے۔''

قومی سوال اور اکتوبر انقلاب

ٹراٹسکی لکھتا ہے''نہ صرف مغربی بلکہ مشرقی سرحدوں پر بھی روس میں قومی جبر ہمسایہ ریاستوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ شدید تھا۔حقوق سے محروم قومیتوں کی بہت بڑی تعداد اور ان کی محرومیوں کی شدت نے زارشاہی روس میں قومیتوں کے سوال کو ایک زبردست دھماکہ خیز قوت بنا دیا تھا۔''(7)

زارشاہی روس قومیتوں کا قید خانہ تھا۔ بالشویک انقلاب کی کامیابی کی کلیدی وجوہات میں سے ایک اس کا قومی سوال کے بارے میں نقطہ نظر تھا۔لینن کو احساس تھا کہ ایک نئی سوشلسٹ فیڈریشن کی تعمیر کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اس کی بنیاد روس میں موجود قومی اقلیتوں کی مکمل برابری پر رکھی جائے۔ایک قوم پر دوسری قوم کا جبر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ایک سوشلسٹ ریپبلک صرف ایک رضا کارانہ بنیاد پر قائم ہوسکتی تھی،یعنی قومیتوں کے رضا کارانہ اتحاد کے طور پر اس کے نتیجے میں پارٹی اور نوخیز سوویت ریپبلک قوموں کے حق خود ارادیت کو تسلیم کرتی تھی جس میں علیحدگی کا حق بھی شامل تھا۔

لینن سابق زارشاہی سلطنت میں شامل اقوام کے اتحاد کے حق میں تھا مگر اس کا ایک رضا کارانہ اتحاد ہونا ضروری تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے شروع ہی سے حق خود ارادیت پر اصرار کیا۔اس تصور کی عام طور پر غلط تشریح کی جاتی ہے یعنی یہ کہ اس کا مطلب علیحدگی کا مطالبہ ہے۔بالشویک علیحدگی کی وکالت نہیں کرتے تھے لیکن قومی حقِ خود ارادیت کی ہر ممکنہ وسعت کا دفاع کرتے تھے جس میں علیحدگی کا حق بھی شامل تھا۔کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی قوم کو ایک ریاست کی حدود میں رہنے پر مجبور کرے جبکہ اکثریت ایسا نہ چاہتی ہو۔لیکن حق خود ارادیت کا مطلب علیحدگی کا مطالبہ نہیں ہے جیسے طلاق کے حق کا مطلب یہ نہیں کہ تمام جوڑے طلاق حاصل کرلیں یا جیسے اسقاط حمل کے حق کا مطلب یہ نہیں کہ تمام حمل لازمی طور پر گرادیئے جائیں۔جیسا کہ ٹراٹسکی روسی انقلاب کی تاریخ میں وضاحت کرتا ہے:

''اس میں بالشویک پارٹی نے کسی طور بھی علیحدگی کی تبلیغ نہیں کی۔اس نے محض قومی جبر کی ہر شکل کے خلاف،جس میں کسی بھی قومیت کو ریاست کی حدود کے اندر جبراً محبوس رکھنا بھی شامل ہے،شدید جدوجہد کے اصول کو اپنایا۔صرف اسی طریقے سے روسی پرولتاریہ بتدریج جبر کی شکار قومیتوں کا اعتماد حاصل کرسکتا ہے۔''(8)

اس کے برعکس بالشویک بورژوا قوم پرستی کے سخت ترین مخالف تھے جو مزدور طبقے کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔بالشویک ایک تنظیم میں تمام مزدوروں کے اتحاد کے حامی تھے چاہے ان کی قومیت،نسل یا مذہب کچھ بھی ہو۔''ایک انقلابی تنظیم مستقبل کی ریاست کا اولین ڈھانچہ نہیں بلکہ محض اس کی تخلیق کا آلہ ہوتی ہے۔آلہ اس قسم کا ہونا چاہیے کہ مطلوبہ چیز تیار کر سکے،اس میں بذات خود وہ چیز شامل نہیں ہونی چاہیے۔''

ٹراٹسکی نے اپنی کتاب ''سٹالن''میں وضاحت کی کہ ''انسانیت کو مختلف قومیتوں پر مبنی ٹکڑوں میں

تقسیم کرنا کبھی بھی ہمارا مقصد نہیں رہا۔درست ہے کہ جبر کے خلاف حتمی اور موثر ترین ضمانت کے طور پر بالشوازم اس بات پر اصرار کرتا تھا کہ ہر قوم کو علیحدگی کا حق حاصل ہونا چاہیے جو حق ہو نہ کہ فرض۔لیکن انفرادی قومی خصوصیات کو مصنوعی طور پر محفوظ کرنے کا خیال بالشوازم کے لیے بالکل اجنبی تھا۔یہاں تک کہ کسی ڈھکے چھپے،نفیس ترین اور غیر محسوس طور پر کیے جانے والے قومی جبر یا ذلت کو بھی لازمی طور پر مختلف قومیتوں کے مزدوروں کے انقلابی اتحاد کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے نہ کہ انہیں تقسیم کرنے کے لیے۔جہاں قومی مراعات اور زخم موجود ہیں قوموں کے پاس ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے کا امکان موجود ہونا ضروری ہے تا کہ اس طرح قوموں کی قریبی مفاہمت کے نام پر مزدوروں کے آزادانہ اتحاد میں آسانی پیدا ہو سکے اور مستقبل بعید میں سبھی کے باہم ضم ہونے کا امکان پیدا ہو سکے۔یہ بالشوازم کا بنیادی رجحان تھا جس نے پوری قوت کے ساتھ اکتوبر انقلاب میں اپنا اظہار کیا۔‘‘(10)یہ ایک جدلیاتی تصور تھا جو قومی سوال کے حل کی بنیاد فراہم کر سکتا تھا۔

قومیتوں کے مسائل بورژوا جمہوری انقلاب کی باقیات تھے۔سرمایہ داری نے اپنے زوال کے دوران ان مسائل کو مزید بگاڑ دیا۔صرف سوشلسٹ انقلاب ہی انہیں حل کر کے قوموں کی حقیقی مساوات مہیا کر سکتا تھا۔جب بالشویک اقتدار میں آئے تو پرانی زار شاہی سلطنت تیز رفتار ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر رہی تھی۔لینن کے الفاظ میں سوویت ریپبلک طاقت کے ذریعے نہیں بلکہ رضا کارانہ مفاہمت کے ذریعے ہی قوموں کے اتحاد کی تعمیر نو کر سکتی تھی۔اس کا مطلب ماضی کی عظیم روسی قوم پرستی سے مکمل طور پر ناطہ توڑنا تھا۔قومی حقِ خود ارادیت کے بالشویک نظریئے کا اطلاق پہلی بار جنگ کے ٹھوس حالات میں کیا گیا جب سوویتوں نے ’’غاصبانہ قبضوں کے بغیر‘‘ امن کے قیام کی اپیل کی۔سماجی آزادی اور حق خود ارادیت بنیادی اہمیت اختیار کر گئے۔

حق خود ارادیت لینن کے پروگرام کا ایک اہم جزو تھا۔یہ پولینڈ،جارجیا،لٹویا اور یوکرائن کے مزدوروں اور بالخصوص کسانوں پر واضح طور پر ثابت کرتا کہ روسی مزدوروں کو ان پر جبر کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ ان کے اس حق کا سختی سے دفاع کریں گے کہ وہ اپنی قسمتوں کے فیصلے خود کریں۔لیکن یہ قومی سوال پر لینن کے پروگرام کا محض نصف جزو تھا۔دوسرا حصہ بھی اتنا ہی اہم تھا یعنی پرولتاریہ کے اتحاد کو تمام قومی،لسانی یا مذہبی امتیازات سے بالاتر رکھنا۔جہاں تک بالشویک پارٹی کا تعلق تھا لینن نے ہمیشہ ایسے رجحانات کی مخالفت کی جو پارٹی(اور مزدور تحریک)کو قومی خطوط پر تقسیم کرتے ہیں۔

انقلاب کے بعد لینن کو امید تھی کہ ایک سوویت فیڈریشن کی شکل میں سابقہ زار شاہی سلطنت کی اقوام کا رضا کارانہ اور برادرانہ اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے مطالبہ کیا کہ قومیتوں کے ساتھ انتہائی حساس رویہ اختیار کیا جائے۔ عظیم روسی قوم پرستی کی ہر شکل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ انقلاب اکتوبر کے کچھ عرصہ بعد تک سرکاری دستاویزات سے لفظ ''روس'' بالکل غائب ہوگیا تھا۔ اکتوبر انقلاب کی سرزمین کا سرکاری نام صرف ''مزدور ریاست'' تھا۔ خانہ جنگی کی فوجی حکمتِ عملی کی ضروریات سے قطع نظر بالشویکوں نے حق خود ارادیت کا بلا امتیاز اطلاق کیا۔ 1918ء میں انہوں نے فن لینڈ اور پولینڈ کی علیحدگی کو تسلیم کیا۔ 1918ء میں ہی اسٹونیا، لٹویا اور لیتھونیا کی آزاد سوویت ریپبلکوں کو تسلیم کیا گیا مگر برطانیہ کی مدد سے ان کا تختہ الٹے جانے کے بعد 1920ء میں انہیں خود مختار بورژوا جمہوریاؤں کے طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ جارجیا کو 1920ء میں ایک بورژوا جمہوریہ اور 1921ء میں ایک سوویت جمہوریہ کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ اس اصول کی خلاف ورزی صرف اس وقت کی گئی جب سوویت نظام کی اپنی بقا خطرے میں پڑ گئی۔ جیسا کہ ٹراٹسکی نے وضاحت کی ہے کہ ''برسٹ لٹووسک کے معاہدوں میں سوویت حکومت نے مزدور ریاست کو بچانے کی غرض سے یوکرائن کی قومی آزادی کو قربان کر دیا۔ کوئی بھی شخص یوکرائن کے ساتھ غداری کی بات نہیں کر سکتا تھا کیونکہ طبقاتی شعور رکھنے والے تمام مزدور اس قربانی کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔'' (11) 1919ء اور پھر 1920ء میں یوکرائن کے اندر سوویت مداخلت ایک ایسی حکومت کے خلاف خود حفاظتی کا اقدام تھا جو بیرونی مداخلت کا باعث بنی تھی۔ زیریں والگا، وسطی ایشیا اور جارجیا کے سلسلے میں بھی یہ بات درست تھی۔

سفید افواج کی شکست اور اس کے بعد برطانوی، جاپانی اور فرانسیسی افواج کے اخراج کے بعد آر ایس ایف ایس آر کے اندر بہت سی خود مختار جمہوریائیں اور علاقے قائم ہوئے۔ آزادی یا خود مختاری کے اصول کو تمام سابقہ روسی سلطنت تک وسعت دے دی گئی تھی۔ آر ایس ایف ایس آر ایک ڈھیلے ڈھالے اتحاد پر مشتمل تھی۔ فیڈریشن یوکرائن، بیلا روس، جارجیا، آذربائیجان اور آرمینیا کے درمیان باہمی معاہدوں کی بنیاد پر قائم تھی۔ 1922ء میں قومیتوں کے کیسار کی حیثیت سے سٹالن جمہوریاؤں کے درمیان تعلقات کو معمول پر لانے کا ذمہ دار تھا۔ بالآخر 30 دسمبر 1922ء کو یہ فیڈریشن ارتقا پا کر سوویت یونین بن گئی جس کے شرکا کی حیثیت مساوی تھی۔ خارجہ تعلقات، دفاع، بیرونی تجارت، مواصلات اور ڈاک و تار سوویت یونین کی مرکزی حکومت کی ذمہ داری تھے۔ اعلان کے

مطابق، بالآخر سوویت اقتدار کے ڈھانچے نے جو اپنی نوعیت کے حوالے سے بین الاقوامی ہے سوویت جمہوریاؤں کے محنت کش عوام کو واحد سوشلسٹ خاندان کے اتحاد کی راہ پر ڈال دیا۔

''ان تمام حالات کا تقاضا ہے کہ سوویت جمہوریاؤں کے اتحاد سے ایک متحدہ ریاست بنائی جائے جو بیرونی تحفظ، داخلی معاشی ترقی اور قوموں کے لئے قومی ترقی کی آزادی کی ضمانت فراہم کرنے کی اہل ہو۔''(12)

تاہم نوکر شاہانہ مرکزیت پر مبنی نظام، سٹالن ازم، اقلیتی قومیتوں کی خواہشات سے متصادم ہوگیا۔ 1922ء میں ہی اقلیتی قوموں کے ساتھ سٹالن کے آمرانہ طرزِ عمل کے باعث اس کا لینن کے ساتھ ٹکراؤ ہوگیا تھا۔ فیڈریشن کے منصوبوں کے سلسلے میں جارجیا کے بالشویکوں کی مخالفت کو سٹالن کچلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ستمبر 1922ء میں لینن نے پولٹ بیورو کو سٹالن کے رویے کے بارے تحریر کیا جو آر ایس ایف ایس آر کے ساتھ اس جمہوریہ کے تعلقات کے لئے ذمہ دار تھا کہ ''میرے خیال میں یہ سوال انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ سٹالن بہت جلدی میں دکھائی دیتا ہے۔''(13) ایک ہفتے بعد لینن نے کامینیف کو لکھا کہ ''میں عظیم روسی شاونزم کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں جو مرتے دم تک جاری رہے گی۔''(14) اگلے ماہ اس نے لکھا ''میں سمجھتا ہوں کہ سٹالن کی جلد بازی اور خالصتاً انتظامی رجحان نے بدنام زمانہ قومیتی سوشلزم کے لئے اس کی کینہ پروری کے ساتھ مل کر اس سلسلے میں ایک تباہ کن کردار ادا کیا ہے۔ کینہ پروری عام طور پر سیاست میں گھٹیا ترین کردار ادا کرتی ہے۔''

سٹالن کے خلاف ایک اور شدید حملہ کرتے ہوئے لینن نے انتباہ کیا ''حقیقی روسی آدمی، عظیم روسی شاونسٹ، بدمعاش اور غاصب، جیسا کہ ایک روسی بیوروکریٹ ہوتا ہے۔'' اس نے مزید کہا ''اس میں کوئی شک نہیں کہ سوویت مزدوروں کی چھوٹی سی تعداد عظیم روسی شاونزم کی غلاظت کی لہر میں یوں ڈوب جائے گی جیسے دودھ میں ''مکھی۔'' اس کے بعد وہ آخر میں لکھتا ہے ''اور بے شک اس عظیم روسی قوم پرستی کی مہم کی سیاسی ذمہ داری یقیناً '' سٹالن اور ڈزرزنسکی پر عائد ہوتی ہے۔''(15) لینن کو دل کے دو دورے پڑ چکے تھے اور اسے احساس تھا کہ وہ کسی بھی لمحے مر سکتا ہے۔ اپنی بیماری کے دوران اس نے اصرار کر کے ٹراٹسکی کے لئے کرپسکایا (لینن کی بیوی) کو خط لکھوایا جس میں اسے سنٹرل کمیٹی میں خارجہ تجارت کی اجارہ داری پر ہونے والی بحث میں ''ایک بھی گھونسا چلائے بغیر'' کامیابی حاصل کرنے پر مبارکباد دی گئی تھی۔ سٹالن کو اس کی بھنک پڑ گئی اور اس نے ٹیلی فون پر (کرپسکایا) کو گالیاں دیں جو ایک ایسا رویہ ہے جسے کسی

بالشویک لیڈر سے منسوب نہیں کیا جاسکتا۔

اگلے روز یعنی 23 دسمبر 1922ء کو کرپسکایا نے پریشانی کے عالم میں کامینیف کو لکھا ''کل سٹالن نے مجھے بدترین گالیوں کا نشانہ بنایا جس کی وجہ وہ مختصر سا نوٹ تھا جو لینن نے مجھے ڈاکٹروں کی اجازت سے لکھوایا تھا۔ میں نے پارٹی میں کل ہی شرکت نہیں کی ہے۔ پچھلے تیس سالوں کے تمام تر عرصے میں، میں نے کبھی بھی کسی کامریڈ کے منہ سے بدتمیزی کا ایک لفظ نہیں سنا۔ پارٹی اور ایلیچ (لینن) کے مفادات مجھے سٹالن سے کم عزیز نہیں ہیں۔ اس وقت مجھے خود پر قابو پانے کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہے۔''

کرپسکایا کہتی ہے کہ اسے ''نجی زندگی میں بے جا مداخلت، گالی گلوچ اور دھمکیوں سے بچایا جائے۔'' (16) 30 دسمبر 1922ء کو لینن لکھتا ہے ''اگر معاملات یہاں تک پہنچ چکے ہیں تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہم کس قدر مشکل میں گھر چکے ہیں۔'' اس نے ٹراٹسکی کے ساتھ خطوط کا تبادلہ کیا اور اپنے مشترکہ مقصد کے دفاع کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ڈالی۔ 5 مارچ کو اس نے ٹراٹسکی کو لکھا کہ وہ سٹالن کے خلاف جارجیا والوں کے کیس کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرے۔ اپنی وصیت میں اس نے سٹالن کو سیکرٹری جنرل کے عہدے سے ہٹائے جانے کے لئے کہا۔ وصیت لکھوانے کے لئے اسے ہر روز زبردست کوشش اور مشقت کرنا پڑتی تھی۔ یہ لینن کا آخری سیاسی فعل تھا۔

قومی سوال بہت حساسیت کا متقاضی ہوتا ہے۔ نوکرشاہانہ دھونس کا ایسے طرزِ عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ ٹراٹسکی وضاحت کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''قوموں کے جن ثقافتی مطالبات کو انقلاب نے ابھارا ہے ان کے لئے ہر ممکنہ خودمختاری درکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعت صرف اس وقت ترقی کر سکتی ہے جب یونین کے تمام حصوں پر ایک مرکزی منصوبہ لاگو کیا جائے۔ لیکن معیشت اور ثقافت کے درمیان ناقابل عبور دیواریں موجود نہیں ہیں۔ فطری بات ہے کہ وقتاً فوقتاً ثقافتی خودمختاری کے رجحانات اور معاشی مرکزیت میں تصادم بھی ہوتا ہے۔ تاہم ان کا تضاد ناقابل مصالحت ہرگز نہیں ہے۔''

''اگرچہ مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ کارگر ثابت ہونے والا کوئی بنا بنایا فارمولا نہیں ہو سکتا لیکن بذاتِ خود دلچسپی رکھنے والے عوام کی مضبوط قوتِ ارادی ضرور موجود ہوتی ہے۔ صرف ہر نئے مرحلے پر اپنے مقدر کے فیصلے میں حقیقی شرکت کے ذریعے ہی معاشی مرکزیت کے جائز تقاضوں اور قومی ثقافت کی

زندہ کشش کے درمیان ضروری خط تقسیم کھینچا جا سکتا ہے۔تاہم مشکل یہ ہے کہ سوویت یونین کی قسم قسم کی قومیتوں میں منقسم روسی عوام کی مرضی کی جگہ اب ایک ایسی بیوروکریسی کی مرضی نے لے لی ہے جو معیشت اور ثقافت دونوں کو انتظامی سہولت اور حکمران پرت کے مخصوص مفادات کے نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔''(17)

قومی سوال اور سٹالن ازم

انقلاب نے قومی تفاخر بیدار کرنے کے سلسلے میں انتہائی ترقی پسندانہ کردار ادا کیا۔زارشاہی کے خاتمے کے بعد جس نے سلطنت کی قومیتوں کو غلام بنا رکھا تھا قومی آزادی کے فروغ اور ثقافت کی تقویت کے لئے راہ ہموار ہوگئی۔سوویت یونین میں بولی جانے والی اکثر زبانوں کے حروف ابجد تبدیل کر دیئے گئے یا ایجاد کیے گئے جب کہ پہلے ان زبانوں کے لئے یا تو کوئی رسم الخط موجود ہی نہیں تھا یا طبقہ امرا کے لیے مخصوص ایشیائی رسم الخط مستعمل تھا۔48 زبانیں پہلی بار تحریری شکل میں سامنے آئیں۔ان میں وسط ایشیا کی ازبک،ترکمان،کرغیز اور کراکالپک زبانیں شامل تھیں۔ان کے علاوہ مالدوویا،چیچنیا اور انگوشیا کے سلسلے میں بھی صورت حال یہی تھی۔بشکیر یا کوتا تار زبان سے اخذ کر کے سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ انقلاب کے بعد وسطی ایشیا کو ترکستان کے نام سے یاد کیا جاتا تھا اگرچہ اس علاقے میں اپنی مخصوص زبانیں رکھنے والی الگ الگ قوموں کی تشکیل ہوئی تھی۔اس کی وجہ سے قومی شعور میں تیز رفتاری سے اضافہ ہوا اور قوموں کے درمیان پہلی بار تحریری رابطہ قائم ہوا۔

مقامی زبانوں کو جدید خطوط پر استوار کرنے کے نتیجے میں لاطینی رسم الخط کو فروغ حاصل ہوا۔اس سے بالخصوص وہ 16 مسلم قومیتیں متاثر ہوئیں جو عرب رسم الخط استعمال کرتی تھی۔ ان میں آزری،ازبک،قازق اور تاتار شامل تھے۔بریات اور کالمک کے لئے بھی لاطینی رسم الخط استعمال کیا جانے لگا جب کہ اس سے پہلے منگول رسم الخط مستعمل تھا۔1933ء تک سوویت اخبارات کی کل تعداد کا 37.5 فیصد غیر روسی زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔1917ء میں کوکرائنی یا بیلا روسی زبانیں سکھانے کے لئے ایک بھی سکول موجود نہیں تھا لیکن 1927ء تک ان قومیتوں کی نوے فیصد تعداد کو انکی مادری زبانوں میں تعلیم دی جانے لگی۔دوسری جمہوریاؤں کے سلسلے میں بھی یہ بات درست تھی۔1935ء تک آر ایس

ایف ایس آر میں 80 زبانوں میں ابتدائی تعلیم دی جانے لگی۔ یہ ایک زبردست پیش رفت تھی۔لیکن ابھی قومی سوال حل نہیں ہوا تھا۔ ماسکو کی نوکر شاہانہ آمریت پر مبنی حکومت آزادی کا معمولی سا اظہار بھی برداشت نہیں کرسکتی تھی۔لینن کے ہر اصول کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے پرانے زارشاہی ہتھکنڈے پہلے سے بھی زیادہ شدومد کے ساتھ استعمال ہونے لگے۔

سٹالن انتہائی معمولی ''قوم پرستانہ'' انحراف کو بھی جبراً دبا دیتا تھا۔ جب دوسری جنگِ عظیم اختتام پذیر ہونے کو تھی تو سٹالن نے نازیوں کے ساتھ تعاون کو بہانہ بنا کر پوری پوری قومیتوں کو جلاوطن کر دیا۔اجتماعی جرم معمول کی بات تھی۔اہلِ چیچنیا،انگوشیوں اور کریمیا کے تاتاروں کے ساتھ یہی ہوا۔جیسا کہ خروشیف نے 1956ء میں انکشاف کیا:

''سب سے زیادہ خوفناک حرکات وہ ہیں جن کا آغاز سٹالن نے کیا تھا اور جو سوویت ریاست کی قومیتوں کے بارے میں پالیسی کے بنیادی لینن اسٹ اصولوں کی زبردست خلاف ورزی ہے۔ہم یہاں بڑے پیمانے پر پوری پوری قومیتوں کی اپنے آبائی علاقوں سے جلاوطنی کا حوالہ دے رہے ہیں جن میں تمام کمیونسٹ اور کامسومول کے اراکین بھی شامل تھے۔اس طرح 1943ء کے اواخر میں ہی تمام کراچائیوں کو ان علاقوں سے جلاوطن کرنے کے فیصلے پر عمل درآمد کر دیا گیا۔

اسی عرصے کے دوران یعنی دسمبر 1943ء میں خودمختار جمہوریہ کالمک کی تمام آبادی پر بھی یہی مصیبت نازل ہوئی۔مارچ 1944ء تمام چیچن،انگوش لوگوں کو جلاوطن کرنے کے بعد ان کی خودمختار جمہوریہ کو ختم کر دیا گیا۔اپریل 1944ء میں تمام بلکاریوں کو ان کے علاقے کبارڈینو، بلکار کی خودمختار جمہوریہ سے جلاوطن کر کے دور دراز علاقوں میں منتقل کر دیا گیا اور اس کا نام تبدیل کر کے خودمختار کبارڈین ریپبلک رکھ دیا گیا۔یوکرائنی محض اس وجہ سے بچ گئے کہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور انہیں جلاوطن کرنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔بصورت دیگر سٹالن انہیں بھی جلاوطن کر دیتا۔''(18)

جمہوریاؤں کے خلاف ان جرائم اور ایسے ہی دیگر اقدامات کی وجہ سے ماسکو حکومت کے خلاف زبردست ناراضگی اور مخالفت کے جذبات پائے جاتے تھے۔عظیم روسی شاونسٹ عناصر،جن کے خلاف لینن تمام عمر نبرد آزما رہا تھا،سٹالن کے دور حکومت میں بے لگام ہو چکے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی ''باس'' بذاتِ خود کر رہا تھا۔اگرچہ سٹالن بذاتِ خود جارجیا سے تعلق رکھتا تھا اور روسی صحیح لہجے میں نہیں بول سکتا تھا لیکن وہ روسی شاونزم کا پرجوش حامی تھا۔چھوٹی قومیتوں کے ان افراد کے سلسلے میں یہ بات ایک اصول کا

درجہ رکھتی ہے جو غاصب قوم کی حکومت میں مقتدر حلقے کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ نپولین کا تعلق کارسیکا سے تھا لیکن وہ اسی طرح فرانسیسی سامراج اور مرکزیت کا پرجوش پیروکار بن گیا تھا۔ جنگ کے فوراً بعد سٹالن نے مندرجہ ذیل تقریر کی:

''مجھے ایک اور جام صحت تجویز کرنے کی اجازت دیجئے۔ میں سوویت عوام کی صحت کا جام پینا چاہتا ہوں اور بالخصوص روسی قوم کی صحت کا جام۔ میں روسی قوم کی صحت کا جام اس لئے پی رہا ہوں کیونکہ سوویت یونین کی تمام اقوام میں یہ ایک نمایاں حصہ ہے۔ میں روسی قوم کا جام صحت اس لئے پی رہا ہوں کہ نہ صرف یہ ایک نمایاں قوم ہے بلکہ اس کے عوام انتہائی ذہین، باکردار اور استقامت رکھنے والے ہیں۔''(19)

جب لینن زندہ تھا تو اس قسم کی تقریر کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ عظیم روسی شاونزم کے تمام مظاہر نے زبردست نقصان پہنچایا، اکتوبر انقلاب کے قائم کردہ برادرانہ اتحاد کی روح کو تباہ کیا اور دوسری قومیتوں میں گہری خفگی کو جنم دیا جو خود کو دوسرے درجے کا شہری محسوس کرتی تھیں۔ یہ جذبات اس وقت تک پوشیدہ رہے جب تک سوویت معیشت ترقی کرتی رہی۔ سٹالن ازم کے بحران نے ان دھماکہ خیز احساسات کے سطح پر آنے کی راہ ہموار کی جس کے نتیجے میں سوویت یونین ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ قومی سوال پر سٹالن ازم کی پالیسی، نظام کے آمرانہ کردار اور ماسکو میں اقتدار کے نوکر شاہانہ ارتکاز کا ناگزیر نتیجہ تھی۔

سٹالن کی موت کے بعد خروشیف نے ماضی کے تمام تر جرائم سٹالن کے سر منڈھنے کی کوشش کی۔ اگرچہ سٹالن ازم کی بدترین خصوصیات کے خاتمے کے لئے اصلاحات نافذ کی گئیں لیکن قومیتوں پر جبر بدستور موجود رہا اگرچہ اس کی شدت قدرے کم تھی۔ اس کا واضح ترین اظہار حکومت کی صیہونیت دشمنی کے نقاب میں چھپی ہوئی سام دشمنی سے ہوتا تھا۔

سام دشمنی کی لعنت

زار شاہی روس کوڑوں اور منظم قتل عام کی سرزمین تھی۔ وہ قومی جبر کے ایک بے رحمانہ نظام پر عمل پیرا تھی جس میں یہودیوں کو بطور خاص نشانہ بنایا جاتا تھا۔ اس جور و ستم سے باعث صیہونیت کو مسترد کرنے والے یہودی نوجوانوں کی ایک پوری پرت ہمیشہ انقلابی مارکسی تحریک میں شامل رہی تھی جن میں

ٹراٹسکی، زینوویف، کامینیف روز الکسمبرگ، راڈک اور دیگر لوگ شامل تھے۔ سام دشمنی کے خاتمے اور یہودی قوم کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کا واحد راستہ سوشلسٹ انقلاب کا راستہ خیال کیا جاتا تھا۔ یعنی مکمل حقوق، باقی آبادی کے برابر مقام اور ان کی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے لیے مواقع کی فراہمی، تا کہ سب کے لیے ایک نئی اور بہتر زندگی تعمیر کی جا سکے۔ زار شاہی نے یہودیوں کو الگ تھلگ کر رکھا تھا۔ بالشوازم نے انہیں مکمل مساوات کی بنیاد پر شرکت کا موقع فراہم کیا۔ عوام کی بہت بڑی اکثریت نے اسے قبول کر لیا تھا۔ یہاں بھی لینن نے بہت زیادہ لچک کا مظاہرہ کیا تھا۔ یہودی حقیقی معنوں میں کوئی قوم نہیں تھے (لینن نے اسے جبر کا شکار ایک خصوصی ذات قرار دیا تھا) لیکن اس کے باوجود انہیں ایک الگ علاقے بیرو بیٹ جان کو اپنا وطن بنانے کا حق دیا گیا اگرچہ بہت کم لوگوں نے اس سلسلے میں کسی دلچسپی کا اظہار کیا۔

اکتوبر انقلاب نے روس اور روس کے باہر موجود یہودی آبادی کے قابل ترین اور وسیع النظر عناصر کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ بہت سوں نے کمیونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور نمایاں کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک پولینڈ کا باشندہ لیوپولڈ ٹریپر تھا جس نے بعد ازاں ریڈ آرکسٹرا نامی تنظیم کی قیادت کی جو سوویت جاسوسوں کی ایسی تنظیم تھی جس نے ہٹلر کے جرمنی میں جرات مندانہ کارنامے سرانجام دیئے تھے ٹریپر اپنی شاندار خودنوشت میں لکھتا ہے:

''میں اس لیے کمیونسٹ بنا کیونکہ میں یہودی ہوں۔ ڈومبرووا کے مزدوروں کے ساتھ اپنے رابطے کے دوران میں سرمایہ دارانہ استحصال کی حدود دیکھ چکا ہوں۔ مارکسزم میں مجھے یہودیوں کے سوال کا قطعی جواب مل گیا جو بچپن سے میرے سر پر سوار تھا۔ میرے خیال میں صرف ایک سوشلسٹ سماج ہی نسل پرستی اور سام دشمنی کا خاتمہ کر کے یہودیوں کی مکمل ثقافتی ترقی کی راہ ہموار کر سکتا ہے۔'' (20) یہ جذبات طبقاتی جدوجہد کرنے والے یہودیوں کی ایک پوری نسل کے جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔

رجعت پرستی نے ہمیشہ سام دشمنی کو ابھارنے اور یہودیوں کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی۔ لینن کی پارٹی میں سام دشمن گفتگو کو برداشت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ غلاظت خانہ جنگی کے دوران سفید رجعت پرستوں کا عمومی ہتھیار تھی جس سے وہ بالشویک لیڈروں کو نشانہ بناتے تھے (جن میں لینن بھی شامل تھا) لیکن اکتوبر انقلاب کے خلاف سٹالنسٹ رجعت کی کامیابی تک سام دشمنی نے کمیونسٹ پارٹی کے اندر سر نہیں اٹھایا۔ سٹالن نے سیاسی مخالفین کے خلاف جدوجہد میں سام دشمنی کو استعمال کیا۔ 4 مارچ 1926ء کو ٹراٹسکی نے بخارین کو ایک خط لکھا جس میں احتجاج کیا گیا تھا کہ پارٹی کی ایک برانچ میں

کچھ اس قسم کی افواہیں پھیلائی گئی ہیں کہ ''یہودی پولٹ بیورو کے اندر گڑ بڑ پھیلا رہے ہیں۔''(21) 1927ء میں اپوزیشن پر حملہ کرتے ہوئے سٹالن نے کہا کہ وہ ٹراٹسکی اور زینوویف کی مخالفت یہودی ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپوزیشن سے تعلق کی وجہ سے کر رہا ہے۔ اس بات کا مقصد اپنے حمایتیوں کو اشارہ دینا تھا جنہوں نے اسے استعمال کرنے میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔

روسی یہودیوں میں صیہونیت کی حمایت بہت کم تھی کیونکہ انہیں انقلاب میں اپنے مسائل کا حل نظر آتا تھا۔ اکتوبر انقلاب نے یہودیوں کو مکمل برابری دی اور جبر سے آزادی دلائی تھی لیکن سٹالن ازم نے عوام کی پست ترین پرتوں کے پرانے تعصّبات کا سہارا لے کر ان کے خلاف نسلی امتیاز میں شدت پیدا کر دی۔ اس حقیقت سے معاملے کی اصلیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا کہ سام دشمنی کو پہلے ''بنیادوں سے عاری آوارہ گرد'' اور بعدازاں ''صیہونیت'' کے باریک پردے میں چھپایا جاتا تھا۔ خصوصاً دوسری جنگِ عظیم کے بعد وقتاً فوقتاً یہودی مخالف مہمیں چلائی جاتی تھیں جن کا نقطہ عروج بدنام زمانہ ڈاکٹروں کی سازش تھی۔ اس کے نتیجے میں سوویت یونین سے ہجرت کا مطالبہ زور پکڑ گیا خصوصاً 1948ء میں اسرائیل کی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد۔

بیسویں کانگریس کے بعد سام دشمنی کے الزامات کی تحقیقات کے لیے برطانوی کمیونسٹ پارٹی کا ایک وفد سوویت یونین بھیجا گیا۔ مندرجہ ذیل رپورٹ میں وہ نتائج شامل ہیں جن سے سٹالنسٹ روس میں کھلی اور پوشیدہ سام دشمنی کے ماحول کا اظہار ہوتا ہے:

''سوویت انسائیکلوپیڈیا کے 1932ء کے ایڈیشن میں یہودیوں کے بارے میں 160 کالم موجود تھے جن کی تعداد 1952ء کے ایڈیشن میں کم ہو کر صرف چار رہ گئی۔ بہت سے نمایاں یہودیوں کی سوانح حیات خارج کر دی گئی ہیں۔ مارکس کے یہودی ہونے کا کوئی ذکر موجود نہیں تھا۔ اس کے بعد کامریڈ لیوائی کی یہودیوں کے ساتھ نجی گفتگو میں معلوم ہوا کہ یہودی 52-1948ء کے سالوں کو ''سیاہ سالوں'' کے طور پر یاد کرتے ہیں کیونکہ یہ وہ دور ہے جب بہت سے یہودیوں کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا گیا، یہودی شاعروں اور ادیبوں کو گرفتار کیا گیا اور غداری کے الزام میں گولی سے اڑا دیا گیا۔ جن کو خفیہ طور پر گرفتار کر کے الزامات عائد کیے گئے ان میں نمایاں سیاسی یا ثقافتی کارکنان شامل تھے۔ گرفتاری کے بعد ان کے قریبی عزیزوں کو کسی دور دراز جگہ بھیج دیا جاتا اور اکثر اوقات کم اجرت پر کسی کام پر لگا دیا جاتا۔ آخر کار خاوند کو اعتراف جرم کروانے یا دوسرے افراد کو ملوث کروانے کی غرض سے

اذیت دینے کے بعد گولی ماردی جاتی۔اس طرح عملاً ''یہودیوں کی اینٹی فاشسٹ کمیٹی کے تمام ارکان کوختم کردیا گیا۔''(22)

زارشاہی کی طرح اس حکومت نے بھی عوام کی توجہ اندرونی مسائل سے ہٹانے کی غرض سے یہودیوں کوقربانی کا بکرا بنایا۔1967ء کی جنگ میں اسرائیلیوں کی فتح کے بعد سام دشمنی میں نیا ابھار آ گیا۔اس نے صیہونیت مخالف مہم کی شکل اختیار کی۔اگر صیہونیت کوفروغ ملا بھی ہوتا تو اس کا مقابلہ صرف انتظامی ذرائع سے کبھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔صیہونی تصورات کے غیر پرکشش ہونے کا دارومدار اس بات پر تھا کہ یہودی خودکوسوویت یونین میں کس حدتک محفوظ خیال کرتے ہیں۔ہجرت کے لئے بے چینی سے اس امر کی واضح عکاسی ہوتی تھی کہ سٹالن ازم یہودیوں کی خواہشات کو پورا کرنے میں ناکام رہا ہے۔1971ء میں امریکہ کی یہودی لابی کے دباؤ کے تحت ہونے والے معاہدے دیتانت کے بعد نقل مکانی کا سیلاب آ گیا۔1970ء کی دہائی میں دولاکھ افراد نے سوویت یونین سے نقل مکانی کی۔سوویت یونین میں موجود یہودی آبادی کی تعداد 1970ء میں 2151000 تھی جو 1989ء میں کم ہوکر 1459000 رہ گئی۔یہ سٹالنسٹ نظام کے لئے انتہائی قابل مذمت بات ہے کہ اس پرت نے اپنے وطن میں رہنے کی بجائے اسرائیل میں رہنے کا خطرہ مول لیا۔یہ بات اس حقیقت سے کس قدر متضاد ہے کہ 1917ء کے بعد یہودیوں نے بہت کم تعداد میں نقل مکانی کی حالانکہ صورت حال بہت دگرگوں تھی اوران کی راہ میں کوئی قانونی رکاوٹ بھی موجودنہیں تھی۔اکتوبر انقلاب نے یہودیوں کے ساتھ ساتھ ان سب اقوام کوامید کی روشنی دکھائی جو پہلے جبر کا شکار تھیں۔سٹالن ازم نے اس امید کے ساتھ شرمناک غداری کی۔ یہودیوں کا مسئلہ صرف سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے ہی حل ہوسکتا ہے۔اسرائیل کی ریاست یہ مسئلہ حل نہیں کرسکتی۔جیسا کہ ٹراٹسکی نے اگست 1940ء میں اپنے قتل سے ایک ماہ پہلے پیش گوئی کی تھی ''مستقبل میں رونما ہونے والے فوجی واقعات کے باعث فلسطین لاکھوں یہودیوں کے لیے ایک خونی پھندے میں تبدیل ہوسکتا ہے۔یہ بات آج پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح ہے کہ یہودی قوم کی نجات اٹوٹ طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے سے منسلک ہے۔''(23)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ٹراٹسکی نے یہ سطور تحریر کی تھیں اس کے مقابلے میں آج صورت حال کچھ مختلف ہے۔نصف صدی بعد اسرائیل میں ساٹھ لاکھ یہودی آباد ہیں اور وہ مشرق وسطیٰ کی طاقتور ترین فوجی طاقت ہے۔مگر اس سے ٹراٹسکی کا تجزیہ قطعاً غیر معتبر نہیں ہو جاتا۔اول تو یہ کہ اسرائیل، جس

کے بارے میں فرض کیا جاتا تھا کہ یہی امن وافراط کی وہ سرزمین ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا، اب حقیقت میں یہودی قوم کے لیے ایک خونی پھندا ثابت ہو رہی ہے۔اس کا ثبوت چار ہولناک جنگوں سے فراہم ہوتا ہے اور ابھی اور زیادہ خوفناک جنگوں کا خطرہ موجود ہے۔علاوہ ازیں اسرائیل کا وجود محض اس لیے قائم ہے کہ امریکہ کو مشرق وسطیٰ میں ایک قابل بھروسہ گڑھ کی ضرورت ہے۔اس کی بقا کا دارومدار اسلحہ پر ہونے والے زبردست اخراجات پر ہے جو واشنگٹن نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔تاہم ضروری نہیں کہ صورت حال ہمیشہ ہی ایسی رہے۔مشرق وسطیٰ میں ایک سوشلسٹ انقلاب برپا نہ ہونے کی صورت میں اسرائیل کا مستقبل ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوگا۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کس طرح سرمایہ دارانہ نظام یہودی قوم کے مسائل حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

''آزادی'' کوئی حل نہیں

جمہوریاؤں کی معیشتوں کا ایک مشترکہ منصوبے کے تحت یکجا ہونا سوویت یونین کی تمام اقوام کے فائدے میں تھا۔وسطی ایشیا کی پسماندہ جمہوریاؤں میں اس کی افادیت خاص طور پر واضح نظر آتی تھی۔ ایک مغربی صحافی نے اس علاقے کی شاندار تبدیلی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ''وسطی ایشیا نے پچھلے 70 سال میں یقیناً ایک زبردست معاشی اور سماجی تبدیلی دیکھی ہے۔1917ء میں ان میدانوں اور پہاڑوں میں آباد لوگ کم وبیش بالکل ان پڑھ تھے جن کی زندگیاں رومانوی مگر اکثر اوقات انتہائی غربت زدہ ہوتی تھیں۔آج تاشقند (جس کی آبادی بیس لاکھ ہے) میں شاہرہ ریشم کو ماسکو کی طرز پر بنی ہوئی زیرِ زمین ٹرین منقطع کرتی ہوئی گزرتی ہے اور 200 ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا باٹینکل گارڈن (لاکھوں درخت اور پودے) معجزانہ طور پر ایک ایسی جگہ بکنگھم شائر کے جنگل کا منظر پیش کرتا ہے جو کبھی نیم صحرائی علاقہ تھا۔'' (24)

لیکن تصور کا یہ محض ایک رخ ہے۔سٹالنسٹ نظام نے جمہوریاؤں میں چھوٹی چھوٹی بیوروکریسیوں کا سلسلہ تخلیق کیا جن میں اس بنیادی شکل کی تمام تر منفی خصوصیات موجود تھیں جس کی یہ نقول تھیں۔خروشیف اور برژنیف کے ادوار میں یکے بعد دیگرے کیے جانے والے عدم مرکزیت کے اقدامات کے طفیل ان جمہوریاؤں کی قومی نوکر شاہیوں نے اپنے ہاتھوں میں مزید قوت مرکوز کر لی۔مزدور

جمہوریت کی مثال کے طور پر ترکمانستان کے ایک بڑے افسر گاپوروف کو دسمبر 1982ء میں ترکمان پارٹی کانگریس میں پنشن دے کر فارغ کیا گیا۔کانگریس کی ایک رپورٹ میں لکھا ہے کہ ”اس کے تحت کیڈروں کو اکثر اوقات شخصی وفاداری، خاندانی تعلقات یا علاقائی بنیاد پر اعلیٰ عہدوں پر ترقی دے دی جاتی تھی۔اس نے اقربا پروری، چاپلوسی، کیریئرازم، کاہلی اور باہمی مفاد پرستی کا ماحول پیدا کیا اور غلامانہ خوشامد اور غیر ذمہ داری کو فروغ دیا۔“(15) یہ کوئی غیر معمولی رویہ نہیں تھا لیکن گاپوروف کی بدقسمتی یہ تھی کہ پکڑا گیا۔

ضمیر فروش، ناکارہ اور جابر لوگوں پر مشتمل ان مقامی نوکر شاہیوں میں بھی اسی قسم کے شاونسٹ رجحانات موجود تھے جو سٹالن ازم کی تمام اقسام کی ناگزیر خصوصات ہیں۔اپنی طاقت اور مراعات کو تقویت دینے کی خاطر وہ مقامی شاونسٹوں کا سہارا لیتے تھے۔تنگ نظر، مغرور اور بین الاقوامیت سے عاری یہ لوگ جان بوجھ کر قومی جذبات سے کھیلتے تھے۔مقامی نوکر شاہیاں قومی شکایات کا سہارا لے کر اپنے اقتدار کی بنیاد کو مضبوط بنانے کی کوشش کرتی تھیں۔بعدازاں اس کے تباہ کن نتائج کو ہم نے آذریوں اور آرمینیاؤں، جارجیا والوں اور ابخازیہ والوں، ڈینائسٹر پار روسیوں اور مالدوویا والوں کے درمیان ہونے والی برادر کش جنگوں اور بالٹک ریاستوں میں روسی اقلیتوں کے خلاف نفرت کی شکل میں دیکھا۔

پہلے تو گورباچوف نے سوویت یونین کو یکجا رکھنے کی کوشش کی اور سٹالنسٹ دور کی پالیسیوں کو لینن کی اس ”لاثانی“ وفاقی ریاست کو مسخ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا جس میں تمام قومیتوں کو وہ قومی اور ثقافتی حقوق دیئے گئے تھے جن سے وہ زار شاہی دور میں محروم تھیں۔اس نے کہا کہ وہ قومیتوں کے بارے میں لینن کی پالیسی کو از سر نو لاگو کرے گا جس میں ”خودارادیت“ کا بنیادی حق بھی شامل ہوگا۔تاہم گورباچوف خودارادیت کو محض علیحدگی کا حق خیال کرنے کو سادہ لوحی پر محمول کرتا تھا (1977 کے سوویت آئین کی رو سے اس کی ”ضمانت“ پہلے ہی دی جا چکی تھی)۔وہ اسے ”قومی وقار کو تقویت دینے کے عمل، زبان اور ثقافت کے فروغ، سیاسی آزادی کے استحکام اور سماجی و معاشی ترقی کے فروغ“ کے حوالے سے دیکھتا تھا۔

گورباچوف نے خبردار کیا کہ ”یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ معاشی، سماجی اور آبادیاتی عوامل اور نقل مکانی کے باعث چھ کروڑ سے زیادہ (کل آبادی کا 21 فیصد) لوگ اپنی قومی جمہوریاؤں سے باہر رہتے تھے۔فطری امر ہے کہ ان شہریوں کے جائز حقوق و مفادات کو مدنظر رکھے بغیر کسی مسئلے کا حل ممکن نہیں۔“ عملاً گورباچوف کے نقطہ نظر کا لینن کے نقطہ نظر سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔یہ آٹو بوئر اور

آسٹرومارکسسٹس کی موقع پرستانہ پوزیشن کی بازگشت تھی جنہوں نے پہلی جنگ عظیم سے پہلے لینن کی حق خودارادیت کی پالیسی کے مقابلے میں ''قومی وثقافتی خودمختاری'' کا نعرہ دیا تھا۔ حقیقت میں جس چیز کی ضرورت تھی وہ ایک حقیقی معنوں میں رضا کارانہ اتحاد تھا۔ لیکن یہ صرف مزدور جمہوریت کی بنیاد پر ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

معیشت کی سست رفتاری اور سٹالن ازم کے گہرے ہوتے ہوئے بحران نے گورباچوف کی ''اصلاحات'' کے ساتھ مل کر، جنہوں نے جزوی طور پر مرکزی نوکر شاہانہ کنٹرول کو ختم کر دیا تھا، ناگزیر طور پر مرکز گریز رجحانات کو آزاد کر دیا جنہوں نے لاوے کی طرح پھٹ کر سوویت یونین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے قومی وعلاقائی شورشوں کے دور کا آغاز کر دیا۔ اپنے مفادات کو فروغ دینے کی خاطر ماسکو سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین مقامی نوکر شاہیوں نے قوم پرستی کو بنیاد بنا کر اس میں سے کچھ تصادموں کو خود ہوا دی تھی۔ بالٹک ریاستوں کی علیحدگی نے دوسروں کو بھی اس کے لیے اکسایا۔ یکے بعد دیگرے جمہوریاؤں نے آزادی کی حمایت شروع کر دی۔

ایک بار سٹالنسٹ دہشت کا خوف ختم ہو گیا تو سٹالن ازم کے بحران کے نتیجے میں دسمبر 1990ء میں سوویت یونین نہایت تیزی سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا۔ جس تیز رفتاری سے یہ ہوا وہ سابقہ تعلق کی ناپختگی کا واضح ثبوت ہے۔ یہ ماسکو کی بیوروکریسی کے ہاتھوں کئی دہائیوں سے جاری قومی جبر کی حتمی سزا تھی۔ قومی سوال کے بارے میں لینن کی محتاط پالیسی نے جبر کا شکار تقریباً تمام قومیتوں کو انقلاب سے جوڑ دیا تھا لیکن سٹالن اور اس کے جانشینوں نے لینن کی پالیسی ترک کر دی جس کا اثر بالکل الٹ ہوا۔

سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک اور دبی ہوئی کشیدگیوں کے ظاہر ہونے سے سابق سوویت یونین کے اندر خوفناک خونی تصادموں نے جنم لیا۔ پانچ سال کے خلفشار اور روسی قبضے کے بعد ابھی حال ہی میں نگورنو کاراباخ کے لیے آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان ہونے والے خونی تصادم کے خاتمے کے سلسلے میں کچھ سمجھوتہ ہو پایا ہے۔ آرمینیا اور آذربائیجان کی بیوروکریسی اپنی طاقت ووقار اور مراعات کے سلسلے میں پریشان ہے ورنہ انہیں دونوں علاقوں کی قوموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جب اس علاقے پر آذری بیوروکریسی کا غلبہ تھا تو انہوں نے آرمینیائی اکثریت کے لسانی حقوق غصب کیے رکھے اور سمکمیٹ اور باکو میں ان کے خلاف منظّم ہنگاموں کی حوصلہ افزائی کی۔ تاہم آرمینیا اور آذربائیجان کے درمیان تصادم ناگزیر نہیں تھا۔ انقلاب کے بعد دونوں اقوام کے درمیان اچھے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ

جب 1923ء میں آذری کیمونسٹ پارٹی کے لیڈر نے نگورنو کاراباخ آرمینیا کو واپس دینے کی پیش کش کی تو اسے مسترد کر دیا گیا۔ اس وقت یہ مسئلہ غیر متعلقہ نظر آتا تھا۔ صرف کئی دہائیوں پر محیط سٹالنسٹ حکمرانی کے بعد ہی پرانی عفریتوں نے سر اٹھانا شروع کیا جب ہر مقامی بیوروکریسی نے آبادی کی پسماندہ ترین پرتوں کے قومی جذبات کو ابھار کر اپنے اقتدار کی بنیاد کو مستحکم کرنے کی کوشش کی۔

مالدیویا، جارجیا، اور چیچنیا میں دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی جسے روسی حکومت طاقت کے ذریعے حل کرنے میں بھی ناکام رہی ہے۔ علاوہ ازیں سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ نے شدید معاشی مسائل کو جنم دیا کیونکہ کئی دہائیوں تک مرکزی منصوبہ بند معیشت کا حصہ رہنے کے باعث یہ جمہوریائیں بہت حد تک ایک دوسرے پر انحصار کرتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں مرکز گریز اور مرکز مائل، دونوں رجحانات کام کر رہے ہیں۔ صرف یوکرائن کے پاس ہی آزادی کے لیے ایک نسبتاً بہتر معاشی بنیاد موجود ہے مگر اس کی معیشت بھی ہزاروں ڈوروں سے اپنے طاقتور ہمسائے سے بندھی ہوئی ہے۔

کئی دہائیوں پر محیط سٹالنسٹ جبر نے قوموں میں ماسکو کے طوق سے آزادی کی شدید خواہش پیدا کر دی ہے مگر جیسا کہ گورباچوف نے کہا تھا تمام جمہوریاؤں کے لوگ ایک دوسرے میں ضم ہو چکے ہیں۔ ہر جمہوریہ کے شاونسٹ اپنی ریاستوں میں قومی اقلیتوں کے خلاف انتہائی بے رحمانہ رویے کا مظاہرہ کرتے ہیں جب کہ وہ خود نو آزاد شدہ ''آزاد'' جمہوریاؤں میں ایسی اقلیتیں بننے سے دہشت زدہ ہیں۔ بالٹک قوم پرست روسیوں، پولشوں اور دیگر قومیتوں کے خلاف انتہائی سخت شاونسٹ رویہ اپناتے ہیں جب کہ مغربی سامراج کے آگے ان کا رویہ انتہائی خوشامدانہ ہوتا ہے۔ انہیں ووٹ جیسے بنیادی حق سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ نازی جرمنی کے قبضے میں آنے سے پہلے دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں یہ ''آزاد'' بالٹک ریاستیں برطانیہ کی نیم نو آبادیاں تھیں۔ انکی معیشتیں روس اور کومیکون سے جڑی ہوئی تھیں۔ مشترکہ زرعی پالیسی کے باعث انہیں یورپی یونین کو برآمدات میں شدید دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صنعتی میدان میں وہ مغرب کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہوسکیں گے۔ جیسا کہ ہم ثابت کریں گے ان کی برائے نام آزادی ایک فریب اور جعلسازی ہے۔

تجربے نے ثابت کیا ہے کہ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ تمام قومیتوں کے لئے تباہی کا پیغام لائی ہے کیونکہ تمام جمہوریاؤں کی معیشتیں آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔ یہ صورت حال زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکتی۔ جلد یا بدیر ایک نہیں تو دوسرے طریقے سے یہ روس کے ساتھ دوبارہ متحد ہو جائیں گی۔ اگر ایسا سرمایہ

دارانہ بنیاد پر کیا گیا تو قومی جبر کی شدت میں زبردست اضافہ ہو جائے گا کیونکہ یہ ایک سامراجی تعلق ہوگا۔ لیکن ''اپنے پیروں پر کھڑے ہونے'' کا تجربہ اس قدر تباہ کن ثابت ہوا ہے کہ غالباً یوکرائن کے عوام کی اکثریت بھی بادل ناخواستہ واپس جانے کو ترجیح دے گی۔ صرف مزدور جمہوریت پر مبنی نظام ہی تمام جمہوریاؤں کے لیے حقیقی آزادی کی ضمانت فراہم کر سکتا ہے۔ ایک آزاد فیڈریشن کی شکل میں، جس کا پیداوار کا ایک مشترکہ منصوبہ ہو اور اس کا کنٹرول مزدور طبقے کے ہاتھ میں ہو، مکمل خودمختاری حاصل ہو اور حق خودارادیت کی ضمانت دی گئی ہو۔

باب نمبر 8: خارجہ پالیسی سے قومی سوال تک

1۔ ایف ہالیڈ دوسری سرد جنگ کی شروعات صفحہ 232

2۔ ایضاً صفحہ 52

3۔ ای ایچ کر بالشویک انقلاب جلد 3 صفحہ 123

4۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 31 صفحہ 472

5۔ دی انڈیپینڈنٹ 89-11-20

6۔ کا کیسس اور رومانیہ کا انقلاب بحوالہ گیلوے اور وائیلی

7۔ ٹراٹسکی۔ روسی انقلاب کی تاریخ صفحہ 890

8۔ ٹراٹسکی۔ روسی انقلاب کی تاریخ صفحہ 891

9۔ ٹراٹسکی۔ روسی انقلاب کی تاریخ صفحہ 891

10۔ ٹراٹسکی سٹالن جلد 1 صفحہ 232

11۔ ٹراٹسکی۔ مارکسزم کے دفاع میں صفحہ 27 نیویارک ایڈیشن 1970ء

12۔ بالشویک انقلاب بحوالہ ای ایچ کر جلد 1 صفحہ 401

13۔ لینن مجموعہ تصانیف جلد 45 صفحہ 211 روسی ایڈیشن (یہ مجموعہ تصانیف انگریزی ایڈیشن میں نہیں ہے)

14۔ جلد 33 صفحہ 372 میں غلط ترجمہ ہوا ہے اصل روسی ایڈیشن جلد 45 صفحہ 214

15۔ لینن کا مجموعہ تصانیف جلد 36 صفحہ 611-605

16۔ لینن مجموعہ تصانیف روسی ایڈیشن جلد 54 صفحہ 675-674

17۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری صفحہ 171-170

18۔ خروشیف کی خفیہ تقریر کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی 20 ویں کانگریس فروری 1996ء

19۔ ایک نوی سٹالنزم اوراس کے بعد صفحہ 169

20۔ ٹریپر، عظیم کھیل، ماسٹر سپائے کی یادداشتیں صفحہ 69

21۔ بحوالہ ڈی والکوگونوف ٹراٹسکی صفحہ 281

22۔ عالمی خبریں کمیونسٹ پارٹی آف برطانیہ کا ویکلی 57-1-12

23۔ لیون ٹراٹسکی یہودی سوال پر صفحہ 12

24۔ دی آبزرور 86-3-30

25۔ فنانشل ٹائمز 86-3-27

باب9

سٹالنزم کی ٹوٹ پھوٹ

سرمایہ داری کی بحالی کے منصوبے

''بے حسی، لاپرواہی اور چوری بہت بڑھ گئی ہے اور ساتھ ساتھ زیادہ آمدنی والوں کے خلاف جارحانہ رشک میں بھی اضافہ ہوا ہے۔شراب نوشی اور کاہلی سے ہماری آبادی کے بڑے حصے میں ایک قسم کے جسمانی انحطاط کی علامات ظاہر ہوئی ہیں۔سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری طور پر اعلان کردہ مقاصد کے بارے میں یعنی زندگی کی ایک معقول معاشی وسماجی تنظیم کے امکان کے بارے میں ہی عدم یقین کی فضا پائی جاتی ہے۔ظاہر ہے کہ اس پر فوراً ہی قابو نہیں پایا جاسکتا اس کے لیے کئی سال یا شاید کئی نسلوں کا عرصہ درکار ہوگا۔''

این۔شیمیلیف

''آپ کسی مچھلی گھر سے تو مچھلی کا سوپ تیار کر سکتے ہیں مگر کیا آپ مچھلی کے سوپ سے مچھلی گھر بنا سکتے ہیں؟''

لیخ ولیسا

گورباچوف کی اصلاحات ناکام ہوئی تو بحران مزید گہرا ہوگیا۔اسی طرح زارشاہی بھی کئی نسلوں

تک جبر اور رعایتوں کے درمیان کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف جھولتی رہی تھی۔ لیکن اب سٹالن کے دور جیسا بے لگام جبر خارج از مکان تھا۔ مزدور طبقے کی زبردست طاقت نے اسے ناممکن بنا دیا تھا۔ دھماکے کے خوف سے بیوروکریسی احتیاط سے کام لینے پر مجبور تھی۔ تاہم بیوروکریسی جن راستوں کا انتخاب کر سکتی تھی انکی تعداد بہت محدود تھی۔ بیوروکریسی کے تعطل نے مزدور طبقے میں وسیع پیمانے پر مایوسی پیدا کر دی تھی۔ 1980ء کے آخر تک بعض پرتوں میں منڈی کی معیشت کے بارے میں زبردست خوش فہمیاں پیدا ہو چکی تھیں بالخصوص بیوروکریسی اور دانشوروں کے حلقوں میں، یہاں تک کہ مزدور طبقے کے بعض حصے بھی اس سے متاثر ہوئے۔ لیکن بیوروکریسی ابھی تک بٹی ہوئی تھی۔

لیگاچوف کا دھڑا پرانے ڈھانچوں کو برقرار رکھنا چاہتا تھا اور انتہائی شدومد سے ان زرعی اصلاحات کی مزاحمت کر رہا تھا جن کا مقصد اجتماعی فارموں کی جڑیں کھوکھلی کر کے نجی کاشتکاری کو فروغ دینا تھا۔ بحران کے گہرا ہونے سے داخلی مخاصمتیں زیادہ شدید ہو گئی۔ اپریل 1989ء میں گورباچوف اولڈ گارڈ کی تطہیر عمل میں لایا اور سنٹرل کمیٹی نے 74 مکمل ارکان اور 24 امیدوار ارکان کی ''ریٹائرمنٹ'' کی منظوری دے دی۔ اس سے اگلے ماہ 2250 ارکان پر مشتمل اعلیٰ ترین نمائندہ ادارہ یعنی عوامی نائبین کی کانگریس وجود میں آئی۔ اسے نئے ''جمہوری'' طریقہ کار کے تحت منتخب کیا گیا تھا اور کانگریس کی دو تہائی تعداد براہ راست منتخب ہو کر آئی تھی۔ اس ادارے نے جزوی طور پر سابقہ سپریم سوویت کی جگہ لے لی۔ کانگریس نے 542 ارکان پر مشتمل سپریم سوویت کو منتخب کیا جو سال میں دو دفعہ اپنا اجلاس بلاتی۔ کمیونسٹ پارٹی کو کانگریس میں ایک بڑے حصے کی ضمانت دے کر بیوروکریسی کے مفادات کا تحفظ کیا گیا تھا۔ اتحاد میں شامل ہر جمہوریہ نے مرکزی انتظامیہ کے نمونے کے مطابق آئین اور ریاست کا ڈھانچہ اپنایا۔ گورباچوف کو امید تھی کہ ان طریقوں سے اسے سٹالنسٹ اولڈ گارڈ کے مقابلے میں ضروری حمایت حاصل ہو جائے گی جو اس کی پالیسیوں کے خلاف مزاحمت کر رہے تھے۔ نئی طرز کی پارلیمنٹ کے اندر بیوروکریسی میں موجود گہری تقسیم از سر نو سامنے آنے لگی۔

اس مرحلے پر بھی گورباچوف سرمایہ داری کی طرف واپسی کا فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ 7 نومبر 1989ء کو لینن کے مقبرے کے سامنے انقلاب کی سالگرہ کے موقع پر ایک انٹرویو میں اس نے ''1917ء کے لینن اسٹ تصورات'' کی طرف واپسی کا مطالبہ کیا تھا۔ تاہم صورتِ حال اس کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھی۔ اس کے فوراً بعد گورباچوف نے اعتراف کیا کہ ''ہم عارضی طور پر کسی حد تک معاشی نظم و نسق کا

کنٹرول کھو چکے ہیں۔'' پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اور اس کی جگہ کوئی چیز نہیں لے رہی تھی۔ ایسی صورتِ حال تا دیر جاری نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے خبردار کیا کہ منڈی کا نظام فوری طور پر اپنانے سے گلیوں میں ہنگامے ہوں گے اور حکومت ختم ہو جائے گی۔ حکومت کبھی ایک جانب جاتی، کبھی دوسری جانب اور ہر طرح کے نیم دلانہ اقدامات اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ 13 نومبر 1989ء کو گورباچوف کے نمایاں مشیر نائب وزیرِ اعظم لیونڈ ایبالکن نے سرمایہ داری کی جانب عبور کے لئے اپنا منصوبہ پیش کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سوویت یونین میں ملی جلی معیشت قائم کی جائے اور کچھ ریاستی اداروں کو مختلف قسم کی ''سوشلسٹ ملکیت'' کے حوالے کر دیا جائے (اگرچہ انہیں نجی ہاتھوں میں نہیں دیا جائے گا جیسا کہ ایبل اگنبیگیان نے تجویز پیش کی تھی)۔

معیشت کا بحران مزید گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ریاست کی مرکزی منصوبہ بندی کی ایجنسی گوز پلان خبردار کر رہی تھی کہ مرکزی منصوبہ کی تباہی کے باعث پیداوار تیس سے ستر فیصد تک گر سکتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گورباچوف آزمودہ نسخے کے مطابق سارا الزام اپنے پیش رووں پر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دسمبر 1988ء میں سنٹرل کمیٹی نے اعلان کیا کہ برژنیف اور چرننکو کے نام تمام گلیوں، تختیوں اور یادگاروں سے ہٹا دیئے جائیں۔ برژنیف کی کتابیں پبلک لائبریریوں سے اٹھا لی جائیں۔ اس دوران تطہیرات میں مرنے والوں کو الزامات سے بری کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ ازوستیا نے اطلاع دی کہ سپریم کورٹ نے ٹراٹسکی کے بیٹے سرجی کے خلاف لگائے گئے الزامات خارج کر دیئے ہیں جسے 1937ء میں سٹالن نے قتل کر دیا تھا۔ لیکن ٹراٹسکی کو الزامات سے بری کرنے کا مسئلہ بدستور شجرِ ممنوعہ بنا رہا۔ دوسری طرف بخارن کی الزامات سے بریت کو خاصی پذیرائی ملی کیونکہ اس کے نظریات کو گورباچوف کی سرمایہ داری کی حامی پالیسی کے سلسلے میں جواز بنایا جا سکتا تھا۔

لیکن ان تمام باتوں کا حقیقی صورتِ حال سے کوئی تعلق نہیں تھا جو بتدریج بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ معاشی بحران گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ 8 جون 1989ء کے واشنگٹن پوسٹ کے مطابق وزیرِ اعظم رژیکوف نے ''سوویت یونین کی معاشی ابتری کے بارے میں پیش کئے جانے والے آج تک کے سرکاری جائزوں میں سے تاریک ترین جائزہ پیش کیا۔'' اس نے رپورٹ دی کہ سوویت یونین کا بجٹ خسارہ 6.2 فیصد ہے اور 89-1988ء میں اخراجات کا اندازہ ٹیکسوں کا مقابلے میں 62,000 ملین روبل زیادہ ہے۔ بجٹ خسارہ 1985ء سے بڑھ رہا تھا جس کی بنیادی وجہ تیل کی آمدنی میں کمی، شراب

نوشی کے خلاف مہم کی وجہ سے 40,000 ملین روبل ٹیکس کی کمی کے علاوہ کئی دیگر مسائل تھے۔افغانستان میں فوجی مداخلت کا خرچہ 5,000 ملین روبل سالانہ تھا۔کل بیرونی قرضہ 34,000 ملین روبل تھا۔اس کے نتیجے میں رژیکوف نے تجویز پیش کی کہ نقصان میں جانے والے ریاستی اداروں کی چھوٹ میں کمی کی جائے اور دفاعی اخراجات میں کٹوتی کی جائے۔اشرافیہ کی مراعات کے بارے میں تحقیقات کے لئے ایک سرکاری کمیشن قائم کیا گیا اور اس طرح حکمران ٹولے نے خود اپنے بارے میں تحقیقات کا بیڑا اُٹھایا۔

مزدوروں کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔جولائی 1989ء میں سوویت یونین میں صنعتی بے چینی کی لہر اٹھی جس کا مرکز ڈونباس اور کُرباس میں واقع کوئلے کی کانیں تھی۔ میزڈور یچنسک میں 12,000 مزدوروں نے کام چھوڑ دیا اور قصبے پر قبضہ کر لیا۔وہ بہتر رہائشی سہولتوں، زیادہ اجرتوں، زیادہ چھٹیوں اور بہتر حالاتِ کار وغیرہ کا مطالبہ کر رہے تھے۔انہوں نے اپنی کانوں کے لئے مکمل معاشی آزادی کا بھی مطالبہ کیا تا کہ منافعوں کی سرمایہ کاری مقامی سطح پر کی جا سکے۔اس قسم کے پراگندہ مطالبات کسی حد تک اس بے چینی و مایوسی کو ظاہر کرتے تھے جو صوبوں کے اندر ماسکو کی بے توجہی اور سرمایہ کاری کی شدید کمی کے سلسلے میں پائی جاتی تھی۔

ہڑتالوں کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے حکومت کو مداخلت پر مجبور ہونا پڑا۔کُرباس میں ایک لاکھ کان کُن ان میں شریک تھے۔ہڑتالی کمیٹیوں نے افسران کی مراعات کے فوری خاتمے، مرکزی حکومت سے براہِ راست مذاکرات اور ایک نئے آئین کا مطالبہ کیا۔جیسے ہی کُرباس والے پیچھے ہٹے ڈان باس والے اسی قسم کے مطالبات لیکر سامنے آ گئے۔اس تحریک سے انتہائی شمال میں واقع ورکوٹا، جنوب مغرب میں روسٹوف آن ڈان اور یوکرائن میں واقع ڈینپر و پیٹر ووسک اور چرنو گراڈ کی کانیں متاثر ہوئیں۔ہڑتال میں شامل مزدوروں کی تعداد کا اندازہ تین لاکھ لگایا گیا تھا۔روسی حکمرانوں کے لئے صورتِ حال انتہائی خوفناک تھی۔گورباچوف نے کہا کہ یہ ہڑتالیں پریسٹرائیکا کے چار سالوں میں ملک کو پیش آنے والی سب سے بڑی مصیبت ہیں لیکن ساتھ میں یہ بھی کہا کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصلاحات کی راہ میں حائل ہر طرح کی نوکر شاہانہ رکاوٹوں کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔حکومت سے رعایتیں حاصل کرنے کے بعد ہڑتالی کام پر واپس جانے کو تیار ہو گئے۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آمرانہ حکمرانی کی سیاہ رات نے روسی عوام کے شعور کو بہت

پست کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ کان کنوں اور بالخصوص ان کی قیادت کے اندر سرمایہ داری کے بارے میں خوش فہمیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ ابھی منڈی کی معیشت کی ''مسرتوں'' سے لطف اندوز نہیں ہوئے تھے اور ان میں کچھ کا خیال تھا کہ اس کے ذریعے وہ عالمی منڈی میں اپنا کوئلہ فروخت کر سکیں گے۔ اس قسم کی خوش فہمیوں کو عجیب وغریب انداز میں کانوں پر مزدوروں کے کنٹرول سے گڈ مڈ کر دیا گیا تھا۔

اس کے باوجود سرمایہ داری کی طرف واپسی عوامی دباؤ کے نتیجے میں نہیں ہوئی۔ اس وقت لئے گئے ایک جائزے میں چالیس فیصد نے کہا کہ وہ زیادہ مرکزیت پر مبنی معاشی انتظام کو ترجیح دیں گے اور صرف 25 فیصد نے کہا کہ وہ مارکیٹ اکانومی کا نظام چاہتے ہیں۔ تاہم بیوروکریسی کے اندر سے سرمایہ دارانہ حل کی حمایت میں اٹھنے والی آوازوں کا شور اور اصرار بڑھتا گیا خصوصاً معیشت دانوں کی طرف سے 1989ء کا پورا سال اور 1990ء کے پہلے چھ ماہ میں اس رجحان نے بہت تقویت حاصل کر لی۔ یلسن کے تحت روسی فیڈریشن کی حکومت میں واضح طور پر بیوروکریسی کے اس دھڑے کا غلبہ تھا جو بورژوا دوست تھا۔ یہ دھڑا سرمایہ داری کی مکمل اور تیز رفتار بحالی کا پروگرام لے کر سامنے آیا۔ سٹانیسلاف شیٹیلن اور گریگوری یا فلینسکی نے مارکیٹ اکانومی کی طرف واپسی کیلئے نام نہاد پانچ سو روزہ پروگرام دیا جس میں سو دنوں کے اندر اندر بڑے پیمانے پر نجکاری کے علاوہ قیمتوں سے پابندی اٹھانے اور ریاستی چھوٹ میں کٹوتی کی تجاویز بھی شامل تھیں۔

شیٹیلن نے اس سال پارٹی میٹنگ میں یہ بات رکھی اور پراوداا خبار نے اس کی رپورٹ دی کہ ''اب سوال سوشلزم، کمیونزم یا کسی اور ازم کو بچانے کا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے ملک اور ہماری قوم کو بچانے کا سوال ہے۔'' اس کے ساتھ ساتھ سوویت یونین کی کونسل آف منسٹرز کا چیئر مین نکولائی رژکوف اور نائب وزیر اعظم لیونڈ ایبالکن ایک متبادل منصوبہ تیار کر رہے تھے جو اتنا انتہا پسندانہ نہیں تھا لیکن اس کی غرض و غایت یہی تھی۔ گورباچوف نے اگنبیگیان سے یہ فیصلہ کرنے کو کہا کہ کونسا راستہ اختیار کیا جائے اور اس نے پانچ سو روزہ منصوبے کی حمایت کی۔ اس میں مالیاتی استحکام، بجٹ کے خسارے کے خاتمے، مارکیٹ کے انفراسٹرکچر اور نجی ملکیت کیلئے قانون سازی کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

تاہم رژکوف نے عوامی نائبین کی کانگریس سے اپنے پروگرام کی منظوری حاصل کر لی جس کا مقصد 1995ء تک معاشی بحالی کا حصول تھا۔ لیکن مارچ 1990ء میں ملک کی معاشی ٹوٹ پھوٹ جاری رہنے کے باعث اس منصوبے کو ناکافی خیال کرتے ہوئے ترک کر دیا گیا۔ گیارہ مارچ کونسل آف

منسٹرز نے ایبالکن کو ہدایت کی کہ مارکیٹ اکانومی کی طرف تیز رفتار پیش رفت کیلئے یکم مئی تک ایک ڈرافت تیار کرے۔ تاہم اپریل کے آخر تک صدارتی اور فیڈریشن کی کونسلیں ایبالکن کے ڈرافٹ پر مزید کام کرنے کیلئے اسے واپس بھیج چکی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ بے چینی اور ہڑتالوں کے خوف سے گورباچوف اوراس کے وزیر معیشت کیلئے تجویز کردہ ''شاک تھراپی'' سے ہاتھ کھینچ چکے تھے۔

چھ مارچ کو سپریم سوویت نے نجی ملکیت کے بارے میں آرٹیکل چونتیس کی منظوری دی جس کے بارے میں ایبالکن کو یقین تھا کہ اس سے ''منصوبہ بند مارکیٹ اکانومی'' کی طرف روس کی پیش رفت کیلئے ضروری حالات پیدا ہونگے۔ اس قانون کے ذریعے شہریوں کو جائیداد، معدنی وسائل، آلات، پیسہ، حصص اور پانی کی ملکیت رکھنے اوراسے منتقل کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ سرکاری خبررساں ایجنسی تاس نے لکھا کہ ''نجی ملکیت'' کی اصطلاح اس لئے استعمال نہیں کی گئی کیونکہ سوویت یونین میں اسے ''زبردست جذباتی طاقت'' حاصل ہے اور لوگ اسے استحصال سے منسوب کرتے ہیں۔ اس بل کے دوسرے مطالعے کے دوران سپریم سوویت میں کافی طوفان اٹھا۔ لیکن یکم جولائی کو یہ قانون لاگو ہوگیا، 350 نے اس کے حق میں، تین نے اس کیخلاف اور گیارہ نے ووٹ کا حق استعمال نہیں کیا۔ تاہم ابھی تک معاملے کو ناپ تول کر مبہم انداز میں پیش کیا گیا تھا جس کا مقصد بیوروکریسی کے تمام دھڑوں کو اکٹھا کرنا تھا۔

اگلے دن مرکزی حکومت نے ایک بیان جاری کیا کہ لوگ جس زمین پر رہ رہے ہیں وہ ان کی ملکیت ہے اور ہر شہری کو ایک پلاٹ رکھنے کا حق حاصل ہے تاہم سرمایہ داری کے حامی ''مصلحین'' کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ دیہی آبادی نے چھوٹے چھوٹے قطعہ ہائے اراضی کے نجی مالکان بننے میں کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔

قیمتوں میں اصلاح کا نکتہ عبوری دور کیلئے مرکزی اہمیت کا حامل تھا لیکن دھماکے کے خوف کی وجہ سے حکومت چاہتی تھی کہ ''منڈی کے طریقوں کو مرحلہ وار متعارف کروایا جائے۔'' ان اصلاحات کے مد نظر یکم جولائی 1990ء کو ڈبل روٹی کی قیمت میں تین گنا اضافے اوراس کے اثرات پر قابو پانے کیلئے پنشنوں اوراجرتوں میں اضافے کی تجویز پیش کی گئی۔ سمجھوتے کی اس کوشش سے کسی کی تسلی نہیں ہوسکی۔ ریڈیکل اور قدامت پسند، دونوں نے سپریم سوویت میں اس منصوبے کو غلط سوچ کہہ کر اس کی مذمت کی۔ انہوں نے یکم ستمبر تک ایک زیادہ مربوط منصوبہ پیش کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس دوران ریڈیکل عنصر نے سپریم

سوویت کے ذریعے گورباچوف پرزور دیا کہ وہ جولائی سے جوائنٹ سٹاک کمپنیوں، سٹاک ایکسچینج کے قیام اور ریاستی اداروں کی نج کاری کے سلسلے میں فرمان جاری کرے۔

14 جون کو سپریم سوویت نے ڈبل روٹی کی قیمت میں تین گنا اضافے کی تجویز مسترد کردی۔ اندھادھند خریداری کی وجہ سے گورباچوف کو مجبوراً عوام سے پرسکون رہنے کی اپیل کرنا پڑی۔ ہر مرحلے پر کریملن کے حکمرانوں کو دھماکے کا اندیشہ لاحق رہا۔ اسی دن سپریم سویت نے ملک کا پہلا کارپوریٹ ٹیکسیشن لامنظور کیا۔ اداروں کو اپنی اشیا کی قیمتیں خود متعین کرنے کی اجازت دینے اور فیکٹریوں کو دیوالیہ قرار دیئے جانے کے سلسلے میں ایک میکینزم تیار کرنے کیلئے قانون سازی کی گئی۔ اس طرح سرمایہ داری کیلئے قانونی بنیادیں رکھی جارہی تھیں۔ مگر آئین کی کتاب میں ایک قانون کا اضافہ کردینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ اس قانون کو عملاً نافذ کرنے کیلئے قوت کا موجود ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔ گیارہ جولائی کو لاکھوں کان کنوں نے ہڑتال کردی۔

یلسن کا عروج

بورس یلسن، جسے 1988ء میں کمیونسٹ پارٹی کے پولٹ بیورو سے نکال دیا گیا تھا اب سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک میں ایک کلیدی کردار کے طور پر سامنے آیا۔ انتیس مئی کو اسے روسی سپریم سوویت کا چیئرمین منتخب کیا گیا جو اسے روسی فیڈریشن کا صدر بنانے کے مترادف تھا۔ کچھ لوگوں کے بقول گورباچوف کا کہنا تھا کہ وہ یلسن کے آگے آنے سے ''کسی حد تک پریشان'' ہے۔ اس وقت تک یلسن نے اپنی حیثیت کو تقویت دینے کیلئے چالیں چلیں تھیں۔ بعدازاں اس کے تحت روسی کانگریس نے روس کی خودمختاری کا اعلان منظور کیا جس سے اس کی اتھارٹی اور اقتدار مزید مستحکم ہوگیا۔ گورباچوف سے اس کا باربار تصادم ہوا اور آخرکار اس نے ٹیلیویژن پر اس کے استعفے کا مطالبہ کردیا۔

عوامی نائبین کی کانگریس نے سوویت یونین کے لئے صدر کے نئے عہدے کی تخلیق کی منظوری دے دی۔ دودن بعد گورباچوف کو اس عہدے کیلئے منتخب کرلیا گیا۔ کانگریس نے سوویت یونین کے 1977ء کے آئین میں بھی ترامیم کی منظوری دی جس میں کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی اقتدار پر

اجارہ داری کی ضمانت کو ختم کر دیا گیا۔ جولائی 1990ء میں کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کی کانگریس کے موقع پر کمیونسٹ پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے اگلے ہی روز ماسکو اور لینن گراڈ کے ''اصلاح پسند'' میئروں گیوریل پوپوف اور اناطولی سوبچاک نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ پچھلے چھ ماہ میں 130,000 نے سی پی ایس یو چھوڑی تھی جن میں سے دس ہزار نے صرف جولائی میں ماسکو سے سی پی ایس یو چھوڑی تھی۔

جولائی 1990ء میں سی پی ایس یو کی 28ویں کانگریس میں گورباچوف نے ''سوشلزم کے سٹالنسٹ ماڈل'' کے خاتمے کا ذکر کیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ ''کئی دہائیوں پر محیط منتظمانہ کمانڈ سسٹم نے مزدور طبقے کو جائیداد اور اتھارٹی سے بیگانہ کر دیا ہے۔'' یہ دیوالیہ پن کا حیرت انگیز اعتراف تھا۔ لیکن ایک لینن اسٹ متبادل پیش کرنے کی بجائے گورباچوف نے حسب معمول عمومی اور مبہم باتوں کا سہارا لیا۔ ''حقیقی جمہوریت'' قائم کی جا رہی تھی۔ ضرورت سے زیادہ مرکزیت پر مبنی سوویت ریاست ''قومیتوں کی حق خودارادیت اور رضا کارانہ اتحاد'' پر مبنی ایک حقیقی اتحاد میں تبدیل ہونے کے عمل سے گزر رہی تھی۔ اس کا اب بھی یہی اصرار تھا کہ ایک ''سوشل'' مارکیٹ کیلئے اس کے منصوبوں کا مطلب سرمایہ داری کی جانب واپسی نہیں تھا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ منڈی کی جانب پیش رفت کر کے ہم سوشلزم کے راستے سے ہٹ نہیں رہے بلکہ ہم سماج کے امکانات سے مکمل استفادہ حاصل کرنے کی جانب بڑھ رہے ہیں۔''

بیوروکریسی کا بورژوا دوست دھڑا منظم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تین سو نائیبن نے کانگریس کے اندر ایک آزاد گروپ قائم کر لیا جس کا مقصد پریسٹرائیکا کی رفتار تیز کرنا اور ''قدامت پرست قوتوں کی طرف سے پارلیمنٹ پر ڈالے جانیوالے دباؤ کا مقابلہ کرنا تھا۔'' اس کی قیادت یلسن، سخاروف، افسانیف اور پالم پر مشتمل تھی۔ وہ بیوروکریسی کے اس دھڑے کی نمائندگی کرتے تھے جو صریحاً رد انقلابی تھا۔ پوپوف اور سوبچاک بھی اسی پرت کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس میں کلیدی کردار یلسن ادا کر رہا تھا۔ جو روسی جمہوریہ کا صدر تھا۔

شیٹیلن کے مطابق، ''سوویت یونین'' کی معاشی صورتحال کے جائزے نے ملکی قیادت کو جس میں صدر گورباچوف سرفہرست ہیں، مارکیٹ اکانومی کی طرف فوری عبور، منڈی کے تعلقات اور سماجی و معاشی شعبے میں بالعموم ریاستی مداخلت کے نظریوں کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا۔ اگرچہ یہاں بھی بنیادی اختلافات ابھی تک موجود ہیں۔'' (2)

ان سطور سے ثابت ہوتا ہے کہ تضادات حل نہیں ہوئے تھے۔ بیورو کریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان شدید جدو جہد جاری تھی۔ چار ستمبر 1990ء کو سوویت یونین کی سپریم سوویت نے مارکیٹ اکانومی متعارف کروانے کا عمل التوا میں ڈال دیا تا کہ شیٹیلن، گورباچوف اور یلسن کے قائم کردہ کمیشن کے زیادہ ریڈیکل منصوبے اور وزیراعظم رژکوف کے زیادہ محتاط منصوبے کے درمیان سمجھوتے کی کوشش کی جا سکے۔ ہمیشہ کی طرح سب سے بڑی پریشانی مزدور طبقے کے ردعمل کے سلسلے میں تھی۔ رژکوف نے خبردار کیا کہ شیٹیلن کے منصوبے سے بے چینی پیدا ہوگی۔ سپریم سوویت نے بالآخر شیٹیلن کے منصوبے کو ترجیح دینے کا اعلان کر دیا۔ تاہم اگنبیگیان نے پھر ایک سمجھوتے کا مسودہ تیار کیا (جو زیادہ تر شیٹیلن کے منصوبے پر مبنی تھا) اور بارہ ستمبر 1990ء کو سپریم سوویت کی کمیٹیوں کے سامنے پیش کیا۔ بیورو کریسی کا بڑا حصہ ابھی تک ہچر مچر کر رہا تھا۔ پھر گیارہ ستمبر کو ایک حیران کن چال چلتے ہوئے رشین فیڈریشن نے جمہوریہ کی معیشت کیلئے شیٹیلن کے منصوبے کو اپنانے کا اعلان کر دیا جس کا نفاذ یکم اکتوبر سے کیا جانا تھا۔ روسی حکومت نے رژکوف کی حکومت کے ساتھ تصادم کا آغاز کر دیا۔ تاہم حکومت نے ٹال مٹول سے کام لیا اور اصلاحات کے حامی وزرا نے حکومت سے استعفیٰ دے دیا۔

بالآخر انیس اکتوبر 1990ء کو سوویت یونین کی سپریم سوویت نے مارکیٹ اکانومی کے ایک منصوبے کی منظوری دے دی۔ 20 اکتوبر 1990ء کے گارجین اخبار کے مطابق موڈ ''بجھا بجھا اور مایوسی'' کا تھا۔ یہ سمجھوتے پر مبنی پروگرام تھا جس میں ''تفاصیل کم'' تھیں۔ اکتوبر کے مہینے میں گورباچوف نے فرمان جاری کئے جن کا مقصد ہول سیل قیمتوں اور روبل کی شرح تبادلہ پر سے پابندیاں اٹھانا تھا۔ نومبر میں حکومت نے روبل کی شرح تبادلہ ایک ڈالر کے مقابلے میں 1.8 روبل مقرر کی (جو چھ سال بعد 5000 روبل فی ڈالر تک ہوگئی) اور غیر ملکیوں کو اداروں کی ملکیت کے حصول کا حق دے دیا یعنی غیر ملکی سرمایہ داروں کو سوویت یونین میں ادارے قائم کرنے کے علاوہ حصص اور جائیداد خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔ تیرہ نومبر کو یلسن نے شیٹیلن کے منصوبے کو موخر کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کہا کہ ''مرکزی حکومت کے ساتھ مربوط کئے بغیر شیٹیلن کے منصوبے کو جاری رکھنا ناممکن ہے۔'' یہ ایک بالکل نیا نقطہ آغاز تھا۔ درحقیقت بورژوا دوست دھڑے کے نمائندے رشین فیڈریشن کی حکومت پر اپنے غلبے کو کریملن سے تصادم کی راہ ہموار کرنے کیلئے استعمال کر رہے تھے۔

سامراجیوں کو اپنی قسمت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ سال

کے آخر میں دیوار برلن کے خاتمے کے بعد سوویت یونین اور امریکہ کے صدور کے درمیان ایک سربراہ ملاقات ہوئی۔ پریس کانفرنس میں صدر بش نے کہا کہ وہ بین الاقوامی مارکیٹ اکانومی میں زیادہ شرکت کیلئے سوویت یونین کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کیلئے تیار ہے۔ دوسرے الفاظ میں عالمی سامراج کے نمائندے اپنا تمام تر وزن روس کی نوزائیدہ بورژوازی کے پلڑے میں ڈال رہے تھے۔ گورباچوف نے شدید بحران کے ماحول میں قوم سے خطاب کیا۔ دسمبر میں عوامی نائبین کی کانگریس نے گورباچوف کو مزید اختیارات دے دیئے۔ نیو یونین ٹریٹی بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان تناؤ کی وجہ بن رہی تھی۔ سابق وزیر خارجہ شیورڈ ناڈزاب حتمی طور پر سرمایہ دارانہ رد انقلابی قوتوں کے ساتھ مل چکا تھا۔ اس نے ''آمریت کے آغاز'' کے بارے میں انتباہ کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا۔ گورباچوف ''سوشلسٹ منصوبہ بندی'' کے بارے میں زبانی جمع خرچ کر رہا تھا لیکن وہ مارکیٹ اکانومی کے تصور کو گلے لگا چکا تھا اگرچہ وہ لگاتار کبھی ایک دباؤ کا شکار ہوتا کبھی دوسرے کا، جیسا کہ ایک خشک پتہ ہوا کے ہر جھکڑ کے ساتھ اڑتا پھرتا ہے۔

پریسٹرائیکا اور گلاسناسٹ نے محض مسائل کے اوپر سے ڈھکنا اٹھانے کا کام کیا۔ سارے روس میں پھیلنے والی ہڑتالوں سے تمام نوکر شاہانہ نظام کی تباہی کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ گورباچوف کو بھی خروشیف کی طرح اقتدار سے محروم کئے جانے کا خطرہ درپیش تھا۔ وہ اپنی راہ مکمل طور پر کھو چکا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں نظام کے بحران کے پس منظر میں جمہوریاؤں کے اندر بڑھتی ہوئی بے چینی بھی موجود تھی۔ جارجیا میں ابخازیہ کے سوال پر جنگ چھڑ چکی تھی۔ حکمران ٹولے کے درمیان پھوٹ کے باعث وہ دبے ہوئے مرکز گریز رجحانات کھل کر سامنے آ گئے جو کئی عشروں سے سوویت یونین کے اندر جمع ہوتے رہے تھے۔ 1991ء میں مرکزی حاکمیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہی تھی۔ جمہوریاؤں بلکہ یہاں تک کہ شہروں نے بھی آزادانہ طور پر قیمتوں کے بارے میں فرمان جاری کر دیئے۔ منصوبہ بندی کی جگہ جمہوریاؤں، علاقوں اور اداروں کے درمیان اشیا کے بدلے اشیا کی تجارت نے لے لی۔ روسی جمہوریہ کی یہ دستاویز صورتحال کو بہت واضح طور پر پیش کرتی ہے۔

''معیشت ایسی حدود کو پہنچ چکی ہے جس کے بعد ہم معاشی بحران کا نہیں بلکہ معاشی تباہی کا نام ہی استعمال کر سکتے ہیں۔ اکثر ریاستی اداروں میں واقع ہونیوالی پیداوار کی شدید کمی کے ساتھ ساتھ افراط زر بھی بڑھ رہا ہے۔ انتظامیہ پیداوار کے بارے میں نہیں بلکہ ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے ذرائع

کی تلاش اور پھر انہیں خوراک اور اشیائے صرف مہیا کرنے کے بارے میں پریشان ہے جن پر وہ اپنی اجرتیں خرچ کر سکیں۔ ان مسائل کے علاوہ خام مال اور ٹیکنیکی سامان کی سپلائی کیلئے اشیا کے بدلے اشیا کی تجارت کا قدیم طریقہ استعمال کیا جا رہا ہے مگر اس سے مطلوبہ رسد کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ اس لئے معاشی رابطے منقطع ہو گئے اور پیداوار رک گئی ہے۔ معیشت اس درجہ بے قابو ہو چکی ہے کہ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ منصوبہ بندی کرنیوالے ادارے آج کی صورتحال کی بے یقینی کی وجہ سے بالعموم اور آنے والے کل کی وجہ سے بالخصوص بے دلی کا شکار ہو چکے ہیں۔ نیچے سے معلومات حاصل نہیں ہو رہیں۔ یونین، جمہوریہ اور علاقوں کے نظام ایک دوسرے سے متضاد ہیں جس کی وجہ سے سماجی و سیاسی کشیدگیوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔'' (3)

سپریم سوویت میں ابھی تک نجکاری کی شدید مخالفت کی جا رہی تھی۔ تاہم ''اصلاح پسند'' بتدریج دلیر اور واضح طور پر سوشلزم مخالف بن گئے۔ گورباچوف کو بیوروکریسی کے مخالف دھڑوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے سے دلچسپی تھی۔ بحران کی وجہ سے یہ سب کچھ شدید متاثر ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اسے بحال کیسے کیا جائے؟ پرانے سٹالنسٹ دھڑے کے نمائندے اس صورتحال سے پریشان اور مایوس تھے۔ یونین ٹریٹی کے بعد سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کی جانب تحریک کھلی مخالفت کا موجب بن گئی۔ عوامی نائبین کی کانگریس کے انعقاد سے پیشتر پرانی اشرافیہ نے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ وہ سوویت یونین کو نہ توڑے۔

دسمبر میں کے جی بی کے سربراہ جنرل ولادیمیر کرچکوف نے ٹیلیویژن پر بیان دیتے ہوئے کہا کہ ملک ''انتہا پسند گروپوں کی گرفت میں ہے جنہیں باہر سے اخلاقی اور سیاسی حمایت حاصل ہوتی ہے۔'' صورتحال گورباچوف کی گرفت سے نکل چکی تھی کیونکہ اس کے پاس نہ تو کوئی منصوبہ تھا اور نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے سوویت یونین کو توڑنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کیخلاف بیوروکریسی اور بالخصوص فوجی ٹولے میں وسیع بے چینی پائی جاتی تھی۔ درحقیقت یونین ٹریٹی کے بعد مرکز کے پاس صرف خارجہ پالیسی اور دفاع کی بچی کھچی طاقت باقی بچتی تھی۔ سوویت یونین کے بحران کے باعث علیحدگی پسندی اور قوم پرستی کے شدید رجحانات سر اٹھا چکے تھے۔ وہ تمام مشرقی یورپ پہلے ہی کھو چکے تھے۔ ان تمام باتوں کا اختتام کہاں ہوتا؟ 1990ء کے آغاز میں ہی اقتدار پر کمیونسٹ پارٹی کی آئینی اجارہ داری کو ختم کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ پست حوصلہ پارٹی کو گورباچوف کی اصلاحات اور اناڑی پن نے مزید

کمزور کر دیا۔ جولائی میں کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین نے ایک نئے پروگرام کا مسودہ منظور کیا جس میں مارکسزم،لیننن ازم کی جگہ سوشل ڈیموکریسی کے اصولوں کو دے دی گئی۔

اس دوران جارجیا اور بالٹک ریاستوں میں ہونیوالے انتخابات انہیں خودمختاری کی جانب دھکیل رہے تھے۔ لیتھونیا میں آزادی کے حق میں زبردست مظاہرے ہوئے اور کوئلے کی کانوں میں مزید ہڑتالیں ہوئیں۔ نائیبن کے سویوز (یونین) گروپ کے لیڈر لیفٹینینٹ کرنل وکٹر الیکسنس نے گورباچوف کو یونین ٹریٹی کے خطرات سے آگاہ کیا۔ نئے معاہدے کے بارے میں جمہوریاؤں کے ساتھ مذاکرات 1991ء تک جاری رہے۔ یہ معاہدہ جس کی توثیق بیس اگست کو ہونا تھی ان طویل مذاکرات کا نتیجہ تھا جن کا آغاز بالٹک ریاستوں، جارجیا اور مالدیویا کی جانب سے یونین سے علیحدہ ہونے کے مطالبات کے جواب میں کیا گیا تھا۔ Alksnis نے دھمکی دی کہ اگر نئی کانگریس کے آغاز تک گورباچوف نے اپنی پالیسی کا رخ نہ بدلا تو وہ اس کیخلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دے گا۔ وہ تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی، تمام پارلیمانوں کی تحلیل اور ایمرجنسی کے نفاذ کے حق میں تھا۔

اس صورتحال کی وجہ روسی پرولتاریہ کی ایک آزاد تحریک کی عدم موجودگی تھی۔ یہ درست ہے کہ بہت سی ہڑتالیں ہوئیں۔ لیکن زبردست انتشار اور کسی متبادل کے موجود نہ ہونے کے باعث مزدور ایک آزاد قوت کی طرح نہیں لڑے۔ اس مساوات میں یہ ایک فیصلہ کن عنصر تھا۔ مزدوروں کی ایک آزاد تحریک کی غیر موجودگی میں تمام تر جدوجہد بیوروکریسی کے مخالف دھڑوں کے درمیان ہوئی۔ تصادم کا فیصلہ صرف کھلی جدوجہد کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ مخالف دھڑوں میں توازن موجود ہونے کے باعث صرف بوناپارٹسٹ حل ہی ممکن تھا۔ اس طرح پریسٹرائیکا کی بند گلی براہ راست 1991ء کے Coup کا سبب بن گئی۔

1991ء کی ناکام بغاوت

’’آرڈر‘‘ کی پارٹی نے ثابت کر دیا کہ اس میں نہ تو حکمرانی کا سلیقہ تھا نہ خدمت کرنے کا، نہ زندہ رہنے کا اور نہ مرنے کا، نہ جمہوریہ کو برداشت کرنے کا اور نہ ہی اس کا تختہ الٹنے کا، نہ آئین کو سربلند رکھنے کا اور نہ ہی اس سے نجات حاصل کرنے کا، نہ صدر سے تعاون کرنے کا اور نہ ہی اس سے نمٹنے کا۔‘‘

کارل مارکس (4)

19 اگست 1991ء کی صبح ماسکو اور دیگر شہروں کی گلیوں میں ٹینک نظر آئے۔اس فوجی بغاوت کی سربراہی نائب صدر گیناڈی یانائیف (لیگاچوف کے سٹالنسٹ دھڑے کا حامی) اور وزیر دفاع یازوف کر رہے تھے۔ بغاوت کے لیڈروں نے ریڈیو پر اعلان کیا کہ ''گورباچوف خرابی صحت کے باعث اپنے فرائض ادا نہیں کرسکتا'' اور ''گہرے بحران، سیاسی اور گروہی فسادات، انتشار اور طوائف الملوکی کے باعث جس سے سوویت یونین کے عوام کے تحفظ اور زندگیوں کو خطرہ درپیش ہے'' ایمرجنسی کی حالت کا اعلان کیا جاتا ہے۔درحقیقت گورباچوف کو کریمیا میں اس کے گھر کے اندر قید کردیا گیا تھا۔کیونکہ اس نے صدارت چھوڑنے سے انکار کردیا تھا۔

یہ بغاوت غیر متوقع نہیں تھی۔سوویت یونین میں کئی مہینوں سے افواہیں گشت کررہی تھیں۔یہاں تک کہ جارج بش نے گورباچوف کو یہ بتانے کیلئے فون پر رابطہ کیا کہ اس نے فوجی قبضے کے بارے میں افواہیں سنی ہیں۔دسمبر 1990ء میں پارلیمانی نائبین کے سویوز گروپ نے زور دیا تھا کہ علیحدہ ہونے والی جمہوریاؤں کیخلاف فوجی کارروائی کے بعد سارے ملک میں ایمرجنسی نافذ کردی جائے۔اس بغاوت کے ذریعے درحقیقت بیوروکریسی کے ایک دھڑے نے مایوسی کے عالم میں جوا کھیلا تھا تاکہ گورباچوف کو یونین ٹریٹی پر دستخط کرنے سے روکا جاسکے۔اس بغاوت کے خالقوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ اس کے ذریعے جمہوریاؤں کو اور بالخصوص یلسن کے تحت روسی جمہوریہ کو مزید قوت مل جائے گی۔یانائیف اور اولڈ گارڈ سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگ سوویت یونین کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے اور فوجی ٹولے کو ازسرنو تقویت دینے کی کوشش کررہے تھے۔تاہم یہ ''کو'' اول تا آخر ایک سعی ناکام ثابت ہوا۔

بورس یلسن جو اس وقت روسی جمہوریہ کی صدارتی عمارت میں موجود تھا (نام نہاد وائٹ ہاؤس) صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام ''جمہوری'' طاقتوں کو قدامت پرستوں کیخلاف جمع کرنے میں کامیاب ہوگیا۔چندروز کے اندر اندر یہ فوجی بغاوت ناکام ہوگی۔تاہم یہ ''کو'' گلی کوچوں میں ناکام نہیں ہوا جیسا کہ بعض لوگوں نے بعد میں دعویٰ کیا تھا۔مزدوروں کی اکثریت لاتعلق رہی۔یلسن نے عام ہڑتال کی اپیل کی جس پر کسی نے کان نہیں دھرا۔اخبار گارجین کے ماسکو میں موجود نمائندے کے مطابق ''زیادہ تر لوگ بے حسی بدگمانی کا شکار تھے یا صاف معنوں میں یلسن کی ہڑتال کی اپیل پر عمل کرنے کے نتائج سے خوف زدہ تھے۔ پریسٹرائیکا کے پانچ سال خالی دکانیں، قطاریں، قلتیں، بے تحاشہ افراطِ زر،

انتشار اور بھوک کا خطرہ لے کر آئے تھے۔اس کے نتیجے میں گورباچوف کی حمایت میں زبردست کمی واقع ہوئی (14 فیصد حمایت) اور ''اصلاح پسند'' سیاست دانوں کے تمام ریوڑ کو لوگوں نے مسترد کرنا شروع کر دیا۔

بیوروکریسی میں گہری پھوٹ پڑ گئی تھی۔ایک دھڑا 'اسٹیٹس کو' برقرار رکھنا چاہتا تھا۔اس طرح کے جبر کی طرف واپس جانا چاہتا تھا جیسا برژنیف کے دور میں تھا۔دوسرا دھڑا جو نوزائیدہ بورژوازی کا نمائندہ تھا سرمایہ داری کے راستے پر چلنا چاہتا تھا۔تاہم مزدوروں کی اکثریت کو قدامت پسندوں اور یلسن کے گرد جمع ہونے والے سرمایہ داری کے حامی ردانقلابیوں میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا تھا۔اگست میں ہوانے والے ''کو'' کیخلاف یلسن نے عام ہڑتال کی جو اپیل کی تھی اس کی مارگریٹ تھیچر نے کھلم کھلا حمایت کی تھی اور روسی مزدوروں سے اس کی حمایت کرنے کو کہا تھا۔ یہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔اس کے بارے میں رائٹر کے نمائندے کا اندازہ تھا کہ ''یلسن کی ہڑتالوں کے لئے اپیل کا ملا جلا ردعمل ہوا۔سوویت یونین کے سب سے بڑے معدنی کوئلے کے ذخیرے کزباس کے مزدور جو قبل ازیں کریملن کیخلاف اپنی صنعتی قوت کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے اب ان کی صرف آدھی تعداد نے ہڑتال میں حصہ لیا۔سائبیریا میں ورکوٹا نامی کوئلے کے ذخیرے کی صرف پانچ کانوں نے یلسن کی اپیل کا مثبت جواب دیا۔''(5)

اس طرح کوئلے کی کانوں میں کام کرنے والوں کی صرف نصف تعداد نے اس عمل میں حصہ لیا۔ تیل کے شعبے میں کام کرنے والے مزدور ایک فیصلہ کن دھڑا تھے اور یلسن نے ان سے خصوصی طور پر ہڑتال کی اپیل کی تھی لیکن انہوں نے اس میں حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا۔گیس کے مزدوروں کی بھی یہی صورتحال تھی۔ ماسکو میں بھی اس کا ردعمل نہ ہونے کے برابر تھا۔لینن گراڈ میں چند محدود پیمانے کی ہڑتالیں ہوئیں۔ یلسن کے آبائی گاؤں سووڈلووسک میں پانچ اداروں نے ہڑتال میں حصہ لیا۔ بالٹک کی ریاستوں، کاشیکیا اور وسطی ایشیا میں کچھ بھی نہیں ہوا۔یوکرائن کی پارلیمنٹ کے صدر لیونڈ کراؤچک نے ''کو'' کے بارے میں مبہم ردعمل کا اظہار کیا جس کے بارے میں رائٹر کے نمائندے نے لکھا کہ ''مسٹر کراؤچک یف کے گلی کوچوں میں پائی جانیوالی رائے کی عکاسی کر رہے تھے جس کے بارے میں یوکرائن کے صحافی نے رپورٹ دی تھی کہ وہاں بہت سے لوگوں نے بغاوت کی حمایت کا اظہار کیا تھا۔''(6)

مورگن سٹینلے بینک نے 17 ستمبر 1991ء کو شائع ہونیوالے اپنے تبصرے میں عینی شاہدوں کے

حوالے سے اسی قسم کی کہانی دہرائی:

''ماسکو میں طاقت کا خلا موجود ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ مرکز کے پاس موجود نہیں۔اس کا کوئی وجود ہی نہیں، یہ اس کا ایک پہلو ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ کوئی مقبول عام انقلاب بھی نہیں ہے۔ غلیظ حکمران ٹولے کو بہت معمولی جمہوری مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اس کے باوجود اس کا ڈھانچہ اور اقتدار کی مشینری منہدم ہو گئی۔'' مزید برآں، ''شروع کے کچھ دنوں کے زیادہ تر حصے میں ''کو'' کیخلاف عوامی مزاحمت نہایت کم تھی۔ ماسکو میں مجھے عوامی بغاوت کے برپا نہ ہونے پر سخت حیرت ہوئی۔'' دوسرے لفظوں میں مزدوروں کی اکثریت نے ''کو'' کیخلاف ایک انگلی بھی نہیں اٹھائی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ یلسن پر یانا یوف سے اور اگر دیکھا جائے تو گورباچوف سے زیادہ اعتماد نہیں کرتے تھے۔

اس رسالے کیلئے لکھنے والے ایک روسی مبصر نے ماسکو میں انیس اگست کے روز ایک بس میں ہونیوالی گفتگو کے بارے میں یہ لکھا، ''اک ادھیڑ عمر شخص نے با آواز بلند کہا کہ اسے نظم وضبط بحال ہوتے دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ نہ تو کسی نے اس کی حمایت کی اور نہ ہی کسی نے اس سے اختلاف کیا۔عوام پر مایوسی اور خوف یا شاید طمانیت اور صبر وشکر کی کیفیت طاری تھی۔'' ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ان سے ''کو'' کے وقت پائے جانیوالے موڈ کا بہت واضح اظہار ہوتا ہے۔

اس نقطہ نظر کو اسی ذریعے کی رپورٹ سے مزید تقویت ملتی ہے جس نے لکھا تھا کہ ''یوں لگتا ہے کہ اگر ''کو'' کامیاب ہو جاتا تو عوام کی اکثریت نے چپ چاپ فوج کی حکمرانی کو قبول کر لیا ہوتا۔ اگرچہ معیشت کی فوری اصلاح کا وعدہ زبانی جمع خرچ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا مگر اس سے فوج کو ایک بہتر موقع فراہم ہو سکتا تھا۔ معیشت کی حالت کے بارے میں پراگندگی، مایوسی اور بدگمانی اس قدر زیادہ ہے کہ کسی بھی ایسے حکمران کو عوامی حمایت حاصل نہیں ہو سکتی جو ترقی (یعنی سرمایہ داری کی طرف) کے حصول کی اہلیت رکھتا ہو۔ میں نہیں سمجھتا کہ عوام کی اکثریت اس تصور کو سمجھتی اور قبول کرتی ہے کہ منڈی کی معیشت اور شاک تھراپی کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔''

بی بی سی کے نمائندے مارٹن سکس سمتھ نے عوامی موڈ کے بارے میں اپنی حتمی رائے اس طرح سے دی:

''اس سہ پہر سوویت عوام کا کردار بھی زیر معائنہ تھا۔ اس روز جو لوگ پارلیمنٹ تک آئے یا جنہوں نے گلیوں میں مظاہرہ کیا جمہوریت کے حق میں ایک حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ان کی

تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ایک کروڑ کی آبادی کے شہر میں پچاس ہزار لوگوں کی تعداد کوئی بہت بڑی شرح فیصد نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے اور لوگ بھی اپنے دلوں میں ''کو'' کی مخالفت کرتے ہوں لیکن انہوں نے اپنے جذبات کو عملی جامہ پہنانے کیلئے کچھ نہیں کیا۔ کہیں کہیں ہڑتالیں بھی ہوئیں لیکن اکثر ادارے کھلے رہے اور ٹرانسپورٹ کے مزدوروں کی اتنی بڑی تعداد کام کرنے پر تیار تھی کہ بسوں اور زیر زمین ٹرینوں کا نظام چلتا رہا۔ ''کو'' کے اس مرحلے پر یلسن کو نہ صرف کریملن کے ٹینکوں کا سامنا تھا بلکہ اسے آبادی کے وسیع حصوں کی لاپرواہی کا بھی سامنا تھا۔''

''اس سے بھی بڑھ کر جو چیز دشواری پیش کر رہی تھی وہ عام سوویت شہریوں میں پایا جانیوالا یہ احساس تھا کہ ''کو'' کے لیڈروں کو بھی ایک موقع ملنا چاہیے اور یہ کہ وہ ان لوگوں سے بدتر ثابت نہیں ہو سکتے جو پہلے اقتدار میں تھے اور شاید یہ لوگ نظم وضبط بحال کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ جرائم میں اضافے کو ختم کرنے، علاقائی تصادموں کو روکنے اور آزادی کی خواہش مند جمہوریاؤں کی طرف سے یونین کو توڑنے کی کوششوں کے خاتمے کا وعدہ بھی بہت سے لوگوں کیلئے خصوصی کشش رکھتا تھا۔''(7)

25 اگست 1991ء کے سنڈے ٹائمز میں شائع ہونیوالی رپورٹ کے مطابق یلسن کا ساتھ دینے والے لوگ وہ تھے ''جنہوں نے پریسٹرائیکا سے فوائد حاصل کئے۔ جو سستی ڈبل روٹی اور زیادہ اجرتوں کے وعدے سے آگے بھی دیکھتے تھے اور آسانی سے اس دور کی طرف واپس جانے کو تیار نہیں تھے جب ان کے ساتھ بھیڑ بکریوں جیسا سلوک ہوتا تھا۔'' یہ پرت زیادہ تر ان لاکھوں کوالیفائیڈ لوگوں، طالب علموں، انجینئروں، سٹہ بازوں اور کالا دھندا کرنیوالوں پر مشتمل تھی جو محسوس کرتے تھے کہ مارکیٹ اکانومی کی جانب پیش رفت سے ان کے لئے طاقت، دولت اور حیثیت کے حصول کے امکانات پیدا ہونگے۔ یہ دانشور ''اصلاح پسند'' تھے جن پر عوام کی بہت بڑی اکثریت اعتماد کرنے کو تیار نہیں تھی۔

اس پرت کے سٹالنسٹ بیوروکریسی کیخلاف جارحانہ رویے کا نہ تو ''جمہوریت'' سے کوئی واسطہ تھا اور نہ ہی مزدوروں کے مفادات کے دفاع سے بلکہ اس کی اصل وجہ سیاسی اقتدار کی بھوک تھی۔ مزدور طبقے کے نزدیک ''جمہوریت'' کوئی تجریدی سوال نہیں ہے۔ اگر اس کی وجہ سے معیار زندگی میں بہتری اور سماجی ترقی میں اضافہ نہ ہو تو آبادی کی اکثریت کیلئے ''جمہوریت'' ایک خالی خولی قانونی تصور ہی رہ جاتا ہے۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ مارکسسٹ جمہوری حقوق کے دفاع کی جدوجہد سے بے پرواہ ہوتے ہیں؟ قطعاً نہیں۔ لیکن مزدوروں کو ''جمہوری'' بورژوازی سے بالکل علیحدہ ہو کر اپنے آزادانہ طریقوں سے

جمہوری حقوق کا دفاع کرنا پڑتا ہے۔

کئی دہائیوں پر محیط عفریتی اور آمرانہ سٹالن ازم کا اثر یہ ہوا تھا کہ مزدور طبقے کا شعور اس طرح سے پس ماندہ ہوا جس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ پرانے بالشویکوں کو ختم کر دینے کی وجہ سے نئی نسل کا انقلاب کی روایات سے رابطہ منقطع ہو گیا۔ منصوبہ بند معیشت کی کامیابیوں نے ہی پرولتاریہ کی ترکیب کو نہایت تیز رفتاری سے بدل ڈالا۔ سابق کسانوں کی بہت بڑی تعداد قصبوں اور شہروں کی طرف نقل مکانی کر گئی جہاں وہ صنعت میں ترقی کے باعث اس شعبے میں جذب ہو گئے۔ عام طور پر اس کی وجہ سے مزدور طبقے کو زبردست تقویت حاصل ہوئی۔ تاہم سوویت مزدوروں کی نئی نسل کے شعور کی سطح وہ نہیں تھی جو 1917ء کی نسل کی تھی۔ انقلاب، سوشلزم اور کمیونزم کے بارے میں ان کے تصورات پر زندگی کے اس تجربے کا رنگ چڑھا ہوا تھا جو انہوں نے سٹالن ازم کے تحت گزاری تھی۔

اس وقت روسی عوام کی نفسیات کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ''کمیونزم'' ناکام ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری اس سے بھی بدتر ہے۔ گورباچوف، یلسن تمام کے تمام وعدے تو کرتے ہیں لیکن عوام کی حالت پہلے سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔ متبادل کہاں ہے؟ ایسے حالات میں عوام کے ذہنوں پر اپنی بقا کیلئے کی جانیوالی روزمرہ کی جدوجہد نے غلبہ کر لیا۔ سیاست ایک غلیظ گالی ہے۔ چہار سو پھیلی ہوئی بدعنوانی، جھوٹ یا کھلی غنڈہ گردی مزدوروں کو عارضی طور پر مایوسی کا شکار کر دیتی ہے۔

کیا یہ بغاوت کامیاب ہو سکتی تھی؟

جو لوگ یہ دلیل دیتے ہیں کہ اس ''کو'' کی کوئی سماجی بنیاد نہیں تھی اس لئے یہ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا ہم انکی توجہ عوام کی ان پرتوں کی طرف دلا سکتے ہیں جو پریسٹرائیکا کے انتشار سے تنگ آ چکی تھیں اور ''سنہرے دنوں کی واپسی'' کی خواہش مند تھیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس کی بنیاد اس وسیع پرت میں موجود تھی جو اس بغاوت کے حق میں تو نہیں تھی لیکن یلسن کی سرمایہ داری کی حامی پالیسیوں کی مخالف تھی۔ لہٰذا وہ اس تمام عرصے میں خاموش تماشائی بنی رہی۔ مزدور طبقے کی اکثریت کا مجہول ہونا ہی اس ''کو'' کی کامیابی کے لئے کافی ہوتا اگر اس پر فیصلہ کن انداز میں عمل پیرا ہوا جاتا۔

سرمائے کے ایک نمایاں حکمت کار اور واشنگٹن کی رینڈ کارپوریشن کے کنسلٹنٹ فرانسس فوکویاما

نے 25 اگست 1991ء کو دی انڈیپنڈنٹ آن سنڈے میں لکھے گئے ایک مضمون میں یہ اعتراف کیا کہ ''پولیس اور فوج کی وفاداریاں تقسیم ہونے کے باوجود ''کو'' کرنیوالے قلیل المدت کامیابی حاصل کر سکتے تھے اگر وہ اہل اور پختہ ارادے کے مالک ہوتے جیسا کہ ڈینگ حکومت نے تیانامن سکوائر میں ثابت کیا تھا۔ ان کے پاس کے جی بی اور داخلی سلامتی کے شعبے کے وفادار فوجی اتنی تعداد میں موجود تھے کہ وہ یلسن کو گرفتار یا ہلاک کر سکتے تھے، پریس بند کر سکتے تھے اور کرفیو نافذ کر سکتے تھے لیکن بغاوت کا منصوبہ تیار کرنیوالوں کو نہ تو خود پر مکمل اعتماد تھا نہ اپنے مقصد پر۔''

انقلاب اور رد انقلاب کا نتیجہ کبھی بھی پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا۔ دونوں صورتوں میں نتیجے کا فیصلہ زندہ قوتوں کی جدوجہد سے ہوتا ہے جس میں داخلی عنصر یعنی قیادت کا معیار ایک اہم اور اکثر اوقات فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ اگر انتہائی سازگار معروضی حالات بھی موجود ہوں اور وسیع ترین سماجی بنیاد بھی، لیکن آپ مکمل ثابت قدمی اور بے باکی کے ساتھ عمل نہ کریں تو آپ کو شکست ہوگی۔ ماسکو میں ''کو'' کی ناکامی کی وجہ سماجی بنیاد کی عدم موجودگی نہیں تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس بغاوت کی قیادت اپنے مخالفین کے ساتھ شدت اور بے رحمی کے ساتھ نمٹنے میں ناکام رہی تھی۔ ان کے رویے کا پولینڈ میں 1981ء میں جیروزلسکی کے رویے سے موازنہ کرنا ہی کافی ہوگا جس نے ''کو'' کرنے سے پہلے اپوزیشن کے لیڈروں کو آدھی رات کے وقت گرفتار کر لیا تھا۔

سابق منحرف رائے میڈویڈیف بھی بالکل یہی موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''پولینڈ میں کریک ڈاؤن کے وقت جیروزلسکی نے ان کی نسبت کہیں زیادہ بہتر کارکردگی کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے مواصلات کا نظام منقطع کر دیا تھا اور دوسو افراد کو گرفتار کر لیا تھا۔ درحقیقت اس نے انہیں گرفتار بھی نہیں کیا اس نے انہیں محض تنہا کر دیا تھا۔ لیکن یہاں انہوں نے یلسن کو بھی گرفتار نہیں کیا۔''

بالخصوص یلسن کو گرفتار نہ کرنے کے باعث مخالفین کو متحد ہونے کیلئے ایک مرکز مل گیا اور فوج کے اہم حصوں، پولیس اور کے جی بی کے سربراہوں کی نظروں میں یہ منصوبہ اناڑیوں کا کام ٹھہرا۔ ابتدا میں دیکھو اور انتظار کرو کی پالیسی پر کاربند رہنے کے بعد ان حصوں نے بغاوت کی قیادت سے خود کو دور کر لیا۔ اس کے نتیجے میں بذات خود یہ قیادت ہوا میں معلق ہوگئی۔ یہ ''کو'' مزدوروں کی کسی بڑی تحریک کی وجہ سے ناکام نہیں ہوا، ایسی کوئی تحریک موجود نہیں تھی، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ایک بھدی اور ناپختہ کوشش تھی جسے بذات خود ریاستی مشینری کے فیصلہ کن حصوں کی حمایت بھی حاصل نہیں تھی۔ اس کا تختہ جدوجہد کے نتیجے

میں نہیں الٹا۔ یہ محض اپنے داخلی تضادات اور کمزوریوں کے باعث ناکام ہو گیا۔ مارٹن میکاولی کہتا ہے کہ ''یہ کامیاب کیوں نہیں ہوسکا؟ حیرت انگیز طور پر اس کی منصوبہ بندی اور عمل درآمد بہت ناقص تھے۔'' (8)

سرمائے کی حکمت عملیاں طے کرنیوالے سنجیدہ حلقے کی رائے یہ تھی کہ ''برطانیہ اور امریکہ میں خفیہ معلومات کا تجزیہ کرنیوالوں کا ابتدائی اندازہ یہ تھا کہ بغاوت کو ایک چھوٹے سے گروہ نے منظّم کیا تھا جنہوں نے اپنے زیرکنٹرول اداروں میں موجود موڈ کو سمجھنے میں زبردست غلطی کی۔ اس بات کے کوئی شواہد نہیں ملے کہ کسی سکیورٹی فورس نے ''کو'' سے پہلے کوئی ریہرسل کی ہو۔'' (9) علاوہ ازیں سنڈے ٹائمز کا کہنا ہے کہ ''پچھلے ہفتے کے ابتدائی حصے میں کسی قابل ذکر فوجی نقل وحرکت کی کوئی علامات نہیں ملیں۔ سراغ رسانی کے ایک مغربی ذریعے کا کہنا ہے کہ یہ کوئی ایسا انقلاب نہیں تھا جو عوامی قوت کے باعث ناکام ہوا ہو۔ بغاوت کا منصوبہ تیار کرنیوالوں کی توقع سے کہیں کم لوگ گلیوں اور سڑکوں پر آئے۔ یہ اس لئے ناکام ہوئی کہ انہوں نے زیادہ سپاہی تعینات نہیں کئے یا انہیں موثر طور پر استعمال نہیں کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ناکام ''کو'' اعلیٰ بیوروکریٹوں کے ایک ایسے فوری ردعمل کا نتیجہ تھا جس کی وجہ یونین ٹریٹی کے بارے میں پریشانی تھی اور اسی سے اس کے غیرسنجیدہ اور غیرفیصلہ کن ہونے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ کریملن میں گورباچوف کے گروپ کے لیڈر رویلنٹن کا رائیف نے بعد میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ جب انہیں احساس ہوا کہ بغاوت کی قیادت کوئی قدم نہیں اٹھا رہی تو انہوں نے اپنے ردعمل کا آغاز کس طرح کیا۔ ''بیس تاریخ تک یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ کچھ بھی واقع نہیں ہوا۔ کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔'' (10) اسی اخبار نے مندرجہ ذیل تبصرہ کیا۔

''لیکن اب ظاہر ہونے والی تفاصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بغاوت کی ناکامی کی اصل وجہ باغی بذات خود تھے جن میں سے کچھ ابتدا میں ہی کم ہمتی کا شکار ہو گئے۔''

''ان میں سے ایک یعنی وزیراعظم پاؤلوف نے سوموار کی صبح قبضے کا اعلان کرنے کے چند گھنٹوں بعد ہی پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ دوسرا یعنی وزیردفاع یازوف کو شروع ہی سے کچھ شکوک وشبہات تھے جن پر اس نے بعد میں عمل کیا۔ یانائیف نے گورباچوف کو ہٹانے کے چند گھنٹوں بعد بذات خود اعتراف کیا کہ اقتدار پر قبضہ غیرقانونی تھا۔'' مضمون کے آخر میں لکھا تھا کہ ''بغاوت نے خود اپنے آپ کو تباہ کر لیا۔''

جب ''کو'' کی ناکامی کے بعد بائیس اگست کو گورباچوف ماسکو واپس پہنچا تو سب کچھ بدل چکا تھا۔ ابھی تک اس نے بیوروکریسی کے مخالف دھڑوں کے درمیان ایک نازک توازن قائم رکھتے ہوئے خود کو

برقرار رکھا تھا، اب اسکی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ گورباچوف کو ذلیل کن انداز میں کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کے سیکرٹری جنرل کے عہدے سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ پھر سنٹرل کمیٹی نے خود کو رضا کارانہ طور پر تحلیل کر دیا۔ چند روز کے اندر اندر اسے کمیونسٹ پارٹی کو غیر قانونی قرار دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ یلسن کی جمہوریہ نے اس کی جائیداد، کتب اور اثاثے ضبط کر کے اس پر پابندی عائد کرنے کیلئے فرمان جاری کر دیا۔ کوموسومول نے خود کو ''رضا کارانہ'' طور پر ختم کر دیا، کوئی مزاحمت نہیں ہوئی۔

پرانی کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین ریاست کا بازو ہونے کے علاوہ سرپرستی کا ایک بہت بڑا ادارہ تھا۔ صرف پارٹی کے ذریعے ہی زندگی میں آگے بڑھا جا سکتا تھا۔ چھ لاکھ کلیدی عہدوں کے علاوہ ریاست اور صنعت کی دس لاکھ ملازمتوں پر تقرریاں بھی پارٹی کی ذمہ داری تھیں۔ لہٰذا ایک کامیاب کیریئر کے لئے پارٹی کی ممبر شپ ضروری تھی۔ سوویت یونین کے ابتدائی دنوں میں ریاست کے نمایاں عہدوں تک مزدور طبقے کے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے باصلاحیت بچوں کی رسائی ہو سکتی تھی۔ مغرب کے مقابلے میں یہ ایک بہت بڑا فرق تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ایسا کم ہونے لگا۔ بہترین ملازمتیں بیوروکریٹوں کی اولاد کیلئے مخصوص تھیں۔ یہ چیز بذات خود سٹالن ازم کے گلنے سڑنے کی علامت تھی جسے ایک طرح کی شریانوں کی سختی کی بیماری خیال کیا جا سکتا ہے۔

سب سے اوپر سوویت حکمران ٹولہ تھا جو بتدریج سماج میں مزدور طبقے کی زندگی کی حقیقتوں سے بے بہرہ ہوتا جا رہا تھا۔ بار بار کی تطہیرات کے بعد پرانی کمیونسٹ پارٹی مواد کے حوالے سے اس قدر تبدیل ہو چکی تھی کہ وہ محض نام کی بالشویک پارٹی رہ گئی تھی۔ دراصل یہ کوئی پارٹی تھی ہی نہیں بلکہ یہ انیس ملین افراد پر مشتمل ریاستی آلہ تھا جس میں ظاہر ہے کہ ایماندار مزدوروں کی ایک پرت بھی موجود تھی لیکن اس کا زیادہ تر حصہ موقع پرستوں، چوروں، مسخروں اور ہر قسم کے پیشہ وروں کی فوج ظفر موج پر مشتمل تھا۔ اس کا عظیم تطہیرات کے دوران تباہ کر دی جانیوالی لینن اور ٹراٹسکی کی پارٹی سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لینن کی موت کے بعد پارٹی کو نوکر شاہی کے آلے میں تبدیل کرنے کا عمل شروع ہو گیا تھا جس کی طرف ایڈورڈ شیورناڈزے نے اشارہ کیا ہے:

''لینن کی موت کے فوراً بعد اس عمل میں تیزی آ گئی۔ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے اور پارٹی میں ایسے لوگوں کو بھرنے کیلئے جن کی حمایت پر تکیہ کیا جا سکے، سٹالن نے جو کہ فرسٹ سیکرٹری تھا اور ٹراٹسکی کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہا تھا، ایک نام نہاد لینن کی فوج کا اعلان کر دیا۔ دراصل یہ بڑے پیمانے پر ہونیوالی نئے

ارکان کی بھرتی تھی جس کا مقصد سٹالن کے مخالفوں پر غلبہ حاصل کرنا تھا۔ 1923ء میں ہونیوالی بارہویں کانگریس میں ممبر شپ 386,000 تھی جو ایک سال بعد یعنی تیرہویں کانگریس میں بڑھ کر 735,881 ہوگئی۔ 1929ء تک سٹالن اعلیٰ ترین حیثیت اختیار کر چکا تھا اور اپنے سینئر رفقا کو ختم کرنے کی تیاری کر رہا تھا اور پارٹی ممبران کی تعداد دگنی ہو کر 1,551,288 ہو چکی تھی۔''

''اگلے مرحلے میں ممبر شپ کی ترکیب میں ایک انتہائی حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی۔ 1930ء اور 1934ء کے درمیان پارٹی مزدوروں کی تنظیم کی حیثیت سے ختم ہوگئی۔ 1930ء میں حقیقی مزدور ممبر شپ کا تقریباً انچاس فیصد تھے۔ 1934ء میں یہ شرح کم ہو کر 9.3 فیصد رہ گئی جیسا کہ پارٹی کانگریس میں ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ابھرتی ہوئی باس کلاس (Boss Class) کی پارٹی پر کم و بیش اجارہ داری قائم ہونے کا عمل بھی جاری تھا۔ 1923ء میں سوویت یونین میں فیکٹری منیجروں کی صرف تیئس فیصد تعداد پارٹی ممبران پر مشتمل تھی۔ 1936ء تک یہ شرح تقریباً سو فیصد ہو چکی تھی اور یہ سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ جس سال جرمنی نے روس پر حملہ کیا اس وقت پارٹی اراکین کی تعداد تقریباً تیس لاکھ تھی جن کی اکثریت کسی نہ کسی قسم کے انتظامی معاملات میں شریک تھی۔'' (11)

آخر میں مصنف بجا طور پر کہتا ہے کہ ''جب ہم اس بات کو یاد کرتے ہیں کہ تیس کی دہائی کے وسط میں ہونیوالی تطہیرات میں سٹالن نے پرانی پارٹی کا تقریباً صفایا کر دیا تھا اور نیچے پارٹی کے اہل کاروں کو باقاعدہ اور جان بوجھ کر اعلیٰ قیادت کی غلطیوں اور زیادتیوں کیلئے قربانی کا بکرا بنایا جاتا تھا تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ کے بعد والی پارٹی اس باڈی سے بہت مختلف تھی جس کے ذریعے سٹالن اعلیٰ ترین مقام تک پہنچا تھا اور لینن کی حقیقی پارٹی سے اس کی معمولی سی مشابہت بھی نہیں تھی۔'' (12)

یہ عناصر کسی عقیدے یا نظریئے کی وجہ سے متحد نہیں تھے بلکہ اس کی وجہ ریاستی وسائل سے پارٹی کا تعلق تھا۔ جب یہ تعلق ختم ہوا تو وہ راتوں رات بکھر گئی۔ بیوروکریسی کے سیاسی بازو کی حیثیت سے ان واقعات نے اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ ''کمیونسٹوں'' کے پورے پورے جتھے پارٹی سے بھاگ کر قوم پرست یا کھلم کھلا بورژوا حامی گروپوں میں شامل ہو گئے جیسے ڈوبتے ہوئے جہاز سے چوہے بھاگتے ہیں۔

اکتوبر انقلاب اور منصوبہ بند معیشت کیخلاف وحشیانہ نظریاتی حملے کا آغاز کر دیا گیا۔ ایک ماہ کے اندر اندر یلسن نے کام کاج کی جگہوں پر تمام سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی اس اقدام کا مقصد دیدہ دانستہ طور پر کمیونسٹ پارٹی کو نشانہ بنانا تھا۔ یلسن کے حامیوں نے کمیونسٹ پارٹی ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر کے اس

کی دستاویزات پر قبضہ کرلیا اور پارٹی پر ناکام ''کو'' میں ملوث ہونے کا الزام لگایا۔ پراودا اخبار بند کر کے اس کے عملے کو تبدیل کر دیا گیا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد کے جی بی نے یہ بیان جاری کیا کہ ''کے جی بی کے ارکان کا مہم جوؤں کے اس ٹولے کے غیر قانونی فعلوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔'' یہ فدویانہ فعل بھی اسے بچانے میں ناکام رہا۔ یلسن نے جبر کے اس آلے پر قبضہ کرلیا جس سے لوگ خوف کھاتے تھے اور اس کی تطہیر کی۔ سپریم سوویت نے ربڑ سٹیمپ کی طرح گورباچوف کی طرف سے تمام حکومت کی برطرفی کی توثیق کر دی۔

ان واقعات سے طاقتوں کا توازن بالکل تبدیل ہو گیا۔ روس کے صدر یلسن اور سوویت یونین کے صدر گورباچوف کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کا خاتمہ ہو گیا۔ اقتدار کی جدوجہد میں گورباچوف پس پردہ چلا گیا۔ سامراجیوں نے سوویت یونین کو توڑنے اور سرمایہ داری بحال کرنے کیلئے زبردست دباؤ ڈالا۔ اس کا مطلب سٹالن ازم کا خاتمہ اور یلسن کے تحت ایک بورژوا دوست حکومت کا اقتدار پر غلبہ تھا جو ہر ممکن تیز رفتاری کے ساتھ سرمایہ داری کی بحالی کا تہیہ کئے ہوئے تھا۔ بغاوت کی ناکامی سے بیوروکریسی کے اس دھڑے کو زبردست تقویت حاصل ہوئی جو کھلم کھلا سرمایہ داری کی بحالی کا حامی تھا۔ روسی ٹی وی پر ہر شام ایک ٹیلیفون نمبر دکھایا جاتا تھا جس پر آپ ان ساتھی مزدوروں اور ہمسایوں کے بارے میں مخبری کر سکتے تھے جنہوں نے بغاوت کی حمایت کی تھی۔ سرکاری ٹی وی اور ریڈیو کو کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھوں سے لے لیا گیا۔ بالآخر پراودا دوبارہ شائع ہونا شروع ہو گیا لیکن اب وہ سنٹرل کمیٹی (سبکدوش شدہ) کا آرگن نہیں تھا۔ اس نے سٹالنسٹوں کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان اٹھا دیا۔ ماسکو کے میئر پوپوف نے تمام کمیونسٹ قوانین کے مسودے گورکی پارک میں جمع کئے اور انہیں تاریخی آثار قرار دے دیا۔

موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک کے بعد دوسری جمہوریہ نے آزادی کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ بالٹک کی ریاستیں، آرمینا اور جارجیا پہلے ہی ایسا کر چکی تھیں مگر اگست کے آخر سے پہلے یوکرائن، بیلا روس، مالدیویا، آذربائیجان اور پھر ازبکستان اور کرغیزیہ نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ یونین کی ٹوٹ پھوٹ سے گورباچوف کے پاس اثر رسوخ اور اقتدار برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ اس نے سرمایہ داری کی بحالی کا دروازہ کھولا تھا اور جن قوتوں کو اس نے آزاد کیا تھا انہیں قوتوں نے اسے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ بغاوت کی ناکامی کے بعد یلسن اور دوسرے لوگوں کے حق میں راہ ہموار ہو گئی تھی جو سرمایہ داری کی تیز رفتار بحالی کے حق میں تھے۔ جلد ہی سپریم سوویت نے یلسن کو غیر معمولی اختیارات دے دیئے جن کی رو سے

وہ فرمان کے ذریعے حکومت کرسکتا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا کہ اب سرمایہ داری کی راہ مکمل طور پر ہموار ہو چکی ہے۔

اگلے ماہ سپریم سوویت نے لینن گراڈ کا نام تبدیل کر کے انقلاب سے پہلے کا نام یعنی سینٹ پیٹرز برگ رکھنے کی توثیق کر دی جس کی منظوری جون کے ریفرنڈم میں دی گئی تھی۔ سورڈلووسک کا نام تبدیل کر کے اس کا پرانا نام یکاٹرن برگ بحال کر دیا گیا۔ دسمبر میں کریملن سے سوویت جھنڈا اتار کر علامتی طور پر پرانا روسی جھنڈا لہرا دیا گیا۔ ان حرکات کا مقصد اکتوبر انقلاب کی وراثت کو مٹانا تھا۔ تاریخ کے پہیے کو اس قدر پیچھے گھما دیا گیا تھا کہ زارشاہی نظام کو بھی نہایت اچھے الفاظ میں پیش کیا جا رہا تھا۔ رد انقلاب نے اپنا اظہار زارشاہی دور کے تمغوں، فسطائی گروپوں کے ظہور، مادرِ روس کے تصور اور آر تھوڈوکس چرچ کی بحالی کی شکل میں کیا جو زارشاہی ریاست کا سرکاری مذہب تھا۔

لیکن کیا بغاوت کے بعد کی صورت حال واقعی ایک فیصلہ کن تبدیلی کی نمائندگی کرتی تھی۔ پوپوف نے 22 اگست 1992ء کو ازوستیا میں لکھا کہ یلسن ’’باغیوں کیخلاف فتح کو سابقہ نظام کی مکمل تطہیر میں تبدیل کرنے کا مکمل طور پر مخالف تھا۔‘‘ مارٹن سکس سمتھ یہ تبصرہ کرتا ہے ’’بہت سی جگہوں میں پارٹی کے ڈھانچوں سے منتخب شدہ ریاستی اداروں کو ذمہ داری منتقل کرنے سے طاقت جمہوریت پسندوں کے ہاتھ نہیں آئی بلکہ ایک مختلف لبادے میں ملبوس کمیونسٹوں کے پاس واپس چلی گئی۔‘‘(13)

سامراجیوں کو اسی بات کا خوف تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سرمایہ داری کی بحالی کی طرف ہی ایک قدم تھا لیکن یہ فیصلہ کن نہیں تھا۔ رد انقلاب کے ابھار کو مدنظر رکھا جائے تو بغاوت کی ناکامی کے فوراً بعد یلسن آمرانہ اختیارات حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے بہت دیر کر دی۔ وہ متذبذب تھا۔ دی اکانومسٹ نے 23 جنوری 1993ء کے شمارے میں شکوہ کیا کہ ’’اگست 1991ء اور 1992ء کے آغاز کے دوران مسٹر یلسن زیادہ مزاحمت کا سامنا کیے بغیر پارلیمنٹ کو برطرف کر سکتے تھے۔‘‘ فیصلہ کن انداز میں عمل نہ کرنے کی وجہ سے پارلیمنٹ جس میں پرانے ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کی نمائندگی تھی، سنبھالا لے کر یلسن کو چیلنج کرنے کے قابل ہوگئی۔ اس کے بعد بیوروکریسی کے دونوں دھڑوں کے درمیان شدید رقابت کے ایک اور دور کا آغاز ہو گیا۔ بعد ازاں یلسن کمیونسٹ پارٹی کی قانونی حیثیت بحال کرنے پر مجبور ہو گیا جس نے دو سال کے اندر اندر اس کے اقتدار کو چیلنج کر دیا۔

سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ نے ’’آزاد‘‘ ریاستوں کیلئے نئے مسائل پیدا کر دیئے۔ اب ان کا

کیا تعلق ہوگا؟ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے سکتیں یلسن نے اعلان کیا کہ ہوسکتا ہے کہ روس کے ساتھ ملنے والی ان جمہوریاؤں کی سرحدوں کی از سر نو حد بندی کرنی پڑے کیونکہ ان جمہوریاؤں میں بہت سے روسی موجود ہیں جن کا تحفظ کرنا روسی ریاست کا فرض ہے۔ اب وہ آزادی کے تصور کا دشمن ہو گیا تھا جس کی وجہ معاشی مضمرات اور روسی سرحدوں میں موجود اقلیتوں کی بے چینی تھی۔ دسمبر 1991ء میں روس، یوکرائن اور بیلا روس نے آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ CIS تشکیل دی جس کیلئے پہل قدمی یلسن نے کی تھی اور اس مہینے کے اختتام سے پہلے آٹھ مزید جمہوریائیں اس میں شامل ہو چکی تھیں۔

گورباچوف کے ہاتھ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ سرمایہ داری کی بحالی کا بہانہ بننے کے بعد یہ حادثاتی کردار چپ چاپ ذلت آمیز انداز میں تاریخ کے سٹیج سے رخصت ہو گیا۔ چار سال بعد منعقد ہونیوالے صدارتی انتخابات میں روسی عوام نے اس شخص کو ایسی زبردست سزا دی جس کا وہ پوری طرح مستحق تھا۔ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ حقیقت تھی کہ سات دہائیوں کی جناتی مشقت اور سماج کی حیرت انگیز تبدیلی کے بعد سوویت یونین غائب ہو چکا تھا۔

قیمتوں پر کنٹرول کا خاتمہ

یلسن نے ابتدا میں بیوروکریسی کی مراعات کیخلاف جو رویہ اپنایا تھا اس کی وجہ سے اسے عام لوگوں میں مقبولیت حاصل ہوئی بالخصوص ماسکو میں۔ اس کی وجہ سے وہ جون 1991ء میں روسی جمہوریہ کا صدر منتخب ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ روسی ریاست کے نئے سربراہ نے کہا کہ وہ وہائٹ ہاؤس میں آ کر کچھ عجیب سا محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس کی یہ بات نہایت اہمیت کی حامل تھی کہ پرانے بیوروکریٹوں کی اکثریت اس کے تحت کام کرنے کو تیار ہے۔ اب اپوزیشن کا لیڈر وسیع وعریض بیوروکریسی کا انتظام سنبھال رہا تھا۔۔۔ زیادہ تر رک گئے، کچھ لوگ چھوڑ گئے۔ (14) ٹراٹسکی نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ پرولتاریہ کے سیاسی انقلاب برپا کرنے کے مقابلے میں ایک سرمایہ دارانہ ردانقلاب کی صورت میں بہت کم لوگوں کو ریاست سے نکالنا پڑے گا۔ اپنے تازہ تازہ اقتدار کو استعمال کرتے ہوئے یلسن نے اپنی فوجی بغاوت کو مستحکم کرنے کیلئے انتہائی بے رحمی سے کام لیا۔

سامراجی دباؤ کے تحت یلسن نے تیز رفتار نج کاری، زرعی اصلاحات اور زیادہ سخت مالیاتی اور

قرضوں کی پالیسیاں اپنانے پر زور دیا۔ اس نے جوان انقلابی اصلاح پسندوں کے گروہ یعنی دوسرے لفظوں میں سرمایہ داری کی بحالی کے انتہا پسند حامیوں کی بھرپور پشت پناہی کی جو یگور گائیڈر کے گرد جمع تھے، جسے وزیر خزانہ بنا دیا گیا تھا۔ اناطولی چوبائیس کو نج کاری کے شعبے کا سربراہ بنا دیا گیا۔ گائیڈر سابق سٹالنسٹوں کے اس دھڑے کا کامل نمائندہ تھا جو سامراج کی حمایت پر تکیہ کرتا تھا۔ اس بورژوا دوست حکومت نے آئی ایم ایف کے ساتھ مذاکرات کیے اور ریاستی بجٹ میں زبردست کٹوتیوں کا اعلان کیا۔ متوقع طور پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک نے سابق سوویت یونین کے ساتھ ایسا گستاخانہ رویہ اپنایا گویا وہ کوئی تیسری دنیا کا ملک ہے جس پر حکم چلایا جا سکتا ہے، جیسے آقا اپنے نوکر پر چلاتا ہے۔

2 جنوری 1992ء کو حکومت نے قیمتوں پر سے ریاستی کنٹرول ختم کر دیا جس کے نتیجے میں کئی چیزوں کی قیمتیں تین سے تیس گنا تک بڑھ گئیں۔ عملاً قیمتیں 300 سے 350 فیصد تک بڑھ گئیں۔ ماسکو کی زیرِ زمین ٹرینوں کا کرایہ 15 کوپک سے بڑھ کر 50 کوپک ہو گیا۔ سی آئی ایس میں شامل دیگر دس ریاستوں کو بھی مجبوراً قیمتیں بڑھانا پڑیں ورنہ روسی ہمسایہ جمہوریاؤں سے مقرر شدہ قیمتوں پر ساری اشیا خرید لیتے۔ مارچ میں ڈبل روٹی، دودھ اور دیگر غذائی اشیا کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا گیا۔ اس کا ردعمل انتہائی شدید تھا۔ روسی سپریم سوویت کی عمارت وائٹ ہاؤس کے سامنے قیمتوں میں اضافے کیخلاف زبردست مظاہرے ہوئے۔ احتجاج کے اس موڑ پر قابو پانے کیلئے حکومت کو کم از کم اجرت میں سو فیصد اضافے کے علاوہ پنشن بڑھانے پر بھی مجبور ہونا پڑا۔ ان آزاد منڈی کی پالیسیوں سے کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوا بلکہ بحران مزید گہرا ہو گیا۔ خوراک کی رسد خطرناک حد تک کم ہو گئی۔ یعنی صرف بیس سے چالیس دن کا ذخیرہ باقی رہ گیا۔

مغربی سامراجی طاقتیں یلسن پر شدید دباؤ ڈال رہی تھیں کہ وہ رد انقلابی اصلاحات کا پروگرام جاری رکھے۔ لیکن بیوروکریسی کے اندر موجود گہرے تضادات کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ روسی پارلیمنٹ لگاتار اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرتی رہتی تھی۔ جو درحقیقت صنعت اور بیوروکریسی کے منتظمین کے مفادات کی نمائندگی کرتی تھی۔ روسی سپریم سوویت کے چیئرمین رسلان خاسبولاٹوف اور نائب صدر الیگزنڈر رسکوئی نے یلسن کی معاشی پالیسیوں کے علاوہ نوزائیدہ بورژوازی پر اپنے حملے مزید تیز کر دیئے جس کی نمائندگی یلسن کرتا تھا۔ خاسبولاٹوف نے خبردار کیا کہ آبادی کا نوے فیصد حصہ غیر تسلی بخش حالات میں زندگی گزار رہا ہے اور روسی عوام کنگالی اور لمپنائزیشن کا شکار ہو رہے ہیں۔ رسکوئی نے محبّ وطن

گروپوں کی ایک میٹنگ میں جس میں ایک ہزار مندوبین شریک تھے، اعلان کیا کہ یلسن کی پالیسی معاشی قتل عام کے مترادف ہے۔

یلسن کا دھڑا سرمایہ داری کی طرف تیز رفتار پیش رفت کا حامی تھا۔ یہ دھڑا نو دولتیوں، کالا دھندا کرنے والوں، مافیا، سٹہ بازوں اور اوباش لوگوں پر مشتمل نوزائیدہ بورژوازی کے مفادات کی نمائندگی کرتا تھا جو سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک کی بنیاد پر ابھر کر سامنے آیا تھا۔ یہ لوگ سامراج کے ایجنٹ بھی تھے اور اپنے مفادات کے حصول کی خاطر روس کے مفادات کو قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ دوسرا دھڑا عمومی طور پر پرانی اشرافیہ کے مفادات کی نمائندگی کرتا تھا۔ یعنی وہ بیوروکریٹ جن کی طاقت، مراعات اور آمدنی کا دارومدار بڑے پیمانے کی صنعت اور اجتماعی فارموں پر ان کے کنٹرول پر تھا۔ لیکن آخر الذکر بذات خود مختلف دھڑوں میں منقسم تھے جو بیورو کریسی کی مختلف پرتوں کی عکاسی کرتے تھے اور ایک بہت بڑے اور غیر متجانس سماجی گروہ کی تشکیل کرتے تھے۔

اس تصادم میں ایک طرف نوزائیدہ سرمایہ دار عناصر اور کالا دھندا کرنیوالوں کے مفادات تھے جو تیزی سے آزاد تجارت یا مادر پدر آزاد سرمایہ داری متعارف کروانا چاہتے تھے اور دوسری جانب پارلیمنٹ تھی جو ریاستی منتظمین اور ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کی پرانی بیوروکریسی کی نمائندگی کرتی تھی جو پہلے کمیونسٹ پارٹی کے ذریعے روس پر حکمرانی کیا کرتی تھی۔ اس میں سے بھی کچھ لوگ سرمایہ داری کے حامی تھے لیکن وہ سرمایہ داری کی بتدریج بحالی کو ترجیح دیتے تھے تاکہ وہ خود نیا حکمران طبقہ بن سکیں جبکہ دوسرے لوگ پرانے نظام کو ترجیح دیتے تھے۔ لیکن یہ سب لوگ سرمایہ داری کی جانب تیز رفتار پیش رفت کے سماجی عواقب کے بارے میں پریشان تھے۔ اگر بڑے پیمانے کی صنعت کی نج کاری کے بارے میں یلسن کے منصوبوں پر مکمل عملدرآمد کیا جاتا تو اس کا نتیجہ پچاس لاکھ نہیں بلکہ دو کروڑ پچاس لاکھ افراد کی بیروزگاری کی صورت میں نکلتا اور ہوسکتا ہے یہ تعداد اس سے بھی دگنی ہو جاتی۔ یہ انقلاب یا مکمل انتشار کیلئے آزمودہ ترکیب ہوتی۔

اولڈ گارڈ نے یلسن اور اس کی حکومت کے خلاف زبردست جدوجہد کی۔ 20 جون 1992ء کو دی اکانومسٹ نے یہ تبصرہ کیا کہ چھ ماہ کی معاشی شاک تھراپی کے بعد روس کے صنعتی منتظمین سیاسی آواز بلند کر رہے ہیں۔ صدر بورس یلسن کے تحت روسی حکومت کی معاشی اصلاحات کی سمت اور رفتار سے پریشانی محسوس کرتے ہوئے روس کے صنعتی منتظمین مطالبہ کر رہے ہیں کہ ملک چلانے کے سلسلے میں ان کی رائے

کواور زیادہ اہمیت دی جائے، روسی اتحاد کے نام سے پارلیمنٹ کے اندر سابق سٹالنسٹوں اور قوم پرستوں نے مل کر ایک نیا یلسن مخالف اتحاد قائم کرلیا۔

تمام جہانوں کی خرابیاں

اب حکومت نے نج کاری کے واؤچروں کے اجرا کے ساتھ بڑے پیمانے کی نج کاری کے پروگرام پر عمل درآمد شروع کردیا۔ امید کی جارہی تھی کہ 1992ء کے آخر تک 25 فیصد ریاستی صنعتوں کو فروخت کردیا جائیگا۔ زمین کی بھی نج کاری کردی جائے گی۔ تاہم ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس نے زیادہ ریاستی چھوٹ کی شکل میں حکومت کو رعایتیں دینے پر مجبور کردیا۔ زرعی پیداوار، کھانے پینے کی اشیا پر ریاستی چھوٹ اور مسلح افواج کی رہائشی ضروریات کیلئے اضافی فنڈز مہیا کیے گئے۔ یلسن اور گائیڈر کی مخالفت کے باوجود روسی پارلیمنٹ نے صنعت کیلئے دو لاکھ بلین روبل کے قرضے فراہم کرنے کی منظوری دے دی۔ رسد زر قابو سے باہر ہو چکی تھی اور افراط زر کی شرح انتہائی بلند ہو کر ہائپر افراط زر میں تبدیل ہو رہی تھی۔

یہ جدوجہد اس قدر شدید تھی کہ اپریل 1992ء میں یلسن کو جزوی پسپائی پر مجبور ہونا پڑا۔ مستحکم معاشیات اور منڈی کی جانب تیز رفتار پیش رفت کی کوشش ناکام ہوگئی۔ عوامی نائبین کی کانگریس نے گائیڈر کی برطرفی کا مطالبہ کیا۔ اس کے نتیجے میں یلسن گائیڈر کو وزیر خزانہ کے عہدے سے برطرف کرنے پر مجبور ہو گیا لیکن اسے اپنے نائبین میں شامل رکھا۔ یلسن نے یہ اعلان بھی کیا کہ اصلاحات میں نرمی اختیار کی جائے گی اور نقد رقم کی کمی کا شکار صنعتوں کو اضافی قرضے فراہم کیے جائیں گے۔ کانگریس نے مزید دباؤ ڈالا اور بہتر سماجی خدمات کا مطالبہ کیا۔ ہسپتالوں کے عملے اور اساتذہ نے اجرتوں میں اضافے کیلئے ہڑتالیں کیں جن کے باعث وہ حکومت سے مزید رعایتیں حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

گائیڈر نے بڑھتی ہوئی سماجی کشیدگی کے باعث بجٹ کے بڑھتے ہوئے خسارے کو جائز قرار دیا تھا چاہے یہ معیشت کیلئے کتنا بھی نقصان دہ کیوں نہ ہو۔ ازوستیا نے اپنے 20 جولائی 1992ء کے شمارے میں لکھا کہ ''پیداوار میں کمی کے باوجود محدود در جائیت کی گنجائش موجود ہے کیونکہ ہم وسیع پیمانے کی کساد بازاری سے بچ گئے ہیں۔'' اس وقت تنخواہوں اور پنشنوں کی مد میں 221,600 ملین روبل کے بقایا

جات واجب الادا تھے۔ یہ اخبار آخر میں لکھتا ہے کہ ''مارکیٹ اکانومی کی بنیاد قائم کرنے کے عمل کی صورتحال امید افزا نظر آتی ہے۔'' واحد ترقی یہ ہوئی کہ سال کے آخر تک 30 ہزار چھوٹے ادارے اور دکانیں نیلام کردی گئیں تاہم معیشت کے فیصلہ کن حصے بدستور ریاست کے ہاتھوں میں رہے۔

یلسن نے امداد اور سرمایہ کاری کیلئے مغرب کو جو اپیل کی اس کے مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ان کی طرف سے دی جانیوالی امداد حسرت ناک طور پر کم تھی یعنی روبل کو مستحکم کرنے کیلئے چھ بلین ڈالر اور آئی ایم ایف کی طرف سے چوبیس بلین ڈالر۔لیکن خود مغربی مالیاتی ماہرین کے اندازے کے مطابق یلسن کے اصلاحات کے پروگرام کی کامیابی کے لیے روس کو آئندہ پندرہ برس تک ہر سال 76 بلین ڈالر سے 167 بلین ڈالر تک کی رقم درکار ہوگی۔اور ان اعداد وشمار میں نہ تو روبل کو قابل تبادلہ بنانے کیلئے درکار رسات سے دس بلین ڈالر کی رقم شامل ہے اور نہ ہی ماحول کو صاف کرنے کیلئے درکار رقم شامل ہے جو بذات خود ایک نہایت ضروری فریضہ ہے۔سرمایہ داری کی بحالی کیلئے درکار کل رقم یورپ، امریکہ اور جاپان کی مجموعی داخلی پیداوار کے ایک فیصد سے بھی کم ہے جو آئندہ پانچ سے دس سال کے عرصے پر محیط ہو۔اگر تناسب کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ رقم اس امداد سے کم ہے جو امریکہ نے مغربی یورپ کو مارشل پلان کے تحت ایک زیادہ طویل عرصے تک دی تھی۔اس کے برعکس مغرب اتنی بڑی بڑی رقوم وقف کرنے کے سلسلے میں تذبذب کا شکار رہا۔سرمایہ داروں کو یقین نہیں تھا کہ روس اور مشرقی یورپ پر مارکیٹ اکانومی از سر نو مسلط کرنے کی کوشش کا مثبت نتیجہ برآمد ہوگا یا نہیں۔ہنر مند روسی مزدوروں کی کم اجرتوں کے باوجود مغربی سرمایہ کار اپنا سرمایہ داؤ پر لگانے کو تیار نہیں تھے۔وہ سمجھ چکے ہیں کہ سرمایہ داری کی بحالی کا راستہ انتہائی دشوار گزار ہے۔سماجی شورشوں کا امکان ہے اور یہ کہ تمام کا تمام عمل بالکل الٹ بھی سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ یلسن نے مغرب کو ایک نئے اکتوبر انقلاب کے بھوت سے ڈرا کر تھوڑی بہت رقم حاصل کرنے کی کوشش کی۔مغربی حکومتوں نے بھی یلسن کے انتباہ کا سنجیدگی سے نوٹس لیا جس سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ اس عادی شرابی اور مریض کی حمایت کیلئے اتنے بے قرار کیوں تھے۔

سارے جہاں کی خرابیاں روس کے حصے میں آئیں یعنی نوکر شاہانہ گھپلے اور بدانتظامی اور ایک بد عنوان اور غنڈہ گردی پر مبنی سرمایہ داری کی تمام تر خامیاں۔ہزاروں ادارے ڈھیروں کے حساب سے ایسی بے کار اشیا بدستور بنائے جا رہے تھے جن کی کسی کو خواہش نہیں تھی۔

انہیں یا تو ذخیرہ کر لیا جاتا تھا یا اجرت کے طور پر مزدوروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔دوسرے ادارے

وسائل اور خام مال کی عدم دستیابی کے باعث بند پڑے تھے۔ جہاں مزدور آتے تو تھے لیکن کوئی کام نہیں کرتے تھے اور اجرت کے نام پر صرف وعدے وصول کرتے تھے اس کے نتیجے میں اجرتوں کے بقایا جات اور اداروں کے باہمی قرضے بہت زیادہ بڑھ گئے۔

بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان جاری یہ جھگڑا کوئی معمولی بات نہیں تھی بلکہ ایک گہری مخاصمت کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کا ثبوت اکتوبر 1993ء میں پارلیمنٹ پر مسلح چڑھائی سے ملتا ہے۔ اس واقعہ سے ثابت ہوا کہ روس میں سرمایہ داری کی طرف عبور کا مرحلہ پرامن طور پر طے ہونا ناممکن ہے۔ تاہم ایک بار پھر اس مساوات میں کلیدی عنصر مزدور طبقے کی بے عملی تھی۔ اگرچہ مزدوروں کی ایک مخصوص پرت نے پارلیمنٹ کے دفاع میں حصہ ضرور لیا۔ لیکن اس کا اعتراف بعدازاں یلسن کے پیروکاروں نے بھی کیا کہ ایک بہت بڑی اکثریت نے کوئی کردار ادا نہیں کیا۔

1992ء کے سارے سال کے دوران یلسن اور پارلیمنٹ کے درمیان کھلی جدوجہد زیادہ سے زیادہ تلخ ہوتی گئی۔ بیوروکریسی کے دونوں دھڑوں نے زبانی کلامی عوام سے حمایت کی اپیل کی۔ دی اکانومسٹ نے 20 جون 1992ء کو رپورٹ دی کہ اصلاحات کی رفتار کو کم کرنے کیلئے روسی منیجروں نے بھی مزدوروں کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ معیشت میں بحران کی وجہ سے ریاستی ملکیت کے اداروں میں موجود مزدوروں اور منتظمین دونوں کو مزید تبدیلی کے خیال سے خوف محسوس ہوتا ہے۔ اس دباؤ کی وجہ سے حکومت کو صنعت کیلئے 200 بلین روبل (2.4 بلین ڈالر) کے آسان قرضے کے علاوہ تیل کے کاروبار کیلئے 120 بلین روبل کا قرضہ فراہم کرنے کا وعدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اسے توانائی کی قیمتوں میں اضافے کا فیصلہ بھی ملتوی کرنا پڑا۔ اسی مضمون کے مطابق مسٹر یلسن کی حکومت نے اصلاحات کو ترک نہیں کیا۔ صرف چند قدم پیچھے ہٹی ہے۔

اس عرصے میں مجوزہ نئے آئین کے سلسلے میں اختیارات کی ایک شدید جدوجہد ہوئی۔ یلسن روز افزوں طور پر فرمانوں کے ذریعے حکمرانی پر انحصار کر رہا تھا جس پر نائبین بہت برانگیختہ تھے۔ انتظامی اور قانونی اتھارٹی کی حدود وجہ نزاع بنی ہوئی تھیں۔ مگر یہ تہہ میں موجود مادی مفادات کی جدوجہد کا محض عکس تھا۔ 1991ء میں متعارف کروائے جانے والے آئین نے یلسن کے ہاتھ باندھ رکھے تھے۔ مغربی سامراج کے احکامات پر عمل کرنے کیلئے ضروری تھا کہ وہ پارلیمنٹ سے جان چھڑا کر زیادہ وسیع صدارتی بوناپارٹسٹ اختیارات حاصل کر لے۔

1992ء میں آئین کے نظر ثانی شدہ مسودہ جات کبھی ادھر جاتے کبھی ادھر۔ کیوں کہ ہر فریق برتری حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روسی پارلیمنٹ کے چار روزہ غیر معمولی اجلاس کے بعد یلسن کو ذلت آمیز شکست کا سامنا تھا۔ قدامت پسندوں اور ان کے درمیانی پوزیشن رکھنے والے اتحادیوں نے کانگریس میں صدر کی طرف سے فرمانوں کے ذریعے حکمرانی کا طریقہ متعارف کروانے کی کوشش کو ناکام بناتے ہوئے صدارتی اختیارات میں مزید کمی کرنے کے حق میں ووٹ دیا، صوبوں میں اس کے نمائندوں کو برطرف کر کے قومی مفاہمت کی ایک نئی حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔ یلسن کو امید تھی کہ وہ اپنی تجاویز پر ہونیوالے ریفرنڈم کے ذریعے جس کیلئے اپریل 1993ء کی تاریخ رکھی گئی تھی اس ڈیڈ لاک کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیگا۔ اس کا خیال تھا کہ ریفرنڈم کو اعتماد کے ووٹ کے طور پر استعمال کیا جائے یعنی یہ کہ آپ یلسن کے حق میں ہیں یا خلاف۔ یہ استصواب رائے کا طریقہ تھا جو مکمل اختیارات کے حصول کیلئے بوناپارٹسٹ سیاستدانوں کا کلاسیکل طریقہ کار رہا ہے۔

سامراجی دباؤ

یلسن کو مغرب میں ''جمہوریت'' کے عظیم نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا، وہ شخص جس نے ٹینک پر کھڑے ہو کر پارلیمنٹ کے حقوق کا دفاع کیا تھا۔ اب وہی پارلیمنٹ اس کے بدترین دشمن میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف سیاسی پارٹیاں نہیں بلکہ متضاد گروہوں اور مفادات پر مبنی ایک اتحاد صف آرا تھا۔ یلسن کے پاس صرف دو راستے تھے یا تو کانگریس کے فیصلہ کن حصوں کو جیتا جائے بصورت دیگر پارلیمنٹ ہی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ کانگریس اسے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔ پارلیمنٹ میں موجود مختلف دھڑے صرف اس ایک بات پر متفق ہو پائے تھے کہ یلسن کو روکنا ضروری ہے۔ منیجر اصلاحات کے پروگرام کو روکنا چاہتے تھے۔ علاقائی بیوروکریٹ جو جمہوریاؤں کا نظام جاگیرداروں کی طرح چلاتے تھے زیادہ خود مختاری اور ایک کمزور مرکز کی خواہش رکھتے تھے، کسی آمر کی نہیں۔ فوجی ٹولہ اپنے کھوئے ہوئے وقار اور مراعات یافتہ حیثیت کی بحالی چاہتا تھا اور سوویت یونین کے حصے بخرے ہونے، مشرقی یورپ کے ہاتھ سے نکلنے اور عالمی سٹیج پر امریکی سامراج پر ذلت آمیز انحصار کے باعث سخت ناراض تھا۔ یلسن اور کانگریس کے درمیان جدوجہد سماج میں موجود ناقابل برداشت تضادات

کی بہت واضح عکاسی کرتی تھی۔

یہ جدو جہد دسمبر 1992ء میں براہ راست تصادم کی شکل اختیار کر گئی جب کانگریس نے کٹر اصلاح پسند وزیر اعظم گائیڈر کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ یلسن نے مہلت حاصل کرنے کی غرض سے گائیڈر کی جگہ چرنومرڈن کو دی اور ساتھ ہی ساتھ جوابی حملے کی تیاری کرتا رہا۔ سمجھوتہ یہ طے پایا کہ یلسن نے اپنے معتمدِ خاص کا نقصان برداشت کر لیا جبکہ کانگریس موسم بہار میں ریفرنڈم کے انعقاد پر رضا مند ہو گئی۔ کوئی سمجھوتہ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے جو کسی دیئے گئے وقت پر طاقتوں کے توازن کی عکاسی کرتا ہے۔ تھیوری میں ریفرنڈم کا مقصد ایک نئے آئین کی تشکیل تھی۔ گورباچوف کے زمانے سے جو آئین چلا آ رہا تھا اس میں تین سو ترامیم کی جا چکی تھیں اور وہ تضادات سے پر تھا۔ عملاً کسی نے بھی آئین کی طرف ذرا سی بھی توجہ نہیں دی۔ اہم بات یہ تھی کہ مخالف قوتوں کی طاقت کا تناسب کیا ہے اور اسے صرف حقیقی جدو جہد میں ہی ناپا جا سکتا تھا آئینی کمیٹیوں میں نہیں اگرچہ انہیں بھی لڑائی میں ہتھیاروں کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا اور استعمال کیا بھی گیا۔

دسمبر میں سمجھوتہ طے پانے کے فوراً بعد دونوں فریقوں نے چالیں چلنا شروع کر دیں۔ یلسن نے مکمل اختیارات کے حصول کی کوشش کرنے کا فیصلہ کیا جس کی بنیاد فرمان کے ذریعے حکمرانی ہو۔ مارچ 1993ء میں یلسن نے ایمرجنسی رول کیلئے فرمان کا مسودہ تیار کیا لیکن آئینی عدالت نے اسے غیر آئینی قرار دے دیا۔ روسی پارلیمنٹ کے سپیکر خاسبولاٹوف نے یلسن کے اختیارات میں یکے بعد دیگرے کمی کر کے اس کی جڑیں کھوکھلی کرنی شروع کر دیں اور اسے ایک ایسے کاغذی صدر میں تبدیل کر دیا جسے موقع ملتے ہیں ہٹایا جا سکے۔ مارچ میں ہونے والی کانگریس کے بعد یلسن 1003 ووٹوں میں سے محض 72 ووٹوں کی اکثریت سے مواخذے سے بچا۔ یلسن کانگریس سے واک آؤٹ کر گیا لیکن چند ایک نائبین نے ہی اس کا ساتھ دیا۔ اب اس نے ساری کوششیں اپریل میں ہونے والے ریفرنڈم میں اکثریت حاصل کرنے اور اکتوبر میں نئے انتخابات کروانے کیلئے وقف کر دیں۔ کانگریس نے ریفرنڈم کروانے کی منظوری دے دی لیکن اپنی طرف سے دو سوالات کا اضافہ بھی کر دیا ''آپ یلسن کی معاشی اصلاحات کے حق میں ہیں یا خلاف اور یہ بھی کہ آپ پارلیمنٹ اور صدارت کے انتخابات کے حق میں ہیں یا خلاف'' اس کے علاوہ انہوں نے یہ شرط عائد کر دی کہ ریفرنڈم کے قانونی طور پر جائز قرار پانے کیلئے کل ووٹوں کی پچاس فیصد سے زیادہ تعداد کا ڈالا جانا ضروری ہوگا۔ یلسن آئینی عدالت کے ذریعے اپنے سوالات کے سلسلے میں اس

آخری شرط کو ختم کروانے میں کامیاب ہو گیا۔

یلسن کی پوزیشن مضبوط کرنے کی کھلے عام کوشش کرتے ہوئے کلنٹن، روس امریکہ سربراہ ملاقات کیلئے تیار ہو گیا جس میں اس نے امریکہ کی طرف سے 1.6 بلین ڈالر کی امداد کا اعلان کیا اور دس دن بعد جی 7 پر بھی زور دیا کہ وہ بھی امدادی پیکج کا اعلان کریں۔ اپریل 1993ء میں جی 7 طاقتیں بیالیس بلین ڈالر کی امداد دینے پر رضامند ہو گئیں۔ اس بنیاد پر یلسن نے ریفرنڈم سے پہلے رشوت کے طور پر مزدوروں اور پنشن یافتہ افراد کے الاؤنسوں میں اضافے کے علاوہ کم از کم اجرت میں اضافے کا بھی وعدہ کیا۔ بالآخر چونسٹھ فیصد ووٹروں نے اپنے ووٹ کا حق استعمال کیا۔ اعلان میں کہا گیا کہ اٹھاون فیصد نے صدر کی حمایت کی اور تقریباً ترپن فیصد نے اس کے معاشی پروگرام کی حمایت کی۔ بہت ساری رپورٹوں میں کہا گیا کہ یلسن نے اس ریفرنڈم میں دھاندلی کی ہے جس میں اسے معمولی اکثریت سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہوا تھا۔ رسکوئی نے فوراً ہی اس نتیجے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ''ووٹ دینے کے اہل افراد کی تعداد 105 ملین ہے۔ ان میں سے تقریباً بتیس ملین نے صدر اور اس کے پروگرام کی حمایت کی ہے۔ اس طرح 71 سے 72 ملین ووٹر یا تو اس کے خلاف ہیں یا انہوں نے ریفرنڈم میں حصہ نہیں لیا۔۔۔مقبول عام حمایت کی بات نہیں کی جا سکتی۔''

لیکن اس کے بعد یلسن نے اپنی فتح کے بل بوتے پر آئین کو تبدیل کرنے، کانگریس کو مفلوج کرنے اور اپنے صدارتی اختیارات کو بڑھانے کی کوشش کی۔ ایک تلخ جدوجہد کے بعد آئین ساز کانفرنس نے مسودہ آئین کی منظوری دے دی۔ یلسن نے اپنے مخالفین کے خلاف حرکت میں آنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ تاہم یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مئی میں اسے شدید ذلت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ اگست 1991ء کی بغاوت کا منصوبہ تیار کرنیوالوں کیخلاف مقدمہ ناکام ہو گیا۔ معاملات تیزی سے تصادم کی طرف بڑھ رہے تھے۔

ستمبر 1993ء میں کچھ ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنے کے بعد یلسن نے بالآخر حملہ کر ہی دیا اور فرمان کے ذریعے پارلیمنٹ کو تحلیل کرتے ہوئے دسمبر میں ریاستی ڈوما کیلئے نئے انتخابات کا اعلان کر دیا۔ اس نے اقتدار اپنے ہاتھوں میں مرکوز کر لیا تھا۔ تمام آمروں کی طرح اس نے آئندہ انتخابات اپنے بنائے ہوئے آئین کے تحت کروانے کا وعدہ کیا۔ وہ جج بھی تھا، جیوری بھی اور جلاد بھی۔ رسکوئی نے فوراً ہی اس فرمان کو ''کھلی بغاوت'' قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی اور کانگریس نے یلسن کے مواخذے کی

منظوری دیتے ہوئے اسے برطرف کر کے رسکوئی کو بطور صدر نامزد کر دیا۔ یہ بات خانہ جنگی کے اعلان کے مترادف تھی۔ پارلیمانی سپیکر خاسبولاٹوف نے تمام فوجی اور سکیورٹی اداروں کے سربراہوں سے اپیل کی کہ وہ یلسن کے تمام ''مجرمانہ'' احکامات اور فرمانوں کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔

مغربی سامراجی فوراً یلسن کے دفاع کیلئے دوڑ پڑے۔ کلنٹن نے اعلان کیا کہ یلسن کے اقدامات ''اس جمہوری اور اصلاح پسندانہ پروگرام سے مطابقت رکھتے ہیں جو اس (یلسن) نے بنایا تھا۔'' ظاہر ہے کہ سامراجیوں کو ''جمہوریت'' سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ صرف اپنے مادی اور سٹریٹیجک مفادات کے بارے میں پریشان تھے۔ انہیں پارلیمنٹ کی غیر قانونی برطرفی سے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ یہ بات دو سال پہلے اگست 1991ء کی ناکام بغاوت کے موقع پر ''جمہوریت'' کا مذاق اڑائے جانے پر بلند ہونے والی احتجاجی چیخ و پکار سے بالکل متضاد تھی لیکن اس وقت نوزائیدہ بورژوازی کے مفادات کے خطرے میں پڑنے یا کچلے جانے کا سوال تھا۔ ان کے طبقاتی مفادات ہی ہمیشہ ان کی داخلی اور خارجہ پالیسیوں کا تعین کرتے ہیں۔ آپ ذرا اس بین الاقوامی غم و غصے کے بارے میں تصور کریں جو نام نہاد سخت موقف رکھنے والوں کے یہی روش اختیار کرنے پر دیکھنے میں آتا! مغرب نے یلسن کو وہ سہارا دیا جس کی اسے ضرورت تھی۔ کانگریس کے ساتھ طاقت کی زبان میں بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ کھلم کھلا حکم عدولی کرتے ہوئے اس نے گائیڈر کو دوبارہ نائب وزیر اعظم اور معیشت کا وزیر مقرر کر دیا۔ ایک مزید تصادم کی راہ ہموار ہو چکی تھی۔ اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

تاہم مسلح افواج پر یلسن کی گرفت بہت کمزور تھی۔ افسران کی ایک بہت بڑی تعداد کھلم کھلا یلسن حکومت کیخلاف تھی کیونکہ وہ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ اور مغرب کے سامنے رینگنے کو اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے۔ بہت سے فوجیوں کو کئی کئی ماہ سے تنخواہیں نہیں ملی تھیں اور بحرالکاہل کے علاقے سے یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ فوجیوں کو فاقہ کشی کا سامنا ہے۔ پچھلے سال اسی ہزار افسران کو فوج سے نکال دیا گیا تھا اور اب ان کے پاس نہ کوئی گھر تھا اور نہ ہی ملازمت۔ فوجی خدمت کیلئے بلائے جانیوالے رنگروٹوں کی صرف چودہ فیصد تعداد نے مثبت جواب دیا تھا۔ وزیر دفاع جنرل پاویل گراچیف ابتدا میں یلسن کے بارے میں ملے جلے احساسات رکھتا تھا لیکن پارلیمنٹ کی جانب سے برطرفی کی دھمکی کے بعد اس نے یلسن کا ساتھ دیا۔

خودمختار علاقوں کی طرف سے بھی یلسن کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب 18 ستمبر کو اس نے

فیڈرل کونسل کے ارکان سے ملاقات کی اورانہیں کہا کہ وہ نئے انتخابات تک کانگریس کی جگہ کام کریں تو 176 میں سے 148 علاقائی لیڈروں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ یہاں تک کہ سینٹ پیٹرز برگ کی شہری کونسل نے بھی یلسن کے پیروکار اور شہر کے میئر سوب چاک کی درخواست مسترد کرتے ہوئے یلسن کے فرمان کی مذمت کی۔ یلسن ان علاقوں سے ایک ایسے نئے آئین کے سلسلے میں بھی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہا جس میں دو ایوان ہوتے اور ایوانِ بالا کی تشکیل یہ علاقے کرتے۔ اس کی تجاویز کو ایک ایسا پھندا خیال کیا جاتا تھا جو ان کے اختیار کو محدود کر کے اختیارات کو صدر کے ہاتھوں میں مرکوز کر دیتا۔ وہ اپنے مفادات کو فروغ دے رہے تھے جو اس مرحلے پر یلسن کے مفادات سے متصادم تھے۔

وائٹ ہاؤس پر حملہ

یہ بات واضح تھی کہ صدر اور پارلیمنٹ کے درمیان یہ تعطل زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ ریاست کے اندر اس کھلی پھوٹ سے بذاتِ خود روس کی ٹوٹ پھوٹ کا امکان پیدا ہو سکتا تھا۔ کئی ماہ سے یلسن اور پارلیمنٹ میں اس کے مخالفین کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری تھی۔ یلسن نے اپنی یادداشتوں میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''میں نے حکومت کے سامنے یہ مقصد رکھا ہے کہ اصلاحات کو ناقابلِ تبدیل بنایا جائے۔'' (15) لیکن یہ ابھی تک ایک مقصد ہی تھا۔ اسے حقیقت بنانے کیلئے ضروری تھا کہ وہ کانگریس کی رکاوٹ کو دور کرے اور سخت گیر افراد کو کچل ڈالے۔ منصوبہ تیار کر لیا گیا۔ اس کا ارادہ یہ تھا کہ وائٹ ہاؤس پر اتوار کے روز جب وہ خالی ہوتا ہے قبضہ کر لیا جائے اور پارلیمنٹ کی تحلیل کا اعلان کر دیا جائے۔ کانگریس کو اس کی خبر ہو گئی اور اچانک حملے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ انہوں نے فوری قدم اٹھایا اور خود کو عمارت کے اندر مورچہ بند کر لیا اور اس طرح وائٹ ہاؤس کے محاصرے کا آغاز ہو گیا۔

21 ستمبر 1993ء کو یلسن کا فرمان جاری ہونے کے بعد بھی پارلیمنٹ کی تقدیر کے بارے میں ہونے والی جدوجہد کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ دونوں فریقوں نے عوام سے اپیلیں کیں۔ خاسبولاٹوف اور رسکوئی نے ہڑتالوں کیلئے بھی اپیل کی۔ تاہم جیسا کہ ہر مزدور جانتا ہے کسی ہڑتال کو منظم کرنے کیلئے محض اپیل جاری کرنا ہی کافی نہیں ہوتا۔ نائبین دو ہفتے تک وائٹ ہاؤس میں بیٹھے رہے اور عوام کی طرف سے امداد کا انتظار کرتے رہے لیکن اس کی بجائے اگر انہوں نے مزدوروں کو عمل پر آمادہ کرنے کیلئے فیکٹریوں میں اپنے نمائندے بھیجے ہوتے جو انہیں یلسن کے پروگرام کے حقیقی معانی سمجھاتے اور ایک متبادل پیش

کرتے، چاہے وہ ایک مسخ شدہ سٹالنسٹ شکل ہی کیوں نہ ہوتی تو انہیں ایک حوصلہ افزا جواب مل سکتا تھا۔ لیکن وہ یلسن کی طرف سے مزدوروں کے حقوق پر حملے کی وضاحت کرنے کے قابل نہیں تھے اور انہوں نے خود کو ''آئین کا دفاع'' کرنے کی اپیلیں جاری کرنے تک محدود رکھا۔

پارلیمنٹ کا دفاع کرنے والے لوگوں میں سے فاشسٹ گروہوں کو نکال باہر کرنے میں خاسبولاٹوف اور رسکوئی کی ناکامی، جسے مغربی ذرائع ابلاغ نے دیدہ دانستہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا، ایک ایسی حقیقت ہے جس سے ان کی حکمت عملی اور سیاسی دیوالیہ پن کی مزید نشاندہی ہوتی ہے۔ یہ یلسن کے ہاتھوں میں کھیلنے کے مترادف تھا اور اسے موقع ملا کہ وہ اس تحریک کو ''کمیونسٹ فاشسٹ'' بغاوت کے طور پر پیش کر سکے۔ ایسی فیصلہ کن کردار کی حامل صورت حال میں بھرپور اور پرعزم عمل ضروری ہوتا ہے۔ تاہم کانگریس کی قیادت نے ثابت کر دیا کہ وہ اس کیلئے تیار نہیں تھی۔ وہ متذبذب اور مجہول انداز میں کسی واضح لائحہ عمل کے بغیر وائٹ ہاؤس میں انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ یلسن نے بجلی، پانی اور حرارت منقطع کر دی۔ عوام پر انحصار کے عادی نہ ہونے کے باعث وہ مزدور طبقے سے اپیل کرنے کے قابل نہیں تھے حالانکہ یلسن کیخلاف وسیع بے چینی پائی جاتی تھی۔ یہ کوئی حادثاتی امر نہیں تھا، دونوں فریقوں کو یہ خوف لاحق تھا کہ مسلح تصادم مزدور طبقے کی مداخلت کو دعوت دیگا جس کے ناقابل پیش گوئی نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔

اس وقت عوام کا موڈ کچھ اس طرح کا تھا کہ ''دونوں گھروں پر لعنت ہو''۔ اگرچہ آخر میں صورتحال تبدیل ہونا شروع ہو گئی تھی اور زیادہ سرگرم مزدوروں کے ایک حصے نے وائٹ ہاؤس کے باہر ہونے والے مظاہروں میں حصہ بھی لیا۔ دیگر وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی جس نے یلسن کو پارلیمنٹ پر مسلح حملہ کرنے پر مجبور کیا۔ بیوروکریسی کی گلی سڑی اور بدعنوان فطرت کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ بہت سے نائبین نے وائٹ ہاؤس چھوڑنے کیلئے یلسن کی طرف سے پیش کی جانیوالی خصوصی تنخواہ اور حکومت کی طرف سے مہیا کئے جانیوالے اپارٹمنٹوں میں رہائش کی اجازت کی رشوت کو قبول کر لیا! آخر میں صرف ایک سو کے قریب سخت موقف رکھنے والے ہی باقی رہ گئے تھے۔

پارلیمنٹ کی بے عملی کے باوجود یہ بات واضح ہے کہ اس کی حمایت میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اکتوبر کی تین اور چار تاریخ کو ہزاروں مظاہرین پولیس کا گھیرا توڑ کر وائٹ ہاؤس تک پہنچ گئے۔ ہو سکتا ہے کہ رسکوئی اور خاسبولاٹوف اسے غلطی سے عوامی تحریک سمجھ بیٹھے ہوں۔ بغاوت پر آمادہ لوگوں کی حیثیت

سے انہوں نے ہر طرح کی غلطیاں کیں۔ انہوں نے نہ تو پیش بینی کی اور نہ ہی تیاری اور یلسن کی ابتدائی جارحیت کے سامنے مجہول ردعمل کا اظہار کیا لیکن آخر میں خوفزدہ ہوگئے اور کسی بھی پیش منظر یا منصوبے کے بغیر اقتدار پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ پھر حملہ شروع ہونے کے بعد ہمیں وہ قابل رحم منظر دکھائی دیتا ہے جب رسکوئی شدید پریشانی کے عالم میں ٹیلیفون پر مغربی سفیروں سے حمایت اور مداخلت کی اپیلیں کر رہا تھا جیسے بعل ڈبوب (شیطانوں کا شہزادہ) کیخلاف شیطان سے اپیل کی جائے! سامراجی طاقتوں کے سفیروں نے اپنی اپنی حکومتوں کی پالیسیوں کی عکاسی کرتے ہوئے یلسن کی بھرپور حمایت کی۔

یلسن کا تختہ الٹنے کیلئے ایک عوامی تحریک منظّم کرنے کی بجائے رسکوئی اور خاسبولاٹوف نے دراصل ایک اقلیت کے سہارے بغاوت برپا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود یلسن کی کمزور پوزیشن کا ثبوت اس حقیقت سے فراہم ہوتا ہے کہ باغی کامیابی کے قریب پہنچ گئے تھے۔ عوامی تحریک کی عدم موجودگی میں ایسے مواقع پر فوج ایک کلیدی عنصر بن جاتی ہے۔ آخری لمحے تک یلسن کی پوزیشن انتہائی نازک رہی۔ کانگریس کی شکست کے بعد معلوم ہوا کہ مسلح افواج کے سربراہوں نے یلسن کو بچانے کیلئے بالکل آخری لمحے پر مداخلت کا فیصلہ کیا تھا۔ یلسن شدید گھبراہٹ کا شکار تھا۔ جب صدر نے فوجیوں کو پارلیمنٹ کی عمارت پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو وہ حرکت میں نہیں آئے۔

صورتحال کے گھمبیر ہونے کی تصدیق بذاتِ خود یلسن نے بھی کی ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے کہ ''معتدل الفاظ میں بھی بیان کیا جائے تو تصویر بہت مایوس کن تھی۔ پچیس لاکھ افراد پر مشتمل فوج ایک ہزار فوجی یا ایک رجمنٹ بھی مہیا کرنے سے قاصر تھی جو ماسکو آ کر شہر کا دفاع کر سکے۔'' (16) وہ وزراتِ دفاع کی میٹنگ میں شرکت کیلئے پہنچا تو اس کے تاثرات یہ تھے کہ ''مجھے یہ بات ضرور کہنی چاہیے کہ مجموعی طور پر جرنیلوں کے چہروں کے تاثرات بہت سخت تھے اور اکثر نے اپنے سر جھکا رکھے تھے۔ یقیناً وہ سمجھتے تھے کہ صورتحال پریشان کن ہے۔ قانونی حکومت انتہائی مشکل کا شکار تھی لیکن فوج اس کا دفاع نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ فوجی آلو چن رہے تھے اور باقی لڑنا نہیں چاہتے تھے۔'' (17)

یلسن نے اپنی یادداشتوں میں اس دشواری کی بھی تصدیق کی ہے جو اسے اپنے خصوصی دستوں کو وائٹ ہاؤس پر قبضہ کرنے پر تیار کرنے کے سلسلہ میں پیش آئی تھی۔ اسے ذاتی طور پر افسروں سے درخواست کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ''صورتحال کا براہ راست سامنا کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میں چلایا، کیا تم صدر کے احکامات بجالانے کو تیار ہو؟ جواب میں اس خصوصی صدارتی فوجی دستے کی طرف سے

خاموشی چھائی رہی، ایک خوفناک اور پراسرار خاموشی۔ میں نے ایک منٹ تک انتظار کیا لیکن کسی نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بالآخر میں غصے سے چلایا، تو پھر میں یہ سوال دوسرے طریقے سے کرتا ہوں کہ کیا تم صدر کے حکم کی تعمیل سے انکار کر رہے ہو؟ اس بار بھی خاموشی چھائی رہی۔ میں نے ان سب پر نگاہ دوڑائی۔ وہ طاقتور، جسیم اور خوش شکل لوگ تھے۔ خدا حافظ کہے بغیر میں ایڑیوں کے بل گھوما اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ جاتے جاتے میں نے بارسوکوف اور الفا کے کمانڈر زائیٹیف سے کہا کہ حکم کی تعمیل ہونی چاہیے۔ بعد ازاں الفا اور ویمپل (خصوصی دستے) نے آپریشن میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔'' (18)

اس سے بالکل صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یلسن کو کتنی معمولی حمایت حاصل تھی۔ کانگریس کی قیادت کو افسران کی یونین کے ناطے مسلح افواج میں اہم نوعیت کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے باوجود عام فوجی تو ایک طرف رہے وہ جونیئر افسران میں بھی ہلچل پیدا کرنے میں ناکام رہے۔ انہوں نے اپنی اپیلوں کا رخ اعلیٰ افسران کی طرف رکھا۔ اکثر جرنیل آخری لمحے تک غیر جانبدار رہے اور انتظار کرتے رہے کہ دیکھیں کون جیتتا ہے۔ یلسن محض گنے چنے فوجی دستوں کی حمایت پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ جیسا کہ ثابت کیا جا چکا ہے ان دستوں کی حمایت بھی پختہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود عوامی شرکت کی عدم موجودگی میں فوج اور کے جی بی پر مشتمل ایک اقلیت کے سرگرم عمل ہونے سے توازن یلسن کے حق میں ہو گیا۔

فیصلہ کن لمحے پر بھی پارلیمنٹ کو کچلنے میں ''وفادار'' فوجیوں کی ایک معمولی تعداد نے حصہ لیا تھا۔ 7 اکتوبر 1993ء کو شائع ہونیوالے ڈیلی ایکسپریس نے رپورٹ دی کہ ''فوجی سربراہ پارلیمنٹ پر گولی چلانے کے احکامات کی تعمیل کے سلسلے میں تذبذب کا شکار تھے۔ بالآخر حملہ آور دستے کی تشکیل فوج، وزارت داخلہ، کے جی بی اور پولیس کے کچھ حصوں کو ملا کر عمل میں لائی گئی۔'' بورژوا معیشت دان الیک نوی کی رپورٹ کے مطابق حملے کی قیادت کیلئے صرف آٹھ افسر مل سکے جنہیں ڈالروں کی شکل میں ایک بہت بڑی رقم ادا کی گئی تھی۔ دو ماہ بعد ان میں سے دو ہلاک کئے جا چکے تھے اور باقی چھ روپوش تھے۔

یہ فطری امر ہے کہ یلسن نے اپنی یادداشتوں میں خود کو ایک ایسے مستعد اور پرقوت سربراہ کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے جسے صورت حال پر مکمل عبور تھا۔ لیکن حقیقت اس سے بہت مختلف تھی۔ باغی قوتوں کے ٹیلیویژن سنٹر پر قبضہ کرنے کے بعد یلسن بالکل مفلوج نظر آتا تھا۔ ناکام بغاوت کے فیصلہ کن لمحات میں جب حکومت اور سارے روس کی قسمت داؤ پر لگی ہوئی تھی یلسن غائب ہو گیا۔ مغربی ذرائع ابلاغ کی رپورٹوں میں کہا گیا ہے کہ وہ شدید گھبراہٹ کا شکار تھا اور غالباً نشے کی حالت میں اپنے عملے کے

لوگوں پر بے ربط انداز میں چلا رہا تھا۔ یہ منظر کسی ایسے ذہین وفطین سازشی کی عکاسی نہیں کرتا جو اپنی دور اندیشانہ حکمت عملی سے دشمنوں کو گھیرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ اس ساری اکڑ اور دکھاوے کی بہادری کے باوجود یلسن کی حیثیت کبھی بھی ایک نو دولیتے اور سیاسی مہم جو سے زیادہ نہیں تھی۔ اگرچہ اس میں جانوروں جیسے چالاکی پائی جاتی ہے اور بعض اوقات وہ کسی حد تک دیدہ دلیری کا مظاہرہ بھی کرتا ہے (جس کا تعلق عام طور پر اپنی جان بچانے کی ضرورت سے ہوتا ہے) لیکن وہ کسی حقیقی سمجھ بوجھ یا پیش منظر سے قطعاً عاری ہے۔

آخرکار وائٹ ہاؤس پر قبضہ کر لیا گیا اور اکتوبر میں ہونیوالی بغاوت کی قیادت یعنی خاسبولاٹوف، رسکوئی، ماکاشوف، آچالوف کو گرفتار کر لیا گیا۔ بظاہر یوں دکھائی دیتا تھا کہ دونوں مخاصمانہ قوتوں یعنی نوزائیدہ مافیا بورژوازی جس کی نمائندگی یلسن کر رہا تھا اور پرانی اشرافیہ جس کی نمائندگی پارلیمنٹ کر رہی تھی، کے درمیان تعطل ختم ہو گیا ہے اور فیصلہ اول الذکر کے حق میں ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری کی بحالی کے عمل کو ایک نئی اور طاقتور تحریک ملی تھی۔ لیکن پھر بھی یلسن کے حامیوں کی فتح ایک قطعی حل پیش کرنے میں ناکام رہی۔ یلسن دہشت زدہ تھا کیونکہ پارلیمنٹ کی شکست کی نوعیت فیصلہ کن نہیں تھی۔ چند ماہ کے اندر اندر ڈوما کے انتخابات کے موقع پر جدوجہد پھر شروع ہو گئی۔ ایک اور دھچکا اس وقت لگا جب فروری 1994ء میں پارلیمنٹ نے بغیر مقدمہ چلائے اگست 1991ء کی بغاوت کا منصوبہ بنانے والوں اور اکتوبر 1993ء کی پارلیمانی بغاوت کے لیڈروں کو معافی دے دی۔ اس پر یلسن طنزیہ انداز میں یوں تبصرہ کرتا ہے کہ ''اب ان سب کو رہا کر دیا گیا ہے، وہ شاعری کرتے ہیں، مظاہروں میں حصہ لیتے ہیں اور نئی پارلیمنٹ یعنی ریاستی ڈوما کے لئے منتخب ہو گئے ہیں۔ لیفورٹو جیل کی جن کوٹھڑیوں میں وہ بند تھے وہاں اور لوگ آ گئے ہیں جس سے یہ افسوسناک بات ثابت ہوتی ہے کہ جمہوریت کی قوت غیر مستحکم ہے۔''(19)

یہ چیز اس عظیم ''جمہوریت'' کے فوری طور پر اپوزیشن اخبارات پر پابندی لگانے، مقامی کونسلوں کو توڑنے اور حزب اختلاف کی پارٹیوں کو غیر قانونی قرار دینے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکی اور یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود عمل میں لایا گیا کہ ریڈیو اور ٹیلیویژن پر اس کا پہلے ہی سے مکمل قبضہ تھا۔ اس نے علاقائی گورنروں اور مقامی کونسلوں کو نکال پھینکنے کے علاوہ آئینی عدالت کو بھی برطرف کر دیا۔ ''جمہوریت'' کے بارے میں معمولی سا تصنع بھی روا نہیں رکھا گیا۔ یلسن جعلی پارلیمانیت کے پردے میں بونا پارٹسٹ

آمریت قائم کرنے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ ڈوما کے یہ انتخابات محض برگ انجیر فراہم کرتے۔ لیکن رابرٹ برنز کے الفاظ میں ''چوہوں اور انسانوں کے بنائے ہوئے بہترین منصوبے ناکام ہو جاتے ہیں۔''

پارلیمنٹ کے کچلے جانے کے بعد دسمبر 1993ء میں ہونے والے انتخابات نے یلسن کی نازک پوزیشن کو آشکار کر دیا۔ فرض یہ کیا جا رہا تھا کہ پارلیمنٹ پر اس کی فتح نے معاملات کو حتمی طور پر طے کر دیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ سامراجی قوتیں اس کی حمایت میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری انٹرنیشنل نے بھی یلسن کی حمایت میں اٹھنے والی آوازوں میں اپنی آواز شامل کر دی اور ساتھ ہی ساتھ ''جمہوریت'' کی حمایت کو بھی ضروری خیال کیا۔ یلسن نئے انتخابات کو ایک رسمی کارروائی تصور کرتا تھا۔ اس کا لنگوٹیا پہلے ہی سے جشن فتح کی تیاریوں میں جتا ہوا تھا۔ اس کا مقصد سرمایہ داری کی جانب تیز رفتار پیش رفت کیلئے اصلاح پسند پارٹیوں کی فیصلہ کن فتح کا حصول تھا۔ تاہم اصلاح پسند مایوس کن طور پر منقسم اور خصی ثابت ہوئے۔ گائیڈر، یافلنسکی، سوب چاک، پوپوف اور سخارائی سمیت ہر کسی نے پارٹیاں اور بلاک بنا ڈالے اور ایک دوسرے کی کھلے عام مذمت کی۔

اس صورتحال میں اصلاح پسندوں کا جشن فتح جنازے کے جلوس میں تبدیل ہو گیا۔ انہیں کمیونسٹوں، ان کے کسان اتحادیوں اور ژرینوسکی کے قوم پرستوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ حقیقت مدنظر رکھنی چاہیے کہ یہ سب کچھ اس کے باوجود ہوا کہ تمام تر ذرائع ابلاغ پر عملاً یلسن کا غلبہ تھا۔ دراصل یلسن کی پوزیشن پہلے سے بھی بدتر تھی۔ غالباً پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا خیال اس کے ذہن میں آیا ہو گا مگر اسے یہ ادراک بھی ہو گا کہ اس کیلئے درکار طاقت کا حصول ناممکن ہو گا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اکتوبر 1993ء میں بھی وہ فوج کی حمایت حاصل کرنے میں بمشکل کامیاب ہوا تھا۔ اس بار یلسن کی ناکامی کم و بیش یقینی تھی۔ 1993ء کے انتخابات میں قوم پرست ژرینوسکی کو فوج سے ملنے والے ووٹوں کی تعداد 63 فیصد سے کم نہیں تھی۔ سٹریٹیجک میزائل فورسز سے تعلق رکھنے والے پچہتر فیصد اور روسی فوجی اکیڈمی کے 93 فیصد طالب علموں نے بھی اسے ووٹ دیئے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فوج کے اندر یلسن کی حمایت کمزور پڑ چکی ہے۔

سامراجیوں کو یقین تھا کہ وائٹ ہاؤس پر قبضے کے بعد سرمایہ کاری کی بحالی کا راستہ ہموار ہو چکا ہے۔ وہ اس خود فریبی میں مبتلا تھے کہ ایک سرمایہ دارانہ روس کمزور اور منقسم ہو گا جس پر مغرب با آسانی غلبہ حاصل کر لے گا۔ اب یہ تمام منصوبے کھنڈر ہو چکے تھے۔ یہ خیال بہر صورت انتہائی احمقانہ تھا کہ سرمایہ

دارانہ روس ایک نیم نوآبادی ہوگا۔ اگر روس میں سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک کامیاب ہو جاتی تو یہ ایک کمزور اور نوآبادیاتی حکومت نہ ہوتی بلکہ یہ ایک جارح اور طاقتور سامراج ہوتا جس کے پاس ایک زبردست فوج اور کافی بڑی صنعتی بنیاد موجود ہوتی۔ اس پیش منظر سے مغربی لیڈروں کی راتوں کی نیند خراب ہونا یقینی امر ہے۔

مغربی ذرائع ابلاغ نے ژرینوسکی کے حاصل کردہ نتائج کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ اسے تئیس فیصد ووٹ ملے تھے لیکن کمیونسٹوں اوران کے کسان اتحادیوں کے حاصل کردہ نتائج کو جان بوجھ کر کمتر حیثیت دی گئی جنہیں مجموعی طور پر بیس فیصد سے زیادہ ووٹ ملے تھے۔ تاہم اس موضوع پر لکھنے والے لیڈروں کا لہجہ خطرے اور مایوسی کے احساس کی غمازی کرتا تھا۔ سامراجیوں اور یلسن کی طبقاتی بنیاد پر حمایت کرنیوالے لاکھوں جرائم پیشہ، کالا دھندا کرنیوالوں اور دوسرے گھٹیا قسم کے لوگوں کو ان اصلاحات کے باعث پیش آنے والے خوفناک انسانی مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں صرف اپنے مفادات سے غرض تھی۔

مغرب کے بدلتے موڈ

شروع ہی سے بین الاقوامی سرمائے کی حکمت عملیاں وضع کرنیوالوں کا رویہ پل پل بدلتے موڈ سے عبارت رہا ہے، مجنونانہ انبساط سے لیکر بدترین قنوطیت تک، کسی غم زدہ جنونی یا کسی ایسے ہوش وخرد سے بیگانہ شرابی کی طرح جو بے کراں شادمانی سے رقت آمیز اشک ریزی تک کے مراحل بآسانی طے کر لیتا ہے۔ یہ اتار چڑھاؤ روس میں سرمایہ داری کی بحالی کی اس متضاد تحریک کی بالکل درست عکاسی کرتا ہے جسے کئی ایک صدمات سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ابھی اپنی منزل کو بھی نہیں پہنچی۔

اس وقت شائع ہونیوالے بے شمار اداریوں میں مغربی بورژوازی کی قنوطیت کا عکس ملتا ہے۔ لہٰذا پروفیسر جیفری ساچیس جو ہارورڈ یونیورسٹی کا ماہر معیشت اور روسی وزرا کا مشیر ہے 9 جنوری 1994ء کے فنانشل ٹائمز میں لکھتا ہے کہ ''یوں دکھائی دیتا ہے کہ اصلاح پسندوں کا خاتمہ کافی قریب ہے۔ ابھی اولڈ گارڈ کی واپسی کو ناگزیر نہیں کیا جا سکتا مگر سب سے زیادہ ممکنہ نتیجہ یہی نظر آتا ہے۔'' اسی اخبار کے ایک اور مضمون میں روسی اصلاح پسندوں کی مکمل مایوسی کا اظہار ملتا ہے، ''اسی کے ساتھ ساتھ صدر یلسن اور

وزیراعظم چرنومرڈن کے بہت سے فیصلوں سے ایک درمیانی معاشی راستے کی ضرورت کو قبول کرنے کا عندیہ ملتا ہے جن کے مطابق دفاعی سامان تیار کرنے والی فیکٹریوں سمیت صنعتوں کو بھاری ریاستی چھوٹ دی جائے گی اور روسی لیڈرشپ کے تحت سابق سوویت جمہوریاؤں کے ساتھ ایک مضبوط معاشی اتحاد قائم کیا جائے گا۔ اصلاح پسندوں کا کہنا ہے کہ اس سارے راستے کے انتخاب سے مالی استحکام کی امید بالکل ختم ہو جائے گی کیونکہ ان جمہوریاؤں کو سستے قرضے فراہم کرنے اور توانائی پر چھوٹ دینے کی ضرورت ہو گی۔"

مزید برآں "ان کی دلیل یہ ہے کہ مناسب طور پر آزمائے یا متعارف کروائے بغیر ہی اصلاحات ترک کرنے سے سب کچھ ضائع ہو سکتا ہے۔ لیکن اب انہیں خوف ہے کہ اس سے کام نہیں بنا۔ وہ ذاتی طور پر سیاسی سٹیج سے اخراج کی تیاری کر رہے ہیں۔"

دی گارجین نے 22 جنوری 1994ء کو آہ و بکا کرتے ہوئے لکھا کہ "صدر یلسن کی اصلاحات کے پروگرام کا مستقبل تاریک ہوتے دیکھ کر (گزشتہ روز) واشنگٹن اور دیگر مغربی دارالخلافوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہو گئیں۔ پہلے اصلاحات کے اولین معمار گائیڈر اور پھر اصلاح پسند وزیر خزانہ بورس فیوڈوروف کو استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب کابینہ میں کوئی سرکردہ 'اصلاح پسند' باقی نہیں بچا۔ اس کے بعد ہی وزیراعظم چرنومرڈن نے "منڈی کی رومانویت" کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔"

روس کے اندر کسی سماجی دھماکے کے خدشے نے سامراجیوں کے درمیان بھی زبردست پھوٹ ڈال دی۔ انتخابات کے بعد روس کا دورہ کرنے والے امریکی نائب صدر الگور کا کھلے عام یہ انتباہ کہ اصلاحات کو بہت زیادہ تیز رفتاری سے نافذ نہ کیا جائے کوئی حادثاتی امر نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سینٹ کے ریپبلکن لیڈر اور بعد ازاں صدارتی امیدوار نامزد ہونے والے رابرٹ ڈول نے یہ تبصرہ کیا کہ "ہم نے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے ذریعے روس پر زبردست دباؤ ڈالا کہ وہ تیز رفتاری سے مارکیٹ اکانومی کی طرف پیش رفت کرے۔ بلاشبہ، اس کے نتیجے میں انتشار پیدا ہوا اور افراط زر میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔"

تاہم سامراجیوں کے غالب دھڑے نے فیصلہ کیا ہے کہ اس دوائی کا استعمال جاری رکھا جائے۔ برطانوی مالیاتی سرمائے کی آواز فنانشل ٹائمز نے 7 جنوری 1994ء کے اداریئے میں مطالبہ کیا کہ "مزید شاک تھراپی دی جائے۔ اگست 1991ء کی ناکام بغاوت کے بعد یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ روس میں

اصلاحات کو بہت محدود موقع ملے گا۔ اگر اس موقع کو ضائع کر دیا گیا تو ٹوٹا ہوا سوویت یونین سابق یوگوسلاویہ جیسی صورتحال کا شکار ہو جائے گا مگر اس کی وسعت بہت زیادہ ہوگی۔ مسٹر ژرینووسکی کی انتخابی کامیابی سے ثابت ہوتا ہے کہ اس خطرے کی نوعیت محض نظری نہیں ہے۔'' اور پھر فنانشل ٹائمز یہ حل تجویز کرتا ہے کہ ''اگر ووٹر ماضی کی طرف واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کا کوئی علاج تجویز نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ایک بہتر مستقبل کا مطالبہ کرتے ہیں تو تیز رفتار اصلاحات اس کا واحد علاج ہے۔ وہ زیادہ خوراک چاہتے ہیں، وہ بدعنوانی کا خاتمہ چاہتے ہیں، انہیں محفوظ ملازمتیں چاہئیں، وہ قابل اعتماد کرنسی چاہتے ہیں، اصلاحات کے بغیر ان میں سے کسی شے کا حصول بھی ممکن نہیں۔''

دسمبر 1993ء کے انتخابات کے بعد فنانشل ٹائمز نے اپنے اداریئے میں تحریر کیا کہ ''روس کیلئے واپسی کا کوئی راستہ نہیں'' اور مطالبہ کیا کہ سماجی قیمت سے قطع نظر اصلاحات کے پروگرام کو جاری رکھا جائے۔ لیکن چند ہفتے بعد اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اصلاح پسندوں کو ایک زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ''اصلاحات کا راستہ اختیار کیا جانا اب بھی ممکن ہے۔ لیکن اصلاح پسندوں کا کہنا ہے کہ زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ عوامی بے چینی، قدامت پسندوں کے دباؤ اور متحد ہونے میں ان کی اپنی ناکامی کے باعث اصلاحات ناکام ہو جائیں گی۔''(20)

سرمائے کی حکمت عملی طے کرنیوالوں کو اس بات کا علم تھا کہ یلسن کی حکومت ایک کمزور نوعیت کے بوناپارٹ ازم کی نمائندگی کرتی ہے۔ ماسکو میں موجود ان کا یہ نمائندہ جو اس وقت بیمار ہونے کے علاوہ کسی حد تک مایوسی کا شکار بھی تھا فیصلہ کن مواقع پر بھی لمبے عرصوں کیلئے ماسکو سے غیر حاضر رہتا تھا۔ یہ غیر حاضریاں نزلے زکام کے باعث نہیں تھیں جیسا کہ سرکاری طور پر کہا جاتا تھا بلکہ ان کی وجہ مایوسی تھی جس میں شراب نوشی کی عادت محض جزوی کمی لا سکتی تھی۔ یلسن کو دو ہارٹ اٹیک ہو چکے تھے اور تیسرا ہونے والا تھا۔ اس کے باجود مغرب اس بوڑھے اور بیمار شخص سے چمٹا رہا (یہ بات عام طور پر کہی جاتی ہے کہ وہ روسی مردوں کی اوسط عمر پوری کر چکا ہے جو اب محض ستاون سال ہے) جو عادی شرابی ہونے کے علاوہ دل کا مریض بھی تھا۔ اگر سامراج کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت صورتحال کی نزاکت اور غیر مستحکم نوعیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اس تعلق کو دیکھتے ہوئے ہیلائیری بیلک کے یہ مشہور مصرعے ذہن میں آتے ہیں کہ

"And always keep a-hold of Nurse For fear of

finding something worse"

(کسی بری چیز کا سامنا کرنے کے خوف سے ہمیشہ ایک تیمار دار پاس رکھنا چاہیے)

روس کے بارے میں بین الاقوامی بورژوازی کے قنوطی طرز فکر کا اظہار جان لائیڈ نے 22 مارچ 1994ء کے فنانشل ٹائمز میں یوں کیا:

''دیگر حقائق کی طرح روسی وزیروں کیلئے یہ حقیقت بھی بہت حوصلہ شکن ہے کہ سرکاری اصلاحات کے آغاز کو دو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر ان کے پاس داخلی کامیابی یا بیرونی اعتماد کے حوالے سے پیش کرنے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ بڑی مغربی کمپنیوں نے روس میں بڑے پیمانے کی سرمایہ کاری نہیں کی ہے۔ تجارت اس قدر سکڑ چکی ہے کہ اکثر ممالک اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ غیر ملکی بینکروں کو یقین نہیں ہے کہ روس اگلے پانچ برسوں میں کوئی حقیقی قرضہ واپس کرنے کے قابل ہو سکے گا اور روبل بتدریج گرتے ہوئے اس سطح کو پہنچ رہا ہے جہاں 2000 روبل ایک ڈالر کے برابر ہو جائیں گے۔'' اس وقت ایک امریکی ڈالر تقریباً 5,700 کے برابر ہو چکا ہے۔

یہ ایک ذہین مغربی مبصر کا بے لاگ جائزہ ہے کہ اس سے روس میں سرمایہ داری کے مستقبل کے بارے میں زیادہ اعتماد کا اظہار نہیں ہوتا۔ لینن کا خیال تھا کہ روس کو سستی غیر ملکی اشیا کی درآمد کیلئے کھولنے سے روسی سرمایہ داروں کو تحریک ملے گی۔ لیکن جیسا کہ لینن کہا کرتا تھا۔ ''سچائی ہمیشہ ٹھوس ہوتی ہے۔'' ان مخصوص حالات میں بیرونی تجارت پر ریاستی اجارہ داری کو ختم کرنے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ تجارت تباہ ہو گئی ہے اور بہت سا سرمایہ ملک سے باہر منتقل ہو گیا ہے۔ بہر طور اگر مغرب کے ساتھ معمول کے تجارتی تعلقات قائم بھی ہو جاتے تو سرمایہ داری کے نامیاتی بحران کے دور میں روس کو منڈی کی حدود و قیود کا سامنا کرنا پڑتا۔

مغربی اجارہ داریوں کو معیشت کے مخصوص شعبوں میں ہی دلچسپی ہو گی یعنی تیل، گیس اور خام مال، کاغذ، کاغذ بنانے کا گودا، سٹیل اور ایلومینیم پر بھی ان کی حریصانہ نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ وہ روس کو لوٹنا اور اس کا استحصال کرنا چاہتے ہیں۔ قدر زائد اور سپر منافع حاصل کرنے کے مواقع بھی موجود ہیں مگر اس میں خطرات بھی موجود ہیں۔

تمام تر خوش بیانیوں کے باوجود روس خود کو تنہا اور الگ تھلگ پاتا ہے۔ مشرقی یورپ کے بعض ممالک کو یورپین یونین میں شرکت کی دعوت دی گئی لیکن روس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ خوراک اور اشیائے

صرف کی مغربی درآمدات روسی صنعت اور زراعت کو تباہ کر رہی ہیں۔ ''آزاد تجارت'' یکطرفہ ہے۔ یہ صورتحال غیر معینہ عرصے کیلئے جاری نہیں رہ سکتی۔ تیئس فروری 1996ء کو اس پوشیدہ تناؤ کا ثبوت فراہم ہوا جب روسی وزیر مالیات نے درآمدات پر اوسطاً بیس فیصد ٹیکس کی تجویز پیش کی۔ امریکہ، یورپی یونین اور عالمی تجارتی تنظیم نے دھمکی دی کہ اگر ایسے اقدامات اٹھائے گئے تو فوری جوابی کارروائی کی جائے گی۔ روس اور مشرقی یورپ کی معیشتوں کو عالمی معیشت کا حصہ بنانے اور انہیں ''آزاد تجارت'' کی برکتوں کے بارے میں تعلیم دینے کے سلسلے میں زبانی جمع خرچ تو کیا جاتا ہے مگر عملاً مغربی معیشتیں مشرق کی سستی درآمدات کیخلاف رکاوٹیں کھڑی کرنے میں مصروف ہیں۔ یورپی یونین اور مشرقی یورپ کے درمیان تجارت کا فرق بہت زیادہ ہے اور اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ یکم جنوری 1994ء کو شائع ہونیوالے گارجین اخبار نے تبصرہ کیا کہ ''مغربی منڈیوں تک محدود رسائی کی وجہ سے وارسا، پراگ اور بڈاپسٹ میں دشمنی کی فضا پیدا ہو رہی ہے اور ان کے نقطہ نظر سے یہ چیز مارکیٹ اکانومی کے بارے میں مغربی تبلیغ کے کھوکھلے پن کو ظاہر کر رہی ہے۔''

ایک بار پھر قومی سوال کے بارے میں

سٹالن ازم کے جرائم کے باوجود قومی سوال کے سلسلے میں سوویت یونین نے زبردست پیش رفت کی۔ لینن نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ آخری تجزیئے میں قومی سوال روٹی کا سوال ہے۔ پیداواری قوتوں کی ترقی اور سماج کے آگے بڑھنے کی وجہ سے قومی سوال کی شدت میں کمی واقع ہوئی۔ سوویت یونین کی سرحدوں کے اندر پندرہ جمہوریائیں تھیں جن میں سو قومیتوں کے علاوہ چار سو علاقائی گروہ موجود تھے۔ چھ کروڑ افراد ان جمہوریاؤں میں رہتے تھے جن سے ان کا آبائی تعلق نہیں تھا۔ جمہوریاؤں کی معیشتوں کا ایک لڑی میں پرویا جانا ایک بہتر اقدام تھا اور تمام قوموں کے مفاد میں تھا۔ اس کے برعکس یونین کی ٹوٹ پھوٹ اور جمہوریاؤں کے درمیان موجود فطری معاشی تعلقات کو منقطع کرنے کی مجنونانہ کوشش کے انتہائی تباہ کن نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

پرانے نظام کی بنیاد عظیم روسی شاونزم پر تھی اور آج کی بورژوا دوست حکومت بھی اقلیتوں اور چھوٹی قومیتوں کے مفادات کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ پرانی بیوروکریسی، بالخصوص روز افزوں بے چینی کا

شکار فوجی ٹولا زیادہ جارحانہ خارجہ پالیسی پر زور دے رہا ہے جیسا کہ ہم نے پیش گوئی کی تھی روس سابقہ سوویت یونین کی تمام جمہوریاؤں پر دوبارہ غلبہ حاصل کرنے کیلئے حرکت میں آ چکا ہے۔ حق خود ارادیت کی وقعت کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں ہے۔

سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ اس میں بسنے والی قوموں میں سے کسی کے مفاد میں نہیں تھی۔ معاشی نقطہ نظر سے یہ ایک زبردست تباہی تھی۔ ان تمام جمہوریاؤں کی معیشتیں سوویت یونین کی معیشت سے جڑی ہوئی تھیں۔ لہٰذا نو آزاد ریاستیں بہت حد تک روس کے ساتھ تجارت پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں۔ سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کے وقت دیگر جمہوریاؤں کے ساتھ روس کی درآمدات اور برآمدات کا اندازہ اس کی پیداوار کے تقریباً تیس فیصد کے برابر لگایا جاتا تھا۔ تاہم جمہوریاؤں کی باہمی تجارت میں یوکرائن کا حصہ اس کی پیداوار کے ساٹھ فیصد اور آرمینیا کا ایک سو دس فیصد تھا۔ اس کے مقابلے میں یورپی یونین کے باقی مما لک کے تھا۔ برطانیہ کی تجارت اس کی پیداوار کے 22 فیصد کے قریب تھی۔ جمہوریاؤں کے پاس اتنی ہارڈ کرنسی نہیں ہے کہ وہ عالمی منڈی کے ساتھ زیادہ تجارت کر سکیں اور اس قسم کی کوشش کا نتیجہ ان سب کی معیشتوں کیلئے انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔

اپنی معاشی طاقت کے بل بوتے پر روس با آسانی دوسری ریاستوں پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔ وہ پہلے ہی ان میں سے کئی ایک کو نام نہاد آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ میں شرکت پر مجبور کر چکا ہے۔ جہاں معاشی دباؤ ناکافی ثابت ہوا وہاں روس نے مختلف جمہوریاؤں کو غیر مستحکم کرنے کیلئے فوجی طاقت استعمال کی جن میں قابل ذکر جارجیا اور مالدیویا ہیں۔ ایک بورژوا مبصر نے بڑی نفاست سے ان ہتھکنڈوں کو بیان کیا ہے۔ جن کے ذریعے ماسکو سوویت یونین کی سابقہ جمہوریاؤں میں اپنے مفادات کو فروغ دیتا ہے:

"بہت سی سابقہ سوویت جمہوریاؤں میں گویا جادو کے زور سے علیحدگی پسند تحریکیں وجود میں آ گئیں اور وہ ان حکومتوں کی نسبت بہتر اسلحہ سے لیس تھیں۔ کچھ عرصے کی خانہ جنگی کے بعد روس لڑائی میں ملوث گروہوں کو علیحدہ کرنے کیلئے مداخلت کر کے ایک ایسا امن مسلط کر دیتا ہے جس میں روسی افواج کی تعیناتی شامل ہوتی ہے۔ مزید برآں اکثر لڑائیاں بالکل اس وقت شروع اور بند ہوتی ہیں جب ماسکو چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر جارجیا میں ہونے والی ابخاز بغاوت اس لمحے دم توڑ گئی جب جارجیا کے صدر ایڈورڈ شیورڈ ناڈزے نے اس امن معاہدے پر دستخط کیے جس نے عملاً اس کے ملک کی آزادی کا خاتمہ کر دیا۔

ان طریقوں سے ماسکو مختلف جمہوریاؤں کو ذلت آمیز دفاعی معاہدوں پر مجبور کر دیتا ہے۔ جارجیا کی جمہوریاؤں جنوبی اوسیٹیا اور ابخازیہ میں روسی مداخلت کے باعث روس مارچ 1994ء میں ایک معاہدے کے ذریعے جارجیا کی سرزمین پر از سر نو فوجی اڈے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مالدیویا میں جولائی 1992ء اور پھر اس سال نومبر میں شمالی اوسیٹیا میں بھی یہی کچھ کیا گیا۔ یہیں سے روس نے دسمبر 1994ء میں چیچنیا پر دوسرا حملہ کیا تھا۔ قفقاز کا تمام علاقہ اب دوبارہ روس کے تسلط میں آ چکا ہے۔ مالدیویا نے رومانیہ کے ساتھ دوبارہ اتحاد کیخلاف رائے دی اور وسطی ایشیا کی طرح مکمل طور پر ماسکو کے ماتحت ہے۔ بیلا روس نے روس کے ساتھ قریبی تعلق کا انتخاب کیا ہے جو اس کے روس میں ضم ہونے کے مترادف ہے۔ ریفرنڈم کے ذریعے اس کی توثیق کروائی گئی اور مارچ 1995ء میں 82.5 فیصد ووٹروں نے اس معاشی اتحاد کے حق میں ووٹ دیا۔ حق رائے دہی استعمال کرنیوالوں کی تقریباً تین چوتھائی تعداد نے روس کو سرکاری زبان بنانے اور سوویت دور کے قومی نشان کو دوبارہ رائج کرنے کی بھی حمایت کی۔

دراصل صرف یوکرائن اور بالٹک ریاستوں کو ہی کسی حد تک آزادی حاصل ہے لیکن بالٹک ریاستوں میں بھی سرمایہ داری کا تکلیف دہ تجربہ اپنا اثر دکھا رہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ لیتھوینیا کے شدید آزادی پسند عوام نے بھی لینڈز برجس کی قوم پرست حکومت کو مسترد کر کے سابق کمیونسٹ پارٹی کو منتخب کیا جو دوسری باتوں کے علاوہ روس کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کرنے کے حق میں بھی تھی۔ ان کے دوبارہ نکال باہر کیے جانے کی وجہ یہ حقیقت تھی کہ کمیونسٹ پارٹی کی قیادت نے سرمایہ داری کا غلیظ کام یعنی اصلاحات کا عمل جاری رکھا تھا۔ لیکن اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بالٹک ریاستوں کے مزدور بھی کسی طبقاتی متبادل کی تلاش میں ہیں۔ لٹویا میں بھی بائیں بازو کی ڈیموکریٹک پارٹی کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی مگر اس کے ساتھ ساتھ روس مخالف پیپلز مومنٹ فار لٹویا کو بھی حمایت حاصل ہوئی ہے جس سے لٹویا کی روسی اقلیت مزید بھڑکے گی۔ یہ آبادی کے تیسرے حصے پر مشتمل ہے لیکن شہریت کے سخت قوانین کے باعث ان میں سے بہت سے لوگ ووٹ کے حق سے محروم ہیں۔

یوکرائن کی خودمختاری

یوکرائن ہی وہ واحد جمہوریہ ہے جو شاید روسی دباؤ کی مزاحمت کی قوت رکھتی ہے۔ اس کی آبادی

52 ملین، مجموعی داخلی پیداوار بلجیئم کے برابر اور اس کی فوج یورپ میں تیسری بڑی فوج ہے۔ لیکن یوکرائن بھی روسی گرفت سے بچ نکلنے کے قابل نہیں ہوگا۔ یوکرائن کی معیشت کی حالت روسی معیشت سے بھی بدتر ہے۔ یہاں تک کہ آبادی کا بڑا حصہ بالخصوص مشرقی حصے سے تعلق رکھنے والے لوگ روس میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ یہ صورتحال صرف کریمیا میں ہی نہیں ہے جہاں بالآخر ایک روس دوست حکومت منتخب ہوگئی بلکہ ڈان باس کے انتہائی اہمیت کے حامل کوئلے کی کانوں کے مزدور بھی یہی چاہتے ہیں۔

یوکرائن نے عملاً خودمختاری حاصل کرلی ہے لیکن وہ ابھی تک معاشی عوامل اور ایک قابل ذکر روسی اقلیت کے ذریعے جو آبادی کا اکیس فیصد ہے، روس کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ روسی منڈیوں اور خام مال تیل، معدنیات وغیرہ تک رسائی کے بغیر اس کی معیشت تباہ ہو جائے گی۔ روس کی طرف سے توانائی کی رسد منقطع ہونے سے یوکرائن پر تباہ کن اثرات مرتب ہوئے تھے اور اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو یہ ملک بالکل ڈوب جاتا۔ اگر وہ مغرب میں چھوٹی موٹی منڈیاں حاصل کر بھی لیتا ہے تو اس سے روسی مارکیٹ چھن جانے کی تلافی نہیں ہوسکتی۔ دوسری طرف یوکرائنی وسائل کے بغیر روسی معیشت بھی مشکلات کا شکار ہوسکتی ہے۔ یوکرائن سابقہ سوویت یونین میں غذائی اجناس اور صنعتی ضروریات کی فراہمی کے حوالے سے بالٹک ریاستوں یا کاکیشیا سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔

یوکرائن کی مسلح افواج کی طاقت بھی ایک نسبتی بات ہے۔ اس کے افسران کی کم وبیش اسی فیصد تعداد روسیوں پر مشتمل ہے۔ مزید برآں یوکرائن تیل اور قدرتی گیس کیلئے مکمل طور پر روس کا محتاج ہے اور اس کا زبردست مقروض ہے۔ اس حقیقت کی یاددہانی کیلئے ماسکو نے صنعتی اور نجی صارفین کیلئے یہ سپلائی ایک بار بند بھی کردی تھی۔ اگر قدرتی گیس کی سپلائی بالکل بند کردی جائے تو یوکرائن کی ایک تہائی صنعت بند ہو جائے گی۔ عملاً اکیلا یوکرائن روس کے مقابلے پر کھڑا نہیں ہوسکتا۔ شاید اسے بیلاروس کی طرز پر کوئی سمجھوتہ کرنا پڑے۔ یہ کوئی حادثاتی امر نہیں تھا کہ 1991ء کی ناکام بغاوت کے ایک ہفتے کے اندر اندر یلسن نے روسی جمہوریہ کی سرحدوں کے ازسرنو تعین کے امکان کا اعلان کردیا تھا اور اگر یوکرائن خود کو قائم نہیں رکھ سکتا تو اس بات کا امکان اور بھی کم ہے کہ بالٹک کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایسا کرسکیں۔ مغرب اس سلسلے میں گلہ شکوہ اور ڈھکے چھپے الفاظ میں دھمکیاں تو دے سکتا ہے لیکن حقیقت میں وہ اس سلسلے میں کچھ کرنے سے بالکل لاچار ہے۔

یوکرائن میں سرمایہ داری کی جانب پیش رفت بہت سست رفتار رہی ہے۔ معیشت کا زیادہ تر حصہ

ریاستی شعبے میں ہے۔مغرب کی طرف سے پانچ بلین ڈالر ملنے کے باوجود صدر کھما بیوروکریسی کی طرف سے بہت زیادہ مخالفت کی وجہ سے جو اقتدار سے چمٹے رہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہا ہے۔کرنسی کی قیمت میں زبردست کمی ہوئی ہے۔افراط زر بہت شدید ہے اور آزادی کے بعد سے اب تک دس سے بارہ بلین ڈالر بیرون ملک منتقل ہو چکے ہیں۔جیسا کہ فنانشل ٹائمز نے 30 اگست 1995ء کے شمارے میں تبصرہ کیا تھا۔آزادی کے چار سال بعد بھی یورپ میں روس کے بعد دوسرے بڑے ملک کو اصلاح کے فوائد تو ایک طرف رہے معاشی استحکام بھی نصیب نہیں ہوا۔اچھی شروعات کے بعد معاشی بحالی کو ریاستی سرپرستی پر انحصار کرنے والے طاقتور سرمایہ داروں اور بیوروکریٹوں کی بڑھتی ہوئی مخالفت کا سامنا ہے، روس کے ساتھ قریبی روابط اور سنہرے دنوں کی واپسی کیلئے دباؤ میں مزید اضافہ ہوگا۔

فوجی ٹولے کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش میں یلسن نے روسی وفاق کی سرحدوں سے باہر آباد 25 ملین روسی زبان بولنے والوں کی حفاظت کا مسئلہ اٹھایا ہے۔اگر اس سے وضاحت میں کچھ کمی رہ گئی تھی تو قازقستان میں روسی زبان بولنے والوں کی ایسوسی ایشن کے لیڈر رولیری گیلیکو نے اسے واضح لفظوں میں بیان کر دیا۔اس نے فنانشل ٹائمز کو 20 دسمبر 1993ء کو بتایا کہ ہمیں تباہ شدہ سوویت یونین کو بحال کرنے کیلئے دوہری شہریت کی ضرورت ہے۔سابقہ جمہوریاؤں کی اکثریت پہلے ہی روس کے دائرہ اثر میں واپس آ چکی ہے جیسا کہ 18 ستمبر 1993ء کے اکانومسٹ نے لکھا تھا، سی آئی ایس کے چھ ممبران کو روس کے ساتھ دفاعی معاہدے کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔پانچ نے اس امید میں اپنی خود مختاری رضاکارانہ طور پر روس کے حوالے کر دی ہے کہ شاید اس کے ساتھ جڑنے سے ان کی معیشتیں بحال ہو جائیں۔غیر رکن ممالک سی آئی ایس میں شمولیت کی درخواست دے رہے ہیں جس سے وہ روس کی گرفت میں آ جائیں گے۔سوویت یونین کی سابقہ پندرہ ریاستوں میں سے صرف بالٹک کی تین ریاستیں یعنی اسٹونیا، لٹویا اور لیتھونیا ابھی تک الگ رہنے میں کامیاب ہوئی ہیں۔

یہ معاہدہ فری ٹریڈ زون سے بڑھ کر ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان جمہوریاؤں نے اپنی مالیاتی خود مختاری روس کے حوالے کر کے پچھلے سال ٹوٹنے والے روبل زون کو دوبارہ استوار کر دیا ہے۔در حقیقت بیلا روس نے اپنا مالیاتی نظام روس کے ساتھ منسلک کر دیا ہے۔اسی طرح روس اپنے پرانے دائرہ اثر میں خود کو دوبارہ مسلط کر رہا ہے۔

سمجھوتے کے باوجود یلسن نے مشرقی یورپ کے ممالک کی نیٹو میں شمولیت کی مخالفت کی، روس کی

جنوبی سرحدوں پر مزید ٹینکوں کی تعیناتی کے حق کا مطالبہ کیا اور یورپ میں روایتی ہتھیاروں میں کمی کے معاہدے کو ختم کرنے کی دھمکی دی۔ علاوہ ازیں اس نے روس کو سابق سوویت یونین میں امن کے ضامن کے طور پر پیش کیا۔ یلسن نے مارچ 93ء میں اعلان کیا کہ وقت آ گیا ہے کہ متعلقہ بین الاقوامی ادارے روس کو سابق سوویت یونین کے علاقے میں امن اور استحکام کے ضامن کی حیثیت سے خصوصی اختیارات دیں۔ ان تمام باتوں سے روسی ملٹری کی بڑھتی ہوئی طاقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ شدید مالیاتی بحران کے باوجود 93ء میں روس کے دفاعی اخراجات دگنے کر دیئے گئے جو مجموعی داخلی پیداوار کے حوالے سے چار فیصد سے بڑھ کر 7.5 فیصد ہو گئے۔

روس میں سرمایہ داری کی از سر نو بحالی کی صورت میں ہمیں ایک خونخوار سامراجی طاقت کا ظہور دیکھنے کو ملے گا۔ روس بیک وقت جمہوری اور سرمایہ دار نہیں ہو سکتا۔ روس میں فوجی آمریت کے قیام کی صورت میں وہ ناگزیر طور پر ماضی کی زار شاہی کے خطوط پر ایک جارحانہ توسیع پسندی کی پالیسی اختیار کرے گی۔ یوکرائن کے علاوہ، حالانکہ وہ بھی فوجی آمریت کے غلبے کا شکار ہو سکتا ہے، سی آئی ایس کی سابقہ ریاستوں کی خود مختاری بہت حد تک جعلی ہو گی۔ کسی ایک یا دوسرے طریقے سے وہ ناگزیر طور پر روسی غلبے کا شکار ہو جائیں گی۔ سرمایہ داری کے تحت یہ ریاستیں طاقتور روسی معیشت کی کشش کی مزاحمت نہیں کر سکیں گی جو انہیں بے رحمی سے اپنے شکنجے میں لے لی گی۔ بہر طور اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ ماسکو میں فوجی بغاوت کے ساتھ ہی کیف میں بھی فوجی بغاوت ہو جائے گی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سلاف ریاستوں، روس، یوکرائن اور بیلا روس پر مشتمل ایک مشترکہ حکومت بنا دی جائے جو مل کر ایک نو تشکیل شدہ یونین پر اجتماعی غلبہ حاصل کر لے۔ یوکرائن اور بیلا روس پہلے ہی ایک کسٹمز یونین کے قیام کیلئے روس کے ساتھ سمجھوتہ کر چکے ہیں۔ دیگر تمام جمہوریاؤں نے بھی ان کی نقالی کی ہے۔ یوکرائن کو کسی حد تک زیادہ خود مختاری کی ضمانت کوئی مہنگا سودا نہیں ہے۔ یہ ایک اطمینان بخش سمجھوتہ نہیں ہو گا مگر کچھ عرصے کیلئے قائم رہ سکتا ہے۔ سابق سوویت یونین کی اقوام کیلئے واحد نمو پذیر حل حقیقی جمہوری مزدور ریاستوں کا وفاق ہے۔ ٹراٹسکی یوکرائن کے ساتھ اتحاد کے مسئلے اور یوکرائن کے عوام کی اپنی علیحدہ ریاست کی خواہش کو سمجھتا تھا۔ سٹالن نے ماسکو کی بیوروکریسی کے جبر کے تحت یوکرائن کو نوکر شاہانہ انداز میں متحد کیا۔ یوکرائنی قوم کیلئے حقیقی خود مختاری اور جمہوریت مفقود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ٹراٹسکی نے مزدور جمہوریت کی بنیاد پر سوویت یونین کی تمام اقوام کے حقیقی اتحاد کی جانب اقدام کے طور پر ایک خود

مختار سوویت سوشلسٹ یوکرائن کا نعرہ دیا تھا۔آگے بڑھنے کا یہی حقیقی راستہ ہے۔

چیچنیا کی جدوجہد

معاشی اور دفاعی دونوں حوالوں سے کاکیشیا کا علاقہ روس کیلئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ 1991ء میں سوویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ سے پھیلنے والی عمومی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چیچنیا کے فوجی ٹولے نے جنرل ڈیوڈائیف کی سربراہی میں اقتدار پر قبضہ کر کے آزادی کا اعلان کر دیا۔یہ بات شروع ہی سے واضح تھی کہ روس اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔موقع ملتے ہی یلسن نے اسے روس کے اتحاد کیلئے خطرہ قرار دیتے ہوئے صدر ڈیوڈائیف کی ''بدمعاش حکومت'' کا تختہ الٹنے کیلئے چیچن جمہوریہ پر حملے کا حکم دیدیا۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ڈیوڈائیف حکومت منشیات اور اسلحہ کے غیر قانونی کاروبار میں بری طرح ملوث ہونے کے علاوہ روس کی مافیا سے بھی رابطہ رکھتی تھی۔لیکن ماضی میں ان باتوں نے یلسن کے زاویہ نظر کو کبھی متاثر نہیں کیا تھا۔

اسے روس کی اکیس داخلی جمہوریاؤں کے ساتھ سخت رویہ اپنانا پڑا ہے جو سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد خودمختاری کی طالب تھیں۔اس کا ایک اور مقصد دیگر جمہوریاؤں کو انتباہ کرنا تھا کہ وہ راہِ رست پر آجائیں ورنہ نتائج کا سامنا کریں۔اگرچہ ان نسلی جمہوریاؤں کی آبادی روسی جمہوریہ کی کل آبادی کا محض بیس فیصد ہے لیکن ان کے پاس پچاس فیصد علاقہ ہے۔دی اکانومسٹ رسالہ لکھتا ہے کہ ''روس کے پارہ پارہ ہونے سے کئی بوسنیا جنم لے سکتے ہیں۔غالب امکان اس بات کا ہے کہ اس سے روسی جرنیل ناراض ہو سکتے ہیں جن میں سے کچھ نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک ملک کی سالمیت کو قائم رکھنا ان کا اولین فرض ہے۔''

تاہم چیچنیا روسیوں کے گلے پڑ گیا۔اہل چیچنیا اپنی سرزمین پر ایک دفاعی جنگ لڑ رہے تھے جبکہ روسی سپاہی ایک ایسی جنگ میں ملوث تھے جس کے نصب العین پر انہیں کوئی یقین نہیں تھا۔وہ خود کو ایک بیرونی جارح فوج سمجھتے تھے اور ان کے ساتھ سلوک بھی اس قسم کا کیا گیا تھا۔روسی فوج کی بے دلی اور اہل چیچنیا کی شدید مزاحمت کے باعث یلسن ایک خونریز گوریلا جنگ میں پھنس گیا۔مارکسسٹ اہل چیچنیا کے حق خودارادیت کے حق میں ہیں جنہیں ایک سوشلسٹ جمہوری متحدہ روسی وفاق کے اندر خودمختاری

حاصل ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چیچن عوام کی حمایت کرتے ہیں لیکن چیچنیا کے رجعتی حکمران ٹولے کی نہیں۔

روسی فوج کو چیچنیا میں جس ذلت کا سامنا کرنا پڑا وہ اس چیز کی واضح علامت ہے کہ اس کی مسلح افواج کس قدر انتشار اور بے دلی کا شکار ہے۔دی سنڈے ٹائمز نے 14 اپریل 1996ء کی اشاعت میں ایک ایسی فوج کی حیران کن تصویر کشی کی ہے جو ٹوٹ پھوٹ رہی ہے اور اس کے فوجی بغاوت پر آمادہ ہیں:

''روسی والدین اپنے بیٹوں کو فوج میں بھرتی ہونے سے بچانے کیلئے جس قدر بے چین ہیں اسی قدر بھرتی کے مراکز اپنے کوٹے پورے کرنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔انہیں جون کے آخر تک دو لاکھ افراد مہیا کرنے ہیں۔کوفٹن کا اندازہ ہے کہ وہ جن ممکنہ رنگروٹوں سے ملتی ہے ان کی ساٹھ فیصد تعداد پرانی بیماریوں میں مبتلا ہے جن میں سے زیادہ تر کی نوعیت نفسیاتی اور اعصابی ہے اور ایسے لوگ فوجی خدمت کیلئے نا اہل ہوتے ہیں۔اس کا کہنا ہے کہ بدترین بات یہ ہے کہ ان بیمار لڑکوں کے والدین میں سے بہت سے اپنے بیٹوں کا علاج کروانے سے انکار کر دیتے ہیں۔''

سابق جنرل الیگزینڈر لیبیڈ جسے یلسن حکومت میں لے کر آیا تھا سمجھتا تھا کہ چیچنیا سے فوج نکال کر اسے سیاسی فائدہ حاصل ہوگا اور اس کا خیال غلط نہیں تھا۔16 جنوری 1997ء کو نیز اویسی مایا گزیٹا میں شائع ہونیوالے ایک جائزے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اسی فیصد آبادی امن معاہدے کی حامی تھی اور لیبیڈ روس کا مقبول ترین سیاست دان تھا (اسے اٹھاون فیصد کی حمایت حاصل تھی جبکہ یلسن کو صرف تیئس فیصد کی) لیکن یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ یلسن یا جنرل سٹاف اس اپوزیشن کے حامی نہیں تھے۔غالباً اسی چال نے اس سابق جنرل سے چھٹکارا پانے کی تحریک کو ہوا دی۔

ان سطور کو تحریر کرتے وقت صورتحال یہ ہے کہ یلسن نے چیچنیا سے فوج واپس بلا لی ہے اور کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔یہ اخراج چیچنیا میں روسی فوج کی کمزوری اور اہل چیچنیا کی پر استقلال مزاحمت کا نتیجہ ہے۔لیکن ماسکو کی جانب سے سرمایہ دارانہ یا سٹالنسٹ کسی بھی نظام کے تحت چیچنیا کو حقیقی آزادی دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ہوسکتا ہے ان میں کسی قسم کی خودمختاری پر سمجھوتہ ہو جائے لیکن ماسکو مکمل آزادی کو قبول نہیں کر سکتا۔بصورت دیگر قفقاز کی دوسری اقوام بھی ایسے ہی مطالبات پیش کریں گی۔روس کے لئے اس علاقے کی دفاعی اور معاشی اہمیت کے مدنظر جنرل کبھی بھی ایسا نہیں ہونے دینگے۔اس کا مطلب ہے کہ مستقبل میں تصادم ناگزیر ہے اور اس سلسلے میں روسی رائے عامہ ہموار کرنے

کیلیئے روسی النسل لوگوں پر حملے کا ڈرامہ رچایا جاسکتا ہے۔ اگر ماسکو نے ضروری خیال کیا تو یہ طریقہ کار نہ صرف چیچنیا بلکہ دوسری جمہوریاؤں میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

وسطی ایشیا کی صورتحال دوسری ہے۔ سابقہ زارشاہی سلطنت کی تمام اقوام میں سے اکتوبر انقلاب کا سب سے زیادہ فائدہ انہی کو ہوا تھا۔ جاگیردارانہ پس ماندگی کی جگہ صنعت، مواصلات، یونیورسٹیوں اور عورت کی مساوات نے لے لی۔ جہالت کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا تھا لیکن ایشیائی بربریت کی جگہ سٹالنسٹ بربریت نے لے لی۔ تاہم ایک مسخ شدہ مزدور ریاست کے اندر بھی وسطی ایشیا کی اقوام نے نہ صرف ماضی کے مقابلے میں بلکہ جنوب میں واقع ''آزاد'' سرمایہ دارانہ ایشیائی ممالک کے مقابلے میں بھی زبردست ترقی کی۔ تاہم قومی جبر برقرار رہا۔ سٹالن ازم کے تحت تمام فیصلے ماسکو میں بیٹھا عظیم تر روس کا حامی حکمران ٹولہ صادر کرتا تھا۔

وسطی ایشیاء میں نوکرشاہانہ منصوبہ بندی کے غیر ذمہ دارانہ اطلاق کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ وسطی ایشیا کے وسائل کی تباہی، بحیرہ یورال کا خشک ہونا، ازبکستان کی واحد فصل کپاس کی بربادی اور جراثیم کش ادویات کے اندھا دھند استعمال کے باعث ماحول کی عمومی تباہی سٹالن ازم کی طرف سے ورثے میں ملی۔ روسی بیوروکریسی وسطی ایشیا میں ایسے صوبے داروں کے ذریعے حکمرانی کرتی تھی جو ماسکو میں موجود اپنے آقاؤں سے بڑھ کر ضمیر فروش اور ذلیل تھے۔ سرمایہ داری کی بحالی ان ایشیائی اقوام کیلیئے تباہی کا پیغام لے کر آئے گی اور انہیں روسی سامراج کی نوآبادیوں میں تبدیل کر دے گی اس سلسلے میں اس کا مقابلہ علاقے کے کمتر سامراجوں سے ہوگا جن میں ایران، ترکی، پاکستان اور بھارت شامل ہیں۔

گزشتہ ستر سال کی تاریخ کو دیکھتے ہوئے قوم پرست عناصر کا ظہور ناگزیر تھا۔ نوکرشاہی کی جانب سے مذہب کو جبراً دبانے کی کوشش کا ناکام ہونا یقینی تھا۔ اب وسطی ایشیا میں اسلام پسند عناصر کا دوبارہ ظہور ہو رہا ہے لیکن یہ غالب رجحان نہیں ہے۔ پولینڈ اور چیکوسلوواکیہ کے باسی اپنے معیار زندگی کا موازنہ جرمنی سے کرتے ہیں مگر سرمایہ داری کی بدقسمتی ہے کہ تاجک اور ازبک اپنی صورتحال کا موازنہ ایران، پاکستان اور بھارت سے کرتے ہیں۔ اس فرق کو دیکھنے کیلیئے جدید تاشقند کی صنعت، تعلیم کی اعلیٰ سطح اور پڑھی لکھی اور آزادی سے باہر نکلنے والی خواتین کا موازنہ کابل یا کراچی پر مسلط کردہ بربریت سے کرنا ہی کافی ہوگا۔

سابق سوویت یونین میں سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک نے قومی سوال کو ایسی دھماکہ خیز جہتیں

عنایت کی ہیں جو تمام خطے کو خوں ریز انتشار کا نشانہ بنا سکتی ہیں۔ مندرجہ ذیل رپورٹ میں صورتحال کی ہولنا کی کو مکمل طور پر بیان کیا گیا ہے:

''سابق سوویت یونین کی آزاد ریاستوں کی دولت مشترکہ کے بارہ ممالک کے اندر 1989ء سے لیکر اب تک تقریباً 90 لاکھ افراد نے نقل مکانی کی ہے جو آج شائع ہونیوالی ایک رپورٹ کے مطابق دوسری جنگ عظیم کے بعد کسی بھی خطے میں ہونے والی سب سے پیچیدہ، سب سے بڑی اور ممکنہ طور پر سب سے زیادہ عدم استحکام کا موجب بننے والی نقل مکانی ہے۔ رپورٹ کے مطابق دولت مشترکہ کی کل آبادی کا ہر تیسواں شخص اس غیر رضا کارانہ اور مسلسل ہجرت سے متاثر ہوا ہے۔ پانچ وسط ایشیائی جمہوریاؤں میں 1989ء سے ہر بارہویں فرد نے نقل مکانی کی ہے۔''

''روسی دولت مشترکہ کے ممالک میں 1988ء کے بعد سے جب آرمینیا اور آذربائیجان میں نگورنو کاراباخ کے لئے تصادم شروع ہوا تھا تیس لاکھ افراد سات تصادموں کے باعث نقل مکانی کر چکے ہیں۔ چیچنیا میں ہونے والے تازہ ترین تصادم کی وجہ سے پچاس ہزار افراد بے گھر ہوئے ہیں۔ سوویت یونین کے پندرہ الگ الگ ریاستوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے 54 سے 64 ملین افراد یعنی سی آئی ایس کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ایسے علاقوں میں موجود تھا جو ان کا آبائی علاقہ نہیں تھا۔ ان میں تیس لاکھ افراد ''واپس'' جا چکے ہیں جن کی اکثریت روس کی طرف ہجرت کر گئی ہے۔ 1936ء سے 1952ء کے دوران سٹالن نے تیس لاکھ افراد کو دیس نکالا دیا جن میں پوری کی پوری آبادیاں شامل تھیں۔ ان میں دولگا کے جرمن، کریمیا کے تاتار اور جارجیا کے میسختین شامل تھے۔'' (22)

سٹالن ازم اور سرمایہ داری، دونوں ہی سابق سوویت یونین اور روس میں قومی سوال حل کرنے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ تمام اقوام کو مساوی حقوق کی ضمانت فراہم کرنے کے بعد ہی کوئی دیرپا برادرانہ اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن سٹالن ازم یا سرمایہ داری کے تحت ایسا ہونا ممکن نہیں۔ صرف مزدور جمہوریت کی طرف واپسی سے ہی مزدور طبقے اور پسی ہوئی قومیتوں کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ ایسا نظام لینن کی قومی آزادی اور اقوام کے برادرانہ تعلقات پر مبنی پالیسی کو دوبارہ اپنائے گا جس میں قومی اقلیتوں کو تمام حقوق حاصل ہونگے۔ اسی پالیسی نے اکتوبر انقلاب کے بعد روس کو ٹوٹ پھوٹ سے بچایا تھا مگر بعد ازاں سٹالن نے اس سے غداری کی۔ روسی مزدوروں کا یہ فریضہ ہے کہ اپنے مسائل کے واحد حل کے طور پر سوشلسٹ بین الاقوامیت کے حقیقی تصورات کو دوبارہ استوار کریں۔ صرف لینن ازم کے حقیقی اصولوں کی

جانب واپسی ہی ایک سوشلسٹ فیڈریشن کے اندر اقوام کے آزادانہ اتحاد کی بنیاد پر ایک منصفانہ اور دیرپا حل پیش کر سکتی ہے۔

باب نمبر 9: سٹالن ازم کی ٹوٹ پھوٹ

1۔ این شمیلیف نوی میر۔ نمبر 6۔ 1987

2۔ اے جی اگان بیگین پریسٹرائیکا (سالانہ) جلد تین صفحہ 162

3۔ ایللک نوی سوویت یونین کی معاشی تاریخ صفحہ 416

4۔ مارکس لوئیس بوناپارٹ کا اٹھارہ برومئیرے۔ جلد ایک صفحہ 462

5۔ دی گارجین۔ 91-8-22

6۔ دی گارجین۔ 91-8-20

7۔ مارٹن سکس سمتھ ماسکو بغاوت۔ صفحہ 37

8۔ ایم میکالے سوویت یونین۔ 1991-1917 صفحہ 368

9۔ دی سنڈے ٹائمز 91-8-25

10۔ دی وال سٹریٹ جرنل 91-8-29

11۔ ایڈورڈ گرینک شاہ خروشیف کا روس صفحہ 63-64

12۔ ایڈورڈ گرینک شاہ خروشیف کا روس صفحہ 64

13۔ مارٹن سکس سمتھ ماسکو بغاوت۔ صفحہ 170

14۔ بورس یلسن کریملن سے جائزہ۔ صفحہ 19

15۔ یلسن کریملن سے جائزہ صفحہ 146

16۔ ایضاً صفحہ 276

17۔ ایضاً صفحہ 277

18۔ یلسن کریملن سے جائزہ صفحہ 12

19۔ یلسن کریملن سے جائزہ صفحہ 102

20۔ فنانشل ٹائمز 94-1-8, 94-1-9

21۔ ازوستیا 93-3-4

22۔ فنانشل ٹائمز 96-5-23

باب 10

ایک بار پھر: روسی ریاست کی طبقاتی نوعیت

مارکسی طریقہ کار

''تاریخ ہر نوع کے تغیرات سے واقف ہے۔'' (لینن)

عشروں سے روس کی طبقاتی نوعیت کا سوال مارکسی تحریک میں ایک مرکزی مسئلہ رہا ہے۔ اب سوویت یونین کے انہدام اور سرمایہ داری کی جانب تحریک سے یہ سوال مزید اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ روس میں رونما ہونے والے عوامل کو مجرد تعریفات اور رسمی منطق کے نقطہ نظر سے سوچ کی گرفت میں لانا ممکن نہیں ہے۔ مبادیاتی کیمسٹری میں یہ جاننے کیلئے ایک سادہ سا لٹمس ٹسٹ ہی کافی ہوتا ہے کہ آیا کوئی مواد اساسی ہے یا تیزابی۔ لیکن پیچیدہ تاریخی عوامل ایسے سادہ طریقہ کار کی اجازت نہیں دیتے۔ ایسا کرنا صرف جدلیاتی طریقہ کار کے ذریعے ہی ممکن ہے جو سارے عمل کو ایک اکائی کے طور پر لیتا ہے اور رونما ہونے والے متضاد رجحانات کا ہر مرحلے پر ٹھوس تجزیہ کر کے صورت حال پر روشنی ڈال سکتا ہے۔ جب ہم حقیقی تاریخی عوامل کی بجائے خالص تجریدات کو بنیاد بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو لامتناہی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ٹریڈ یونین اور مزدوروں کی پارٹی کس قسم کی ہونی چاہیے۔ لیکن تاریخ ہر طرح کی عجیب وغریب اور حیرت انگیز اقسام سے واقف ہے۔ انتہائی خوفناک نوکرشاہانہ ٹریڈ یونینوں سے بھی اور

بدعنوان اصلاح پسند پارٹیوں سے بھی۔ایک مزدور ریاست کم وبیش اسی طرح کی ہوتی ہے جیسے اقتدار کی حامل ٹریڈ یونین۔انتہائی پس ماندگی کے حالات میں ایسی ریاست نوکر شاہانہ انحطاط کے عمل کا شکار ہوسکتی ہے۔جیسا کہ ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ سٹالن ازم ایک مخصوص قسم کا بونا پارٹ ازم ہے۔ایک پرولتاری بونا پارٹ ازم کا نظام۔

یہاں تک کہ تجربہ کار مارکسٹوں کی جانب سے بھی سوویت یونین، چین اور مشرقی یورپ کی ریاستوں کو ''مزدور ریاستیں'' قرار دیا جانا سننے میں آتا ہے۔یہ مارکسی اصطلاح کا ناقابل معافی غلط استعمال ہے۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں 1920ء میں لینن نے بخارین کی طرف سے روس کو ''مزدور ریاست'' قرار دینے پر اس پر کڑی تنقید کی تھی۔اس کا اصرار تھا کہ اس میں ''نوکر شاہانہ بدہیئتی کے ساتھ'' کا اضافہ کیا جائے۔اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہ توڑ مروڑ یا بدہیئتی نسبتاً معمولی نوعیت کی تھی۔

اس وقت روس ایک نسبتاً صحت مند مزدور ریاست تھی۔اس کا موزانہ سٹالن کے تحت ظہور پذیر ہونے والے نوکر شاہانہ، آمرانہ عفریت سے نہیں کیا جاسکتا۔یہاں ٹراٹسکی کا یہ ریمارک دہرانا ہی کافی ہوگا کہ اگر قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو ایک طرف کر دیا جائے تو سٹالن کی روسی ریاست کا موازنہ صرف ایک فاشسٹ ریاست سے ہی کیا جاسکتا ہے۔اس عفریت کو غیر مشروط طور پر ایک مزدور ریاست قرار دینا ایک مکروہ حرکت ہے۔

''مزدور ریاست یا سرمایہ داری'' کے سوال کے فوری جواب کا مطالبہ بظاہر ایک واضح تعریف اور سیاسی استقلال کی خوبی کا حامل دکھائی دیتا ہے۔لیکن سماجی کی طرح فطرت میں بھی غیر مختتم عوامل سے نمٹتے وقت کسی حتمی حل کو نافذ کرنے کی کوشش وضاحت کا نہیں بلکہ لامتناہی غلطیوں اور پراگندگی کا موجب بنتی ہے۔جب سوال عبوری تشکیلات کا ہو تو سیاہ وسفید یا ہاں اور نہ میں حل کا مطالبہ کسی دانشورانہ کٹر پن کو نہیں بلکہ محض ایک رسمی منطق کے تابع ذہن کو آشکار کرتا ہے جو کسی مسئلے کو ''حل'' کرنے کی جلدی میں بلا سوچے سمجھے خارجی تعریف کا اطلاق کرتے ہوئے حقیقی عوامل سے تمام رابطہ منقطع کر لیتا ہے۔رسمی مشابہتیں بھی یہاں کسی کام نہیں آتیں۔روس میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی کوئی حقیقی مثال یورپی تاریخ میں سلطنت روم کے زوال کے بعد کہیں نہیں ملتی۔

اگر سرمایہ داری کی جانب تحریک پایہ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے تو اس کا مطلب اکتوبر انقلاب کی تمام حاصلات کی تباہی ہوگا۔مثال کے طور پر فرانسیسی انقلاب کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا جہاں جیکوبی تحریک کی

تمام حاصلات پر 1794ء کی تھرمیڈورین رجعت نے پانی پھیر دیا تھا۔اس کے بعد رجعت کی سمت تحریک بہت دور تک گئی،تھرمیڈور سے نظامت پھر بونا پارٹ ازم،سلطنت کی بحالی اور ایک نئی اشرافیہ اور یہاں تک کہ 1815ء کے بعد انگریزی اور پروشین سنگینوں کے بل پر بوربن مطلق العنانی بھی بحال کردی گئی۔ تاہم ان تمام تبدیلیوں کے دوران 93-1789ء کے انقلاب کے بنیادی سماجی و معاشی ثمرات قائم و دائم رہے۔ بنیادی سوال ان نئے ملکیتی رشتوں کا تھا جو بڑی جاگیروں کو توڑ کر ان کی بنیادوں پر بہت سے چھوٹے کسان مالکان کے وجود میں آنے سے قائم ہوئے تھے۔

اسی طرح روس میں سٹالنسٹ بیوروکریسی کے سیاسی انقلاب نے مزدوروں کی سوویت جمہوریت کا مکمل خاتمہ کر دیا لیکن اکتوبر انقلاب کے قائم کردہ نئے ملکیتی رشتوں کو تباہ نہیں کیا۔حکمران بیوروکریسی نے قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو اپنی بنیاد بنایا اور پیداواری قوتوں کی ترقی میں ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کیا لیکن جیسا کہ ٹراٹسکی نے جنگ سے پہلے (جبکہ معیشت 20 فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کر رہی تھی) اس جانب توجہ دلاتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ داری کی نسبت اس کی قیمت تین گنا زیادہ ادا کرنا پڑی تھی جس کی وجہ زبردست ضیاع بدعنوانی اور بدانتظامی تھی۔جس مسئلے کا آج ہمیں سامنا ہے وہ 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں میں ٹراٹسکی کو بھی پیش آیا تھا جب اسے سٹالن ازم کے مظہر کا تجزیہ کرنا پڑا تھا۔بعض الٹرا لیفٹ سے تعلق رکھنے والوں کیلئے یہ مسئلہ بہت سیدھا سادہ تھا۔ان کی رائے کے مطابق سوویت یونین 1920ء میں ہی ایک نئے طبقاتی سماج میں تبدیل ہو چکا تھا لہٰذا مزید تجزیہ بالکل بے سود تھا۔اس رسمی مظقیت اور ٹراٹسکی کے محتاط جدلیاتی طریقہ کار میں ایک بنیادی فرق تھا۔اس نے نہایت باریک بینی سے سٹالنسٹ ردانقلاب کے عمل کے تمام مراحل کا کھوج لگا کر اس کے تمام تضادات کو ننگا کیا، سوویت سماج اور بذات خود بیوروکریسی کے اندر موجود متضاد رجحانات کا تجزیہ کیا اور روس کے اندر اور عالمی پیمانے پر ہونے والی تبدیلیوں کے جدلیاتی ربط باہم کو ظاہر کیا۔

ٹراٹسکی نے اپنے تجزیے کے طریقہ کار کی وضاحت یوں کی ہے:

''سوویت نظام حکومت کی تعریف عبوری یا درمیانی مرحلے کے طور پر کرنے کا مطلب ہے کہ سرمایہ داری (اور اس کے ساتھ ساتھ ریاستی سرمایہ داری) اور سوشلزم جیسے مکمل سماجی زمروں کو ترک کر دیا جائے۔ لیکن بذات خود مکمل طور پر ناکافی ہونے کے علاوہ ایسی تعریف یہ غلط تصور پیدا کر سکتی ہے موجودہ سوویت نظام حکومت سے صرف سوشلزم کی طرف ہی عبور ممکن ہے۔درحقیقت سرمایہ داری کی طرف واپس پھسلنے کا

امکان بھی پوری طرح موجود ہے۔اس لیے ایک زیادہ جامع تعریف لازمی طور پر پیچیدہ بھی ہوگی اور ثقیل بھی۔

''سوویت یونین سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان موجود ایک متضاد سماج ہے جس میں (a) پیداواری قوتیں ریاستی ملکیت کو ایک سوشلسٹ کردار عطا کرنے کے حوالے سے بہت ناکافی ہیں۔(b) قلت سے پیدا شدہ ابتدائی ارتکازِ زر کا رجحان منصوبہ بند معیشت کے ان گنت سوراخوں کے راستے بہہ جاتا ہے۔(c) بورژوا کردار کا حامل اصول تقسیم، سماج کی نئی سماجی تفریق کی بنیادوں میں موجود ہے۔(d) معاشی ترقی محنت کرنے والوں کے حالات کو دھیرے دھیرے بہتر کرتی ہے مگر ایک مراعات یافتہ پرت کی تشکیل نہایت تیز رفتاری سے کرتی ہے۔ (e) سماجی مخاصموں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیوروکریسی نے خود کو ایک ایسے بے قابو ٹولے میں تبدیل کرلیا ہے جو سوشلزم کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ (f) وہ سماجی انقلاب جس کے ساتھ حکمران پارٹی نے غداری کی تھی ابھی تک ملکیتی رشتوں اور مشقت کرنے والوں یعنی عوام کے شعور میں موجود ہے۔ (g) اکٹھے ہونے والے تضادات کی مزید ترویج سوشلزم کی جانب بھی لے جاسکتی ہے اور واپس سرمایہ داری کی طرف بھی۔(h) سرمایہ داری کے راستے پر چلنے کی صورت رد انقلاب کو مزدوروں کی مزاحمت کو ختم کرنا ہوگا اور سوشلزم کی جانب بڑھنے کی صورت میں مزدوروں کو بیوروکریسی کا تختہ الٹنا ہوگا۔آخری تجزیے میں قومی اور عالمی سطح پر اس سوال کا فیصلہ جیتی جاگتی سماجی قوتوں کی جدوجہد کے ذریعے ہوگا۔''

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نظریہ پرست اس قیاسی تعریف سے مطمئن نہیں ہونگے۔وہ حتمی فارمولا پسند کریں گے ہاں، ہاں اور نہ، نہ۔عمرانی مسائل یقیناً زیادہ آسان ہوجاتے اگر سماجی مظاہر ہمیشہ ایک مکمل طے شدہ کردار کے حامل ہوتے۔تاہم اس سے زیادہ خطرناک بات کوئی نہیں ہوسکتی کہ منطقی کاملیت کی خاطر حقیقت سے ان عناصر کو یکسر خارج کردیا جائے جو آج آپ کے بنائے ہوئے خاکے پر پورے نہیں اترتے اور ہوسکتا ہے کل اس کا تختہ مکمل طور پر الٹ دیں۔ہم نے اپنے تجزیے میں ایسی سماجی تشکیلات کے ساتھ زیادتی سے پہلو تہی کرنے کی پوری پوری کوشش کی ہے جن کی ہمارے پاس کوئی نظیر یا مشابہت موجود نہیں۔سائنسی اور سیاسی فریضہ یہ نہیں کہ کسی نامکمل عمل کی مکمل تعریف فراہم کی جائے بلکہ یہ ہے اس کے تمام مراحل کا جائزہ لیا جائے،اس کے ترقی پسندانہ رجحانات کو اس کے رجعتی رجحانات سے الگ کیا جائے،ان کے باہمی تعلق کو آشکار کیا جائے،اس کے ارتقا کی ممکنہ صورتوں کی پیش بینی کی جائے اور اس

پیش بینی میں عمل کے لئے بنیاد تلاش کی جائے۔'' (1)

سوویت یونین کی طبقاتی نوعیت کا مسئلہ ٹراٹسکی کی موت تک اس کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ وہ آخر تک سوویت یونین کے آئندہ ارتقا کے سوال پر ہمیشہ انتہائی مشروط انداز میں بات کرتا تھا جبکہ جنگ کی صورت میں اس کا بااصول موقف یہ تھا کہ سوویت یونین کا دفاع کیا جائے۔ اسے سٹالنسٹ نظام حکومت کے اتنی مدت تک قائم رہنے کی توقع نہ تھی جتنی دیر یہ رہا۔ یہ بجا ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب ''سٹالن'' میں یہ ضرور لکھا تھا کہ ہوسکتا ہے یہ نظام حکومت اپنی موجودہ شکل میں کئی دہائیوں تک قائم رہے لیکن اس کے قتل کے وقت یہ کتاب نامکمل تھی اور وہ اپنے اس خیال کی مزید ترویج نہیں کر پایا۔ جنگ کے بعد میں نے بہت سی تحریروں کے ذریعے، جو اس وقت بہت کم قارئین تک پہنچی تھیں، پرولتاری بونا پارٹ ازم کے بارے میں ٹراٹسکی کے تجزیئے کو مزید وسعت اور ترویج دینے کی کوشش کی تھی۔

بلاشبہ مارکسی نقطہ نظر سے ریاست کی طبقاتی نوعیت کا تعین ملکیتی رشتوں سے ہوتا ہے۔ تاہم یہاں بھی یہ تعلق خود کار نہیں بلکہ جدلیاتی ہے۔ ریاست حکمران طبقے کا براہ راست اظہار نہیں ہونی چاہیے، یہ حکمران طبقہ بورژوا ہو یا مزدور۔ بعض مخصوص حالات میں حکمران ٹولہ مختلف طبقات کے درمیان جگہ بناتے ہوئے مروجہ ملکیتی رشتوں کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ شام، برما، ایتھوپیا، اور افغانستان میں فوجی ٹولوں نے ایسا ہی کیا تھا اور مجھے یقین ہے کہ صرف ہم نے ہی اپنی دستاویزات کے ذریعے اس کی وضاحت کی تھی۔ اب روس اور مشرقی یورپ میں ہمیں اس نوعیت کے عمل کی ایک عجیب وغریب قسم کا سامنا ہے لیکن یہ بالکل الٹ ہے۔

سٹالن ازم میں بونا پارٹ ازم کی غیر معمولی قسم کی وضاحت صرف اس حقیقت کے ذریعے کی جاسکتی ہے کہ ریاست نے خود کو سماج سے بالاتر کرلیا ہے۔ ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی کہ بیوروکریسی اور بالخصوص اس کی بالائی پرتیں ناگزیر طور پر اپنی قوت اور مراعات کے تحفظ کی ضمانت کیلئے خود کو حکمران طبقے میں تبدیل کرلیں گی۔ حالات کے مخصوص تاریخی کردار کے تحت بیوروکریسی کے بورژوا دوست دھڑے نے وقتی طور پر برتری حاصل کرلی ہے۔

عالمی سامراج اور سوویت سماج کے مساموں میں پہلے سے موجود کروڑوں بدمعاشوں، نودولتیوں اور کالا دھندا کرنے والوں پر مشتمل نوزائیدہ بورژوازی کی حمایت سے وہ خانہ جنگی کا سامنا کیے بغیر پہلے ہی اس سمت میں ایک لمبا فاصلہ طے کرچکے ہیں۔ ردانقلاب کے لیے استعمال ہونے والا یہ ایک عجیب و

غریب میکینزم ہے۔لیکن یہ اس ''مزدور ریاست'' سے زیادہ عجیب وغریب نہیں ہے جس سے اس کا ظہور ہوا ہے یا جس عجیب وغریب طریقے سے مشرقی یورپ، افریقہ اور ایشیا میں پرولتاری بوناپارٹسٹ حکومتوں نے خود کو قائم کیا تھا۔

ٹراٹسکی کی توقع کے برعکس اس وقت تک بیوروکریسی کا بورژوا دھڑا پرامن طور پر ردانقلاب برپا کرنے میں محض جزوی طور کامیاب ہوا ہے۔ جزوی طور پر لیکن مکمل طور پر نہیں۔ یہ عمل پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا۔خوفناک سماجی ومعاشی تباہی کے باعث نہ صرف مزدور طبقہ بلکہ بیوروکریسی کا ایک حصہ بھی دوسری جانب پھرنا شروع ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ عمل بالآخر خانہ جنگی پر منتج ہو۔اس پیش منظر کا انحصار مزدور طبقے کی تحریک پر ہے اور کسی حد تک اس بات پر بھی کہ فوج کا ردعمل کیا ہوگا۔اس سوال کا فیصلہ قبل از وقت نہیں کیا جاسکتا اس کا دارومدار قومی اور بین الاقوامی پیمانے کے عوامل کے ایک پورے سلسلے پر ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انقلاب اور ردانقلاب کے کلاسیکی نمونوں سے ہر وہ شخص واقف ہے جس نے لینن کی تحریر کردہ چند سطریں بھی پڑھ رکھی ہیں۔لیکن تاریخ بہت سی دیگر انواع سے بھی واقف ہے۔ انیسویں صدی میں جاپان میں جاگیرداری سے سرمایہ داری کی طرف عبور کا مرحلہ بیوروکریسی کے میکینزم کے ذریعے طے ہوا جو ایک مخصوص صورت حال کے تحت بغیر کسی انقلاب یا خانہ جنگی کے ایک طبقاتی بنیاد سے دوسری طبقاتی بنیاد منتقل ہو گیا۔ بلاشبہ سرمایہ داری کی طرف عبور بالکل خالص نہیں تھا، اس میں جاگیرداری کے کئی عناصر موجود تھے جن کا خاتمہ (ایک اور عجیب وغریب انداز میں) چینی انقلاب کے دباؤ کے تحت 1945ء میں قابض ہونے والی امریکی افواج نے کیا۔ یہ تمام واقعات ریاست کے سوال کی زبردست پیچیدگی کو مزید واضح کرتے ہیں۔ 1989ء میں مشرقی یورپ میں پرانا نظام بغیر کوئی سسکی لیے ختم ہو گیا۔اسی طرح مخصوص حالات کے تحت ایک بڑی مزدور تحریک کے مقابلے میں جسے پیٹی بورژوا طبقے کے ایک بڑے حصے کی حمایت بھی حاصل ہو، مغربی بورژوا نظام کا انہدام بھی ممکن ہے۔تاریخ یقیناً ہر نوع کے تغیرات سے آگاہ ہے!

مسلسل تخمینے

جیسا کہ مارکس نے مدتوں پہلے وضاحت کی تھی، تاریخ سے ماورا کسی خاکے یا منصوبے جیسی کسی

شے کا وجود نہیں۔ضروری ہے کہ مادی معروضی حقیقت کو جوں کا توں سامنے رکھا جائے اور پھر اس کی وضاحت کی جائے۔ یہ مارکسی فلسفے کا طریقہ کار ہے۔معروضی حقیقت کو صرف جوں کا توں دیکھنا ہی نہیں بلکہ اسے وجود میں لانے والے عوامل، اس میں موجود تضادات، سماجی حرکت کے جس قانون کی وہ نمائندگی کرتی ہے اور مستقبل میں تغیرات و تضادات کے جو عوامل اس کا احاطہ کریں گے، ان کی وضاحت کرنا بھی ضروری ہے۔اس کی پیدائش، نشوونما، زوال پذیری اور ان تغیرات پر مبنی عمل جو اس کی تباہی کا باعث بنیں گے۔

ٹراٹسکی نے ''مارکس ازم کے دفاع میں'' اس طریقہ کار کا خاکہ پیش کیا ہے جس طرح ایک مارکسی روسی ریاست کی طبقاتی نوعیت کے سوال کو اٹھائے گا۔

''(۱) سوویت یونین کا تاریخی آغاز کیا ہے؟

(۲) اپنے وجود کے تمام عرصے میں اس میں کون کون سی تبدیلیاں آئیں؟

(۳) کیا یہ تبدیلیاں مقدار کے مرحلے سے معیار کے مرحلے میں داخل ہوئیں؟ یعنی کیا انہوں نے ایک نئے استحصالی طبقے کے تاریخی طور ضروری غلبے کی تشکیل کی؟''

1923-36ء کے عرصے میں نوکر شاہانہ رد انقلاب کی راہ میں کئی موڑ آئے۔ یہ واقعہ مقدر نہیں تھا۔سٹالن کی آخری فتح کا تعین پہلے سے نہیں ہو چکا تھا۔حقیقت یہ ہے کہ 1934ء تک ٹراٹسکی کا خیال یہ تھا کہ سوویت ریاست اور کمیونسٹ پارٹیاں، دونوں کی اصلاح ممکن ہے اور اس پوزیشن کی وجہ سے الٹرالیفٹ کے ساتھ اکثر و بیشتر تصادم بھی ہوئے۔ٹراٹسکی کا جدلیاتی طریقہ کار مسلسل تخمینوں پر مبنی تھا جو اس عمل کے تمام مراحل کا احاطہ کرتا تھا اور روس میں طاقتوں کے طبقاتی توازن، کمیونسٹ پارٹی کے اندر مختلف رجحانات اور طبقات سے ان کے تعلق، عالمی صورت حال کے ارتقا، معیشت اور داخلی عامل کے درمیان رشتے کو ٹھوس انداز میں ثابت کرتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ مختلف اوقات میں اس نے اپنے تجزیے میں ردوبدل کیا تھا۔مثلاً ابتدائی طور پر اس نے سٹالن ازم کو نوکر شاہانہ مرکزیت قرار دیا لیکن بعد ازاں اسے زیادہ درست پرولتاری بوناپارٹ ازم کی اصطلاح کے حق میں مسترد کر دیا۔ یہ تبدیلیاں ٹراٹسکی کی طرف سے کسی تذبذب کی نہیں بلکہ صرف اس طریقہ کار کی عکاسی کرتی ہیں جس کے ذریعے اس کے تجزیئے نے نہایت درستگی کے ساتھ نوکر شاہانہ انحطاط کے عمل کا قدم بہ قدم احاطہ کیا تھا۔

روس کے حالیہ واقعات کے بارے میں ہمارے تجزیئے کا طریقہ کار ٹراٹسکی کے طریقہ کار سے کسی

بھی طور مختلف نہیں۔اس بات میں قطعاً کوئی شبہ نہیں کہ روس میں سرمایہ داری کی جانب بڑھنے والی تحریک نہ صرف موجود ہے بلکہ کافی آگے بڑھ چکی ہے۔تاہم مارکسی تجزیئے کی رو سے یہ مسئلہ انجام کو نہیں پہنچ گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا سرمایہ داری کی بحالی کا عمل اس فیصلہ کن مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں مقدار معیار میں تبدیل ہو جاتی ہے؟ یہی سوال دوسرے انداز میں یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ کیا ہم سمجھتے ہیں کہ نئے ملکیتی رشتوں نے غیر مبہم طور پر خود کو اس قدر مستحکم کر لیا ہے کہ یہ عمل ان پلٹ ہو گیا ہے؟ یا اس کے برعکس سرمایہ داری کی جانب بڑھنے والی اس تحریک کا رخ واپس موڑا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے جواب پر بہت سی چیزوں کا دارومدار ہے۔اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اس سوال کا انتہائی احتیاط سے جائزہ لیا جائے۔ روسی ریاست کی طبقاتی نوعیت کا تعین کرنے کیلئے نجی ہاتھوں میں موجود معیشت کی شرح کا حوالہ دینا کافی نہیں ہے۔ضروری ہے کہ تمام عمل کا تجزیہ مجموعی طور کیا جائے،اس میں شامل مختلف طبقاتی قوتوں کے درمیان موجود رشتوں کو آشکار کیا جائے اور بتایا جائے کہ مرکزی تضاد کے کس طرح حل ہونے کا امکان ہے۔

ایسی مزدور ریاست کا وجود بھی ممکن ہے جہاں ذرائع پیداوار صد فیصد نجی ملکیت میں ہوں اور ایک ایسی بورژوا ریاست کا بھی جہاں یہ صد فیصد ریاستی ملکیت میں ہوں۔اول الذکر صورت کی مثال پیرس کمیون تھا۔تاریخ کی پہلی مزدور ریاست نے بینک آف فرانس کو بھی قومی ملکیت میں نہیں لیا اور جیسا کہ مارکس نے وضاحت کی تھی یہ غلطی اس کی سنجیدہ ترین غلطیوں میں سے تھی۔روسی انقلاب کے اولین مرحلے میں بھی بالشویکوں نے صنعت کو فوری طور پر قومیانے کے اقدامات نہیں کیے۔مزدوروں کا کنٹرول سوویتوں کے ذریعے تھا اور تقریباً بارہ ماہ تک زیادہ تر صنعت مضبوطی کے ساتھ نجی ہاتھوں میں موجود رہی۔ اگر سرمایہ دارانہ رد انقلاب سوویت اقتدار کا تختہ الٹ دیتا تو بھی یہی تضاد موجود رہتا۔برسبیل تذکرہ اکتوبر انقلاب کے بعد ایک عشرے تک یہ ایک حقیقی امکان تھا۔صرف لینن اور ٹراٹسکی کی درست پالیسیوں کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔اگر بخارین کا نقطہ نظر فتح یاب ہو جاتا تو 1920ء کی دہائی میں بھی سرمایہ داری کی بحالی ہو سکتی تھی۔ایک طرف تو یہ حقیقت اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ کس طرح تاریخی عوامل خود کار یا پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتے جیسا کہ معاشی جبریت پسندوں کا خیال ہے اور دوسری طرف یہ داخلی عامل کے فیصلہ کن کردار کو ظاہر کرتی ہے۔

سوال کو اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں یوں رکھا جا سکتا ہے کہ اگر ہٹلر سوویت یونین کو شکست

دینے میں کامیاب ہوجاتا تو کیا ہوتا؟ فاتح انتہائی بہیمانہ سرمایہ دارانہ ردانقلاب کے پروگرام کے ساتھ سوویت یونین میں ایک فسطائی نظام حکومت مسلط کر دیتے۔ لیکن وہ یہ سب کچھ فوری طور پر کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔ جیسا کہ ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی انہیں بتدریج آگے بڑھنا پڑتا، وہ زراعت سے آغاز کرتے پھر ہلکی صنعت اور بالآخر بھاری صنعت کے فیصلہ کن شعبے کی ریاستی ملکیت کا خاتمہ ہوتا۔ اس بات کا امکان تھا کہ بھاری صنعت کا ایک بڑا حصہ ریاست کے ہاتھوں میں رہتا جو اس کے باوجود اول تا آخر ایک بورژوا ریاست ہی رہتی۔ یہ مثالیں اس عمومی مفروضے کی درستگی کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہیں کہ کسی ریاست کی طبقاتی نوعیت کا تعین کرنے کیلئے محض ملکیت کے اعداد شمار شائع کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔ اس سمت کا تعین کرنا بھی ضروری ہے جدھر سماج جا رہا ہے اور لینن کے الفاظ میں ''کون غالب آئے گا'' ہماری نظر میں ابھی ان سوالات کا حتمی جواب دینا ممکن نہیں۔

روس میں بورژوا انقلاب کی میکانیات پر بات کرتے ہوئے ٹراٹسکی وضاحت کرتا: ''بورژوا سماج نے اپنی تاریخ کے سفر میں کئی سیاسی حکومتوں اور نوکر شاہانہ ٹولوں کو راستے سے ہٹایا ہے مگر اس نے سماجی بنیادوں کو تبدیل نہیں کیا۔ اس نے اپنے پیداواری طریقوں کی برتری کے ذریعے خود کو جاگیردارانہ اور دست کارانہ تعلقات کی بحالی کے خلاف محفوظ رکھا ہے۔''

ریاستی اقتدار یا تو سرمایہ دارانہ ترقی میں معاون بنا ہے یا اس نے راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں۔ لیکن بالعموم پیداواری قوتوں نے مسابقت اور نجی ملکیت کی بنیاد پر اپنی تقدیر خود بنائی ہے۔ اس کے برعکس سوشلسٹ انقلاب سے جنم لینے والے ملکیتی رشتے ناقابل تقسیم طور پر نئی ریاست سے بندھے ہوتے ہیں جو ان کا مخزن ہوتی ہے۔ پیٹی بورژوا رجحانات اور سوشلسٹ رجحانات کے غلبے کی ضمانت معیشت کا خود کار نظام فراہم نہیں کرتا کیونکہ ہم ابھی اس سے بہت دور ہیں، بلکہ اس کی ضمانت پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کے اٹھائے ہوئے سیاسی اقدامات فراہم کرتے ہیں۔ لہٰذا معیشت کے مجموعی کردار کا دارومدار ریاستی اقتدار کے کردار پر ہوتا ہے۔

ہم پر فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم بتائیں کہ روسی ریاست کی طبقاتی نوعیت کیا ہے۔ لیکن اس کا جائزہ لازمی طور پر جدلیاتی نقطہ نظر سے لیا جانا چاہیے نہ کہ رسمی منطق کے نقطہ نظر سے۔ یہاں بھی ہمارا واسطہ ایک ایسے عمل سے ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوا لہٰذہ کسی مکمل اور حتمی تعریف کے تقاضے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ سارے عمل کو ایک اکائی کے طور پر دیکھنا اور اس مقام کا تعین کرنا ضروری ہے جہاں فیصلہ کن علیحدگی واقع

ہوتی ہے۔قبل ازیں دی گئی تاریخی مثالوں میں جواب بالکل واضح ہے۔ جب پیرس کے مزدوروں نے پرانی ریاستی مشینری کو پاش پاش کیا تو انہوں نے سیاسی اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے کر سماج کو تبدیل کرنے کا فریضہ شروع کردیا۔ اگر وارسائی رجعت نے کمیون کا تختہ نہ الٹ دیا ہوتا تو وہ ناگزیز طور پر سرمایہ داروں کو بے دخل کرنے کی طرف بڑھتا۔ مزدور ریاست اور استحصالیوں کے ہاتھوں میں موجود معیشت کے درمیان تضاد کو کسی نہ کسی طرح حل کیا ہی جانا تھا۔ فرانس میں یہ اس وقت حل ہوا جب بورژوا طبقے نے کمیون کو کچلنے کے لیے مطلق العنانیت پسندوں اور رجعت پسندوں سے ساجھے داری کرلی۔ روس میں بالشویکوں نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی بے دخلی کیلئے ریاستی اقتدار کو استعمال کیا۔

تسلسل میں ایسا ہی فیصلہ کن رخنہ اس سے بالکل متضاد عمل میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ ہٹلر کو سوویت یونین پر فتح ایک زبردست فوجی شکست کے نتیجے میں ہی حاصل ہوسکتی تھی۔ فاتح فسطائی پرانی ریاستی مشینری کو توڑ کر اس کی جگہ نئی مشینری لاتے جو ان کی ضرورتوں کو پورا کرسکتی۔ یہ سچ ہے کہ پرانی سٹالنسٹ بیوروکریسی کا ایک حصہ تعاون کرتا اور نازی ریاست کا حصہ بن جاتا لیکن اس سے یہ حقیقت نہیں بدلتی کہ تبدیلی لانے کیلئے انتہائی متشددانہ جدوجہد ہوتی۔ کیا یہ نقطہ نظر رکھنا ممکن ہے کہ ایسی ہی فیصلہ کن تبدیلی اس وقت واقع ہوچکی ہے؟

کس مقام پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک معیاری تبدیلی واقع ہوچکی ہے؟ اگر معیشت کا بیشتر حصہ تمام فیصلہ کن شعبوں سمیت، مضبوطی سے نجی مالکان کے ہاتھوں میں ہوتا تو یہ ایک بنیادی تبدیلی کو ظاہر کرتا۔ ایک منصوبہ بند معیشت کے قوانین حرکت کی جگہ منڈی کے قوانین لے لیتے۔ ہم ایک بالکل مختلف صورت حال کا سامنا کررہے ہوتے۔ یہ درست ہے کہ اس وقت پرانا نظام ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اگرچہ سرمایہ داری کی جانب پیش رفت کیلئے زبردست کوششیں جاری ہیں تاہم پرانے نظام کی جگہ کسی نئی اور مستحکم چیز نے نہیں لی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمام صورت حال ابھی تک نامکمل، غیر مستحکم اور بہاؤ میں ہے۔

مسئلہ کی تفہیم

سماج کے ارتقا کا تجزیہ کرتے وقت معیشت کو لازماً غالب عامل خیال کیا جانا چاہیے۔ اس معاشی بنیاد پر ترویج پانے والا بالائی ڈھانچہ یا سپر سٹرکچر خود کو اس بنیاد سے علیحدہ کرلیتا ہے اور اس کا مخالف بن

جاتا ہے۔ انقلاب کی مارکسی تھیوری کا نچوڑ یہ ہے کہ معیشت فیصلہ کن ہے کیونکہ بالآخر بالائی ڈھانچے کو مروجہ ملکیتی رشتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہونا ہی پڑتا ہے۔ جب ہم ایک بار سماج کے بنیادی معاشی ڈھانچے کو کسوٹی ماننے سے انکار کر دیتے ہیں تو ہر طرح کی سطحی اور من مرضی کی شکلوں کی تعمیر ممکن ہو جاتی ہے۔ تاہم محض یہ اثباتی بیان ناکافی ہے کہ آخری تجزیے میں ریاست کی طبقاتی نوعیت کا فیصلہ ملکیتی رشتوں سے ہوتا ہے۔

سرمایہ کے پیش لفظ میں مارکس نے وضاحت کی ہے تمام پیداواری رشتوں کا مجموعہ وہ حقیقی بنیاد فراہم کرتا ہے جس پر ریاست سمیت سماجی زندگی کی تمام جہتیں استوار ہوتی ہیں۔ ملکیتی رشتے ان پیداواری رشتوں کا محض قانونی اظہار ہیں۔ بہرحال یہ تعلق نہ تو براہ راست ہے اور نہ ہی خودکار۔ اگر یہ بات ہوتی تو انقلاب ضروری نہ ہوتا۔ طبقاتی سماج کی ساری تاریخ ثابت کرتی ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے برعکس بالائی ڈھانچہ لمبے عرصوں تک پیداواری قوتوں کے ساتھ کھلے تضاد کی حالت میں قائم رہ سکتا ہے، نہ ہی ریاست کسی مخصوص سماج کے اندر حکمران طبقے کی براہ راست عکاسی کرتی ہے جیسا کہ ہم اس کتاب کے پہلے حصے میں دیکھ چکے ہیں۔ یہ رشتہ پیچیدہ اور متضاد ہے یعنی دوسرے الفاظ میں جدلیاتی ہے۔

سوویت یونین اس جدلیاتی رشتے کی ایک اچھی مثال ہے۔ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کا نوکر شاہانہ ریاست سے تضاد تھا۔ ایسا ہمیشہ سے تھا۔ پہلے پانچ سالہ منصوبوں کے دوران بھی نوکر شاہانہ نظام زبردست ضیاع کا ذمہ دار تھا۔ معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ تضاد غائب نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس مزید ناقابل برداشت ہوتا گیا یہاں تک کہ بالآخر نظام مکمل طور پر ناکام ہو گیا۔

سٹالن ازم اور سرمایہ داری کے بحرانوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ آخرالذکر کا بحران منڈی کی طوائف الملوکی اور نجی ملکیت کا نتیجہ ہے۔ اس میں قومی ریاست کے محدود کر دینے والے کردار کا اضافہ بھی ضروری ہے جس کی افادیت ختم ہو چکی ہے اور اب وہ پیداواری قوتوں کے راستے میں زبردست رکاوٹ بن چکی ہے۔ یہ چیز واضح کرتی ہے کہ سب سے بڑی سپر پاور بھی عالمی منڈی میں شرکت پر کیوں مجبور ہے۔ مارکس نے اس کی پیش گوئی بہت پہلے کر دی تھی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک ملک میں سوشلزم کا تصور ایک رجعت پسندانہ یوٹوپیا کیوں ہے۔

اس کے برعکس سوویت یونین کا بحران ایک قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت اور ایک نوکر شاہانہ

آمریت کے درمیان غیر ہم آہنگی کا نتیجہ تھا۔مختلف بیماریوں کے علاج مختلف ہوتے ہیں۔سرمایہ داری کے بحران کے حل کا تقاضا ہے کہ نجی ملکیت اور منڈی کی طوائف الملوکیت کا خاتمہ کیا جائے۔ایک لحاظ سے اسے جزوی طور پر پہلے ہی بڑی اجارہ داریوں کے ذریعے حاصل کیا جا چکا ہے۔(اگرچہ سرمایہ داری کے تحت اسے مکمل طور پر کبھی بھی حل نہیں کیا جا سکتا)۔ان اجارہ داریوں کے اندر ایک قسم کی منصوبہ بندی موجود ہے۔ وہ جدید ترین پیداواری طریقے استعمال کرتی ہیں اور یہاں تک کہ کمپیوٹروں اور جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے نہایت درستگی کے ساتھ اپنی اشیا کے لیے منڈی کا حساب کتاب بھی لگا سکتی ہیں۔عین وقت پر پیداوار کا مظہر ثابت کرتا ہے کہ سوشلزم کے تحت پیداوار کے جمہوری منصوبے کی بنیاد پر کیا کچھ ممکن ہوگا۔

تاہم جیسا کہ مارکس نے قبل از وقت دیکھ لیا تھا اجارہ داریوں کے دور نے سرمایہ داری کے مرکزی تضادات کو ختم نہیں کیا بلکہ صرف انہیں زیادہ تند اور وسیع کردار عطا کیا ہے۔سرمایہ داری کی طوائف الملوکی ختم نہیں ہوتی بلکہ عالمی منڈی کے بڑے حصے کیلئے اجارہ داریوں کی باہمی کشمکش میں دوبارہ رونما ہو جاتی ہے۔اس میں وہ قومی ریاست ان اجارہ داریوں کی مدد کرتی ہے جس سے ان کا تعلق ہوتا۔''کثیر القومی'' کا لفظ حقیقتاً ایک غلط نام ہے۔اگرچہ ان کے کاروبار عالمی ہیں لیکن انہوں نے اپنا قومی اداروں والا کردار کھویا نہیں۔کوئی نہیں سوچتا کہ جنرل موٹرز ایک امریکی فرم نہیں یا مٹسوبیشی جاپانی نہیں،تاہم عالمگیریت کا مظہر، جو محض عالمی منڈی پر غلبے کا اظہار کرنے کا ایک مختلف طریقہ ہے، درحقیقت ایک عالمی منصوبہ بند معیشت اور عالمی سوشلزم کی ضرورت کا اعتراف ہے۔ مارکس نے جب درج ذیل سطور تحریر کیں تو اس کا یہی مطلب تھا:

''عالمی منڈی کے معاملے میں فرد واحد کا سب کے ساتھ تعلق،مگر ساتھ ہی ساتھ اس تعلق کی فرد واحد سے آزادی،اتنی اونچی سطح تک ترقی پا چکے ہیں کہ عالمی منڈی کی تشکیل پہلے ہی اپنے اندر وہ حالات سموئے ہوئے ہے جو اس سے آگے جانے کیلئے درکار ہیں۔''

محنت کی بین الاقوامی تقسیم ایک حقیقت ہے۔مگر سرمایہ داری کے تحت یہ ایک خوفناک،منصوبہ بندی سے عاری اور پر انتشار کردار اپناتی ہے۔اس کا سب سے نمایاں اظہار نام نہاد شمال جنوب کی تقسیم اور غیر ترقی یافتہ دنیا کے ذمے واجب الادا زبردست قرضہ ہے جو اس وقت 1900 بلین ڈالر ہے۔ دنیا کی مخالف تجارتی بلاکوں میں تقسیم اس کا ایک اور اظہار ہے۔بینکوں اور بڑی اجارہ داریوں کی عالمی سرگرمیاں

آئندہ کچھ عرصے میں عالمی کساد بازاری کی راہ ہموار کریں گی جس کی شدت اور وسعت 1929ء کے کریش جیسی ہو سکتی ہے۔

اب ایسی صورت حال میں یہ امر یقینی ہے کہ جہاں طاقتور اجارہ داریاں ہر براعظم میں منڈیوں کے لیے لڑ رہی ہیں، جہاں ایک بٹن دبا کر بے شمار سرمایہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک منتقل کیا جا سکتا ہے اور جہاں عالمی پیمانے پر ہونے والی قیاس آرائی اور سٹے بازی پر کئی ٹریلین ڈالر لگے ہوئے ہیں ان کے ذریعے بحران سے بچنے کی کوشش بالآخر ایک ایسے گہرے بحران کو جنم دے گی جس کی وسعت ماضی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو گی۔

لہٰذا ایک منصوبہ بند معیشت کی ضرورت عالمی سرمایہ داری کی موجودہ صورت حال سے براہ راست پیدا ہو رہی ہے۔ تضادات کو حل کرنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ لیکن روس میں ایک سرمایہ دارانہ نظام حکومت از سر نو مسلط کرنے کی کوشش کسی بھی طور سٹالن ازم کے بحران کا فطری نتیجہ نہیں تھی۔ یہ بات ناگزیر ہرگز نہیں تھی۔ یہاں داخلی عامل نے غالب کردار ادا کیا۔ یہ سٹالنسٹ حکمران پرت کے گھٹیا پن کے خلاف ایک تباہ کن تبصرہ ہے کہ اکتوبر انقلاب کے اسی سال بعد انہوں نے اقتدار مزدور طبقے کو واپس دینے کی بجائے سوویت یونین کو سرمایہ دارانہ بربریت کی طرف واپس دھکیلنے کو ترجیح دی۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جو موجودہ کتاب کے مصنف کے نزدیک خارج از امکان تھی۔ اور ایک عرصے تک یہ حقیقتاً خارج از امکان رہی۔ جب تک سوویت یونین میں پیداواری قوتیں فروغ پاتی رہیں سرمایہ داری کا حامی رجحان معمولی تھا۔ لیکن سٹالن ازم کے تعطل نے صورت حال کو یکسر تبدیل کر دیا۔

بیوروکریسی کا اقتدار اتنا عرصہ کیوں قائم رہا؟

روس، چین، مشرقی یورپ اور پرولتاری بوناپارٹ ازم پر مبنی دیگر نظاموں میں بیوروکریسی کے موجودہ ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ سمجھا جائے کہ اول الذکر تاریخی طور پر کس طرح ظہور پذیر ہوا۔ پرولتاری بوناپارٹ ازم کا ظہور سرمایہ داری کے تحت عالمی پیمانے پر پیداواری قوتوں کے تعطل اور مغرب میں پرولتاری انقلاب میں تاخیر کے باعث ہوا۔ ان حالات میں سرمایہ داری کے بحران کا اظہار پیداواری قوتوں کو ریاستی تحویل میں لیے جانے کے عمومی رجحان کی شکل میں ہوا۔ سرمایہ دارانہ نظام

میں بعداز جنگ معاشی ابھار کے دور میں پیداواری قوتوں پر ریاستی غلبے کے اس عالمی رجحان نے ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں ریاست کو آگے آنے میں مدد دی (کینشین ازم اور ''ملی جلی معیشت'' وغیرہ)۔ عالمی تجارت میں زبردست وسعت کے ساتھ ساتھ دیگر عوامل کے علاوہ ایک عامل یہ بھی تھا جس نے جزوی اور عارضی طور پر نظام کی قیود پر قابو پا کر ایسے نتائج حاصل کئے جن کی نظیر سرمایہ داری کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ اب یوں دکھائی دیتا ہے کہ یہ عمل الٹ ہوگیا ہے۔ یہ حقیقت نجی ملکیت کی حدود کی بہت واضح طور پر نشاندہی کرتی ہے۔ بڑی وجہ یہی تھی جس کے باعث سٹالنسٹ حکومتیں توقعات سے کہیں زیادہ عرصہ قائم و دائم رہیں۔

پیداواری قوتوں کو ریاستی تحویل میں لیے جانے کا رجحان جو کہ نجی ملکیت کی حدود سے آگے بڑھ چکا ہے، انتہائی ترقی یافتہ معیشتوں اور یہاں تک کہ انتہائی رجعتی نوآبادیاتی ممالک میں بھی دکھائی دیتا تھا۔ نام نہاد تیسری دنیا کے ممالک میں سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پیداواری قوتوں کے مسلسل اور بلاتعطل فروغ کا کوئی امکان موجود نہیں۔ پیداوار یا تو جمود کا شکار ہو جاتی ہے یا گر جاتی ہے۔ سابقہ نوآبادیاتی ممالک میں عوام کی پشت پر سوار ہو کر برسر اقتدار آنے والی قومی بورژوازی نیشنلائزیشن کے اقدامات پر مجبور تھی۔ بورژوا خطیب مثلاً ناصر، نکرومہ، کنیاٹا، نہرو، سکارنو اور نائریرے خود کو ''سوشلسٹ'' کہتے تھے۔ یہ حقیقت جدید دور میں سرمایہ داری کو درپیش تعطل کی عکاسی کرتی ہے، یعنی سماج کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت کا فقدان بالخصوص ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی پس ماندہ معیشتوں میں۔

1950ء کی دہائی کے دورن اور 1960ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں میں سوویت منصوبہ بند معیشت نے اونچی شرح ترقی کو برقرار رکھا۔ بیوروکریسی محسوس کرتی تھی کہ وہ ایک ترقی پسند قوت ہے۔ اس کی خوداعتمادی کی عکاسی 1961ء میں ہونے والی بائیسویں پارٹی کانگریس میں خروشیف کی اس تقریر سے ہوتی ہے جب اس نے شیخی بگھاری تھی کہ سوویت یونین بیس برس کے اندر اندر تمام شعبوں میں امریکہ پر بازی لے جائے گا۔ مزدور طبقہ بیوروکریسی کے تمام تر جرائم کے باوجود وقتی طور پر اسے برداشت کرنے کو تیار تھا کیونکہ پیداواری قوتوں کو فروغ دینے میں وہ ابھی تک ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کر رہی تھی۔

1948ء سے 1975ء تک کے عرصے میں عالمی سرمایہ داری عالمی تجارت میں فروغ اور کسی حد تک ''ریاستی سرمایہ داری'' کے اقدامات کے ذریعے اپنے مرکزی تضادات پر عارضی طور پر قابو پانے میں

کامیاب رہی۔تاہم جیسا کہ مارکسٹوں نے پیش گوئی کی تھی کینشین پالیسیوں کے باعث ناگزیر طور پر افراط زر میں دھماکہ خیز اضافہ ہوا۔جزوی ریاستی تحویل نے مسائل کو حل نہیں کیا اور محض نئے تضادات تخلیق کیئے۔اس حقیقت کے ادراک نے گزشتہ عرصے میں مخالف سمت میں رجحان پیدا کیا ہے۔یہ چیز بذات خود اس حقیقت کا اظہار ہے کہ عالمی سرمایہ داری کا بعد از جنگ کا پورا ماڈل جس نے کچھ عرصے تک شاندار نتائج فراہم کیے تھے،اب اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ایسے طریقوں کی طرف واپسی کی کوشش جو''معمول'' کے زیادہ قریب ہوں عالمی پیمانے پر مزید ہنگاموں کو جنم دے گی۔ہمیں عالمی جنگوں کے درمیانی دور میں اپنائی گئی متوازن بجٹوں اور مستحکم مالیات کی کلاسیکی پالیسیوں کے اثرات کو یاد رکھنا چاہیے۔

سرمایہ کاری کیلئے کسی شعبے کی تلاش میں بورژوازی مایوسی کے عالم میں قومیائی ہوئی صنعتوں اور عوامی خدمت کے اداروں کی نج کاری کے ذریعے ریاست کو لوٹنے پر اتر آتی ہے۔یہ چیز سرمایہ داری میں کسی ترقی پسندانہ تبدیلی کی نمائندگی کرنے کی بجائے اس کے تعطل کو ظاہر کرتی ہے۔بلاشبہ فوری طور پر یہ بڑی اجارہ داریوں کے لیے زبردست منافع کا باعث ہے۔لیکن ایسا صرف مزید فیکٹریوں کی بندش، معیار زندگی میں گراوٹ اور ریاستی اخراجات میں کی جانے والی کٹوتیوں کے باعث ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ منڈی کے مزید سکڑنے اور بحران کے گہرا ہونے کی صورت میں برآمد ہوگا۔ان پالیسیوں کے سلسلے میں بورژوازی کے جوش وخروش سے یہ پرانی کہاوت سچ ثابت ہوتی ہے کہ دیوتا جنہیں تباہ کرنا چاہتے ہیں انہیں پہلے پاگل کرتے ہیں۔

وہ اپنے ممالک میں ان پالیسیوں کے نتائج پر ہی قانع نہیں بلکہ وہ ساری دنیا کو ان کا شکار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سرمایہ کاری کے شعبے کی یہی تلاش انہیں سابقہ نوآبادیاتی ممالک کو بھی نج کاری کے اسی راستے پر چلنے کیلئے مجبور کرنے کی طرف لے جاتی ہے۔ماضی میں نوآبادیاتی بورژوازی اس قابل تھی کہ ایک طرف سامراج اور دوسری طرف روس اور چین جیسی مسخ شدہ مزدور ریاستوں کے درمیان توازن قائم کر سکے۔اب یہ ناممکن ہے۔اب وہ شکاری سامراج کیلئے اپنی منڈیاں کھولنے پر مجبور ہیں۔اب ان کی قومی صنعتیں نہایت سستے داموں فروخت ہوتی ہیں اور مقامی سرمایہ داری کے ہاتھ نہیں بلکہ بڑی کثیر القومی کمپنیوں کے ہاتھ۔آنے والے دور میں یہ چیز سرمایہ داری اور سامراج کے خلاف زبردست دھماکے کی راہ ہموار کرے گی۔

ہر عمل کا مساوی اور مخالف سمت رد عمل ہوتا ہے۔اس قانون کا اطلاق محض طبیعات پر ہی نہیں بلکہ

کسی حد تک سماج پر بھی ہوتا ہے۔ نج کاری کی مہم بالآخر اپنی حدود کو پہنچ کر ریاستی تحویل میں لیے جانے کا رجحان دوبارہ ابھرے گا۔ بہرحال پچھلے تقریباً دس برسوں میں ریاستوں غلبے کے خلاف ردعمل نے بظاہر کچھ نتائج فراہم کیے اور یہ دور 1982ء سے 1990ء کے معاشی ابھار سے ہم آہنگ تھا۔ اس سے روس اور مشرقی یورپ کے ارتقا پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔

ٹراٹسکی ہمیشہ عالمی سرمایہ داری اور روس میں سٹالن ازم کے عروج کے درمیان جدلیاتی رشتے کو پیش کرتا تھا۔ اس نے وضاحت کی تھی کہ اگر سرمایہ داری عالمی پیمانے پر کمزوری کا شکار نہ ہوتی تو روس میں آنے والی رجعت پسندی کے نتیجے میں سرمایہ داری بحال ہوجاتی۔ 1930ء کی دہائی میں پہلے پانچ سالہ منصوبوں کی زبردست کامیابیاں سرمایہ داری کی تاریخ کی عظیم ترین کساد بازاری سے ہم زمان تھیں۔ اگرچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سرمایہ داری سنبھل گئی اور امریکہ اور مغربی یورپ میں پانچ سے چھ فیصد شرح ترقی حاصل کی جبکہ جاپان میں یہ شرح مزید بلند تھی مگر سوویت معیشت نے اس سے بھی بہتر اوسط شرح ترقی حاصل کی یعنی دس یا گیارہ فیصد جو کساد بازرای، بے روزگاری یا افراط زر سے مبرا تھی۔

ان حالات میں روس میں موجود پرولتاری بوناپارٹ ازم پر مبنی نظام نہ صرف خود کو قائم رکھنے کے قابل ہوا بلکہ اس نے خود کو مستحکم بھی کیا۔ چین کے ہمراہ اس نے سابقہ نوآبادیاتی دنیا کے عوام کے لیے ایک اہم حوالے کے طور پر کام کیا۔

بہرحال ان وجوہات کی بنا پر جن کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے 1960ء کی دہائی کے وسط تک نوکرشاہی کے غلبے تلے چلنے والا یہ منصوبہ بند معیشت پر مبنی نظام اپنی آخری حدود کو پہنچ گیا۔ 1970ء کی ساری دہائی میں سوویت یونین میں ترقی کی شرح مسلسل گرتی رہی۔ مشرقی یورپ کی صنعتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ مسخ شدہ مزدور ریاستوں میں بھی یہی صورت حال تھی۔ اپنی ابتدائی کامیابیوں کے باوجود پرولتاری بوناپارٹ ازم سماج کے مسائل کو حل نہیں کرسکا۔ درحقیقت یہ ایک خوفناک تاریخی انحراف تھا جو حالات کے ایک عجیب و غریب تاریخی تسلسل یا ربط کا نتیجہ تھا۔ سامراج کا بے رحمانہ دباؤ، جس میں اس نے سماج کی انتہائی وحشیانہ قوتوں کو استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا، موزمبیق، انگولا اور افغانستان میں پرولتاری بوناپارٹسٹ حکومتوں کے خاتمے کا باعث بنا۔ ایتھوپیا میں مینگسٹو حکومت بھی قومی سوال کی چٹان سے ٹکرا کر ڈوب گئی جو ساری تاریخ میں تمام سٹالنسٹ حکومتوں کی کمزوری رہا ہے۔

چین میں صورت حال مختلف تھی۔ زیادہ پس ماندہ بنیاد سے آغاز کرنے کے باعث چینی

بیوروکریسی کی پوزیشن کم وبیش ویسی ہی تھی جیسی 1930ء کی دہائی میں روس میں سٹالنسٹ بیوروکریسی کی تھی۔فرق کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ اس وقت بیجنگ دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ پیداواری قوتوں کو ترقی دے رہا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک ایک نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کرنے کے قابل ہے۔اگرچہ سرمایہ داری کے اہم عناصر موجود ہیں مگر بیوروکریسی ریاست پر آہنی گرفت قائم رکھے ہوئے ہے۔متناقض طور پر یہی چیز چین کو بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے اس قدر پر کشش بناتی ہے اگرچہ آنے والے وقت میں یہ چیز نہایت آسانی سے اپنی ضد میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

فی الحال روس اور مشرقی یورپ کی صورت حال کے برعکس پیداوار کی تیز رفتار ترقی سے چینی بیوروکریسی کی نسبتاً مستحکم حیثیت کی وضاحت ہوتی ہے۔حکمران ٹولہ اپنے تاریخی فریضے کے حوالے سے پر اعتماد ہے۔اس کا محرک یقیناً جزوی طور پر اس کی آمدنی،مراعات اور طاقت کا تحفظ اور فروغ بھی ہے لیکن اس کے مدنظر ایک جدید اور طاقتور چین کی تخلیق بھی ہے(جو اس کے زیر غلبہ ہو)۔بیجنگ حکومت کی کامیابی سے شمالی کوریا اور یہاں تک کہ شاید ویت نام کے حکمرانوں کی بھی امیدیں بندھی ہوئی ہیں جہاں سرمایہ داری کی بحالی کی جانب پیش رفت یا تو معمولی ہے یا بالکل نہیں ہے۔چین ان ممالک کے لیے تقویت کا باعث ہے۔اگر اس نے سرمایہ داری کی راہ اپنائی تو ان کا بھی خاتمہ ہوجائے گا۔تاہم جب تک پرانی نسل کے لوگ غالب ہیں اس بات کا امکان کم ہے۔سابقہ سٹالنسٹوں کی طرح وہ بھی خالصتاً تجربیتی سوچ سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔انہوں نے روس میں ہونے والی تباہی سے سبق سیکھا ہے اور اس راہ پر چلنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔

بہرحال ڈینگ کی وفات کے بعد بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان بالادستی کی نئی جدوجہد کا آغاز ہوچکا ہے۔روس کی طرح چین کے آئندہ ارتقا کا تعین بھی اس تصادم کے نتیجے سے ہوگا۔

کتنی نج کاری؟

ٹراٹسکی نے اپنی کتاب ''انقلاب سے غداری'' میں روس میں سرمایہ داری کی بحالی کے مختلف امکانات پیش کیے تھے:

''سوویت نظام کا انہدام ناگزیر طور پر منصوبہ بند معیشت کے انہدام کی طرف لے جائے گا اور اس

طرح ریاستی ملکیت کے خاتمے پر منتج ہوگا۔ٹرسٹوں اوران میں شامل فیکٹریوں کے درمیان موجود مجبوری کا رشتہ ختم ہوجائے گا۔زیادہ کامیاب ادارے آزادی کا راستہ اختیار کرنے میں کامیاب رہیں گے۔وہ شاید خودکوسٹاک کمپنیوں میں تبدیل کرلیں یا شاید ملکیت کی کسی عبوری شکل کوڈھونڈ نکالیں مثال کے طور ایسی شکل جس میں مزدور بھی منافعوں میں حصہ دار بن جائیں۔ساتھ ہی ساتھ اجتماعی فارم بھی ٹوٹ جائیں گے اور کہیں زیادہ آسانی کے ساتھ۔اگر ایک نئے سوشلسٹ اقتدار نے اس کی جگہ نہ لی تو موجودنوکرشاہانہ آمریت کے زوال کا مطلب سرمایہ دارانہ رشتوں کی طرف واپسی ہوگا جس سے صنعت اور ثقافت تباہ کن زوال کا شکار ہوجائے گی۔''(5)

جس شاندار انداز میں ٹراٹسکی نے روس میں اس وقت رونما ہونے والی تبدیلیوں کے بنیادی خطوط کی پیش بینی کی تھی وہ حیران کن ہے۔تاہم ہمیں اس میں اہم فرق بھی دکھائی دیتے ہیں۔اس وقت روس میں طاقتوں کا طبقاتی توازن بالکل مختلف ہے۔مثال کے طور پر ٹراٹسکی کو یقین تھا کہ سرمایہ داری کی بحالی کو زیادہ سماجی حمایت کسانوں سے حاصل ہوگی جبکہ معاملہ اس کے برعکس۔اس کی وجہ یہ ہے کہ سٹالنسٹ نظام اس سے کہیں زیادہ عرصے تک قائم رہا جتنا ٹراٹسکی کے خیال میں ممکن تھا۔قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کے باعث ممکن ہونے والی پیش رفت سے کسان طبقہ بالکل غائب ہوگیا۔جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں اس وقت روس کی دیہی آبادی تقریباً سب کی سب زرعی مزدوروں پر مشتمل ہے جسے چھوٹے چھوٹے نجی قطعہ ہائے اراضی کی طرف واپسی سے کوئی دلچسپی نہیں۔چھوٹے چھوٹے غیر پیداواری قطعہ ہائے اراضی پر دیر تک کام کرنے کا خیال ان کو بالکل نہیں بھاتا جس کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دیہی آبادی زیادہ تر بڑی عمر کے لوگوں پر مشتمل ہے۔جیسا کہ گورباچوف کو نیم دلانہ زرعی اصلاحات کی کوشش کے دوران معلوم ہوگیا تھا،ایسی پیش کش قبول کرنے والوں کی تعداد نہایت معمولی ہے۔اس کے بعد سے صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔جیسا کہ دی اکانومسٹ وضاحت کرتا ہے''دوسال کی انقلابی اصلاحات کے بعد بھی 26,692 ریاستی اور اجتماعی فارموں پر کام کرنے والے دوکروڑ ستر لاکھ (27 ملین)افراد کی زندگیاں بمشکل ہی متاثر ہوئی ہے''۔اسی جریدے نے کچھ قنوطیانہ تاریخی مشابہتوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے''غلام کسانوں کوآزادی دلانے والے الیگزینڈر دوئم کو بم سے اڑا دیا گیا تھا۔نکولس دوئم کے عظیم اصلاح پسند وزیراعظم پیوٹرسٹولیپن کو گولی ماردی گئی۔''

یہ سچ ہے کہ آخر کار کسی ریاست کی طبقاتی نوعیت کا تعین کرنے میں ملکیتی رشتوں کے سوال کو فیصلہ

کن حیثیت حاصل ہونی چاہئے۔تاہم جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ باہمی تعلق ہمیشہ خودکار نہیں ہوتا۔فیصلہ کن مرحلوں پر کسی سماجی و معاشی تشکیل کی منزل کے تعین کا فیصلہ متصادم طبقاتی قوتوں کی جدو جہد کے ذریعے ہوتا ہے۔اس عمل کے دوران ہر طرح کی عجیب وغریب عبوری اشکال ممکن ہیں جن کی جانچ پڑتال ان کے عبوری اور نامکمل کردار کے باعث آسان نہیں ہوتی۔یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ روس میں سرمایہ داری کی بحالی کا عمل شروع ہو چکا ہے۔درحقیقت یہ کافی آگے بڑھ چکا ہے۔مگر اس سے معاملہ ختم نہیں ہو گیا۔ہر مرحلے پر صورت حال کا از سرِ نو جائزہ لینا ضروری ہے۔سرمایہ داری کی جانب پیش رفت کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی ہے؟ سامراجی دباؤ کے تحت روسی حکومت نے اداروں کی ایک بہت بڑی تعداد کی نج کاری کی ہے۔اس کے باوجود مغرب شکوک وشبہات میں مبتلا ہے۔ان شکوک کا واضح اظہار مغرب کی طرف سے سنجیدہ سرمایہ کاری کی عدم موجودگی سے ہوتا ہے۔1994ء کے آخر تک روس میں بیرونی سرمائے کی مقدار اسٹونیا میں ہونے والی سرمایہ کاری سے زیادہ نہیں تھی۔

نج کاری جس حد تک ہوئی اس کے بارے میں ہر قسم کے دعوے کیے جا رہے ہیں۔حقیقی صورت حال کا تعین ہمیشہ آسان نہیں ہوتا۔مثال کے طور پر عام طور پر نجی شعبے کی مجموعی داخلی پیداوار میں شرح کا حوالہ دیا جاتا ہے لیکن دوسری جانب ایک نجی کمپنی کی تعریف عام طور پر غیر واضح ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے امداد باہمی کے ادارے اور دیگر فرمیں شامل کر دی جاتی ہیں جو زیادہ تر یا جزوی طور پر ریاستی ملکیت میں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ شرح بھی مصنوعی طور پر اونچی ہوتی ہے جس کی وجہ ریاستی صنعتوں کی گراوٹ ہے۔

منطقی طور پر ڈی نیشنلائزیشن کے پروگرام کا آغاز چھوٹی ورکشاپوں اور اس شعبے سے ہوا جسے آجکل خدمات کا شعبہ کہا جاتا ہے۔12 مارچ 1994ء کو شائع ہونے والے اکانومسٹ جریدے نے رپورٹ دی کہ ''1993ء کے آخر تک ملک کے بہت سے علاقوں میں کم وبیش تمام دکانیں، ریسٹوران اور ورک شاپس وغیرہ نجی ہاتھوں میں پہنچ چکی تھیں۔'' بڑے اداروں کو قومی تحویل سے نکالنے کے عمل کا آغاز دسمبر 1992ء میں ہوا جب 18 فرمیں ایسے پرائیویٹائزیشن واؤچرز کے بدلے ''فروخت'' کی گئیں جو ہر روسی شہری کو بلا معاوضہ مہیا کیے گئے تھے۔

اس طرح کاغذوں میں 1993ء کے دوران 8010 درمیانے اور بڑے سائز کے اداروں کی نج کاری عمل میں لائی گئی۔ان میں 83 لاکھ یا دوسرے لفظوں میں روس کے پیداواری شعبے سے منسلک

افرادی قوت کا 2/5 حصہ کام کرتا تھا۔

بہر حال صورت حال اس قدر سیدھی سادی نہیں ہے جیسی ان اعداد وشمار میں دکھائی دیتی ہے۔ فروری 1993ء میں ماسکو نیوز نامی اخبار نے گلہ کیا کہ ''رجسٹرڈ شدہ چھوٹے کاروباروں میں سے نصف نے کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ 30 فیصد بمشکل گذارہ کر رہے ہیں اور صرف 3.4 فیصد کا خیال ہے کہ وہ پھل پھول رہے ہیں۔'' جہاں تک بڑے اداروں کا تعلق ہے اصلاحات کے حامی گروہ بابلوکو کے سربراہ گریگوری یافلنسکی نے اس قسم کی نج کاری کی عجیب وغریب نوعیت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ ''اب تک جو کچھ ہوا وہ نج کاری نہیں بلکہ اشتراک ہے جس میں مزدور اور منتظمین اپنے اداروں کا نظم ونسق سنبھال لیتے ہیں۔ ان کا مفاد سرمایہ کاری میں نہیں بلکہ تنخواہوں میں اضافے میں ہے۔ یہ ایک نیا مسئلہ ہے جو اس قسم کی نج کاری سے پیدا ہوا ہے۔'' سابق وزیر برائے نج کاری اناطولی چوبائس نے ایک تحریر ''روس کی نج کاری'' میں اعتراف کیا ہے اور کہا ہے کہ اکثر اوقات مزدور اور منتظمین حصص کا ستر فیصد سے زیادہ حصہ لے جاتے ہیں اور آخر میں کہتا ہے کہ ''بظاہر منتظمین کو ملنے والی رعایتیں بہت بڑی دکھائی نہیں دیتیں مگر حقیقت میں وہ بہت زیادہ ہیں۔''

جنوری 1994ء تک چھوٹے اداروں کی اسی فیصد تعداد فروخت کی جا چکی تھی اور 14000 درمیانے اور بڑے سائز کے اداروں کی نج کاری ہونے والی تھی۔ 22 مارچ 1994ء کے فنانشل ٹائم میں جان لائیڈ نے لکھا ''تاہم نج کاری شدہ اداروں کی مالی حالت بھی عام طور پر ریاستی اداروں سے بہتر نہیں (بعض اوقات بدتر) ہے اور تقریباً تیس فیصد فروختوں میں بدعنوانی ہوئی ہے (ان کے بقول جنہوں نے سکیورٹی سروس کے تخمینے دیکھے ہیں۔)''

ڈی نیشنلائزیشن کا عمل کس حد تک جا چکا ہے؟ نج کاری کے مکمل ترین اعداد وشمار یورپی بینک برائے ترقی وتعمیر نو کی سالانہ عبوری رپورٹ میں شائع ہوئے ہیں جو خصوصی طور پر مشرقی یورپ اور سابقہ سوویت یونین (ایف ایس یو) کے ممالک کے مارکیٹ اکانومی کی طرف عبور کی ''تعریف اور پیمائش'' کے لیے وقف تھی۔ 1995ء کی رپورٹ میں سابقہ سٹالنسٹ ریاستوں کی معیشتوں کے بارے میں تفصیلی اعداد وشمار شامل ہیں۔ ہم نے اسے 1996ء کے وسط میں شائع ہونے والی رپورٹ پر ترجیح دی ہے کیونکہ اس میں مختلف اقسام کی نج کاری کا زیادہ مفصل تجزیہ شامل ہے۔ گذشتہ بارہ ماہ میں نج کاری میں مزید اضافہ ہوا ہے لیکن اس قدر نہیں کہ مجموعی صورت حال ہی تبدیل ہو جائے۔

1996ء کے وسط میں ای بی آر ڈی نے مجموعی داخلی پیداوار میں نجی شعبے کے حصے کے بارے میں جو تخمینے دیئے ہیں ان میں خاصا فرق ہے۔ چیک ریپبلک میں 75 فیصد، اسٹونیا میں ستر فیصد، یوکرائن مالدوا اور ازبکستان میں 40 فیصد، آزربائیجان میں 25 فیصد، تاجکستان اور ترکمانستان میں 20 فیصد اور بیلا روس میں محض 15 فیصد۔ روسی جمہوریہ کے لیے یہ اعداد و شمار 60 فیصد دیئے گئے ہیں مگر قریبی جائزے سے یہ گمراہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ ان تمام ریاستوں میں معیشت کے فیصلہ کن حصے بدستور ریاست کے ہاتھوں میں ہیں۔ دوسری جانب جسے نج کاری قرار دیا جا رہا ہے وہ بہت سی صورتوں میں ایک عجیب وغریب جانور ہے۔ دیوالیہ پن اور بندش سے بچنے کیلئے بڑے اداروں کے بیوروکریٹوں نے مزدوروں کے ساتھ مل کر فرم ''خرید'' لی اور اگلے ہی روز اسے چالو رکھنے کیلئے ریاست سے چھوٹ کا مطالبہ کر دیا۔ عملاً یہ بات بالکل واضح نہیں ہے کہ ایسی فرموں کی صورت حال میں نج کاری سے پہلے اور نج کاری کے بعد کیا فرق ہے۔

ای بی آر ڈی کی 1995ء کی رپورٹ حقیقی نجی ملکیت (''خالص'' نجی شعبہ) اور نج کاری کی دیگر اقسام کو نہایت محتاط طریقے سے الگ الگ کرتی ہے مثلاً مزدوروں اور منتظمین کے خرید کردہ ادارے (غیر ریاستی شعبہ، غیر حکومتی وغیرہ وغیرہ) جنہیں وہ حقیقی معنوں میں سرمایہ دارانہ ادارے نہیں سمجھتی۔ اکثر اوقات یہ کمپنیاں رسمی طور پر نجی شعبے کا جزو ہونے کے باوجود ابھی تک ریاست سے جڑی ہوئی ہیں اور ان میں نجی سرمایہ یا تو نہایت معمولی ہے یا بالکل نہیں ہے۔ ای بی آر ڈی کا نجی شعبے اور ''غیر ریاستی'' شعبے کے فرق کو خصوصی طور پر الگ الگ کر کے دکھانا اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ یہ محض ایک غیر اہم تفصیل نہیں۔

روس میں ''غیر ریاستی'' شعبے کا تخمینہ 1994ء میں مجموعی داخلی پیداوار کا تقریباً 62 فیصد لگایا گیا تھا مگر حقیقی نجی شعبہ محض 25 فیصد تھا۔ یوکرائن کے بارے میں دیئے گئے اعداد و شمار مزید چونکا دینے والے تھے۔ 1993ء میں غیر ریاستی شعبہ 41 فیصد دکھایا گیا تھا مگر حقیقی نجی شعبہ محض 7.5 فیصد تھا (1995ء کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ اس ترکیب میں کچھ زیادہ تبدیلی واقع ہوئی ہوگی)۔ بیلا روس میں نج کاری نے بمشکل ہی کوئی پیش رفت کی ہے جہاں 1994ء میں غیر ریاستی شعبے کو 40.2 فیصد دکھایا تھا مگر حقیقی نجی شعبہ محض 6.2 فیصد تھا۔ لٹویا میں صورت حال بہت مختلف تھی۔ یہاں غیر ریاتی شعبہ زیادہ تر نجی اداروں پر مشتمل ہے اور غیر ریاستی شعبے میں کام کرنے والوں کے اعداد و شمار

(58 فیصد) اور نجی شعبے میں کام کرنے والوں کے اعداد و شمار (53 فیصد) کے درمیان فرق نہایت معمولی ہے۔

ریڈ فیکٹری ڈائریکٹرز

فرموں کی ایک نسبتاً بڑی تعداد جس نے واؤچر سسٹم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزدوروں اور منتظمین کی طرف سے خریداری سکیموں پر عمل درآمد کیا، منتظمین کی جانب سے اپنی ملازمتوں پر براجمان رہنے کی چال کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کی تصدیق اکانومسٹ جریدے نے کی تھی جس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''نج کاری نے محض ریڈ فیکٹری ڈائریکٹرز'' کی جائیداد کی ہوس کو قانونی شکل دی ہے۔ اپنی کمپنیوں کو مسابقت کے لیے بہتر طور پر تیار کرنے کی کوشش کرنے کی بجائے ان لوگوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مزدور حصہ داروں کے ساتھ معاملہ کرلیا جائے کہ جب تک کاروبار معمول کے مطابق چلتا رہے کسی منیجر کو برطرف نہ کیا جائے۔

بیوروکریسی کے صنعتی دھڑے کا سب سے بڑا مفاد یہ ہے کہ اپنے اداروں پر ہر قیمت پر کنٹرول قائم رکھا جائے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر اصلاحات کے پروگرام پر عمل درآمد ہوتا تو ان میں سے بہت سی فیکٹریاں بند ہو جاتیں۔ ان بیوروکریٹوں کی حقیقی پوزیشن کو ریشن لیبر ریویو میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں بہت اچھی طرح بیان کیا گیا ہے کہ ''سرمایہ دار بننے کے سحر میں گرفتار یہ منتظمین اکثر اوقات دیوالیہ، بے کار دھاتوں کے ڈھیروں میں بڑے حصے دار بننے کے امکان سے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔'' (6)

نج کاری پیداوار بڑھانے اور اداروں کی مسابقت کی صلاحیت بڑھانے کی نیت سے کی گئی تھی۔ اس کا متضاد اثر ہوا ہے۔ واؤچر سسٹم سے سرمایہ اکٹھا نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی اس سے ملکیت کا دائرہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد تک پھیل سکتا ہے۔ اکثر لوگوں نے خوراک کیلئے پیسہ حاصل کرنے کی غرض سے جس قدر جلد ممکن ہو سکتا تھا اپنے واؤچر فروخت کر دیئے۔ اسی طرح نااہل اور بدعنوان اجارہ داریاں معرض وجود میں آ گئی ہیں۔ یہ تباہی کا نسخہ ہے۔ ضخیم بین الادارہ جاتی قرضوں اور بڑی فرموں کے دیوالیہ ہو جانے کی صورت میں بڑے پیمانے کی جو بے روزگاری یقینی طور پر پیدا ہو گی اس کا مطلب ہے کہ ڈوما کی موجودہ ترکیب اور طاقتوں کے حقیقی توازن کے پیش نظر ریاست کو بڑی بڑی چھوٹوں کا سلسلہ جاری رکھنا ہو گا۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا صوت حال غیر نمو پذیر رہے گی۔ روس میں ملکیت کی ترکیب کے بارے میں

اپرل، اسٹرن اور لیشچنکو میں شائع ہونے والے اعداد وشمار سے پتا چلتا ہے کہ اتفاقیہ طور پر منتخب شدہ 439 صنعتی فرموں میں سے 110 پر منتظمین براجمان تھے اور محض 35 نجی سرمایہ داروں کی ملکیت تھیں جن میں روسی اور غیر ملکی دونوں شامل ہیں اور مزید 45 نئے ادارے وجود میں آئے تھے۔ نج کاری کے باوجود ریاست نے 30 فیصد فرموں کے اکثریتی حصص اپنی تحویل میں رکھے تھے۔ نج کاری شدہ کمپنیوں کی کم وبیش 70 فیصد تعداد میں مزدوروں اور منتظمین کے حصص 51 فیصد ہیں۔ روس، ہنگری، پولینڈ اور چیک ریپبلک میں ہونے والی نجکاری کے بارے میں ای بی آر ڈی کی 1995ء کی رپورٹ میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے:

''زیر جائزہ چاروں ممالک نے نج کاری کے بارے میں مختلف طرز عمل اپنائے ہیں جن کے نتیجے میں نج کاری شدہ شعبے میں مختلف سرکاری ڈھانچے وجود میں آئے ہیں۔ ڈھانچوں کے بارے میں کئی عارضی نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ اول، ریاستی ملکیت جو بہت حد تک داخلی ملکیت ہے اکثر ممالک میں بدستور اہمیت کی حامل ہے۔ دوئم، ایسی داخلی ملکیت جس میں مزدوروں کا حصہ غالب ہے اور یہ مبینہ طور پر منتظمین کے کنٹرول میں ہے، زیادہ تر روس میں اور کسی حد تک پولینڈ میں موجود ہے۔ سوئم، خارجی ملکیت بڑے پیمانے میں چیک ریپبلک میں ظاہر ہوئی ہے اور چھوٹے پیمانے پر ہنگری میں لیکن غالب خارجی ملکیت ہنگری میں زیادہ عام ہے اور اب اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ یہ مرکوزہ ملکیت ہو جسے کنٹرول کے زیادہ سخت حقوق حاصل ہوں۔''

یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ سرمایہ داری کی حکمت عملیاں وضع کرنے والے اس صورت حال کے سلسلے میں انتہائی محتاط رویہ اپنائے ہوئے ہیں جسے وہ واضح طور پر ایک عبوری مرحلہ خیال کرتے ہیں اور جو ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ ابھرنے والی تصویر ایک ایسی دوغلی معیشت کی ہے جس میں سرمایہ دارانہ عناصر ریاستی شعبے پر غلبے کی جدوجہد کررہے ہیں جو بدستور ایک طاقتور وجود رکھتا ہے۔ یہ عمل ایک ناہموار انداز میں آگے بڑھا ہے۔ چیک ریپبلک، ہنگری اور کسی حد تک پولینڈ میں یہ کافی آگے بڑھا ہے لیکن روس کی صورت حال، جو کہ فیصلہ کن سوال کا درجہ رکھتی ہے، عالمی سرمائے کے نقطہ نظر سے تسلی بخش انداز میں حل ہونے سے ابھی بہت دور ہے۔ 1996ء کی ای بی آر ڈی کی رپورٹ کے مطابق ''روس میں 94-1993ء کے درمیان واؤچر کی بنیاد پر ہونے والی نج کاری کے سبب 15,000 سے زائد درمیانے اور بڑے پیمانے کے اداروں کی ملکیت میں تبدیلی عمل میں آئی جن میں صنعتی مزدوروں کی اسی

فیصد سے زیادہ تعداد کام کرتی ہے۔ اس واؤچر سکیم میں مزدوروں اور انتظامیہ کو ترجیح دی گئی اور اس کی وجہ سے انتظامیہ پر اپنی کارکردگی کو بہتر بنانے کے سلسلے میں بیرونی مالکان کا دباؤ نہایت معمولی ہے۔ 1995ء کی پہلی تین سہ ماہیوں میں نقد رقم کی بنیاد پر ہونے والی نجکاری کے مرحلے کی ابتدا سست رفتاری سے ہوئی۔ اگرچہ کئی اداروں کی فروخت کی خاصی تشہیر کی گئی مگر ان میں سے کچھ کی نیلامیاں جن حالات میں ہوئیں وہ خاصے متنازعہ تھے۔ نج کاری کی رفتار 1996ء کے پہلے نصف عرصے میں سست پڑ گئی۔

رپورٹ کا سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں اس بات کا تعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سرمایہ داری کی بحالی کی جانب پیش رفت کس حد تک ہو چکی ہے۔ مصنفین نے سرمایہ داری کی جانب عبوری کے مرحلے کی کامیابی کے سلسلے میں چار الگ الگ چیزوں کی نشاندہی کی ہے۔ (1) نجی شعبے کی شرح پیداوار (2) منڈی کا سرگرم ہونا (3) مالیاتی شعبے کا کردار (4) قانونی نظام کی اصلاح۔ مختلف ممالک کو چاروں میں سے پوائنٹ دیئے جاتے ہیں۔ اس طرح مکمل طور سرمایہ دارانہ معیشت کا حامل ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ چار میں سے چار پوائنٹ حاصل کرے۔ ان میں سے ایک بھی ملک اس شرط پر پورا نہیں اترتا۔ چیک جمہوریہ، ہنگری اور اسٹونیا اس سے کافی قریب ہیں لیکن باقی سب کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہیں اور اکثریت ایک مناسب سکور کے حصول سے ابھی کافی دور رہے۔

ناگزیر طور پر اس میں استعمال ہونے والی درجہ بندیاں کسی حد تک بے قاعدہ ہیں۔ مثال کے طور پر نجی شعبے کی شرح فیصد کی بنیاد مکمل طور پر پیداوار پر رکھی گئی ہے۔ یہ ایک مسخ شدہ تاثر دیتی ہے کیونکہ اس میں زیر جائزہ فرم میں کام کرنے والوں کی تعداد اور اس کے اثاثوں کی مالیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

ان معلومات کے بغیر قومی معیشتوں کے مختلف شعبوں کے نسبتی وزن کے بارے میں کسی درست تصور کا حصول ناممکن ہے۔ علاوہ ازیں اس میں ریاستی شعبے کی پیداوار کی گراوٹ کو مدنظر نہیں رکھا گیا جس میں عام طور پر بڑے پیمانے کی بھاری صنعت بھی شامل ہوتی ہے اور اس طرح خدمات کے شعبے، چھوٹے کاروبار وغیرہ کو مبالغہ آمیز وزن اور اہمیت دیتی ہے۔ لہٰذا یہ بیان کہ ان ممالک کی اکثریت میں مجموعی داخلی پیداوار نصف سے زیادہ حصہ نجی شعبہ پیدا کرتا ہے، اگرچہ کافی اہم ہے لیکن فیصلہ کن ہرگز نہیں ہے۔

اگرچہ یہ چارٹ نامکمل اور قدرے بے قاعدہ ہے لیکن اس کے باوجود اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب بھی سابقہ سٹالنسٹ ریاستوں میں سے اکثر کے اندر سرمایہ داری کی بحالی کا عمل نامکمل ہے۔

آیئے ''بڑے پیمانے کی نج کاری'' کے کالم کا جائزہ لیتے ہیں۔ درجہ اول کا مطلب ہے ''نجی

ملکیت قابل ذکر نہیں''، درجہ دوئم کا مطلب ہے کہ ڈی نیشنلائزیشن کا عمل ابھی محض شروع ہوا ہے، درجہ سوئم کا مطلب ہے کہ بڑے پیمانے کے اداروں کی پچیس فیصد تعداد کی نج کاری عمل میں آ چکی ہے یا ''نج کاری کے مرحلے میں ہے'' اور درجہ چہارم کا مطلب ہے کہ پچاس فیصد سے زیادہ کی ڈی نیشنلائزیشن ہو چکی ہے۔

چہارم ایک ترقی یافتہ سرمایہ دار معیشت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جن 25 ممالک کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان میں سے تین کے علاوہ (چیک جمہوریہ، اسٹونیا اور ہنگری) بڑے پیمانے کے اداروں میں ریاستی شعبہ ابھی تک پچاس فی صد سے زیادہ کا احاطہ کرتا ہے۔ ''چھوٹے پیمانے کی نجکاری'' کا کالم ایک بالکل مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔ یہاں 14 ممالک نے چار پوائنٹس حاصل کیے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ 1996ء تک بھی مشرقی یورپ اور یہاں تک کہ روس میں بھی نجی شعبے کی بھاری اکثریت چھوٹے کاروباروں پر مشتمل تھی۔ کل پیداوار میں نجی شعبے کی بڑی شرح فیصد (روس میں یہ 60 فیصد ہے) زیادہ تر بھاری صنعت کے کلیدی شعبے میں تباہ کن گراوٹ کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن معیشتوں اور بالخصوص روزگار کی طویل المدت کامیابی کیلئے یہ فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔

اس جدول سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ سرمایہ داری کی بحالی کی رفتار انتہائی غیر ہموار ہے۔ کچھ ممالک میں اس کا بمشکل آغاز ہی ہوا ہے بیلا روس، آذربائیجان، تاجکستان، ترکمانستان اور یوکرائن بھی کافی پیچھے ہے۔

دیگر ممالک میں جن میں روس بھی شامل ہے یہ کافی آگے بڑھ چکی ہے لیکن رپورٹ احتیاط کی تاکید کرتے ہوئے خبردار کرتی ہے کہ ''منڈی کی اصلاحات کے سلسلے میں متاثر کن پیش رفت کے باوجود اس خطے کے زیادہ تر حصے میں مزید بڑے چیلنج ابھی سامنے آئیں گے بشمول ان ممالک کے جو منڈی کی جانب عبور میں آگے ہیں مثلاً وہ ممالک جو او ای سی ڈی کے رکن بن چکے ہیں (چیک جمہوریہ، ہنگری اور پولینڈ)'' اس میں مزید کہا گیا ہے کہ ''پرانے نظام سے وراثت میں ملنے والا تشکیل نو کا مسئلہ بہت بڑے پیمانے کا ہے، پیداواری خاکوں اور طریقہ کار کو منڈی کی معیشت کے حالات کے مطابق ڈھالنے میں کئی سال کا عرصہ لگ سکتا ہے۔ اس خطے میں نجی سرمایہ کاروں کے لیے سرمایہ کاری کی غرض سے طویل المعیاد فنانس تک رسائی ابھی تک محدود ہے۔'' علاوہ ازیں اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ زرعی مسئلے میں صورت حال زیادہ تر جوں کی توں ہے۔

لٰہذہ بین الاقوامی سرمائے کی حکمت عملیاں طے کرنے والوں کو اپنے سامنے بہت سی دشواریاں نظر آ رہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داری کو مستحکم ہونے میں کئی سال لگیں گے۔ لیکن اس مدت میں داخلی اور خارجی طور پر ہر طرح کی تبدیلیاں رونما ہوسکتی ہیں جن سے یہ عمل متاثر ہوسکتا ہے۔ مارکیٹ اکانومی کا تجربہ پہلے ہی ایک ردعمل کو جنم دے رہا ہے۔ البانیہ میں رونما ہونے والا حالیہ سکینڈل جہاں ایک اہرامی سکیم کی ناکامی کے باعث بہت سے لوگ تباہی کا شکار ہوئے ہیں اس کی ایک مثال ہے۔ اس کے نتیجے میں سارے البانیہ میں زبردست مظاہرے ہوئے ہیں اور ملک کے جنوبی شہروں میں بغاوت ہوئی ہے۔ یہ دھما کہ با آسانی بورژوا دوست حکومت کا تختہ الٹے جانے کا باعث بن سکتا ہے جس سابقہ سٹالنسٹ ریاستوں میں رونما ہونے والے انقلابی اقدام کا عندیہ ملتا ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ عالمی سرمایہ داری میں آنے والا ایک شدید بحران ان معیشتوں کو بہت بری طرح متاثر کرے گا۔ رپورٹ کی رو سے ''عبوری مرحلے کی کامیابی (یعنی ترقی کو بڑھاوا دینے کے حوالے سے) کیلئے ضروری ہے کہ اس دوران استحکام موجود رہے۔'' لیکن جیسا کہ البانیہ میں رونما ہونے والے واقعات سے ظاہر ہے اس کا امکان بہت کم ہے۔ صورت حال اس کے برعکس ہے۔

ری سٹرکچرنگ کے پرزور تقاضے کا مطلب ہے بڑے پیمانے کی صنعت کی وسیع پیمانے پر تباہی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی وسیع بے روزگاری۔ یہ نظام معاشی، سماجی اور سیاسی سطح پر ایک کے بعد دوسری اتھل پتھل سے گزریں گے۔

کیا یہ عمل پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے؟

کیا روس میں ایک ''نارمل'' سرمایہ دارانہ نظام کی کامیابی خارج از امکان ہے؟ نظری طور پر یہ خارج از امکان نہیں ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ سوال نظری طور نہیں بلکہ ٹھوس طریقے سے اٹھایا جائے۔ ایسا کن حالات میں ممکن ہوسکتا ہے؟ اگر مزدور طبقہ مجہول رہتا ہے، اگر بورژوا حکومت اپنی ''اصلاحات'' کے پروگرام کے موجودہ مرحلے پر کامیابی سے عمل درآمد کر سکتی ہے۔ اگر روس کسی سماجی دھماکے کے بغیر اڑھائی کروڑ سے زیادہ بے روزگاروں کو برداشت کر سکتا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اگر ہم عالمی پیمانے پر اس قسم کی سرمایہ دارانہ توسیع کے ایک نئے دور میں داخل ہو رہے ہیں جو

1948-74ء کے مقابلے کا ہو تو پھر کم وبیش یقینی طور پر روس سرمایہ دارانہ ترقی کی ایک ایسے دور میں داخل ہوسکتا ہے جو اسے تیزی سے دنیا کے طاقتور ترین ممالک کی صف میں کھڑا کر دے۔ اس بات کا اطلاق چین پر بھی ہوگا غالباً اس سے کہیں بڑھ کر۔ لیکن یہ اگر والی شرائط حقیقتاً بہت کڑی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مشرقی یورپ کے کچھ ممالک میں یہ عمل کافی آگے بڑھ چکا ہے بالخصوص چیک جمہوریہ، ہنگری اور پولینڈ میں۔ یہاں وہ ''کمیونسٹ'' لیڈر فیصلہ کن کردار ادا کر رہے ہیں جنہوں نے بورژوازی کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور اس کے مکروہ عزائم کی تکمیل کے لیے کام کر رہے ہیں۔ سامراجی اس سلسلے میں خاصے پر اعتماد ہیں۔ ان کا رویہ یہ ہے کہ اگر کمیونسٹ ہمارا کام کر رہے ہیں تو انہیں کرنے دو۔ بعد ازاں جب ان کی ساکھ خراب ہو جائے گی تو انہیں ٹھڈے مار کر باہر نکال دیں گے۔

اس وقت پولینڈ اور ہنگری میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت بورژوا طبقے کے ایجنٹوں کا کردار ادا کر رہی ہے لیکن اس میں بھی تبدیلی واقع ہوسکتی ہے خاص طور پر اگر مغرب میں کساد بازاری آتی ہے یا روسی منڈی سے تعلق یکلخت ختم ہوتا ہے۔ بہر حال اگر موجودہ صورت حال تین یا پانچ سال تک جاری رہتی ہے تو اس سے سرمایہ دارانہ رشتوں کو کسی حد تک مستحکم ہونے کا وقت ملے گا۔ بیوروکریسی کے فیصلہ کن حصے نے سرمایہ داری کو اپنا لیا ہے اور ''کمیونسٹ'' پارٹی کی قیادت نے اس پوزیشن کو قبول کر لیا ہے۔ درحقیقت ہنگری اور پولینڈ میں بورژوازی ''کمیونسٹ'' پارٹیوں کے ذریعے حکمرانی کر رہی ہے۔ یہ سب کچھ اس حقیقت کے باوجود ہو رہا ہے کہ عوام نے کمیونسٹوں کو ووٹ اِس لیے دیئے تھے کہ وہ سرمایہ داری کی مخالفت کریں، وہ چاہتے تھے کہ نظام سوشلسٹ ہو مگر ایک جمہوری بنیاد پر قائم ہو۔

تاہم روس اور مشرقی یورپ کے درمیان کہیں اہم فرق موجود ہیں۔ آخر الذکر کے لیے 'کمیونزم' باہر سے درآمد شدہ چیز تھی جبکہ روسی مزدوروں کے پاس جو واحد روایت موجود ہے وہ بالشوازم اور اکتوبر انقلاب کی ہے۔ یہ انکی تاریخ کا حصہ ہے۔ مشرقی یورپ میں سٹالنسٹ نظام چالیس سال سے کچھ ہی عرصہ زیادہ قائم رہا۔ روس میں انقلاب اور اسکی حاصلات کی یاد اس سے دگنے عرصے پر محیط ہے اور اجتماعی شعور میں گہری جڑیں پکڑنے کے لیے یہ عرصہ کافی طویل ہے۔ ان تمام وجوہات کی بنا پر بورژوازی کمیونسٹ پارٹی آف رشین فیڈریشن کو مشرقی یورپ کی پارٹیوں کے مقابلے میں ایک مختلف قسم کا جانور خیال کرتی ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ روسی مزدور طبقہ اس پر زبردست دباؤ ڈال سکتا ہے۔ مغرب کو سب سے زیادہ خوف اسی بات کا ہے۔ ممکن ہے اگر زیوگانوف کو اقتدار مل جائے تو وہ پولینڈ جیسی پالیسی پر

عمل درآمد کرے۔ درحقیقت حال ہی میں اس سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ وہ یلسن کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے پر رضامند ہے۔ مگران وجوہات کی بنا پر جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں یہ بات قطعاً یقینی نہیں کہ وہ ایسا کر بھی سکے گا۔

مارکسی تھیوری کی رو سے ایک نیا حکمران طبقہ صرف اس شرط پر ظہور پزیر ہو سکتا ہے اور خود کو مستحکم کر سکتا ہے کہ وہ ذرائع پیداوار کو ترقی دے۔ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ سٹالن ازم کی زوال کی وجہ یہ تھی کہ وہ ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک سے زیادہ اونچی شرحِ ترقی کے حصول کا اہل نہیں رہا تھا۔ آخری دور میں اس نے ذرائع پیداوار کو قطعاً کوئی ترقی نہیں دی۔ اس کا مطلب ہے کہ تباہی اس کا مقدر ہو چکی تھی جیسا کہ مارکس نے وضاحت کی ہے تاریخی طور پر بورژوازی ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ معیشت کو فروغ دیتی ہے اور وہ اس طرح انسانی سماج کی ایک اعلیٰ شکل کے لیے مادی بنیاد فراہم کرتی ہے یعنی سوشلزم کے لیے، یہ اسکے وجود کا واحد جواز ہے۔

انفرادی سرمایہ داری کے سلسلے میں بھی یہی بات درست ہے۔ مارکس انہیں محض پیداواری قوتوں کے مخزن خیال کرتا تھا۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ مزدوروں سے نچوڑی گئی قدر زائد کی سرمایہ کاری نئی پیداواری قوتوں میں کریں۔ یہ حقیقت ضمنی حیثیت رکھتی ہے کہ وہ ایسا لالچ کے باعث کرتے تھے اور بچوں کی محنت کا بے رحمانہ استحصال کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ جب تک وہ پیداوری قوتوں کو ترقی دیتے رہے وہ سماج کو آگے کی جانب بڑھاتے رہے۔ لیکن روس میں صورتحال کیا ہے؟ پچھلے چھ سالوں میں روس کے اندر پیداوار میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ اسکے برعکس دنیا کی معاشی تاریخ کا عظیم ترین انہدام ہوا ہے۔

یہ دلیل بھی دی جا سکتی ہے کہ موجودہ صورتحال عارضی ہے اور مستقبل بعید میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائیگا۔ لیکن جیسا کہ کینز نے ایک بار کہا تھا کہ اگر لمبی مدت کو مدِ نظر رکھا جائے تو ہم سب مردہ ہیں۔ تمام تر وعدوں کے باوجود روس میں بحالی کی کوئی علامت نظر نہیں آتی، 1996ء میں چھ فیصد مزید گراوٹ آئی حالانکہ بورژوا معیشت دان دس فیصد ترقی کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ کوئی بھی معیشت مستقل طور پر زوال پزیر نہیں رہ سکتی، 1997ء تا 1998ء میں کسی وقت تھوڑی بہت بحالی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کے کافی کمزور ہونے کا امکان ہے، دوسری بات یہ ہے کہ کسی بھی ترقی کو پچھلے چھ سال کے خوفناک انہدام کے پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ جیسا کہ اکانومسٹ جریدے نے 1997ء کی سالانہ رپورٹ میں طنزاً لکھا ہے کہ چٹان کی چوٹی سے گرنے والی کسی بھی چیز کا تھوڑا بہت اچھلنا یقینی امر

ہے، جلد یا بدیر کسی نہ کسی قسم کا توازن دوبارہ قائم ہونا لازمی ہے۔ لیکن کس قسم کا؟ نوزائیدہ بورژوازی کی انتہا درجہ کی کمزوری اور عمومی زوال وانتشار کے باعث یہ بات کم وبیش یقینی ہے کہ یہ توازن انتہائی غیر مستحکم کردار کا حامل ہوگا۔

روس کی پیداواری قوتوں کو نوکرشاہانہ نظام نے مصنوئی طور پر آگے بڑھنے سے روک رکھا تھا۔ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کے باعث انہیں زبردست فروغ حاصل ہوا تھا۔ مگر بیوروکریسی نے اسے تخریب کاری کا نشانہ بنایا۔ اس مسئلے کا واحد حل مزدور طبقے کے جمہوری کنٹرول اور انتظام کے ذریعے ممکن تھا جیسا کہ لینن کا ارادہ تھا۔ 1980ء کی دہائی میں موجودہ ترقی یافتہ معیشت کی بنیاد پر اسے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بیوروکریسی کا اس راستے پر چلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ سرمایہ داری کی جانب تحریک کا ظہور کسی معاشی مجبوری کے باعث نہیں بلکہ مزدور طبقے سے خوف کے باعث اور حکمران ٹولے کے اقتدار اور مراعات کے تحفظ کی خاطر ہوا۔ سٹالن ازم کے بحران نے اپنا اظہار، ترقی کی گرتی ہوئی شرح میں کیا۔ لیکن کیا نوزائیدہ بورژوازی اس سے بہتر کارکردگی دکھا سکتی ہے؟

یہ فیصلہ کن سوال ہے۔ ہم پہلے ہی دو زبردست کارنامے پیش کر چکے ہیں جو قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت نے کئی دہائیوں تک بیوروکریسی کے باوجود سرانجام دیئے۔ 1980ء تک ایک زبردست پیداواری صلاحیت موجود تھی جسے ترقی دینے میں بیوروکریسی ناکام ثابت ہوئی، یہ ہمارا نقطہء آغاز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا بورژوازی اس امکان کو حقیقت کا روپ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے؟ اگر اسکا جواب اثبات میں ہے تو ہمارے سامنے ایک ایسے سرمایہ دار روس کا تناظر موجود ہوگا جو نہایت تیزی سے امریکا کو ایک معاشی طاقت کی حیثیت سے دعوت مبارزت دے رہا ہوگا۔ روسی سرمایہ داری ایک زوال پزیر نظام نہیں ہوگا جیسا کہ ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی بلکہ ایک زبردست اور خوشحال سپر پاور ہوگا اور اس سے جنم لینے والے اکتوبر انقلاب اور منصوبہ بند معیشت محض ایسے وقفے ہونگے جنکی حقیقی اہمیت یہ تھی کہ وہ منڈی کی فتح کے لیے راستہ ہموار کرتے لیکن یہ ایک ایسا مفروضہ ہے جسکا ثابت کیا جانا ابھی باقی ہے۔

روسی سرمایہ داری کے گرنے یا قائم رہنے کا انحصار اسکی معیشت کو ترقی دینے اور سب سے بڑھ کر مزدوروں کی پیداواری کارکردگی کو فروغ دینے کی صلاحیت پر ہوگا، یہ کس طرح کیا جا سکتا ہے؟ تاریخی طور پر ''محنت کے وقت میں بچت'' کے حصول کا بڑا ذریعہ محنت کی بچت کرنے والے آلات (مشینری) میں سرمایہ کاری تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا کسی نیکی کے جذبے کے تحت نہیں بلکہ منافع کی تلاش اور

مخالفوں پر برتری حاصل کرنے کی غرض سے کیا جاتا تھا۔ تضاد یہ ہے کہ تغیر پزیر سرمائے کے مقابلے میں مستقل سرمائے کی مقدار میں اضافہ کرنے سے سرمایہ دار کو جلد یا بدیر منافع کی شرح میں کمی کے رجحان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ایک اور معاملہ ہے۔ یہاں اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ سرمایہ داری کا ترقی پسندانہ فعل یہ ہے کہ وہ نئی مشینری اور ٹیکنیک کو عمومی طور پر متعارف کروا کر محنت کے وقت میں زیادہ بچت کا باعث بنتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سٹالن اِزم میں قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کی بنیاد پر زبردست پیداواری صلاحیت تخلیق کی لیکن اپنے باطنی تضادات کے باعث اسے اِستعمال کرنے میں ناکام رہا، لیکن اب صورتحال کیا ہے؟ پیداوار میں سرمایہ کاری بہت کم ہے، نوزائیدہ سرمایہ دار پیداواری سرگرمیوں میں سرمایہ کاری کرنے میں قطعاً کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کر رہے۔ بلکہ اس کی بجائے سٹہ بازی، ہیرا پھیری، ڈاکے، اور قتل میں سرگرم ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ منظّم انداز میں ریاست کو لوٹ رہے ہیں، ان بنیادوں پر مزدوروں کی پیداواری کارکردگی میں اضافے کی بات کرنا عبث ہے۔

جن حصوں کا احیا ہو رہا ہے وہ کم و بیش سب کے سب خدمات کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں اور زیادہ تر انتہائی پس ماندہ بنیادوں پر قائم ہیں۔ مثلاً گلیوں میں اشیا کی فروخت یا مشکوک قِسم کے چھوٹے کاروبار جو راتوں رات پھلتے پھولتے ہیں اور پھر یک دم غائب ہو جاتے ہیں۔ جزوی طور پر مال کے بدلے مال کے نظام کی طرف بھی واپسی ہوئی ہے۔ یہ سرمایہ داری کی جانب حرکت کو ظاہر نہیں کرتی۔ (مارکس نے کہا تھا کہ زر تبادلہ کی بنیاد پر معیشت کا قیام اور مال کے بدلے مال کے نظام کا خاتمہ انتہائی پسماندہ بنیادوں پر قائم سرمایہ دارانہ معیشت کے لیے شرط اولین ہے) بلکہ محض انتشار کی ایک اور علامت ہے، متضاد طور پر روسی صنعت کے پردے میں صنعت کے بڑے حصوں کی تباہی نوزائیدہ بورژوازی کی کامیابی کی اولین شرط ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم تخلیقی تباہی وغیرہ کے سلسلے میں دیے جانے والے استدلال سے بخوبی آگاہ ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر ان منصوبوں پر عمل درآمد کیا گیا تو اس سے روسی معیشت تباہ ہو جائیگی۔

عالمی معیشت کا غلبہ

بالآخر سب سے فیصلہ کن سوال عالمی معیشت کا ہے۔روس کا عالمی منڈیوں پر انحصار پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہے یہ انحصار سابقہ زار شاہی حکومت سے کہیں زیادہ ہے بظاہر روس بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے ایک مثالی ملک ہے۔اس میں ایک بڑی منڈی بننے کی صلاحیت ہے۔اس میں انتہائی ہنر مند اور پڑھے لکھے مزدور مضحکہ خیز حد تک کم اجرتوں پر دستیاب ہیں۔ایک ہنر مند مزدور کی اجرت سات ڈالر ماہانہ ہے اور اس کے پاس وسیع قدرتی وسائل موجود ہیں تاہم ہمارے سامنے ایک تضاد موجود ہے، اس وقت تک روس میں براہِ راست نجی سرمایہ کاری کی مقدار انتہائی کم ہے۔ یہ سچ ہے کہ یلسن کے انتخاب کے بعد مغربی سرمایہ کاروں کا رویہ کسی حد تک تبدیل ہوا ہے۔ بارہ ماہ میں بیرونی نجی سرمایہ کاری ایک بلین ڈالر سے دگنی ہو کر دو بلین ڈالر ہو گئی ہے، لیکن اس کا نتیجہ اتنا اچھا نہیں جتنا بظاہر دکھائی دیتا ہے۔اس سطح پر بھی سرمایہ کاری انتہائی کمزور ہے، ذرا اس کا موازنہ چین میں ہونے والی بیرونی سرمایہ کاری سے کریں جو صرف 1996ء میں چالیس بلین ڈالر تھی، پچھلی دہائی میں کل 120 بلین ڈالر کی سرمایہ کاری ہوئی، جو روس کے مقابلے میں بیس گنا زیادہ ہے۔ یہ اعداد و شمار کمپنیوں کی سرمایہ کاری کے ہیں اس میں بنکوں کے قرضے بھی شامل کرنا ضروری ہیں جو اتنے زیادہ نہیں، علاوہ ازیں وہ رقم بھی جو سٹاک ایکسچینج میں خرچ ہوئی ہے۔ماضی قریب میں اس میں کافی اضافہ ہوا ہے مگر اس کی نوعیت سٹہ بازی جیسی ہے۔سٹاک، حصص اور حکومتی بانڈز پر جوا، جس سے روسی معیشت کو کوئی حقیقی فائدہ پہنچنا ضروری نہیں۔ مثال کے طور پر حکومتی بانڈز کی فروخت سے روسی حاکموں کو اپنے قرضوں کی ادائیگی کے لیے نقد رقم ملتی ہے لیکن اس سے پیداواری قوتوں کے فروغ میں کوئی مدد نہیں ملتی اور اسے سود سمیت واپس کرنا بھی ضروری ہے۔ پیداواری سرمایہ کاری کی بجائے یہ ایک بہت بڑا ضیاع ہے۔اگر انہوں نے سرمایہ کاری کی بھی ہے تو انکی دلچسپی حقیقتاً چند مخصوص شعبوں تک محدود ہے جن میں زیادہ تر تیل اور خام مال شامل ہے۔روس کے پاس حقیقی معنوں میں تیل، گیس اور ہر قسم کے خام مال کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔ حقیقی سوشلسٹ منصوبہ بند معیشت کی بنیاد پر یہ دنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا تھا لیکن مغرب کے مشورے قبول کرنے سے روس کی حیثیت تیسری دنیا کی پسماندہ معیشت جیسی ہو جائیگی، جو اشیائے صرف درآمد کرتی ہے اور خام مال برآمد کرتی ہے۔کثیر القومی کمپنیوں اور سامراجیوں کو یہ صورتحال بہت بھائے گی لیکن روسی بیوروکریسی اور فوج یہاں تک کہ نوزائیدہ بورژوازی کا وہ دھڑا بھی اس پر زیادہ خوش نہیں ہوگا جسے بڑی صنعتیں وراثت میں ملیں ہیں، انتہائی خوش آئند حالات میں بھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بعض علاقوں میں سرمایہ کاری ہوگی جبکہ باقی

پسماندہ اور غریب رہیں گے۔ جیسے 1917ء سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

بیرونی اجارہ داریوں کی نظریں روس کے تیل، گیس اور دیگر خام مال پر لگی ہوئی ہیں۔لیکن اگر وہ یہاں بھی سرمایہ کاری کرتے ہیں تو کوئلے کو چھوڑ کر باقی شعبوں میں کام کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے۔خاص طور پر گیس کے شعبے میں زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔لہٰذا یہاں سرمایہ کاری روزگار کے زیادہ مواقع پیدا نہیں کرے گی۔دوسری طرف مغرب IMF کے ذریعے ماسکو کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ غیر منافع بخش بڑی فرموں کو دیوالیہ ہو جانے دے۔ان صنعتوں میں کئی ملین مزدور کام کرتے ہیں۔ IMF کے دباؤ سے دھماکہ ہونے کا خطرہ ہے، یہی وجہ ہے کہ روسی حکومت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی رہی ہے۔بالخصوص موجودہ دور میں بیرونی سرمایہ بدنام ہونے کی حد تک متلون مزاج ہے۔یہ حیرت انگیز تیز رفتاری کے ساتھ آ بھی سکتا ہے اور جا سکتا ہے۔اس وقت بین الاقوامی بورژوازی روس سے بہت خوش ہے بالآخر حالات بظاہر اسی نہج پر جا رہے ہیں جس پر وہ چاہتے تھے، انکا خیال ہے کہ یلسن کی فتح کے بعد کمیونسٹ ختم ہو چکے ہیں اور مزدور طبقہ بھی منظر میں نہیں ہے۔انکے اخذ کردہ نتائج خالصتاً تجربیتی ہیں اور وہ غلطی پر ہیں۔روس کی صورتحال چوبیس گھنٹے میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ہو سکتا ہے کہ وہ خود کو مبارکباد دیں رہے ہوں کہ سب کچھ طے ہو چکا ہے اور ایک ایسا حتمی نوعیت کا دھماکہ ہو جو انکی خوش فہمیوں کو اڑا کر آسمان تک پہنچا دے۔

سوال یہ ہے کہ روس میں سرمایہ کاری اتنی سست رفتار کیوں ہے؟ اس کا جواب حال ہی میں جرمنی کے سرمایہ کاری بینک ڈوئچے مورگن گرین ویلی کے ماسکو آفس کے ڈائریکٹر جنرل نے یوں دیا تھا:

''میں نہیں سمجھتا کہ پچھلے چند ہفتوں میں روس میں کوئی ایسی شدید نوعیت کی تبدیلی آئی ہے۔بات صرف اتنی سی ہے کہ نیا سال آنے پر فنڈ کے منتظمین نے نئے اثاثے مختص کیے ہیں لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ روس میں معاشی اصلاحات غیر رجعت پزیر یا ان پلٹ ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ صدر کا برسرِ اقتدار رہنا انتہائی اہم ہے''۔(8)

اس تبصرے سے سرمائے کی حکمتِ عملی وضع کرنے والوں کے رویے کا بہت واضح اظہار ہوتا ہے۔ اس وقت غالب رجحان سرمایہ داری کی جانب ہے۔ لیکن یہ پایہء تکمیل کو نہیں پہنچا اور اسکے الٹنے کا امکان موجود ہے۔سرمائے کی حکمت عملیاں بنانے والے حقیقت پسند لوگ ہیں۔وہ اس بات سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ وہ سرمایہ کاری نہیں کر رہے ہیں اور اسی باعث وہ روسی حکومت پر خودکشی

پر مبنی پالیسی اختیار کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہے ہیں۔

سرمایہ کاری بدستور ایک مرکزی مسئلہ ہے۔نوزائیدہ بورژوازی اپنا سرمایہ کہاں سے لائے گی؟ وہ کسان طبقے سے تو حاصل نہیں کرسکتی کیونکہ اب اس طبقے کا تو وجود ہی نہیں ہے۔روس میں یہ دیہی پرولتاریہ کی شکل میں ہے جسے چھوٹے مالکان کے طبقے میں تبدیل ہونے سے کوئی دلچسپی نہیں۔کئی دہائیوں تک نوجوان فوج میں شامل ہو جاتے تھے اور پھر انہیں ملازمت سے فارغ ہونے کے بعد گاؤں واپس پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔باقی رہنے والوں کی اکثریت اجتماعی نظام کی عادی ہو چکی ہے جو انہیں کم از کم ایک مخصوص قسم کا تحفظ ضرور فراہم کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دیہی علاقوں میں زمین کی نج کاری کے منصوبوں کی کوئی پذیرائی نہیں ہوئی۔اگرچہ پہلے پہل انہیں گورباچوف نے پیش کیا تھا۔

روایتی طور پر بورژوا معیشت دان سرمایہ کاری کے ایک اور سرچشمے کے طور پر بچتوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔بنکوں،تعمیراتی سوسائٹیوں اور پنشن فنڈز کے ذریعے انکی رسائی لاکھوں افراد کی چھوٹی چھوٹی بچتوں پر مشتمل پیسے کی بہت بڑی مقدار تک ہوتی ہے جن کا تمام تعلق مزدور اور درمیانے طبقے سے ہوتا ہے اور اس رقم کو وہ سرمایہ کاری کے لیے استعمال کرتے ہیں۔لہٰذا تاریخی طور پر بچتوں کی اونچی شرح سرمایہ جمع کرنے کے عمل میں ایک اہم عنصر رہی ہے۔سوویت یونین میں حقیقی معنوں میں بچت کی شرح بہت اونچی تھی،یہ زیادہ تر ان اشیائے صرف کی قلت کی عکاسی کرتی تھی جنہیں لوگ خریدنا چاہتے تھے۔

اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر سوویت یونین کی کاروں کی صنعت کافی تعداد میں کاریں بناتی تو روس میں 1980ء کے عشرے کے ابتدائی سالوں میں کاروں کی ملکیت کی سطح برطانیہ سے زیادہ اونچی ہوتی۔ کاریں اس لیے نہیں بنائی جاتی تھیں کہ بیوروکریسی کی ترجیہات مختلف تھیں اگرچہ قوتِ خرید موجود تھی۔ لیکن اب کیا ہے؟ کاریں اب بھی کافی تعداد میں نہیں بنائی جا رہی ہیں۔کاریں باہر سے درآمد کی جا رہی ہیں۔مافیا سرمایہ داروں کیلئے زیادہ تر مہنگی مرسیڈیز کاریں درآمد ہو رہی ہیں جو ڈالروں کی شکل میں ادائیگی کرتے ہیں۔لیکن روبل کی شکل میں تمام لوگوں کی بچتوں کا افراطِ زر نے صفایا کر دیا ہے۔انسانوں کیلئے تباہ کن نتائج کا حامل ہونے سے قطع نظر اس سے معیشت کو بھی ترقی نہیں ملتی بلکہ عوام کی قوتِ خرید کو تباہ کر کے یہ داخلی منڈی کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے علاوہ سرمایہ کاری کے ایک اہم امکانی سرچشمے کو بھی ختم کر دیتا ہے۔اگر بورژوازی روس پر مکمل گرفت قائم کر سکے اور کسی حد تک استحکام حاصل کر سکے تو وہ بیرونی سرمایہ کاری کے لیے پر کشش ہو سکتا ہے اور ایسا نہ ہونے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی،اگر اس چیز کو مدِ نظر رکھا

جائے کہ روس کے پاس ایک بہت بڑا پڑھا لکھا مزدور طبقہ موجود ہے جس کی اجرتیں نہایت قلیل ہیں۔ آخرکار انہوں نے زارشاہی روس میں بھی بہت بڑی سرمایہ کاری کی تھی اور اس وقت وہ چین میں بڑی بڑی رقوم کی سرمایہ کاری کر رہے تھے فرق یہ ہے کہ وہ غلط طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ چین میں انکی سرمایہ کاری محفوظ ہے۔(زارشاہی روس کے بارے میں بھی انکا یہی خیال تھا) لیکن روس میں سرمایہ کاری کیوں نہیں کرتے؟ انکے روس میں سرمایہ کاری نہ کرنے کی وجہ یہی ہے کہ انکو یقین ہے کہ انکی سرمایہ کاریاں محفوظ نہیں رہیں گی۔

مارکس نے اس عمل کی وضاحت کی تھی جس میں آزادانہ مسابقت سے اجارہ داری جنم لیتی ہے۔لیکن اپنی باری آنے پر اجارہ داری ریاستی ملکیت کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔روسی اجارہ داریوں کا خود کو عوام کے خرچ پر امیر بنانے کا نظام زبردست غم و غصے کو فروغ دیگا۔ یہاں صورتحال مغرب جیسی نہیں ہے جہاں کئی نسلیں گزرنے کے بعد لوگ سرمایہ دارانہ نِظام کے عادی ہو چکے ہیں، شاید انہیں اسکے نتائج پسند نہ ہوں لیکن اکثر لوگ اسے ناگزیر اور کم وبیش فطری خیال کرتے ہیں۔وہ عام طور پر سرمایہ دار کو خدا کی جانب سے ودیعت کیے گئے صنعت کی ملکیت اور محنت کے استحصال کے حق پر معترض نہیں ہوتے۔لیکن روس میں معاملات مختلف ہیں۔کئی نسلوں سے لوگ ایسے سماج کے عادی ہو چکے ہیں جس میں ذرائع پیداوار ریاست کے ہاتھ میں تھے اور کم از کم رسمی طور پر یہ بھی فرض کیا جاتا تھا کہ ریاست مزدور طبقے کے مفادات کا دفاع کرتی ہے۔ بہت بڑی اکثریت کو یقین ہے کہ نجکاری شدہ اداروں کے مالکان محض بدمعاش ہیں جنہوں نے عوام کی ملکیت چرا لی ہے۔ یہ ساری بات بالکل درست ہے۔مزدور طبقے کی نظروں میں سرمایہ داری کی کوئی جائز حیثیت نہیں ہے۔مغرب کے مقابلے میں یہ ایک نہایت اہم فرق ہے۔اور آئندہ عرصے میں یہ زبردست نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔

موجودہ نظام حکومت ترقی کو نہیں بلکہ ارتقائے معکوس کو ظاہر کرتا ہے۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ بدعنوان اور غنڈا گرد سرمایہ داری کی ہولناکیاں عوام کے ذہنوں پر نقش ہو رہی ہیں۔وہ اینگلز کے ان الفاظ کو نئے معنی دے رہے ہیں کہ ''یہ ڈارون کی دریافت کردہ بقا کی جدوجہد ہے جو شدید تر تشدد کے ساتھ فطرت سے سماج کو منتقل ہوگئی ہے۔ جانوروں کے لیے زندگی کے جو حالات فطری ہیں وہ انسانی ارتقا کی آخری حد کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔''(9) پلٹ کر موجودہ عہد کو ایک وسیع تر تاریخی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ عارضی انحراف اکتوبر انقلاب نہیں بلکہ سٹالن ازم اور اسکی جگہ لینے کی کوشش کرنیوالا

مافیا سرمایہ داری کا غلیظ نظام تھا۔

کیا روسی بورژوازی ایک ترقی پسندانہ کردار ادا کرسکتی ہے؟

سوشلزم کا مطلب ہے کہ صنعت، ٹیکنیک، سائنس اور ثقافت کی سطح ترقی یافتہ ترین سرمایہ دار سماج کے مقابلے میں ایک اعلیٰ تر سطح پر ہو۔ اس صورت میں سماج کے پیداوار جنس کے جیسے پسماندہ تر نظام کی طرف لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چھوٹے پیمانے کی اشیائے صرف کی پیداوار کے بیچ رہنے والے عناصر رفتہ رفتہ غائب ہو جائینگے اور انکی جگہ برتر سوشلسٹ اشکال لے لیں گی۔ چھوٹے کسان اور کاروباری حضرات جب نئی معاشی اشکال کی زبردست افادیت اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے تو جبر کی ضروریات اتنی ہی کم ہو جائیگی۔ مزدور ریاست کی یہ تصویر درست ہے مگر یہ محض ایک تجرید ہے۔ 1917ء میں روس میں قائم ہونے والی مزدور ریاست امریکہ اور برطانیہ کے مقابلے میں برتر معاشی سطح کی حامل نہیں تھیں بلکہ وہ ایک انتہائی پسماندہ بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ ان حالات میں بورژوا اور پیٹی بورژوا عناصر کا اضافی وزن بہت زیادہ تھا۔ جب تک ریاست پر مزدور طبقے کی نمائندگی کرنے والے بالشویکوں کا کنٹرول تھا بورژوازی، اس کے اتحادیوں اور دولتمند کسانوں کے دباؤ کا مقابلہ کیا جاسکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ لینن اور ٹراٹسکی نے بار بار انتباہ کیا تھا سرمایہ داری کی بحالی کا حقیقی خطرہ موجود تھا۔ خانہ جنگی کے اختتام تک سماجی دھڑے بندی نے ایک خطرناک صورتحال پیدا کرنا شروع کردی۔

ٹراٹسکی نے لکھا تھا کہ ''کسان دھڑوں میں تقسیم ہو رہے تھے جس میں ایک طرف چھوٹا سرمایہ دار اور دوسری طرف اجرت پر کام کرنے والے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ صنعتی اشیائے صرف کی عدم فراہمی کے باعث ریاست دیہی منڈی سے خارج ہوگئی۔ پھر گویا زمین کے نیچے سے کولاک اور چھوٹے گھریلو دستکار کے درمیان دلال نمودار ہوگیا۔ بذاتِ خود ریاستی ادارے خام مال کی تلاش میں پرائیوٹ تاجر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کاروبار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ سرمایہ داری کی بڑھتی ہوئی لہر ہر جگہ دکھائی دے رہی تھی۔ غور وفکر کرنے والے لوگوں نے واضح طور پر دیکھا کہ ملکیت کی شکل میں آنے والا انقلاب سوشلزم کے مسئلے کو حل نہیں کرتا بلکہ صرف اسے اٹھاتا ہے''۔ (10) لینن نے کئی بار اس خطرے سے خبردار کیا تھا کہ روس میں پیٹی بورژوا عوام غیر ملکی سرمائے کے ساتھ مل کر سرمایہ داری کی بحالی کے لیے ایک زبردست

بلاک تخلیق کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ٹراٹسکی کے ساتھ مل کر بیرونی تجارت پر ریاستی اجارہ داری کے دفاع میں زبردست لڑائی کی جسے ابتدا میں سٹالن اور بخارین ختم کرنا چاہتے تھے۔ بخارین کی دائیں بازو کی حزبِ اختلاف پر سٹالن کے دھڑے کی فتح بورژوازی کے سرمایہ دارانہ بحالی کے رجحان کی شکست کی غمازی کرتی تھی لیکن اس سے خطرہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ اس وقت اکتوبر انقلاب کی قائم کردہ قومیائی ہوئی ملکیتی اشکال اور نوزائیدہ بورژوازی کے درمیان تصادم میں فیصلہ اول الذکر کے حق میں ہوا تھا۔ سٹالنسٹ بیوروکریسی کے فیصلہ کن حصے نے اپنی طاقت اور مراعات کا تحفظ کرنے کی غرض سے مزدور طبقے کی حمایت سے کلاکوں اور نئی معاشی پالیسی کے طفیل دولت جمع کرنے والوں کو کچل ڈالا۔ لیکن اس وقت کے حالات میں اس کا مطلب مزدور جمہوریت کے نظام کی بحالی نہیں بلکہ اسکے برعکس ایک نوکرشاہانہ آمرانہ ریاست کی مضبوطی تھا۔

نوزائیدہ بورژوا عناصر کو شکست دینے کے لیے جبری اجتماعی کاشتکاری کے پاگل پن جیسے انتہائی خوفناک بوناپارٹسٹ ذرائع استعمال کئے گئے جس کے باعث سوویت زراعت کئی نسلوں تک غیر منظّم رہی۔ سٹالن کا خیال تھا کہ سرمایہ دارانہ بحالی کے خطرے کا خاتمہ انتظامی ذرائع اور ننگی طاقت کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ ایک سراب تھا۔ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کو حقیقی خطرہ پیداواری قوتوں کی انتہائی کم تر سطح، عمومی غربت اور مزدوروں کی کم پیداواری کارکردگی سے اور سب سے بڑھ کر سامراجی گھیراؤ سے درپیش تھا۔ جہاں سوویت یونین کے بڑے دشمن عالمی سرمایہ داری کے بحران کے باوجود معاشی ترقی کی ایک اعلیٰ تر سطح پر تھے۔

نوکرشاہانہ منصوبہ بندی کے پرشکوہ ڈھانچے کے اندر نئی معاشی پالیسی کے تحت دولت کمانے والے عناصر غائب نہیں ہوئے بلکہ پوشیدہ طور پر کام کرتے رہے۔ صنعت سماج اور ریاست کے انتظام پر مزدوروں کے کنٹرول کی عدم موجودگی میں مارکس کے بقول ''تمام تر پرانی بکواس'' پھر سے واپس لوٹ آئی۔ عبوری ریاست کی دوہری فطرت جس میں تقسیم کے بورژوا نظام 'عدم مساوات اور بدعنوانی کے ساتھ سوشلِسٹ منصوبہ بند معیشت کے عناصر موجود تھے' ہر قسم کی چوری اور ہیرا پھیری کے لیے انتہائی سازگار ثابت ہوئی۔ یہاں تک کہ پہلے پانچ سالہ منصوبے کے وقت بھی مزدور طبقے کی پیدا کردہ قدر زائد کا ایک بڑا اور روزافروں حصہ ہڑپ کرلیا گیا تھا۔

مارکس لکھتا ہے کہ ''سرمایہ بنیادی طور پر گردش سے حاصل ہوتا ہے اور علاوہ ازیں اسکا نقطہ آغاز اور

زرِ تبادلہ (پیسہ) ہے‘‘۔(11) مارکس وضاحت کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی پسماندہ ترین اور غیر ترقی یافتہ شکلیں سودخوروں اور تاجروں کے سرمائے کی شکل میں سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے قیام کے لیے ضروری معروضی حالات کے پیدا ہونے سے بہت پہلے ظاہر ہو جاتی ہیں۔ تاہم ماقبل سرمایہ داری سماجوں میں تاجروں کے سرمائے سے تعلق رکھنے والے مظاہر کوئی پیداواری کردار ادا نہیں کرتے۔

جب سماج ایسی سطح کو نہیں پہنچا تھا جہاں تبادلۂ جنس کا پیداوار کا نظام مکمل ہوتا، کارتھیجین فونیشین اور یہودی معیشت کے حاشیوں پر نمودار ہوئے جو تبادلے کے ذریعے دیگر کم ترقی یافتہ عوام کی پیدا کردہ قدر زائد ہتھیا لیتے تھے۔ قدیم دنیا میں ان سرگرمیوں کو دھوکہ دہی، ڈاکہ زنی، اغوا اور قزاقی کے ساتھ شمار کیا جاتا تھا۔ انکا ظہور سماج کے شگافوں سے ہوا، جہاں وہ رائج الوقت سماجی اور معاشی نظام کو بکھیرنے والے عامل کے طور پر کام کرتے تھے۔ قدیم دنیا میں تجارتی سرمائے نے جہاں بھی جڑیں پکڑیں وہاں پر پرانے خاندانی سماج کے خاتمے کے عمل کو تیز کیا اور ناگزیر طور پر غلامی کی راہ ہموار کی۔ بعدازاں قرونِ وسطیٰ میں سودخوروں اور تاجروں کے سرمائے نے جاگیرداری کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں اسی قسم کا کردار ادا کیا۔

’’نیم وحشی یا مکمل طور پر وحشی قبائل میں پہلے تاجر اقوام مداخلت کرتی ہیں یا ایسے قبائل تعلق پیدا کرتے اور اپنی فاضل اشیا کا تبادلہ کرتے ہیں جن کی پیداوار، نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ اول الذکر صورت ایک زیادہ کلاسیکی شکل ہے۔ لٰہذا ہم اسی کو آگے لیکر چلتے ہیں۔ فاضل اشیا کا تبادلہ ایسا لین دین ہے جس میں تبادلے اور قدرِ تبادلے کے اصول کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اسکا دائرہ محض فاضل پیداوار تک محدود ہے اور یہ بذاتِ خود پیداوار کے سلسلے میں ثانوی کردار ادا کرتا ہے لیکن اگر تبادلے کی آرزومند تجارتی اقوام بار بار آتی ہیں (لمبارڈ اور نارمن اقوام نے کم وبیش تمام یورپی اقوام کے سلسلے میں ایسا ہی کردار ادا کیا) اور اگر ایک روز افزوں تجارت فروغ پاتی ہے تو اگرچہ مال تیار کرنے والی قوم ابھی تک محض ایک نام نہاد مجہولِ تجارت میں شریک ہے لیکن چونکہ قدرِ تبادلہ وضع کرنے کی مہمیز خارجی طور پر ملتی ہے نہ کہ پیداوار کے اندرونی ڈھانچے سے، اس لیے اب فاضل پیداوار کبھی کبھار رونما ہونے والی کوئی اتفاقی چیز نہیں رہتی بلکہ اسکا مستقل طور پر بار بار دہرایا جانا ضروری ہوتا ہے اور اس طرح بذاتِ خود داخلی پیداوار میں بھی گردش کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے یعنی قدرِ تبادلہ وضع کرنے کا رجحان‘‘۔(12)

اس نے ’’سرمایہ‘‘ کی تیسری جلد میں اس خیال کو مزید ترویج دی ہے:

’’تجارت اور تاجر کے سرمائے کا فروغ ہر جگہ قدرِ تبادلہ کا رجحان پیدا کرتا ہے اسکا حجم بڑھتا ہے

اسے دگنا چوگنا کرتا ہے اسے عالمی کردار عطا کرتا ہے اور زرِ تبادلہ کو عالمی زرِ تبادلہ کے طور پر فروغ دیتا ہے لہٰذا تجارت ہر جگہ پیداواری تنظیم پر کم و بیش ایک تحلیل کنندہ کے طور پر کام کرتی ہے جو اسے تیار ملتی ہے اور جس کی مختلف ہیئتیں زیادہ تر قدر استعمال کے طور پر جاری رکھی جاتی ہیں۔ یہ پرانے طریقہ پیداوار کو کس حد تک تحلیل کرتا ہے اسکا دارومدار اسکی پختگی اور داخلی ڈھانچے پر ہوتا ہے۔ اور تحلیل کا یہ عمل کہاں لے جاتا ہے دوسرے لفظوں میں پرانے کی جگہ کونسا نیا طریقہ پیداوار لے گا اسکا دارومدار تجارت پر نہیں بلکہ بذاتِ خود پرانے طریقہ پیداوار کے کردار پر ہوگا۔ قدیم دنیا میں تاجروں کے سرمائے کی ترقی اور تجارت کے اثر نے ایک غلام معیشت کو جنم دیا۔ نقطہ آغاز پر انحصار کرتے ہوئے ایک قبائلی غلام داری نظام کو جو کہ فوری ضرورت کی اشیا کے لیے وقف تھا صرف ایک ایسے نظام نے تبدیل کیا جو قدر زائد کی پیداوار کے لیے وقف ہو۔ تاہم جدید دنیا میں اسکا نتیجہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات اخذ ہوتی ہے کہ یہ نتائج بذاتِ خود ان حالات سے پیدا ہوتے ہیں جو تاجر کے سرمائے کی ترقی سے الگ ہیں''۔ (13)

مارکس یہودیوں کے ''پولینڈ کے سماج کے مساموں میں'' موجود ہونے کا ذکر اس حوالے سے کرتا ہے کہ وہ رائج الوقت جاگیردارانہ طریقہ پیداوار کا حصہ نہیں تھے بلکہ دلالی کا کام کرتے تھے یعنی خرید و فروخت اور اشرافیہ اور کسانوں کو پیسہ بطورِ قرض دینے کا کام۔ قرونِ وسطیٰ میں سودخوروں کا سرمایہ ایک غیر پیداواری ذخیرہ ہی رہا۔ لہٰذا تاریخ کے منظر پر سرمایہ پہلے پہل ایک غیر پیداواری مظہر کے طور پر ظاہر ہوتا ہے جو مروجہ طریقہ پیداوار سے جنم نہیں لیتا بلکہ اس میں باہر سے داخل ہوتا ہے اور بتدریج اس کی جڑیں کھوکھلی کرتا ہے۔ وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہے اس کا دارومدار مروجہ نظام کی مضبوطی پر ہے۔ جاگیرداری کے ابتدائی مراحل میں سودخوروں اور تاجروں کا سرمایہ جس حد تک بھی موجود تھا وہ ایک ایسے نظام کی تحلیل کا سبب نہیں بن سکتا تھا جو ابھی تک ذرائع پیداوار کو ترقی دے رہا تھا۔ لیکن بعد کے مراحل میں یعنی جاگیرداری کے زوال کے عہد میں ان عناصر نے مروجہ سماج کے انہدام کو تیز کرنے میں مرکزی کردار ادا کیا۔

جاگیرداری نظام یقینی طور پر جنس کی بجائے قدرِ استعمال کی بنیاد پر قائم تھا۔ خود کفیل جاگیروں کو ایک دوسری کے ساتھ تجارت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سرمایہ داری کی پسماندہ ہیئتیں (تاجروں اور سود خوروں کا سرمایہ) جاگیردارانہ معیشت کے مساموں میں مخفی تھیں اور تجارت کے حوالے سے ایک اہم

کردار ادا کرتی تھیں۔ یہودی پیشہ ور تاجروں کی حیثیت سے عمومی معیشت میں ایک ایسی ضرورت پوری کرتے تھے جسے کوئی اور پورا نہیں کرسکتا تھا۔ علاوہ ازیں مارکس وضاحت کرتا ہے کہ کم ترقی یافتہ سماجوں میں ''تجارتی منافع محض بھاؤ تاؤ میں مہارت اور دھوکہ دہی کی شکل ہی اختیار نہیں کرتا بلکہ زیادہ تر انہیں طریقوں سے پیدا بھی ہوتا ہے۔''(14)

ترقی کے اس مرحلے پر سرمایہ دولت تخلیق نہیں کرتا بلکہ درمیانی آدمی یا ثالث کے طور پر گردش میں ایک ایسا کردار ادا کرتا ہے جو مروجہ پیداواری نظام نہیں کرسکتا۔ سوویت یونین میں نوکر شاہانہ منصوبہ بندی نے ایسی بے شمار رکاوٹیں کھڑی کیں جنھوں نے گردش پر مفلوج کن اثر ڈالا۔ یہ معیشت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی جو بالکل جمود کا شکار ہو جاتی اگر ان غیر قانونی اور بدعنوانی پر مبنی عوامل کا وجود نہ ہوتا جنہیں بلیٹ (Blat) کہا جاتا تھا۔ اور انکے ذریعے سرکاری ضابطوں سے بچتے ہوئے اشیا کی گردش زیادہ تیز رفتاری سے ہوتی تھی لیکن اسکی بھی قیمت مقرر تھی۔ یہ مظہر پانچ سالہ منصوبوں کے ابتدائی ترین دور سے موجود تھا جیسا کہ وکٹر سرجی لکھتا ہے:

''اب ہم بلیٹ کی یکتائے روزگار عملداری کی طرف آتے ہیں۔ یہ روسی عوامی زبان کی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے اشتراک۔ معاشی زندگی میں نیچے سے اوپر تک اسی کی حکمرانی ہے۔ ٹرسٹوں کے سربراہ، بینکوں اور فیکٹریوں کے ڈائریکٹر، ریاستی تجارت کے منتظمین، کولخوز یا آرٹیلز کے منتظمین، سٹور مینیجر اور ملازمین، تمام کے تمام روزانہ اس کا سہارا لیتے ہیں۔ اس عظیم الشان مشین کے تمام پہیوں کو یہی تیل دیتی اور خراب کرتی ہے۔ اسکا کردار اتنا ہی بڑا ہے جتنا منصوبہ بندی کا کیونکہ اسکے بغیر منصوبہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا۔ بہت سے شعبوں کا اشتراک ناکافی اجرتوں، اعداد وشمار کے نقائص، منتظمانہ غفلت اور نوکر شاہانہ بے عقلی کو ڈھانپ کر معجزوں پر معجزوں کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ منصوبے کے مطابق ایک جوتوں کی فیکٹری کا ڈائریکٹر قریبی چمڑہ ساز فیکٹری سے فروری کے مہینے میں ایک ٹن خام چمڑے کے لیے اجازت نامہ حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ چمڑہ فیکٹری احکامات کی بجا آوری کے لیے تیار ہے۔ لیکن اسکا جواب یہ ہے کہ اس کے لیے مارچ سے پہلے یہ خام مال مہیا کرنا ناممکن ہے۔ جوتوں کی فیکٹری کا پیداواری منصوبہ تباہ ہونے کو ہے لیکن ڈائریکٹر اس سے چنداں پریشان نہیں ہے۔ اسے اس بات کی توقع تھی۔ وہ اپنے چمڑہ فیکٹری والے رفیق کار سے کہے گا ''یار تم میرے ساتھ اس قسم کا ہاتھ کرو گے؟'' چمڑہ فیکٹری والا کہے گا ہرگز نہیں، ہمیں اس مسئلے میں صرف مل بیٹھنے کی ضرورت ہے۔ خدمت کے عوض خدمت، ٹھیک؟ پیارے

کامریڈ، چمڑہ فیکٹری میں کام کرنے والوں کے پاس جوتے نہیں ہیں کیا تم دو ہفتے میں ہمیں پانچ سو جوڑے مہیا کر سکتے ہو؟ بالآخر چمڑہ فیکٹری والوں کی بھی نعل بندی ہو جائیگی مگر اتنی اچھی نہیں جتنی ڈائریکٹر اور اسکے خاندان والوں کی جن کے جوتوں کی ستائش سارا شہر کرے گا اور جوتے بنانے والی فیکٹری کا منصوبہ بھی پورا ہو جائیگا جس پر اسکے ڈائریکٹر صاحبان کو پریمیم ملے گا اور دعوت اڑے گی وغیرہ وغیرہ۔ جب خام مال کو ایک فیکٹری سے دوسری فیکٹری لے جانے کا مسئلہ سامنے آئے گا تو یہ بات بالکل واضح طور پر سمجھ لی جائیگی کہ بالکل ٹھوس وجوہات کی بنا پر کاریں اور ٹرک دستیاب نہیں ہیں مگر یہاں بھی فیاضانہ اشتراک کام آئے گا۔ ریلوے والوں اور ٹرک ڈرائیوروں کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں فائدہ ہے۔''

طفیلی آڑھتی

مذکورہ بالا مظہر ماقبل سرمایہ داری سماج میں طفیلی آڑھتیوں کی سرگرمیوں سے بہت قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ یہ قومیائی ہوئی صنعت منصوبہ بند معیشت کا نہیں بلکہ انقلاب کے انتہائی پس ماندہ حالات میں تنہا رہ جانے اور مزدور طبقے کی سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد ابھرنے والے نوکر شاہانہ نظام کا نتیجہ ہے۔ بدعنوانی، ہیرا پھیری، کالا دھندا اور بلیک جیسے عناصر سوویت معیشت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ختم ہونے کی بجائے مزید فروغ پاتے گئے اور قدر زائد کی روز افزوں مقدار ہڑپ کر کے منصوبہ بند معیشت کی کامیابیوں کو کم کرتے گئے۔ جس طرح سود خوروں اور تاجروں کے سرمائے نے ماقبل سرمایہ داری سماج کو اندر سے توڑا تھا اسکی جڑیں کھوکھلی کی تھیں اسی طرح بیوروکریسی نے جو کہ ''منصوبہ بند معیشت کے جسم پر طفیلی پھوڑا'' تھا رفتہ رفتہ نظام کی جڑیں کھوکھلی کر دیں اسی طرح جیسے ایک طفیلی جس جانور کے جسم سے چمٹا ہوتا ہے اسے کھاتے کھاتے بالآخر اس کی موت کا سبب بن سکتا ہے۔

ان غیر قانونی حرکتوں کو ایک وسیع اور روز افزوں غنڈوں، نو دولتیوں اور سٹے بازوں پر مشتمل جرائم پیشہ طبقے سے منسوب کیا جاتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے یہودی آڑھتی پولینڈ کی جاگیرداری کے مساموں میں موجود تھے۔ وہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کا حصہ نہیں تھے اور اس سے جنم نہیں لیا بلکہ اس سے چمٹا ہوا بدگوشت اور کینسر کا پھوڑا۔ یہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کی ضروریات اور نوکر شاہانہ کنٹرول کی گلا گھونٹ ڈالنے والی گرفت کے درمیان زبردست تضاد کا واضح اظہار تھا۔ نوزائیدہ بورژوازی کا ابتدائی

اظہار یعنی سوویت آڑھتی، پیداوار میں کوئی کردار ادا نہیں کرتا تھا بلکہ اس مشینری کو تیل دینے کے لیے ضروری تھا جو نوکر شاہی نا اہلی، تخریب کاری اور سرخ فیتے کی بدولت بار بار رکتی تھی۔

ان ''خدمات'' کے عوض یہ آڑھتی ایک بہت بڑا اور روز افزوں خراج ہیرا پھیری، دھوکہ دہی اور ڈاکے کی شکل میں سماج سے وصول کرتے تھے جس میں روز بروز قدرِ زائد کا زیادہ سے زیادہ حصہ جذب ہو رہا تھا۔ شروع ہی سے دو متضاد مگر ایک دوسرے کے لیے لازِم و ملزوم عناصر موجود تھے۔ ایک طرف بیوروکریسی تھی جس کے پاس سیاسی اقتدار تھا اور وہ ریاست کو کنٹرول کرتی تھی دوسری جانب بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو حقیقی معنوں میں جرائم پیشہ، کالا دھندہ کرنے والے، نو دولتیے اور سٹے باز تھے جو قدر زائد میں سے اپنا حصہ بٹورنے کے لیے ان سے مقابلہ کرتے تھے۔ ایک طویل عرصے تک بیوروکریسی نے ان عناصر کو انتظامی ذرائع سے قابو میں رکھنے کی کوشش کی کیونکہ اسے خوف تھا کہ ریاست کی اس بے مہار لوٹ سے منصوبہ بند معیشت کے سارے نظام کے ساتھ ساتھ ان کی اپنی مراعات یافتہ حیثیت کو بھی زبردست نقصان پہنچ سکتا ہے۔ لہذا ہمیں یہ تضاد دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہاں معاشی جرائم کے لیے موت کی سزا ایک ایسے وقت پر متعارف کروائی گئی جب کہا جا رہا تھا کہ سوویت یونین میں ''کمیونزم کی تعمیر'' ہو رہی ہے۔ لیکن چاہے کتنے ہی لوگوں کو گرفتار کیا جاتا' جیلوں میں ڈالا جاتا اور گولی سے اڑایا جاتا ایک ایسی بیماری کا خاتمہ ممکن نہیں تھا جو ایک بدعنوان آمرانہ نظام کا ناگزیر نتیجہ تھی آخر کار فرق تو صرف ''قانونی'' اور ''غیر قانونی'' چوری کا تھا۔

یہاں ہمارے سامنے ایک ایسا مظہر ہے جو ما قبل سرمایہ داری سماجوں میں سرمائے کے اس ابتدائی ارتکاز کے تاریخی عمل سے قریبی مشابہت رکھتا ہے جس کے بارے میں مارکس نے ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک فرق موجود ہے۔ قرون وسطی میں سود خوروں اور تاجروں کا جمع کردہ سرمایہ ابتدائی طور پر غیر پیداواری تھا۔ جیسا کے مارکس وضاحت کرتا ہے پیداواری عمل سے باہر دھوکہ دہی اور بھاؤ تاؤ میں مہارت کے ذریعے حاصل کیا گیا یہ سرمایہ سود خور کے غیر پیداواری ذخیرے کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ تاہم پندرھویں اور سولہویں صدی میں سرمایہ داری کے عروج کے ساتھ ساتھ سود خور کے ذخیرے یا خزانے نے حقیقی سرمایہ دارانہ ارتکاز کے عمل کی بنیاد تشکیل کی، پہلے تجارتی سرمائے اور بعد کے مراحل میں صنعتی سرمائے کی۔ یہ سرمایہ دارانہ عروج کا دور تھا جب بورژوازی نے عالمی پیمانے پر پیداواری قوتوں کی ترقی میں نسبتاً ترقی پسندانہ کردار ادا کیا تھا۔

اس مین کوئی شک نہیں کہ ''سوویت'' بدمعاشوں اور سٹے بازوں کے ریوڑوں نے قومیائی ہوئی معیشت کی لوٹ مار اور دھوکہ دہی کے حوالے سے کم وبیش وہی کردار ادا کیا جو جاگیرداری نظام کے تحت آڑھتیوں اور دلالوں کی سرگرمیوں نے کیا تھا۔تاہم یہ سولہویں صدی نہیں بلکہ سامراجی زوال کا دور ہے۔عالمی پیمانے پر سرمایہ داری کا یہ دور عمومی تاریخی پیش رفت کا نہیں بلکہ اس کے برعکس زوال کا دور ہے جس میں ''ابھار'' زیادہ سے زیادہ کمزور اور غیر مستحکم کردار کے حامل ہوتے جا رہے ہیں اور کساد بازاریاں زیادہ طویل ہوتی جا رہی ہیں۔اگر ہم روس میں سرمایہ داری کی بحالی کے امکانات کا جائزہ لیں تو مساوات میں اسے ایک فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے۔

تاریخی طور پر سرمایہ داری کا ظہور چھوٹے چھوٹے سرمایوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا طور پر ہوتا ہے۔چودھویں اور پندرھویں صدی میں سرمائے کے ابتدائی ارتکاز کے دور سے شروع کرتے ہوئے مغرب میں بورژوازی نے بتدریج امداد باہمی، مشینی پیداوار اور بالآخر جدید صنعت تک کے تمام مراحل طے کیے۔تاہم روسی سرمایہ داری نے سرمایہ دارانہ ارتقا کے تمام کلاسیکی مراحل طے نہیں کیے اور کر بھی نہیں سکتی تھی۔نوآبادیاتی ممالک کی کمزور بورژوازیوں کی طرح یہ بھی تاریخ کے منظر پر بہت دیر سے آئی تھی۔ یہ مکمل طور پر بڑے بیرونی سرمائے کی محتاج تھی۔آج کے لئے یہ بات پہلے سے بھی زیادہ سچ ہوگی۔عین اسی طرح جیسے انیسویں صدی کے اواخر میں کمزور روسی بورژوازی ان مراحل کو محض دہرا نہیں سکتی تھی جن سے مغربی یورپ کے ممالک پہلے ہی گزر چکے تھے اسی طرح آج بھی نوزائیدہ بوروژوازی کو ایک سست رو اور ٹھوس انداز میں سرمایہ جمع کرنے کی اجازت نہیں دی جائیگی۔عالمی منڈی کے وجود اور مشترکہ اور غیر مساوی قانون ترقی کے باعث یہ خارج از امکان ہے۔آج ہمیشہ سے زیادہ اسے عالمی منڈی میں شرکت پر مجبور ہونا ہے جہاں اس کی پیداوار مسابقت سے قطعاً معذور ہے۔

سامراجی ماسکو پر زبردست دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ نام نہاد اصلاحات کے پروگرام کو جاری رکھے چاہے اس کے نتائج کچھ بھی کیوں نہ نکلیں۔نوزائیدہ بوروژوازی کے نقطہ نظر سے بھی یہ ایک مجنونانہ پالیسی ہے۔مغرب نے یہ لائن اس لیے اختیار کی ہے کیونکہ اسے احساس ہے کہ روس میں سرمایہ داری کی بحالی کا عمل ابھی نامکمل ہے اور وہ اسے نتیجہ خیز بنانے کے لیے بے چین ہے۔لیکن ریاستی ملکیت کی صنعت کو مکمل طور پر ختم کر کے بڑی بڑی فیکٹریوں کو دیوالیہ قرار دینے کا خیال انتہائی غیر ذمہ دارانہ ہے کیونکہ اس سے زبردست بے روزگاری پھیلے گی اور سماجی ہیجان جنم لیں گے۔

اسی طرح لبرلائزیشن کے سلسلے میں لفاظی اور روسی معیشت کا کھولا جانا ایسی پالیسیاں ہیں جن کا مطلب یہ ہوگا کہ روسی دولت پلیٹ میں رکھ کر سامراج کو پیش کر دی جائے۔ تاریخی حوالے سے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ برطانیہ، جرمنی، فرانس اور امریکہ نے اس وقت تک تحفظاتی پالیسی اپنائے رکھی جب تک وہ اتنے طاقتور نہیں ہو گئے کہ اپنے مخالفین کو عالمی منڈی میں شکست دے سکیں جس کے بعد انہوں نے ''آزاد تجارت'' کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ ان تمام معیشتوں میں ریاستی شعبے نے ایک کلیدی کردار ادا کیا تھا بالخصوص 1948ء سے 1974ء تک کے سرمایہ دارانہ ابھار کے دور میں۔ جاپان میں بھی ریاستی مداخلت نے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا جسے ہمیشہ ایک نمونے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسکے باوجود روس کو ایک بالکل متضاد پالیسی اپنانے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس سے اسکی معیشت پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہونگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نہ صرف سامراجیوں بلکہ نوزائیدہ بورژوازی کو بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں جس نے بالکل طفیلیوں کی طرح یہ دولت حاصل کی۔

اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو چینی سٹالنسٹوں کا اختیار کردہ نمونہ کہیں زیادہ ذہانت پر مبنی تھا۔ بیجنگ نے روسی تجربے سے سیکھا ہے اور اس سے بچنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے۔ بیوروکریسی کی ریاست پر آہنی گرفت ہے اور وہ بعض مخصوص شعبوں میں سرمایہ داری کے وجود کی اجازت دیتی ہے جبکہ صنعت کے فیصلہ کن حصے ریاست کے ہاتھوں میں ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ملی جلی معیشت ہر قسم کے نئے تضادات کو جنم دیتی ہے اور غیر معینہ عرصے کے لیے جاری نہیں رہ سکتی۔ ڈینگ کی وفات کے بعد بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان کشمکش شروع ہو چکی ہے جس کے نتیجے کے بارے میں پیش گوئی کرنا مشکل ہے لیکن تضادات کا کسی نہ کسی طور حل ہونا ضروری ہے۔ بالآخر یا تو سرمایہ دارانہ شعبہ قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت کے عناصر پر حاوی ہو جائے گا یا اس سے الٹ عمل وقوع پذیر ہوگا۔ اس کا انحصار بہت حد تک اس بات پر ہوگا کہ آئندہ چند سالوں میں عالمی معیشت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

روسی معیشت کی قسمت کا فیصلہ خوانچہ فروشوں، چھوٹے کاروباری لوگوں، سٹاک مارکیٹ میں سٹہ کھیلنے والوں یا میکڈونلڈ کی سرگرمیوں سے نہیں ہوگا۔ یہ 150 ملین افراد پر مشتمل ایک بڑی قوم کے لیے کوئی معاشی بنیاد نہیں جس کے پاس بیسویں صدی کے آخری عشرے میں ایک بہت بڑا صنعتی شعبہ موجود ہے۔ ہرگز نہیں، روس کی قسمت کا فیصلہ اس کی صنعت اور ٹیکنالوجی کی طاقت کرے گی۔ روسی سرمایہ داری پہلے ہی بہت اجارہ دارانہ ہے کیونکہ اسکا ظہور بڑی بڑی ریاستی کمپنیوں کی ڈی نیشنلائزیشن سے ہوا ہے۔

ان میں سے بہت سی فرمیں عالمی منڈی کے حوالے سے نمو پذیری کی اہل نہیں ہیں۔ کیا ایسی بنیاد پر بہتر نتائج کا حصول ممکن ہے؟ اس پر یقین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ذہنی طور پر تھوڑا سا غیر پختہ ہو۔

قرونِ وسطیٰ اور سرمایہ داری کے ابتدائی دور میں سرمائے کے ابتدائی ارتکاز کے حصول کے لیے کئی ایک مختلف طریقے اپنائے گئے تھے۔ عام طور پر اسکے لیے ماقبل سرمایہ داری معاشی سرگرمیوں میں ملوث طبقات اور پوری پوری آبادیوں کو بے رحمی سے بے دخل کیا گیا مثلاً شمالی اور جنوبی امریکہ کی مقامی آبادی، جاگیروں پر کام کرنے والے افریقی غلام، بالعموم نوآبادیاتی ممالک کی اقوام، تحریکِ اصلاح کے جھنڈے تلے خانقاہوں کی املاک کا خاتمہ وغیرہ۔ لیکن سرمائے کے ابتدائی ارتکاز کا بڑا سرچشمہ کسان تھے۔ پہلے قرونِ وسطیٰ کے تاجر اور سودخور انہیں مونڈتے رہے۔ بعدازاں انہیں سکاٹ لینڈ میں اینکلوژر ایکٹ اور ہائی لینڈ کلیئرنس کے ذریعے کھلم کھلا لوٹا گیا۔ جیسا کہ مارکس کہتا ہے ”جب سرمایہ تاریخ کے منظر پر آیا تو اسکے ہر مسام سے خون ٹپک رہا تھا“۔

بے شک مارکسسٹ اس سوال کے بارے میں جذباتی رویہ نہیں اپنا سکتے۔ اپنے بے رحمانہ استحصالی کردار کے باوجود سرمایہ داری نے آخر کار ایک ترقی پسندانہ تاریخی رول ادا کیا تھا کیونکہ اس نے صنعت، زراعت، سائنس اور ٹیکنیک کو ایسی بلندیوں تک پہنچایا جن کے بارے میں کبھی سنا بھی نہیں گیا تھا۔ سائنسی نقطہ نظر سے یہ اسکا واحد جواز تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں بالشویکوں نے شکستہ حال معیشت کے حامل ایک پسماندہ ملک میں اقتدار حاصل کیا تھا۔ روس میں سوشلزم کے لیے مادی بنیاد موجود نہیں تھی لیکن عالمی پیمانے پر موجود تھی۔ عالمی انقلاب میں تاخیر نے انہیں اس مسئلہ کا سامنے کرنے پر مجبور کیا کہ ایک الگ تھلگ معیشت کو ترقی دینے کا آغاز کیسے کیا جائے۔

شروع میں لینن کا خیال تھا کہ ایک لمبے عرصے تک نجی شعبہ اہم کردار ادا کرتا رہے گا کیونکہ اس وقت تک مزدور کے پاس صنعت کو چلانے کا نہ تو تجربہ تھا اور نہ ہی اس کا ثقافتی معیار اتنا بلند تھا۔ اس لیے اس کی تجویز یہ تھی کہ سرمایہ داروں کو فیکٹریاں چالو رکھنے کی اجازت دے دی جائے لیکن وہ اجرتوں اور حالات کے سلسلے میں سوویت قانون کے تابع ہونگے اور مزدور، مزدوروں کے کنٹرول کے نظام کے تحت کام کریں گے۔ ریاست مضبوطی سے مزدور طبقے کے ہاتھوں میں ہوگی اور وہ کئی ایک کلیدی معاشی اوزار اپنے پاس رکھے گی مثال کے طور پر بینکوں کی قومی ملکیت اور قرضوں کی مرکزیت وغیرہ۔ یہی چیز ہے جسے وہ ”ریاستی سرمایہ داری“ کہتا ہے۔ نجی شعبے کا وجود باقی رہے گا مگر وہ مزدور طبقے کے سخت کنٹرول کے تحت

ہوگا۔ مزدوروں کے کنٹرول کے ذریعے رفتہ رفتہ مزدور وہ ضروری تجربہ حاصل کر لیتے جس کے باعث وہ سرمایہ داروں کی مدد کے بغیر انتظام کرنے کے قابل ہو جاتے۔ لیکن لینن کو توقع تھی کہ اس سے بہت پہلے یورپ کے مزدوران کی مدد کو آ جائیں گے۔

لینن بڑی بڑی غیر ملکی کمپنیوں کو سرمایہ کاری کی اجازت دینے پر بھی تیار تھا تاکہ وہ روس میں فیکٹریاں لگائیں اور سائبیریا کے زبردست وسائل کو فروغ دیں۔ لیکن ان میں سے کوئی منصوبہ بھی بار آور نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بالشویک نظام عالمی سامراج کیلئے ایک جان لیوا خطرہ تھا۔ سوویت روس میں سرمایہ کاری کرنے کے برعکس انہوں نے اس کا تختہ الٹنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ جب براہ راست فوجی مداخلت ناکام ہو گئی تو انہوں نے معاشی محاصرے کا سہارا لیا۔ یہ ان مباحثوں میں جانے کا موقع نہیں ہے جو اس وقت صنعت کاری کے موضوع پر ہوئے تھے۔ اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ اس میں پرولتاریہ اور کسانوں کے درمیان رشتے کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ سامراجی محاصرے کے باعث عالمی منڈی سے کٹ جانے کے بعد صنعت میں سرمایہ کاری کے لیے رقوم کے حصول کا واحد ممکنہ سرچشمہ کسان تھے۔

ابتدائی ارتکاز کے کلاسیکی عہد میں برطانیہ کی نوائیدہ بورژوازی نے بدنام زمانہ اینکلوژر ایکٹ میں کسانوں کے خلاف خوفناک تشدد کا استعمال کیا تھا۔ لیکن جب جنگی کمیونزم کے دور میں بالشویک، قحط کے شکار شہروں کیلئے اناج کی جبری وصولی پر مجبور ہوئے تو ان کے ہاتھ بھی دہشت کے اظہار سے خود کو نہ روک سکے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان عارضی ہنگامی اقدامات کی جگہ 1921ء میں نئی معاشی پالیسی نے لے لی تھی۔ اناج کی نجی منڈی قائم کی گئی اور کسانوں کو جنس کی صورت میں ایک ٹیکس دینا ہوتا تھا۔ امیر کسانوں کا سہارا لینے کی جس پالیسی کی وکالت سٹالن اور بخارین کرتے تھے اس نے دیہی علاقوں میں سرمایہ دارانہ رجحانات کو تقویت بخشی۔ ٹراٹسکی اور بائیں بازو کی حزب اختلاف نے اس میں موجود خطرات کے بارے میں خبردار کیا۔ انہوں نے امیر کسانوں پر ٹیکس لگانے، سوشلسٹ صنعت کاری کے اقدامات، پانچ سالہ منصوبہ اور بتدریج اجتماعی کاشت کاری کو فروغ دینے کی وکالت کی۔

مزدور ریاست کی کمزوری اور امیر کسانوں اور نودولتیوں کی شکل میں نوزائیدہ بورژوازی کے مضبوط ہونے سے انقلاب کو شدید خطرہ لاحق ہو گیا۔ بالآخر افراتفری کے عالم میں سٹالن نے بخارین سے ناطہ توڑ لیا اور جبری اجتماعی کاشتکاری اور ''امیر کسانوں (کلاک) کو ایک طبقے کی حیثیت سے ختم کرنے'' کی پالیسی پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس پالیسی کے تباہ کن نتائج برآمد ہوئے۔ سٹالن

کے تحت صنعت کاری کیلئے رقوم جزوی طور پر کسانوں کا اور جزوی طور پر مزدور طبقے کا خون نچوڑ کر حاصل کی گئیں۔ ایک لحاظ سے اس نے بھی ''ابتدائی ارتکاز'' جیسا کردار ہی ادا کیا لیکن ایک مسخ شدہ مزدور ریاست کے تحت۔ قدر زائد نجی سرمایہ داروں کی بجائے ریاست نے حاصل کی۔ اگرچہ اس کا ایک حصہ بیوروکریسی نے اپنے استعمال کے لیے ہڑپ کیا جس میں ہر طرح کی عیاشیاں اور مالی فوائد شامل تھے لیکن اس کا بڑا حصہ دوبارہ صنعت میں لگا دیا۔

کیا یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ روس میں ابتدائی ارتکاز کے عناصر پیداواری قوتوں کے فروغ میں ویسا ہی کردار ادا کریں گے جیسا کہ سرمایہ داری کے عروج کے دور میں سودخوروں اور تاجروں کے سرمائے نے ادا کیا تھا؟ تجربہ اس قسم کے امکان کی نفی کرتا ہے۔ روسی سرمایہ داری نے خود کو بالعموم بدعنوان اور گھٹیا ظاہر کیا ہے۔ یہ مافیا سرمایہ داری ہے اور وہ بدستور اسی طرح کام کر رہی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد پیداواری قوتوں کو ترقی دینا نہیں بلکہ ڈاکہ زنی، ہیرا پھیری اور دھوکہ ہی ہے۔ اس کے طریقہ کار میں اغوا، قتل اور جبری وصولی شامل ہیں۔ یہ راستہ ترقی کی طرف نہیں بلکہ بربریت کی طرف جاتا ہے۔

اس قسم کی شکایت قطعاً بے جا ہے جو اکثر اوقات مغربی مبصرین کرتے ہیں کہ اس قسم کی سرمایہ داری کی نہیں بلکہ ایک قسم کی ''نارمل'' سرمایہ داری کی ضرورت ہے جو صحت مند، ترقی پسند اور جمہوری ہو۔ اس قسم کی ''نارمل'' سرمایہ داری کا کبھی کوئی وجود نہیں رہا۔ درحقیقت عمومی سماجی ضابطوں کی تلاش وقت کے ضیاع کے علاوہ کچھ نہیں۔ لازم ہے کہ سماجی مظاہر کا تجزیہ ٹھوس انداز میں کیا جائے جیسے وہ ایک مخصوص تاریخی سیاق وسباق میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ عین اسی طرح جیسے سٹالن ازم کی مسخ شدہ عفریتی مزدور ریاست کو ''مزدور ریاست'' کو عمومی تجرید کی بنیاد پر سمجھنا ناممکن ہے اسی طرح روس میں جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اسے آدم سمتھ اور ریکارڈو کی تحریروں کے حوالے سمجھنا ناممکن ہے۔ سٹالن ازم اور مافیا سرمایہ داری دونوں ٹھوس قومی اور بین القوامی تاریخی حالات کی پیداوار ہیں۔ مسخ شدہ مزدور ریاست روس کی تاریخی پس ماندگی اور انقلاب کی تنہائی کا اظہار تھی۔ مافیا سرمایہ داری اس حقیقت کا اظہار ہے کہ روسی بورژوازی اتنی تاخیر سے دھارے میں شامل ہوئی ہے کہ ترقی پسندانہ کردار ادا نہیں کر سکتی اور یہ کہ عالمی پیمانے پر سرمایہ دارانہ نظام اپنا کام پورا کر چکا ہے۔

معیشت کا فیصلہ کن کردار

اگر ہم اپنے استدلال کا احاطہ کریں تو اب تک مندرجہ ذیل عوامل نے روس میں رونما ہونے والے واقعات پر فیصلہ کن اثر ڈالا ہے:

(1) بیوروکریسی نے خود کو تعطل کا شکار اور پرانی بنیادوں پر ذرائع پیداوار کو ترقی دینے کا نااہل پایا۔

(2) تنہائی کے طویل دور کا نتیجہ بیوروکریسی کے مکمل طور پر گلنے سڑنے کی صورت میں برآمد ہوا۔

(3) تین دہائیوں پر محیط سٹالنسٹ آمریت کے بعد پرولتاریہ نشان راہ گم کر چکا تھا۔

(4) اس تیسرے عامل کے نتیجے میں مزدور طبقہ عارضی طور پر مجہول ہو گیا۔

(5) مغرب میں سوشلسٹ انقلاب میں تاخیر۔

(6) 1982-90ء کا تاریخی ''حادثاتی'' ابھار جس نے اس خوش فہمی کو جنم دیا کہ سرمایہ داری کوئی حل پیش کر سکتی ہے۔

(7) اس سے سامراجیوں کو عارضی اعتماد حاصل ہوا جنہوں نے گورباچوف پر سرمایہ دارانہ راستہ اختیار کرنے کیلئے دباؤ ڈالا۔

(8) ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک میں ''ملی جلی معیشت'' کے نمونے کے اپنی حدود کو پہنچنے کے نتیجے میں ریاستی تحویل میں لیے جانے کے رجحان میں عالمی پیمانے پر ایک عارضی رجعت پذیری سامنے آئی۔

(9) روسی مزدوروں کی ایک خودمختار تحریک کی عدم موجودگی نے عالمی سامراج کے زبردست دباؤ کے ساتھ مل کر بیوروکریسی کے سرمایہ داری کے حامی دھڑے کو تقویت بخشی اور ایک پرولتاری دھڑے کو ظہور پذیر نہیں ہونے دیا جیسا کہ ٹراٹسکی نے جنگ سے پہلے پیش گوئی کی تھی۔

(10) پرولتاری بوناپارٹسٹ ریاست کی نسبتی خودمختاری کے باعث یلسن کے گرد جمع شدہ حکمران ٹولا اس قابل تھا کہ مختلف طبقات اور بیوروکریسی کے دھڑوں کے درمیان سے بچ نکلے اور اس نے ابتدا میں سرمایہ داری کی جانب بڑھنے کیلئے عالمی سامراج کا سہارا لیا۔

(11) اس طرح ہمارے سامنے ایک متضاد دوغلی صورت حال موجود ہے جس میں یلسن کی بورژوا حکومت عالمی سامراج کے دباؤ کے تحت سرمایہ داری کی جانب عبور کا مرحلہ طے کرنے کی کوشش

کررہی ہے۔

(12) یہ عجیب وغریب عمل ابھی مکمل نہیں ہوا۔اس کے نتیجے کا فیصلہ روسی سماج اور ریاست میں موجود متضاد قوتوں کی جدوجہد کے ذریعے ہوگا۔

(13) اس کے نتیجے کا تعین روس میں طبقاتی طاقتوں کے توازن اور عالمی پیمانے پر رونما ہونے والے واقعات سے ہوگا۔

مارکس ازم وضاحت کرتا ہے کہ عمومی تاریخی ارتقا کا تعین بالآخر پیداواری قوتوں کی ترقی سے ہوتا ہے یعنی صنعت، زراعت، سائنس ٹیکنالوجی اور محنت کی بارآوری کا فروغ۔ سٹالن ازم کا انہدام اس حقیقت کا براہ راست نتیجہ تھا کہ ایک مخصوص مقام پر آکر بیوروکریسی پیداواری قوتوں کے راستے میں ایک نسبتی مزاحمت کی بجائے ایک حتمی روکاوٹ بن گئی تھی۔ 1980ء کی دہائی میں سوویت یونین ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کے مقابلے میں زیادہ شرح ترقی حاصل نہیں کررہا تھا۔ یہ سزائے موت تھی تاہم ترقی کی حرکیات کا سوال ایک نسبتی کردار کا حامل ہے۔سوویت معیشت مغرب کے مقابلے نسبتاً سست پڑرہی تھی جو 90-1982ء کے عارضی ابھار سے گزر رہا تھا۔ مساوات میں یہ عنصر ایک فیصلہ کن اہمیت کا حامل تھا۔ صورت حال اس سے بالکل مختلف ہوتی اگر سرمایہ داری 1930ء کی دہائی جیسی کساد بازاری کا شکار ہوتی جب سوویت یونین کی معیشت بیس فیصد سالانہ کی شرح سے ترقی کررہی تھی۔

مزدور ریاست کی طرح ایک بورژوا نظام کے قائم رہنے یا ختم ہونے کا دارومدار بھی اس کی سماج کو آگے لے جانے کی صلاحیت پر ہوگا۔ محنت کی زیادہ بارآوری اور معیشت کی ترقی نے جاگیرداری پر سرمایہ داری کی فتح کی ضمانت فراہم کی تھی۔ مارکسی نقطہ نظر سے صرف اسی بنیاد پر کسی نظام کو تاریخی طور پر ترقی پسند یا غیر ترقی پسند قرار دیا جاتا ہے۔ روس میں ایک سرمایہ دارانہ نظام کی نمو پذیری کا انحصار بالآخر اس کی پیداواری قوتوں کو ترقی دینے کی صلاحیت پر ہے۔اوراس کا تعلق براہ راست عالمی معیشت کے عمومی تناظر سے ہے۔ سرمایہ داری نظام کی گراوٹ کے حالات میں جبکہ بڑی بڑی معیشتیں بعد از جنگ عروج کی 5-6 فیصد شرح ترقی کے مقابلے میں ابھار کے دور میں بھی صرف 3-1 فیصد شرح ترقی حاصل کرنے کے قابل ہیں، روس کے سلسلے میں صورت حال حوصلہ افزا نظر نہیں آتی۔

ان حالات میں سرمایہ داری کی جانب پیش رفت کی کوشش ناگزیر طور پر اپنے ساتھ نئے سماجی اور معاشی ہنگامے لے کر آئے گی۔ فوری امکان اس امر کا ہے کہ بڑی ریاستی فرموں کو دیوالیہ قرار دیئے جانے

کے بعد بہت سی فیکٹریوں بند ہو جائیں گی اور بڑے پیانے پر بے روزگاری پھیلے گی۔ ایسی صورت حال میں سرمائے کا ارتکاز اجرتوں کو ان کی قدر سے مزید کم کر کے ہی ہو سکتا ہے جس سے اکثریت کے معیار زندگی میں گراوٹ آئے گی اور کھپت میں مزید کمی ہو گی لہذا نئے اور نا قابل حل تضادات جنم لیں گے۔ داخلی منڈی کے محدود ہونے کی وجہ سے برآمدات کے فروغ کیلئے زبردست کوشش کی جائے گی۔ لیکن مشرقی یورپ، جو روسی اشیا کی روایتی منڈی رہا ہے اب زیادہ سے زیادہ مغرب کی طرف جھک رہا ہے۔ زیادہ تر روسی اشیا قیمت اور معیار میں مغربی درآمدات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ دوسری طرف تیل اور دوسرے خام مال کے علاوہ مغربی یورپ کی منڈیوں کے دروازے ان کیلئے کم و بیش بند ہیں۔

وہی مغربی مبصرین جو سوویت معیشت کی ہر خرابی کو بڑھا چڑھا کر اور اسکی کامیابیوں کو جان بوجھ کر چھپاتے تھے (آخری دور میں وہ یہ کھیل زیادہ شدومد کے ساتھ کھیلتے تھے) پچھلے عرصے میں منڈی کی شاندار کامیابیوں کے بارے میں نہایت ڈھٹائی سے خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ لیکن آپ چاہے جدھر بھی دیکھیں فرد میزان تباہی کا منظر پیش کرتی ہے۔ بالخصوص روس میں ہونے والا انہدام کسی جنگ میں تباہ کن شکست سے ملتا جلتا ہے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ دو جنگوں میں رومن سلطنت کی تباہی کے بعد آنے والے عہد تاریک کے سے یورپ نے زمانہ امن میں ایسی تباہی نہیں دیکھی۔ اگر ہم روس کی 1989ء کی مجموعی داخلی پیداوار کو 100 تصور کریں تو 1996ء میں اس کی متوقع شرح 53 فیصد تھی۔ یعنی چھ سال کے عرصے میں تقریباً نصف تھی۔ اگر ہم یاد رکھیں کہ 31-1929ء میں امریکہ میں ہونے والی گراوٹ 30 فیصد تھی تو اس بے مثل تباہی کا اندازہ لگانا ممکن ہو جائے گا۔ اور روس اس کی بدترین مثال نہیں ہے، اسی عرصے میں قازقستان کی معیشت کی شرح ترقی منفی 54 فیصد، یوکرائن کی منفی 57 فیصد، مالدیویا کی منفی 61 فیصد، تاجکستان کی منفی 63 فیصد، آرمینیا کی منفی 60 فیصد، آذربائیجان کی منفی 64 فیصد، اور جارجیا کی منفی 80 فیصد کی حیران کن سطح کو پہنچ گئی۔

درحقیقت روس کی آج کی صنعتی گراوٹ 1945ء مقابلے میں کہیں زیادہ ہے (1945ء کی 18 فیصد کے مقابلے میں اب 50 فیصد سے زیادہ قومی دولت ضائع ہو چکی ہے) جب ہم 1989ء کے مقابلے میں 1993ء میں مجموعی داخلی پیداوار میں صنعت کے حصے کے اعداد و شمار پر نظر ڈالتے ہیں تو اس عرصے میں ہونے والی پیداوار کی بے نظیر تباہی پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ معیشت میں صنعت کا حصہ البانیہ میں 26.4 فیصد، آرمینیا میں 22.5 فیصد، بلغاریہ میں 23.5 فیصد، جارجیا میں 21.3 فیصد،

پولینڈ میں 19.4 فیصد، اور روس میں 11.1 فیصد کم ہوا۔ ان میں سے اکثر ممالک میں طفیلی خدمات کے شعبے میں اضافہ ہوا (لیکن اس شعبے میں بھی یوکرائن میں 10 فیصد، جارجیا میں 12.7 فیصد، اور آرمینیا میں 25.4 فیصد کمی واقع ہوئی)، آرمینیا میں زراعت کے حصے میں ہونے والے بڑے اضافے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک یوکرائن میں بھی اضافہ ہوا ہے جس کی واحد وضاحت یہ ہوسکتی ہے کہ عمومی معاشی بدحالی کے حالات میں آبادی کا کچھ حصہ گزر بسر کے لیے کاشت کاری کر رہا ہے۔

سرمایہ کاری کے اعداد و شمار بھی یہی کہانی سناتے ہیں صرف ایک ملک سلووینا (جس نے ایک کمتر سطح سے آغاز کیا تھا) میں مجموعی داخلی سرمایہ کاری 1989ء کی سطح کو پہنچ سکی ہے۔ بلغاریہ، لٹویا اور لیتھوینیا میں نصف سے زیادہ کمی واقع ہوئی۔ پولینڈ، بیلا روس، جارجیا اور ازبکستان میں ایک تہائی کمی واقع ہوئی۔ جو سرمایہ کاری ہوئی ہے اگر ہم اسے الگ الگ کر کے دیکھیں تو نوزائیدہ بورژوازی کا طفیلی کردار فوراً واضح ہو جاتا ہے۔ تمام صورتوں میں مجموعی سرمایہ کاری میں نجی شعبے کا حصہ انتہائی کم ہے۔ زیادہ تر حصہ اب بھی ریاست مہیا کرتی ہے۔ چیک جمہوریہ کے سلسلے میں بھی یہ بات سچ ہے جہاں 1993ء میں ریاستی شعبے نے نجی شعبے کے مقابلے میں تین گنا زیادہ سرمایہ کاری کی اور یہ آخری سال ہے جس کے اعداد و شمار مہیا کیے گئے ہیں۔ لٹویا اور اسٹونیا میں نجی سرمایہ کاری کے اعداد و شمار جی ڈی پی کی شرح کے حوالے سے بالترتیب 1.3 فیصد اور 1.6 فیصد تھے۔ روس میں نجی سرمایہ کاری جی ڈی پی کے ایک فیصد سے کم تھی جبکہ ریاستی شعبے کی سرمایہ کاری 24.9 فیصد تھی۔ بورژوا دوست عناصر کی یہ امید پوری نہیں ہوسکی کہ غیر ملکی سرمایہ کاری ان کی مدد کرے گی۔ چیک جمہوریہ، ہنگری اور کسی حد تک پولینڈ کے علاوہ ان ممالک میں غیر ملکی سرمایہ کاری نہ ہونے کے برابر ہے۔ روسی جمہوریہ میں مجموعی غیر ملکی سرمایہ کاری تقریباً اتنی ہی ہے جتنی پولینڈ میں جبکہ روس کی آبادی 160 ملین اور پولینڈ کی 38 ملین ہے۔ فی کس کے لحاظ سے یہ ہر روسی مرد اور عورت کیلئے گیارہ ڈالر کے برابر بنتی ہے۔ روس میں 1989ء سے 1994ء کے درمیان 1.6 بلین ڈالر کی براہ راست بیرونی سرمایہ کاری ہوئی جو مضحکہ خیز ہے۔ اسی عرصے میں چین نے 82.5 بلین ڈالر وصول کیے۔

ان اعداد و شمار کا مطلب یہ کہ مغربی سرمایہ کار روس میں اس لیے سرمایہ کاری نہیں کر رہے کیونکہ انہیں مستقبل پر کوئی یقین نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں مغربی حکومتوں کی طرف سے ملنے والی امداد اور آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے ملنے والے قرضے شامل نہیں ہیں۔ مگر یہ بھی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ تاہم

روس کا انحصار مغرب کی طرف سے ملنے والی خیرات پر بڑھتا جارہا ہے جو کہ پیش رفت کے لیے ایک بہت کمزور بنیاد ہے کیونکہ یہ ''امداد'' سامراجیوں کی سیاسی مصلحتوں اور قلیل المدت سیاسی مفادات کی بنا پر دی جاتی ہے جو کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتے ہیں۔

1996ء کے صدارتی انتخابات کے اگلے روز تک آئی ایم ایف واضح طور پر روسی معیشت کے اسکی شرائط پر پورا نہ اترنے پر آنکھیں بند کیے ہوئے تھا تا کہ انکے اپنے آدمی یعنی یلسن کو انتخابات میں شرمندگی سے بچایا جاسکے۔لیکن ماسکو حکومت کے قرضے معاف کرنے کی پالیسی اس وقت بھی آئی ایم ایف میں پھوٹ ڈالنے کا باعث بن رہی تھی۔ایک حصہ مزید رعایتیں دینے کے خلاف تھا اور سماجی عواقب سے قطع نظر منڈی کی اصلاحات کی رفتار تیز کرنے کیلئے یلسن پر مزید دباؤ ڈالنا چاہتا تھا جبکہ دوسرا دھڑا ان سماجی شورشوں سے خوفزدہ تھا جو اصلاحات کو مکمل طور تباہ کرسکتی تھیں۔بہرحال ایک سمجھوتہ طے پا گیا جس میں روس کو حسب وعدہ قرضہ تو دے دیا گیا مگر اس کی ادائیگی ماہانہ بنیادوں پر کی گئی۔اس طریقے سے بین الاقوامی مالیاتی سرمایہ صورت حال کو اپنے قابو میں رکھتا ہے۔وہ امداد یوں مہیا کررہے ہیں جیسے کوئی نرس بیمار شخص کو نلکی کے ذریعے مائع خوراک بہم پہنچاتی ہے۔اس طرح وہ جب چاہیں کسی بھی لمحے رسد منقطع کرسکتے ہیں۔آئی ایم ایف کے شکوک وشبہات بے بنیاد نہیں ہیں۔اصلاحات کرنے والوں کے معاشی اہداف قابل بھروسہ نہیں ہیں۔1994ء میں جس قدر ٹیکس جمع ہونے تھے ان سے نصف سے بھی کم جمع ہو پائے تھے۔دوسری طرف بین الاقوامی قرضہ جات بہت زیادہ ہیں۔اگر بین الاقوامی کمپنیاں روس میں سرمایہ کاری کرنے کو بے چین نہیں ہیں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ان کے حقیقی رویے کا اظہار روبل کی مستقل گراوٹ سے ہورہا ہے۔1995ء میں ریاستی بجٹ کی بنیاد ایک ڈالر کے مقابلے میں 3800 روبل کی اوسط شرح تبادلہ پر رکھی گئی تھی (جو بذات خود ایک تباہ کن گراوٹ ہے) لیکن 13 جنوری 1995ء میں یہ سطح مزید بلند ہوگئی تھی۔موجودہ شرح تبادلہ (مارچ 1997ء) ایک ڈالر کے مقابلے میں تقریباً 5700 روبل کی ہے۔

اس دوران معیشت بدستور کساد بازاری کا شکار رہے۔1996ء کے تمام سال کے دوران معاشی پیداوار گرتی رہی۔جی ڈی پی میں مزید چھ فیصد کمی واقع ہوئی۔صنعت میں پانچ فیصد اور زراعت میں 7 فیصد کمی واقع ہوئی۔سرمایہ کاری میں 18 فیصد کمی ہوئی۔ایک آزاد ذریعے کے اندازے کے مطابق اس وقت روس میں سرمایہ کاری کی سطح 1989ء کی سطح کا 1/5 ہے۔دوسری طرف بے روزگاری بڑھ کا 6 فیصد

سے 9.3 فیصد ہوگئی ہے۔ضروری اشیائے صرف کی قیمتوں میں 21.8 فیصد اضافہ ہوا ہے جبکہ مزدوروں کی قابل خرچ آمدنی میں کمی ہوئی ہے یا وہیں کی وہیں ہے، آبادی کے 10 فیصد امیر ترین لوگ نقد آمدنی کا 34 فیصد حاصل کرتے ہیں (1995ء میں یہ شرح 31 فیصد تھی)۔

معاشی زوال سرمایہ دار مبصرین کے لیے بھی روز فزوں پریشانی کا باعث بن رہا ہے اگر چہ حکومت اب بھی یہ جھوٹے دعوے کررہی ہے کہ صورت حال بہتر ہورہی ہے۔ ماسکو میں کارنیجی انیڈومنٹ کا تجزیہ نگار نکولائی پیٹروف لکھتا ہے کہ ''سماجی استحکام کی علامات کیسے ظاہر ہوسکتی ہیں جبکہ معیشت کی پیداواری بنیاد سکڑ رہی ہے اور سماجی تحفظ کا نظام تباہ ہورہا ہے؟ بہتری کی کوئی علامات نظر نہیں آرہی ہیں اور ہمارے ماہرین شماریات کے سربراہ کا ایسی علامات تلاش کرنے کی کوشش کرنا عجیب لگتا ہے جبکہ بحران یقینی طور گہرا ہورہا ہے۔''

طبقاتی تضادات اور ریاست

ٹراٹسکی کو یقین تھا کہ ایک سرمایہ دارانہ ردانقلاب صرف ایک خانہ جنگی کے نتیجے میں آسکتا ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ

''حکمران پرت نے اکتوبر انقلاب سے غداری کی ہے لیکن ابھی اس کا تختہ نہیں الٹا۔اس میں مزاحمت کی زبردست طاقت موجود ہے جس کی وجہ قائم شدہ ملکیتی رشتے ہیں، پرولتاریہ کی جاندار قوت ہے، اس کے بہترین عناصر کا شعور ہے، عالمی سرمایہ داری کا تعطل ہے اور عالمی انقلاب کا ناگزیر ہونا ہے۔''

پھر لکھتا ہے کہ ''دوسرا مفروضہ یہ ہے کہ اگر ایک بورژوا پارٹی حکمران سوویت دھڑے کا تختہ الٹتی ہے تو اسے موجودہ بیوروکریٹوں، منتظمین، ٹیکنیشنوں، ڈائریکٹروں، پارٹی سیکریٹریوں اور بالعموم بالائی مراعات یافتہ حلقوں میں خادمین کی ایک بہت بڑی تعداد تیار ملے گی۔اس صورت میں بھی بلاشبہ ریاستی مشینری کی تطہیر ضروری ہوگی۔لیکن غالباً بورژوا نظام بحال کرنے والوں کو ایک انقلابی پارٹی کے مقابلے میں کم لوگوں کا صفایا کرنا پڑے گا۔ نئے اقتدار کا سب سے بڑا فریضہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کی بحالی ہوگا۔ سب سے پہلے کمزور فارموں سے مضبوط کسانوں کی ترقی کے لیے سازگار حالات پیدا کرنے

ضروری ہوں گے اور مضبوط اجتماعی کاشت کاری کے فارموں کو پیدا کاروں کے بورژوا قسم کے امداد باہمی کے اداروں یا زرعی سٹاک کمپنیوں میں تبدیل کرنا ضروری ہوگا۔ عبوری دور میں منصوبہ بندی کے اصول کی جگہ ریاستی طاقت اور انفرادی کارپوریشنوں یعنی صنعت کے سوویت ناظمین، سابقہ ملک بدر مالکان اور بیرونی سرمایہ کاروں کے درمیان سمجھوتوں کا ایک سلسلہ لے لے گا۔ سوویت بیورکریسی بورژوا نظام کی بحالی کی تیاریوں میں بہت آگے تک جا چکی ہے لیکن اس کے باوجود نئے نظام حکومت کو ملکیت کی اشکال اور صنعت کے طریقہ ہائے کار میں اصلاحات متعارف کروانے کی بجائے ایک سماجی انقلاب لانا پڑے گا۔"

تاریخ میں ایسا پہلی بار نہیں ہوا کہ ایک گہری سماجی تبدیلی خانہ جنگی کے بغیر رونما ہوئی ہو۔ ایسے موقع بھی آئے ہیں کہ ایک نظام اس قدر کمزور ہوگیا کہ وہ بنا لڑے کسی گلے سڑے سیب کی طرح گر گیا۔ اس کی ایک مثال ہنگری کی ہے کہ جہاں 1919ء میں کاؤنٹ کارولی کی بورژوا حکومت گر گئی اور اقتدار کمیونسٹ پارٹی کے حوالے کر دیا۔ 1989ء میں مشرقی یورپ میں بھی کم وبیش ایسا ہی ہوا۔ سٹالنسٹ حکومتیں اس قدر مایوسی کا شکار تھیں کہ انہوں نے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیئے۔ پولینڈ میں جیروزلسکی نے اقتدار حزب مخالف کے حوالے کر دیا۔ یہ عوام کی مداخلت کے بغیر نہیں ہوا جو برسبیل تذکرہ سرمایہ داری کی بحالی کے خواہش مند نہیں تھے۔ لیکن داخلی عنصر کی غیر موجودگی میں سرمایہ داری کے حامی عناصر اس خلا کو پر کرنے اور تحریک کو سرمایہ دارانہ خطوط پر چلانے کے قابل ہو گئے۔ پولینڈ اور ہنگری میں کمیونسٹ پارٹی کی قیادتوں کی مدد سے ایسا کیا گیا۔

ابھی تک مشرقی یورپ اور روس میں جو کچھ ہوا ہے وہ بظاہر اس پیش گوئی سے متضاد ہے جو ٹراٹسکی نے خانہ جنگی کے بارے میں کی تھی۔ لیکن یہ بات قطعاً واضح نہیں ہے کہ اس عمل کا انجام کیا ہوگا۔ حقیقت میں سرمایہ داری کی جانب پیش رفت کی تحریک کو ہر مرحلے پر رکاوٹوں اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایسا قطعاً نہیں ہوا کہ اس کی سمت ایک ہی رہی ہو۔ 1991ء کی ناکام (فوجی) بغاوت اور وائٹ ہاؤس پر حملہ پرامن واقعات نہیں تھے۔ بیورکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان تنازعہ کا اظہار پارلیمانی بحث کے ذریعے نہیں بلکہ ٹینکوں اور مشین گنوں کی زبان میں کیا گیا تھا۔ صرف یہی حقیقت اس بات کو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے کہ بیوروکریسی کے اندر موجود تضادات قطعاً ضمنی نوعیت کے نہیں ہیں۔

مارکسسٹ مظاہر کو طبقاتی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس وقت روس میں بیوروکریسی کا طبقاتی کردار

کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ناممکن ہے اگر ہم اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں کہ یہ ایک عبوری مرحلہ ہے جس میں بنیادی تضادات ابھی تک کسی بھی حوالے سے حل نہیں ہوئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ موجودہ مرحلے میں بیوروکریسی تضادات سے چھلنی ہے جن کا کردار بنیادی طور پر طبقاتی ہے۔ بیوروکریسی کا ایک دھڑا جو یقینی طور پر اوپری پرت کی اکثریت پر مشتمل ہے خود کو سرمایہ دار بنانے کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ایک اور پرت عوام کی طرف سے مافیا سرمایہ داری کی مخالفت کی عکاسی کر رہی ہے۔ جبکہ دیگر اس انتظار میں ہیں کہ دیکھیں معاملات کی رخ اختیار کرتے ہیں۔

جس سوال کا جواب ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کیا نوزائیدہ بورژوازی ریاست کو کنٹرول کرتی ہے؟ اگر ہم کمیونسٹ مینی فسٹو میں مارکس اور اینگلز کے لکھے ہوئے ان الفاظ کو یاد کریں کہ ''جدید ریاست کی انتظامیہ صلاحیت محض تمام بورژوازی کے مشترکہ معاملات کا انتظام کرنے والی کمیٹی ہوتی ہے''، تو ہمیں کہنا پڑے گا کہ یہ تعریف روس کے موجودہ سیٹ اپ پر پوری طرح لاگو نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ یہاں یہ تعلق کہیں زیادہ پیچیدہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ روس کی نوزائیدہ بورژوازی ابھی تک تشکیل کے عمل سے گزر رہی ہے۔ یہ ابھی تک بحیثیت مجموعی سماج پر فیصلہ کن طور پر اپنی مہر ثبت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ یہ ابھی تک خود کو قائم کرنے کیلئے لڑ رہی ہے۔ بہت سے عناصر کا کردار ابھی تک عبوری نوعیت کا ہے۔ صورت حال قطعاً طے شدہ نہیں بلکہ بہاؤ میں ہے اور کئی ایک مختلف اطراف میں حرکت کرسکتی ہے۔ ابھی کچھ بھی فیصلہ کن طور پر طے نہیں ہوا۔

ریاست کیا ہے؟ اگر ہم مسلح لوگوں کے جتھوں والی تعریف کا اطلاق کریں تو یہ چیز قطعاً واضح نہیں کہ روسی فوج، پولیس اور سکیورٹی فورسز کو نوازئیدہ سرمایہ دار ہی کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ تمام کے تمام بحران کا شکار ہیں۔ ''اصلاحات'' ایک کے بعد دوسری تباہی لے کر آئی ہیں۔ یہاں اصلاحات نافذ کرنے والوں کیلئے زیادہ جوش و خروش نہیں ہوسکتا۔ یہ سچ ہے کہ اعلیٰ فوجی حکام نے فائدہ اٹھایا ہے لیکن دیگر اہلکار تو ایک طرف رہے جونیئر افسران کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آیا۔ جیسا کہ یلسن اعتراف کرتا ہے۔ 1993ء میں وائٹ ہاؤس پر حملے کے موقع پر فوج آخری وقت تک شش و پنج کا شکار رہی۔ کیا اسے مسلح افواج پر یلسن کے حامیوں کے مضبوط کنٹرول کے طور پیش کیا جاسکتا ہے؟ قطعاً نہیں! پولیس اور سکیورٹی کے اداروں میں بھی صورت حال زیادہ بہتر ہونے کا امکان نہیں۔ بقیہ بیوروکریسی منقسم ہے۔ منتخب صدر ہونے کے باوجود حقیقتاً یلسن کی بنیاد کافی محدود ہے۔ اقلیت بورژوا دوست ہے مگر بہت بڑی اکثریت منتظر ہے کہ دیکھیں کیا

ہوتا ہے۔ وہ حسب معمول جیتنے والوں کا ساتھ دیں گے۔ دوسرے الفاظ میں وہ کس طرح حرکت میں آئیں گے اس کا دارومدار طاقتوں کے طبقاتی توازن پر ہوگا۔

پچھلے چھ سالوں کے تمام مدوجزر کے دوران پرانی ریاستی مشینری بنیادی طور پر اپنی جگہ برقرار رہی ہے۔ جو تبدیلیاں کی گئیں وہ زیادہ تر معمولی نوعیت کی تھیں۔ یلسن نے اس خوف کے تحت کے جی بی کو ختم کرنے کی کوشش کی کہ مستقبل میں اس کے خلاف ہونے والی کٹر سٹالنسٹوں کی بغاوت کی صورت میں وہ ان کی حمایت پر مائل ہوسکتی تھی۔ کے جی بی کا نام بدل کر انٹر رپبلیکن سکیورٹی سروس رکھ دیا گیا اور اسے روسی وزارت برائے سلامتی وداخلی امور میں ضم کردیا گیا۔ تاہم ناموں کی تبدیلی کے باوجود ریاستی سکیورٹی سروس کو ختم کرنا یلسن کے لیے ناممکن ہے۔ پرانا نیٹ ورک بدستور قائم ہے اور روس کے اندر اور باہر تمام سطحوں پر کام جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی تبدیلی کے باوجود وہی پرانی سٹالنسٹ ریاست کی بیوروکریسی ،فوجی ٹولے، پولیس اور کے جی بی کی شکل اپنی جگہ قائم و دائم ہے۔ درحقیقت بیوروکریسی اپنے عہدوں سے چمٹے رہنے میں غیر معمولی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ 1917ء کے بعد بھی لینن نے کہا تھا کہ سوویت رنگ کی پتلی سی تہہ کے نیچے وہی پرانے زار شاہی اہل کار موجود ہیں۔

یہ اہل کار خود کو سب سے زیادہ بولی لگانے والے کے آگے فروخت کرنے کیلئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں اگر ان کی مراعات یافتہ حیثیت برقرار رہے چاہے یہ بولی لگانے والے لبرل ہوں یا قدامت پسند، سوشلسٹ ہوں یا فاشسٹ۔ اس وجہ سے بیوروکریسی کو ایک طے شدہ چیز کے طور پر دیکھنا غلط ہے۔ یہ عامل ایک عہدے سے دوسرے اور پھر واپس اسی عہدے پر نہایت سہولت سے آجاسکتے ہیں۔ صرف ایک حقیقی مزدور جمہوریت پر مبنی نظام ہی بیوروکریسی کا خاتمہ کرسکتا ہے۔ 1917ء میں اس کی کوشش کی گئی تھی لیکن انتہائی کمتر مادی اور ثقافتی بنیاد کے باعث بالآخر ناکام ہوگئی کیونکہ یہ عوام کے صنعت، سماج اور ریاست کے انتظام میں شریک ہونے میں مانع تھی جیسا کہ لینن کو پہلے سے ادراک تھا۔ پرانی بیوروکریسی نے خود کو مزدور ریاست کے جسم پر بدگوشت کی طرح برقرار رکھا اور بالآخر اس کی جڑیں کھوکھلی کردیں۔

حیرت انگیز آسانی سے سابقہ ''کمیونسٹ'' قیادت کا ایک بڑا حصہ سرمایہ داری کی جانب مڑ گیا۔ تاہم اگر انہیں متوقع نتائج حاصل نہ ہوئے تو ان کا ایک حصہ اتنی ہی آسانی سے واپس بھی پلٹ سکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ کچھ بیوروکریٹوں نے نج کاری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن ان سے کہیں زیاہ ایسے

ہیں جنہیں کچھ نہیں ملا۔ ایسے منیجروں کو بھی دیوالیہ پن کا سامنا ہے جنہوں نے چالبازی سے اپنی ہی فرموں پر قبضہ کرلیا تھا۔ بیوروکریسی کا ایک حصہ کسی وقت مزدور طبقے کی حمایت سے نوازئیدہ بورژوازی پر بھی ضربیں لگا سکتا ہے جس کا دارومدار اس بات پر ہے کہ صورت حال کیا رخ اختیار کرتی ہے۔

موجودہ روسی ریاست دوغلی ہے جو پرانی نوکرشاہانہ مشینری کے ساتھ ایک بورژوا ریاست کے عناصر کا پیوند لگانے سے تشکیل پائی ہے۔ وہی پرانے اہل کار انہیں مفادات، نقطہ نظر اور تعصّبات کے ساتھ انہی دفاتر میں براجمان ہیں اور ان میں سے کچھ توقعات کے ساتھ اور کچھ روز افزوں خوف کے ساتھ نئی تبدیلیاں دیکھ رہے ہیں۔ اس بات پر زور دینا ضروری ہے کہ یہ ایک مزدور ریاست نہیں تھی بلکہ بھیانک طور پر مسخ شدہ مزدور ریاست تھی یعنی پرولتاری بوناپارٹ ازم کا نظام۔ کئی نسلوں پر محیط آمرانہ حکمرانی کے بعد مراعات یافتہ حکمران ٹولہ مکمل طور پر بدعنوان ہو چکا تھا۔ بوناپارٹسٹ نظام کی ماہیت ہی ایسی ہے کہ وہ سماج سے بالاتر ہو جاتا ہے اور بہت حد تک خودمختاری حاصل کر لیتا ہے۔

لینن کا یہ بیان کہ تاریخ ہر قسم کی عجیب وغریب تبدیلیوں سے آگاہ ہے اس عجیب انداز سے براہ راست نسبت رکھتا ہے جس طرح 1945ء کے بعد سابقہ نوآبادیاتی ممالک میں پرولتاری بوناپارٹسٹ حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں ترقی یافتہ سرمایہ دار ممالک کی نسبتاً مستحکم اور طے شدہ کردار کی حامل ریاست اور سابقہ نوآبادیاتی اقوام کی کم ترقی یافتہ ریاست کے درمیان تمیز ضروری ہے۔ کم از کم ماضی میں سرمایہ دار ممالک میں بورژوازی کا ایک کردار تھا اور وہ مستقبل کے بارے میں پر اعتماد تھی۔ اس نے پیداواری قوتوں کو ترقی دینے میں ایک حقیقی ترقی پسندانہ کردار ادا کیا تھا۔ اس کے پاس ریاست کو اپنی طبقاتی حکمرانی کے آلے کی حیثیت سے کامل بنانے کیلئے کئی نسلوں پر محیط وقت موجود تھا۔ فوج، پولیس، سرکاری ملازم، درمیانی پرتیں اور بالخصوص سول سروس کے سربراہ، شعبوں کے سربراہ، پولیس کے سربراہ، کرنل اور جرنل حکمران طبقے کی ضروریات اور مفادات کے تحفظ کے لیے نہایت احتیاط سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ ایک ترقی یافتہ معیشت، ایک مشن اور اس میں اپنے کردار کے باعث وہ جوش وخروش سے ''قومی مفاد'' یعنی صاحب ملکیت طبقے یا حکمران طبقے کی خدمت کرتے ہیں۔ تاہم نوآبادیاتی انقلاب کے بعد ظہور میں آنے والی پس ماندہ سرمایہ دارانہ حکومتوں کے سلسلے میں صورت حال بالکل مختلف ہے۔

سامراج کے انخلا کے بعد شام، برما، ایتھوپیا جیسے ممالک میں جو ریاست وجود میں آئی وہ طے شدہ

اور جامع نہیں تھی۔ کچھ فرق کے ساتھ یہی بات افغانستان کے سلسلے میں بھی درست تھی۔ ان تمام ممالک میں بوژوازی کی کمزوری اور نا اہلیت نے فوجی ٹولے کو ایک مخصوص خودمختاری دی۔ اس کے نتیجے میں فوجی بغاوتوں اور جوابی بغاوتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن آخری تجزیئے میں وہ حکمران طبقے کے طبقاتی مفادات کی عکاسی کرتی تھیں۔ وہ کوئی آزاد کردار نہیں ادا کرسکتی تھیں۔ فوج کے مختلف دھڑوں کے درمیان جدوجہد سماج میں موجود عدم استحکام اور تضادات کی عکاسی کرتی تھی۔ جرنیلوں کے ذاتی اغراض و مقاصد سماج میں موجود مختلف طبقات کے حصوں یا سماجی طبقات مثلاً پیٹی بورژوازی کی مختلف پرتیں، بورژوازی اور یہاں تک کہ بعض مخصوص حالات میں پرولتاریہ کے مفادات کی بھی عکاسی کرتے تھے۔

بونا پارٹسٹ حکومتیں ہوا میں قائم نہیں ہوتیں بلکہ ان کا انحصار طبقات کے درمیان توازن پر ہوتا ہے۔ آخری تجزیئے میں وہ سماج کے غالب طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔ پیداواری قوتوں سے ریاست کا تعلق، آخری تجزیئے میں اس کے طبقاتی کردار کا تعین کرتا ہے۔ بعض اوقات مختلف دھڑوں کی مسلح افواج یا مسلح افواج کے دھڑے حکمران طبقے کے مختلف حصوں اور یہاں تک کہ سامراجی دباؤ بالخصوص امریکی سامراج کے دباؤ کی عکاسی کرسکتے ہیں، لیکن اب تک انہوں نے ہمیشہ نجی ملکیت کے دفاع میں حکمران طبقے کے مفادات کی عکاسی کی ہے۔

بہرحال مارکس ازم پیداواری قوتوں میں سماج کی ترقی کی کلید پاتا ہے۔ سرمایہ دارنہ بنیاد پر اب آگے کی جانب کوئی راستہ نہیں ہے بالخصوص افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ کے لیے۔ یہی وجہ ہے کہ دانشور یا دیگر فوجی افسران نے اپنے سماجوں کی زوال پذیری سے متاثر ہوکر بعض حالات میں اپنی وفاداریاں تبدیل کرلیں۔ سرمایہ داری سے پرولتاری بونا پارٹ ازم کی جانب آنے سے حقیقتاً ان کی طاقت، وقار، مراعات اور آمدنی میں اضافہ ہوا۔ کچھ عرصے کے لئے وہ ماضی کے مقابلے میں بھی عوام سے بلند تر ہوکر سماج کی واحد حاکم اور راہنما پرت بن گئے۔ یہ عجیب وغریب تبدیلی دوسری جنگ عظیم کے بعد کے دور میں مذکورہ بالا ممالک میں واقعتاً رونما ہوئی۔ درحقیقت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تبدیلیاں رونما ہوئیں مثلاً گیانا میں، جہاں سی آئی اے کے ایک سابق ایجنٹ فوبے برن ہام نے تمام معیشت کو قومی تحویل میں لے لیا تھا۔

کیا روس میں اس قسم کی تبدیلی ممکن ہے؟ اس کا دارومدار عوامل کے ایک پورے سلسلے پر ہے، سب سے بڑھ کر عالمی معیشت کے ارتقا پر۔ تاہم ہم صورت حال کے مندرجہ ذیل عناصر کی جانب اشارہ کرسکتے

ہیں جو بظاہر اثبات میں جواب فراہم کرتے ہیں۔ اول، روسی سرمایہ داری کا تعطل جس کی وضاحت قبل ازیں کی جا چکی ہے۔ دوم، مافیا بوژوازی کا گھناؤ ناپن جو سماج کو آگے لے جانے کی اہلیت سے عاری ہے۔ سوم، جنرل سٹاف سمیت روسی مسلح افواج کے اندر موجود انتہائی غیر مستحکم اور دھماکہ خیز صورتحال جہاں سکینڈلز، چھانٹیاں اور دیگر تبدیلیاں معمول بن چکی ہیں۔ چہارم، ایک قومیائی ہوئی منصوبہ بند معیشت اور مرکزیت کی روایت جو یقیناً بہت سے فوجی افسروں کے لیے ایک خوشگوار یاد کی حیثیت رکھتی ہوگی۔ یہ روایت اور گزشتہ عظمتوں کی یاد ویسی ہی زبردست کشش کی حامل ہے جیسا شام اور افغانستان کے فوجی جرنیلوں کے لیے سوویت یونین اور چین کا وجود تھا۔ لہذا بعض مخصوص حالات میں یہ بات یقیناً ممکن ہے کہ روسی جرنیل فیصلہ کریں کہ بہت ہو چکا، اور مزدور طبقے کا سہارا لے کر نوازئیدہ بورژوازی کے خلاف وار کریں۔

ریاست کو ایک ایسی چیز خیال کرنا غلط ہے جو ہمیشہ کیلئے طے شدہ ہو۔ موجودہ روسی ریاست تضادات سے چھلنی ہے اور اسی باعث غیر مستحکم ہے۔ یہ کسی جدید سرمایہ دار ریاست کی بجائے ایشیا، افریقہ اور مشرق وسطیٰ کی ریاستوں سے کہیں زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ یہ ہر سمت مڑ سکتی ہے جس کا انحصار اس پر پڑنے والے مختلف قسم کے دباؤ پر ہے۔ بالعموم سماجی ارتقا تضادات کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ اس پر دباؤ ہے۔ اس سے بڑا تضاد کیا ہو سکتا ہے کہ اکتوبر انقلاب کے اسی برس بعد سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک چل سکتی ہے؟ اور یہ عین اس وقت ہو رہا ہے جب منڈی ہر جگہ یہ ثابت کر رہی ہے کہ اس میں انسانیت کو آگے لے جانے کی صلاحیت نہیں ہے۔

بیوروکریسی میں موجود متضاد رجحانات

بیوروکریسی کی بالائی پرتیں نوازئیدہ بوژوازی اور سب سے بڑھ کر عالمی سامراج کے دباؤ کی عکاسی کرتی ہیں اور نچلی پرتیں مزدور طبقے کے دباؤ کی۔ اس تضاد کی عکاسی بیوروکریسی کے مختلف دھڑوں کے درمیان کشمکش سے ہوتی ہے جو بعض اوقات وائٹ ہاؤس (پارلیمنٹ) پر حملے جیسے پرتشدد تصادم کی شکل میں سامنے آتی ہے اور کبھی کم و بیش دبی رہتی ہے لیکن مختلف افراد اور گروہوں کے عروج و زوال میں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمائے کی حکمت عملیاں وضع کرنے والے کریملن میں ہونے والی اقتدار کی

غیر واضح کشمکش کے ہر پیچ وخم کا اتنی احتیاط سے جائزہ لیتے ہیں۔اس جدوجہد کا نتیجہ ہی ریاست کی نوعیت کا تعین کرے گا۔لیکن اس کی قبل از وقت پیش گوئی آسان نہیں ہے۔اس کا تعین بہت سے داخلی اور خارجی عوامل کا مجموعہ کرتا ہے۔تاریخ نے ابھی اس امر کا فیصلہ نہیں کیا ہے کہ روسی ریاست کا ارتقا کس طرح ہوگا۔ حکومت پر قابض بورژوا دھڑا سرمایہ داری کی بحالی کی کوشش کر رہا ہے لیکن وہ ابھی تک اس مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔صورت حال جامد اور طے شدہ نہیں بلکہ انتہائی دھما کہ خیز ہے۔یہ کسی بھی جانب جاسکتی ہے۔

مارکسی تجزیئے کے انتہائی مشکل کاموں میں سے ایک یہ ہے کہ اس مقام کا ٹھیک ٹھیک تعین کیا جائے جہاں مقدار معیار میں تبدیل ہو جاتی ہے۔مثال کے طور پر وہ کون سا مقام تھا جہاں سٹالنسٹ سیاسی رد انقلاب فتح سے ہمکنار ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے میں ٹراٹسکی کو کئی سال کا عرصہ لگا جس دوران اس نے ایک سے زیادہ بار اپنی ضابطہ بندیوں کو تبدیل کیا۔چھ سال بعد سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک ایک سنجیدہ سماجی بنیاد تخلیق کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔بعض اندازوں کے مطابق نوازئیدہ بورژوازی آبادی کے تقریباً دس فیصد حصے پر مشتمل ہے اور مزید دس فیصد لوگ ایسے ہیں جو کسی نہ کسی طرح ان کی سرگرمیوں پر انحصار کرتے ہیں۔روس کی آبادی کا پانچواں حصہ ایسی قوت نہیں ہے جسے خاطر میں نہ لایا جائے۔اگرچہ ان کی اکثریت انسانی کاٹھ کباڑ پر مشتمل ہے یعنی نوسرباز، نودولتیئے، کالا دھندا کرنے والے اور پیٹی بورژوازی جو اپنے خود غرضانہ مفادات کا دفاع کریں گے اور ان کی اسلحہ کی بہت بڑی مقدار تک رسائی بھی ہے۔وہ جاگیردار نوابوں کی مانند ہیں جو اپنے ہمراہ مسلح افراد کے جتھے رکھا کرتے تھے۔

ان قوتوں کے مقابلے میں ہمارے پاس کروڑوں مزدور ہیں جو کمیونسٹ پارٹی اور اس کے اتحادیوں کو ووٹ دیتے ہیں اور کم وبیش ایک تہائی بنتے ہیں۔علاوہ ازیں طاقتوں کے طبقاتی توازن کو کبھی بھی خالصتاً ریاضیاتی رشتے تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔کمیونسٹ پارٹی کی حمایت کا مرکز بھاری صنعتیں ہیں جہاں بڑے بڑے اداروں میں مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کام کرتی ہے۔پچھلی تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے باعث ان میں سے بہت سوں کی بڑی بڑی رقوم واجب الادا ہیں۔انہوں نے اپنے معیار زندگی کو تباہ ہوتے اور اپنے خاندانوں کو غربت کا شکار ہوتے دیکھا ہے جبکہ نودولتیئے ان کی نظروں کے سامنے دولت لٹا رہے ہیں۔

سامراجی نام نہاد اصلاحات کے اگلے مرحلے پر عمل درآمد کے لیے ماسکو حکومت پر زبردست دباؤ

ڈال رہے ہیں۔اس کا مقصد ریاست اور صنعت کے درمیان تعلق کو فیصلہ کن انداز میں منقطع کرنا ہوگا یعنی نج کاری شدہ اداروں کو ریاستی رقوم کی فراہمی کا خاتمہ جس سے یہ ادارے دیوالیہ ہو جائیں گے۔اس کا مطلب بے مثال پیمانے پر وسیع بے روزگاری اور معاشی ٹوٹ پھوٹ ہوگا۔اس کے مقابلے میں ماضی قریب میں رونما ہونے والا انحطاط کسی ٹی پارٹی کی طرح لگے گا۔یہ ''دوستانہ مشورہ'' دیتے وقت مغرب کے پیش نظر روسی مفادات ہرگز نہیں ہیں۔یہ خالصتاً اس خواہش کے پیش نظر دیا جا رہا ہے کہ سرمایہ داری کی بحالی کے عمل کو ان پلٹ بنا دیا جائے تا کہ روس مغربی سرمایہ داری کے لیے ''محفوظ'' ہو جائے۔تاہم زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اس کا الٹا اثر ہوگا۔ایسے کسی بھی منصوبے کا نتیجہ لازمی طور پر سماجی شورشوں اور طبقاتی جدوجہد کے دھماکے کی صورت میں سامنے آئے گا۔درحقیقت اس کا آغاز پہلے ہی ہو چکا ہے۔

غالباً اس لڑائی کے نتیجے میں ہی یہ فیصلہ ہوگا کہ روس کس سمت جائے گا۔ہم درج ذیل مفروضہ پیش کرتے ہیں۔اگر روسی پرولتاریہ متحرک نہ ہوا (اور ایسے مفروضے کو پہلے ہی سے خارج از امکان قرار دیا جاسکتا ہے) یا اگر مزدور لڑتے ہیں اور انہیں مسلسل فیصلہ کن شکستوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اگر اس کے بعد حکومت اپنا پروگرام آگے بڑھانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو یہ امر صورت حال میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوسکتا ہے۔لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ اس جدوجہد کا نتیجہ پہلے سے معین نہیں ہے۔ایک بار عظیم روسی مزدور طبقے نے اپنا وزن پلڑے میں ڈال دیا تو شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔دوسرے اگر ردانقلابی آئی ایم ایف کے منصوبوں کو آگے بڑھانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو روسی معیشت کے لیے اس کا مطلب ایک نئی تباہی ہوگا۔وہ چاہے کوئی اور بھی کامیابی حاصل کر لے لیکن استحکام کا دور نہیں لا سکے گا۔

اس صورت حال کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا اس سلسلے میں قبل از وقت پیش گوئی نہیں کی سکتی۔یہ بات قطعاً خارج از امکان قرار نہیں دی جاسکتی کہ خوفناک سماجی شورشوں کے دور کے بعد مزدور طبقے کی ہڈیوں پر ایک بورژوا نظام حکومت قائم ہوسکتا ہے جو ناگزیر طور پر بورژوا بونا پارٹ ازم پر مبنی ہوگا۔عمومی تاریخی نقطہ نظر سے یہ ایک انتہائی غیر موافق تبدیلی ہوگی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انقلاب ایجنڈے سے خارج ہو جائے گا۔بے دلی اور مایوسی کے ایک ناگزیر دور کے بعد مزدور طبقہ پھر سنبھالا لے گا بالخصوص معاشی بحالی کی صورت میں، اور ایک بار پھر میدان عمل میں آجائے گا لیکن اس بار اسے مارکیٹ اکانومی کی نعمتوں کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہوگی۔

بالآخر روس میں سرمایہ داری کی فتح کا تعین رائج الوقت ملکیتی رشتے کریں گے۔سرمایہ داری کی

بحالی کا عمل شروع ہو چکا ہے لیکن ابھی فیصلہ کن طور پر حل نہیں ہوا ہے۔اور اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک کسی نہ کسی طرح متحارب گروہوں اور طبقات کے درمیان ہونے والی کشمکش کسی نتیجے پر نہیں پہنچتی۔کیا یہ کہنا درست ہے کہ سرمایہ داری کی بحالی کی تحریک ان پلٹ ہو چکی ہے؟ سرمایہ داری کی حکمت عملیاں وضع کرنے والے ایسا خیال نہیں کرتے اور نہ ایسا سمجھتے ہیں۔

عرصہ گزرا ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی کہ بیوروکریسی قومیائی ہوئی صنعتوں کے کنٹرول سے حاصل ہونے والی مراعات اور ٹھاٹھ باٹھ پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ جائے گی بلکہ خود کو صاحب جائیداد بنانے کی کوشش کرے گی تا کہ اپنی حیثیت کو مستحکم کر سکے اور اپنی دولت اپنے بچوں کو منتقل کر سکے۔یہ پیش گوئی سچ ثابت ہوئی ہے۔لیکن اس نے خود کو اس عمومی مشاہدے تک محدود نہیں رکھا بلکہ بیوروکریسی میں موجود مختلف رجحانات کا گہرائی میں جا کر تجزیہ کیا۔بیوروکریسی ''شے بالذات'' نہیں ہے۔ایک دیئے گئے سماج میں وجود رکھتی ہے اور مختلف طبقاتی مفادات کی عکاسی کر سکتی ہے۔ 1920ء کی دہائی میں بیورکریسی کا ایک حصہ امیر کسانوں اور کاروباری حضرات کے شانہ بشانہ کھڑا تھا اور سرمایہ داری کی بحالی کے حق میں تھا۔اس رجحان کا ترجمان بخارین پرانے بالشویک لیڈروں میں سے ایک تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ شعوری طور پر پرانے نظام کی بحالی کا متمنی نہیں تھا۔لیکن لاشعوری طور پر وہ بورژوا عناصر کے دباؤ کی عکاسی کر رہا تھا۔دوسری جانب ٹراٹسکی اور لیفٹ اپوزیشن شعوری طور پر پرولتاریہ کے مفادات کے دفاع پر کمر بستہ تھے۔سٹالن کو اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔وہ مختلف دھڑوں کے درمیان توازن قائم رکھتا تھا لیکن وہ ریاست،صنعت اور پارٹی میں موجود لاکھوں اہلکاروں کی نمائندگی کرتا تھا جو اپنی طاقت اور مراعات میں اضافے کی تگ و دو کر رہے تھے۔

زائد پیداوار کون استعمال کرے گا؟

اپنی آخری اہم تحریر ''سٹالن'' میں ٹراٹسکی 29-1924ء کے دور میں بیورکریسی اور نوزائیدہ بورژوازی کے درمیان جدوجہد کا وسیع سائنسی تجزیہ پیش کرتا ہے۔بدقسمتی سے مارکسسٹ ان سے مناسب حد تک واقف نہیں ہیں لیکن یہ سطور روس میں ہونے والی اس جدوجہد پر بہت واضح روشنی ڈالتی ہیں جو ہماری نظروں کے سامنے جاری ہے۔

’’امیر کسان چھوٹے صنعت کار کے ساتھ ملکر سرمایہ داری کی مکمل بحالی کے لیے کام کر رہا تھا۔اس طرح قومی محنت سے حاصل ہونے والی زائد پیداوار کے لیے نا قابل مصالحت جدوجہد کا آغاز ہوا۔ مستقبل قریب میں اسے کون خرچ کرے گا نئی بورژوازی یا سوویت بیوروکریسی؟ یہ اگلا مسئلہ تھا۔ جو زائد پیداوار کو استعمال کرتا ہے اس کے قبضے میں ریاست کی طاقت ہوتی ہے۔ اسی چیز نے ایک طرف پیٹی بورژوازی جس نے محنت کش عوام اور ان کی ترجمان لیفٹ اپوزیشن کی مزاحمت کو کچلنے میں بیوروکریسی کی مدد کی تھی اور بذات خود ردانقلابی بیوروکریسی کے درمیان، جس نے کسانوں پر بالادستی حاصل کرنے میں پیٹی بورژوازی کی مدد کی تھی، کشمکش کا آغاز کر دیا۔‘‘

’’ظاہر ہے کہ بیوروکریسی پرولتاری ہراول دستے کی تباہی، عالمی انقلاب کی پیچیدگیوں سے علیحدگی اور عدم مساوات کے فلسفے کو جائز قرار دینے کی مرتکب اس لیے نہیں ہوئی تھی کہ وہ بورژوازی کے آگے ہتھیار ڈال دے۔اس کی خادم بن جائے اور بالآخری ریاستی خزانے سے دست کشی اختیار کر لے۔‘‘

یہاں ہمیں مختصر الفاظ میں بیوروکریسی کی مختلف پرتوں کے درمیان جدوجہد کی طبقاتی اساس کا شاندار خلاصہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ تصادم قدر زائد کے حصول کی خاطر ہے اور جو کوئی بھی اس کا مالک ہوتا ہے ریاست پر اس کا کنٹرول ہوتا ہے۔اس طرح بیوروکریسی اور نوزائیدہ بورژوازی کے درمیان فرق کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ قدر زائد کے حصول کے دو مختلف طریقے ہیں۔لیکن یہ کوئی ثانوی اہمیت کا سوال نہیں ہے۔ بورژوازی ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کی بنیاد پر براہ راست قدر زائد حاصل کرتی ہے۔ بیوروکریسی اپنی طاقت، آمدنی اور مراعات ریاستی ملکیت سے حاصل کرتی ہے۔ درحقیقت اس کا واحد ترقی پسندانہ عمل یہ تھا کہ اس نے ریاستی ملکیت کا دفاع کیا۔ اگرچہ جیسا کہ ٹراٹسکی نے کہا تھا اس نے اپنی مراعات کے مقابلے میں سوویت یونین کا دفاع کہیں کم کیا تھا۔ بہرحال اپنی حیثیت کے لیے قومیائی ہوئی معیشت پر انحصار کرنے والی بیوروکریسی کے مفادات نوزائیدہ بورژوازی کی تمناؤں اور مفادات سے متصادم تھے۔

اس کے باوجود ٹراٹسکی سوویت ریاست کے مستقبل کے آگے سوالیہ نشان لگا کر احتیاط کا تقاضا پورا کر رہا تھا۔اس نے اس بات کو خارج از امکان قرار نہیں دیا کہ ایک خاص مرحلے پر نوکر شاہانہ ردانقلاب کا عمل اکتوبر انقلاب کے قائم کردہ ملکیتی رشتوں کے خاتمے کا باعث بن سکتا ہے۔

’’جب ترقی پسند سماجی فتوحات کی چرخی کا دھاگہ کھلنے لگتا ہے تو ردانقلاب پاؤں جمانے لگتا ہے۔

کھلنے کے اس عمل کا کوئی اختتام نظر نہیں آتا۔ تاہم انقلاب کی فتوحات کا کچھ حصہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا خوفناک نوکرشاہانہ توڑ مروڑ کے باوجود سوویت یونین کی طبقاتی اساس بدستور پرولتاری ہے۔ لیکن ہمیں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ادھڑنے کا یہ عمل ابھی مکمل نہیں ہوا اور آئندہ چند دہائیوں کے لیے یورپ اور دنیا کے مستقبل کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔ روسی رجعت نے بلاشبہ بورژوا حکمرانی کے نئے عہد کا آغاز کر دیا ہوتا اگر یہ حکمرانی دنیا بھر میں متروک ثابت نہ ہو چکی ہوتی۔ بہرصورت مساوات کے خلاف جدوجہد اور بہت گہری سماجی تفریق کا قیام ابھی تک عوام کے اشتراکی شعور یا زمین اور ذرائع پیداوار کی نیشنلائزیشن کے خاتمے میں ناکام رہا ہے جو کہ انقلاب کی بنیادی سوشلسٹ فتوحات تھیں۔ ان حاصلات کی تحقیر و تذلیل کے باوجود بیوروکریسی نے ابھی تک ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کو دوبارہ بحال کرنے کی کوشش نہیں کی۔'' (20)

ٹراٹسکی نے سوویت ریاست کی طبقاتی نوعیت کا ایک حتمی اور ہمیشہ کیلئے طے شدہ تجزیہ پیش نہیں کیا بلکہ اس نے یہ سوال بالکل کھلا چھوڑ دیا ہے کہ وہ بالآخر کونسی سمت اختیار کرے گی۔ اس کا تعین جیتی جاگتی قوتوں کی جدوجہد سے ہوگا جو پھر اٹوٹ طور عالمی پیمانے پر ہونے والی تبدیلیوں سے منسلک ہے۔

''اس وقت اس سوال کا حتمی اور ناقابل تنسیخ جواب دینا ناممکن ہے کہ آئندہ تین، پانچ یا دس سال کے دوران سوویت سماج کے معاشی تضادات اور سماجی مخاصمتیں کونسی سمت اختیار کریں گی۔ نتیجے کا دارومدار جیتی جاگتی سماجی قوتوں کی جدوجہد پر ہوگا اور قومی پیمانے پر نہیں بلکہ عالمی پیمانے پر۔ لہٰذا ہر نئے مرحلے پر حقیقی تعلقات اور رجحانات کا ان کے ربط اور مسلسل عمل باہم کی بنیاد پر ٹھوس تجزیہ کرنا ضروری ہے۔''

بیوروکریسی کی سماجی بناوٹ کبھی بھی ہم جنس یا متجانس نہیں رہی تھی۔ اس میں وہ باہمی جڑت بھی نہیں جو بورژوازی اور پرولتاریہ میں موجود ہے۔ یہ ایک بڑی اور انتہائی غیر یکساں سماجی تشکیل ہے۔ مقامی پارٹی سیکریٹریز اور اعلیٰ قیادت میں ہمیشہ ایک بہت بڑا فرق موجود رہا تھا۔ مزدور طبقے کی انقلابی تحریک ابھرنے کی صورت میں بیوروکریسی کے کم حیثیت عہدیدار بڑی تعداد میں انقلاب میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن بیوروکریسی کے اعلیٰ حلقوں میں بھی ہمیشہ متضاد رجحانات پائے جاتے تھے۔ ٹراٹسکی نے خبردار کیا تھا کہ بیورکریسی انقلاب سے غداری کرے گی اور خود کو صاحب جائیداد بنا کر اپنی آمدنیوں اور مراعات کو تحفظ فراہم کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن صرف اس کی اوپری پرتیں ہی اس سے فائدہ

اٹھا سکیں گی۔

ایک طرف بورژوا حکومت ہے جو پوری شدومد کے ساتھ سرمایہ داری کی بحالی کیلئے کوشش کر رہی ہے لیکن اسے بہت سی مختلف سطحوں پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ کوئی سیدھا سادھا عمل ہر گز نہیں ہے۔ یلسن نے ایک ''بورژوا جمہوریت'' قائم کی ہے جو قطعاً اس قسم کی چیز نہیں ہے۔ دوسری طرف ایک بدعنوان مافیا سرمایہ داری ہے جو ایک خوفناک معاشی انہدام کی سربراہی کر رہی ہے۔ بدعنوانی پہلے کی نسبت دس گنا بڑھ چکی ہے۔ اور تمام غلاظت کے اوپ وہی پرانی بیوروکریسی براجمان ہے۔ درحقیقت وہ پہلے سے زیادہ مسلط ہے۔ روسی فیڈریشن میں سوویت یونین کے مقابلے میں 1.8 گنا زیادہ بیوروکریٹس ہیں جبکہ اس کی آبادی پہلے کی نسبت 13 کروڑ کم ہو چکی ہے۔

یہ سچ ہے کہ چرنومرڈن جیسے بیوروکریٹوں نے نج کاری سے خوب فائدا اٹھایا ہے۔ لیکن بہت سے محروم رہے ہیں۔ اپنی ہی فرموں پر قبضہ جما لینے والے منیجروں کو بھی اب دیوالیہ پن کا سامنا ہے۔ بیوروکریسی کا چرنومرڈن والا دھڑا نجی ملکیت کے حق میں ہے۔ ایک اور دھڑا پرانے نظام سے چمٹے رہنے کو زیادہ قابل ترجیح خیال کرتا ہے۔ جبکہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان نچلے اور درمیانے درجے کے اہل کاروں کا ایک جم غفیر ہے جو تذبذب کا شکار ہے اور یہ لوگ اس دھڑے کا ساتھ دیں گے جو انہیں جیتتا دکھائی دے گا۔

جنگ عظیم دوم سے پہلے ٹراٹسکی نے بیوروکریسی میں بوتنکو اور رئیس دھڑوں کا ذکر کیا تھا۔ بوتنکو ایک سوویت اہل کار تھا جو فاشسٹوں سے جا ملا تھا جبکہ رئیس (جی پی یو) خفیہ پولیس کا افسر تھا جس نے چوتھی انٹرنیشنل کی حمایت کا اعلان کیا تھا اور بعد ازاں سٹالن کے ایجنٹوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس سے ٹراٹسکی کی مراد یہ تھی کہ بیورورکریسی کے اندر بھی مختلف النوع رجحانات پائے جاتے تھے جن میں بوتنکو جیسے صریح اور کھلے رد انقلابیوں سے لیکر رئیس جیسے حقیقی لیننن اسٹ شامل تھے۔ اس نے مزید لکھا تھا کہ اول الذکر قسم کے لوگ آخر الذکر کے مقابلے میں بہت زیادہ تھے بالخصوص بالائی حصوں میں۔ لیکن سٹالنسٹ بیوروکریسی کے گھناؤنے انحطاط کا اندازہ ٹراٹسکی بھی نہیں لگا سکا تھا۔

نوکر شاہانہ نظام کے تقریباً تین نسلوں تک طوالت اختیار کرنے سے سوویت سماج کے تمام طبقات اور پرتوں پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہونے والے بیوروکریٹوں کی تیسری نسل پر مشتمل ان بالائی پرتوں کی گراوٹ اس سے کہیں بڑھ کر تھی جو ٹراٹسکی یا ہمارے خیال میں ممکن

ہوسکتی تھی۔

پرانے بالشویکوں کو جسمانی طور ختم کر کے سٹالن پرانی رویات کو فنا کرنے اور مزدور طبقے کو اکتوبر انقلاب کے تصورات سے جوڑنے والے رابطے کو ختم کرنے میں اس سے کہیں زیادہ کامیاب رہا جتنا ہمارا خیال تھا۔کم ازکم دو نسلیں سٹالنسٹ آمریت کے خوفناک نظام کے زیر سایہ پل کر جوان ہوئیں۔حقیقی لینن ازم کے جمہوری اور بین الاقوامیت پسندی کے تمام تر علم اور تجربے سے محروم رہنے کے باعث ان کی شعوری سطح بہت پست ہوگئی تھی۔اس سے آخری دور میں روسی مزدوروں کے عارضی طور پر نشان راہ گم کرنے کی جزوی وضاحت ہوجاتی ہے۔مساوات میں یہ ایک اہم عنصر ہے جس پر اس وقت ہم نے مناسب توجہ نہیں دی تھی۔

بہرحال یہ فرض کرنا بالکل غلط ہوگا کہ بالشوازم کی روایات روسی مزدوروں کی نفسیات سے مکمل طور پر خارج ہوچکی ہیں۔معاملہ اس کے برعکس ہے۔مشرقی یورپ میں اسکے باقی تمام جرائم کے ساتھ ساتھ سٹالن ازم کو ایک غیر ملکی درآمد کے طور پر دیکھا جاتا تھا جو قومی جبر اور ماسکو سے کی جانے والی حکمرانی سے منسلک تھا۔اس کے برعکس روسی پرولتاریہ کے لیے بالشوازم واحد حقیقی روایت ہے جس میں تین انقلابات،خانہ جنگی، پانچ سالہ منصوبے اور ہٹلرازم کے خلاف جدوجہد شامل ہے۔یہ حقیقت، کہ سب کچھ کے باوجود روسی مزدوروں کی اکثریت ابھی تک ''کمیونسٹ'' پارٹی کی جانب دیکھتی ہے اس بات کا زبردست ثبوت فراہم کرتی ہے کہ کمیونزم اور اکتوبر انقلاب کے تصورات ابھی تک کروڑوں افراد کے دل و دماغ میں گھر کیے ہوئے ہیں۔لینن نے اس بات کی جانب کئی بار اشارہ کیا ہے کہ مزدور اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں۔وہ ابھی ابھی ایک نہایت سخت سکول سے فارغ التحصیل ہوئے ہیں!اور اب انہوں نے نتائج اخذ کرنا شروع کردیئے ہیں۔یہاں یہ یقین دہانی کرانا کافی ہوگا کہ کان کن محض چند سال پہلے تک یلسن کی حمایت کررہے تھے۔طبقہ بالکل اسی طرح سبق حاصل کرتا ہے۔روسی کان کنوں کی مثال بہت معنی خیز ہے جن میں سے بہت سے ''منڈی'' کے بارے میں خوش فہمیوں کا شکار تھے اور اب ان کی بہت بڑی اکثریت نے کمیونسٹ پارٹی کے حق میں ووٹ دیئے ہیں۔

سب کچھ کے باوجود ابھی وہ موڑ نہیں آیا جو طبقات کے درمیان موجود رشتوں کو فیصلہ کن طور پر تبدیل کردے۔جیسا کہ ہم بار بار نشان دہی کرچکے ہیں کئی عشروں پر محیط سٹالن ازم کے نتیجے میں مزدور طبقے میں پیدا ہونے والی مجہولیت وہ فیصلہ کن عنصر ہے جس نے ساری صورت حال کو متاثر کیا ہے۔لیکن

دسمبر 1995ء میں پڑنے والے ووٹوں نے عوام کے موڈ میں ایک اہم تبدیلی کا عندیہ دیا ہے۔اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اجرتوں کے بقایاجات کی وصولی کیلیئے کی جانے والی کان کنوں، استادوں اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے مزدوروں کی ہڑتالیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مزدور طبقے کی عارضی مجہولیت ختم ہونے کو ہے۔ایک خاص مرحلے پر جو شاید زیادہ دور نہ ہو مزدور طبقہ قابل نفرت مافیا سرمایہ داری اور اس پر تکیہ کرنے والے حکمران ٹولے کے خلاف میدان عمل میں آجائے گا۔اس لمحے کے بعد ساری صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو جائے گی۔

باب نمبر 10: ایک بار پھر روس کی طبقاتی نوعیت

1۔ لیون ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 254 تا 256

2۔ ٹراٹسکی مارکسزم کے دفاع میں۔صفحہ 68

3۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 250

4۔ مارکس گرنڈ وائز۔صفحہ 161

5۔ لیون ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 250 تا 251

6۔ روسی لیبر ریویو ایشو 2،صفحہ 33

7۔ ای بی آر ڈی رپورٹ 1995ء۔صفحہ 132

8۔ فنانشل ٹائمز 97-1-10

9۔ ایم ایس ڈبلیو، اینگلز، سوشلزم خیالی اور سائنسی جلد 3۔صفحہ 143

10۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 26

11۔ مارکس گرنڈ وائز۔صفحہ 253

12۔ مارکس گرنڈ وائز۔صفحہ 256

13۔ مارکس سرمایہ جلد 3۔صفحہ 326 تا 327

14۔ مارکس سرمایہ جلد 3۔صفحہ 386

15۔ وکٹر سرجی انقلاب کی عظمت۔صفحہ 43 تا 44

16۔ مارننگ سٹار 97-2-5

17۔ لیون ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 252

18۔ لیون ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔صفحہ 253

19۔ لیون ٹراٹسکی ''سٹالن''۔صفحہ 397

20۔ لیون ٹراٹسکی ''سٹالن''۔صفحہ 405 تا 406

21۔ ٹراٹسکی انقلاب سے غداری۔ صفحہ 49

ضمیمہ: ریاست کا مارکسی نظریہ

ریاستی سرمایہ داری کے نظریہ پر ایک اور نظر

عبوری دور کی معاشیات

روسی سوال پر ٹراٹسکی کی پوزیشن پر نظر ثانی کی کوشش کرنے والے تمام حضرات کے سلسلے میں سب سے اہم اور معنی خیز بات یہ ہے کہ وہ مسئلے کو ہمیشہ تجریدی حوالے سے لیتے ہیں اور کبھی بھی سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان عبوری سماج کے قوانین کی ٹھوس انداز میں وضاحت نہیں کرتے اور نہ ہی یہ وضاحت کرتے ہیں کہ وہ سماج کیسے چلے گا۔ یہ کوئی حادثاتی امر نہیں ہے۔ ٹھوس انداز میں تجزیہ کرنے سے وہ اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ روس میں بنیادی معیشت ویسی ہی تھی جیسی لینن کے تحت تھی اور اور کوئی دوسری صورت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ جاگیرداری نظام کے تحت اشیائے صرف کی پیداوار کی ترویج کے ذریعے بننے والا سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کا بیج تاجروں اور آزاد دست کاروں کے عمل کا مرہون منت ہے۔ ایک مخصوص مرحلے پر پہنچنے کے بعد سرمایہ دارانہ رشتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ جاگیردارانہ ڈھانچے کے پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔ آخر الذکر کا تختہ انقلاب کے ذریعے الٹ دیا جاتا ہے۔ اور پھر سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار میں پنہاں امکانات جاگیردارانہ بندشوں سے آزاد ہو کر ثمر آور ہوتے ہیں۔ انقلاب (سرمایہ دارانہ اور پرولتاری) کا تمام جوہر ہی اس حقیقت میں مضمر ہے کہ پرانے رشتے اور پرانی ہیئتیں اس نئے طریقہ پیداوار سے مطابقت نہیں رکھتیں جو پرانے سماج کی کوکھ میں پل چکا ہوتا ہے۔ خود کو ان بندشوں سے آزاد کروانے کے لیے پیداواری قوتوں کو ایک نئی بنیاد پر از سر نو منظم ہونا پڑتا ہے۔ تمام انسانی تاریخ اس مخاصمت کو مختلف سماجوں میں اس کے تمام مراحل کے دوران حاصل کرنے کی کوشش سے

عبارت ہے۔

سماجی ومعاشی ہیئتیں کبھی بھی بالکل خالص شکل میں ظاہر نہیں ہوتیں۔ کسی بھی قسم کے سماج میں پرانی سماجی ہیئتیں اور رشتے نئی ہیئتوں کے پہلو بہ پہلو کم یا زیادہ بے چینی کے عالم میں اپنا وجود قائم رکھ سکتے ہیں علاوہ ازیں یہ صورتِ حال کافی عرصے تک قائم رہ سکتی ہے۔ بورژوا انقلاب جاگیرداری نظام کو ایک ہی ضرب سے تباہ نہیں کر دیتا۔ طاقتور جاگیردارانہ عناصر ابھی تک باقی ہیں اور آج تک انتہائی ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں بھی جاگیرداری کی باقیات موجود ہیں۔ کسان طبقہ، اشرافیہ، برطانیہ میں دارالامرا، بادشاہت وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اسی قسم کے تضادات جاگیردارانہ نظام کے اندر بھی موجود تھے۔ قرونِ وسطیٰ میں جاگیردارانہ طریقہ پیداوار کی حدود کے اندر شہروں میں سرمایہ داری کے عناصر نے فروغ پانا شروع کر دیا تھا۔ ان سرمایہ دارانہ عناصر نے ایک قابل ذکر کردار (تجارت، سودخوری وغیرہ) ادا کیا اور بالآخر جاگیرداری کا تختہ الٹ دیا۔ لیکن اس سے جاگیردارانہ سماج کی بنیادی فطرت یا اس کے قوانین حرکت تبدیل نہیں ہوئے۔ اسی قسم کا تبصرہ غلام داری سماج یا کسی قسم کے سماج کے بارے میں کیا جا سکتا ہے۔ مارکسزم سماجی ہیئتوں یا تراکیب کا تجزیہ ان کی تمام تر متضاد خصوصیات سمیت ٹھوس انداز میں کرتا ہے، انہیں مثالی نمونوں کے طور پر نہیں لیتا۔

ریاستی سرمایہ داری کے نظریئے کی یہ بنیادی غلطی ہے۔ یہ عبوری دور کو تجریدی طور پر پیش کرتا ہے اور طریقہ پیداوار اور طریقہ تقسیم میں امتیاز کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ ہر طبقاتی سماج میں استحصال ہوتا ہے اور قدرِ زائد پیدا ہوتی ہے جسے استحصالی طبقہ اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ لیکن یہ چیز ہمیں بذاتِ خود طریقہ کار کے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔ مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ نظام کے تحت طریقہ پیداوار کی نوعیت سوشل یا سماجی ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس تقسیم (تصرف) کی نوعیت انفرادی ہوتی ہے۔ جیسا کہ اینگلز وضاحت کرتا ہے:

''علیحدگی کو مکمل کر دیا گیا جس میں ایک طرف ذرائع پیداوار سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں جمع تھے اور دوسری طرف پیدا کار تھے جن کے پاس اب ملکیت کے نام پر اپنی قوت محنت کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سماجی پیداوار اور سرمایہ دارانہ تقسیم میں موجود تضاد کا اظہار پرولتاریہ و بورژوازی کے درمیان مخاصمت کی شکل میں ہوا۔'' (1)

جیسا کہ لینن نے نشاندہی کی تھی عبوری معیشت کی نوعیت میں مختلف ادوار میں مختلف ممالک اور

یہاں تک کہ ایک ہی ملک میں مختلف ادوار میں بہت فرق ہوسکتا ہے اور ہوگا۔اس کا طریقہ پیداوار بھی سماجی ہے لیکن اس میں تصرف ریاست کا ہے نہ کہ انفرادی جیسا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہوتا ہے۔یہ ایک ایسی ہیئت ہے جس میں سوشلسٹ اور سرمایہ دارانہ خوبیاں یکجا ہیں۔

اشیائے صرف کی پیداوار کے اعلیٰ ترین نظام سرمایہ داری کے تحت پیداوار کو پیدا کار پر مکمل غلبہ حاصل ہے۔اس کی وجہ تصرف کی ہیئت یا شکل ہے اور تصرف کی ہیئت اور طریقہ پیداوار دونوں ہی عامل ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے جنم لیتے ہیں۔ایک بار جب ریاستی ملکیت اس کی جگہ لے لیتی ہے تو اس کے نتیجے میں چاہے جو بھی نظام آئے وہ سرمایہ داری نظام نہیں ہوسکتا کیونکہ بنیادی تضاد ختم ہو چکا ہے۔سماجی پیداوار کے ساتھ نجی تصرف کا نراجی کردار ختم ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سرمایہ دارانہ سماج کا قانونِ حرکت بھی (ابھار اور کساد بازاری)۔

سرمایہ داری کی طرح سوشلزم کے تحت بھی طریقہ پیداوار کی نوعیت سماجی ہوگی لیکن سرمایہ داری کے برعکس طریقہ تقسیم بھی سماجی ہوگا۔اسی طرح پہلی بار پیداوار اور تقسیم ہم آہنگ ہو جائیں گے۔ہمیں سماجی نظام کی نوعیت بتانے کے لیے محض ان سرمایہ دارانہ خصوصیات کی جانب اشارہ کر دینا ہی کافی نہیں جو بلاشبہ سٹالنسٹ روس میں موجود تھیں (اجرتی مزدوری، اشیائے تبادلہ کی پیداوار، یہ حقیقت کہ بیوروکریسی قدرِ زائد کا بہت بڑا حصہ ہڑپ کر جاتی تھی وغیرہ وغیرہ)۔یہاں بھی تمام پہلوؤں سے جائزہ لینا ضروری ہے۔ہم سوویت یونین میں موجود سماجی رشتوں کی نوعیت کو صرف اس وقت سمجھ سکتے ہیں جب ہم ان کا مجموعی طور پر احاطہ کریں۔

اس قسم کے تجزیئے میں ناکامی کے نتیجے میں انقلاب کے آغاز سے ہی بہت سے مکاتب نے انتہائی بودے اور نامعقول خیالات پیش کیے ہیں۔لینن نے اس مسئلے کا احاطہ یوں کیا تھا ”لیکن لفظ، عبوری، کے معنی کیا ہیں؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ معیشت کی طرح موجودہ نظام میں سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں کے عناصر، ذرات اور ٹکڑے شامل ہیں؟ یہ بات ہر کوئی تسلیم کرے گا کہ ایسا ہے۔لیکن اس امر کا اعتراف کرنے والے سبھی لوگ یہ زحمت نہیں کرتے کہ ان عناصر کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کا جائزہ لیں جو اس وقت روس میں موجود مختلف سماجی و معاشی ہیئتوں کی تشکیل کرتے ہیں اور یہی اس سوال کا بنیادی نقطہ ہے۔“(2)

کسی ایک جہت کی تجرید یقینی طور پر غلطی کا باعث بنے گی۔روسی مظہر کی جو چیز شش و پنج میں ڈالتی

تھی وہ معیشت کا متضاد کردار تھا۔سوویت یونین کی پسماندگی اور تنہائی نے اسے مزید بگاڑ دیا تھا۔اسے آمرانہ سٹالنسٹ نظام حکومت کی شکل میں عروج حاصل ہوااوراس کے نتیجے میں سرمایہ داری کے بدترین پہلو سامنے آئے یعنی منتظمین اور مزدوروں کے درمیان جابرانہ رشتے، پیس ورک اور عدم مساوات وغیرہ۔ان تضادات کا تجزیہ کرنے کی بجائے ٹونی کلف اپنی ریاستی سرمایہ داری کی تھیوریوں کوتقویت دینے کے لیےانہیں سرمایہ دارانہ پیداوار کے نارمل قوانین کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔

علاوہ ازیں سرمایہ دارانہ نظام کے تحت پیداواری قوتوں کے صرف مرکزی شکل اختیار کرنے بلکہ ریاستی تحویل میں لیے جانے کے اقدامات متعارف ہونے کے باعث ایک غلط نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔یہ ثابت کرنے کے لیے کہ آخری تجزیے میں روس کی ''ریاستی سرمایہ داری'' ویسی ہی ہے جیسے انفرادی سرمایہ داری اور اس کے قوانین بھی ویسے ہیں کلف اپنی روس پر لکھی جانے والی کتاب میں اینٹی ڈیورنگ سے مندرجہ ذیل اقتباس پیش کرتا ہے۔

''جتنی زیادہ پیدواری قوتیں وہ (ریاست) اپنے قبضے میں لیتی ہے،اتنی ہی زیادہ وہ تمام سرمایہ داروں کا حقیقی اجتماعی ادارہ بن جاتی ہےاور اتنے ہی زیادہ شہریوں کا وہ استحصال کرتی ہے،مزدور اجرت کمانے والے پرولتاریہ ہی رہتے ہیں۔سرمایہ دارانہ رشتہ منسوخ نہیں ہوتا بلکہ اسے انتہا تک پہنچا دیا جاتا ہے۔لیکن اس انتہا پر پہنچ کر یہ اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پیداواری قوتوں کی ریاستی ملکیت اس تصادم کا حل نہیں ہے لیکن اس کے اندر اس کے حل کے رسمی ذرائع یا چابی موجود ہوتی ہے۔''(3)

حقیقت یہ ہے کہ اینگلز اس سے بالکل متضاد دلیل دے رہا ہے۔آیئے ہم اس اقتباس کا ازسرِ نو جائزہ لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہم اس سے مختلف نتائج کیسے اخذ کرتے ہیں''اگر بحران نے یہ ثابت کیا تھا کہ بورژوازی اب جدید پیداواری قوتوں کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت کھو چکی ہے تو پیداوار اور ذرائع مواصلات کی عظیم تنظیموں کا جوائنٹ سٹاک کمپنیوں اور ریاستی ملکیت میں تبدیل ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس مقصد کے لیے بورژوازی غیر ضروری ہو چکی ہے۔سرمایہ داروں کے تمام تر سماجی فرائض اب تنخواہ دار ملازمین سرانجام دیتے ہیں،سرمایہ داروں کے لیے اب کوئی سماجی سرگرمی باقی نہیں بچی ماسوائے اس کے کہ وہ آمدنی جیب میں ڈالیں،کوپن اکٹھے کریں اور سٹاک ایکسچینج میں جوا کھیلیں جہاں مختلف سرمایہ دار ایک دوسرے کو سرمائے سے محروم کرتے ہیں جس طرح پہلے پہل سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار نے مزدوروں کو بے در کیا تھا اسی طرح اب وہ سرمایہ داروں کو بھی بے در کر کے فالتو آبادی میں تبدیل کر رہا

ہے۔اگرچہ وہ انہیں فوری طور پر پس انداز صنعتی فوج میں شامل نہیں کررہا۔‘‘

’’لیکن جوائنٹ سٹاک کمپنیوں یا ریاستی ملکیت میں تبدیل ہونے سے پیداواری قوتیں اپنے اس کردار سے محروم نہیں ہو جاتیں جو انہیں بطور سرمائے کے حاصل ہوتا ہے۔اور جدید ریاست بھی محض ایک ایسی تنظیم ہے جسکے ذریعے بورژوا سماج اپنی ضروریات پوری کرتا ہے تاکہ مزدوروں یا انفرادی سرمایہ کی تجاوزات کے خلاف سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے عمومی خارجی حالات کو برقرار رکھا جاسکے۔جدید ریاست کی شکل چاہے کچھ بھی ہو وہ بنیادی طور پر ایک سرمایہ دارانہ مشین ہے،سرمایہ داروں کی ریاست،تمام سرمایہ داروں کا مثالی اجتماعی ادارہ۔جتنی زیادہ پیداواری قوتیں وہ اپنی ملکیت کے طور پر قبضے میں لیتی ہے اتنی ہی زیادہ وہ تمام سرمایہ داروں کا حقیقی اجتماعی ادارہ بن جاتی ہے اور اتنے ہی زیادہ شہریوں کا وہ استحصال کرتی ہے۔مزدور اجرت کمانے والے ہی رہتے ہیں۔سرمایہ دارانہ رشتہ منسوخ نہیں کیا جاتا بلکہ اسے انتہا تک پہنچا دیا جاتا ہے۔لیکن اس انتہا پر پہنچ کر یہ اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔پیداواری قوتوں کی ریاستی ملکیت تصادم کا حل نہیں ہے لیکن اس کے اندر حل کے رسمی ذرائع یا چابی موجود ہوتی ہے۔‘‘(4)

مذکورہ بالا تحریر میں پیش کردہ خیال یقیناً واضح طور پر سمجھ میں آ گیا ہوگا؟ جس حد تک پیداواری قوتیں فروغ پا کر سرمایہ دارانہ رشتوں کی حدود سے تجاوز کر چکی ہیں(یعنی تضاد کا جراثیم اب نشوونما پا کر سماجی نظام کو لاحق ایک مہلک بیماری کی شکل اختیار کر کے خود کو بحرانوں کی صورت میں ظاہر کر رہا ہے)اسی حد تک سرمایہ دار پہلے جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے ذریعے اور بعدازاں پیداواری قوتوں کے کچھ حصوں کو ریاستی تحویل میں لے کر وسیع ذرائع پیداوار کو’’سوشلائز‘‘ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔اسی خیال کو لینن نے اپنی کتاب’’سامراج؛ سرمایہ داری کا اعلیٰ ترین مرحلہ‘‘میں بہت واضح طور پر پیش کیا تھا۔اس نے ثابت کیا کہ اجارہ داری اور محنت کی سوشلائزیشن کا فروغ درحقیقت پرانے نظام کے اندر نئے سماجی نظام کے عناصر کی ترجمانی کرتا ہے۔

پیداواری قوتوں کے اس مرحلے پر پہنچنے کا مطلب تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام اپنا تاریخی فریضہ پورا کر چکا ہے اور اسی باعث بورژوازی زیادہ سے زیادہ غیر ضروری ہوتی گئی۔قبل ازیں وہ پیداواری قوتوں کے فروغ کے لیے ضروری تھے لیکن اب وہ محض فالتو طفیلی اور کوپن جمع کرنے والے بن چکے ہیں۔اسی طریقے سے اور اسی وجہ سے اپنے تاریخی فریضے کی تکمیل کے بعد جاگیرداری متروک ہو چکی ہے۔مارکس نے

''سرمایہ'' میں ثابت کیا تھا کہ کریڈٹ اور جوائنٹ سٹاک کمپنیاں خود ہی اس بات کی علامت ہیں کہ پیداواری قوتیں نجی ملکیت سے متجاوز ہو چکی ہیں۔ اینگلز ثابت کرتا ہے کہ پیداوار کے ارتقا نے کس طرح بذات خود سرمایہ داروں کو اس امر کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیا کہ پیداواری قوتوں کا کردار سماجی (سوشل) ہے نہ کہ انفرادی۔

مقدار کی معیار میں تبدیلی

اگرچہ ایک خاص مرحلے پر سرمایہ دار ریاست معیشت کے ایک یا دوسرے حصے کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے لیکن اس سے پیداواری قوتوں کا کردار بطور سرمائے کے ختم نہیں ہو جاتا، لیکن تمام مسئلے کا جوہر یہ ہے کہ جہاں ریاستی غلبہ مکمل ہو جاتا ہے وہاں مقدار معیار میں بدل جاتی ہے، سرمایہ داری اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کا اظہار سرمائے کے ارتکاز کے بڑھتے ہوئے رجحان سے ہوتا ہے۔ پہلے جوائنٹ سٹاک کمپنیاں قائم ہوئیں پھر بڑی بڑی اجارہ داریاں اور کثیر القومی کمپنیاں۔ ایک خاص مرحلے پر معیشت کے بعض حصوں کو قومی تحویل میں لیے جانے کا روز افزوں رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ اگر اسے صحیح نام سے پکارا جائے تو یہ اجارہ دارانہ ریاستی سرمایہ داری ہے جس کا سوشلزم سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں قومیائی ہوئی صنعتیں نجی شعبے کے خادم کا کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ نجی اجارہ داریوں کو سستا کوئلہ، گیس، بجلی، ریل اور ڈاکخانے کا نظام فراہم کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ ہنرمند سستے مزدور فراہم کرنے کے لیے مزدوروں کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات اٹھاتی ہیں، بوڑھوں اور بیماروں کے کام آتی ہیں۔ نکاسی آب اور دیگر ''غیر منافع بخش سرگرمیوں'' کے لیے ذمہ دار ہوتی ہیں جو سرمایہ داروں کے لیے ضروری تو ہوتی ہیں لیکن وہ ان کے لیے ادائیگی نہیں کرتے۔

اینگلز کے اس بیان کی وضاحت اور اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ''لیکن اس انتہا پر پہنچ کر یہ (سرمایہ دارانہ رشتہ) اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پیداواری قوتوں کی ریاستی ملکیت اس تصادم کا حل نہیں ہے لیکن اس کے اندر اس کے حل کے رسمی ذرائع یا چابی موجود ہوتی ہے۔''

اگر ہم اس حقیقت کو مدنظر رکھیں کہ یہ قبل ازیں بیان کردہ اقتباس کے اس حصے کے بعد آتا ہے جہاں اینگلز سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کی تعریف (سماجی پیداوار، انفرادی تصرف کے طور پر) کرتا ہے

توکلف کے اخذ کردہ نتائج قبول کرنے کی صورت میں ہمیں لازماً اعتراف کرنا چاہیے کہ اینگلز خود کو بری طرح جھٹلا رہا ہے۔لیکن سیاق وسباق کے حوالے سے اینگلز کا مطلب بالکل واضح ہے۔وہ وضاحت کرتا ہے کہ سرمایہ داری کے تضادات کا حل جدید پیداواری قوتوں کی سماجی نوعیت کو تسلیم کرنے میں مضمر ہے۔''لہٰذا طریقہ پیداوار،تصرف اور تبادلے کو ذرائع پیداوار کے سماجی کردار سے ہم آہنگ کرنے میں۔''لیکن وہ ثابت کرتا ہے کہ تسلیم کرنے کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کی بنیاد پر منڈی میں قوتوں کے اندھے کھیل کی جگہ شعوری تنظیم اور منصوبہ بندی کو لاگو کیا جائے۔تاہم ایسا یکبارگی نہیں کیا جا سکتا۔سماجی کنٹرول کو محض ''بتدریج'' ہی مکمل طور پر لاگو کیا جا سکتا ہے۔اس کے لیے ریاستی ملکیت ایک عبوری شکل ہے لیکن مکمل ریاستی ملکیت سرمایہ داری کے تمام پہلوؤں کا خاتمہ فوری طور پر نہیں کر دیتی ورنہ ملکیت بھی سماج ہوتی یعنی سوشلزم فوری طور پر متعارف ہو جاتا ہے۔

لیکن عین اسی طرح جیسے سماجی ارتقا میں پرانے نظام کے اندر نئے عناصر موجود ہوتے ہیں عبوری سماج میں نئے نظام کے اندر پرانے عناصر موجود ہوتے ہیں۔مکمل ریاستی غلبہ سرمائے کی آخری حد کو ظاہر کرتا ہے۔سرمایہ دارانہ رشتہ اپنی ضد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔پرانے نظام کے اندر نشو ونما پانے والے نئے سماج کے عناصر اب بالا دستی حاصل کر لیتے ہیں۔سرمایہ داری کے اندر تضاد یا تصادم کی وجہ یہ حقیقت ہے کہ قوانین خود کو بالکل اندھے طور پر ظاہر کرتے ہیں۔لیکن تمام تر صنعت کے قومیا لیے جانے کے بعد پہلی بار یہ ممکن ہوتا ہے کہ پیداوار پر کنٹرول اور منصوبہ بندی کو شعوری طور پر لاگو کر سکیں۔تاہم ابتدائی مراحل میں کنٹرول اور منصوبہ بندی پر عمل درآمد دی گئی حدود کے اندر ہی ہوگا۔ان حدود کا تعین ٹیکنیک کی اس سطح سے ہوگا جو نئے سماج کے غلبہ حاصل کرنے کے وقت موجود ہوگا۔سماجی ارتقا راتوں رات ''جبر کی اقلیم'' سے چھلانگ لگا کر ''آزادی کی اقلیم میں داخل نہیں ہو سکتا محض پیداواری قوتوں کی بے پایاں ترقی کی بنیاد پر ہی آزادی اپنے کامل مفہوم پر حقیقت کا روپ دھار سکے گی۔اس مرحلے پر پہنچا جائے گا جس میں افراد پر اشیا کے غلبے اور انسان پر انسان کے جبر کی جگہ باشعور انسانوں کے ہاتھوں اشیا کا انتظام لے لے گا۔

ایسے مرحلے پر پہنچنے سے پہلے سماج کے لیے عبوری دور سے گزرنا لازمی ہے۔لیکن جہاں تک نجی ملکیت کے خاتمے کے بعد کنٹرول اور منصوبہ بندی کے پہلی بار ایک امکان بننے کا تعلق ہے تو ایک حوالے سے جبر کی اقلیم پہلے ہی پیچھے رہ گئی ہوتی ہے۔تاہم اگرچہ اب ''آزادی'' کے بارے میں بات کرنا ممکن

ہے لیکن یہ محض اس حوالے سے ہے کہ جبر کو شعوری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس مرحلے (عبوری دور) پر اینگلز یہ نشاندہی کرتا ہے۔ ''پیدا کار بالکل شعوری طور پر ذرائع پیداوار اور پیداوار کے سماجی کردار کو متعین کرتے ہیں اور بدنظمی اور وقتاً فوقتاً انحطاط کی وجہ بننے کی بجائے یہ بذات خود پیداوار کے انتہائی طاقتور آلے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ''سماج میں کارفرما قوتیں اس وقت تک بالکل اسی طرح عمل کرتی ہیں جیسے فطرت میں کارفرما قوتیں یعنی اندھے، متشددانہ اور تباہ کن انداز میں جب تک ہم انہیں سمجھنے میں ناکام رہیں اور خاطر میں نہ لائیں لیکن ایک بار جب ہم انہیں شناخت کر لیتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کیسے کام کرتی ہیں ان کی سمت اور اثرات کیا ہیں تو انہیں بتدریج اپنی مرضی کے تابع کرنا اور اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا مکمل طور پر ہمارے اپنے بس میں ہے۔ اور موجودہ عہد کی زبردست پیداواری قوتوں کے سلسلے میں یہ بات خاص طور پر درست ہے۔''(5)

ہیگل کو نقل کرتے ہوئے اینگلز آزادی، جبر اور عبوری دور کے درمیان تعلق کا احاطہ کچھ یوں کرتا ہے۔ ''جبر کا ادراک آزادی ہے۔ لازماً (جبر) صرف اس وقت تک اندھا ہے جب تک اسے سمجھا نہ جائے۔''(6)

مارکس اور اینگلز نے عبوری دور کے متضاد کردار کا مخصوص سرسری احاطہ کیا تھا۔ انہوں نے مخصوص عمومی قوانین وضع کیے تھے اور ان کی وضاحت وصراحت کا کام اگلی نسلوں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ لیکن انہوں نے پیداواری قوتوں کے ارتقا کے لیے ریاستی ملکیت کی ضرورت کو لازمی عبوری حالت کی حیثیت سے واضح طور پر ثابت کیا تھا۔ اینگلز نے اس مرحلے کے دوران دو وجوہات کی بنا پر ریاست کی ضرورت کی وضاحت کی تھی۔

1۔ پرانے حکمران طبقے کے خلاف اقدامات اٹھانے کے لیے۔

2۔ کیونکہ عبوری سماج فوری طور پر ہر کسی کو اس کی ضرورت کے لیے کافی چیزوں کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتا۔

ٹونی کلف کے پیش کردہ مفروضے کی منطق یہ ہے کہ عبوری دور میں داخلی معیشت کے اندر سرمایہ داری کی باقیات کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ کلف چاہے کتنی ہی شدومد سے بحث کرے کہ وہ عبوری عرصے میں ریاست کی ضرورت سے اتفاق کرتا ہے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس نے یہ غور وفکر نہیں کیا کہ وہ کونسی معاشی وجوہات ہیں جو ریاست کو لازمی بناتی ہیں اور اس عرصے میں معیشت کیا کردار اپناتی ہے۔ سوشلزم

کو عملی جامہ پہنائے جانے سے قبل پیداواری قوتوں کی زبردست ترقی بہت ضروری ہے، اس سے کہیں زیادہ جتنی سرمایہ داری کے تحت حاصل ہوئی ہے۔

جیسا کہ ٹراٹسکی نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ابھی امریکہ میں اتنی پیداوار نہیں ہے جو فوری طور پر سوشلزم متعارف کروانے کی ضمانت فراہم کر سکے۔ لہٰذا ابھی ایک ایسا درمیانہ دور ضروری آئے گا جس میں سرمایہ دارانہ قوانین ایک تبدیل شدہ شکل میں کارفرما ہوں گے۔ اس میں شبہ نہیں کہ امریکہ میں اس کا درانیہ چھوٹا ہوگا۔ لیکن اس مرحلے کو مکمل طور پر نظرانداز کر دینا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ کونسے سرمایہ دارانہ قوانین ہین جو برقرار رہیں گے؟ کلف محض اس کا جواب دینے میں ہی ناکام نہیں رہتا بلکہ وہ ''نوکر شاہانہ اجتماعیت'' کے جال میں پھنس جاتا ہے کیونکہ وہ یہ تسلیم کرنے میں ناکام رہتا ہے کہ روپیہ پیسہ، قوت محنت، مزدور طبقے کا وجود، قدر زائد وغیرہ تمام کی تمام پرانے سرمایہ دارانہ نظام کی ایسی باقیات ہیں جو لینن کے نظام حکومت کے دوران بھی موجود تھیں۔ فوری طور پر براہ راست سماجی پیداوار اور تقسیم متعارف کروانا ممکن ہے۔ بالخصوص پسماندہ روس میں یہی صورت حال موجود تھی۔

1980ء میں کونراڈ شمٹ کو تحریر کردہ ایک خط میں اینگلز نے سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف عبور کی معیشت کے مسئلے پر مادہ پسندانہ طرز فکر کی انتہائی شاندار مثال پیش کی ہے۔ اس نے لکھا تھا۔

''ولکس ٹربیون میں اس سلسلے میں بحث ہوتی رہی ہے کہ آئندہ سماج میں پیداوار کی تقسیم کس طرح ہوگی۔ آیا یہ کیے گئے کام کی مقدار کی مناسبت سے ہوگی یا کوئی دوسری صورت ہوگی۔ عدل کے بارے میں بعض خیال پرستانہ قسم کے اسلوب بیان کے مقابلے میں اس سوال کا جائزہ بہت، مادہ پسندانہ، طور پر لیا گیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کسی کو یہ نہیں سوجھا کہ آخرکار طریقہ تقسیم کا دارومدار لازمی طور پر اس بات پر ہوتا ہے کہ تقسیم کرنے کے لیے کتنا کچھ موجود ہے۔ اور اسے یقیناً پیداوار اور سماجی تنظیم کی ترقی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہونا چاہیے تاکہ طریقہ تقسیم بھی تبدیل ہو سکے۔ لیکن اس بحث میں حصہ لینے والے ہر شخص کے نزدیک، سوشلسٹ سماج ایسی چیز نہیں تھا جو مسلسل تبدیلی اور ارتقا سے گزر رہا ہو بلکہ ایک ایسی مستحکم و متوازن چیز تھا جو ہمیشہ کے لیے طے شدہ ہو لہٰذا اس کا طریقہ تقسیم بھی ہمیشہ کے لیے طے شدہ اور معین ہو۔ تاہم جو کچھ معقول طور پر کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ (1) ایسا طریقہ تقسیم دریافت کرنے کی کوشش کی جائے جسے شروع میں استعمال کیا جائے اور (2) اس عمومی رجحان کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے جو آئندہ ارتقا اختیار کرے گا۔ لیکن اس بارے میں ساری بحث میں مجھے ایک بھی لفظ نہیں ملتا۔'' (7)

اینٹی ڈیورنگ میں اینگلز یہ نشاندہی کرتا ہے۔''براہ راست سماجی پیداوار اور براہ راست تقسیم اشیائے صرف کے تبادلے کا خاتمہ کر دیتی ہے لہٰذا پیداوار کی اشیائے تبادلہ (جنس) میں تبدیلی (کم از کم کمیونٹی کی حدود کے اندر) اور نتیجتاً ان کی قدروں میں تبدیل ہونے کو بھی خارج از امکان کر دیتی ہے۔''(8)

لیکن صرف سوشلزم اسے حقیقت کا روپ دے سکتا تھا۔عبوری دور میں تقسیم بدستور بالواسطہ رہتی ہے۔سماج رفتہ رفتہ ہی پیداوار پر مکمل کنٹرول حاصل کرتا ہے۔لہٰذا اشیائے صرف کی پیداوار اور پیداوار کے مختلف شعبوں کے درمیان تبادلہ یقینی طور پر واقع ہوگا۔قدر کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے اور لازماً ہونا چاہیے جب تک پیدا کاروں کی پیداوار تک براہ راست رسائی نہیں ہوتی ایسا صرف سماجی پیداوار پر مکمل کنٹرول اور براہ راست سماجی تقسیم کی بنیاد پر ہوسکتا ہے۔جس میں ہر فرد کو جس چیز کی ضرورت ہو لے لیتا ہے۔مارکس اس مسئلے کا ''سرمایہ'' کی تیسری جلد میں سرسری جائزہ لیتا ہے جب وہ سرمایہ دارانہ پیداوار کے مسئلے پر بحیثیت مجموعی بحث کر رہا ہوتا ہے۔

''اسی طرح منافع،قدر زائد،اور زائد پیداوار کا ایک حصہ محض نو صرف شدہ محنت کو ظاہر کرتا ہے جہاں تک اس کی قدر کا تعلق ہے وہ ایک انشورنس فنڈ کا کام کرتی ہے۔قدر زائد،زائد پیداوار اور اس حوالے سے زائد محنت کا صرف یہی وہ حصہ ہے جو ارتکاز اور تجدید کے عمل کی توسیع کے لیے مختص حصے سے الگ رہتے ہوئے اپنا وجود سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے بعد بھی برقرار رکھتا ہے۔اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام نیا سرمایہ منافع،کرائے یا ریونیو کی دیگر صورتوں سے جنم لیتا ہے یعنی زائد پیداوار''اس باب میں مارکس پیداوار کے عمل کا تجزیہ کرتا ہے۔اس کے اپنے الفاظ میں ''محنت کی مجموعی سالانہ پیداوار کی قدر زیر بحث ہے بالفاظ دیگر مجموعی سماجی سرمائے کی پیداوار کی قدر۔''(9)

اسی باب میں ایک بورژوا معیشت دان سٹورچ کے جواب میں وہ اس بات کا دوبارہ اعلان کرتا ہے۔''پہلی بات یہ ہے کہ ایک ایسی قوم کو جس کا طریقہ پیداوار قدر کی بنیاد پر قائم ہو یا دوسرے لفظوں میں سرمایہ دارانہ طریقے سے منظم ہو ایک ایسا ادارہ خیال کرنا جو محض قومی ضروریات کی تسکین کے لیے کام کر رہا ہے ایک غلط تجربہ ہے،دوسرا یہ کہ سرمایہ دارانہ طریقہ پیداوار کے خاتمے کے بعد جبکہ سماجی پیداوار بدستور جاری ہو قدر کا تعین اس طریقے سے جاری رہتا ہے کہ قوتِ محنت کی ضابطہ بندی اور پیداوار کے مختلف شعبوں میں سماجی محنت کی تقسیم کے ساتھ ساتھ اس کا حساب کتاب رکھنا پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہو جاتا

ہے۔(10)

زرِتبادلہ اور ریاست

یہ مارکس اور اینگلز کے ان تبصروں سے ہم آہنگ ہے جو انہوں نے مختلف اوقات میں عبوری دور کے بارے میں کیے ہیں۔ اینگلز وضاحت کرتا ہے کہ سرمایہ داری کے تحت قائم ہونے والی جوائنٹ سٹاک کمپنیاں اور ریاستی ملکیت حقیقی لفظوں میں سرمایہ دارانہ پیداوار کی حدود سے باہر ہیں۔ ایک اور جگہ مارکس یہ نشاندہی کرتا ہے کہ کریڈٹ نے مزدور ریاست کی طرف عبور سے بھی پہلے سرمایہ دارانہ پیداوار کو اس کی حدود سے آگے بڑھا دیا تھا۔ اور جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا اقتباسات میں ثابت کیا ہے (علاوہ ازیں گوتھا پروگرام پر تنقید میں بھی) مارکس کا خیال تھا کہ بوژوا قانون، بورژوا تقسیم اور اس حوالے سے بورژوا ریاست کا وجود سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف عبور کے دوران بھی برقرار رہتا ہے۔ عبوری دور میں زرِ تبادلہ کے کردار اور ریاست پر بحث کرتے ہوئے ٹراٹسکی نے اس تصور کو مزید ترویج دی۔

''ان دو مسائل، ریاست اور زرِتبادلہ میں بہت سی قدریں مشترکہ ہیں کیونکہ یہ دونوں سمٹ کر آخری تجزیئے میں خود کو مسئلوں کے مسئلے تک محدود کر لیتے ہیں یعنی محنت کی بار آوری۔ زرِتبادلہ کی مجبوری بھی ریاست کی مجبوری کی طرح طبقاتی سماج کا ورثہ ہے جو کسی نہ کسی قسم کی مذہبی یا غیر مذہبی اشیا پرستی کا سہارا لیے بغیر انسان سے انسان کے رشتوں کی تعریف کرنے کی صلاحیت سے قاصر ہے اور ان کے دفاع کے لیے اس نے سب سے خوفناک اشیا پرستی یعنی ریاست کو مقرر کیا تھا جس کے دانتوں میں ایک لمبا سا چاقو دبا ہوا ہے۔ کمیونسٹ سماج میں ریاست اور زرِتبادلہ غائب ہو جائیں گے۔ نتیجتاً سوشلزم کے تحت ان کے رفتہ رفتہ مٹنے کا آغاز صرف اس تاریخی لمحے سے ہونا چاہیے جب ریاست نیم ریاست میں تبدیل ہو جاتی ہے اور زرِتبادلہ اپنی جادوئی طاقت کھونے لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ سوشلزم نے سرمایہ دارانہ اشیا پرستی سے نجات حاصل کر کے ان کے درمیان زیادہ شفاف، آزاد اور قابل قدر رشتوں کی تخلیق کا آغاز کر دیا ہے۔ ایسے طوائف الملوکانہ تقاضے جن میں زرِتبادلہ کا خاتمہ، اجرتوں کا خاتمہ یا ریاست اور خاندان کا خاتمہ شامل ہیں محض میکانکی سوچ کے نمونوں کی حیثیت سے دلچسپی کا باعث ہیں۔

''زرِتبادلہ کو من مرضی سے ''ختم'' نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی ریاست اور خاندان کو ''قتل'' کیا جا سکتا

ہے۔ضروری ہے کہ وہ اپنا تاریخی فریضہ پورا کرنے کے بعد تحلیل ہو کر ختم ہو جائیں۔ زرِتبادلہ کی پرستش کے لیے موت کا نقارہ صرف اس مرحلے پر بجے گا جب سماجی دولت کا بتدریج فروغ ہم دوپایوں کو محنت کے ہر اضافی منٹ کے بارے میں کنجوس جیسے رویئے اور اپنے راشن کے حجم کے بارے میں ذلت آمیز خوف کو فراموش کرنے پر مجبور کر دے گا۔خوشی فراہم کرنے یا انسانوں کو خاک میں ملا دینے کی صلاحیت سے عاری ہونے کے بعد زرِتبادلہ اعدادوشمار کے ماہرین کی سہولت اور منصوبہ بندی کے مقاصد کے لیے محض حساب کتاب کی رسیدوں میں تبدیل ہو جائے گا۔اگر اس سے بھی آگے ہم مستقبل بعید کی بات کریں تو غالباً ان رسیدوں کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔لیکن اس سوال کو ہم مکمل طور پر آئندہ آنے والی نسلوں پر چھوڑ سکتے ہیں جو ہم سے زیادہ ذہین ہوں گی۔

”ذرائع پیداوار اور کریڈٹ کی نیشنلائزیشن،اندرونی تجارت پر ریاستی غلبہ،بیرونی تجارت پر ریاستی اجارہ داری،زراعت کی اجتماعیت اور وراثت کے سلسلے میں قانون ذاتی طور پر زرِتبادلہ جمع کرنے پر سخت حدود قائم کرتے ہیں اور اس کے نجی سرمائے (تجارتی،صنعتی اور سودخوری پر مبنی) میں تبدیلی کی راہ روکتے ہیں۔زرِتبادلہ کے یہ افعال استحصال پر مبنی ہونے کے باوجود پرولتاری انقلاب کے شروع میں ختم نہیں کیے جاتے ہیں بلکہ ایک تبدیل شدہ شکل میں ریاست کو منتقل کر دیئے جاتے ہیں۔جو ایک آفاقی تاجر،قرض فراہم کرنے والی اور صنعت کار ہوتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ زرِتبادلہ کے زیادہ بنیادی نوعیت کے افعال بطور پیمانہ قدر،ذریعہ تبادلہ اور ذریعہ ادائیگی کو نہ صرف محفوظ کیا جاتا ہے بلکہ ان کا دائرہ عمل اس سے کہیں زیادہ وسعت اختیار کر لیتا ہے جتنا سرمایہ داری کے تحت تھا۔“(11)

ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے خاتمے سے پہلے منڈی انسان پر غالب ہے جو معیشت کے ان قوانین کے آگے لاچار ہے جنہیں اس نے خود تخلیق کیا ہے۔تاہم اس کے خاتمے کے بعد ہی انسان پہلی بار شعوری کنٹرول کی شروعات کرتا ہے۔لیکن یہاں شعور کا مطلب محض قانون کو تسلیم کرنا ہے قانون کا خاتمہ نہیں۔اسی میں عبوری دور کی مخصوص نوعیت مضمر ہے یعنی کیونکہ انسان اب پیداواری قوتوں کی نوعیت کو سمجھتا ہے اس لیے وہ ایک حد تک ان کو کنٹرول کر سکتا ہے۔لیکن وہ پیداواری قوتوں کی ترقی کی اس سطح کی حدود سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔تاہم اب جبکہ پیداواری قوتوں کو انفرادی سرمایہ دارانہ پیداوار کی زنجیروں سے آزاد کرایا جا سکتا ہے۔انہیں اتنی تیز رفتاری سے ترقی اور وسعت دی جا سکتی ہے کہ سماج کی مادی بنیادوں کو نئی بلندیوں تک اٹھایا جا سکے۔اس طرح ایک غیر طبقاتی سماج کی جانب پیش رفت کے لیے

مادی حالات پیدا کیے جاسکتے ہیں جہاں ریاستی ملکیت کی درمیانی شکل حقیقی سماجی ملکیت میں تبدیل ہو جائے۔ایک بار اس مرحلے (کمیونزم) پر پہنچنے کے بعد پہلی بار حقیقی سماجی پیداوار بھی ہوگی اور تقسیم بھی۔ زر تبادلہ، قانون قدر اور ریاست تمام کے تمام ختم ہو جائیں گے کیونکہ ان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔دوسرے لفظوں میں باندھ کر رکھنے والی وہ تمام قوتیں جو پیداوار کی ترقی اور ٹیکنیک کی محدود نوعیت کا لازمی عکس ہوتی ہیں اب غائب ہو جاتی ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ تقسیم محنت بھی۔تاہم یہ سب کچھ چوبیس گھنٹے میں نہیں ہو جاتا۔معیار زندگی اور ثقافتی سطح میں زبردست اضافہ اس کی شرط اولین ہے۔اس وقت تک مذکورہ بالا خصوصیات یعنی پرانے سرمایہ دارانہ نظام کی باقیات پر مبنی سرمایہ دارانہ خصوصیات عبوری دور میں بھی موجود رہیں گی۔

کلف، شناخت مین اور ان تمام لوگوں کی پوزیشن عبوری دور کے بارے میں بالکل غیر واضح ہے جنہوں نے روس پر ٹراٹسکی کی پوزیشن پر نظر ثانی کی ہے اور اس کی ایک بہت اچھی وجہ ہے۔اگر کوئی شخص عبوری مرحلے کے نظریئے کو روسی تجربے کی روشنی میں دیکھتا ہے تو دو میں سے ایک ہی نتیجہ اخذ کرے گا۔یا تو روس ابھی عبوری مرحلے (جس میں کئی خوفناک بگاڑ پیدا ہو گئے) میں ہے یا پھر روس اپنے آغاز ہی سے کبھی بھی مزدور ریاست نہیں رہا تھا۔روس پر اپنی کتاب میں کلف ٹراٹسکی کی کتاب انقلاب سے غداری سے اقتباس پیش کرتا ہے۔

''سوویت سماجی ڈھانچے کی بنیاد زمین، صنعتی پیداوار کے ذرائع، مواصلات اور تبادلے کی نیشنلائزیشن اور بیرونی تجارت کی اجارا داری پر قائم ہے۔پرولتاری انقلاب کے قائم کردہ ان رشتوں کے ذریعے ہمیں بنیادی طور پر بطور ایک پرولتاری ریاست کے سوویت یونین کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔''(12)

کلف کے اخذ کردہ نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ اس صورت میں ''پیرس کمیون اور بالشویک آمریت میں سے کوئی بھی مزدور ریاست نہیں تھی۔کیونکہ اول الذکر نے ذرائع پیداوار کو ریاستی تحویل میں لیا ہی نہیں اور آخر الذکر نے کافی عرصے تک ایسا نہیں کیا۔''(13) یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ کلف اس چیز کو بنیاد بناتا ہے کہ آیا ریاستی مشینری پر مزدور طبقے کا کنٹرول ہے یا نہیں۔لیکن آیئے ہم کلف کے اس طریقہ کار کا جائزہ لیتے ہیں جس کے ذریعے وہ مزدور ریاست کی معاشی بنیاد کو ریاستی مشین پر مزدوروں کے کنٹرول کے سوال سے علیحدہ کرتا ہے۔

ایک چھوٹے یا لمبے دورانیے کے عارضی وقفے کے لیے پرولتاریہ کے لیے یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کر لے لیکن فوری طور پر مروجہ ملکیتی رشتوں کو تبدیل کرنے کی جانب پیش قدمی نہ کرے۔ روس میں صورت حال ایسی ہی تھی جہاں اکتوبر 1917ء میں پرولتاریہ نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا لیکن اس نے بڑے پیمانے پر نیشنلائزیشن 1918ء تک شروع نہیں کی جب اسے اس کے لیے مجبور ہونا پڑا تھا۔ لیکن اگر پرولتاریہ معاشی تبدیلی روبہ عمل میں نہ لاتا تو ناگزیر طور پر تباہی پرولتاری نظام حکومت کا مقدر بن جاتی معیشت کے قوانین بالآخر ہمیشہ اپنا راستہ بنا لیتے ہیں۔ یا تو پرولتاریہ تمام معیشت کو قومی تحویل میں لینے کی طرف بڑھتا یا ناگزیر طور پر سرمایہ دارانہ نظام غالب آجاتا۔ کلف یہ دکھانے میں ناکام رہتا ہے کہ روسی معیشت کی بنیادی ہیئت ایک صحت مند مزدور ریاست کے تحت کیونکر مختلف ہوگی۔

پیرس کمیون اور روسی انقلاب کے اولین مراحل کے تجربے کے حوالے سے بھی اس کا کیس بہتر بنیادوں پر قائم نہیں ہے۔ مذکورہ بالا تجزیئے کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔ یہ نظام پرولتاریہ کی مکمل معاشی حکمرانی کا عبوری مرحلہ تھے۔ ایک سے دوسرے سماج میں تبدیلی کی صورت میں ایسے عبوری دور کم وبیش ناگزیر ہیں۔ کمیون اور روسی انقلاب، دونوں ہی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے تھے اگر پرولتاریہ آگے چل کر صنعت کو قومی تحویل میں نہ لے لیتا۔ کیا کلف صاحب یہ بات فراموش کر چکے ہیں کہ مارکس کے بنیادی اسباق میں سے ایک اور جسے بالشویکوں نے بڑی ریاضت سے سیکھا تھا، یہ تھا کہ فرانسیسی پرولتاریہ بینک آف فرانس کو قومی تحویل میں لینے میں ناکام رہا تھا؟ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی ریاست سیاسی اقتدار کی بنیاد پر پرولتاریہ ریاست ہوسکتی ہے، یا معیشت کی بنیاد پر پرولتاری ریاست ہوسکتی ہے یا جیسا کہ ہم ثابت کریں گے یہ ان دنوں کی طرف عبور پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔

سرمایہ دارانہ ردانقلاب پر بھی انہی قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔ ٹراٹسکی نے بجا طور پر یہ دلیل دی تھی کہ روس میں بورژوا ردانقلاب آنے کی صورت میں ہوسکتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے بورژوازی ریاستی ملکیت کو بھی برقرار رکھے اس سے قبل کہ وہ اسے توڑ کر نجی مالکان کے حوالے کرے۔ ایک کتابی شخص کے لیے بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاستی ملکیت کی بنیاد پر بورژوا ریاست بھی قائم ہوسکتی ہے اور مزدور ریاست بھی یا نجی ملکیت کی بنیاد پر مزدور ریاست بھی قائم ہوسکتی ہے اور بورژوا ریاست بھی۔ تاہم یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس قسم کا طرز استدلال وہی شخص اختیار کرسکتا ہے جو اس امر کو ملحوظ خاطر نہ رکھ سکے کہ سماج ایک سمت میں جارہا ہے یا دوسری سمت میں۔

ریاست اور سماج کے طبقاتی ڈھانچے سے ہر قسم کے غیر متوقع رشتے ارتقا پا سکتے ہیں۔ روس کی مثال لیجئے۔ 1917ء میں سوویتوں پر بالشویکوں کے مکمل غلبے سے قبل ہمارے سامنے ایک ایسی صورت حال تھی جس کے بارے میں ٹراٹسکی نے ''روسی انقلاب کی تاریخ'' میں لکھا ہے کہ منشویک اکثریت کے باعث ایک مخصوص حوالے سے بورژوازی سوویتوں کے ذریعے حکمرانی کرتی تھی جو مزدور اقتدار کے شاندار ترین ادارے تھیں۔ اگر ہم کلف کے نظریاتی خاکے کو قبول کر لیں تو ایسا واقع ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر بالشویکوں نے اقتدار پر قبضہ نہ کیا ہوتا تو عبوری دور میں بورژوازی منشویکوں کو اور ان کے ذریعے سوویتوں کو استعمال کرنے کے بعد سوویتوں کو ختم کر دیتی جیسا کہ اس نے 1918ء کے بعد جرمنی میں کیا تھا۔

یہ واضح ہے کہ ایک سماج سے دوسرے سماج میں تبدیلی کے درمیان کوئی ناقابل عبور خلیج حائل نہیں ہے۔ طے شدہ اور مقررہ درجہ بندیوں کے حوالے سے سوچنا جدلیاتی طریقہ کار نہیں ہے یعنی ''مزدور ریاست'' یا ''سرمایہ دارانہ ریاست'' اور ان کے درمیان کوئی کسی عبوری دور یا حرکت پر لعنت۔ واضح ہے کہ جب مارکس نے کمیون کے ساتھ تعلق کے حوالے سے پرانی ریاستی شکل کو پاش پاش کرنے کی بات کی تھی تو وہ اس بات کو یقینی خیال کرتا تھا کہ سست روی سے یا تیز رفتاری سے معیشت بھی تبدیل ہو گی اور سیاسی ہیئتوں سے ہم آہنگ ہو جائے گی۔

کیا سوویت یونین میں بھی قانونِ قدر کارفرما ہے؟

مارکسی معاشیات کے مطابق جنس کی تمام تر پیداوار کی بنیادوں میں قانون قدر کارفرما ہوتا ہے۔ سرمایہ داری کے تحت یہ عروج پر ہوتا ہے جس میں جنس کی پیداوار کی نوعیت آفاقی ہوتی ہے۔ اس قانون کی اساس یہ ہے کہ اجناس کی قدر و قیمت کا تعین ان کی تیاری کے لیے سماجی طور پر ضروری محنت کی مقدار سے ہوتا ہے یعنی (منجمد شدہ عرصہ محنت)۔ بعد ازاں اس قدر کا اظہار اجناس کے تبادلے کے ذریعے ہوتا ہے۔ یہ قانون مسابقت کے باعث رسد اور طلب میں آنے والی تبدیلیوں کے ذریعے سرمایہ دارانہ نظام کو اپنے تابع کرتا ہے۔ یہاں تک کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیانی عرصے میں رائج عبوری نظام یعنی مزدور ریاست کے تحت بھی بلاشبہ اجناس پیدا کی جائیں گی اور اسی باعث قانون قدر بھی ایک

تبدیل شدہ شکل میں بدستور کارفرما رہے گا۔

کلف نے کوشش کی تھی کہ اس قانون کو یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کر سکے کہ سوویت یونین میں بھی بحران (معاشی ابھار اور کساد بازاری) آ سکتے ہیں۔ تاہم مارکسی نقطہ نظر سے قانون قدر کے بارے میں اس کا تمام تر طرز فکر ہی انتہائی ناقص تھا۔ انتہائی الجھے ہوئے اور عجیب وغریب انداز میں وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ سوویت یونین کی معیشت کے اندر قانونِ قدر کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ صرف عالمی سرمایہ داری سے اس کے تعلقات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے روسی سماج کے اندر نہیں بلکہ عالمی سرمایہ دارانہ ماحول میں قانونِ قدر کی اساس تلاش کر لی ہے۔

کلف کہتا ہے کہ ''اس لیے اگر کوئی روسی معیشت کے اندر موجود رشتوں کا جائزہ لے تو یہ نتیجہ اخذ کرنا ناگزیر ہوگا کہ وہاں پیداوار کے محرک اور منتظم کی حیثیت سے قانونِ قدر کا سرچشمہ تلاش نہیں کیا جاسکتا۔'' (14) اور پھر وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ''لہٰذا جیسے ہی ہم اسے آج کی ٹھوس تاریخی صورت حال یعنی طوائف الملوکیت کی شکار عالمی منڈی میں دیکھتے ہیں تو قانونِ قدر ہمیں روسی معاشی ڈھانچے کا مختار کل نظر آتا ہے۔'' (15)

مارکسی نقطہ نظر کے مطابق قانون قدر خود کو تبادلے میں ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ بات ہر قسم کے سماج کے لیے درست ہے۔ مثال کے طور پر قدیم اشترا کی نظام کی ٹوٹ پھوٹ مختلف قدیم آبادیوں کے درمیان مال کے بدلے مال کی تجارت اور تبادلے کے باعث عمل میں آتی تھی۔ اس کے نتیجے میں نجی ملکیت کو فروغ حاصل ہوا۔ اسی طرح غلام داری سماج میں غلاموں کی بنائی ہوئی اشیا تبادلے کے باعث اجناس میں تبدیل ہوگئیں۔ اس ارتقا کے ذریعے ''جنسوں کی جنس'' یعنی روپیہ پیسہ قدیم زمانے میں ہی وجود میں آ چکا تھا۔ اگرچہ اس کو مکمل عروج سرمایہ داری کے تحت ہی حاصل ہوا جو ایک ایسا سماج ہے جس میں اجناس کی پیداوار کوئی استثنا نہیں بلکہ اصول ہے۔ لہٰذہ زمانہ قدیم میں بھی قانونِ قدر موجود تھا۔ اس کے باعث پیداکار پیداوار کی غلامی میں آیا اور اس کا نتیجہ پرانے غلام داری سماج کی تباہی کی صورت میں برآمد ہوا جو زرتبادلہ (روپیہ پیسہ) کی معیشت کے پیدا کردہ تضادات کے باعث اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔

جاگیرداری نظام کے تحت خودکفیل جاگیرداروں اور نوابوں کی ''فطری معیشت'' سے پیدا ہونے والی قدر زائد کے تبادلے نے اجناس کی شکل اختیار کر لی اور حقیقت میں یہی چیز تجارتی سرمائے کے ظہور

کے ذریعے سرمایہ دارانہ ارتقا کا نقطہ آغاز بنی۔ لہٰذا اگر قانون قدر کا اظہار محض روس اور بیرونی دنیا کے درمیان تبادلے میں ہوا تھا جیسا کہ کلف دعویٰ کرتا ہے تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ روسی قدر زائد کا تبادلہ قانون قدر کی بنیاد پر ہوا تھا۔

بہر حال جب کلف نے پہلے پہل یہ دلیل پیش کی تھی اس وقت اپنی مجموعی پیداوار کے مقابلے میں سوویت یونین کی عالمی منڈی میں شراکت بہت معمولی سی تھی۔ کلف کو ناگزیر طور پر اس نقطے پر اپنی کمزوری کا ادراک تھا۔ لہٰذا ایک حیرت انگیز ذہنی قلابازی لگاتے ہوئے اس نے یہ دریافت کیا کہ قانون قدر اپنا اظہار تبادلے میں نہیں بلکہ مسابقت میں کرتا ہے۔ یہ بھی اتنی بری بات نہ ہوتی اگر اس نے یہ دلیل دی ہوتی کہ یہ عالمی منڈی میں کلاسیکی سرمایہ دارانہ خطوط پر ہونے والی مسابقت تھی۔ وہ یہ دلیل نہیں دے سکتا تھا کیونکہ یہ حقائق سے میل نہیں کھاتی تھی۔ لہٰذا اس نے ایک نیا تصور متعارف کروا دیا۔ اس نے اپنی ''مسابقت'' اور اپنے ''قانونِ قدر'' کو اسلحہ سازی کی پیداوار میں کھوج نکالا! ''کیونکہ بین الاقوامی مسابقت زیادہ تر فوجی شکل اختیار کرتی ہے اس لیے قانونِ قدر خود کو اپنی ضد میں ظاہر کرتا ہے یعنی قدرِ استعمال میں مقابلے کی جدوجہد۔ لیکن چونکہ دوسرے ممالک کے ساتھ مقابلے کی نوعیت زیادہ تر فوجی ہوتی ہے اس لیے ریاست بطور صارف مخصوص قسم کی قدر استعمال میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مثلاً ٹینک ہوائی جہاز وغیرہ وغیرہ۔'' (16) یہ انتہائی عجیب وغریب طرز استدلال کسی مسئلے کو حل کرنے کی بجائے ہمیں صرف روز افزوں اور ناقابل حل تضادات کی طرف لے جاتا ہے۔ عالمی سرمایہ داری کے دباؤ نے ایک جانب سوویت یونین کو قومی آمدنی کا بہت بڑا حصہ اسلحہ کی تیاری اور دفاع پر خرچ کرنے پر مجبور کیا تو دوسری طرف دفاعی ضروریات کے لیے قومی آمدنی کے ساتھ تناسب کے اعتبار سے جو سرمایہ تشکیل کیا اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ کلف کا دعویٰ ہے کہ اس نے یہاں قانون قدر تلاش کر لیا ہے۔ قانون قدر نے خود کو دو سماجی نظاموں کے درمیان اسلحہ کی مسابقت میں ظاہر کیا! اسے محض شاخت مین کے نوکر شاہانہ اجتماعیت کے نظریئے کو رعایت دینے کے مترادف خیال کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ نظریہ درست ہوتا تو ہمارے سامنے ایک بالکل نئی معیشت موجود ہوتی جس کی مثال نہ تو تاریخ میں ملتی ہے اور نہ ہی مارکسسٹوں نے یا کسی اور نے اس کی پیش بینی کی ہے۔ اس حماقت کے نتیجے میں کلف کو نام نہاد مسلسل عسکری معیشت کے برگ انجیر تلے مغرب میں پائی جانے والے کینشین ازم کے بورژوا دلائل کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اسی طرح الجھاؤ کے ایک لامحدود تسلسل میں ایک غلط نظریہ دوسرے غلط نظریئے کو جنم دیتا چلا جاتا

ہے۔

یہاں ایک بار پھر ہم ان خطرات کی نشاندہی کرنا چاہیں گے جو اقوال کے بے دریغ استعمال اور خیالات کے ملغوبے کی مدد سے کوئی ''تھیسز'' تیار کرنے میں مضمر ہیں۔ درحقیقت کلف کی کتاب مخلوط النسل ہے کیونکہ اس میں نوکر شاہانہ اجتماعیت اور ریاستی سرمایہ داری کے نظریات کا ادغام ہے۔ اگر کلف کی کتاب کے اس حصے کا کوئی مفہوم ہے بھی تو وہ ہمیں سیدھا شاخت مین کی نوکر شاہانہ اجتماعیت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔

یہ سارا تصور جزوی طور پر ایک جرمن سوشل ڈیموکریٹ لیڈر رڈولف ہلفرڈنگ سے مستعار لیا گیا ہے۔ جس کا اصرار تھا کہ روس اور نازی جرمن پر قانون قدر کا اطلاق نہیں ہوتا تھا اور یہ بالکل نئی سماجی تشکیلات تھیں اور اس میں بخارین کی تحریر ''سامراج اور عالمی معیشت'' کے چند پیروں کو بھی بنیاد بنایا گیا جو موصوف کی سمجھ بوجھ سے باہر تھے۔ اس میں بخارین نے ''ریاستی سرمایہ داری'' (ٹرسٹوں کا مالیاتی سرمائے سے ٹھوس اتحاد) کو بنیاد بنا کر بحث کی ہے اور اس میں لینن کے ساتھ مل کر آمریت کی ایک ایسی قسم کے بارے میں پیش بینی کی ہے جس نے بعدازاں فاشزم کی شکل میں حقیقت کا روپ دھارا۔ اس تصور کا ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد مالیاتی سرمائے کے ساتھ ریاست کے اتحاد پر قائم تھی۔ درحقیقت بخارین نے ایسے اجارہ دارانہ ریاستی سرمایہ داری پر مبنی نظاموں کی کلاسیکی مثال کے طور پر امریکہ کا انتخاب کیا تھا۔

اسلحہ سازی پر کلف کے دلائل معاشی نہیں بلکہ صوفیانہ نوعیت کے حامل ہیں۔ اگر ہم انہیں درست تسلیم کر بھی لیں تو یہ محض اس بات کی وضاحت کریں گے کہ روس اسلحہ کیوں بناتا تھا لیکن اس بات کی نہیں کہ کیسے اور کن بنیادوں پر اسلحہ بناتا تھا۔ اگر سوویت یونین ایک صحت مند مزدور ریاست بھی ہوتا تو اس کے لیے اسلحہ بنانا اور اسلحہ کی ٹیکنیک اور پیداوار میں مخالف سرمایہ دار ممالک کا مقابلہ کرنا اشد ضروری ہوتا۔ لیکن اسلحہ سازی کے بارے میں یہ دلائل بالکل غلط ہیں سوویت یونین میں ہونے والی پیداوار کا بڑا حصہ اسلحہ پر نہیں بلکہ ذرائع پیداوار پر مشتمل تھا۔ پھر اس سے یہ وضاحت تو ہو جائے گی کہ بیوروکریسی مجنونانہ رفتار سے ذرائع پیداوار کو جمع کرنے کی کوشش کیوں کر رہی تھی لیکن یہ بذاتِ خود نظام پیداوار کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کرتی۔ یہ بجا ہے کہ ایک صحت مند مزدور ریاست میں سماجی وجوہات (دوسرے ممالک کے مزدوروں کے سلسلے میں بین الاقوامیت پر مبنی اور انقلابی پالیسی) کی بنا پر اسلحہ کا ارتکاز کم ہوتا

لیکن عالمی سامراج کے دباؤ کے تحت اس کا وقوع پذیر ہونا بہر حال یقینی تھا۔

ضروری نہیں کہ سست رفتاری یا تیز رفتاری سے ہونے والی ذرائع پیداوار کی ترقی ہمیں یہ بھی بتائے وہ کس طریقے سے پیدا کیے جا رہے ہیں۔ کلف کہتا ہے کہ بیوروکریسی عالمی سامراج کے دباؤ کے تحت ذرائع پیداوار کو ترقی دے رہی تھی۔ بہت خوب! لیکن اس سے ہمیں صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ رفتار اتنی تیز کیوں تھیں۔ کلاسیکی بورژوا پولیٹیکل اکانومی کے نقطہ نظر سے بھی کلف کے دلائل خالصتاً لفظی ہیر پھیر پر مبنی ہیں۔ ان میں اس بات کو فرض کر لیا گیا ہے جسے ثابت کرنا مقصود تھا۔

ٹراٹسکی نے اپنی کتاب انقلاب سے غداری میں بلاوجہ ہی اس امر کی نشاندہی نہیں کی تھی کہ سٹالنسٹ بیوروکریسی کی سرگرمی اور انہماک کا سارا ترقی پسندانہ مواد محنت کی بارآوری اور ملک کے دفاع پر مبنی تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اگر قانون قدر کا اطلاق محض عالمی معیشت میں سرمایہ داری کے وجود کے باعث تھا تو اس کا اطلاق محض ان اشیا پر ہوتا جن کا تبادلہ عالمی منڈی میں کیا جاتا۔ لیکن کلف سوویت معیشت کے بارے میں دو متضاد مفروضوں کے حق میں دلائل دیتا ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ ''اس کا یہ مطلب نہیں کہ روس میں قیمتوں کا نظام صوابدیدی ہے جس کا دارومدار بیوروکریسی کی مرضی پر ہے۔ یہاں بھی قیمت کی بنیاد پیداواری لاگت ہے۔ اگر قیمت کو ایک ایسے ذریعے کے طور پر استعمال ہونا ہے جس سے بیوروکریسی بحیثیت مجموعی پیداوار کی سمت کا تعین کرتی ہے تو اسے اپنے مقصد پر پورا اترنا چاہیے۔ اور جہاں تک ہو سکے حقیقی لاگت کی عکاسی کرنی چاہیے یعنی مختلف اشیا کی تیاری میں صرف ہونے والی سماجی لحاظ سے ضروری محنت'' (17)

تین صفحات کے بعد کلف وہ مرکزی نقطہ اٹھاتا ہے جسے وہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ ''اگر آپ روسی معیشت میں پائے جانے والے رشتوں کا جائزہ لیں تو آپ یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس کے اندر قانون قدر کا سرچشمہ موجود نہیں ہے۔'' اپنے پہلے بیان میں کلف یہ دکھاتا ہے کہ قانون قدر سٹالن ازم کے تحت روسی سماج میں خود کو داخلی طور پر کس طرح ظاہر کرتا تھا۔ اگر آپ عالمی منڈی کے اس باہمی اثر کو منہا بھی کر دیں جو وہ بلاشک وشبہ ڈالتی تھی جب کلف یہ کہتا ہے کہ ''حقیقی لاگتوں یعنی مختلف اشیا کی تیاری کے لیے درکار سماجی لحاظ سے ضروری محنت'' کو حقیقی قیمتوں کی لازماً عکاسی کرنی چاہیے تو وہ کہہ رہا ہے کہ سوویت یونین میں بھی وہی قانون لاگو ہوتا ہے جو کسی سرمایہ دارانہ سماج میں لاگو ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ سرمایہ دارانہ سماج میں یہ خود کو منڈی کے قوانین کے ذریعے اندھے طور پر ظاہر کرتا ہے

جبکہ سوویت معیشت میں یہ باشعور سرگرمی ایک اہم کردار ادا کرتی تھی۔

اس حوالے سے دوسرا قول کلف کی اس دلیل کو بری طرح مسترد کر دیتا ہے کہ ان دیئے گئے حالات میں سوویت یونین میں سرمایہ داری موجود تھی کیونکہ قانون قدر وہاں اندھے انداز میں کارفرما نہیں تھا بلکہ اس پر سعوری غلبہ موجود تھا۔ جیسا کہ اس کا کہنا ہے سرمایہ دارانہ سماج میں قانون قدر اپنا اظہار ''معاشی سرگرمی کی خودمختاری'' کے ذریعے کرتا ہے یعنی اس میں غلبہ منڈی کو حاصل ہوتا ہے۔ پہلا قول واضح طور پر یہ ظاہر کرتا ہے کہ منڈی، اور یہ فیصلہ کن نقطہ ہے، پر معینہ حدود کے اندر شعوری غلبہ موجود تھا اور اسی وجہ سے یہ ان معنوں میں مارکسسٹ سمجھتے ہیں۔

قبل ازیں کلف نے کہا تھا کہ سوویت یونین میں قانون قدر کارفرما نہیں تھا۔ یہاں وہ یہ دکھا رہا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھک کس طرح سے عمل کرتا تھا یعنی کلاسیکی سرمایہ دارانہ خطوط پر نہیں بلکہ سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان ایک عبوری سماج کے اندر۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کلف کا دعویٰ یہ تھا کہ سٹالنسٹ روس ایک سرمایہ دارانہ سماج تھا لیکن اس کو سرمایہ دارانہ پیداوار کے بنیادی قانون کا سرچشمہ روس کے باہر ملا۔ کسی بھی سرمایہ دار سماج میں پس انداز فنڈ سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ اینگلز کی وضاحت کے مطابق

''اگر یہ پیداوار اور پس انداز فنڈ واقعتاً سرمایہ دار طبقے کے ہاتھوں میں موجود ہو، اگر اس کا ظہور حقیقتاً منافع کے جمع ہونے سے ہوا ہو تو یہ لازماً محنت کی جمع شدہ زائد پیداوار پر مشتمل ہوتا ہے۔ جسے مزدور طبقے نے سرمایہ دار طبقہ کے حوالے کیا ہوتا ہے جو اجرتوں کی اس مجموعی مقدار کے علاوہ ہوتا ہے جو سرمایہ دار طبقہ مزدور طبقے کو ادا کرتا ہے۔ بہر حال اس صورت میں قدر کا تعین اجرتیں نہیں بلکہ محنت کی مقدار کرتی ہے۔ اس صورت میں مزدور طبقہ محنت کی پیداوار کی شکل میں قدر کی اس سے زیادہ مقدار سرمایہ دار طبقے کے حوالے کرتا ہے جتنی وہ اجرتوں کی شکل میں وصول کرتا ہے اور پھر دوسرے کی محنت کی پیداوار پر بلا معاوضہ تصرف کی تمام دیگر اقسام کی طرح اس کی وضاحت قدر زائد کے ایک سیدھے سادھے جزو کے طور پر ہو جاتی ہے جسے مارکس نے دریافت کیا تھا۔''(18)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں اجرتی مزدوری ہو، جہاں سرمائے کا ارتکاز ہو وہاں قانون قدر کا اطلاق ضرور ہوتا ہے چاہے اس کے اظہار کی شکل کتنی ہی پیچیدہ کیوں نہ ہو۔ آگے چل کر ڈیورنگ کی پانچ اقسام کی قدروں اور ''پیداوار کی قدرتی لاگتوں'' کے جواب میں اینگلز وضاحت کرتا ہے کہ ''سرمایہ'' میں مارکس اجناس کی قدر پر بحث کرتا ہے اور قدر سے متعلق تمام حصے میں مارکس نے اس جانب ذرا سا بھی

اشارہ نہیں کیا کہ آیا اجناس کی قدر کے نظریئے کا اطلاق سماج کی دیگر شکلوں پر بھی ہوگا یا کس حد تک ہوگا۔ اس حوالے سے یہ واضح ہے کہ عبوری سماج میں بھی ''قدر بذات خود کسی شے کی تیاری میں صرف ہونے والی سماجی لحاظ سے ضروری محنت کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں۔''

یہاں یہ پوچھنا ضروری ہو جاتا ہے کہ سوویت یونین میں ہونے والی مشینوں اور اشیائے صرف وغیرہ کی قدر کا تعین کونسی چیز کرتی تھی؟ کیا وہ کوئی صوابدیدی شے تھی؟ بیوروکریسی کے حساب کتاب کا تعین کونسی چیز کرتی تھی؟ وہ قیمت میں کس چیز کی پیمائش کرتے تھے؟ اجرتوں کا تعین کس سے ہوتا تھا؟ کیا اجرتیں قوت محنت کی ادائیگی تھیں؟ زرتبادلہ کا تعین کیا چیز کرتی تھی؟ اداروں کے منافع کا تعین کس سے ہوتا تھا؟ کیا سرمایہ موجود تھا؟ کیا تقسیم محنت کو ترک کر دیا گیا تھا؟ کلف ان سوالات کے دو متضاد جوابات فراہم کرتا ہے۔ ایک طرف تو وہ اقرار کرتا ہے کہ یہ قانون قدر ہی تھا جس پر روسی سماج کی حرکت اور تمام حساب کتاب نے فروغ پایا۔ دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ قانون قدر محض خارجی دنیا کے دباؤ کے باعث کارفرما تھا اگرچہ وہ سنجیدگی سے اس کی وضاحت نہیں کرتا کہ وہ کس طرح وقوع پذیر ہوتا تھا۔

عبوری دور کا مفہوم

حیران کن بات یہ ہے کہ کلف بذات خود اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ بیوروکریسی نہ تو من مرضی سے قیمتوں کا تعین کرتی تھی اور نہ کر سکتی تھی۔ زرتبادلہ کی کتنی مقدار گردش میں ہے وہ اس کا تعین کرنے کی صلاحیت سے محروم تھی اور یہ بھی اس کی صوابدید پر منحصر نہیں تھی۔ اور یہ صورت حال ہر اس سماج میں رہی ہے جہاں زرتبادلہ (ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ جنسوں کی جنس ہے) نے کردار ادا کیا ہے۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے اینگلز نے ڈیورنگ سے بجا طور پر استفسار کیا تھا۔

'' اگر تلوار (اس سے قطع نظر کہ یہ کس کے ہاتھ میں ہے، سرمایہ دارانہ حکومت کے بیوروکریٹ) واقعی اس جادوئی معاشی قوت کی حامل ہے جو ڈیورنگ اس سے منسوب کرتے ہیں تو ایسا کیوں ہے کہ کوئی بھی حکومت مستقل طور پر خراب زرتبادلہ کو اچھے زرتبادلہ جیسی قدر تقسیم عطا کرنے یا سونے جتنی قدر تقسیم عطا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔'' (19) ٹراٹسکی اپنی کتاب انقلاب سے غداری میں اس مسئلے کی بہت اچھی طرح وضاحت کرتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام سے منسوب معاشی

خوبیاں سرمایہ داری سے سوشلزم کی طرف عبور کے درمیان سماج میں بھی برقرار رہتی ہیں۔اس کی کلید یہ ہے کہ قوانین برقرار رہتے ہیں لیکن ایک تبدیل شدہ شکل میں ۔سرمایہ داری کے کچھ قوانین کا اطلاق ہوتا ہے اور کچھ منسوخ ہو جاتے ہیں ۔مثال کے طور پر ٹراٹسکی یہ دلیل دیتا ہے کہ ''صرف یہی نہیں کہ سوویت معیشت میں زر تبادلہ کا کردار ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں اسے آئندہ بھی ایک طویل عرصے تک فروغ حاصل کرنا ہے۔بحیثیت مجموعی سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیانی دور کا یہ مطلب نہیں کہ تجارت میں کٹوتی ہو بلکہ اس کے برعکس اس میں غیر معمولی توسیع ہوتی ہے۔صنعت کی تمام شاخیں خود کو تبدیل کرتی ہیں اور فروغ حاصل کرتی ہیں۔نئی (شاخیں) لگا تار وجود میں آتی رہتی ہیں سب کی سب مقداری اور معیاری لحاظ سے ایک دوسری کے ساتھ تعلق کا تعین کرنے پر مجبور ہوتی ہیں ۔زرعی معیشت کے ساتھ ساتھ محدود خاندانی زندگی کے خاتمے کا مطلب ہے کہ محنت کی وہ ساری توانائی جو قبل ازیں کسان کے اپنے صحن کی حدود یا اپنی ذاتی رہائش گاہ کی دیواروں کے اندر صرف ہوتی تھی اب باہمی سماجی تبادلے کے دائرے میں آجاتی ہے اور خود بخود زر تبادلہ کی گردش کا حصہ بن جاتی ہے۔تاریخ میں پہلی بار تمام اشیا اور خدمات کا ایک دوسرے کے لیے تبادلہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔''(20)

اس معمے کے حل کی چابی کیا ہے؟ اسے محض اس حقیقت میں تلاش کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک عبوری سماج تھا۔ریاست اب ہدایات دے سکتی تھی تاہم صوابدیدی طور پر نہیں بلکہ محض قانون قدر کی حدود کے اندر رہتے ہوئے۔بذاتِ خود پیداواری قوتوں کے فروغ کی طے کردہ سخت حدود سے صرف نظر کرنے یا ان کی خلاف ورزی کرنے کی کوئی بھی کوشش فوری طور پر پیدا کار پر پیداوار کے از سر نو غلبے پر منتج ہوتی ہے۔اس کا انکشاف سٹالن پر قیمت اور زر تبادلہ کے تعلق کے بارے میں اس وقت ہوا تھا جب روسی معیشت پر افراط زر کے بحران کی ضرب لگی تھی جس نے منصوبے کو مکمل طور پر مسخ اور خراب کر دیا تھا۔قانون قدر کو منسوخ نہیں بلکہ تبدیل کیا گیا تھا۔

جواب کے لیے مسئلے کو اس طرح سے پیش کرنا ہی کافی ہے۔ایک سنجیدہ معاشی تجزیہ نگار لازماً ہماری رہنمائی اس نتیجے کی سمت کرے گا کہ یہ ایک ایسا عبوری سماج تھا جس پر کچھ ایسے قوانین کا اطلاق ہوتا تھا جو خاص طور پر سوشلزم سے منسوب تھے اور کچھ ایسے قوانین کا جو خاص طور پر سرمایہ داری سے منسوب تھے۔ آخر کار عبوری دور سے مراد یہی ہے۔اگرچہ کلف یہ شناخت کرنے سے قاصر ہے لیکن جب وہ کہتا ہے کہ بیوروکریسی شعوری طور پر (اگرچہ کچھ حدود کے اندر) سرمایہ داری کی شرح، ذرائع پیداوار اور ذرائع صرف

کے درمیان تناسب اوراشیائے صرف کی قیمتوں کو باقاعدہ اور باضابطہ بناتی تھی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کررہاہے کہ سرمایہ داری کے کچھ بنیادی اصولوں کا اس پر اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

کیا روس میں زرِتبادلہ سرمائے میں تبدیل ہوتی تھی؟ سٹالن کے ساتھ بحث میں ٹراٹسکی یہ ثابت کرتا ہے کہ اگرچہ سرمایہ کاری ایک منصوبے کی بنیاد پر کی جاتی تھی لیکن جس چیز کی سرمایہ کاری ہوتی تھی وہ مزدوروں کی پیدا کردہ قدرِ زائد تھی۔ یہاں ٹراٹسکی سٹالن کے اس تصور کی بنیادی خامی کو ثابت کرتا ہے کہ ریاست معیشت کی پرواہ کیے بغیر فیصلے کرسکتی ہے اور ضابطے بنا سکتی ہے۔ہم یہاں اس بات کا بھی اضافہ کرسکتے ہیں کہ سٹالن نے اس حقیقت سے کبھی انکار نہیں کیا کہ روس میں ہونے والی پیداوار جنس کی پیداوار تھی۔

اس حقیقت کے باوجود کہ سٹالنسٹ روس میں صرف ایک ہی ''آجر'' تھا، ریاست بہرحال قوت محنت خریدتی تھی۔ یہ درست ہے کہ مکمل روزگار کے باعث، جو عام حالات میں قوت محنت کی جنس فروخت کرنے والے کو ایک مضبوط حیثیت عطا کرتی، ریاست نے قوت محنت کی آزادانہ فروخت پر مختلف قسم کی پابندیاں عائد کردیں۔ بالکل اسی طرح جیسے فاشزم کے تحت (یا ''جمہوری'' برطانیہ میں بھی اگر اس کی ضرورت پڑے) آجر ریاست سے مداخلت کرواتے ہیں تاکہ ایسی صورت حال میں قوت محنت کی فروخت کے حوالے سے مزدوروں کو جو برتری حاصل ہوتی ہے اسے ختم کیا جاسکے۔لیکن اس حقیقت سے کوئی مایوس کن حد تک تجریدات میں گم شخص ہی انکار کرسکتا ہے کہ اس سے نظریہ قدر کی نفی نہیں ہوتی۔

یہ درست ہے کہ کلاسیکی سرمایہ دارانہ معیشت میں قوت محنت کی فروخت آزادانہ طور پر ہوتی تھی۔ تاہم مارکس کی کتاب ''سرمایہ'' میں بھی ان وحشیانہ قوانین کے لیے ایک پورا باب مختص ہے جو انگلینڈ میں اجرتوں کو کم سطح پر رکھنے کے لیے وضع کیے گئے تھے کیونکہ طاعون کالی موت کے باعث آبادی اتنی کم ہو گئی تھی کہ نوزائیدہ پرولتاریہ زیادہ اجرتوں کی مانگ کے لیے ایک بہتر پوزیشن میں گیا تھا۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ بنیادی مارکسی قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا تھا؟ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ''سرمایہ'' کی تینوں جلدوں میں مارکس ایک ایسے ''خالص'' سرمایہ دارانہ نظام پر بحث کررہا تھا جس کا کبھی کوئی وجود نہیں تھا، جس سے اس نے بنیادی قوانین اخذ کیے تھے یہ ایک ''مثالی نمونہ'' تھا۔ لیکن عمل میں حقیقت کسی نہ کسی طور نمونے سے ہمیشہ مختلف ہوتی ہے۔

یہ حقیقت بنیادی قوانین کو تبدیل نہیں کرتی کہ مخصوص صورتوں میں کوئی عنصر مسخ بھی ہوسکتا ہے۔

بہت سے انحرافات کے باوجود نازی جرمنی بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ معیشت پر مبنی نظام ہی رہا کیونکہ معیشت پر جنس کی پیداوار اور نجی ملکیت کی بنیاد پر ہونے والی پیداوار کا غلبہ رہا۔اس فرق کو دیکھنے کے لیے صرف سٹالن کے کیمپوں میں غلامانہ مزدوری کا روسی شہروں کے پرولتاریہ سے موازنہ کرنا ہی کافی تھا۔پہلا ایک غلامانہ مشقت کرنے والا غلام تھا اور دوسرا اجرتی غلام تھا۔ایک اپنی قوت محنت فروخت کرتا تھا دوسرا بذات خود خالصتاً ایک محنت کا اوزار تھا۔یہ ایک بنیادی نوعیت کا فرق ہے۔یہ قطعاً کوئی حادثاتی امر نہیں ہے کہ ریاست جو زرتبادلہ استعمال کرتی ہے اس کی بنیاد بھی لازمی طور پر وہی ہوتی ہے جو سرمایہ دارانہ سماج میں ہوتی ہے۔جیسا کہ ٹراٹسکی نے وضاحت کی تھی کہ روس (یا کسی بھی عبوری معیشت میں اور یہاں تک کہ ایک مثالی مزدور ریاست میں بھی) میں واحد حقیقی زرتبادلہ کی بنیاد سونے پر رکھنا ضروری تھا۔سٹالن کے دور میں روبل کی قیمت میں ہونے والی کمی بذات خود اس حقیقت کی واضح تصدیق تھی کہ زرتبادلہ کی گردش کا قانون اسی طرح اجناس کی گردش کا قانون اپنے جواز کو برقرار رکھے ہوئے تھا اور صرف سوویت یونین میں ہی نہیں بلکہ کسی بھی عبوری معیشت میں زرتبادلہ،قدر،قدرِزائد وغیرہ وغیرہ کا نئے سماج کے اندر پرانے عناصر کی حیثیت سے جاری رہنا یقینی امر ہے۔

کلف دلیل دیتا ہے کہ ''ریاستی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ ٹرن اوور اور ٹیکس تھا جو کہ ایک بالواسطہ ٹیکس ہے۔''(21) بہرحال ٹرن اوور اور ٹیکس بالواسطہ طریقے سے یہ ضروری ثابت کرتا ہے کہ سٹالنسٹ روس پر قانون قدر کا اطلاق ہوتا تھا۔کلف یہ تو دکھاتا ہے کہ روس میں ٹرن اوور ٹیکس کیسے لاگو ہوتا تھا۔لیکن وہ یہ دیکھنے سے محروم ہے کہ اس ٹیکس کی یقیناً کوئی بنیاد بھی ہوگی۔ریاست اضافی ٹیکسوں کے ذریعے قیمت میں چاہے کتنا بھی اضافہ کرلے قیمت کا کسی نہ کسی بنیاد پر قائم ہونا لازمی ہے۔یہ شے کی قدر کے علاوہ کیا ہوسکتی ہے یعنی اس میں شامل سماجی لحاظ سے ضروری محنت کا وقت؟ ورنہ کیا ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ ریاست ایسی چیزوں کا تعین من مرضی سے کرتی تھی یعنی انتظامی آمریت کے ذریعے جس کی پشت پر طاقت موجود ہوتی تھی۔لیکن یہ ایک انتہائی بچگانہ دلیل ہے جسے اینٹی ڈیورنگ کے صفحات میں پہلے ہی تہس نہس کیا جاچکا ہے۔اس میں اینگلز نے ڈیورنگ کا مضحکہ اڑایا ہے جس کے خیال میں ٹیکس تلوار کے ذریعے وصول کیا جاتا تھا جس سے مبینہ طور پر سرپلس حاصل کیا جاتا تھا۔وہ لکھتا ہے

''دوسری طرف مبینہ ٹیکس سرچارج قدر کی ایک حقیقی مقدار کو ظاہر کرتے ہیں جسے محنت کرنے والے اور قدر پیدا کرنے والے طبقے نے پیدا کیا ہوتا ہے لیکن اس پر اجارہ دار طبقے کا تصرف ہوتا ہے اور

پھر قدر کی یہ مجموعی مقدار محض غیر ادا شدہ اجرت پر مشتمل ہوتی ہے۔اس صورت میں ہم شمشیر بکف شخص اور مبینہ ٹیکس سرچارج سے قطع نظر ایک بار پھر قدر زائد کے مارکسی نظریئے کی طرف واپس لوٹ آتے ہیں۔''(22)

روس میں ٹرن اوور ٹیکس اور بیوروکریسی کی دیگر ہیرا پھیریوں سے قانون قدر کسی بھی طور جواز سے عاری نہیں ہوتا۔قانون قدر کا جوہر کیا ہے؟ یہ کہ کسی شے کی قدر کا تعین اس کی تیاری کے لیے درکار سماجی لحاظ سے ضروری محنت کے وقت کی اوسط مقدار سے ہوتا ہے۔یہ لازمی طور پر ہمارا نقطہ آغاز ہونا چاہیے۔ لامحالہ یہ اپنا اظہار تبادلے کے ذریعے کرتی ہے۔ مارکس نے ''سرمایہ'' کی پہلی جلد کا بڑا حصہ جنس کے تاریخی ارتقا کی وضاحت کے لیے وقف کیا تھا۔جس میں ہم وحشیوں کے درمیان حادثاتی تبادلے سے شروع کر کے اس کے مختلف عبوری ادوار کا مطالعہ کرتے ہوئے جنس تبادلہ کی پیداوار کے نقطہ عروج یعنی سرمایہ دارانہ پیداوار تک پہنچتے ہیں۔

ایک کلاسیکی سرمایہ دارانہ معیشت میں بھی قانون قدر خود کو براہ راست ظاہر نہیں کرتا۔جیسا کہ سب جانتے ہیں جنس تبادلہ کو ان کی قدر سے کم یا زیادہ قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔کسی جنس تبادلہ کا اپنی اصل قیمت پر فروخت ہونا محض ایک حادثاتی امر ہوگا۔''سرمایہ'' کی تیسری جلد ہی میں مارکس جنس تبادلہ کی پیداوار کی قیمت کی وضاحت کرتا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ سرمایہ دار کو صرف اپنی جنس تبادلہ کی پیداواری لاگت کے علاوہ منافع کی اوسط شرح حاصل ہوتی ہے۔لہٰذا کچھ سرمایہ داروں کو حقیقی شرح سے کم ادائیگی ہو گی اور کچھ کو زیادہ ہوگی۔مختلف سرمایوں کی مختلف ٹھوس تراکیب کے باعث صرف اسی قسم کے پیچیدہ طریقے سے قانون قدر خود کو ظاہر کرتا ہے۔اس میں شک نہیں کہ یہ مسابقت کے ذریعے ہی رونما ہوتا ہے۔

اجارہ داری قانون قدر کا محض ایک زیادہ پیچیدہ ارتقا ہے۔کچھ اجارہ داریوں کو غالب حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے وہ جنس تبادلہ کی قدر سے زیادہ قیمت وصول کر سکتی ہیں لیکن ایسا محض اس صورت میں ہوسکتا ہے جب دیگر اجناس تبادلہ اپنی قدر سے کم قیمت پر فروخت ہوں۔سماج میں پیدا ہونے والی مجموعی قدروں کی قیمت وہی رہے گی۔جس حد تک سوشلزم ترقی کرے گا اسی حد تک قانون قدر ''رفتہ رفتہ مٹے گا۔'' اینگلز ڈیورنگ پر اچھی طرح ہنسنے کے بعد آخر میں اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ سوشلزم کے تحت لوگ ''مشہور زمانہ'' کی مداخلت کے بغیر ہر چیز کا انتظام انتہائی آسانی اور سادگی سے کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

ضمیمہ: ریاست اور مارکسی تصور

1۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ صفحہ 321

2۔ لینن۔مجموعہ تصانیف جلد 27 صفحہ 335

3۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ صفحہ 330

4۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ صفحہ 330

5۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ صفحہ 331

6۔ ایضاً ایضاً صفحہ 136

7۔ مارکس اور اینگلز۔منتخب خطوط صفحہ 393

8۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ صفحہ 366

9۔ مارکس۔سرمایہ جلد 3 صفحہ 847

10۔ مارکس۔سرمایہ جلد 3 صفحہ 851

11۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری صفحہ 66-65

12۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری صفحہ 248

13۔ کلف۔روس ایک مارکسی تجزیہ صفحہ 133

14۔ ایضاً صفحہ 159

15۔ ایضاً صفحہ 161

16۔ ایضاً صفحہ 160

17۔ ایضاً صفحہ 156

18۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ پروگریسو پبلشرز ماسکو 1969ء صفحہ 233

19۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ پروگریسو پبلشرز ماسکو 1969ء صفحہ 228

20۔ ٹراٹسکی۔انقلاب سے غداری نیویارک 1972ء صفحہ 67

21۔ کلف۔روس ایک مارکسی تجزیہ صفحہ 47

22۔ اینگلز۔اینٹی ڈیورنگ صفحہ 226